جماعتِ شیخ الہندؒ
اور
تنظیمِ اسلامی

ڈاکٹر اسرار احمد

یکے از مطبوعاتِ تنظیمِ اسلامی

مکتبہ خُدّام القُرآن لاہور

36 کے ماڈل ٹاؤن لاہور، فون: 3-35869501

نام کتاب ———— جماعت شیخ الہندؒ اور تنظیم اسلامی

طبع اوّل تا چہارم (اپریل 1987ء تا جولائی 1998ء) ———— 4000

طبع پنجم (مارچ 2013ء) ———— 1100

ناشر ———— ناظم نشر و اشاعت، مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

مقامِ اشاعت ———— 36۔ کے، ماڈل ٹاؤن، لاہور

فون: 3-35869501

مطبع ———— شرکت پرنٹنگ پریس، لاہور

قیمت ———— 500 روپے

ISBN : 978 - 969 - 606 - 014 - 7

email:publications@tanzeem.org
website:www.tanzeem.org

اُن علماءِ حق

کی خدمت میں ——— جو ——— اِس دورِ فتن میں

ذاتی مصلحتوں، دنیوی منفعتوں اور گروہی تعصّبات

کا شکار ہوکر، فرمانِ نبویؐ:

”عُلَمَاءُهُمْ شَرٌّ مَنْ تَحْتَ اَدِيْمِ السَّمَاءِ
مِنْ عِنْدِهِمْ تَخْرُجُ الْفِتْنَةُ وَفِيْهِمْ تَعُوْدُ“

کا مصداق بننے کی بجائے ——— دین کی موجودہ حالتِ غربت میں

اللہ اور رسولؐ کے ساتھ نصح و اخلاص اور غیرت وحمیتِ دینی سے سرشار ہونے کی بنا پر

”وَلٰكِنْ كُوْنُوْا رَبّٰنِيّٖنَ بِمَا كُنْتُمْ تُعَلِّمُوْنَ الْكِتٰبَ وَبِمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُوْنَ“

اور

” اَلَّذِيْنَ يَسْتَمِعُوْنَ الْقَوْلَ فَيَتَّبِعُوْنَ اَحْسَنَهٗ “

کی قرآنی ہدایات پر عمل پیرا، اور

”فَطُوْبٰى لِلْغُرَبَاءِ“

کی نبویؐ تہنیت اور مبارک باد کے مستحق ہوں

(نوٹ: کتاب کے عام قارئین کے لیے احادیثِ نبویہؐ اور آیاتِ قرآنیہ کا ترجمہ پشت پر درج ہے!)

آیاتِ قرآنیہ

——— (۱) ———

﴿ وَلٰكِنْ كُوْنُوْا رَبّٰنِيّٖنَ بِمَا كُنْتُمْ تُعَلِّمُوْنَ الْكِتٰبَ وَبِمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُوْنَ ﴾

(سورۂ آل عمران: آیت ۷۹)

ترجمہ: ”بلکہ اللہ والے بنو بوجہ اس کے کہ تم اللہ کی کتاب خود بھی پڑھتے ہو اور دوسروں کو بھی اس کی تعلیم دیتے ہو!“

——— (۲) ———

﴿ اَلَّذِيْنَ يَسْتَمِعُوْنَ الْقَوْلَ فَيَتَّبِعُوْنَ اَحْسَنَهٗ ؕ ﴾

(سورۃ الزمر: آیت ۱۸)

ترجمہ: ”جو سنتے ہیں بات کو توجہ سے، پھر پیروی کرتے ہیں اس کے بہترین پہلو کی“

احادیثِ نبویہ

علٰی صاحبہا الصّلٰوۃ والسّلام

——— (۱) ———

امام بیہقیؒ نے شعب الایمان میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”قریب ہے لوگوں پر ایک زمانہ ایسا آئے کہ اسلام میں سے سوائے اُس کے نام کے اور کچھ نہ رہے گا اور قرآن میں سے بھی سوائے الفاظ کے اور کچھ باقی نہ رہے گا۔ ان کی مسجدیں آباد تو ہوں گی، لیکن ہدایت سے خالی ہوں گی،

اُن کے علماء آسمان کے نیچے کی بدترین مخلوق ہوں گے، فتنہ وفساد اُن ہی کے اندر سے نکلے گا اور اُن ہی میں واپس لوٹ جائے گا!“

——— (۲) ———

امام مسلمؒ نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”اسلام کا آغاز تو اس حال میں ہوا کہ وہ اجنبی اور غیر معروف تھا اور عنقریب اس پر پھر یہی کیفیت طاری ہو جائے گی ——— تو تہنیت اور خوشخبری ہے اُن کے لیے جو (اسلام کے اس دَورِ غربت میں اس کے دامن سے وابستہ رہنے کے باعث) خود بھی اجنبی بن جائیں!“

فہرست

مُقدّمہ

جو رمضان المبارک ۱۴۰۷ھ کے آخری عشرے میں
مکہ مکرمہ (زادہ اللہ شرفہا) میں قلمبند ہوا

❁ زیرِ نظر کتاب راقم الحروف کی چند تحریروں اور تقریروں کا مجموعہ ہے جو ۸۵۔۱۹۸۴ء کے دوران اکثر و بیشتر ماہنامہ ''میثاق'' اور بعض مجلّہ ''حکمت قرآن'' میں شائع ہوئیں۔

❁ ان کی وہ قدرِ مشترک' جو ان کی کتابی صورت میں تالیف کا سبب بنی' یہ ہے کہ ان میں علماءِ کرام بالخصوص منتسبین حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن رحمۃ اللہ علیہ سے خطاب اور عرض معروض بھی ہے۔

❁ اور ان میں سے بعض حضرات کے اعتراضات کا جواب اور شکوک و شبہات کا ازالہ بھی۔

............❁............

❁ یہ بحث دو اسباب سے شروع ہوئی:

❁ ایک: یہ کہ راقم نے اپنی ایک پرانی تحریر جو ''میثاق'' کی ستمبر و اکتوبر ۱۹۷۵ء کی مشترک اشاعت میں ''مولانا ابوالکلام آزاد' جمعیت علماء ہند اور حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ '' کے عنوان سے شائع ہوئی تھی بطور ''قندِ مکرر'' جنوری ۱۹۸۴ء کے پرچے میں دوبارہ شائع کر دی۔

❁ جس پر طنز و طعن سے بھرے ہوئے دو خطوط کہروڑ پکا (ضلع ملتان) کے مولانا اللہ بخش ملکانوی صاحب کے موصول ہوئے جن میں متحدیانہ انداز کے سوالات بھی تھے۔

❁ میں' اپنی دعوت و تحریک کی مصلحتوں کے پیشِ نظر' طعن و طنز سے صرفِ نظر کرتے ہوئے ازالۂ شبہات کی موزوں اور مناسب صورت کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ ان کی

ایک تیز و تند تحریر ماہنامہ ''الخیر'' ملتان میں بھی شائع ہو گئی۔

جس کے نتیجے میں' مجبوراً راقم کو بھی وضاحتی جواب ''میثاق'' میں شائع کرنا پڑا۔

............(اس ضمن میں راقم نے خود بھی ''میثاق'' میں مولانا ملکانوی کے دونوں خطوط اور ''الخیر'' میں شائع شدہ تحریر شائع کر کے جوابی گزارشات پیش کی تھیں...... اور علماء کرام سے متوقع اخلاقِ عالیہ اور صحافتی و تصنیفی روایات کے پیشِ نظر معاصر ''الخیر'' سے بھی درخواست کی تھی کہ وہ بھی میری وضاحتی گزارشات کو اپنے مؤقر مجلّے میں شائع فرما دیں...... یا کم از کم' ہمیں اپنے قارئین کے پتے فراہم کر دیں تا کہ ہم ان کی خدمت میں ''میثاق'' کا وہ شمارہ ارسال کر سکیں...... لیکن ع ''اے بسا آرزو کہ خاک شدہ!'')

............❁............

❁ دوسرے: یہ کہ ان ہی دنوں لاہور میں ایک ایسی نوجوان شخصیت ابھر کر سامنے آئی جس نے مولانا امین احسن اصلاحی کو اپنا ''استاذ'' قرار دے کر' حدِ رجم کے ضمن میں جہاں مولانا اصلاحی کی رائے کی انتہا ہوئی تھی' وہاں سے آغاز فرماتے ہوئے شریعت اسلامی کے پورے ڈھانچے کو درہم برہم اور تہہ و بالا کرنے کا بیڑا اٹھا لیا۔

❁ اور چونکہ یہ نوجوان زبان و قلم کی استعدادات سے بخوبی مسلّح تھا' لہٰذا دیکھتے ہی دیکھتے لاہور کے دین پسند نوجوانوں میں اس کا ایک حلقۂ اثر پیدا ہو گیا۔

❁ جہاں تک مولانا اصلاحی کا تعلق ہے' رجم کے ضمن میں ان کی عظیم غلطی اور بعض دوسرے معاملات میں ان کے شذوذ کے ساتھ ساتھ ان کی دینی و علمی خدمات بھی نہایت شاندار ہیں جن کا انکار ممکن نہیں۔

❁ جن میں سرفہرست تو بلاشبہ خدمتِ قرآن کے ضمن میں ان کی عمر بھر کی مساعی ہیں جن کے ذریعے انہوں نے نظمِ قرآن' اسالیبِ قرآن اور تفسیر القرآن بالقرآن کے ضمن میں اپنے استاذ و امام مولانا حمید الدین فراہیؒ کے کام کو آگے بڑھایا۔

❁ پھر اسی پر بس نہیں'

❁ انہوں نے شریعت اسلامی کے بعض اہم مسائل' بالخصوص عائلی قوانین کے ضمن میں مغربی رجحانات کی مذمت و مخالفت اور احکامِ شرعی کی حفاظت و مدافعت کے سلسلے میں جو مؤثر خدمات سرانجام دیں ان کا لوہا ہر شخص مانتا ہے۔

❁ چنانچہ' اس کے باوجود کہ بعض دوسرے حوادث و واقعات کی بنا پر مولانا سے راقم الحروف

کا ملنا جلنا ۱۹۷۶ء سے بند تھا'

❁ اور "حدرجم" کے بارے میں ان کی رائے کی بنا پر تو راقم نے ۱۹۸۲ء میں ان کی جملہ تصانیف کا حق اشاعت بھی انہیں واپس کر دیا تھا اور ان سے اپنے تعلق کے کامل انقطاع کا اعلانِ عام بھی کر دیا تھا' (شائع شدہ "حکمت قرآن" بابت جولائی و اگست ۱۹۸۲ء)

❁ تاہم...... راقم کو یہ اندیشہ نہیں تھا کہ مولانا کی اس غلطی کی بنیاد پر کوئی فتنہ کھڑا ہو سکتا ہے۔

❁ لیکن...... متذکرہ بالا نوجوان کے طرزِ عمل سے راقم کو یہ تنبّہ ہوا کہ ایک عظیم فتنہ شروع ہوا چاہتا ہے جس کی سرکوبی "گربہ کشتن روزِ اوّل" کے مصداق ابتدا ہی میں لازمی ہے۔

❁ چنانچہ راقم نے اپنی بساط کی حد تک اس کی کوشش کی۔

❁ اور الحمدللہ کہ اس کے خاطر خواہ نتائج بھی برآمد ہوئے۔

(اس معاملے میں راقم کے احساسات کا اندازہ اس سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ اس نوجوان کے ساتھ ربط ضبط بڑھانے اور اس کے ساتھ ایک تنظیمی سلسلے میں منسلک ہو جانے کی بنا پر راقم نے اپنے ایک دیرینہ سرپرست اور تنظیم اسلامی کے حلقۂ مستشارین میں شامل شخصیت مولانا سید وصی مظہر ندوی سے بھی قطع تعلق کر لیا۔)

❁ اس کے ساتھ ہی راقم کو یہ احساس بھی ہوا کہ ماضی قریب میں قرآن کے نام پر اٹھنے والی تحریکوں سے اسی طرح فتنے جنم لیتے رہے ہیں۔

❁ اور غالباً یہی سبب ہے کہ ع "سنگ اٹھایا تھا کہ سر یاد آیا!"...... کے مصداق علماء کرام خدمت دین کی نئی تحریکوں اور بالخصوص قرآن کے نام پر اٹھنے والی دعوتوں کے بارے میں "اندیشہ ہائے دور و دراز" میں مبتلا ہو جاتے ہیں!

❁ اس ضمن میں یہ عملی مسئلہ بھی راقم کے سامنے آن کھڑا ہوا کہ اس صورتِ حال کا سدّ باب کیسے کیا جا سکتا ہے........... اور

❁ خود راقم الحروف اور اس کی دعوت و تحریک کو اس انجامِ بد سے بچنے کے لیے کیا اقدامات کرنے چاہئیں اور کون سی احتیاطیں ملحوظ رکھنی چاہئیں؟

❁ چنانچہ رمضان المبارک ۱۴۰۴ھ کے جمعۃ الوداع میں راقم نے اس موضوع پر ایک مفصل تقریر کی جو "میثاق" بابت ستمبر ۱۹۸۴ء میں شائع ہوئی۔

❁ اس پر جہاں بعض اکابر کا بحیثیت مجموعی موافق و تائیدی ردّ عمل سامنے آیا' جیسے:

❁ ....مولانا سعید احمد اکبر آبادی مرحوم و مغفور' سابق صدر شعبۂ معارف اسلامیہ' مسلم یونیورسٹی علی گڑھ' و سابق صدر شیخ الہندؒ اکیڈمی' دیوبند

❁ ....مولانا اخلاق حسین قاسمی مدظلہ' مہتمم و شیخ التفسیر' جامعہ رحیمیہ' دہلی...... اور

❁ ....مولانا سید حامد میاں مدظلہ' مہتمم و شیخ الحدیث' جامعہ مدنیہ' لاہور

❁ وہاں معاصر "الخیر" ملتان اور "بیّنات" کراچی نے مخالفانہ مہم بھی شروع کر دی' جس پر ردّ و قدح اور قال و اقول کا سلسلہ شروع ہو گیا۔

❁ جو ان حضرات کی جانب سے تو تا حال جاری ہے' البتہ راقم نے ۸۵۔۱۹۸۴ء میں ضروری وضاحتوں کے بعد اپنی جانب سے بحث منقطع کر دی تھی۔

❁ تاہم...... اب لگ بھگ دو سال بعد اس "مقدمہ" کا پورا ریکارڈ علماء کرام' بالخصوص منتسبینِ حضرت شیخ الہندؒ کی خدمت میں فوری حوالے کے لیے یکجا صورت میں حاضر ہے

❁ تا کہ............ وہ احقاقِ حق اور ابطالِ باطل کا فریضہ علیٰ وجہ البصیرت ادا فرما سکیں...... اور

❁ اگرچہ ہمیں شدت کے ساتھ احساس ہے کہ علماءِ حق اس کے محتاج نہیں'

❁ تاہم "کَلَّا اِنَّهَا تَذْکِرَةٌ" کے مصداق اس گزارش میں مضائقہ بھی نہیں' کہ وہ...... تنظیم اسلامی...... اور اس کے داعی و مؤسس کے بارے میں رائے قائم فرماتے ہوئے حسبِ ذیل قرآنی ہدایات کو ملحوظ خاطر رکھیں:

❁ ﴿وَاِذَا قُلْتُمْ فَاعْدِلُوْا﴾

❁ ﴿كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ بِالْقِسْطِ شُهَدَآءَ لِلّٰهِ وَلَوْ عَلٰٓى اَنْفُسِكُمْ اَوِ الْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ﴾
﴿كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ لِلّٰهِ شُهَدَآءَ بِالْقِسْطِ وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓى اَلَّا تَعْدِلُوْا اِعْدِلُوْا هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى﴾

—— (۲) ——

❁ "تنظیم اسلامی" کی تأسیس بالفعل تو مارچ ۱۹۷۵ء میں ہوئی تھی۔

❁ لیکن اس کے قیام کے فیصلے کا اعلان راقم الحروف نے جولائی ۱۹۷۴ء میں مسلم ہائی اسکول لاہور میں منعقدہ اکیس روزہ قرآنی تربیت گاہ کے آخری دن اپنی اختتامی تقریر

میں کیا تھا۔ (یہ تقریر اب ''عزمِ تنظیم'' کے نام سے طبع ہوتی ہے!)

- یادش بخیر' اس تربیت گاہ کی افتتاحی تقریب کے مہمانِ خصوصی شیخ التفسیر مولانا احمد علی لاہوریؒ کے فرزند ارجمند وخلف الرشید مولانا عبید اللہ انورؒ تھے۔

......(اس تقریب کا یہ واقعہ بھی ریکارڈ پر آ جائے تو اچھا ہے کہ جب راقم نے اپنے استقبالی سپاس نامے میں مولانا موصوفؒ سے بصد ادب واحترام یہ شکوہ کیا کہ ان کے برادر بزرگ مولانا حبیب اللہؒ کے حجاز ہجرت کر جانے اور برادر خورد مولانا حمید اللہؒ کے انتقال فرما جانے کے بعد سے جامع مسجد شیرانوالہ میں درس قرآن کا سلسلہ بند ہے تو انہوں نے پورے کھلے دل کے ساتھ اور نہایت برملا الفاظ میں اعترافِ تقصیر فرمایا اور خود راقم الحروف کے بارے میں اقبال کا یہ مصرعہ پڑھتے ہوئے کہ ع ''پاسباں مل گئے کعبے کو صنم خانے سے'' اس اطمینان کا اظہار فرمایا کہ بحمد اللہ خدمت قرآن کا یہ سلسلہ جاری ہے اور جاری رہے گا۔)

- باز آمدم برسر مطلب ......اس کے بعد 'میثاق' کی اکتوبر' نومبر ۱۹۷۴ء کی مشترک اشاعت میں راقم کی ایک طویل تحریر شائع ہوئی جس کا اصل مقصد یہ تھا کہ ''تنظیم اسلامی'' کے عنوان سے دین کی جس خدمت کا بیڑا اٹھانا مقصود ہے امتِ مسلمہ کی چودہ سو سالہ تاریخ کے پس منظر اور معاصر دینی تحریکوں اور تنظیموں کے تناظر میں اس کا موقف و مقام کیا ہے۔ (یہ تحریر بھی اب ''تنظیم اسلامی کا تاریخی پس منظر'' کے نام سے طبع ہوتی ہے۔)
- چنانچہ اپنی اس تحریر میں راقم نے امت مسلمہ کی چودہ سو سالہ تاریخ کے دوران عروج اور زوال کے مختلف ادوار کا مختصر جائزہ بھی پیش کیا......
- اور ''موجودہ ہمہ جہتی احیائی عمل'' اور اس میں شامل تحریکوں اور تنظیموں کے بارے میں اپنی رائے بھی پیش کی۔
- راقم کے نزدیک اس ''ہمہ جہتی احیائی عمل'' کے تین نمایاں منفرد اور ممتاز گوشے ہیں:
- ....ایک: خالص قومی وملی تحریکیں جن کا اصل موضوع ہے جہادِ حریت واستخلاصِ دیارِ مسلمین' یعنی مسلم ممالک کی سیاسی غلامی کا خاتمہ اور آزادی کا حصول۔
- ....دوسرے: علماءِ کرام کی مساعی جن کا اصل ہدف ہے تصحیح عقائد و اعمال' تعلیم کتاب وسنت' حفاظت دین وشریعت......اور باطل فرقوں کا ابطال اور جدید فتنوں کا استیصال۔
- ....تیسرے: مثبت احیائی وتجدیدی مساعی جن کا معین مقصود ہے اسلام کی نشأۃِ ثانیہ اور غلبۂ دینِ حق' یا بالفاظ دیگر اللہ کی زمین پر اللہ کی حکومت کا قیام!

- اور یہ تینوں گوشے مل جل کر' اور یہ جملہ مساعی بحیثیت مجموعی تسلسل ہیں اُمتِ محمد ﷺ کی تاریخ کے ''الفِ ثانی'' (یعنی دوسرے ہزار سال) کی تجدیدی مساعی کے سنہری سلسلے کا!
- راقم کے نزدیک' برِعظیم پاک و ہند کی بیسویں صدی عیسوی کی مسلمان تحریکوں میں سے ''تحریک پاکستان'' گوشۂ اوّل سے تعلق رکھتی ہے' جبکہ علماءِ کرام کی جملہ جمعیتیں اور ادارے اور بالخصوص تبلیغی جماعت کا تعلق دوسرے گوشے سے ہے' جبکہ تیسرے سلسلے کے داعیٔ اوّل کی حیثیت مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم ومغفور کو حاصل ہے!

.... ۞ ....

- ''الف ثانی'' کے تجدیدی کارنامے کا نقطۂ آغاز اور گیارہویں صدی ہجری کے مجدّدِ اعظم تو بلا شک وشبہ شیخ احمد سرہندیؒ ہیں......لیکن ان کے ہم عصر شیخ عبد الحق محدث دہلویؒ کی علمی خدمات بھی یقیناً قابل تحسین ہیں۔
- اسی طرح بارہویں صدی ہجری کے مجدّدِ اعظم تو بلا شائبہ ریب و شک امام الہند شاہ ولی اللہ دہلویؒ ہیں لیکن شیخِ نجد محمد ابن عبد الوہابؒ کی اصلاحی کوششیں بھی یقیناً قابلِ تعریف ہیں۔
- اسی طرح تیرہویں صدی ہجری کے اصل مجدّد تو مجاہد کبیر سید احمد بریلویؒ ہیں' تاہم ان کے نائب ومعاون شاہ اسماعیل شہیدؒ بھی ان کے ساتھ برابر کے شریک اور سہیم ہیں!
- چودھویں صدی ہجری کے بارے میں راقم کا یہ گمان رفتہ رفتہ یقین کے درجے تک پہنچ گیا ہے کہ اس کے مجدّدِ اعظم حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندیؒ ہیں......(اگرچہ بعض دوسرے اصحاب دعوت وعزیمت کے علاوہ ایک ع 'برہمن زادۂ رمز آشنائے روم وتبریز است'' کی سچی تصویر اور ع ''اگرچہ سر نہ تراشد قلندری داند'' کا مصداقِ اتمّ اور ڈاڑھی منڈا عاشق احمد مرسل ﷺ و پروانۂ احمد سرہندیؒ یعنی علامہ اقبال مرحوم ومغفور کی مساعی بھی حد درجہ دُور رس اور از بس نتیجہ خیز ہیں!)

.... ۞ ....

- عجیب بات ہے کہ اپنے انتقال کے قریب حضرت شیخ الہندؒ نے ''خرقۂ خلافت'' عطا

فرما دیا ایک ایسے شخص کو جو نہ صرف یہ کہ نہ ان کے تلامذہ میں سے تھا' نہ حلقہ دیوبند سے تعلق رکھتا تھا' بلکہ علماء کے دیگر معروف حلقوں اور سلسلوں میں سے بھی کسی سے منسلک نہ تھا......

❁ حتیٰ کہ علماء کی سی وضع قطع بھی نہ رکھتا تھا' بلکہ بقول خود ''گلیم زہد اور ردائے رندی'' دونوں کو بیک وقت زیب تن کرنے کے ''جرم'' کا مرتکب تھا............

اور عجیب اتفاق ہے کہ اس کا نام بھی احمد ہی تھا' اگرچہ وہ مشہور یا اپنی کنیت سے ہوا یا تخلص سے' یعنی ''ابوالکلام آزاد''

❁ **یہ ہمارے ماضیٔ قریب کی تاریخ کا نہایت اہم واقعہ ہے جس پر معاصرانہ چشمک نے انتہائی دبیز پردہ ڈال دیا ہے!**

❁ لیکن ؎

''سرِّ خدا کہ عارف و سالک بہ کس نہ گفت
در حیرتم کہ بادہ فروش از کجا شنید!''

کے مصداق اس ''راز'' کی بھنک پروفیسر یوسف سلیم چشتی مرحوم ومغفور کی زبانی راقم الحروف کے کان میں پڑ گئی۔

❁ اگرچہ ان کی بیان کردہ روایت میں زمانی ومکانی ہر نوع کے سقم تھے'

❁ تاہم یہی سقم تحقیق وتفتیش کا سبب بن گئے۔

❁ اور اس طرح مسلم انڈیا کی ماضیٔ قریب کی تاریخ کا ایک اہم لیکن گم شدہ باب روشنی میں آ گیا۔

❁ اور اس تحقیق وتفتیش کے اضافی ثمرے کے طور پر' راقم الحروف پر حضرت شیخ الہندؒ کی عظمت بہ تمام وکمال منکشف ہو گئی۔

❁ **فَلِلّٰہِ الحمد!**

❁ بہرحال اب اس بات کے سامنے آ جانے کے بعد ہر اس شخص پر جو حضرت شیخ الہندؒ سے کسی بھی درجہ میں قلبی تعلق یا نسبت عقیدت رکھتا ہو' لازم ہے کہ وہ:

......اولاً اس واقعہ کی اپنے طور پر مزید تحقیق کرے' اور اگر اسے درست پائے تو

❁ ....پھر: غور کرے کہ اس کے کیا نتائج برآمد ہوتے ہیں؟ ان شاء اللہ العزیز' اس

سے اس کے فکر ونظر کو جلا اور قلب وذہن کو وسعت حاصل ہو گی اور امتِ مسلمہ بالخصوص مسلمانانِ برعظیم پاک وہند کے موجودہ ظروف واحوال اور ان کے تاریخی پس منظر کے بارے میں گہری بصیرت حاصل ہو جائے گی۔

............❁............

❁ مولانا ابوالکلام آزاد کا سن پیدائش ۱۸۸۸ء ہے۔

❁ ۱۹۱۲ء میں چوبیس برس کی عمر میں انہوں نے ''الہلال'' جاری کیا۔

❁ ''الہلال'' کے مضامین کا نقطہ ماسکہ' جسے اس کی علامت وعنوان قرار دیا جا سکتا ہے ''دعوت رجوع الی القرآن'' تھا!

❁ اس کی دعوت کا دوسرا اہم نکتہ تھا جہاد وقتال فی سبیل اللہ......اور اس کی تمہید کے طور پر ''امر بالمعروف ونہی عن المنکر''!

❁ ابوالکلام کی اس دعوت کی توثیق وتصویب اور تعریف وتحسین حضرت شیخ الہندؒ نے ان الفاظ کے ذریعے فرمائی کہ ''اس نوجوان نے ہمیں ہمارا بھولا ہوا سبق یاد دلا دیا ہے!''
(راقم الحروف کو حضرت شیخ الہندؒ کے اس مشہور قول کی سند مولانا محمد یوسف بنوریؒ سے بالمشافہہ حاصل ہو گئی تھی!)

❁ ۱۹۱۳ء میں مولانا آزاد نے ایک جانب قرآن کے مبلّغ ومعلّم تیار کرنے کے لیے کلکتہ میں ''دارالارشاد'' قائم کیا' اور دوسری جانب اقامت دین اور اعلاءِ کلمۃ اللہ کے لیے ''حزب اللہ'' قائم کی جس کی اساس ''بیعت'' پر استوار کی!

❁ ۱۹۱۵ء میں انہوں نے خود (گویا اپنے جملہ مبایعین سمیت) حضرت شیخ الہندؒ سے بیعت کر لی! (اس بات کی تردید متعدد حضرات کی جانب سے ہوئی' اور اب خود مجھے بھی یاد نہیں آ رہا ہے کہ یہ میں نے کہاں پڑھا تھا!)

❁ اور مولانا سعید احمد اکبر آبادی مرحوم کے قول کے مطابق اسی سال حضرت شیخ الہندؒ نے ان کے بارے میں اپنے جذبات اس شعر کے ذریعے ظاہر فرمائے کہ ؎

کامل اس طبقہ زہاد سے اٹھا نہ کوئی
کچھ ہوئے تو یہی رندانِ قدح خوار ہوئے!

❁ مولانا موصوف پیدائشی طور پر حد درجہ ذہین وفطین بلکہ نابغۂ عصر تو تھے ہی'

❁ اس پر مستزاد' انہیں متعدد مسلمان ممالک کے حالات کا بچشم سر مشاہدہ کرنے کا موقع

ملا تھا۔

- مزید برآں‘ انہوں نے مغربی فکر و فلسفہ...... اور خاص طور پر سیاسیات و عمرانیاتِ جدیدہ کا بھی گہرا مطالعہ کیا تھا۔
- چنانچہ انہیں خوب معلوم تھا کہ
- .... فی الوقت برعظیم پاک و ہند میں کسی عسکری تحریک کا کوئی امکان نہیں!
- .... کسی دوسرے مسلمان ملک سے مدد کا بھی کوئی سوال نہیں‘ گویا اب کوئی احمد شاہ ابدالی مسلمانانِ ہند کی مدد کے لیے نہیں آ سکتا!
- .... بلکہ اب ’’استخلاصِ وطن‘‘ کی جدوجہد ہو یا غلبۂ اسلام اور اقامتِ دین کی سعی‘ تمام کام خالص مقامی لیکن عوامی تحریکوں کے ذریعے ہی ہوسکیں گے!
- لہٰذا‘ ان کا مشورہ یہ تھا کہ حضرت شیخ الہندؒ ہندوستان ہی میں رہ کر عوامی تحریک برپا کریں۔
- لیکن افسوس کہ اُس وقت حضرت شیخ الہندؒ نے اپنے ان مشیروں کی رائے پر عمل کیا جو دینی علم میں تو بہت دسترس رکھتے تھے لیکن ان کا ہاتھ حالاتِ جدیدہ کی نبض پر نہ تھا!
- اور اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ:
- اُدھر بیرونِ ہند نام نہاد مسلمان امراء و سلاطین نے غداری کی اور ایک طرف شریف حسین والیٔ مکہ نے حضرت شیخ الہندؒ کو گرفتار کر کے گویا چاندی کی طشتری میں سجا کر انگریزوں کے سامنے پیش کر دیا‘ جنہوں نے انہیں ہندوستان کی کسی جیل میں نہیں بلکہ مالٹا میں نظر بند کیا!

............(راقم کے نزدیک علامہ اقبال مرحوم کا یہ شعر بہ تمام و کمال صادق آتا ہے حضرت شیخ الہندؒ کی مالٹا کی اسیری پر کہ ؎

اقبال کے نفس سے ہے لالے کی آگ تیز
ایسے غزل سرا کو چمن سے نکال دو!

- یہی سلوک افغانستان میں امیر کابل کے ہاتھوں حضرت شیخ الہندؒ کے سفیر اور معتمد خصوصی مولانا عبید اللہ سندھی مرحوم کے ساتھ ہونے والا تھا کہ انہیں بروقت اطلاع مل گئی اور وہ روس کی جانب فرار ہو گئے!
- اِدھر اندرونِ ملک ریشمی رومالوں کے راز کے افشا پر علماء کرام اور خادمانِ دین متین نے تو ع ’’من از سر نو جلوہ دہم دار و رسن را!‘‘ کے مصداق پکڑ دھکڑ‘ قید و بند اور تعذیب و

ابتلا کے نئے باب رقم کیے۔ لیکن چونکہ ملک میں کوئی عوامی تحریک موجود نہ تھی‘ لہٰذا نہ زمین پر کوئی ہلچل برپا ہوئی‘ نہ فضا میں کوئی ارتعاش پیدا ہوا!

- ۱۹۲۰ء میں حضرت شیخ الہندؒ اسیری سے رہائی پا کر وارد ہند ہوئے تو انہوں نے کمالِ ضعف و نقاہت اور شدتِ مرض و علالت کے باوجود چھ ماہ کے مختصر سے عرصے میں تین اہم کام سرانجام دیے:
- .... ایک: اپنے تلامذہ اور مسترشدین کو ہدایت کہ اپنی تمام تر توجہات کو خدمتِ قرآن پر مرکوز کر دیں...... جس کا مظہر اتم آپؒ کا خطبۂ دیوبند ہے! (بروایت حضرت مولانا مفتی محمد شفیعؒ)
- .... دوسرے: قدیم اور جدید تعلیم...... اور قومی و ملی اور دینی و مذہبی تحریکوں کے مابین فصل و بُعد کو کم کرنے کی کوشش...... جس کا سب سے بڑا مظہر آپؒ کا سفر علی گڑھ اور تاسیس جامعہ ملّیہ ہے!
- تیسرے: علم جہاد بلند کرنے کے لیے ایک عوامی تحریک کے آغاز کے لیے کسی صاحب دعوت و عزیمت اور حامل فہم و بصیرت بالخصوص موجودہ زمانے کے سیاسی و عمرانی ظروف و احوال سے کما حقہ‘ واقف شخص کے ہاتھ پر بیعت کی تجویز اور اس کے لیے مولانا ابوالکلام آزاد کی تعیین!...... جس کے ضمن میں حضرت شیخ الہندؒ کے اضطرار و اصرار کا مظہر ان کا یہ قول ہے کہ ’’میری چارپائی سٹیج پر لے جائی جائے تا کہ میں خود بیعت کر لوں‘ اس لیے کہ میں دنیا سے بغیر بیعت کیے رخصت ہونا نہیں چاہتا‘‘ (روایت بالمعنی)
- تو............ اگرچہ اصلاً مشیت خداوندی اور ظاہراً بعض علماء کی جانب سے فوری طور پر اختلاف اور بعد ازاں باقاعدہ مخالفت کی بنا پر شیخ الہندؒ کی یہ تجویز ناکام ہو گئی۔
- تاہم............ یہ ثابت ہو گیا کہ جہاں علم و فضل اور تقویٰ و تدین کے میدان میں حضرت شیخ الہندؒ کی جانشینی کا شرف حاصل ہے مولانا حسین احمد مدنیؒ‘ مولانا انور شاہ کاشمیریؒ اور مولانا شبیر احمد عثمانیؒ وغیرہم کو...... وہاں دعوت و تحریک کے میدان میں حضرت شیخ الہندؒ کے اصل خلیفۂ مجاز تھے مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم و مغفور!
- جہاں تک مولانا آزاد کی ۲۱۔۱۹۲۰ء کے بعد کی زندگی کا تعلق ہے تو اگرچہ وہ اصلاً راقم کا موضوع نہیں ہے‘

- تاہم دلائل وشواہد سے جو بات ظاہر ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ:
- علماءِ کرام کی عمومی مخالفت......جس کا آغاز تو بعض غیر دیوبندی علماء کی جانب سے ہوا تھا، لیکن بعدازاں اس میں بہت سے دیوبندی علماء حتیٰ کہ حضرت شیخ الہندؒ کے بعض تلامذہ بھی شامل ہوگئے تھے........... سے بددل ہو کر انہوں نے ''بیعت'' کی ٹھیٹھ شرعی اساس پر ایک خالص دینی تحریک کا خیال دل سے نکال دیا۔
- اور اگرچہ اپنی روایتی وضع داری کے تحت انہوں نے جمعیت علماء کے جلسوں میں اکثر و بیشتر خاموش سامع و ناظر کی حیثیت سے شرکت جاری رکھی تاہم اپنے اصل میدانِ عمل کے اعتبار سے انہوں نے:
- اولاً...........تحریک خلافت کے ذریعے ایک ملی جذبہ پیدا کرنے کی کوشش کی۔
- اور اس کے بعد مستقل طور پر جہادِ حریت واستخلاصِ وطن کو اپنا اصل موضوع بنا کر انڈین نیشنل کانگرس کے پلیٹ فارم کو اختیار کر لیا۔
- جس پر وہ ع ''وفاداری بشرطِ استواری اصل ایمان ہے!'' کی سی شان کے ساتھ آخر دم تک قائم رہے!

......(اس ضمن میں بطور تحدیث نعمت ایک واقعہ کا ذکر مناسب ہے۔ آج سے لگ بھگ پچیس سال قبل زندگی میں پہلی بار حیدرآباد دکن جانا ہوا تو وہاں درسِ قرآن اور خطاباتِ عام کی بیسیوں مجالس کے علاوہ ایک خطاب مولانا ابوالکلام آزاد انسٹیٹیوٹ میں منعقدہ جلسے میں بھی ہوا، جس میں وہاں کے احباب کے بقول حیدرآباد کے تمام مسلمان اربابِ فکر ونظر اور اصحابِ علم و دانش جمع تھے۔ اس موقع پر جب راقم نے یہ نکتہ بیان کیا کہ ''مولانا آزاد مرحوم کی زندگی کے دو دور بالکل مختلف اور متمائز تھے۔ ایک ۱۹۱۲ء سے ۲۱-۱۹۲۰ء تک کا دور جو اصلاً تسلسل تھا تحریک شہیدینؒ کا...... اور دوسرا ۱۹۲۱ء کے بعد کا دور جو حقیقتاً تعلق رکھتا تھا ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی سے!'' تو ایک جانب تو صدر جلسہ نے جو پرانے کانگریسی رہنما اور تحریک آزادی کے صف اوّل کے کارکنوں میں سے تھے، اور آزادی کے بعد بھارت کے متعدد صوبوں کے گورنر رہ چکے تھے اور اب ضعیف ونحیف ہی نہیں علیل و صاحبِ فراش بھی تھے، بڑے رقت آمیز انداز اور بھرائی ہوئی آواز میں فرمایا: ''مولانا! آپ نے تو بہت سی پرانی یادیں تازہ کر دیں اور پرانے زخموں کو ہرا کر دیا!''...... اور دوسری جانب ایک صاحب نے جو عثمانیہ یونیورسٹی کے شعبہ سیاسیات کی

صدارت سے ریٹائر ہوئے تھے، فرمایا کہ ''میں نے درجنوں طلبہ کو تحریک آزادیٔ ہند کے مختلف گوشوں اور بالخصوص مولانا ابوالکلام آزاد کی شخصیت و سیاست کے موضوع پر پی ایچ ڈی کرادی، لیکن واقعہ یہ ہے کہ خود مجھے مولانا مرحوم کی سیرت و شخصیت کا جو فہم آج حاصل ہوا ہے، وہ اس سے قبل نہ تھا!'')

............۞............

- جس طرح بارہویں صدی ہجری کے مجدّدِ اعظم شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی عظمت وجلالت اور خصوصاً جامعیت کبریٰ کا مظہر ان کی تصانیف ہیں،
- اسی طرح چودھویں صدی کے مجدد شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ کی عظمت و جامعیت کے مظہر کامل ان کے عظیم تلامذہ ہیں۔
- اگر شیخ الہندؒ کی تجویز کامیاب ہو جاتی تو کم از کم اس ''جماعت شیخ الہندؒ'' کا شیرازہ قائم رہتا اور اب اس کا اندازہ بصد حسرت و یاس ہی کیا جا سکتا ہے کہ اس صورت میں اس جماعت کی قوت وشوکت کس قدر ہوتی!
- لیکن افسوس کہ حضرت شیخ الہندؒ کی تجویز کی ناکامی کے باعث ان کے انتقال کے بعد رفتہ رفتہ یہ شیرازہ بکھرتا چلا گیا۔
- تاہم...........جس طرح امام الہندؒ کو یہ کشف ہوا تھا کہ ''میں قائم بالزماں ہوں اور اللہ تعالیٰ جس خیر کا ارادہ فرماتا ہے، اس کے لیے مجھے بطور آلہ استعمال فرماتا ہے''
- بالکل اسی طرح......واقعہ یہ ہے کہ شیخ الہندؒ کے بعد کم از کم برعظیم پاک و ہند کی حد تک جو خیر بھی ظاہر ہوا، اس میں ان کے تلامذہ کا حصہ نمایاں نظر آتا ہے۔
- چنانچہ:
- ....خالص جہادِ حریت واستخلاصِ وطن کے میدان میں انڈین نیشنل کانگرس کے پلیٹ فارم سے مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم اور جمعیت علماء ہند کے پلیٹ فارم سے مولانا حسین احمد مدنیؒ اور بے شمار علماءِ کرام نے جو کردار ادا کیا وہ نہایت تابناک ہے۔

(اگرچہ بعد میں کانگرس اور مسلم لیگ کے سیاسی تصادم اور مسلم انڈیا کے مستقبل کے بارے میں اختلافِ رائے اور اس کے ضمن میں پیدا ہونے والی تلخی نے ان حضرات کے کردار کی عظمت کو مسلمانانِ ہند کی عظیم اکثریت کی نگاہوں سے اوجھل کر دیا اور وہ متنازعہ شخصیتوں کی حیثیت اختیار کرتے چلے گئے۔)

- اسی طرح مسلمانانِ ہند کی قومی تحریک اور اس کے نتیجے میں پاکستان کے قیام کے ضمن میں نہایت عظیم اور فیصلہ کن خدمات سرانجام دیں حضرت شیخ الہندؒ کے دوسرے معتمد علیہ رفیق اور شاگرد علامہ شبیر احمد عثمانیؒ اور ان کے رفقاء نے، جن کے ذریعے جماعت شیخ الہندؒ کا پیوند تحریک پاکستان میں لگ گیا۔

...........(اس ضمن میں اس حقیقتِ واقعی کا استحضار بہت اہم ہے کہ حضرت شیخ الہندؒ نے اپنی زندگی ہی میں اپنی ملی مساعی کے سلسلے میں اپنا دستِ راست مولانا عثمانیؒ کو بنا دیا تھا۔ چنانچہ شیخ الہندؒ کا خطبہ علی گڑھ بھی ان کے حسب منشا مولانا عثمانیؒ ہی نے تحریر کیا تھا، اور جمعیت علماء ہند کے اجلاس دہلی، منعقدہ نومبر ۱۹۲۰ء کا خطبۂ صدارت بھی ان کے زیر ہدایت انہی نے لکھا بھی تھا اور ان کے نمائندے کی حیثیت سے پڑھ کر سنایا بھی تھا!)

- ....اسی طرح خالص علمی خدمات کے میدان میں کارہائے نمایاں سرانجام دیے بیہقیٔ وقت مولانا سید انور شاہ کاشمیریؒ اور ان کے تلامذہ نے، جن کی ایک تابناک مثال مولانا سید محمد یوسف بنوریؒ تھے!
- ....رہے مولانا عبید اللہ سندھی مرحوم تو وہ خود تو ریشمی رومالوں کی تحریک کی ناکامی کے بعد طویل عرصے تک جلا وطن رہے، تاہم ان کے دو شاگردوں یعنی مولانا عبدالحی فاروقیؒ اور مولانا احمد علی لاہوریؒ نے ارضِ لاہور میں "قرآن کی انقلابی دعوت" کے شجرۂ طیبہ کی تخم ریزی اور آبیاری کے ضمن میں نمایاں کردار ادا کیا۔

(چنانچہ لاہور میں راقم کی دعوتِ قرآنی کو جو پذیرائی حاصل ہوئی اس کا ایک اہم سبب یہ بھی ہے کہ یہاں کی فضا میں خواجہ عبدالحی فاروقیؒ اور مولانا احمد علی لاہوریؒ کے دروسِ قرآن کے اثرات موجود تھے...... اور اگرچہ راقم نے خواجہ صاحب کو تو دیکھا تک نہیں، حضرت لاہوریؒ کی زیارت بھی صرف ایک بار ہوئی اور کسی قریبی رابطے کی سعادت حاصل نہیں ہوئی، تاہم راقم کا گمان غالب ہے کہ اگر اسے نہیں تو اس کی قرآنی تحریک کو بلاشائبہ ریب و شک ان دونوں بزرگوں سے نسبت اویسیؒ حاصل ہے...........اس کے دو مظاہر بھی قابل ذکر ہیں:

ایک یہ کہ جامع مسجد خضراء سمن آباد، جس میں راقم کی دعوتِ قرآنی کا پودا ابتداءً پروان چڑھا اور جہاں لگ بھگ دس سال تک اس دعوت کا غلغلہ پوری شدت کے ساتھ بلند ہوتا رہا اور ذرائع آمد و رفت کی شدید دشواریوں کے باوجود لاہور کے کونے کونے سے لوگ وہاں پہنچتے رہے...... اس کے بارے میں ایک عرصے کے بعد راقم کو معلوم ہوا کہ اس کا سنگ بنیاد مولانا احمد علی لاہوریؒ کے دستِ مبارک کا رکھا ہوا تھا!

دوسرے یہ کہ جب لگ بھگ ستر برس کی عمر کے ایک بزرگ نے میرے تین چار دروس ہی میں شرکت کے بعد ایک روز اچانک میرا ہاتھ کھینچ کر اور اس پر اپنا ہاتھ رکھتے ہوئے یہ الفاظ کہے کہ "میں اقامتِ دین اور اعلاءِ کلمۃ اللہ کی جدوجہد کے لیے آپ کے ہاتھ پر بیعت کرتا ہوں!" تو فوری طور پر تو میں حیران و ششدر رہ گیا، اس لیے کہ اس وقت تک میں نے تنظیم اسلامی کے قیام کا فیصلہ بھی نہیں کیا تھا، کجا یہ کہ بیعت کا خیال دل میں آتا...... لیکن بعد میں جب یہ معلوم ہوا کہ انہوں نے اپنی نوجوانی میں خواجہ عبدالحی فاروقیؒ کے دروس سنے تھے، بعد ازاں حضرت لاہوریؒ سے نہ صرف دورۂ تفسیر قرآن بلکہ سلوک کی بھی تکمیل کی تھی، تو حیرت ختم ہو گئی اور یہ احساس ہوا کہ ع "پہنچی وہیں پہ خاک جہاں کا خمیر تھا!" یہ بزرگ تھے حاجی عبدالواحد مرحوم و مغفور۔ ان کے انتقال پر جو نوٹ "میثاق" میں شائع ہوا تھا، وہ بھی اس کتاب میں شامل کیا جا رہا ہے۔)

.... ❁ ....

- اسلام کی نشأۃِ ثانیہ کی مثبت دعوت...... اور دین حق کے غلبہ و اقامت کی راست تحریک کے میدان میں جو خلا مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم کی بددلی اور پسپائی کے باعث پیدا ہوا تھا اسے قدرت نے مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی مرحوم و مغفور کے ذریعے پُر کرایا۔
- جنہوں نے مولانا آزاد مرحوم کے انتقالِ موقف کے لگ بھگ نو دس سال بعد ہی اپنی دعوت و تحریک کے لیے ابتدائی اور تمہیدی کام شروع کر دیا۔ اور "حزب اللہ" کے خاتمے کے تقریباً بیس سال بعد "جماعت اسلامی" کے نام سے ایک نیا قافلہ تشکیل دیا!
- وہ اگرچہ...... نہ براہِ راست حضرت شیخ الہندؒ کے تلمیذ یا مسترشد تھے، نہ باضابطہ طور پر کبھی مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم سے منسلک رہے تھے،
- تاہم حقیقت وہی ہے جو مولانا اخلاق حسین قاسمی مدظلہ نے بیان فرمائی کہ وہ تھے علماءِ دیوبند ہی کے تربیت یافتہ۔ اس لیے ان کی صحافتی زندگی کی ابتدا اور تصنیف و تالیف کے شغل کا آغاز جمعیت علماءِ ہند کے آرگن روزنامہ "**الجمعیة**" ہی کی ادارت سے وابستگی کی صورت میں ہوا تھا۔
- اس کے ساتھ ساتھ وہ "الہلال" اور "البلاغ" والے ابوالکلام کی دعوت سے بے حد

متأثر تھے، اور انہوں نے ان کے قرآنی فکر اور جہاد فی سبیل اللہ سے متعلق نظریات سے بھرپور استفادہ کیا تھا۔

............(اس سلسلے میں اگرچہ یہ بات تو نہایت افسوس ناک ہے کہ خود انہوں نے کبھی اس حقیقت کا برملا اعتراف نہیں کیا...... تاہم دو مواقع پر غالباً کسی کیف کے عالم میں جو الفاظ ان کے قلم سے ٹپک گئے ان سے یہ حقیقت پوری طرح آشکار ہو جاتی ہے، یعنی ایک...... وہ الفاظ جن کے ذریعے انہوں نے یہ اعتراف کیا کہ اس دور میں جس شخص سے اسلام کی نشأۃ ثانیہ کی سب سے زیادہ امیدیں وابستہ تھیں وہ مولانا آزاد تھے، اور

دوسرے.......... اس سے کہ انہوں نے مولانا آزاد کو ان کی زندگی ہی میں ''مرحوم'' قرار دیا، جس سے بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے کہ مولانا آزاد کی ۱۹۱۲ء سے ۱۹۲۰ء تک کی دعوت اور تحریک کے ساتھ ان کی فکری اور جذباتی وابستگی کس درجہ کی تھی اور اس سے ان کی پسپائی کا انہیں کس قدر صدمہ ہوا تھا!)

❁ راقم کے نزدیک مولانا مودودی مرحوم کی سب سے بڑی کمزوری ان کی ''انتہا پسندی'' تھی، جس نے ایک مختصر سے دور کے سوا، ان کی پوری زندگی کو ''تضادات'' کا مرقع اور رجعتوں کی داستان بنا کر رکھ دیا............ اور بالآخر یہی انتہا پسندی ان کی ناکامی کا اصل سبب بنی!

❁ اگرچہ فوری نتائج کے اعتبار سے یہی ان کی سب سے بڑی ''خوبی'' اور ابتدائی کامیابیوں کا ''راز'' بن گئی...... اس لیے کہ جو کوئی ایک بار ان کا گرویدہ ہوا وہ قطعی اور مستقل طور پر بقیہ تمام اکابر امت سے ذہناً وقلباً منقطع اور دوسری تمام دینی تحریکوں اور تنظیموں سے کلیۃً بیزار ہو کر رہ گیا......

❁ اور اس طرح ''جماعت بندی'' کا کٹھن مرحلہ آسان ہو گیا!

❁ ان کی اس ''انتہا پسندی'' کا اوّلین مظہر یہ تھا کہ انہوں نے ''متحدہ قومیت'' کو نہایت شدّ ومد کے ساتھ ''کفر'' قرار دیا...... اور کانگرسی مسلمانوں اور جمعیت علماء ہند اور اس کی قیادت پر نہایت جارحانہ ہی نہیں حد درجہ دل آزار تنقیدیں کیں۔

❁ اس سے یہ تو ضرور ہوا کہ...... ایک جانب، مسلمانانِ ہند کی قومی تحریک کو تقویت حاصل ہوئی اور...... دوسری جانب، خود انہیں نہایت وسیع حلقے میں پذیرائی نصیب ہوئی۔

❁ لیکن جمعیت علماء ہند سے وابستہ علماء کرام اور خاص طور پر مولانا حسین احمد مدنیؒ کے عقیدت مندوں کا اکثر وبیشتر حلقہ ان سے شدید بیزار ہو گیا۔

❁ اور دُوررس نتائج اور دیرپا عواقب کے اعتبار سے یہی چیز ان کے قدموں کی زنجیر اور ان کی ناکامی کا سب سے بڑا سبب بن گئی!

❁ اس کے کچھ ہی عرصے بعد...... انہوں نے ''مسلم قومیت'' کو بھی ''کفر بواح'' کا ہم پلہ قرار دے دیا اور اس کے ساتھ کسی مفاہمت یا تعاون کو ''گناہِ کبیرہ'' قرار دیتے ہوئے، مسلمانانِ ہند کی قومی تحریک کی منجدھار سے کٹ کر ''جماعت اسلامی'' کے نام سے اپنا ایک علیحدہ قافلہ تشکیل دے لیا، اور

❁ **ایک خالص اصولی، اسلامی انقلابی دعوت وتحریک کی بنیاد رکھ دی۔**

❁ اور ان سطور کا عاجز و ناچیز راقم مولانا مرحوم کی ذاتی وشخصی کوتاہیوں، علمی وفکری لغزشوں، اور پالیسی اور طریق کار کے ضمن میں متعدد فاش غلطیوں سے واقف ومطلع اور ان کا قائل ومعترف ہونے کے باوجود

❁ اور اس کے باوصف کہ ''جماعت اسلامی'' سے اس کی علیحدگی کو تیس سال سے زائد گزر چکے ہیں۔ (اب یہ مدت اکیاون (۵۱) سال ہو چکی ہے۔)

❁ آج بھی اس رائے کا حامل ہے کہ

❁ ۱۹۳۸ء سے ۱۹۴۷ء تک ان کی تحریکِ اسلامی خالص اصولی اور انقلابی طریق کار پر عمل پیرا اور گویا منہاجِ نبوت ورسالت پر قائم اور گامزن رہی!

❁ اور اس طرح اس نے اس دعوت وتحریک کے تسلسل کو جاری رکھا جس کے بیسویں صدی عیسوی کے داعیٔ اوّل تھے ۱۹۱۲ء سے ۱۹۲۰ء تک کے مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم ومغفور!

❁ یہی وجہ ہے کہ متعدد اہم اشخاص جو پہلے مولانا آزاد سے بیعت اور ''حزب اللہ'' میں شریک تھے، جماعت اسلامی میں شامل ہو گئے، جیسے مستری محمد صدیق مرحوم، ملک نصر اللہ خاں عزیز مرحوم اور شیخ قمر الدین مرحوم!

❁ لیکن افسوس کہ اپنے پیش رو کے مانند اس تحریک کا یہ دَورِ ثانی بھی ع ''خوش درخشید ولے شعلۂ مستعجل بود!'' کا مصداقِ کامل ثابت ہوا...... اور

❁ تقسیم ہند اور قیامِ پاکستان کے موقع پر حالات کی ایک ظاہری اور سطحی تبدیلی سے متأثر ہو کر مولانا مودودی نے اپنی مساعی اور جدوجہد کا رُخ ایک قومی وسیاسی تحریک اور انتخابی طریقہ کار کی جانب موڑ دیا۔

❁ اس موضوع پر راقم کو اس وقت زیادہ تفصیل میں جانے کی ضرورت اس لیے نہیں ہے کہ:

❁ ....اولاً اس کی اصل دلچسپی اسلام کی نشأۃِ ثانیہ اور غلبۂ دینِ حق کی اس اصل اصولی و انقلابی تحریک سے ہے جس کے دو منفصل اَدوار کا ذکر اوپر ہوا ہے...... نہ کہ مولانا مودودی کے اس سے ماقبل یا مابعد کے افکار و نظریات یا پالیسی اور حکمت عملی سے!

❁ ....ثانیاً اس اصولی اسلامی انقلابی موقف سے مولانا مودودی کے انحراف یا انقلابِ حال کے موضوع پر راقم کی ایک مفصل تالیف ''تحریکِ جماعتِ اسلامی: ایک تحقیقی مطالعہ'' کے نام سے موجود ہے۔

❁ ورنہ واقعہ یہ ہے کہ مولانا مودودی مرحوم...... اور جماعت اسلامی کی پالیسیوں کے تضادات کی داستان بہت طویل ہے۔

❁ لیکن جیسے کہ اس سے قبل عرض کیا جا چکا ہے، راقم کی اصل دلچسپی ان موضوعات سے نہیں ہے، بلکہ اسے افسوس اور تشویش صرف اس پر ہے کہ

❁ اسلام کی اصولی، انقلابی دعوت اور غلبۂ دینِ حق کی منہاجِ نبوت و رسالت والی تحریک

❁ ع ''اِک دمکتا چراغ تھا، نہ رہا!'' کی مصداق بن گئی۔

❁ **فَوَا حَسْرَتَا و یَااَسَفَا!**

............❁............

❁ اور اسی خلا کو پُر کرنے

❁ اور براہِ راست ''اسلام کی نشأۃِ ثانیہ'' کی دعوت و تحریک اور ''غلبہ و اقامتِ دین'' کی جدوجہد کے تسلسل کو برقرار رکھنے کی کوشش کا مظہر ہے ''تنظیم اسلامی''

❁ جو راقم کی نسبت سے تو یقیناً نہایت حقیر بھی ہے اور بے وقعت بھی

❁ لیکن اپنے ہدف و مقصود اور اپنے تاریخی پس منظر کے اعتبار سے نہایت اہم بھی ہے اور عظیم بھی!

❁ چنانچہ راقم سے واقفیت رکھنے والا ہر شخص جانتا ہے

❁ کہ راقم کی دعوت و تحریک کے بھی دو حصے اور شعبے ہیں:

❁ ....ایک ''دعوت رجوع الی القرآن''......جس کے لیے اَوّلاً ''مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور'' قائم ہوئی اور ''قرآن اکیڈمی'' تعمیر ہوئی (اور پھر ذیلی انجمنوں اور اکیڈمیوں کا سلسلہ شروع ہو گیا)۔

❁ ....دوسرے دینِ حق کے غلبہ و اقامت یا بالفاظ دیگر ''اسلامی انقلاب'' کے لیے حرکت و جہاد، جس کے لیے ''تنظیم اسلامی'' قائم ہوئی اور اس کی تنظیمی اساس ''بیعت جہاد و سمع وطاعت فی المعروف'' پر استوار ہوئی۔

❁ جہاں تک راقم کی دعوتِ قرآنی کا تعلق ہے، اس کے بارے میں کچھ عرض کرنا تحصیل حاصل ہے۔

❁ اس لیے کہ، اگرچہ اس کے ضمن میں تصنیف و تالیف کی مقدار کم رہی، لیکن درس و خطاب اور آڈیو/ ویڈیو کیسٹوں (اور سی ڈیز/ ڈی وی ڈیز کے علاوہ ٹی وی چینلز) کے ذریعے اس کا چرچا دنیا کے کونے کونے میں ہے۔

❁ مزید برآں، لگ بھگ چالیس سالہ مساعی کے نتیجے میں قرآن کے نوجوان داعیوں اور مبلغوں کی ایک ٹیم بھی تیار ہو چکی ہے۔

❁ اور الحمدللہ کہ ان دروس و خطابات کے ذریعے قرآن کے جس فہم و فکر کی اشاعت ہو رہی ہے، وہ کسی ایک لکیر کے فقیر یا کنویں کے مینڈک کے مانند نہیں ہے۔

❁ بلکہ اس میں کم از کم چار منبعوں سے پھوٹنے والے سوتوں کا ''قِرانُ السُّعداء'' موجود ہے۔ یعنی:

❁ ....ایک: حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندیؒ اور شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانیؒ کا ''رُسوخ فی العلم''۔ جس کی وساطت سے اس تحریک کا تعلق اسلاف کے ساتھ قائم ہے۔

❁ ....دوسرے: ڈاکٹر محمد اقبال مرحوم اور ڈاکٹر رفیع الدین مرحوم کی جدید فلسفہ و سائنس اور جدید سیاسیات و اقتصادیات کے ضمن میں تنقیدی بصیرت!

❁ ....تیسرے: مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم اور مولانا ابوالاعلیٰ مودودی مرحوم کا جذبۂ حرکت و عمل اور تصورِ جہاد فی سبیل اللہ! (اور

❁ ....چوتھے: مولانا حمید الدین فراہیؒ اور مولانا امین احسن اصلاحی مرحوم کا تعمق و تدبّرِ قرآن کا اسلوب و منہاج!

(الحمدللہ کہ راقم اس ''دعوتِ رجوع الی القرآن'' اور اس کے ''منظر و پس منظر'' کے بارے میں تفصیلاً لکھ چکا ہے، جو اب کتابی شکل میں مطبوعہ موجود ہے!)

❁ اور الحمدللہ کہ ع ''شادم از زندگی خویش کہ کارے کردم!'' کے مصداق راقم کو پورا اطمینان حاصل ہے کہ اس نے اپنی حیاتِ دُنیوی کے چالیس سال ''دعوت

الی القرآن'' اور ''تحریک تعلیم و تعلّمِ قرآن'' کی جس جدوجہد میں صرف کیے اس سے اعلیٰ اور ارفع کام اور کوئی نہیں!

❁ اور راقم کو خوف ہے تو صرف اس کا کہ کہیں اس میں نفس اور شیطان کی وسوسہ اندازیوں کے باعث ریا اور سمعہ کا دخل نہ ہو گیا ہو۔

❁ ورنہ رجا اور استبشار کے لیے تو نبی اکرم ﷺ کے یہ دو ارشادات کفایت کرتے ہیں کہ

❁ ....''خَيْرُكُمْ مَنْ تَعَلَّمَ الْقُرْآنَ وَعَلَّمَهٗ''......اور

❁ ....''وَمَنْ دَعَا اِلَيْهِ فَقَدْ هُدِيَ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ''

............❁............

❁ البتہ جہاں تک تحریک و تنظیم کا تعلق ہے' راقم کو برملا اعتراف ہے کہ اس کی تینتیس سالہ مساعی کا حاصل کم از کم بظاہر احوال بہت کم ہے!

❁ اور الحمدللہ کہ اس کے سبب کے بارے میں بھی راقم کو نہ کوئی مغالطہ لاحق ہے' نہ ہی وہ اپنے آپ کو دھوکا دینے کے مرض میں مبتلا ہے۔

❁ چنانچہ اسے خوب معلوم ہے کہ اس کا اصل سبب یہی ہے کہ اقامتِ دین کے بلند و بالا نصب العین اور ''اظہارُ دینِ الحقّ علی الدّین کلّہ'' یا بالفاظ دیگر ''اسلامی انقلاب'' کی جاں گسل جدوجہد' بالخصوص اس کی قیادت و رہنمائی کے لیے جو کم از کم استعدادات اور صلاحیتیں درکار ہیں وہ ان سے بھی تہی دست ہے!

❁ گویا معاملہ وہی ہے جو مولانا حسرت موہانی کے اس شعر میں بیان ہوا کہ: ؎

غمِ زندگی کا حسرت سبب اور کیا بتائیں
مری ہمتوں کی پستی' مرے شوق کی بلندی!

❁ صرف اس فرق کے ساتھ کہ جہاں تک راقم کا تعلق ہے معاملہ ''شوق'' کا نہیں' خالص ''احساسِ فرض'' کا ہے!

❁ چنانچہ............یہی احساسِ فرض تھا جس کے تحت راقم نے عمرِ عزیز کے پورے دس سال ''تحریک جماعت اسلامی'' کی نذر کیے اور اس عرصے کے دوران ایک ادنیٰ کارکن کی حیثیت سے' لیکن نہایت فعال انداز میں کام کیا۔

❁ پھر جب اس سے مایوس ہو کر علیحدگی اختیار کی تو آٹھ برس اس انتظار میں بسر کیے کہ جماعت

سے علیحدہ ہونے والے بزرگ علماء میں سے کوئی صاحبِ عزیمت وہمت نیا قافلہ تشکیل دے تو راقم اس میں ایک ادنیٰ کارکن کی حیثیت سے شامل ہو کر اپنے فرض سے عہدہ برآ ہو سکے!

❁ اور جب اس جانب سے بھی مایوسی کا سامنا ہوا تو مجبوراً خود اس کانٹوں بھری وادی میں قدم رکھنے کے فیصلے کے ساتھ دوبارہ وارِدِ لاہور ہوا!

❁ اور پورے دس برس صرف ''قرآن کی انقلابی دعوت'' کی نشر و اشاعت کا کام کیا' (سات سال خالص انفرادی حیثیت میں اور تین سال ''مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور'' کے زیرِ عنوان)

❁ اور بالآخر جب ۱۹۷۴ء میں ''عزمِ تنظیم'' کا اعلان کیا اور مارچ ۱۹۷۵ء میں ع ''ہوتا ہے جادہ پیما پھر کارواں ہمارا!'' کے مصداق ''تنظیم اسلامی'' کے نام سے ایک نیا قافلہ ترتیب دیا......تب بھی ہیئتِ تنظیمی کے ضمن میں آخری فیصلہ نہیں کیا' بلکہ اسے اس خیال سے مؤخر رکھا کہ کوئی بزرگ شخصیت بھی شامل ہو تو اس کی صوابدید کے مطابق اقدام کیا جائے!

❁ اور دو ڈھائی سال کے لاحاصل انتظار کے بعد تنظیمی ڈھانچے کی اساس کے طور پر ''بیعتِ سمع وطاعت فی المعروف'' کے اس اصول کو اختیار کرنے کا اعلان کر دیا جو راقم کے نزدیک اسلامی اجتماعیت کی واحد منصوص و مسنون بنیاد ہے!

❁ اس طرح' الحمدللہ کہ ''استدار الزّمان کھیئتہ یوم خلق اللّٰہ السمٰوٰت والارض'' کے مانند غلبہ و اقامتِ دین کی جدوجہد کے تنظیمی ڈھانچے کی ہیئت' جو ٹھیٹھ اسلامی مدار سے ہٹ گئی تھی' دوبارہ اپنے صحیح نہج پر استوار ہو گئی۔

❁ ان سطور کے عاجز و ناچیز راقم کو اپنی جملہ کوتاہیوں اور کمزوریوں اور تمام تر بے بضاعتی اور تہی دامنی کے ساتھ ساتھ' الحمدللہ کہ یہ اطمینان حاصل ہے کہ:

❁ اولاً: اسے اپنی بے بضاعتی اور تہی دامنی کا پورا شعور و ادراک حاصل ہے۔

❁ ثانیاً: وہ سلفِ صالحین اور علماءِ ربانیین کے حلقے سے ذہناً وقلباً منسلک ہے'

أُحبّ الصَّالحينَ ولستُ منهم
لعلّ اللّٰهَ يرزقني صلاحًا

❁ ثالثاً: اس کے فکر ونظر میں نہ تنگی ہے' نہ افراط وتفریط...... چنانچہ اس کے باوجود کہ اس کے دینی فکر کا تانا بانا اصلاً علامہ اقبال اور تبعاً مولانا آزاد اور مولانا مودودی کے فکر پر مبنی ہے' اس کی قلبی محبت وعقیدت کا رشتہ اصلاً حضرت شیخ الہندؒ اور تبعًا مولانا مدنیؒ اور علامہ عثمانیؒ کے ساتھ ہے......اور ان دونوں مؤخر الذکر بزرگوں کے ضمن میں بھی راقم اپنے

باطن میں ایک عجیب توازن کی لذت وحلاوت محسوس کرتا ہے' کہ اگر اصابت فکر ونظر کے ضمن میں راقم زیادہ قائل ہے علامہ عثمانیؒ کا...... تو تقویٰ وتواضع اور عزیمت و استقامت کے ضمن میں زیادہ معترف ہے مولانا مدنیؒ کا!

۞ مزید برآں'...... اس کے نزدیک مسلمانوں کا غیر مسلموں کے ساتھ کسی متحدہ قومیت میں شامل ہونا اصلاً تو غلط ہے' تاہم کسی وقتی اور فوری دفاعی تدبیر کے طور پر اس کا استعمال ہرگز حرام نہیں ہے۔ رہی مسلمانوں کی دُنیوی فلاح و بہبود کے لیے کی جانے والی ''قومی'' مساعی تو وہ تو راقم کے نزدیک احیائے ملت کے وسیع پروگرام کا ایک جزوِ لاینفک ہیں...... اگرچہ خالص غلبۂ اسلام اور اقامت دین کے لیے اٹھنے والی ٹھیٹھ تجدیدی مساعی کو ان دونوں سے بالاتر ہو کر خالص اصولی' انقلابی خطوط پر استوار ہونا چاہیے!

۞ رابعاً: اسے نہ کوئی غرور لاحق ہے نہ زعم...... بلکہ وہ شدید احتیاج محسوس کرتا ہے علماء ربانیین بالخصوص منتسبین حضرت شیخ الہندؒ کی سرپرستی اور تعاون کی!

۞ چنانچہ اسی کے حصول کی کوشش کی مظہر ہے اس کتاب کی تالیف واشاعت!!

۞ ''گر قبول افتد' زہے عز و شرف!''

(واضح رہے کہ یہ تحریر سرزمین حرم پر یہیں تک سپرد قلم ہو سکی تھی اور اس کے آخری الفاظ ۲۷ رمضان المبارک ۱۴۰۷ھ مطابق ۲۴ مئی ۱۹۸۷ء کو مکہ مکرمہ زادہا اللہ شرفہا' میں ضبط تحریر میں آئے تھے۔ اس کا باقی حصہ واپسی پر لکھا گیا ہے۔)

—— (۳) ——

۞ اس وقت پوری دنیا میں اسلام اور مسلمان جس حال میں ہیں وہ اظہر من الشمس ہے۔

۞ یعنی یہ کہ...... اگرچہ بظاہر مسلمان ممالک کی عظیم اکثریت مغربی سامراج کی غلامی سے نجات حاصل کر چکی ہے (چنانچہ اِس وقت یو این او کے کل ۱۹۲ ممبر ممالک میں سے ۴۸ کی تعداد مسلمان ممالک پر مشتمل ہے!)

۞ لیکن ایک جانب...... یہ تمام مسلمان ملک جدید ٹیکنالوجی اور خاص طور پر اسلحہ کے لیے بالکلیہ دوسروں کے دستِ نگر اور کسی نہ کسی سپر پاور کے فتراک کے نخچیر ہونے کے علاوہ اکثر وبیشتر باہم دست وگریباں ہیں۔

۞ تو دوسری جانب............ ''اسلام'' فرمانِ نبویؐ ((بَدَأَ الْاِسْلَامُ غَرِيْبًا وَسَيَعُوْدُ كَمَا

بَدَأَ)) کی کامل تصویر ہے۔

۞ اور اس کے بارے میں لگ بھگ ایک صدی قبل کے یہ اشعار آج بھی صد فی صد درست ہیں کہ ؎

پستی کا کوئی حد سے گزرنا دیکھے
اسلام کا گر کر نہ ابھرنا دیکھے!
مانے نہ کبھی کہ مدّ ہے ہر جزر کے بعد
دریا کا ہمارے جو اترنا دیکھے!

۞ اور ؎

اے خاصۂ خاصانِ رسل وقت دعا ہے
امت پہ تری آ کے عجب وقت پڑا ہے
وہ دیں جو بڑی شان سے نکلا تھا وطن سے
پردیس میں وہ آج غریب الغربا ہے!

۞ اس لیے کہ ان نام نہاد مسلمان ممالک میں قیادت و سیادت کی باگ ڈور اور حکومت و سیاست کی زمامِ کار گورے یوروپین لوگوں کے جانے کے بعد ان لوگوں کے ہاتھوں میں آ گئی ہے جو صرف چمڑی کی رنگت کے سوا ذہن وفکر اور تہذیب وتمدن ہر اعتبار سے خالص ''یوروپین'' ہیں!

۞ اہل تشیع تو پھر بھی فخر کے ساتھ سر اونچا کر سکتے ہیں کہ انہوں نے اپنے واحد اکثریتی ملک میں اپنے نظریات کے مطابق ''اسلامی انقلاب'' برپا کر دیا اور اس سے قطع نظر کہ یہ انقلاب عارضی ثابت ہوتا ہے یا پائیدار' کم از کم فی الوقت ایک وسیع وعریض ملک پر اپنے عقائد اور اپنی فقہ کی غیر مشروط بالادستی بالفعل قائم کر دی۔

۞ پوری سنّی دنیا کے لیے تو ؎

''یارانِ تیز گام نے محمل کو جا لیا
ہم محوِ نالۂ جرسِ کارواں رہے!''

کے مصداق واقعتاً ڈوب مرنے کا مقام ہے کہ ان کے درجنوں اکثریتی ممالک میں سے' سوائے ایک سعودی عرب کے' کسی ایک جگہ بھی شریعت اسلامی کی بالادستی قائم نہیں!

۞ اور خود سعودی عرب میں بھی اگرچہ داخلی طور پر نظامِ عبادات کے سرکاری سطح پر قیام و اہتمام اور شریعت اسلامی کی جزوی تنفیذ و ترویج کی برکات نظر آتی ہیں......

۞ تاہم ایک مستبد بادشاہت اور دولت کی غیر منصفانہ تقسیم نے اسے پوری بیرونی دنیا کے لیے نفرت و حقارت کا ہدف اور تمسخر و استہزاء کا موضوع بنا کر رکھ دیا ہے۔

۞ گویا آج پوری سُنّی دنیا کم از کم قومی و اجتماعی اور ملی و ملکی سطح پر شہادتِ حق کی بجائے شہادتِ زُور پر عمل پیرا ہے......اور نوعِ انسانی کو اسلام کی دعوت دینے اور اس پر حجت قائم کرنے کی بجائے عملی اعتبار سے خود اسلام سے نفرت اور بیزاری کا اظہار کر رہی ہے!

۞ ادھر برعظیم ہند کی تقسیم سے ۱۹۴۷ء میں وقت کی جو عظیم ترین مسلمان مملکت وجود میں آئی تھی وہ سینتیس سال قبل ایک عظیم حادثے سے دوچار ہوگئی، جس نے نہ صرف یہ کہ اسے دولخت کر دیا بلکہ ایک نہایت شرمناک شکست اور ذلت آمیز ہزیمت کا کلنک کا ٹیکہ پوری اُمتِ مسلمہ کی پیشانی پر لگا دیا۔

۞ نتیجتاً آج وہ اندیشہ واقعہ کی صورت اختیار کر کے سامنے آ گیا ہے، جس کا اظہار اب سے لگ بھگ تین چوتھائی صدی قبل کچھ مخلصانِ ملت نے کیا تھا......یعنی یہ کہ مسلمانانِ برعظیم تین حصوں میں تقسیم ہو کر ضعیف و غیر مؤثر ہو گئے ہیں!

۞ اور نوبت بایں جارسید، کہ آئے دن بھارت کا کوئی نہ کوئی علاقہ ع

''ہو گیا مانندِ آب ارزاں مسلماں کا لہو!''

کا نقشہ پیش کرتا رہتا ہے، لیکن بنگلہ دیش کے پندرہ کروڑ اور بچے کھچے پاکستان کے سترہ کروڑ مسلمان چند ایک اخباری مضامین و بیانات...... اور ایک آدھ چھوٹے موٹے مظاہرے کے سوا اور کچھ نہیں کر سکتے!

۞ رہا یہ بچا کھچا پاکستان!......تو دیکھنے والے دیکھ رہے ہیں کہ یہ رفتہ رفتہ خوفناک ترین تباہی کی جانب بڑھ رہا ہے......اور ﴿كُنتُمْ عَلَىٰ شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ﴾ کا کامل مصداق بن چکا ہے۔

۞ اور اگر جلد ہی مشیت و قدرتِ خداوندی کا کوئی خصوصی اور معجزانہ ظہور نہ ہوا......اور

۞ یہاں اسلامی انقلاب نہ آیا

۞ تو اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ اس کے چار ٹکڑے ہوں گے یا پانچ!

۞ بہرصورت

۞ بھارت میں مسلم دشمنی ہی نہیں باضابطہ مسلم کشی کی تیز و تند لہر...... اور پاکستان میں نسلی، لسانی اور علاقائی عصبیتوں کے بڑھتے ہوئے طوفان کے پیش نظر یہ اندیشہ اور خطرہ موہوم نہیں، واقعی اور حقیقی ہے کہ برعظیم پاک و ہند میں ع

''ہے جرمِ ضعیفی کی سزا مرگِ مفاجات!''

کا وہ اٹل قانونِ قدرت نافذ نہ ہو جائے جو آج سے ٹھیک پانچ سو برس قبل سپین میں ہوا تھا!

ع ''حذر اے چیرہ دستاں سخت ہیں فطرت کی تعزیریں!''

......(اس موضوع پر الحمدللہ کہ راقم کی دو کتابیں شائع ہو کر منظر عام پر آ چکی ہیں یعنی ''استحکامِ پاکستان'' اور ''استحکامِ پاکستان اور مسئلہ سندھ''، لہٰذا اس مقام پر کسی تفصیل کی ضرورت نہیں ہے!)

(۴)

۞ ان حالات میں ضرورت تو اس امر کی ہے کہ طبقۂ علماء میں سے کوئی عظیم شخصیت ایسی ابھر کر سامنے آئے جو مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندیؒ، امام الہند شاہ ولی اللہ دہلویؒ اور مجاہد کبیر سید احمد بریلویؒ کی سی عظمت و جلالت نہ سہی کم از کم شیخ الہند محمود حسن دیوبندیؒ کی سی جامعیت و وسعت کی تو حامل ہو............جو

۞ اولاً......ع ''کرتا ہوں جمع پھر جگرِ لخت لخت کو!''

کے مصداق ''جماعت شیخ الہند'' کے باقیات الصالحات کو جمع کرے اور اس کی منتشر لڑیوں کو از سرِ نو ایک مضبوط رسّی کی صورت میں بٹ دے!

۞ ثانیاً............ان جملہ دینی عناصر کو جمع کرنے کی کوشش کرے جو جمعیت علماء ہند کے ابتدائی دور میں ایک پلیٹ فارم پر جمع ہو گئے تھے۔

............(واضح رہے کہ اُس وقت مسلمانانِ ہند کے اس مشترک دینی و سیاسی اتحاد سے صرف مولانا احمد رضا خاں صاحب بریلوی کے فرزند ہی باہر رہ گئے تھے، باقی جملہ قابل ذکر حنفی اور اہل حدیث علماء اس اتحاد میں شامل تھے)

۞ اس لیے کہ اس کے بغیر پاکستان میں کسی اسلامی انقلاب کے خواب دیکھنا جنت الحمقیٰ میں رہنے کے مترادف ہے!

۞ تاہم جب تک کوئی ایسی صاحب ہمت وعزیمت شخصیت سامنے نہیں آتی '

۞ ان سطور کا عاجز و ناچیز راقم اپنی بساط بھر کوشش کرتا رہے گا کہ غلبۂ اسلام اور اقامت دین کی اس راست تحریک کے تسلسل کو قائم رکھے' جس کے بیسویں صدی کے داعیٔ اوّل تھے مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم اور داعیٔ ثانی تھے مولانا ابوالاعلیٰ مودودی مرحوم

۞ اور ...... بحمد اللہ ...... وہ اس پر پوری طرح مطمئن ہے کہ خواہ اسے تنظیم کی وسعت کے اعتبار سے تاحال نمایاں اور محسوس کامیابی حاصل نہیں ہوئی' تاہم اسے اللہ نے توفیق عطا فرمائی کہ اس نے :

۞ دروسِ قرآن اور خطاباتِ عام' اور ان کی آڈیو اور ویڈیو کیسٹوں کے ذریعے وسیع پیمانے پر نشر و اشاعت کے ذریعے' نہ صرف یہ کہ دین اور فرائض دینی کا جامع اور ہمہ گیر تصور بہت بڑے حلقے میں عام کیا' بلکہ مطالعہ قرآن کے ایک منتخب نصاب کے ذریعے اس کا نہایت مضبوط و مستحکم تعلق قرآن حکیم کے ساتھ استوار کر دیا ہے۔

۞ مزید برآں' انقلاب اسلامی کے اساسی لوازم اور تدریجی مراحل کو وضاحت کے ساتھ معین کیا ...... اور اس کا گہرا رشتہ سیرت النبی ﷺ کے ساتھ اس طرح قائم کر دیا کہ **''لا یصلح آخر هذه الامة الابما صلح به اولها''** کی حقیقت روز روشن کی طرح عیاں ہوگئی۔ (اس موضوع پر راقم کی تالیف ''منہجِ انقلاب نبویؐ'' اور اس کا خلاصہ ''رسولِ انقلاب ﷺ کا طریق انقلاب'' مطبوعہ موجود ہیں!)

۞ اور ...... ثم الحمد للہ ...... کہ وہ اس پر پوری طرح راضی ہے کہ اگر اسے معاشرے اور قوم کے اکابر و اصاغر سے تائید و تعاون حاصل نہ ہو تو وہ یہی دو کام کرتا ہوا دنیا سے رخصت ہو جائے!

۞ تاہم ...... پاکستان کے علماء حقانی اور صلحاء ربانی کی خدمت میں یہ کتاب ﴿مَنْ اَنْصَارِیْۤ اِلَی اللّٰهِ﴾ کی صدا کے ساتھ پیش ہے' مبادا وہ یہ کہیں کہ تم نے ہمیں کبھی پکارا ہی نہیں!

۞ ورنہ ﴿وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ﴾ کے مطابق نصرت تو بالکلیہ اللہ ہی کی جانب سے ہے۔

——— (۵) ———

۞ اس کتاب میں اس مقدمے کے بعد

۞ بابِ اوّل ایک تمہید کی حیثیت رکھتا ہے' جس میں ایک خط قاری حمید انصاری صاحب کا شامل ہے اور

ایک تحریر ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہان پوری کی۔

۞ باب دوم کی حیثیت اس پوری کتاب کے مبنیٰ واساس اور بنیاد کی ہے۔

۞ اس میں اولاً راقم کی وہ تحریر شامل ہے جس میں ۲۱-۱۹۲۰ء کے امامت الہند کے مسئلے سے متعلق واقعات کی پوری تحقیق بھی آ گئی ہے' اور حضرت شیخ الہندؒ کی عظمت کے بارے میں راقم کے تأثرات بھی بیان ہو گئے ہیں۔

۞ پھر دو تائیدی خطوط مراد آباد (بھارت) کے مولانا افتخار احمد فریدی صاحب کے ہیں۔

۞ پھر راقم کی تحریر پر مولانا اللہ بخش ملکانوی کے اعتراضات اور ان کے ضمن میں راقم کی وضاحت ہے۔

۞ اور آخر میں محترم حکیم محمود احمد برکاتی کی تحریر ہے جس میں بعض واقعات اور اقوال کی روایت پر تنقیدی گرفت کی گئی ہے' جس کے ضمن میں ضروری وضاحت ان کے مقالے پر ''میثاق'' کے ادارتی نوٹ میں موجود ہے۔

۞ تیسرا باب ''فرائض دینی کا جامع تصور'' کے موضوع پر قرآن اکیڈمی' ماڈل ٹاؤن' لاہور میں منعقدہ چھ روزہ محاضرات کی روداد پر مشتمل ہے' جس سے دین کا جامع تصور بھی سامنے آ جاتا ہے اور فرائض دینی کا انقلابی تصور بھی۔

۞ چوتھا باب ...... راقم کی دو تقریروں پر مشتمل ہے' جو اواخر مارچ ۱۹۸۴ء میں جناح ہال' لاہور میں مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کے چھٹے سالانہ محاضراتِ قرآنی میں کی گئیں۔ ان میں اسلامی انقلاب کی جدوجہد کے دو لازمی اجزاء تفصیلاً زیر بحث آئے ہیں' یعنی ایک جہاد بالقرآن اور دوسرے التزامِ جماعت و لزوم بیعت! ——— واضح رہے کہ مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم کی دعوت و تحریک (۱۹۱۲ء تا ۱۹۲۰ء) کے بھی یہی دو اساسی اجزاء تھے!

۞ پانچویں باب کا اصل موضوع مولانا سعید احمد اکبرآبادی مرحوم و مغفور اور ان کی بعض آراء ہیں۔

۞ چنانچہ اس میں اولاً مولانا اکبرآبادی مرحوم کا ایک مختصر سوانحی خاکہ درج ہے جو موصوف کے خویش پروفیسر اسلم صاحب نے تحریر کیا اور متذکرہ بالا محاضراتِ قرآنی میں پڑھ کر سنایا۔

۞ پھر مولانا اکبرآبادی کی ایک طویل تقریر ہے جو انہوں نے مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم کی شخصیت اور سیرت کے موضوع پر ان ہی محاضرات میں کی۔ یہ تقریر اولاً ماہنامہ ''حکمت قرآن'' میں شائع ہوئی تھی' بعد ازاں اسے نہایت آب و تاب کے ساتھ کتابی صورت میں ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہان پوری نے شائع کیا۔

۞ پھر مولانا سعید احمد اکبرآبادی کے دو انٹرویو ہیں' جن میں انہوں نے راقم الحروف کے بارے میں اپنی رائے وضاحت کے ساتھ پیش کی ہے ...... جس کے لیے راقم ان کا شکرگزار بھی ہے اور ان کے لیے دعا گو بھی ...... البتہ اس گفتگو میں بعض دوسری تحریکوں اور شخصیتوں کے ضمن میں جو ریمارکس آ گئے ہیں ان کے ضمن میں مولانا اخلاق حسین قاسمی (دہلی) اور مولانا محمد منظور نعمانی (لکھنؤ) کے جو تردیدی یا وضاحتی خطوط موصول ہوئے' وہ بھی شامل کر دیے گئے ہیں۔

(واضح رہے کہ اس کتاب کے باب چہارم میں شامل راقم کی دونوں تقریروں کے دوران مولانا سعید احمد اکبر آبادی مرحوم بھی موجود تھے۔ پہلی میں بحیثیت صدر مجلس اور دوسری میں بحیثیت شریک و سامع!)

- باب ششم سے اس کتاب کی دوسری اہم بحث کا آغاز ہوتا ہے۔
- اس میں اولاً ''قرآن کے نام پر اٹھنے والی تحریکات اور ان کے بارے میں علماء کرام کے خدشات'' کے موضوع پر راقم کی ایک مفصل تقریر شامل ہے جو رمضان ۱۴۰۴ھ کے جمعۃ الوداع کو مسجد دارالسلام' باغ جناح' لاہور میں کی گئی تھی۔
- چونکہ ''میثاق'' کا وہ شمارہ (ستمبر ۱۹۸۴ء) بہت سے معروف علماء کرام اور بعض دینی جرائد کو تبصرے اور اظہار رائے کے لیے بھیجا گیا تھا' لہٰذا اس باب میں اس کے بعد چار جید علماء کرام اور دو ہفت روزہ جرائد کے تبصرے شامل ہیں جو ''میثاق'' کی نومبر اور دسمبر ۱۹۸۴ء کی اشاعتوں میں شائع ہوئے۔
- اور آخر میں ان تبصروں کے ضمن میں راقم کی وضاحتیں ہیں جو دسمبر ۱۹۸۴ء اور جنوری ۱۹۸۵ء کے ''میثاق'' میں شائع ہوئی تھیں۔
- باب ہفتم مولانا اخلاق حسین قاسمی (دہلی) کی ایک تحریر سے شروع ہوتا ہے جس میں انہوں نے ''جماعت شیخ الہندؒ'' کی اصطلاح استعمال فرمائی اور ایک جانب راقم کو کچھ نصیحتیں کیں اور دوسری جانب علماء دیوبند کو راقم کی تائید اور سرپرستی کا مشورہ دیا۔
- اس کے بعد راقم کی ایک طویل تحریر ہے جو ''میثاق'' فروری ۱۹۸۵ء میں شائع ہوئی تھی اور جس میں راقم نے ''جماعت شیخ الہندؒ'' کے ضمن میں اپنے تاثرات و احساسات کا تفصیلاً ذکر کیا ہے۔
- آخر میں مولانا محمد منظور نعمانی (لکھنؤ) کی تالیف کا ایک طویل اقتباس ہے جس میں مسلم انڈیا کی بیسویں صدی عیسوی کے ابتدائی چالیس سال کی تاریخ کے بعض اہم واقعات اور اس دور کے بعض اعاظم رجال کا ذکر ہے۔
- باب ہشتم میں یہی سلسلہ مضمون آگے بڑھتا ہے لیکن اس میں گفتگو اصلاً مولانا محمد یوسف لدھیانوی' مدیر ''بینات'' کراچی کے اعتراضات کے حوالے سے ہے۔

اس میں ''میثاق'' مارچ ۱۹۸۵ء کا ''تذکرہ و تبصرہ'' من وعن...... اور ستمبر ۱۹۸۵ء کے ''تذکرہ و تبصرہ'' کے چیدہ چیدہ حصے شامل ہیں۔ اس باب کے آخر میں ہفت روزہ ''حرمت'' اسلام آباد میں شائع شدہ ایک مضمون بھی شامل ہے۔

- باب نہم اصلاً راقم کے ۲۴ اگست ۱۹۸۴ء کے خطاب جمعہ پر مشتمل ہے جو ''میثاق'' نومبر ۱۹۸۴ء میں شائع ہوا تھا۔
- اس کے علاوہ اس میں ''قتل خطا میں عورت کی نصف دیت کا مسئلہ'' کے موضوع پر راقم کی ایک تحریر شامل ہے' جو اوّلاً روزنامہ ''نوائے وقت'' اور پھر ''میثاق'' دسمبر ۱۹۸۴ء میں شائع ہوئی تھی۔

اس کتاب میں ان دونوں کی اشاعت سے مقصود یہ ہے کہ فقہی مسائل کے ضمن میں راقم کا نقطۂ نظر

وضاحت سے سامنے آجائے۔

- باب دہم............ کچھ ''متفرقات'' پر مشتمل ہے جن کی حیثیت اس کتاب میں ''ضمیموں'' کی سی ہے...... ان میں حسب ذیل چیزیں شامل ہیں:
- (ا) آیۂ اظہار دین کے ضمن میں امام الہند شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی وضاحت (ماخوذ از ''ازالۃ الخفا'' ترجمہ از مولانا عبدالشکور لکھنوی)
- (ب) ''لا يصلح آخر هذه الامة الا بما صلح به اولها'' کے ضمن میں دو نہایت اہم تحقیقی خطوط
- (ج) ''علماء کب اٹھیں گے؟'' کے عنوان سے مولانا محمد زکریا' سربراہ پاکستان سنی اتحاد' کی ایک جھنجھوڑ دینے والی تحریر
- (د) حاجی عبدالواحد مرحوم و مغفور کا سوانحی خاکہ' جو اپنی ذات میں اس دور کی جملہ دینی تحریکوں کی چلتی پھرتی تاریخ تھے اور میرے ہاتھ پر زبردستی بیعت کرنے والے پہلے شخص!
- (ہ) مولانا سید عنایت اللہ شاہ بخاریؒ کی ایک تقریر جس میں موصوف نے راقم الحروف کے بارے میں اظہارِ خیال فرمایا ہے۔

راقم ان تمام حضرات کا تہہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہے جن کی تحریریں مضمون کی مناسبت سے کتاب میں شامل کی گئی ہیں۔

خاکسار **اسرار احمد** عفی عنہ

لاہور...... ۱۶ جون ۱۹۸۷ء

نظر ثانی...... ۱۵/ جنوری ۲۰۰۹ء

اہم نوٹ: زیر نظر تالیف میں شامل مضامین' مقالات اور خطابات میں سے اکثر گزشتہ چار پانچ سال کے عرصے کے دوران ماہنامہ 'میثاق' اور 'حکمت قرآن' میں شائع ہو چکے ہیں' اور اب اُنہیں عجلت اور کفایت کے پیش نظر بلا ترمیم و اضافہ اس کتاب میں شامل کیا جا رہا ہے۔ مگر اس دوران وقت کے دریا میں بہت سا پانی بہہ گیا اور بہت سی قابل احترام علمی دینی شخصیات جن کا ذکر اس کتاب میں اس انداز سے موجود ہے جیسے وہ ابھی بقیدِ حیات ہوں' مرحومین کی فہرست میں شامل ہو چکی ہیں۔ قارئین کرام سے گزارش ہے کہ دورانِ مطالعہ اس حقیقت کو ملحوظ رکھیں۔ (ناشر)

باب اوّل

تمہید

حضرت شیخ الہندؒ
ایک بھولی بسری شخصیت

از قاری حمید انصاری

حضرت شیخ الہندؒ کی عظمت کے عناصر ترکیبی پر ایک معروضی نظر

از ڈاکٹر ابو سلمان شاہجہان پوری

حضرت شیخ الہندؒ

ایک بھولی بسری شخصیت

—— قاری حمید انصاری ——

قاری حمید انصاری حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ کے معتمد علیہ رفیق کار مولانا محمد میاں منصور انصاری مرحوم ومغفور کے چھوٹے صاحبزادے ہیں۔ ان کے والد ماجد کے تعارف کے لیے مولانا سید حسین احمد مدنیؒ نے اپنی خودنوشت سوانح حیات میں جو کچھ تحریر فرمایا ہے وہ نہ صرف یہ کہ کفایت کرتا ہے' بلکہ 'سند' کا درجہ بھی رکھتا ہے۔ لہٰذا اس کا عکس ذیل میں درج کیا جارہا ہے:

(۴) مولانا منصور صاحب انصاری مرحوم' ان کا اصلی نام محمد میاں تھا۔ موصوف حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ بانی دار العلوم دیوبند کے نواسے اور پیرجی عبداللہ صاحب انصاری مرحوم ناظم دینیات علی گڑھ یونیورسٹی کے بڑے صاحبزادے تھے۔ حضرت شمس العلماء مولانا حافظ احمد صاحب مرحوم ناظم اعلیٰ دارالعلوم دیوبند کے حقیقی بھانجے تھے۔ ان کا اصلی وطن انبہٹہ ضلع سہارنپور تھا۔ دارالعلوم دیوبند میں تکمیل کرنے کے بعد مختلف مقامات میں خدماتِ تدریسیہ انجام دیتے رہے۔ دارالعلوم معینیہ اجمیر میں بعہدہ صدر مدرسی عرصہ تک کام کیا۔ اس کے بعد حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں اعانت ترجمہ قرآن کی خدمات انجام دینے کے لیے مقرر کیے گئے۔ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ نے ان کو اپنے مشن کا ممبر بنایا اور اسکیم میں شریک کرلیا۔ جمعیۃ الانصار میں بھی مولانا عبیداللہ صاحب مرحوم کے ساتھ ان کے نائب بن کر عرصہ تک کام کرتے رہے۔ نہایت مستقل مزاج' ذکی الطبع رازدار اور قابل اعتماد تھے۔ انہوں نے مشن کے کاموں کو نہایت زیادہ رازداری سے انجام دیا' لوگوں (اعزہ واحباب نے) ان کو بہت کوشش کے ساتھ توڑنا چاہا مگر یہ نہ ٹوٹے اور ہمیشہ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ سے وابستہ رہے۔ ان کو ڈگمگا دینے والے خطرات سے دوچار ہونا پڑا مگر یہ ثابت قدم رہے۔ حضرت شیخ الہندؒ کے ساتھ سفر حجاز میں رفاقت کی خدمات انجام دیتے رہے۔ مکہ معظّمہ میں گورنر حجاز غالب پاشا کی ملاقات ہونے اور ہدایات وتعلیمات ضروریہ حاصل کرنے کے بعد حضرت شیخ الہندؒ نے ان کو ہندوستان واپس کیا اور اس پر مامور کیا کہ وہ ہندوستان جاکر حسب تعلیمات غالب پاشاؒ کارہائی متعلقہ انجام دیں اور مشن کے ممبروں کی رہنمائی فرماتے رہیں۔ حسب بیان رولٹ رپورٹ غالب نامہ اُن کے پاس تھا' موصوف جب حسب ہدایت

ہندوستان پہنچے تو ریشمی خط انگریزوں کو مل چکا تھا۔ جگہ جگہ تفتیش اور پکڑ دھکڑ ہورہی تھی۔ بدخواہوں نے ان کے گرفتار کرانے کی کوشش کی۔ ان کو پتا چل گیا اور بھیس بدل کر انہوں نے فرائض ہدایات انجام دیے اور روپوش ہو کر یاغستان روانہ ہوگئے۔ سی آئی ڈی نے بہت کوشش کی مگر یہ ہاتھ نہ آئے اور یاغستان (آزاد علاقہ) میں بال بچوں (اہلیہ محترمہ دو صاحبزادوں وغیرہ) کو وطن میں چھوڑ کر چلے گئے اور بخیر وعافیت وہاں پہنچ گئے۔ وہاں کچھ عرصہ رہ کر پھر افغانستان (کابل) چلے گئے۔ امیر حبیب اللہ خاں صاحب کے اخیر زمانہ میں مولانا سیف الرحمٰن صاحب کے ساتھ گورنمنٹ ہند کی پروٹسٹ کی بنا پر کابل سے یاغستان کو روانہ کردیے گئے۔ انہوں نے یاغستان پہنچنے کے پہلے سے جب کہ بھیس بدلا تھا' اپنا نام بھی بدل کر محمد منصور انصاری رکھ لیا تھا جس سے سی آئی ڈی کو گرفتاری میں بڑی ناکامی ہوئی۔ امیر امان اللہ خاں صاحب کے زمانہ میں پھر کابل واپس ہوئے اور اپنی علمی استعداد وغیرہ کی وجہ سے بڑے علمی اور سیاسی عہدوں پر فائز ہوئے۔ جو مشن افغانستان سے استنبول امیر امان اللہ صاحب کے سریر آرائے سلطنت ہونے کے بعد بھیجا گیا تھا' اس میں موصوف بھی تھے۔ بعہدہ وزیر مختار سفیر افغانستان کے ساتھ فرائض عہدہ انجام دیتے رہے۔ پھر ماسکو میں افغانی سفارت فوق العادت میں بحیثیت مشیر شریک رہے۔ کابل میں انہوں نے مختلف سیاسی اسلامی رسائل بھی تصنیف کیے جو کہ شائع ہوچکے ہیں☆ ان کی روانگی کے بعد چونکہ ان کے متعلقین معاشی تنگیوں میں مبتلا ہوگئے تھے اس لیے ڈاکٹر انصاری مرحوم ۳۰ روپے ماہوار سے تکفل فرماتے رہے۔ انہوں نے یاغستان میں شادی بھی کرلی تھی۔ ان کے بڑے صاحبزادے مولانا حامد انصاری صاحب ہیں جو عرصہ دراز تک مدینہ بجنور کی ایڈیٹری کی خدمات نہایت لیاقت اور دانائی کے ساتھ انجام دیتے رہے اور پھر بمبئی چلے گئے اور روزنامہ جمہوریت جاری فرمایا۔ چھوٹے صاحبزادے والدہ ماجدہ کے انتقال کے بعد کابل چلے گئے اور ان دنوں وہیں مقیم ہیں۔ منصور صاحب کا انتقال کابل میں ہوگیا رحمہ اللہ تعالیٰ ورضی عنہ وارضاہ آمین۔

قاری حمید انصاری مولانا محمد میاں منصور انصاری مرحوم ومغفور کے وہی چھوٹے بیٹے ہیں جن کا ذکر مندرجہ بالا عبارت کے آخر میں ہوا ہے۔ وہ پچاس سال تک افغانستان میں مقیم رہے اور اس عرصے کے دوران امان اللہ خان' بچہ سقہ' نادر شاہ اور پھر ظاہر شاہ کی طویل بادشاہت کا زمانہ دیکھا اور اس کے بعد سردار داؤد اور پھر کمیونسٹوں کے دورِ اقتدار کے بھی سال ڈیڑھ سال کے حالات کا بچشم سر مشاہدہ کیا—— اور بالآخر ۱۹۷۹ء میں ''مہاجر'' ہوکر پاکستان تشریف لے آئے —— ساری عمر ''مہاجرت'' کی کیفیت میں رہنے کے باعث شادی کی نوبت بھی نہیں آئی۔ اس وقت اسّی برس کی عمر ہے لیکن صحت بحمد للہ اچھی ہے۔ اُن کے پاس اپنے والد ماجد کے چند مخطوطات محفوظ ہیں جنہیں وہ سینے سے لگائے

☆ ان کے نام مندرجہ ذیل ہیں: (۱) حکومتِ الٰہی (۲) اساسِ انقلاب یا مراقبہ نماز (۳) مجمل بیعت تابعیت (۴) دستور امامت اُمت (۵) انواع الدول وغیرہ۔

پھر رہے ہیں۔ اگر اللہ نے توفیق دی تو انہیں ''میثاق'' کے ذریعے سلسلہ وار ہدیۂ قارئین کیا جائے گا۔ سردست ان کا ایک مکتوب شائع کیا جا رہا ہے — پچاس سال افغانستان میں گزارنے کے باعث ان کی اردو بہت کمزور ہو گئی ہے — لیکن ہم چاہتے ہیں کہ اُن کے جذبات من وعن قارئین کے سامنے آئیں' لہٰذا اس میں زیادہ ترمیم یا اصلاح نہیں کی جا رہی۔ (عاکف سعید)

محترم المقام حضرت مولانا ڈاکٹر اسرار احمد صاحب دامت فیوضکم!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ!

ایک عرصے سے آپ حقائق اور دین اسلام کی حقیقتِ خاصہ پر جو تشریحات اور نکاتِ انقلابی' اسلامی لہجہ اور بے ٹوک اپنے مؤقر ماہنامے کے ذریعے اور اکثر اوقات مختلف مقامات میں خطبات کی صورت بیان فرما رہے ہیں' میں پڑھ رہا ہوں' اس قحط الرجال اور پُرفتن زمانے میں یہ چیز اسلام دوست اور دین پسند مسلمانوں کے لیے ایک آبِ حیات اور امیدوں کی کرن ثابت ہو رہی ہے۔ خداوند تعالیٰ آپ کو اور آپ کے رفقائے کار اور معاونین کو تادیر زندہ و سلامت اپنے حفظ وامان میں رکھ کر اپنے پاک دین اور خدا تعالیٰ کی حاکمیتِ مطلقہ کے لیے اجتہادی اور جہادی خدمت لیتا رہے۔ آمین ثم آمین۔ آپ کا مؤقر ماہنامہ ایک ہفتہ ہوا ہے کہ اسلام آباد میں اپنے ماموں زاد بھائی جناب ڈاکٹر محمد مسعود صاحب ریڈر ادارہ تحقیقاتِ اسلامی جامعہ اسلام آباد کے یہاں مجھے ملا۔ یہ پرچہ جلد ۳۳ نمبر ۱ ربیع الثانی ۱۴۰۴ھ مطابق جنوری ۱۹۸۴ء کا تھا جو کہ آج کل زیر مطالعہ ہے۔ عرضِ احوال' الہدیٰ' اسلام کا جماعتی نظام' شرک اور اقسامِ شرک کا بغور مطالعہ کیا۔ اب پھر ان کو دوبارہ پڑھ کر اپنے کو ایک نئی دنیا میں محسوس کیا (اگرچہ یہ تمام حقائق اور نکات وہی ہیں جو کہ آج سے چودہ سو سال پہلے حضور اکرم ﷺ و خلفائے راشدین نے عملی صورت اور علمی حقائق کے طور پر ہمارے لیے لائحہ عمل کے طور پر بتلا اور سمجھا دیے تھے' مگر ہمیں آج وہ نئے اور اجنبی معلوم ہو رہے ہیں) جس کی وجہ ہماری اسلامی علوم اور سیرت نبی اکرم ﷺ اور حضرات شیخین رضی اللہ عنہم کی اسلامی عملی زندگی سے ناواقفیت ہے مگر ''قندِ مکرر'' میں آپ کی جو تحریر مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم اور جمعیت علمائے ہند اور مخدومنا ومولانا مجاہد احیاءِ مجدد اسلام محمود الحسن صاحب (حضرت شیخ الہندؒ رحمۃ اللہ علیہ) کا مطالعہ میرے لیے بہت ہی خوشی و تعجب کا باعث ہوا۔ میں عرصے سے پاکستان میں ہوں مگر میں نے اس عرصے

میں پاکستان کے کسی اخبار یا رسالے' یا ہفتہ وار مجلّے میں مجاہد اعظم حضرت شیخ الہند کا نام تک نہیں پڑھا اور نہ کسی مجلس یا کسی شخص کی زبانی ان کی خدمات اور مجاہدات کے بارے میں کچھ سنا (حالانکہ یہاں کے اخباروں اور رسالوں میں' پیروں فقیروں اور بزرگانِ دین اور بعض گزرے ہوئے لوگوں کے حالات' کرامات' خدمات بڑی بڑی جاذبِ نظر سرخیوں کے ساتھ دیکھنے میں آتے ہیں) مگر جن مردانِ حق نے ''دین مبین'' کے ارتقاء اور اس کی اصلی روح کو مدنظر رکھتے ہوئے ایک اسلامی انقلاب کے لیے طوفانوں سے مقابلہ اور شدائد اور قید و بند کی تکالیف برداشت کیں ان کا نام' ان کا تذکرہ اور ان کے کارنامے آج ہم بھلا بیٹھے ہیں۔ ان حضرات میں مخدومنا مجاہد اعظم حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب رحمۃ اللہ علیہ بھی ہیں۔ حضرت شیخ الہندؒ کا جو مشن (پان اسلام ازم) اور جو پروگرام (ہندوستان کے مسلمانوں کی آزادی حاصل کر کے اس کی قوت سے عالمِ اسلام اور اسلامی حکومتوں کو آزاد کرا کے مسلمان حکومتوں کا متحدہ وفاق بنانا اور تمام بشریت کو اسلامی عدل وانصاف اور مساوات برادری و برابری کے نظام کے تحت لا کر تمام دنیا میں حکومتِ الٰہیہ کو عام کرنا تھا) مگر ہماری بدبختی تھی کہ حضرت شیخ الہندؒ کی زندگی نے وفا نہ کی۔ اور حضرت اپنے تمام مشن کے پروگرام انجام تک نہ پہنچا سکے۔ حضرت شیخ رحمۃ اللہ علیہ کی وفات کے بعد نہ ان کے جانشین حضرت مولانا حسین احمد صاحبؒ نے حضرت کے پروگرام کو اپنا کر آگے چلایا اور نہ حضرت شیخ کے کسی اور مخلص نے یہ جرأت کی کہ حضرت شیخ کے حقیقی پروگرام کو اگر عملی صورت میں ممکن نہ تھا تو کم از کم تحریری صورت میں ہی حضرت کے پروگرام اور مشن کی حقیقت لوگوں تک پہنچا دیتے۔

آج میں اپنے آپ کو بہت خوش نصیب محسوس کر رہا ہوں کہ ایک عرصے کے بعد حضرت شیخ کے حالات اور بعض ان کے فرمائے ہوئے نکات آپ کے مؤقر رسالے میں پڑھ کر خوش ہوں کہ اس پُرفتن زمانے میں بھی ایسی ہستیاں موجود ہیں جو (گاہے گاہے بازخواں ایں قصۂ پارینہ را) کو قندِ مکرر کے معنی خیز عنوان سے حضرت شیخ کی یاد اور ان کے کارناموں اور اخلاقی اور انسانی خصائص ایک بہت فصیح اور دردمندانہ طریقے سے یاد فرما رہے ہیں (این کار از تو آید و مرداں چنیں کنند) کا مصداق بنے ہیں۔

اگرچہ حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کی سوانح حیات اور حضرت کی آزادیٔ وطن اور احیائے مجدد دین اسلام کے سلسلہ میں اکثر حضرات نے بہت لکھا ہے۔ اپنی تحریروں میں حضرت کے مشن

اور پروگراموں کا بھی ذکر کیا ہے' مگر کسی سوانح نگار یا مضمون نگار نے مشن اور پروگراموں کے سلسلے میں حضرت شیخ کی کوئی ایسی صریح اور صاف الفاظ میں یہ نہیں لکھا کہ حضرت شیخ کا مشن کیا تھا اور اس کی کامیابی کے لیے کیا کیا پروگرام کس وقت اور کہاں کہاں بنے۔ اور ان پر کتنا علمی اور عملی اقدام کے بعد کامیابی ہوئی یا ناکامی اور اس کے اسباب وعلل کیا تھے۔ مولانا محمد میاں مرحوم دیو بندی نے ایک کتاب تحریک حضرت شیخ الہندؒ۔ کون کیا تھا' لکھی۔ لیکن اس کتاب میں چونکہ انگریزوں کی سی آئی ڈی کی گمراہ کن رپوٹوں کو' جو لندن کی لائبریری میں محفوظ ہیں' اساس بنایا گیا ہے' لہٰذا اس کے ذریعے شیخ الہندؒ کی شخصیت اپنے اصل رنگ میں سامنے نہیں آسکی۔

(میثاق' اپریل ۱۹۸۷ء)

حضرت شیخ الہندؒ کی عظمت کے عناصر ترکیبی پر ایک معروضی نظر!

جمعیت علماءِ ہند کے زیر اہتمام دہلی میں منعقدہ شیخ الہند سیمینار میں پیش ہونے والا ایک مقالہ

ـــــــ ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہان پوری ـــــــ

تاریخ عالم میں بہت سی ایسی شخصیتیں گزری ہیں جنہیں بڑا کہا جاتا ہے۔ یہ شخصیتیں علم وعمل کے مختلف میدانوں میں اپنے خصائص وخدمات کی بنا پر بڑی کہلاتی ہیں۔ ملت اسلامیہ پاک وہند کی تاریخ بھی بڑے بڑے علمائے دین' صوفیاءِ کرام' مشائخ عظام اور ادیبوں' مصنفوں' مدبروں' مفکروں اور قومی خدمت گزاروں کے ذکر سے خالی نہیں۔ ان کے نام ہماری زبان پر اور ان کے تراجم وتذکار زیر تحریر و مطالعہ آتے ہیں تو ہمارا سر فخر سے بلند ہو جاتا ہے۔

یہ صورت تو اس وقت ہوتی ہے جب ہمارے ہاتھ میں ایک حقیقت پسند مؤرخ کا قلم ہوتا ہے اور ہمارا ذہن تعصب سے اور زبان مبالغہ سے قطعاً ناآشنا ہوتے ہیں۔ مجرد ومنفرد عظمتوں کا یہی ذکر جب نیاز مند زبان پر آتا ہے تو قلب عقیدت سے جھوم جھوم اٹھتا ہے۔ اگر دردمندی پہلو میں ہو اور ارادت سے قلم کا سر جھک جائے تو ممدوح کے محاسن کی ایک ایک خوبی کو سو سو انداز سے بیان کرنے کو جی چاہتا ہے' لیکن جب حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن دیو بندی کے بارے میں ہم یہ کہتے ہیں کہ وہ اس عہد کی ایک عظیم اور نادر روزگار شخصیت اور مذہب وسیاست میں سلطانِ وقت وسکندر اعظم تھے تو یہ ایک روادار قلم کی تحریر اور عقیدت مند قلب کا فیصلہ نہیں ہوتا' نہ یہ بات تحریر کرتے ہوئے ان کی کوئی مجرد خوبی ذہن میں آتی ہے۔ اگر کسی مجرد خوبی ہی کی بنا پر کوئی شخص عظمت کے تاج کا مستحق قرار پائے تو یقین کرنا چاہیے کہ تاریخ ملت اسلامیہ پاک وہند میں ایسے بے شمار علماء کے نام ملتے ہیں جن کے علمی وتصنیفی کارنامے بے حد وحساب ہیں' ایسے صوفیاء ومشائخ ہیں جن کے مریدوں کی تعداد لاکھوں تک پہنچتی ہے' شعلہ بیان وآتش نوا خطیبوں کی بھی تاریخ میں کمی نہیں' فلسفہ وکلام کے ایسے ماہر ہیں جن کی نکتہ آفرینیوں کا کوئی جواب نہیں' ایسے حکماء عقلاء ہیں جن کی حکمت ودانائی نے دنیا کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیا ہے' بے مثال شاعر' لاجواب ادیب اور

ایسے صاحبِ طرز انشاء پرداز ہیں جن کے کلام و انشاء کی دل ربائیوں نے لاکھوں قارئین ادب کے الگ الگ حلقے اور مستقل مکاتب فکر وفن پیدا کر دیے ہیں' کتنے ہی مدبر اور مفکر ہیں جن کے افکار نے زندگی کی تعمیر میں حصہ لیا ہے۔ مختلف علوم وفنون کی تاریخ میں ان کے نام عزت و احترام سے جگہ پانے کے مستحق ہیں' لیکن علم وفکر اور فلسفہ وعمل کے تمام اعتراف کے باوجود' یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ ''شیخ الہند'' ان میں کوئی نہیں۔

اگر ہم انسانی عظمت کے بجائے علم وعمل کی کسی ایک خوبی اور فکر و سیرت کے کسی خاص حسن کے شیدائی ہوتے تو ہمارا مرجع اور مرکزِ عقیدت کوئی اور شخصیت بھی ہو سکتی تھی اور تعجب نہ ہوتا کہ ہم حضرت ہی کے حلقے کے کسی صاحب علم وفن کو اپنی نیاز مندی کے اظہار کے لیے منتخب کر لیتے کہ اس حلقے میں بے مثال ادیب وخطیب' محدث و مفسر' شیخ و صوفی' مدرس و معلم اور صحافی و مبلغ سے لے کر حکیم الامت تک موجود تھے۔ یہ نہ سمجھ لیجیے کہ میں ان خصائص و محاسن کا منکر ہوں لیکن مجھے ایک جامع الصفات عظیم انسان کی تلاش ہے۔ کسی ایسی عمارت کی ضرورت نہیں جو اپنی تاریخ رکھتی ہو لیکن فیضانِ الٰہی کی بخششوں سے مالا مال نہ ہو اور اپنے حسن تعمیر میں آگرے کے تاج اور نظارۂ جمال میں لاہور کے شالامار کی طرح کسی آمر کے حکم اور کسی سرمایہ دار کی دولت کی رہین منت ہو۔ میں کسی ایسی عورت کے حسن کا متلاشی نہیں جسے قیمتی پتھروں کے استعمال سے رنگین و سنگین بنایا گیا ہو۔ میں ایک ایسی انسانی سیرت کا جویا ہوں جسے فکر و عمل کے حسن و توازن اور جامعیت نے عظیم بنایا ہو' جس کا تعلق اسی عہد سے ہو اور جس کا نام ہماری سماعت اور فہم کے لیے مانوس ہو' جس کا فکر بلند' قلب فراخ اور نظر وسیع ہو جو اپنے مذہبی عقائد میں محکم اور سیرت اسلامی میں پختہ ہو' جو مسلمانوں کے لیے ایک آبرومندانہ زندگی کا خواہاں ہو۔ لیکن جس کی نظر میں تمام خلق انسانی خدا کا گھرانہ ہو اور وہ اس پورے گھرانے کی فلاح و بہبود کے لیے فکر مند ہو۔ جس کی ملت پروری کا یہ عالم ہو کہ بلقان کی جنگ اور سمرنا و تھریس اور طرابلس کے میدانوں میں کسی مسلمان کے پیر میں کانٹا چبھے تو وہ دیوبند کی مسندِ رشد و ہدایت پر اور مجلس درس و تدریس میں تڑپ اٹھے لیکن اس کی انسانی ہمدردی و غمگساری کا یہ عالم ہو کہ اپنے غلام ملک میں ایک ایک برادرِ وطن کی آزادی کے لیے اپنی زندگی کی راحتوں کو قربان کر دے' جس نے میدانِ جنگ میں خدا اور اس کی بخشی ہوئی آزادی کے دشمنوں سے نفرت کرنا سیکھا ہو۔ لیکن جو مخلوق خدا سے محبت کرنے اور انہیں ان کی چھینی ہوئی آزادی دلانے کے لیے پیدا ہوا ہو۔ مجھے ایک ایسے وجود گرامی کی تلاش ہے جس کا تعلق خواہ سہارنپور کے کسی قریے سے ہو' لیکن وہ پورے ملک کا افتخار ہو' اس کے نام کے ساتھ خواہ دیوبندی لکھا

جاتا ہو لیکن اس کی سیرت تمام مکاتبِ فکر کے لیے محمود ہو' اس کا تعلق اگرچہ برصغیر پاک و ہند سے ہو لیکن اس کا قلب پورے ایشیا میں استعمار کے استحصال پر خون کے آنسو روتا ہو اور اگرچہ وہ خود ایشیائی ہو لیکن اس کی نظر میں تمام روئے زمین پر بسنے والے انسان آزادی و امن میں برابر ہوں اور دنیا کا ہر مظلوم خواہ اس کا تعلق کسی ملک اور کسی قوم و طبقہ سے ہو' وہ یکساں ہمدردی و حمایت کا مستحق ہو۔

دنیا میں بہت سے خصائص و فضائل کی پرستش کی جاتی ہے۔ اس میں طاقت و قوت' مال و دولت' حسن و جمال' حکومت و اقتدار بھی شامل ہیں۔ پس اگر کوئی شخص انہیں چیزوں کا پرستار رہے تو اسے کون روک سکتا ہے' وہ اپنے معبود کے حضور اپنی جبین عجز و نیاز جھکا دے۔ دنیا کی تاریخ عبودیت و نیاز کے حسین مناظر اور حیرت زا نظارہ ہائے جمال سے بھری پڑی ہے۔ آپ کے گرد و پیش کی دنیا میں نہ طاقت و قوت کے معبودانِ باطل کی کمی ہے جو اَنَا رَبُّکُمُ الْاَعْلٰی کے نعرہ زن ہیں' نہ مال و دولت کے ایسے حسین مناظر کی' جن کی دلفریبیوں نے ایک عالم کو اپنا گرویدہ بنا لیا ہے اور نہ حکومت و اقتدار کے ایسے ساحروں کی جو درحقیقت خود مسحور ہیں' لیکن ان کے اقتدار کی بجلیوں کی چمک اور حکم و صدائے اَنَا وَلَا غَیْرِیْ کی کڑک نے عقلوں کو ماؤف اور ذہنوں کو مسحور کر رکھا ہے۔ ان کے علاوہ دنیا میں مٹ جانے والی قوت و طاقت' متزلزل ہو جانے والے اقتدار اور فانی حسن و جمال کے آگے جھکے ہوئے سروں کی بھی کمی نہیں۔ خدا کی پھیلی ہوئی زمین پر کسی بھی ملک میں انسانی شرف کی پامالی کا یہ اندوہناک نظارہ کیا جا سکتا ہے۔

لیکن آپ مجھے کسی ایسی شخصیت کا پتا اور ایسی عظمت کا نشان بتائیں جو خصائص سیرت و فضائل علمی کی جامع ہو' جس کے افکار کی روشنی نے غلامی کی ذلت و نکبت سے آزادی کی عزت و آبرومندانہ زندگی کی طرف رہنمائی کی ہو' جس کے پاس حکومت کا اقتدار نہ ہو لیکن وہ دلوں پر حکمران ہو۔ اس کے پاس مال و دولت نہ ہو لیکن اس کے سرمایۂ ذوقِ عمل سے ایک دنیا اس کی گرویدہ ہو گئی ہو۔ وہ حسن و جمالِ ظاہری کا مالک نہ ہو لیکن وقت کے تمام سلاطینِ عشق اور شیفتگانِ حریت اس کی زلف کے اسیر ہوں اور اس کے ایک ادنیٰ اشارہ و ایما پر وطن میں اپنی زندگی کی راحتوں کو تج کر غربت اور جلاوطنی کی زندگی کی صعوبتوں کو اپنے لیے سرمایۂ راحتِ جاں سمجھ کر اپنے سینے سے لگا لیں اور اس کے عشق میں خود اپنے ہاتھوں سے اپنے پیروں کے لیے زنجیر کی کڑیاں ڈھالنے کا کام انجام دیں' وہ اپنی صلیب خود اپنے کندھے پر اٹھا لیں اور آزاد زندگی کی سیر و گردش کی جگہ اسارت کے حبس اور زنداں کے سیہ خانہ و قید کو قبول کر لیں' جس نے زبان سے کبھی حکم نہ چلایا ہو لیکن دنیا نے اس کے نطق و بیان کے موتی چن لینے کے لیے اپنے دامن پھیلا

دیے ہوں، جس نے دنیا کو اپنی پرستش کے لیے نہ پکارا ہو کہ اس کے عقیدے میں یہ کفر تھا کہ انسانی شرف کو پامال کیا جائے لیکن دنیا نے عقیدت و نیاز کا سر اس کے سامنے جھکا دیا ہو۔

حضرات! میرا ذوق ایک ایسی سیرت کے پاک باز حامل کے نظارۂ جمال ہی سے تسکین پا سکتا ہے جو اپنی زندگی کے تمام اعمال، روز و شب کے معمولات، اپنی شکل و صورت اور وضع قطع میں ایک مذہبی زندگی اور شخصیت کی مثال ہو لیکن وہ ملکی زندگی کے تقاضوں کو بھی سمجھتا ہو اور قومی فرائض کی بجا آوری میں وہ کسی قوم پرست سے پیچھے نہ ہو اور ایک مذہبی عالم ہونے کے ساتھ کہ وہی اسلامی زندگی میں رہنمائی کا سب سے زیادہ مستحق ہو سکتا ہے، وقت کی سیاست اور اس کی رفتارِ کار کا اندازہ شناس بھی ہو۔ مذہب و سیاست کے بام و سنداں پر جس کی گرفت سخت ہو اور دونوں کو باہم آمیز کر کے ان کے دائرہ و حدود کی نزاکت پر نظر رکھ سکے اور شریعت کے خصائص کو عشق کے مطالبوں اور تقاضوں سے پامال نہ ہونے دے اور جس کی سیرت کی یہ خوبی ہو کہ سیاست کے دریا میں اپنی کشتی کی تختہ بندی کر لے اور دریا کے چھینٹوں سے اپنی زندگی کے دامن کو تر بھی نہ ہونے دے۔

حضرات! اس تمہید لطیف کو کہاں تک طویل اور اس حکایتِ لذیذ کو کب تک دراز کیا جائے، میرے لیے اس حکایت میں خواہ کتنی ہی دل فریبی کا سر و سامان ہو، لیکن یہ بات کسی طرح مناسب نہیں کہ آپ کی طلب کو اپنے ذوقِ بیان و داستان سرائی کا پابند کروں۔ میں صاف الفاظ میں اپنے اس عقیدے کا اعلان کر دینا چاہتا ہوں کہ ان تمام فضائل و محامدِ علم و عمل اور خصائص و محاسن فکر و سیرت اور ایثارِ وقت و جان اور جہادِ ملی و قومی کی جامع کوئی شخصیت اگر ہے تو وہ حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن کی ہے۔

حضرت کی زندگی پر نظر ڈالنے اور آپ کے افکار و خدمات کے بیان و تجزیہ کے کئی انداز ہو سکتے ہیں، ان میں سے ایک انداز یہ ہوگا —— اور عام طور پر اہل قلم اور اصحابِ نظر اسی کو اختیار فرمائیں گے کہ علم و عمل کے مختلف میدانوں میں آپ کے افکار و خدمات کا جائزہ لیا جائے، لیکن ان معنوں میں آپ کی ذات گرامی ایک ذات تھی کہاں؟ آپ کا وجود مقدس و گرامی مرتبت علم و ادب، فکر و نظر، مذہب و سیاست، ایثار و عمل، اخلاق و سیرت اور مذہبی علوم و فنون کے مختلف دبستانوں کا ایک دبستان اور سینکڑوں انجمنوں کی ایک انجمن تھا۔ آپ کے وجودِ مقدس سے فیضانِ الٰہی کے سینکڑوں چشمے پھوٹے تھے۔ آپ کی ذات گرامی کا ایک خاص دور میں ایک محور ضرور تھا، لیکن اپنے دور میں آپ خود ایک نظامِ رشد و ہدایت اور مذہب و سیاست کے مرکز و محور تھے۔ آپ کی خدمات کا جائزہ اس طرح بھی لیا جا سکتا ہے کہ آپ کی دعوت جو تعمیرِ نو سے لے کر

انقلاب تک، مسندِ درس و تعلیم اور ذوقِ عمل کی تربیت سے لے کر میدانِ جہاد و عمل تک، تالیف و تدوین افکار سے لے کر جہادِ لسانی کے ملی و قومی میدانوں تک، مسلمانوں کی عام اجتماعی زندگی سے لے کر بین الملی سطح تک اور مسلمانوں سے لے کر برادرانِ وطن تک، ملکی حالات سے لے کر بین الاقوامی مسائل تک اور اسلامی دینی دائرے سے لے کر قومی سیاست کے تمام گوشوں تک پھیلی ہوئی ہے، اس پر بھی من حیث القوم نظر ڈالی جائے۔ دینی و ملی، ملکی و قومی اور بین الاقوامی سیاست میں دارالعلوم کی مسندِ درس و تدریس، اصحابِ عمل اور مردانِ کار کی تعلیم و تربیت، جمعیت الانصار اور نظارۃ المعارف القرآن کا قیام ترکی کے لیے ایثارِ وقت و مال، مولانا عبیداللہ سندھی کا سفرِ کابل، خود حضرت کا سفرِ حجاز و اسارتِ مالٹا، ریشمی رومال کی تحریک، خلافت کی تحریک اور ترکِ موالات، ہندو مسلم اتحاد، دارالعلوم دیوبند اور مدرسۃ العلوم علی گڑھ کا ربط و اتصال، حضرت کی دعوت و رہنمائی کے خاص عنوانات ہیں۔

حضرات! فرصت کے ان چند لمحوں میں ان تمام دائروں میں حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی رہنمائی اور سیرت و افکار کے خصائص کا ذکر اجمال سے بھی ممکن نہیں۔ اب اس صحبت کو ختم کرتا ہوں اور صرف اتنا عرض کروں گا کہ:

امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد نے خانوادہ ولی اللٰہی میں شاہ اسماعیل شہید کو خود شاہ صاحب سے بھی اونچا مقام عطا فرمایا تھا اور یہاں تک لکھ دیا تھا کہ اگر ان کے عہد میں شاہ صاحب بھی ہوتے تو انہی کے جھنڈے کے نیچے ہوتے۔ میں پوری علمی بصیرت کے ساتھ یہ بات کہہ سکتا ہوں کہ پورے علمی خانوادہ قاسمی میں جو برصغیر کی تاریخ میں ڈیڑھ سو سال پر پھیلا ہوا ہے، حضرت شیخ الہند کا وہی مقام ہے جو اُس تحریک کے دورِ ثانی میں شاہ اسمٰعیل شہید کا تھا۔ حضرت شیخ الہندؒ نے اپنی زندگی میں وہ کارنامہ انجام دیا ہے کہ اگر اس دور میں حضرت قاسم العلوم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ ہوتے تو وہ بھی اسی سلطانِ وقت و سکندرِ عزم کے جھنڈے کے نیچے نظر آتے۔

برصغیر پاک و ہند میں مسلمانوں کا یہ عہدِ سعادت اور دورِ علوم و افکار اسی ذات گرامی اور فضیلت مآب کا ہے جسے تاریخ اسلامیانِ پاک و بھارت میں محمود حسن کے نام، دیوبندی کی نسبت اور شیخ الہند کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے۔

حضرات! اس صحبت و فرصت کے لمحات اختتام کو پہنچے۔ رخصت چاہتا ہوں۔

وآخر دعوانا ان الحمد للّٰہ رب العالمین: والسلام علیکم ورحمۃ اللّٰہ وبرکاتہ!

(شائع شدہ، میثاق، اپریل ۱۹۸۶ء)

باب دوم

حضرت شیخ الہندؒ،

مولانا ابوالکلام آزادؒ

اور

مسئلۂ

انتخاب و بیعتِ

امام الہند

(۱)

موضوعِ زیرِ بحث پر

ڈاکٹر اسرار احمد کی ایک اہم تحریر

جو اوّلاً — 'میثاق' بابت ستمبر اکتوبر ۱۹۷۵ء اور
پھر 'میثاق' جنوری ۱۹۸۴ء میں شائع ہوئی

(۲)

مولانا افتخار احمد مراد آبادی کے دو تائیدی خطوط

(۳)

مولانا اللہ بخش ایاز ملکانوی

کے اعتراضات و استفسارات
اور ان کا جواب

(۴)

حکیم محمود احمد برکاتی کی وضاحتی تحریر

اور اس پر 'میثاق' کا نوٹ

امیر تنظیم اسلامی **ڈاکٹر اسرار احمد** کی ایک تحریر
جو 'میثاق' بابت ستمبر اکتوبر ۱۹۷۵ء میں شائع ہوئی تھی:

مولانا ابوالکلام آزاد — جمعیت علماءِ ہند
اور
حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن رحمۃ اللہ علیہ

''میثاق'' بابت اکتوبر و نومبر ۱۹۷۴ء کے ''تذکرہ وتبصرہ'' کے صفحات میں جو ایک طویل تحریر راقم الحروف کے قلم سے شائع ہوئی تھی اُس میں اس ''ہمہ جہتی احیائی عمل'' کے جائزے کے سلسلے میں جو اس وقت پورے عالم اسلام میں جاری ہے' قومی تحریکوں کے ذریعے حصولِ آزادی اور علمائے کرام کے دفاعی رول کے ذکر کے بعد عرض کیا گیا تھا:

''**اس**' ہمہ جہتی احیائی عمل' کا تیسرا اور اہم ترین گوشہ وہ ہے جس میں وہ جماعتیں اور تنظیمیں برسرِ کار ہیں جو قائم ہی خالص احیائی مقاصد کے تحت ہوئیں اور جنہیں اب اس احیائی عمل کے اعتبار سے گویا مقدمۃ الجیش کی حیثیت حاصل ہے! مختلف مسلمان ممالک میں ایسی جماعتیں اور تنظیمیں مختلف ناموں کے تحت کام کرتی رہی ہیں لیکن ؎ ''ہے ایک ہی جذبہ کہیں واضح کہیں مبہم'' اور ''ہے ایک ہی نغمہ کہیں اونچا کہیں مدھم'' کے مصداق ان کی حیثیت ایک ہی تحریک کے تحت کام کرنے والی مختلف تنظیمی ہیئتوں کی ہے۔

ان جماعتوں میں سے اگرچہ ایک دَور میں جوش اور جذبے کی شدت اور اثر ونفوذ کی وسعت کے اعتبار سے مصر کی ''الاخوان المسلمون'' توجہات اور اُمیدوں کا مرکز بن گئی تھی' لیکن واقعہ یہ ہے کہ احیائی عمل کے اس گوشے میں بھی اصل اہمیت برصغیر ہند و پاک ہی کو حاصل ہے۔

برصغیر میں اس تحریک احیائے دین کے مؤسس اوّلین اور داعیٔ اوّل کی حیثیت مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم کو حاصل ہے جنہوں نے اس صدی کے بالکل اوائل میں ''الہلال'' اور ''البلاغ'' کے ذریعے [1] ''حکومتِ الٰہیہ'' کے قیام اور اس کے لیے ایک ''حزب اللہ'' کی

(۱) ''الہلال'' کا اجراء ۱۹۱۲ء میں ہوا تھا!

تأسیس کی پرزور دعوت پیش کی۔ مولانا کے مخصوص طرزِ نگارش اور اندازِ خطابت نے خصوصاً تحریکِ خلافت کے دوران ان کی شہرت کو برصغیر کے طول وعرض میں پھیلایا اور ان کی دعوت نے لاکھوں مسلمانوں کے دلوں کو مسخر کر لیا۔ لیکن اس کے بعد خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ کس سبب سے انہوں نے اس عظیم مشن کو خیرباد کہہ کر انڈین نیشنل کانگریس میں شمولیت اختیار کر لی اور باقی پوری زندگی پوری یکسوئی اور کمالِ مستقل مزاجی کے ساتھ ہندوستان کی نیشنلسٹ سیاست کی نذر کر دی۔

مولانا کی زندگی کے اس عظیم انقلاب کے ممکن اسباب میں ان کی حد سے بڑھی ہوئی ذہانت کو بھی شمار کیا جا سکتا ہے کہ ؏ ''اے روشنیٔ طبع تو برمن بلا شدی!'' مولانا بلاشبہ عبقری تھے اور عبقری انسان زیادہ عملی نہیں ہوا کرتے۔ اس کا کچھ سراغ ان کے اس جملے میں بھی ملتا ہے کہ ''ہم بیک وقت گلیم زہد اور ردائے رندی اوڑھنے کے جرم کے مرتکب ہیں''۔ اور ایک خیال جو زیادہ قرین قیاس ہے یہ بھی ہے کہ مولانا کی حیثیت ایک سکہ بند اور مسلّم عالم دین کی نہ تھی اور اس وقت تک مسلمانانِ ہند پر علماء کی گرفت بہت مضبوط تھی' لہٰذا مولانا کو گویا راستہ بند نظر آیا۔ اس کی تائید اس روایت سے بھی ہوتی ہے جو پروفیسر یوسف سلیم چشتی صاحب کے ذریعے ہم تک پہنچی اور جس کا حاصل یہ ہے کہ دس سال کے عرصے میں اپنے پیش نظر مقصد کے لیے تمہیدی مراحل کی تکمیل کے بعد اپریل ۱۹۲۲ء میں مولانا نے دہلی میں منعقدہ جمعیت علمائے ہند کی کانفرنس میں مفتی کفایت اللہ مرحوم اور مولانا احمد سعید مرحوم کے تعاون سے اگلا قدم اٹھانے کی سکیم بنائی۔ چنانچہ پہلے خود انہوں نے تقریر کی اور اپنے جوشِ خطابت سے حاضرین کے جذبۂ عمل کو ابھارا ہی نہیں للکارا۔ اور پھر مولانا احمد سعید صاحب نے تقریر کی کہ حضرت شیخ الہندؒ کی رحلت کے بعد سے مسلمانانِ ہند کی قیادت کی مسند خالی ہے۔ اور اب جو مرحلہ درپیش ہے اُس میں ''شیخ الہند'' سے بھی بڑھ کر ''امام الہند'' کی ضرورت ہے۔ اب غور کرو اور اس کے لیے کسی موزوں شخص کو تلاش کر کے اس کے ہاتھ پر بیعت کرو اور جدوجہد کا آغاز کر دو۔ لیکن اللہ تعالیٰ کو کچھ اور ہی مطلوب تھا۔ چنانچہ علامۃ الہند مولانا معین الدین اجمیری اٹھے اور انہوں نے براہِ راست مولانا آزاد کو خطاب کر کے ان الفاظ سے اپنی تقریر کا آغاز کیا کہ ''ایاز قدرِ خود بشناس!'' جس سے بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ پوری تقریر میں کیا کچھ ہو گا۔ بہرحال اس سے دل شکستہ اور دل برداشتہ ہو کر مولانا اس کام ہی سے دست کش ہو گئے اور اس کے فوراً بعد ہی انہوں نے کانگریس میں شمولیت اختیار کر لی!

اس پر ہمیں محترم احمد حسین کمال صاحب [1] کا درج ذیل مکتوب ملا، جس کا آغاز تو نہایت مشفقانہ ہے لیکن اختتام اسی قدر متحدیانہ (challenging) ہے:

''مکرم و محترم، ڈاکٹر اسرار احمد صاحب، سلام ورحمۃ

آپ کا مؤقر ماہنامہ ''میثاق'' گاہے بگاہے موصول ہوتا رہتا ہے۔ میں اس کے لیے آپ کا نہایت ممنون ہوں۔

میں ہمیشہ آپ کے مضامین بغور پڑھتا ہوں اور آپ کے دینی جذبہ کی تعریف کیے بغیر نہیں رہ سکتا ہوں۔

تاہم آپ کے افکار اور آپ کا طریق تنظیم، ابتدائی دور کی، جماعت اسلامی، اور مودودی صاحب کے انداز کا سا ہے اور اس کے نتائج و مراحل کے بارے میں بہت سے اندیشے سامنے آجاتے ہیں۔

لیکن فی الحال میرا ارادہ اس سلسلے میں کسی تبصرہ اور تنقید کا نہیں ہے، بلکہ اس عریضہ کا مقصد آپ کی توجہ، آپ کی ایک حالیہ تحریر کی طرف مبذول کرانا ہے، جو ماہنامہ ''میثاق''، نومبر ۱۹۷۴ء میں ''تذکرہ و تبصرہ'' کے زیر عنوان شائع ہوئی ہے۔

آپ کے اس طویل مقالے کے بہت سے مقامات ایسے ہیں جو قابل گفتگو ہیں، لیکن یہاں میں صرف ایک مقام کی بات کرنا چاہتا ہوں جو ''میثاق'' کے اس پرچہ کے

(۱) ڈاکٹر کمال صاحب سے غائبانہ تعارف تو راقم الحروف کو کچھ پہلے سے بھی حاصل تھا، لیکن بالمشافہ ملاقات ان سے ۷۰۔۱۹۶۹ء میں ہوئی جبکہ پاکستان کی سیاسی فضا میں بڑی گرما گرمی تھی اور دائیں اور بائیں بازو کے درمیان کچھ کاغذی اور کچھ ہوائی جنگ بڑے زور وشور کے ساتھ جاری تھی۔ جس میں دوسرے بہت سے ''متقابلین'' کے شانہ بشانہ جماعت اسلامی اور جمعیت علماء اسلام کے مابین بھی معرکہ آرائی چل رہی تھی —— موصوف اس زمانے میں جمعیت کے ہفت روزہ آرگن ''ترجمان اسلام'' کے مدیر تھے —— اور غالباً جمعیت کے پالیسی بنانے والے حلقوں میں بھی خاصے دخیل تھے۔ بہرحال ان سے مل کر اندازہ ہوا کہ مذہب سے تو ان کا تعلق کچھ واجبی اور روایتی سا ہی ہے، البتہ وہ ایک منجھے ہوئے سیاسی کارکن اور پختہ سوشلسٹ ورکر ہیں۔ بعد میں وہ کراچی منتقل ہوگئے اور ''جمعیت اکادمی'' کے نام سے کچھ کتابیں بھی انہوں نے شائع کیں جن میں سے ایک مولانا آزاد مرحوم کی سیاسی بصیرت سے متعلق بھی تھی۔ راقم کا خیال تھا کہ یہ اکادمی جمعیت علماء اسلام ہی کا کوئی ذیلی ادارہ ہے، لیکن پچھلے دنوں کراچی جانا ہوا تو بڑی تلاش وجستجو سے راقم کورنگی کراچی میں ڈاکٹر صاحب کے دولت خانے پر حاضر ہوا۔ اگرچہ ملاقات کا شرف تو حاصل نہ ہوسکا تاہم یہ معلوم کر کے کچھ حیرت بھی ہوئی اور کسی قدر دکھ بھی ہوا کہ نہ صرف وہ خود بلکہ ان کے پسرِ کلاں بھی روسی سفارت خانے کے کسی ذیلی ادارے میں ملازم ہیں —— اگرچہ ساتھ ہی یہ خیال بھی آیا کہ ع ''پہنچی وہیں پہ خاک جہاں کا خمیر تھا!'' اُمید ہے کہ ڈاکٹر صاحب ہماری اس ''حق گوئی'' کا برا نہ منائیں گے!

صفحہ ۳۹ پر ہے اور حضرت مولانا ابوالکلام آزادؒ سے متعلق ہے۔

آپ نے محترم پروفیسر یوسف سلیم چشتی صاحب کے حوالہ سے جو واقعہ جمعیت علماءِ اسلام کے اجلاس منعقدہ، دہلی، اپریل ۱۹۲۲ء کے بارے میں لکھا ہے میں اس کے بارے میں عرض کرنا چاہتا ہوں تاکہ آپ ایک تاریخی واقعہ کی تصحیح فرمالیں۔

جمعیت علماءِ ہند ۱۹۱۹ء میں قائم ہوئی۔

پہلا اجلاس امرتسر میں ہوا، اور پہلے صدر مولانا عبدالباری فرنگی محلی منتخب ہوئے۔

دوسرا اجلاس ۱۹۲۰ء میں دہلی میں ہوا، اور شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ اس کے صدر تھے۔

تیسرا اجلاس ۱۹۲۱ء میں لاہور میں منعقد ہوا، مولانا ابوالکلام آزاد اس کے صدر تھے۔

اس سال اپریل میں مولانا آزاد گرفتار کرلیے گئے۔

قولِ فیصل کے نام سے ان کا مشہور تاریخی بیان اس گرفتاری کے بعد ہی علی پور کلکتہ کی جیل میں عدالت کے سامنے دیا گیا تھا۔

چنانچہ ۱۹۲۲ء میں مولانا، جیل میں تھے، دوسرے یہ کہ ۱۹۲۲ء کے جمعیت علماءِ اسلام کا اجلاس، دہلی میں نہیں، گیا، صوبہ بہار میں منعقد ہوا تھا۔ اور مولانا آزاد کی گرفتاری پر احتجاج کا ریزولیشن پاس کیا گیا تھا۔ نیز مولانا کو مبارکباد کا تار بھی بھیجا گیا تھا۔

اس اجلاس کی صدارت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب دیوبندی نے کی اور اس سال کے جمعیت علماء اسلام کے صدر بھی مولانا حبیب الرحمٰن صاحب ہی تھے۔ اس تفصیل سے آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ مولانا آزادؒ اور مولانا معین الدین اجمیری سے منسوب ''میثاق'' میں ذکر کردہ اس واقعہ کی کیا حقیقت رہ جاتی ہے۔

مجھے عرض کرنا پڑتا ہے کہ مولانا آزاد کے معاملہ میں بعض حلقوں کے احساسِ کمتری نے بہت سے، خانہ ساز جھوٹ تراشے ہیں، یہ بھی منجملہ ان کے ایک ہے۔

۱۹۲۲ء میں نہ تو جمعیت علماء اسلام کا اجلاس دہلی میں ہوا، نہ مولانا اس سال قید فرنگ سے آزاد تھے۔

پھر بھلا اس سارے افسانہ کی کیا حقیقت ہے۔ پتا نہیں پروفیسر یوسف سلیم چشتی صاحب تک یہ روایت کن صاحب نے پہنچائی۔

کانگریس میں حضرت مولانا آزاد کی شمولیت کسی ردعمل کا نتیجہ نہیں تھی بلکہ ان کے دینی اور سیاسی پروگرام کا ایک جزو تھی۔ اس موضوع پر میں تفصیل سے روشنی ڈال

سکتا ہوں، مگر ابھی صرف اتنے پر ہی اکتفا کرتا ہوں۔

اگر آپ کی حق پسندی اجازت دے تو ''میثاق'' کی آئندہ اشاعت میں، ان سطور کو شائع فرما دیجیے۔

بہر حال میں نے اپنا فرض ادا کر دیا ہے۔ والسلام کمال'

اس خط کی وصولی پر راقم نے سب سے پہلے تو اللہ کا شکر ادا کیا کہ مضمون میں روایت کے ساتھ راوی کا نام بھی درج کر دیا گیا تھا اور وہ بفضلہٖ تعالیٰ ابھی بقید حیات ہیں۔ پھر جب پروفیسر یوسف سلیم چشتی صاحب سفرِ کراچی سے واپس آئے تو معاملہ ان کے سامنے رکھ دیا۔ لیکن انہوں نے صرف یہ مزید وضاحت کر کے کہ مجھے یہ واقعہ مولانا عبدالحامد بدایونی مرحوم کے برادرِ بزرگ مولانا عبدالماجد بدایونی نے سنایا تھا اور وہ اس اجتماع میں بنفس نفیس موجود تھے، یہ کہہ کر جان چھڑالی کہ ''ہوسکتا ہے کہ سن کے بارے میں میری یادداشت نے غلطی کی ہو، بہر حال میرے پاس ان باتوں کی تحقیق و تفتیش کے لیے وقت نہیں ہے!''

چشتی صاحب تو یہ کہہ کر فارغ ہو گئے لیکن ظاہر ہے کہ ہمارے لیے یہ معاملہ اتنا غیر اہم نہ تھا۔ چنانچہ غور شروع ہوا کہ اس سلسلے میں کس سے رجوع کیا جائے۔ اوّلاً ذہن مولانا سید حامد میاں صاحب کی جانب منتقل ہوا کہ وہ مولانا محمد میاں صاحب کے فرزند ارجمند ہیں، جو جمعیت علماءِ ہند کی اہم شخصیتوں میں سے ہیں۔ چنانچہ ان سے رجوع کیا گیا لیکن معلوم ہوا کہ وہ اس پورے معاملے سے بالکل بے خبر ہیں۔

اچانک ذہن جماعت اسلامی کے بزرگ رکن اور مشہور صحافی ملک نصر اللہ خاں عزیزؔ کی طرف منتقل ہوا۔ موصوف کے بارے میں کبھی یہ بات سننے میں آئی تھی کہ انہوں نے مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم کے ہاتھ پر بیعت کی (۱) تھی۔ موصوف اب بہت ضعیف بھی ہیں اور بالکل گوشہ گیر بھی، ان سے ان کے فرزند اکبر ملک ظفر اللہ خان صاحب کی وساطت سے رابطہ

(۱) ملک صاحب نے نہ صرف اس کی توثیق فرمائی بلکہ یہ بھی بتایا کہ ۱۹۳۰ء میں وہ گونڈہ جیل میں مولانا آزاد کے ساتھ ہی نظر بند تھے۔ اور وہیں ''ترجمان القرآن'' کی جلد اوّل کی طباعت و اشاعت کے سلسلہ میں اشتراکِ عمل طے پایا تھا۔ ملک صاحب نے مزید بتایا کہ بعد میں جب جماعت اسلامی قائم ہوئی اور ملک صاحب اس میں شامل ہو گئے تو ڈاکٹر نذیر احمد الہ آبادی نے مولانا ابوالکلام آزاد کو جماعت کا لٹریچر پہنچایا اور ملک صاحب نے بھی اس سلسلے میں ان سے بات کی تو انہوں نے فرمایا: ''کام تو درست ہے، لیکن میں مودودی صاحب کی صلاحیت اور استعداد سے واقف نہیں ہوں۔ مزید برآں اگر میں جماعت میں شامل ہوں تو ظاہر ہے کہ پھر پروگرام بھی میں دوں گا!'' اس پر گفت وشنید کا یہ سلسلہ ختم ہو گیا۔

قائم کیا جن سے راقم کو اسلامی جمعیت طلبہ کے زمانے سے نیاز حاصل ہے، تو کچھ امید افزا صورت نظر آئی۔ چنانچہ ان کی خدمت میں باقاعدہ حاضری دے کر معلومات حاصل کیں۔ ملک صاحب نے فرمایا:

''۱۹۲۱ء میں جمعیت علماءِ ہند کا جو اجلاس بریڈلا ہال لاہور میں ہوا تھا (۱) اس موقع پر یہ خبر گرم تھی کہ مولانا ابوالکلام آزاد کو امام الہند مان کر بیعت کی جائے گی، لیکن بعد میں کچھ نہ ہوا۔ اور معلوم ہوا کہ اندرونِ خانہ دیوبندی علماء میں سے مولانا شبیر احمد عثمانی اور غیر دیوبندی علماء میں سے مولانا معین الدین اجمیری نے شدت کے ساتھ اس کی مخالفت کی تھی!''

مزید برآں، ملک صاحب نے اس کی بھی توثیق فرمائی کہ مولانا عبدالماجد بدایونی بھی اس اجلاس میں موجود تھے!

اس سے اصولی طور پر تو چشتی صاحب کی روایت کی تصدیق ہو گئی تاہم ابھی مزید تحقیق کا خیال تحت الشعور میں موجود تھا کہ ایک خاص ضرورت سے کراچی میں مولانا منتخب الحق قادری (۲) کی خدمت میں حاضری کا موقع ہوا تو اچانک ذہن اِدھر منتقل ہوا کہ مولانا موصوف کو مولانا معین الدین اجمیریؒ کے تلمیذِ رشید کی حیثیت حاصل ہے چنانچہ اُن سے بھی معاملہ زیر بحث کے متعلق استفسار کر دیا گیا۔ جواباً مولانا نے باقاعدہ اِملا کرایا کہ:

''مولانا (معین الدین اجمیری) نے بغیر تاریخ اور سن کے ذکر کے تذکرہ فرمایا کہ کسی کو امام الہند ماننے کی تجویز زیر غور تھی۔ اس کے لیے پہلے سے خط و کتابت بھی چل رہی تھی، بعد ازاں جامع مسجد دہلی میں ایک جلسہ ہوا جس میں تمام علماءِ ہند جمع ہوئے اور اس موضوع پر نہایت زوردار تقریریں ہوئیں اور سب نے اس تجویز سے اتفاق کیا۔ مولانا آزاد کی تقریر گویا حرفِ آخر کا درجہ رکھتی تھی جس سے تمام حاضرین مسحور سے ہو گئے اور یہ آوازیں بھی بلند ہوئیں کہ ہاتھ بڑھائیے ہم آپ کے ہاتھ پر بیعت کرتے ہیں! اس پر میں نے صدرِ جلسہ سے صرف پانچ منٹ کچھ کہنے کے لیے مانگے جو بہت مشکل سے اس شرط کے ساتھ ملے کہ چھٹا منٹ کسی صورت نہ ہونے پائے۔ میں نے کھڑے ہو کر

(۱) جمعیت علماءِ ہند کے اس اجلاس کا ذکر ڈاکٹر شیر بہادر پنی کی ایک حالیہ تالیف ''افاداتِ مہر'' میں دو طرح آیا ہے: (دیکھئے چوکھٹہ، ص ۷۰)

(۲) مولانا کراچی یونیورسٹی میں ڈین آف فیکلٹی آف تھیالوجی ہیں۔ راقم کو ۶۴-۱۹۶۳ء میں ایم اے اسلامیات کی تعلیم کے سلسلے میں مولانا سے شرف تلمذ حاصل ہوا تھا۔ ان کی خدمت میں مذکورہ حاضری دوسری سالانہ قرآن کانفرنس کے سلسلے میں ہوئی تھی۔

عرض کیا کہ علماء کے اس موقر اجتماع میں تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں ہے اور صرف اشارہ کافی ہے۔ میں جملہ علماء کی توجہ حضرت عمرؓ کی اس تقریر کی طرف مبذول کرانا چاہتا ہوں جو آپؓ نے حج سے واپسی پر اس قسم کا چرچا سن کر کی تھی کہ لوگ کہہ رہے ہیں کہ اگر حضرت عمرؓ کا انتقال ہو گیا تو ہم فوراً اور دفعۃً فلاں شخص کے ہاتھ پر بیعت کر لیں گے۔ حضرت عمرؓ نے حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف کو حکم دیا کہ لوگوں کو جمع کریں اور پھر فرمایا کہ ''فلتةً بیعة''(۱) اُمت کے حق میں کبھی مفید نہیں ہوگی۔ اگر لوگ حضرت ابوبکرؓ کی بیعت سے استدلال کریں گے تو بہت بڑی غلطی کا ارتکاب کریں گے' اس لیے کہ حضرت ابوبکرؓ واحد شخصیت ہیں جن کے لیے اس قسم کی بیعت خالی از مضرت تھی۔ انؓ کے علاوہ کوئی دوسرا شخص ایسا موجود نہیں ہے! —— میرے اس توجہ دلانے پر جلسے کا رنگ ایک دم تبدیل ہو گیا۔ میری تائید میں مولانا انور شاہ صاحب نے ایک نہایت غامض اور دقیق تقریر فرمائی اور مولوی شبیر احمد عثمانی نے بھی میری تائید کی اگرچہ اس سے پہلے وہ اصل تجویز کی تائید میں تقریر کر چکے تھے!''

مزید برآں مولانا منتخب الحق صاحب قادری نے یہ بھی فرمایا کہ ''جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے مولانا نے اس اجلاس کی صدارت کے ضمن میں حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحب کا ذکر فرمایا تھا!'' اور یہ بھی فرمایا کہ ''میں نے اس موضوع پر ایک خط کی نقل نصیر میاں (۲) کے پاس دیکھی ہے جو مولانا نے عبدالباری فرنگی محلی کے نام تحریر فرمایا تھا!''

گویا راقم کے سمندِ شوق کو ایک اور ایڑ لگ گئی' چنانچہ کشاں کشاں حکیم نصیر الدین صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا' اور ان سے متذکرہ بالا خط کی فوٹو سٹیٹ کاپی حاصل کی جس کی عبارت درج ذیل ہے:

''از دارالخیر' اجمیر

۲ / ستمبر ۱۹۲۱ء

مرجع انام حضرت مولانا صاحب دامت برکاتہم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ!

والا نامہ نے عزت بخشی' سابق والا نامہ چونکہ جواب طلب نہ تھا اس وجہ سے تاریخ مقررہ

(۱) یعنی کسی ہنگامی اور جذباتی فضا میں دفعۃً اور اچانک کسی کے ہاتھ پر بیعت کر لینا۔

(۲) حکیم نصیر الدین صاحب مالک نظامی دوا خانہ' صدر کراچی فرزند مولانا حکیم نظام الدین مرحوم برادرِ خورد مولانا معین الدین اجمیریؒ۔

آنمخدوم کو ذہن میں رکھ کر عریضہ حاضر کرنے کی ضرورت نہ سمجھی کہ ۱۵/ محرم الحرام کے بعد حاضر خدمت ہو کر آنمخدوم کی ہم رکابی میں پنجاب روانہ ہو جاؤں گا۔ یہی ارادہ اب بھی ہے۔ اطلاعاً عرض کیا گیا —— لیکن دہلی کے جلسہ جمعیۃ العلماء کی شرکت نے اس سفر میں ایک جدید مانع پیش کر دیا' کیونکہ اس کی تجویز کے مطابق ۱۷ و ۱۸ ستمبر کو جلسہ منتظمہ قرار پایا ہے۔ اس میں ضبطی فتویٰ و مسئلہ امامت پیش ہوگا جس کی طرف جناب مولوی ابوالکلام صاحب کو بے حد رجحان ہے۔ چونکہ ان کو اس مسئلہ سے زیادہ دلچسپی ہے اس وجہ سے خالی الذہن علماء ان کی تقریر سے متاثر ہوئے۔ اگر من جانب فقیر اس کے التوا کے متعلق مختصر و جامع تقریر نہ ہوتی تو کچھ عجب نہ تھا کہ حاضرین علماء اسی وقت اس مسئلہ کو طے کر دیتے۔ اس وجہ سے علماء دہلی کا یہ خیال ہے کہ فقیر خصوصیت کے ساتھ اس جلسہ میں شریک ہو۔ اِدھر جناب مولوی شوکت علی صاحب نزاعِ رنگون کے متعلق زور دے رہے ہیں کہ فقیر جلد سے جلد وہاں پہنچ کر ان نزاعات کا تصفیہ کرائے جن کی وجہ سے وہاں کی کمیٹی خلافت کا وجود خطرہ میں ہے۔ اب میں حیران ہوں کہ کہاں جاؤں اور کس سفر کو پہلے اختیار کروں۔ اس کے متعلق امروز و فردا میں آنمخدوم کی خدمت میں عریضہ حاضر کرنے والا تھا کہ دفعتاً والا نامہ نے شرف بخشا۔ مناسب معلوم ہوا کہ اس کے جواب میں عرضِ حال کر دیا جائے جو آں مخدوم کی رائے ہوگی اس پر عمل پیرا ہونے کے لیے بالکل تیار ہوں۔ فقط

فقیر معین الدین کان اللہ لہٗ''

مندرجہ بالا شواہد اور قرائن کی بنا پر نفس مسئلہ تو بالکل طے ہو گیا' یعنی مولانا ابوالکلام آزاد کے لیے امام الہند کے خطاب اور ان کے ہاتھ پر بیعت کی تجویز اور پھر اس کے ناکام رہ جانے میں مولانا معین الدین اجمیری کا خصوصی حصہ تو بلا شائبہ ریب و شک ثابت ہو گیا۔ البتہ مختلف روایتوں کی جمع و تطبیق اور کچھ دوسرے قرائن و شواہد کی روشنی میں جو صورت سامنے آتی ہے وہ غالباً کچھ یوں ہے:

۱۔ یہ مسئلہ سب سے پہلے جمعیت العلماء ہند کے اُس دوسرے اجلاس میں زیر بحث آیا جو دہلی میں ۷ تا ۹ ربیع الاول ۱۳۳۹ھ (مطابق نومبر ۱۹۲۰ء) حضرت شیخ الہندؒ کے زیر صدارت منعقد ہوا اور جس کے تقریباً دس ہی دن کے بعد ان کا انتقال ہو گیا۔ اور اُسی موقع کی روداد ہے جو مولانا معین الدین اجمیریؒ نے مولانا منتخب الحق صاحب کو سنائی اور انہوں نے راقم کو املا کرائی۔ ظاہر ہے کہ اس موقع پر مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم کی ذات زیر بحث نہیں آئی تھی بلکہ

اس اصولی اعتراض پر کہ ایسے اہم معاملے پر فیصلہ اچانک نہیں کر لیا جانا چاہیے' تجویز زیرِغور پر فیصلہ ملتوی کیا گیا تھا تا کہ مزید مشورہ بھی ہو سکے اور سوچ بچار بھی!

۲ ۔ فطری طور پر اس کے بعد یہ معاملہ بحث وتمحیص اور خط وکتابت کا موضوع بنا رہا ہوگا تا آنکہ جمعیت کا وہ تیسرا اجلاس سر پر آ پہنچا جو لاہور میں نومبر ۱۹۲۱ء میں منعقد ہوا۔ چنانچہ بعض دوسرے امور کے علاوہ خاص اس مسئلے پر بھی حتمی فیصلہ کر لینے کے لیے مجلس منتظمہ کا وہ اجتماع ۱۷یا۱۸ ستمبر ۱۹۲۱ء کو دہلی میں منعقد ہونا طے پایا جس کا ذکر مولانا معین الدین اجمیریؒ نے اپنے مکتوب بنام مولانا عبدالباری فرنگی محلیؒ محررہ ۲ ستمبر ۱۹۲۱ء میں کیا ہے —— اغلبًا یہی وہ اجلاس ہے جس میں وہ واقعہ پیش آیا جس کی روایت مولانا عبدالماجد بدایونی مرحوم کی وساطت سے مخدومی پروفیسر یوسف سلیم چشتی کو اور ان سے راقم کو پہنچی اور درجِ ''میثاق'' ہوئی۔ ظاہر ہے کہ یہی وہ موقع تھا جہاں ''امام الہند'' کے عظیم ورفیع منصب کے لیے جس شخص کا نام تجویز کیا جا رہا تھا اس کی ذات لامحالہ زیرِ بحث آتی اور اس سلسلے میں جو کچھ مولانا ابوالکلام آزاد کے بارے میں مولانا معین الدین اجمیری نے کہا ہوگا اس کا کسی قدر اندازہ ان کے اُس ایک جملے ہی سے بخوبی ہو جاتا ہے جو محولہ بالا خط میں موجود ہے یعنی ''اس میں ضبطیٔ فتویٰ اور مسئلۂ امامت پیش ہوگا جس کی طرف جناب مولوی ابوالکلام صاحب کو بے حد رجحان ہے'' اور یہ بات بالکل قرین قیاس ہے کہ بحث کی گرما گرمی میں مولانا معین الدین اجمیری نے مولانا ابوالکلام آزاد کو براہِ راست خطاب کر کے کہا ہو کہ ''ایاز قدرِ خود بشناس!۔ کہاں تم اور کہاں یہ رفیع وعالی منصب! تم ایسے نوعمر (مولانا آزاد مرحوم کی عمر اس وقت کل ۳۳ برس تھی!) کو تو اکابر علماء کی موجودگی میں زبان کھولنا بھی مناسب نہیں! رہا تمہارا علم وفضل تو اس کا بھانڈا ابھی پھوٹا جاتا ہے ذرا منطق کی فلاں کتاب کی عبارت تو پڑھ کر سنا دو!'' —— چنانچہ لگ بھگ اسی مفہوم پر مشتمل تھے وہ کلمات جو چشتی صاحب نے نقل فرمائے تھے اور راقم نے جان بوجھ کر حذف کر دیے تھے —— اور صرف ''ایاز قدرِ خود بشناس!'' کے الفاظ سے کلام کے رُخ کی جانب اشارہ کرنے پر اکتفا مناسب سمجھا تھا!

۳ ۔ اس کے دوسوا دو ماہ بعد ہوا بریڈلا ہال لاہور میں جمعیت کا وہ تیسرا اجلاس جس کا ذکر ع ''دیکھنے ہم بھی گئے تھے پر تماشا نہ ہوا!'' کے سے انداز میں فرمایا ہے ملک نصر اللہ خاں عزیز صاحب نے' اور جس کی صدارت کے لیے منتظمین نے پیشگی مولانا ابوالکلام آزاد کا نام اس

اُمید میں طے کر دیا ہوگا کہ مجلس منتظمہ میں یہ تجویز بہرحال منظور ہو ہی جائے گی۔ تو جسے امام الہند مان کر اس کے ہاتھ پر عمومی بیعت کرنی ہے کیوں نہ یہ اجلاس اسی کی صدارت میں ہو۔ یہ دوسری بات ہے کہ مجلس منتظمہ کے اجتماع میں تجویز پاس ہونے سے رہ گئی۔ چنانچہ لاہور کا اجلاس خانہ پری کے لیے ہوا تو سہی لیکن کچھ یونہی پھیکے سے انداز میں۔ یہی وجہ ہے کہ خود مولانا آزاد اس میں اُکھڑے سے رہے جس کا تذکرہ ہے' ڈاکٹر شیر بہادر خاں پنی کی بیان کردہ روداد میں! —— اور بالکل مطابقِ قرائن ہے یہ بات کہ یہی ''اُکھڑاہٹ'' تھی جس کے نتیجے کے طور پر مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم نے جمعیت العلماء کا پلیٹ فارم ہمیشہ کے لیے ترک کر دیا اور ع ''کچھ اور چاہیے وسعت میرے بیاں کے لیے!'' کے مصداق اپنی جولانیٔ طبع کے لیے انڈین نیشنل کانگرس کا وسیع وعریض میدان منتخب کر لیا!!

اب اگر تو ڈاکٹر احمد حسین کمال صاحب ان تفاصیل سے بے خبر ہیں اور اسی بنا پر انہوں نے اس روایت کی تردید کی ہے تو پھر بھی غنیمت ہے۔ لیکن اگر یہ سب کچھ جانتے بوجھتے انہوں نے محض تاریخ اور سن کی ایک معمولی سی غلطی سے فائدہ اٹھا کر اس قدر متحدیانہ انداز میں حقیقت کو جھٹلانے کی کوشش کی ہے تو بہت ہی ہلکی رائے ان کے بارے میں قائم کرنی ہوگی۔ گویا: ؎

اِنْ كُنْتَ لَا تَدْرِىْ فَهٰذَا مُصِيْبَةٌ
وَاِنْ كُنْتَ تَدْرِىْ فَالْمُصِيْبَةُ اَعْظَمُ

ہماری خواہش بہرحال یہ ہے کہ صورتِ حال پہلی ہی ہو —— نہ کہ دوسری!

۲

مسئلہ متذکرہ بالا پر تحقیق وتفتیش کے دوران راقم الحروف پر حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن ؒ کی شخصیت کے بعض ایسے پہلو منکشف ہوئے جن کی جانب پہلے توجہ نہ ہوئی تھی۔ جہاں تک ان کے علم وفضل' تقویٰ وتدین' خلوص وللّٰہیت۔ پھر صبر واستقلال' ہمت وعزیمت اور مجاہدہ ومصابرت' گویا علم اور عمل کی جامعیت کا تعلق ہے اس کا تو کسی قدر اندازہ پہلے بھی تھا لیکن وسعتِ نگاہ اور بالغ نظری کے ساتھ ساتھ وسعتِ قلب اور عالی ظرفی کا جو امتزاج اُن کی ذات میں پایا جاتا تھا اس کی جانب پہلے توجہ نہ ہوئی تھی۔

مولانا ۱۳۳۳ھ میں ہندوستان سے عازمِ حجاز ہوئے تھے۔ جہاں سے گرفتار ہو کر تقریباً تین سال اور سات ماہ حالتِ اسیری میں رہے —— اور رہائی ملنے پر ۲۰ رمضان المبارک

۱۳۳۸ھ مطابق ۸ جون ۱۹۲۰ء کو واپس بمبئی پہنچے۔ اِس کے بعد اُن کی زندگی نے کل چھ ماہ کے لگ بھگ وفا کی اور ۱۸ ربیع الاول ۱۳۳۹ھ مطابق ۳۰ نومبر ۱۹۲۰ء کو وہ خالقِ حقیقی سے جا ملے! پھر اس مختصر مدت کے دوران ضعیفی اور عام نقاہت پر مستزاد مرض و علالت کا بھی مسلسل ساتھ رہا۔ بایں ہمہ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ ایک لمحے کے لیے بھی نہ دین و مذہب اور ملت و اُمت کے مسائل سے فارغ الذہن ہو سکے نہ ملک و وطن کے معاملات سے! اور اس مختصر مدت میں جو چند کام انہوں نے کیے یا کرنے کی کوشش کی ان پر غور کرنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ نہ صرف یہ کہ وہ موجود الوقت صورتِ حال کا بالکل صحیح تجزیہ کر چکے تھے بلکہ ان کی نگاہیں مستقبل کے حالات و واقعات کا بھی نہایت دور تک مشاہدہ کر رہی تھیں۔ مزید برآں ان کی عالی ظرفی اور وسیع القلبی کے تو وہ شواہد سامنے آتے ہیں کہ انسان حیران رہ جاتا ہے کہ ع

ایسی چنگاری بھی یارب اپنی خاکستر میں تھی!

اور اس پس منظر میں، ہمیں معاف فرمایا جائے اگر ہم اپنے آپ کو اپنے اس احساس کے اظہار پر مجبور پائیں، کہ اُن کے جانشینوں میں سے مختلف حضرات ان کی ہمہ گیر شخصیت کے مختلف پہلوؤں کے وارث تو ضرور بنے، لیکن کوئی بھی ان کی جامعیت کا وارث نہ بن سکا۔ گویا ؎

نہ اٹھا پھر کوئی رومیؔ عجم کے لالہ زاروں سے
وہی آب و گِل ایراں وہی تبریز ہے ساقی!

اور صورتِ حال بالکل اس شعر کے مصداق ہوگئی کہ ؎

اڑائے کچھ ورق لالے نے، کچھ نرگس نے، کچھ گل نے
چمن میں ہر طرف بکھری ہوئی ہے داستاں میری!

خصوصاً وہ حضرات جو سیاست، یا جہادِ حریت، یا تحریکِ استخلاصِ وطن کے میدان میں اُن کے جانشین بنے انہوں نے تو اپنے گرد تقلیدِ جامد کا لبادہ اس قدر کس کر لپیٹا کہ دنیا اِدھر سے اُدھر ہوگئی لیکن انہوں نے اپنے موقف میں ترمیم کی کوئی ضرورت محسوس نہ کی۔ حالانکہ اس کے بالکل برعکس کیفیت نظر آتی ہے حضرت شیخ الہندؒ کی شخصیت میں:

مثلاً علمی و تعلیمی اور تہذیبی و تمدنی اعتبار سے ملت اسلامیہ ہند کے بحرِ محیط میں جو دو رَوئیں علی گڑھ اور دیوبند کی صورت میں بالکل مخالف سمت میں بہہ نکلی تھیں اور ان سے جسد ملی کے پارہ پارہ ہونے کا جو شدید خطرہ موجود تھا اس کا بالکل بروقت اور صحیح اندازہ مولانا نے فرما لیا، حالانکہ وہ خود ان میں سے ایک کشتی میں بالفعل سوار تھے اور اس اعتبار سے بالکل خلاف توقع نہ

ہوتا اگر خود ان میں یک رُخا پن پیدا ہو جاتا یا کم از کم فریقِ ثانی کے لیے کوئی نرم گوشہ دل میں موجود نہ رہتا۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ اس چھ ماہ سے بھی کم مدت میں انہوں نے ایک تو علی گڑھ کا دورہ کیا اور وہاں ان کی عالی ظرفی اور وسعتِ قلبی کا یہ مظاہرہ سامنے آیا کہ انہوں نے برملا فرمایا کہ:

''میں نے اس پیرانہ سالی اور علالت و نقاہت کی حالت میں آپ کی اس دعوت پر اس لیے لبیک کہا کہ میں اپنی گم شدہ متاع کو یہاں پانے کا امیدوار ہوں۔ بہت سے نیک بندے ہیں جن کے چہروں پر نماز کا نور اور ذکر الٰہی کی روشنی جھلک رہی ہے...... اے نونہالانِ وطن! جب میں نے دیکھا کہ میرے اس درد کے غم خوار جس میں میری ہڈیاں پگھلی جا رہی ہیں، مدرسوں اور خانقاہوں میں کم اور سکولوں اور کالجوں میں زیادہ ہیں تو میں نے اور چند مخلص احباب نے ایک قدم علی گڑھ کی جانب بڑھایا اور اس طرح ہم نے دو تاریخی مقاموں دیوبند اور علی گڑھ کا رشتہ جوڑا!''(۱)

اور دوسرے جدید اور قدیم کے امتزاج کی سعی —— اور علی گڑھ اور دیوبند کے مابین ایک درمیانی راہ پیدا کرنے کے لیے مسلم نیشنل یونیورسٹی کی بنیاد رکھی جو بعد میں ''**جامعہ ملّیہ**'' کے نام سے موسوم ہوئی۔ یہ بالکل دوسری بات ہے کہ پیش نظر مقصد کے اعتبار سے یہ تجربہ بھی ناکام رہا!

دوسری طرف تحریک استخلاصِ وطن کے ضمن میں ہندو مسلم اشتراکِ عمل کے نظری طور پر قائل اور اس پر بالفعل عامل ہونے کے باوجود مولاناؒ کی نگاہِ حقیقت بین نے ہندوؤں کے طرزِ عمل کا بالکل صحیح مشاہدہ کر لیا اور ان کی نگاہِ دُور رس سے ان کے آئندہ عزائم چھپے نہ رہ سکے۔ چنانچہ جمعیت العلماء کے دوسرے اجلاس میں جو خطبہ صدارت انتقال سے چند روز قبل آپؒ نے ارشاد فرمایا، اس میں یہ واضح انتباہ موجود ہے کہ:

''ہاں، یہ میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں اور آج پھر کہتا ہوں کہ ان اقوام کی باہمی مصالحت اور آشتی کو اگر آپ پائیدار اور خوشگوار دیکھنا چاہتے ہیں تو اس کی حدود کو خوب اچھی طرح دلنشیں کر لیجیے۔ اور وہ حدود یہی ہیں کہ خدا کی باندھی ہوئی حدود میں ان سے کوئی رخنہ نہ پڑے۔ جس کی صورت بجز اس کے کچھ نہیں کہ صلح و آشتی کی تقریب سے فریقین کے مذہبی امور میں سے کسی ادنیٰ امر کو بھی ہاتھ نہ لگایا جائے اور دنیوی معاملات میں ہرگز کوئی ایسا طریقہ اختیار نہ کیا جائے جس سے کسی فریق کی ایذا رسانی اور دل آزاری

(۱) خود نوشت سوانح حیات مولانا حسین احمد مدنیؒ بحوالہ بیس بڑے مسلمان، صفحہ ۲۸۸۔

مقصود ہو۔ مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ اب تک بہت جگہ عمل اس کے خلاف ہو رہا ہے۔ مذہبی معاملات میں تو بہت لوگ اتفاق ظاہر کرنے کے لیے اپنے مذہب کی حد سے گزر جاتے ہیں، لیکن محکموں اور ابوابِ معاش میں ایک دوسرے کی ایذا رسانی کے درپے رہتے ہیں۔ میں اس وقت جمہور سے خطاب نہیں کر رہا ہوں بلکہ میری گزارش دونوں قوموں کے زعماء (لیڈروں) سے ہے کہ ان کو جلسوں میں ہاتھ اٹھانے والوں کی کثرت اور ریزولیشنوں کی تائید سے دھوکا نہ کھانا چاہیے کہ یہ طریقہ سطحی لوگوں کا ہے اور ان کو ہندو و مسلمانوں کے نجی معاملات اور سرکاری محکموں میں متعصّبانہ رقابتوں کا اندازہ کرنا چاہیے۔"[1]

بنا بریں —— یہ بات بلاخوف وتردید کہی جاسکتی ہے کہ اگر مولاناؒ کی زندگی وفا کرتی تو بعد میں ہندوؤں کی جانب سے جس تنگ نظری اور کم ظرفی ہی نہیں منتقمانہ ذہنیت کا مظاہرہ ہوا اس کے پیشِ نظر مولانا یقیناً اپنے طریق کار پر نظر ثانی فرماتے اور کیا عجب کہ مسلمانانِ ہند کے جداگانہ قومی وملی تشخص کے سب سے بڑے علمبردار اور اس کے تحفظ کے لیے عملی سعی وجہد کے "**قائد اعظم**" وہی ہوتے۔

تیسری طرف اس واقعے کو ذہن میں لائیے جس کے راوی ہیں مولانا مفتی محمد شفیع مدّ ظلہ —— کہ اسارتِ مالٹا سے رہائی اور مراجعتِ ہند کے بعد ایک روز دارالعلوم دیوبند میں اکابر علماء کے ایک اجتماع میں حضرت شیخ الہندؒ نے فرمایا کہ ہم نے تو اپنی اسیری کے زمانہ میں دو سبق حاصل کیے ہیں۔ اور جب علماء کرام، جن میں مولانا حسین احمد مدنیؒ، مولانا انور شاہ کاشمیریؒ اور مولانا شبیر احمد عثمانیؒ ایسے اکابر موجود تھے، ہمہ تن متوجہ ہو گئے کہ دیکھیں اس "استاذُ العلماء" نے اس ضعیفی اور پیرانہ سالی میں کون سے دو نئے سبق سیکھے ہیں تو حضرتؒ نے فرمایا:

"میں نے جہاں تک جیل کی تنہائیوں میں اس پر غور کیا کہ پوری دنیا میں مسلمان دینی اور دنیوی ہر حیثیت سے کیوں تباہ ہو رہے ہیں تو اس کے دو سبب معلوم ہوئے۔ ایک ان کا قرآن چھوڑ دینا، دوسرے آپس کے اختلافات اور خانہ جنگی، اس لیے میں وہیں سے یہ عزم لے کر آیا ہوں کہ اپنی باقی زندگی اس کام میں صرف کروں کہ قرآن کریم کو لفظاً اور معناً عام کیا جائے۔ بچوں کے لیے لفظی تعلیم کے مکاتب ہر بستی بستی میں قائم کیے جائیں۔ بڑوں کو عوامی درسِ قرآن کی صورت میں اس کے معانی سے روشناس کرایا

(۱) بیس بڑے مسلمان، صفحہ ۲۹۱۔

جائے اور قرآنی تعلیمات پر عمل کے لیے آمادہ کیا جائے اور مسلمانوں کے باہمی جنگ وجدال کو کسی قیمت پر برداشت نہ کیا جائے۔"

(ماخوذ از وحدتِ اُمت، تالیف مولانا مفتی محمد شفیع مدظلہ، شائع کردہ مکتبہ المنبر لائل پور)

پھر اس اعتراف واظہار ہی پر اکتفا نہیں فرمایا بلکہ ایک عام درسِ قرآن کی نشست کا باقاعدہ بنفسِ نفیس اجراء فرمادیا۔ گویا اب احیائے دین اور تجدید ملت کے لیے کام جس اساس اور نہج پر ہونا چاہیے اس کی جانب رہنمائی فرمادی۔ جس سے ثابت ہوتا ہے کہ مولانا ہرگز لکیر کے فقیر نہ تھے بلکہ آخری عمر میں بھی مسلسل غور وفکر کی عادت برقرار تھی اور بدلتے ہوئے حالات کے تقاضوں کو سمجھ کر اس کے مطابق نقشۂ کار میں ضروری تبدیلی کرنے کی اہمیت ان پر پوری طرح واضح تھی اور اُمت کے زوال وانحطاط کے اسباب پر ایک ماہر معالج کے سے انداز میں تشخیص و تجویز پر ہمیشہ نظر ثانی کرتے رہنا آپؒ کی عادتِ ثانیہ تھی۔

حضرت شیخ الہندؒ کی وسعتِ قلبی اور عالی ظرفی کا سب سے بڑا مظہر مولانا آزاد کے معاملے میں انؒ کا طرزِ عمل ہے! بڑے لوگوں کی بڑائی کا ایک اہم پہلو چھوٹوں کی بڑائی کا اقرار اور ان کی اُبھرتی ہوئی شخصیتوں کو خواہ مخواہ اپنے لیے ایک چیلنج سمجھ کر انہیں دبانے کی فکر کرنے کی بجائے ان کی سرپرستی اور حوصلہ افزائی کی صورت میں سامنے آتا ہے۔ اور اس پہلو سے واقعہ یہ ہے کہ عظمت کا کوہِ ہمالیہ معلوم ہوتے ہیں حضرت شیخ الہندؒ۔

۱۹۱۲ء میں جب مولانا آزاد مرحوم نے "الہلال" نکالنا شروع کیا تو اُس وقت ان کی عمر کا کل چوبیسواں سال تھا، جبکہ حضرت شیخ الہندؒ ساٹھ سے متجاوز ہو چکے تھے۔ اور جب ۱۹۲۰ء میں مولانا آزاد کو "امام الہند" ماننے کی تجویز زیرِ غور تھی اُس وقت وہ بمشکل بتیس برس کے تھے جبکہ حضرت شیخ الہندؒ ستر کے قریب پہنچ چکے تھے، گویا عمر میں آدھوں آدھ سے زیادہ کا فرق و تفاوت تھا! —— پھر کہاں جملہ علمائے ہند[1] کا بے تاج بادشاہ، انگریزی سامراج کے خلاف ڈٹ جانے والوں کا سرخیل[2] دیوبند ایسی عظیم درسگاہ کا صدر مدرس، اور مولانا انور شاہ

(۱) واضح رہے کہ اس وقت تک دیوبندی اور بریلوی کی تقسیم عمل میں نہ آئی تھی اور جمعیت علمائے ہند جملہ علمائے ہند کا مشترک پلیٹ فارم تھی!

(۲) اس اعتبار سے مولانا کے مقام اور مرتبے کا کچھ اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ مالٹا سے واپسی پر جس روز انہوں نے بمبئی کے ساحل پر قدم رکھا اس روز ان کی خدمت میں حاضر ہونے والوں میں نمایاں نام مولانا عبدالباری فرنگی محلی اور مسٹر موہن داس کرم چند گاندھی کے ہیں!

کاشمیریؒ‘ مولانا اشرف علی تھانویؒ‘ مفتی کفایت اللہ دہلویؒ‘ مولانا حسین احمد مدنیؒ اور مولانا شبیر احمد عثمانیؒ ایسے اکابر علماء کا استاذ‘ اور کہاں: ایک نوخیز نوجوان ——— جس کی زبان میں تاثیر‘ قلم میں زور اور ”اس کے سینے میں ہے نغموں کا تلاطم اب تک!“ کے مصداق جہاد کا جذبہ اور جوش تو بے شک موجود تھا لیکن نہ جبہ وعمامہ نہ عبا وقبا‘ نہ کہیں کے مفتی نہ شیخ الحدیث‘ حتیٰ کہ نہ کہیں کی سندِ فراغت نہ دستارِ فضیلت‘ ایک قرآن کا عاشق ہونے سے کیا ہوتا ہے‘ نہ کسی حدیث کی کتاب پر حاشیہ کا مصنف‘ نہ فقہ کی باریکیوں کا مسلّم نکتہ دان‘ ——— بایں ہمہ اُس استاذ العلماء کا یہ قول ان کے شاگردوں کے حلقے میں معروف ہے کہ ”اس نوجوان (ابوالکلام آزاد) نے ہمیں اپنا بھولا ہوا سبق یاد دلا دیا!“ اللہ اکبر! ہے کوئی حد اس وسعتِ قلبی اور عالی ظرفی کی! ﴿فَارْجِعِ الْبَصَرَ ۙ هَلْ تَرٰى مِنْ فُطُوْرٍ﴾ (الملك)۔ مزید غور فرمائیے: ہندوستان تقلید کا گڑھ ہے یہاں اسلام کے معنی ہی حنفیت کے ہیں۔ اور تقلید کے دائرے سے باہر قدم نکالنے کے معنی گویا اسلام سے نکل جانے کے ہیں۔ اور بقول مولانا سید محمد انور شاہ کاشمیریؒ ”علمی کام“ کا مطلب یہاں صرف یہ رہا ہے کہ مسلکِ حنفی کی فوقیت دوسرے مسلکوں پر ثابت کی جائے (۱) ——— اور خود حضرت شیخ الہندؒ پکے حنفی تھے چنانچہ بیس بڑے مسلمان کے مرتب کے الفاظ میں خود ان کا حال یہ تھا کہ:

> ”مسائل مختلف فیہا میں ائمہ ثلاثہ رحمہم اللہ بلکہ دیگر مجتہدین کے مذاہب بھی بیان فرماتے اور مختصر طور سے دلائل بھی نقل کرتے‘ لیکن جب امام ابوحنیفہؒ کا نمبر آتا تو مولانا کے قلب میں انشراح‘ چہرہ پر بشاشت‘ تقریر میں روانی‘ لہجہ میں جوش پیدا ہو جاتا۔ دلیل پر دلیل‘ شاہد پر شاہد‘ قرینہ پر قرینہ بیان کرتے چلے جاتے‘ تقریر رکتی ہی نہ تھی اور اس خوبی سے مذہب امام اعظمؒ کو ترجیح دیتے تھے کہ سلیم الطبع اور منصف مزاج لوگ لوٹ لوٹ جاتے تھے......“ (صفحہ ۲۳۷)

دوسری طرف ابوالکلام آزاد حنفیت سے حد درجہ بعید‘ تقلید سے کوسوں دُور ایک آزاد خیال انسان‘ جس کی اصل عقیدت تھی امام ابن تیمیہؒ سے ——— بایں ہمہ مولاناؒ ان کے جوہر قابل کے قائل بھی ہیں اور انہیں ”امام الہند“ مان لینے کی تجویز کے پرزور مؤید بھی ——— پھر غور کیجیے کہ ہے کوئی حد اس عالی ظرفی اور وسعتِ قلبی کی اور ہے اس کی کوئی دوسری مثال اس دور میں! ﴿ثُمَّ

(۱) مولانا انور شاہؒ کے اس قول کے راوی بھی مولانا مفتی محمد شفیع ہی ہیں۔ ان کا فرمانا ہے کہ آخری عمر میں مولانا پر شدید حسرت طاری ہوگئی تھی کہ پوری زندگی کس بے کار مشغلے میں بسر کر دی!

ارْجِعِ الْبَصَرَ كَرَّتَيْنِ يَنْقَلِبْ اِلَيْكَ الْبَصَرُ خَاسِئًا وَّهُوَ حَسِيْرٌ﴾ (الملك)۔

کاش کہ علمائے کرام ہماری ان گزارشات پر سیخ پا نہ ہوں بلکہ ٹھنڈے دل سے غور کریں کہ ع ”وہ کیا گردوں تھا تو جس کا ہے اِک ٹوٹا ہوا تارا!“

واضح رہے کہ جمعیت علماءِ ہند ۱۹۱۹ء میں قائم ہوئی تھی اور اگرچہ اس کے قیام کے وقت حضرت شیخ الہندؒ ہندوستان سے باہر تھے‘ تاہم چونکہ اس کے مؤسس اصلی مولانا مفتی کفایت اللہ دہلویؒ تھے جو حضرت شیخ الہندؒ کے شاگرد بھی تھے اور نہایت معتمد رفیق کار بھی۔ لہٰذا اس کی پشت پر اصل کارفرما ذہن حضرت شیخ الہندؒ ہی کا تھا۔

دوسری طرف اگرچہ اس میں چند ایک اہلحدیث عالم بھی تھے جیسے مولانا سید محمد داؤد غزنویؒ‘ تاہم اس پر اصل غلبہ ”حنفیت“ ہی کا تھا خواہ اس کا دیوبندی ایڈیشن ہو خواہ غیر دیوبندی جیسے فرنگی محلی خیرآبادی‘ بدایونی اور بریلوی۔ ان حالات میں مولانا ابوالکلام آزاد ایسے آزاد منش شخص کے ”امام الہند“ قرار دیے جانے کی کسی تجویز کے زیرِ غور آنے کا سوال ہی ہرگز پیدا نہ ہوسکتا اگر اس کی پشت پر حضرت شیخ الہند کی پرزور تائید ہی نہیں تحریک نہ ہوتی۔ اور ان کی وفات کے بعد بھی جس قدر رشد و مد کے ساتھ اس تجویز کے لیے کام کیا مفتی کفایت اللہؒ اور مولانا احمد سعیدؒ نے اس کا بھی کوئی امکان نہیں تھا اگر یہ ان کے استاذ اور شیخ رحمۃ اللہ علیہ کی خواہش نہ ہوتی ——— رہا یہ مسئلہ کہ اس تجویز کے ناکام رہنے کا اصل سبب کیا تھا تو اگرچہ بظاہر احوال تو یہ نظر آتا ہے کہ حنفیت کی شدت یا روایتی اور مدرسی علم کا ادّعا آڑے آ گیا‘ لیکن اصل سبب وہی ہے کہ ”مَا شَاءَ اللّٰهُ كَانَ وَمَا لَمْ يَشَأْ لَمْ يَكُنْ“ حضرت شیخ الہندؒ کا خلوص واخلاص اپنی جگہ پر لیکن علم وحکمت الٰہی سب سے اوپر ہے۔ فَاِنَّكَ تَعْلَمُ وَلَا نَعْلَمُ وَتَقْدِرُ وَلَا نَقْدِرُ اور وہی بہتر جانتا ہے کہ آیا احیائے اسلام کی اس براہِ راست جدوجہد کے لیے ابھی ماحول ہی سازگار نہ تھا‘ بقول شاعر ؎

ابھی نہ چھیڑ محبت کے راگ اے مطرب
ابھی حیات کا ماحول سازگار نہیں!

یا جیسے کہ بعد کے حالات و واقعات سے ثابت ہوا۔ اس عظیم مقصد کے لیے مولانا ابوالکلام آزاد کی شخصیت ہی موزوں نہ تھی گویا ؎

نہ مصطفیٰ نہ رضا شاہ میں نمود اس کی
کہ رُوحِ شرق بدن کی تلاش میں ہے ابھی!

بہر حال ہمارے لیے اصل قابل توجہ مسئلہ یہ ہے کہ ابوالکلام کی دعوت کا وہ عنصر کون سا تھا جس نے استاذ الاساتذہ اور شیخ الشیوخ مولانا محمود حسنؒ دیو بندی ایسی عظیم شخصیت کو مسحور کر دیا تھا۔ اس کا مختصر ترین جواب یہ ہے کہ مولانا ابوالکلام کی دعوت بنیادی طور پر دو امور کی جانب تھی ایک: قرآن اور دوسرے: جہاد۔

پہلے نکتے کی وضاحت کے لیے کفایت کرے گا حسبِ ذیل اقتباس جو ماخوذ ہے ''البلاغ'' کے پہلے شمارے سے جو شائع ہوا تھا ۱۲ نومبر ۱۹۱۵ء کو[۱]:

''اگر ایک شخص مسلمانوں کی تمام موجودہ تباہ حالیوں اور بدبختیوں کی علتِ حقیقی دریافت کرنا چاہے اور ساتھ ہی یہ شرط بھی لگا دے کہ صرف ایک ہی علت اصلی ایسی بیان کی جائے جو تمام علل و اسباب پر حاوی اور جامع ہو تو اس کو بتایا جا سکتا ہے کہ علماء حق و مرشدین صادقین کا فقدان اور علماء سوء و مفسدین دجالین کی کثرت —— رَبَّنَـآ اِنَّـآ اَطَعۡنَا سَادَتَنَا وَكُبَرَآءَ نَا فَاَضَلُّوۡنَا السَّبِيۡلَا۔ اور پھر اگر وہ پوچھے کہ ایک ہی جملہ میں اس کا علاج کیا ہے؟ تو اس کو امام مالک کے الفاظ میں جواب ملنا چاہیے کہ ''لاَ يصلحُ آخِر هٰذِهِ الاُمَّةِ اِلَّا بِمَا صَلَحَ بِهٖ اَوَّلُها'' یعنی اُمتِ مرحومہ کے آخری عہد کی اصلاح کبھی نہ ہو سکے گی تاوقتیکہ وہی طریق اختیار نہ کیا جائے جس سے اس کے ابتدائی عہد نے اِصلاح پائی تھی اور وہ اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ قرآن حکیم کے اصلی و حقیقی معارف کی تبلیغ کرنے والے مرشدین صادقین پیدا کیے جائیں۔''

اور دوسرے نکتے کے لیے کفایت کرے گی یہ حقیقت کہ جب مولانا آزاد نے توجہ دلائی اس حدیث نبوی کی جانب کہ ((اِنِّیۡ آمُرُكُمۡ بِخَمۡسٍ اَللّٰهُ اَمَرَنِیۡ بِهِنَّ : اَلۡجَمَاعَةِ وَالسَّمۡعِ وَالطَّاعَةِ وَالۡهِجۡرَةِ وَالۡجِهَادِ فِیۡ سَبِيۡلِ اللّٰهِ)) تو ایک خوشگوار حیرت کا احساس ہوا اہل علم کے حلقے میں کہ ((بُنِیَ الۡاِسۡلَامُ عَلٰی خَمۡسٍ)) کے علاوہ بھی کوئی پانچ چیزیں تھیں جن کا حکم دیا تھا نبی اکرم ﷺ نے —— اور جبکہ وہ پانچ ارکان ہیں قانونی اسلام کے —— وہاں یہ پانچ ارکان ہیں حقیقی ایمان کے!!

یہ دوسری بات ہے کہ آج ساٹھ سال گزر جانے کے بعد بھی یہ دونوں نکات اتنے ہی غریب ہیں جتنے اس وقت تھے اور روایتی و مدرسی علم اور فقہی و قانونی تصورات کے غلبے کے تحت

(۱) واضح رہے کہ لگ بھگ یہی زمانہ ہے حضرت شیخ الہندؒ کے ہندوستان سے عازمِ حجاز ہونے کا۔ جہاں سے واپسی پر آپ نے وہ جملے ارشاد فرمائے جو اس سے پہلے نقل ہو چکے ہیں۔

حقیقی اسلام بالکل اسی طرح اجنبی اور غریب ہے جس طرح اپنے آغاز کے وقت تھا۔ کس قدر صحیح فرمایا تھا جناب صادق المصدوق ﷺ نے کہ: ((بَدَاَ الۡاِسۡلَامُ غَرِيۡبًا وَسَيَعُوۡدُ كَمَا بَدَاَ فَطُوۡبٰی لِلۡغُرَبَاءِ))! —— آج انہی غرباء کو پکارنے کی ایک نئی کوشش کا آغاز ہو رہا ہے تنظیم اسلامی[۱] کے قیام کی صورت میں: فَهَلۡ مِنۡ مُسۡتَمِعٍ وَهَلۡ مِنۡ مُجِيۡبٍ!

۞ ۞ ۞

(۱) مولانا ابوالکلام آزاد نے احیائے اسلام کے لیے جس جماعت کے قائم کرنے کا ارادہ کیا تھا یا یوں کہہ لیں کہ بالفعل قائم کر بھی دی تھی اس کا نام عام طور پر ''حزب اللہ'' معروف ہے' لیکن عجب حسن اتفاق ہے کہ ''افاداتِ مہر'' میں اس کا ذکر ''اسلامی تنظیم'' کے عنوان سے ہوا ہے۔ چنانچہ مولانا غلام رسول مہر مرحوم رقم طراز ہیں: ''ہمارے مولانا (مولانا ابوالکلام آزاد) ۱۹۱۹ء میں نظر بندی سے رہا ہوئے تو آپ کو یاد ہو گا کہ اسلامی تنظیم کی ایک تحریک شروع ہوئی تھی جس میں مولاناؒ کو امام بنا کر کام کرنا مقصود تھا۔ اس سلسلے میں ایک لاکھ روپے کی رقم مولانا محمد علی (بن مولانا عبدالقادر قصوریؒ) ہی نے فراہم کی تھی لیکن ہمارے مولاناؒ جلد دوبارہ گرفتار ہو گئے اور وہ تحریک بھی رہ گئی۔ روپیہ بھی گیا' کچھ نہ بنا'' —— واضح رہے کہ مولانا آزاد کے جملہ محبین و معتقدین نے اس پورے معاملے کو اس طرح گول مول رکھنا مناسب سمجھا ہے۔ چنانچہ کہیں بھی اس موضوع پر مفصل گفتگو نہیں کی گئی۔ اور محترم پروفیسر چشتی صاحب والی روایت اتفاقاً درجِ ''میثاق'' نہ ہو جاتی تو غالباً اب بھی اس مسئلے کی تحقیق و تفتیش کا موقع پیدا نہ ہوتا۔ بہر حال اللہ تعالیٰ کی حکمتِ کاملہ میں ہر کام کے لیے ایک وقت معین ہے جس سے نہ ایک منٹ مؤخر ہو سکتا ہے نہ مقدم!

جمعیت علماء ہند کے اجلاس لاہور

نومبر ۱۹۲۱ء

کا ذکر ''افاداتِ مہر'' تالیف ڈاکٹر شیر بہادر پنی میں

(۱) اولاً ڈاکٹر شیر بہادر خاں پنی کی زبانی جو ایک نوجوان طالب علم کی حیثیت سے بطور سامع شریک تھے۔ ڈاکٹر صاحب لکھتے ہیں:

''مولانا ابوالکلام آزاد اور جمعیت علماءِ ہند کی صدارت: جب آپ تشریف لائے اور مسندِ صدارت سنبھالی تو فرمایا کہ ''ابتدائی کارروائی تحریری خطبۂ صدارت کے پڑھنے سے کی جائے گی''۔ کسی شخص کو اپنا لکھا ہوا خطبہ پڑھنے کے لیے دیا۔ خطبہ کے تھوڑی دیر تک پڑھے جانے کے بعد لوگوں میں کھسر پھسر شروع ہوئی۔ لوگ تو ان کی تقریر کے پیاسے تھے جب یہ ہلچل زیادہ ہوئی تو آپ غصہ میں اٹھے۔ تحریری خطبہ قاری کے ہاتھ سے لے لیا اور فرمایا ''جو یہ سننا نہیں چاہتے وہ جا سکتے ہیں۔ جب چار پانچ منٹ تک ایک متنفس بھی اپنی جگہ سے نہ ہلا اور ہال میں سخت سناٹا چھا گیا تو خطبہ پھر پڑھوانا شروع کرا دیا۔ جب یہ ختم ہوا تو اٹھے اور فرمایا ''عزیزانِ من! میں اس لب ولہجہ کا عادی نہیں' لہٰذا معافی چاہتا ہوں'' اس کے بعد تقریر شروع کی۔''

(۲) اور ثانیاً مولانا غلام رسول مہر کے قلم سے وہ لکھتے ہیں: ''آپ نے کئی مجالس کا ذکر فرمایا۔ بریڈلاء ہال والی مجلس (جلسہ جمعیت علماءِ ہند) اس روز منعقد ہوئی تھی جو میری اخبار نویسی کا پہلا دن تھا۔ نومبر ۱۹۲۱ء کی کوئی تاریخ تھی۔ میں اس جلسے میں اوّل سے آخر تک رہا۔ مولاناؒ نے کھدر کی دستار نہایت عمدگی سے باندھ رکھی تھی۔''

مولانا افتخار احمد فریدی

(مراد آباد' بھارت)

کے دو خطوط

مولانا افتخار احمد فریدی ملت اسلامیہ پاک و ہند کے ان چند دردمند بزرگوں میں سے ہیں جن کا ایک ایک لمحہ دین وملت کے درد اور فکر کے لیے وقف ہے۔ ضعیف العمری کے ہاتھوں مجبور اور ایک ٹانگ سے معذور ہونے کے باوجود ان کا جوش اور جذبہ اور ہمت وعزیمت جوانوں کے لیے قابلِ تقلید ہے —— ماضی میں ان کا نہایت فعال تعلق تبلیغی جماعت کے ساتھ رہا ہے' اور انہیں مولانا محمد الیاسؒ کی صحبت ورفاقت کا شرف بھی حاصل ہے۔ اُن سے سب سے قیمتی چیز جو راقم کو حاصل ہوئی وہ اُن کی یہ روایت ہے کہ مولانا الیاسؒ یہ فرمایا کرتے تھے کہ ''میں بھی شیخ الہندؒ ہی کا آدمی ہوں!'' —— آج کل اُن کا محبوب ترین مشغلہ خادمانِ دین وملت کے مابین زیادہ سے زیادہ ربط و تعلق اور تعاون وتوافق پیدا کرنے کی کوشش ہے —— بھارت کے جملہ دینی حلقوں میں نہایت معروف ہیں' لیکن مسلمانانِ پاکستان کی اکثریت کے لیے اجنبی اور غیر معروف —— خود راقم کو اُن سے متعارف ہوئے زیادہ عرصہ نہیں ہوا' اور اس کے ضمن میں خود ان ہی نے نہایت شفقت آمیز انداز میں پیش قدمی فرمائی تھی —— اب جب بھی راقم کا بھارت جانا ہوتا ہے وہ اپنی جملہ معذوریوں کے باوجود مراد آباد سے دہلی تک کے سفر کی صعوبت جھیل کر بھی ملاقات کے لیے تشریف لاتے ہیں —— اور نہایت محبت اور شفقت کا اظہار فرماتے ہیں۔ راقم کے لیے اُن کی دعائیں سرمایۂ راحت واطمینان ہیں۔

(اسرار احمد)

(۱)

حضرت محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب دام مجدہم' السلام علیکم۔
مزاجِ گرامی!

بھائی عبدالکریم پاریکھ صاحب کے خط سے یہ خوشخبری معلوم ہوئی کہ وہ لاہور قرآن کانفرنس میں تشریف لے گئے تھے اور آپ سے خوب ملاقات رہی خدا مجھے بھی نصیب فرمائے۔ ''میثاق'' اور ''حکمتِ قرآن'' سے آپ کی مساعیٔ حسنہ کا حال معلوم ہو کر آپ کے لیے دل سے دعائیں نکلتی ہیں۔ بعض ڈاک والوں کی مہربانی سے نہیں ملتے جن کا قلق رہتا ہے۔ جنوری والا میثاق ماشاء اللہ بڑا جاندار ہے۔ جزاکم اللہ۔ مگر اس میں قرآن کانفرنس کا کوئی حال نہیں معلوم ہو سکا۔ حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی صاحب دام مجدہم کو آئندہ سالانہ کانفرنس میں شرکت کے لیے ابھی سے خط و کتابت کرائیں۔ بھائی پاریکھ حضرت مولانا کے بہت ہی تعلق والے ہیں ان کو بھی ذریعہ بنائیں۔ خدا کرے ان کی شرکت اس سال ہو جائے ابھی تو وہ جنوبی ہند کے اسفار میں ہیں۔ حق تعالیٰ شانہ' نے پاریکھ صاحب کو بھی قرآن پاک کی خدمت و سعادت وہبی طور سے عطا فرمائی ہے' جی چاہتا ہے اس دور کے قرآنی خدمت گزاروں کا جوڑ آپ کے ساتھ قائم ہو جائے۔

حضرت شیخ الہندؒ پر اس میثاق میں خوب تفصیل سے کچھ باتیں آ گئی ہیں جزاکم اللہ۔ جی چاہا کہ اس سلسلہ کی کچھ باتیں بندہ بھی عرض کر دے: حضرت کے مجدد ہونے کی بات تو آپ کی ہی زبان مبارک سے سنی تھی اس پر غور کیا تو واقعی یہ ساری بہاران کی ہی لگائی ہوئی ہے۔ مولانا محمد الیاس صاحبؒ شیخ التبلیغ بھی بچپن سے ہی قیام گنگوہ سے ہی تعلق رکھتے تھے۔ ڈاکٹر انصاری صاحبؒ کی کوٹھی پر وفات کے وقت بھی مفتی کفایت اللہ صاحبؒ اور مولانا الیاس صاحبؒ ہی تھے۔ حکیم اجمل خان صاحبؒ' ڈاکٹر انصاریؒ' حکیم نابینا صاحبؒ' مولانا ابوالکلام آزادؒ' مولانا محمد علی جوہرؒ' صاحبزادہ آفتاب خاں صاحبؒ' حاجی ترنگ زئیؒ پر بھی حضرت شیخ الہندؒ کا خوب اثر پڑا تھا۔ یہ سب حضرت کے فدائی تھے۔ ۱۹۱۰ء میں دیوبند کا جلسہ ہوا جس میں صاحبزادہ آفتاب احمد خاں صاحب شریک ہوئے۔ اس وقت یہ بات طے ہوئی تھی کہ دیوبند کے کچھ ہونہار جدید تعلیم کے لیے علی گڑھ جایا کریں گے اور اس طرح علی گڑھ کے کچھ دیوبند کی تعلیم کے

لیے آیا کریں گے۔ مالٹے سے واپسی پر ہڈیوں کے ڈھانچے والے انسان نے علی گڑھ یونیورسٹی کی جامع مسجد کے ایک ستون سے کمر لگا کر یہ ارشاد فرمایا کہ ''مدرسوں' خانقاہوں سے زیادہ تم سے اُمید لگاتا ہوں۔ جس طرح حق تعالیٰ نے تاتاریوں کو ہدایت نصیب فرمائی تھی' کیا عجب ہے کہ انگریزی دانوں کو بھی اس دور میں یہ شرف مل جائے اگر یہ ہوتا ہے تو یہی طبقہ اس کام کے لیے کارآمد ہوگا''۔ حضرت شیخ الہند کی ایک ہی یادگار انسان آپ کے خطہ میں پایا جاتا ہے مولانا عزیز گل صاحب دام مجدہم' خدا کرے حیات ہوں' خطۂ سرحد میں اُن سے بھی ایک دفعہ ضرور ملاقات فرمائیں۔ اگر ان تک پہنچنے کے لیے ضرورت رہبر کی ہو تو قاری سعید الرحمٰن صاحب پنڈی والے یا مدرسہ حقانیہ اکوڑہ خٹک سے کسی کو لے لیا جائے۔

آپ کو حق تعالیٰ شانہ' نے قرآن پاک کی خدمت کے لیے قبول فرمایا ہے اس لیے عرض کر رہا ہوں' حضرت مولانا محمد الیاس صاحبؒ نے فرمایا تھا کہ میری زندگی بھر کا تجربہ یہ ہے کہ حق تعالیٰ کا قرب جتنا میں نے تہجد کے وقت قرآن پاک کی تلاوت میں پایا اور کسی چیز میں نہیں پایا اور یہ بھی فرمایا تھا کہ اُس وقت دیکھ کر پڑھا جائے اور معنی و مطلب کا دھیان نہ کرے صرف یہ کہ اللہ کے کلام کی تلاوت کر رہا ہوں۔ والسلام

محتاجِ دعا خادم افتخار فریدی

(۲)

حضرت محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب دام مجدہم' السلام علیکم۔
مزاجِ گرامی!

مارچ کے اجتماع کا دعوت نامہ ملا۔ جزاکم اللہ۔ حضرت مولانا علی میاں صاحب سعودی عرب سے واپسی پر شروع اپریل میں پاکستان آنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ خدا کرے دعوتِ قرآن کے پروگرام میں کراچی اور لاہور بھی کوئی پروگرام ہو جائے۔ بندہ نے تو ان سے عرض کیا ہے۔ (مولانا علی میاں مدظلہ' نے اپنے ایک حالیہ مکتوب میں تحریر فرمایا ہے کہ وہ مستقبل قریب میں جب بھی پاکستان تشریف لائیں گے تو ان شاء اللہ قرآن اکیڈمی کو اپنے خطابات کے لیے ضرور وقت دیں گے —— ادارہ)

سید قطب شہید کی تالیف' قرآنی خصوصیات' سعید گجرانوی صاحب کے بدست ارسال کی تھی جو دفتر مرکزی انجمن خدام القرآن میں دے آئے تھے' خدا کرے آپ

کے ملاحظہ میں آ گئی ہو۔

امارت کی انتخابی کارروائی کی تفصیل جمعیۃ العلماء ہند کی جن رپورٹوں میں آئی ہے اس کی ایک جلد مولانا سید حامد میاں کے ذریعہ آپ کو ملی ہوگی۔

حضرت شیخ الہندؒ کے سلسلہ میں میثاق میں جو تحریر آپ کی شائع ہوئی ہے ماشاء اللہ خوب ہے۔ جزاکم اللہ۔ اس سلسلہ میں ایک بات مزید معلومات کے لیے عرض کرتا ہوں۔ حضرت شیخ الہندؒ نے سفر حجاز سے قبل جس میں اسارتِ مالٹا سے دوچار ہوئے' اپنے خواص سے بیعت جہاد لی تھی۔ اس میں حضرت مولانا محمد الیاس صاحبؒ نے بھی بیعت کی تھی اور اپنے شیخ مولانا خلیل احمد صاحب سے بھی اس کا تذکرہ نہیں کیا تھا۔

ماشاء اللہ مولانا عزیز گل صاحب سے ملاقات کر لی۔ یہ بھی حضرت شیخ الہندؒ کے خواص میں سے ہیں۔ حضرتؒ کی جان کنی کے وقت شاید مولانا عزیز گل صاحب مدظلہ بھی موجود تھے۔ مفتی کفایت اللہ صاحبؒ اور مولانا محمد الیاس صاحبؒ کا بھی حضرت شیخ الہندؒ کے پاس دریا گنج میں ڈاکٹر انصاری صاحبؒ کی کوٹھی پر موجود ہونا تو یقین سے معلوم ہوتا ہے۔

ایک بات یہ بھی عرض کروں کہ حضرت نانوتویؒ کے والد صاحبؒ کو آخری عمر میں اسہال کا مرض ہو گیا تھا۔ دیوبند مسجد انار والی حجرہ قاسمی میں قیام تھا۔ چوکی اور کونڈا وہاں رہتا تھا۔ اس کی صفائی استاد شاگرد کرتے تھے۔ ایک روز کونڈا رکھنے سے رہ گیا تھا تو دست زمین پر پھیل گیا۔ شاگرد فکر مند ہوئے کہ اب کیسے اٹھائیں؟ حضرت نانوتویؒ اس وقت باہر سے تشریف لائے اور حجرہ کے باہر ہی اس فکر و مشورہ میں شریک ہو گئے۔ حضرت شیخ الہندؒ بھی باہر سے ساتھ آئے تھے جب کوئی تدبیر سمجھ میں نہ آئی تو حضرت نانوتویؒ حجرہ کی طرف تشریف لے گئے۔ وہاں جا کر دیکھا کہ جگہ بالکل صاف ہے۔ یہ صفائی حضرت شیخ الہندؒ نے کر لی تھی۔ بس وہیں حضرتؒ نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھا دیے:

''اے اللہ! اس لڑکے کے بارے میں قیامت کے روز میری لاج رکھ لیجیے گا''۔

حضرت شیخ الہندؒ کو حضرت نانوتویؒ کی جانشینی کا شرف اسی وقت مل گیا۔

حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ مسجد نبوی میں درس دیتے تھے۔ حضرت شیخ الہندؒ کی گرفتاری کے وقت حضرت مدنیؒ کو گرفتار نہیں کیا گیا۔ انہوں نے خود ہی اپنے آپ کو پیش کیا کہ میں اس تحریک میں حضرت کے ساتھ شریک ہوں۔ جب مالٹا سے رہائی ہوئی تو حضرت مدنیؒ کے خاندان کی مدینہ پاک میں کئی اموات ہو چکی تھیں۔ والد'

بھائی' والدہ' اہلیہ' بچیاں لیکن حضرت مدنیؒ حضرت شیخ الہندؒ کے ساتھ ہی ہندوستان تشریف لے آئے اور آخر تک ساتھ رہے۔ وفات سے ایک روز قبل حضرت شیخ الہندؒ نے فرمایا کہ میں نے مولانا آزاد سے وعدہ کر لیا تھا ان کے مدرسہ دارالارشاد کے لیے ایک مدرس کا' لیکن کوئی آمادہ نہیں ہے تم ہی چلے جاؤ۔ چنانچہ حضرت مدنیؒ روانہ ہو گئے۔ راستہ ہی میں تھے کہ حضرت شیخ الہندؒ کی وفات ہو گئی۔ بس یہی واقعہ جانشینی کا ذریعہ بنا۔

حضرت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ بھی برابر کے شریک تھے۔ جامعہ ملیہ کی بنیاد والا خطبہ مولانا شبیر احمد صاحبؒ نے ہی لکھا اور پڑھا تھا جس میں بتایا گیا تھا کہ پورا مغرب ہندوستان میں انگریزوں کے اقتدار کو اپنے مفادات کے لیے کتنا عزیز رکھتا ہے اور پورا مغرب انگریزی داں طبقہ کو اپنا سب سے زیادہ حامی خیال کرتا ہے۔

ماشاء اللہ مولانا اخلاق حسین قاسمی صاحب نے وہ مدرسہ رحیمیہ سنبھال لیا ہے جس نے ملت ہندیہ کی بقا و سلامتی کا حضرت مجدد صاحبؒ والے پروگرام کو چلانے والے شاہ ولی اللہ صاحبؒ پیدا کیے تھے۔ خدائے پاک ان سب کا آپ کو وارث و جانشین بنائے۔ آپ کی صحت کا فکر رہتا ہے۔ دعا کرتا رہتا ہوں۔ اب آپ کام کرنے والے بنائیں' خود کرنے کے بجائے دوسروں سے کام لیں اور ان کی تعلیم و تربیت پر زیادہ توجہ دیں۔ والسلام

خادم افتخار فریدی

مراد آباد' بھارت

مکتوبِ گرامی ڈاکٹر شیر بہادر خان پنی بنام شیخ جمیل الرحمٰن

محترمی زاد عنایتہٗ! السلام علیکم

ماہِ مئی کے شمارے میں مراد آباد (بھارت) سے ایک مکتوب کی آخری سطر ہے:

''......اب آپ کام کرنے والے بنائیں' خود کرنے کے بجائے دوسروں سے کام لیں اور ان کی تعلیم و تربیت پر زیادہ توجہ دیں''۔ گو کام مشکل تو ہے مگر ضروری ہے۔

''خیالات و افکار کا پیدا کرنا آسان ہے مگر خیالات و افکار کے بقا و قیام کے لیے اشخاص کا پیدا کرنا مشکل ہے۔'' (بحوالہ الہلال)

لیکن یہ کام ضروری ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے جس کام کا بیڑہ اٹھایا ہے وہ تو بڑی

عزیمت کا کام ہے۔ اس میں عمریں کھپ جاتی ہیں اور پھر آج کل جب دنوں میں صدیاں بیت رہی ہیں' اس کام میں کامیابی کے لیے عرصہ دراز درکار ہوگا۔ ''درخت سب بوتے ہیں لیکن ہر شخص کے نصیب میں یہ نہیں ہوتا کہ پھل بھی کھائے۔ پس نہایت مبارک ہے وہ ہاتھ جو تخم پاشی کے بعد اپنے دامن میں اس کے پھلوں کو بھی دیکھے۔'' (الہلال)

مگر بالفاظ ''الہلال'' مرحوم:

''خلوص کے لیے موت نہیں اور حق وصداقت کے لیے ناکامی نہیں۔ دنیا میں ہر چیز مٹ سکتی ہے پر حق وصداقت ہی ایک بیج ہے جو پامال نہیں ہوسکتا۔''

میں اس سے پہلے عرض کر چکا ہوں کہ ڈاکٹر صاحب موصوف موم بتی کو دونوں سروں سے نہ جلائیں ع

ایں رشتہ مسوز کہ چندیں دراز نیست

یہ چند باتیں ڈاکٹر صاحب سے قلبی تعلق کی وجہ سے زبانِ قلم پر آ گئیں وگرنہ من آنم کہ من دانم۔

بہ حرفے می تواں گفتن تمنائے جہانے را
من از شوقِ حضوری طول دادم داستانے را

طالب دعا
شیر بہادر خان (ایبٹ آباد)

❁❁❁

جامعہ باب العلوم' کہروڑ پکا ضلع ملتان کے

مولانا اللہ بخش ایاز ملکانوی

کا

امیر تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد سے

براہِ راست اور بواسطہ ماہنامہ ''الخیر'' ملتان

استفسار اور اُس کا جواب!

——— (۱) ———

جناب ملکانوی کا پہلا خط —— محررہ ۱۸/ جمادی الاخریٰ ۱۴۰۴ھ

امام الہند بنانے کی تجویز۔ استاذ العلماء شیخ الہند کا کردار

شیخ الہند کے جانشینوں کو دعوتِ فکر اور ایک سوال!

ڈاکٹر اسرار احمد کے حضور عرضِ نیاز!

میثاق بابت جنوری ۱۹۸۴ء میں امیر تنظیم اسلامی جناب ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کا ایک مضمون ''مولانا ابوالکلام' جمعیت العلماء ہند اور شیخ الہند مولانا محمود حسن'' شائع ہوا جس میں مولانا ابوالکلام آزاد کو امام الہند بنانے کی تجویز اور استاذ العلماء حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی کی وسعتِ نگاہ اور بالغ نظری کے ساتھ ساتھ موصوف کی وسعتِ قلبی اور عالی ظرفی کا منہ بھر کر واشگاف الفاظ میں اقرار کیا گیا۔ اور مولانا ابوالکلام کی دعوت کے بنیادی عنصر (قرآن وجہاد) کی بھی نشاندہی فرما دی گئی جس نے استاذ الاساتذہ اور شیخ الشیوخ مولانا محمود حسن دیوبندی ایسی عظیم نابغہ روزگار شخصیت کو مسحور کر دیا تھا اور استاذ العلماء بایں علم وفضل'

تقویٰ وتدین وخلوص وللّٰہیت برملا فرمایا کرتے تھے کہ اس نوجوان (ابوالکلام آزاد) نے ہمیں اپنا بھولا ہوا سبق یاد دلایا ہے اور یہ سب کچھ تقلید کے گڑھ ہندوستان میں ہو رہا تھا جہاں اسلام کے معنی ہی حنفیت کے ہیں اور تقلید کے دائرے سے باہر قدم نکالنے کے معنی گویا اسلام سے نکل جانے کے ہیں اور اس تمام تر کارروائی کے خالق حضرت شیخ الہندؒ پکے کٹر حنفی ہیں اور جس عبقری نابغۂ روزگار شخصیت کے سر پر امامتِ ہند کا تاج رکھنا چاہتے ہیں وہ بیک وقت گلیم زہد اور ردائے رندی اوڑھنے کے جرم کے مرتکب اور بالکل اسم بامسمّٰی آزاد ہیں۔ حنفیت سے حد درجہ بعید' تقلید سے کوسوں دور ایک آزاد خیال انسان نہ کہیں کی سندِ فراغت' نہ دستارِ فضیلت' نہ جبہ و عمامہ' نہ عبا و قبا' نہ کہیں کے مفتی نہ شیخ الحدیث۔ لیکن بایں ہمہ مولانا دیوبندی ان کے جوہر قابل کے قائل بھی ہیں اور انہیں امام الہند مان لینے کی تجویز کے پرزور مؤید بھی۔

الحاصل ان تمہیدی گزارشات کے بعد جنہیں دراصل ڈاکٹر صاحب کے فرمودات و ارشادات کا خلاصہ کہنا بے جا نہ ہوگا' یہ بات روزِ روشن کی طرح کھل کر سامنے آتی ہے کہ حضرت شیخ الہند نے قیامِ حکومت الٰہیہ اور تجدید و احیائے دین و تجدید ملت کی منزل کو قریب تر کرنے کے لیے ماہ و سال' اعلیٰ و ادنیٰ' قدیم و جدید اور فکر و نظر کے تمام تر اختلافات کو بالائے طاق رکھتے ہوئے تحریک احیائے دین کے مؤسس ابوالکلام آزاد کو امام الہند تجویز کرانے میں ہمہ تن مصروف نظر آتے ہیں تو کیا آج بھی اگر کوئی شخص جو کہ معروف طریقہ کا سکہ بند اور مسلم عالمِ دین نہ ہو اور نہ ہی حنفیت کی جلی چھاپ رکھتا ہو' لیکن بایں ہمہ اُمت مسلمہ کو انحطاط و زوال اور نکبت و فلاکت سے نکالنے کے لیے اعتصام بالقرآن اور دعوت رجوع الی القرآن کا محض خیالی داعی اور ڈھنڈورچی ہی نہیں بلکہ ؎

گئے دن کہ تنہا تھا میں انجمن میں

یہاں اب مرے راز داں اور بھی ہیں!

کا مصداق ہو۔ تو کیا ان حالات میں استاد العلماء شیخ الہند کے ارادت مند عقیدت کیش جانشینوں سے یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ وہ بھی اپنے شیخ کی طرح وسعت قلبی اور اعلیٰ ظرفی کا ثبوت دیتے ہوئے اس دور میں دوسری مثال قائم کر دیں گے اور کسی ایسی نابغۂ روزگار ہستی کی امامت کو تسلیم کرنے کے لیے تیار ہو جائیں گے **فھل من مستمع وھل من مجیب** یا پھر سکہ بند حنفیت' زہد و تقویٰ کی اجارہ داری یا روایتی و مدرسی علم کا ادّعا آڑے آئے گا؟ بہرحال امیر تنظیم اسلامی کی طرف سے شیخ الہند کے جانشینوں کو یہ ایک دعوتِ فکر ہے چاہے وہ اتباعِ شیخ

میں وسعت قلبی اور اعلیٰ ظرفی کا بھرپور مظاہرہ کریں یا پھر حنفیت کی تقلیدِ جامد اور روایتی و مدرسی علم کا ادّعا انہیں حق بات تسلیم کرنے سے روک دے۔ امیر موصوف کے ارشاد کے مطابق علماءِ کرام ہماری ان گزارشات پر سیخ پا نہ ہوں بلکہ ٹھنڈے دل سے غور کریں ع

وہ کیا گردوں تھا تو جس کا ہے اک ٹوٹا ہوا تارا

الحاصل امیر تنظیم اسلامی جناب ڈاکٹر اسرار احمد کا بڑے پر پیچ' پراسرار اور دبے دبے لفظوں میں شیخ الہند کے جانشینوں سے یہ ایک مطالبہ ہے۔ نہ معلوم اس خیرسگالی مطالبہ کا ان کی طرف سے کس وسعت قلبی اور اعلیٰ ظرفی سے جواب دیا جاتا ہے۔ یہ ان حضرات کا نجی معاملہ ہے جس سے سردست ہمیں سروکار نہیں۔

القصہ مذکورہ بالا مقدمات کو جب ترتیب دیا جائے تو بنیادی طور پر چند خدشات سوالیہ پیدا ہوتے ہیں۔ سرورِ دو عالم ﷺ کے فرمان کے مطابق **شفاء العی السوال** خیال گزرا کہ کیوں نہ ہو امیر تنظیم اسلامی ہی کے حضور اپنے اندیشہ ہائے ذہنی کو عرض کرتا چلوں۔ اگرچہ آج سے پہلے خاکسار کو امیر محترم سے نیاز مکاتبت کا شرف حاصل نہیں' تاہم اخوتِ اسلامی کے تعلق سے پرامید ہوں کہ آنجناب محروم نہ فرمائیں گے۔

(۱) اسلامی تعلیمات کے مطالعہ سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اگر کسی وقت اربابِ حل و عقد قومی و ملی معاملات میں کسی منتخب شخصیت کی بیعت و امارت پر اتفاق کر لیں تو انہیں یہ حق حاصل ہے کہ اُمت کی دستگیری اور ملک و ملت کی فلاح و بہبود کے پیش نظر انہیں ایسا کرنے کا اختیار دیا جائے بشرطیکہ جسے یہ مرتبہ عالی تفویض کیا جا رہا ہے اس کے طائر دماغ میں معمولی طلب تو کجا بلکہ ناگواری کی حد تک کے انکار کا معاملہ ہو۔ کیونکہ اسلامی تعلیمات کا مزاج ہی کچھ ایسا ہے کہ یہاں بے طلب و مدّعا اُمورِ اُمت سپرد کیے جائیں تو باعث خیر و برکت ہوتے ہیں اور طالب منصب و مراتب ہمیشہ ہمیشہ کے لیے محروم کر دیے جاتے ہیں۔ یا پھر فلاح و سعادت اور نصرتِ خداوندی کی برکات سے تہی دامن رہتے ہیں۔ چنانچہ مسلم شریف میں عبدالرحمٰن بن سمرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' فرماتے ہیں کہ سرور کائنات ﷺ نے مجھ سے فرمایا: ''اے عبدالرحمٰن! امارت کی درخواست مت کر کیونکہ اگر درخواست کے بعد تجھے ملی تو تیرے سپرد کر دی جائے گی (امدادِ خداوندی نہ ہوگی) اور اگر بغیر درخواست کے ملی تو تیری (من جانب اللہ) مدد کی جائے گی۔''

(۲) حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں بارگاہِ نبوت میں حاضر ہوا اور میرے

ساتھ میرے دو چچازاد بھائی تھے۔ان میں سے ایک بولا یارسول اللہ جوملک اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو دیے ہیں ان میں سے کسی ملک کی حکومت ہمیں دے دیجیے اور دوسرے نے بھی یہی کہا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''اللہ کی قسم ہم کسی کو اس امر کا حاکم نہیں بناتے جو اس حکومت کی درخواست کرے اور نہ اس کو جو اس کی حرص کرے۔''

(۳) حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے عرض کیا یارسول اللہ! آپؐ مجھے عامل نہیں بناتے۔آپ ﷺ نے اپنا دست مبارک میرے کندھے پر مارا اور فرمایا: ''ابوذر تو کمزور ہے اور یہ امانت ہے قیامت کے دن سوائے رسوائی اور شرمندگی کے اور کچھ نہیں ہے' مگر جو اس کے حقوق ادا کرے اور جو ذمہ داریاں اس پر عائد ہیں انہیں پورا کرے۔''

---

(۴) ابوالکلام آزاد کو امام الہند بنانے کی تجویز صرف اور صرف جہادِ حریت اور تحریک استخلاصِ وطن کی حد تک تھی جس کے لیے حزب اللہ کی تاسیس اور حکومت الٰہیہ کا قیام عمل میں لانا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ مذہبی معاملات میں ان کے قول وفعل کو بطور حجت و دلیل کے کبھی بھی کسی نے پیش نہیں کیا اور نہ ہی مذہبی قیادت و سیادت کی دستار ان کے سر پر رکھ دی گئی تھی۔جبکہ زمانہ حال کی امارت گروہی اور مذہبی حیثیت کی حامل ہے۔عیاں راچہ بیاں!

(۵) مولانا ابوالکلام کے لیے امامتِ ہند کے رفیع منصب کے مجوز و مؤید اس وقت کے خیار امت زہد وتقویٰ' اخلاص وللّٰہیت' علم وفضل میں یکتائے روزگار تھے۔لہٰذا دریافت طلب امر یہ ہے کہ آپ کی امارت کے مجوز ومؤید کون اور کس معیار کے لوگ ہیں۔دیدہ باید۔

جنابِ والا! آپ کے حضور زندگی کی پہلی نیاز ہے۔عرض احوال کے آداب سے بالکلیہ نابلد ہوں۔اگر طبع نازک پر انجان سائل کی خش خش گراں نہ گزرے تو میثاق میں جواب کا منتظر رہوں گا۔

والسلام

خاکسار بندہ ایاز ملکانوی عفی اللہ عنہ

(۲)

جناب ملکانوی کا دوسرا خط —— محررہ ۲۰/ذی قعدہ ۱۴۰۴ھ

بخدمت گرامی جناب ڈاکٹر اسرار احمد صاحب زاداللہ شرفکم العالی!

درخواست دعا کے بعد۔السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ'

مزاجِ محترم بعافیت راضی تمام ہوں گے۔المرام آنکہ چند ماہ پیشتر ناچیز نے خدمتِ عالیہ میں ایک سوالیہ نیاز نامہ رجسٹری کیا تھا۔جس کا جواب باوجود طلب کے میثاق میں نہ آیا نہ آنا تھا۔اور ویسے بھی حقائق کے جواب صبح قیامت تک بن نہیں پڑتے۔اس لیے یہ بات نہ کوئی باعث تعجب تھی نہ اب ہے۔

البتہ حیرانی تو جناب قمر سعید صاحب کی بے تابی پر ہے کہ موصوف مجھ خاکسار کے کوائف جمع کرنے کے لیے شہر کی ایک عظیم المرتبت علمی شخصیت کو خط میں لکھتے ہیں کہ ''ہمیں بعض ضروری امور کی خاطر جناب ایاز ملکانوی صاحب کے کوائف کی ضرورت ہے۔براہِ کرم آپ حکمت کو ملحوظ رکھتے ہوئے ان کے کوائف وغیرہ حاصل کرکے ہمیں ارسال فرمادیں۔ہم شکر گزار رہوں گے۔آپ کا ہم سے یہ تعاون ایک دینی معاملہ ہی کے لیے مطلوب ہے۔''

گرامی قدر! نہ معلوم یہ کون سی حکمت قرآنی ہے اور دعوت رجوع الی القرآن کا اصول و ضابطہ ہے کہ سائل کے سوال کا جواب تب دیا جائے جب اس کے مکمل کوائف معلوم ہوں۔ جناب آپ کے پروگرام اور شبانہ روز سعی ومحنت کا بنیادی نقطہ دعوت رجوع الی القرآن ہے تو کیا آپ کا یہ عمل ﴿اَنْ تَقُوْلُوْا مَا لَا تَفْعَلُوْنَ﴾ (الآیہ) کا مصداق ہونے کے ساتھ ساتھ ﴿وَاَمَّا السَّآئِلَ فَلَا تَنْهَرْ﴾(الآیہ) کی ہدایت ربانی کے بھی سراسر خلاف ہے ؎

اندکے پیش تو گفتم غم دل ترسیدم! کہ تو آزردہ شوی ورنہ سخن بسیار است

اچھا خیر یہ ایک نیازمندانہ شکوہ تھا۔اُمید ہے طبع نازک پر گراں نہیں گزرے گا۔

عالی قدر۔محرومی جواب کے باوجود بقول حضرت غالبؔ: ؎

یار سے چھیڑ چلی جائے اسد گر نہیں وصل تو حسرت ہی سہی!

آج پھر مختصر عرض نامہ لے کر حاضر خدمت ہوں۔کاش: ؎

چھیڑنے کا مزہ تو تب ہے کہو اور سنو بات میں تم تو خفا ہو گے لو اور سنو

کرمفرمائے محترم! نزولِ وحی کی اول تاریخ بعض حضرات نے ۲۸/ جولائی ۶۱۰ء بروز شنبہ شب قدر بیان فرمائی ہے جبکہ ماہنامہ حکمت قرآن جمادی الاخریٰ ۱۴۰۴ھ میں مولانا عبدالکریم پاریکھ نے مقالہ ''قرآن مجید۔ قرآن کی روشنی میں'' نزولِ قرآن عیسوی ۶۱۰ء اگست کی چھ تاریخ کو بتایا ہے۔

علاوہ ازیں آیاتِ قرآن شمارِ حضرت عائشہؓ کے مطابق ۶۶۶۶ ہیں اور مولانا دریابادی نے ۶۶۱۶ کو میزانِ اصح قرار دیا ہے، جبکہ حکمت قرآن کے مقالہ نگار نے ۶۲۳۷ آیات شمار فرمائی ہیں۔

بہرحال ان ہر دو باتوں میں توفیق مطلوب ہے۔ رہی بات میرے کوائف کی تو وہ حضرت اصغر سے سن لیجیے: ؎

تیرا جمال ہے تیرا خیال ہے تو ہے — مجھے یہ فرصت کاوش کہاں کہ کیا ہوں میں

میں ہوں وہ مست جس کا ایک جرعہ زمزم و کوثر!

میں اس تکوین کے خمخانہ میں صہبائے وحدت ہوں

اجازت! طالب جواب ——— والسلام

بندہ ایاز ملکانوی عفی اللہ عنہ

——— (۳) ———

ماہنامہ ''الخیر'' شمارہ جولائی ۱۹۸۴ء میں شائع شدہ تحریر

''میثاق'' بابت جنوری ۱۹۸۴ء میں امیر تنظیم اسلامی جناب ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کا ایک مضمون ''مولانا ابوالکلام، جمعیت العلماءِ ہند اور شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ'' شائع ہوا جس میں مولانا ابوالکلام آزاد کو امام الہند بنانے کی تجویز پر استاذ العلماء حضرت شیخ الہندؒ کی وسعتِ نگاہ اور بالغ نظری کے ساتھ ان کی وسعتِ قلبی اور عالی ظرفی کی مدح و توصیف کی گئی ہے اور حضرت اقدس نور اللہ مرقدہٗ کے علم و فضل، تقویٰ و تدین اور خلوص و للّٰہیت کے اعتراف و اقرار کے ساتھ ساتھ مولانا آزاد مرحوم پر آپؒ کی عنایات اور بے حد اعتماد اور حسن سلوک کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ صاحب مضمون کے مطابق حضرت شیخ الہند جس عبقری، نابغۂ روزگار شخصیت کے سر پر امامت ہند کا تاج رکھنا چاہتے تھے وہ بیک وقت گلیم زہد اور ردائے رندی اوڑھنے کے جرم کے مرتکب اور بالکل اسم بامسمّیٰ آزاد تھے۔ حنفیت سے حد درجہ بعید، تقلید سے کوسوں دور،

ایک آزاد خیال انسان، نہ کہیں کی سند فراغت نہ دستارِ فضیلت، نہ جبہ نہ عمامہ، نہ عبا نہ قبا، نہ کہیں کے مفتی نہ شیخ الحدیث، لیکن با ایں ہمہ مولانا دیوبندی ان کے جوہر قابل کے قائل بھی ہیں اور ان کو امام الہند مان لینے کی تجویز کے پرزور مؤید بلکہ داعی بھی۔

حضرت شیخ الہند نے قیامِ حکومتِ الٰہیہ اور تحریک احیائے دین و تجدید ملت کی منزل کو قریب تر لانے کے لیے قدیم و جدید اور فکر و نظر کے تمام اختلافات کو بالائے طاق رکھتے ہوئے جس استقامت و بلند حوصلگی سے تحریک کی قیادت فرمائی اور اس تحریک سے تعلق رکھنے والے تمام اعلیٰ و ادنیٰ حضرات کو بلا امتیاز جس محبت و بندہ پروری سے نوازا، مولانا آزاد پر یہ عنایت بھی انہی مراحم خسروانہ کا ایک حصہ ہے۔

مگر ڈاکٹر اسرار احمد اس سے کچھ اور مفہوم اخذ کرنا چاہتے ہیں۔ ان کے مطابق شیخ الہندؒ کے ارادت مند، عقیدت کیش جانشینوں کو اپنے شیخ کی طرح وسعتِ قلبی اور اعلیٰ ظرفی کا ثبوت دیتے ہوئے اس دور میں ایک دوسری مثال قائم کرنی چاہیے اور ''سکہ بند حنفیت'' زہد و تقویٰ کی اجارہ داری اور روایتی و مدرسی علم کا ادعا آڑے نہیں آنا چاہیے۔

آج شیخ الہندؒ کے جانشین اتباع شیخ میں کس کو ''امیر الباکستان'' تسلیم کریں۔ اس کی وضاحت امیر تنظیم اسلامی نے نہیں فرمائی مگر ان کے پرپیچ، پر اسرار اور دبے دبے لفظوں میں جس شخصیت کے بارے میں وسعت قلبی اور اعلیٰ ظرفی اختیار کیے جانے کا مطالبہ چھلک رہا ہے وہ چشم بدور ''حضرت اقدس ڈاکٹر صاحب'' ہی کی ذاتِ گرامی قدر معلوم ہوتی ہے۔ مگر غالباً انہوں نے ازراہِ کسرنفسی اپنے نام کی صراحت نہیں فرمائی۔ باقی ع

یہی کہتے ہیں وہ اور کیا کہنے کو ہیں

اور ع

ہے تجھ میں مکر جانے کی جرأت تو مکر جا!

اس بات سے قطع نظر کہ انہوں نے اپنے آپ کو اس منصب کا اہل ثابت کرنے اور مولانا آزاد اور اپنے درمیان عدم تفاوت ظاہر کرنے کے لیے جس رنگ آمیزی اور مبالغہ آرائی سے کام لیا ہے وہ درست ہے یا نہیں؟ —— اور بیک وقت گلیم زہد اور ردائے رندی اوڑھنے کے مرتکب، حنفیت سے حد درجہ بعید، تقلید سے کوسوں دور آزاد خیال انسان، سند فراغت اور دستارِ فضیلت سے محروم، جبہ و عمامہ اور عبا و قبا سے تہی دامن اور مفتی و شیخ الحدیث کے منصب سے خالی جیسے الفاظ سے وہ مولانا آزاد کا تعارف کروا رہے ہیں یا اپنی شخصیت کا نقشہ کھینچ رہے ہیں؟

ڈاکٹر صاحب کے حسن طلب کی داد نہ دینا تنگ ظرفی ہوگی مگر یہ طلب کچھ غور طلب ہے۔

کیا ڈاکٹر صاحب ہمارے طالب علمانہ ایک دو اشکالات کا جواب دینا پسند فرمائیں گے؟

(۱) اسلامی تعلیمات کے مطالعہ سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اگر کسی وقت اربابِ حل وعقد، قومی وملی معاملات میں کسی منتخب شخصیت کی بیعت وامارت پر اتفاق کرلیں تو انہیں یہ حق حاصل ہے کہ اُمت کی دستگیری اور ملک وملت کی فلاح و بہبود کے پیش نظر انہیں ایسا کرنے کا اختیار دیا جائے۔ بشرطیکہ جسے یہ مرتبہ عالی تفویض کیا جارہا ہے اس کے طائر دل ودماغ میں معمولی تو کجا بلکہ ناگواری کی حد تک انکار کا معاملہ ہو۔ کیونکہ اسلامی تعلیمات کا مزاج ہی کچھ ایسا ہے کہ یہاں بےطلب ومدّعا اُمورِ اُمت سپرد کیے جائیں تو باعث خیر وبرکت ہوتے ہیں اور طالب منصب ومراتب ہمیشہ ہمیشہ کے لیے محروم کردیے جاتے ہیں، یا پھر فلاح وسعادت اور نصرتِ خداوندی کی برکات سے تہی دامن رہتے ہیں۔ چنانچہ مسلم شریف میں عبدالرحمٰن بن سمرہ ؓ سے روایت ہے۔ فرماتے ہیں کہ سرور کائنات ﷺ نے مجھ سے فرمایا:

''اے عبدالرحمٰن! امارت کی درخواست مت کر کیونکہ اگر درخواست کے بعد تجھے ملی تو تیرے سپرد کردی جائے گی (امدادِ خداوندی نہ ہوگی) اور اگر بغیر درخواست کے ملی تو تیری (من جانب اللہ) مدد کی جائے گی۔''

(۲) ابوالکلام آزاد کو امام الہند بنانے کی تجویز صرف اور صرف جہادِ حریت اور تحریک استخلاصِ وطن کی حد تک تھی، جس کے لیے حزب اللہ کی تاسیس اور حکومتِ الٰہیہ کا قیام عمل میں لانا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ مذہبی معاملات میں ان کے قول وفعل کو بطور حجت ودلیل کے کبھی بھی کسی نے پیش نہیں کیا اور نہ ہی مذہبی قیادت وسیادت کی دستاران کے سر پر رکھ دی گئی تھی۔ جبکہ زمانہ حال کی امارت گروہی اور مذہبی حیثیت کی حامل ہے۔ عیاں راچہ بیاں۔

(۳) مولانا ابوالکلام کے لیے امامتِ ہند کے رفیع منصب کے مجوز ومؤید اس وقت کے خیار اُمت زہد وتقویٰ، اخلاص وللّٰہیت، علم وعمل میں یکتائے روزگار تھے۔ لہٰذا دریافت طلب امر یہ ہے کہ آں موصوف کی امارت کے مجوز ومؤید کون اور کس معیار کے لوگ ہیں؟

(۴)

محترم ڈاکٹر صاحب کا جواب

مکرمی ومحترمی مولانا اللہ بخش ایاز ملکانوی صاحب!

وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ —— اُمید ہے کہ مزاج بخیر ہوں گے۔

آپ کا پہلا والا نامہ میرے نام اغلباً مارچ ۱۹۸۴ء میں موصول ہوا تھا۔ میری خط وکتابت کا سلسلہ عرصہ سے بالکل بند ہے اور اکثر خطوط کے جوابات میرے رفقائے کار ہی دیتے ہیں۔ (اس کے متعدد اسباب ہیں جن کے ذکر کی اس موقع پر چنداں ضرورت نہیں ہے) لیکن آپ کے خط کے مضمون کی اہمیت کے پیش نظر میں خود ہی اس کا جواب تحریر کرنا چاہتا تھا —— (بلکہ میری خواہش تو اور ہی تھی جس کا ذکر آگے آئے گا!) —— ادھر اپریل ۸۴ء سے میرے بیرونِ ملک دوروں کا جو سلسلہ شروع ہوا تو اپریل میں ہندوستان اور مئی میں سعودی عرب کے طویل دورے ہوئے —— جون میں رمضان المبارک میں اس سال اللہ تعالیٰ نے توفیق عطا فرمائی تو نمازِ تراویح کے ساتھ پورے قرآن مجید کے ترجمہ کا دورہ مکمل کیا — جولائی مکمل اور نصف اگست امریکہ اور برطانیہ کے دورے کی نذر ہوگئے۔ واپس آیا تو اندرونِ ملک دوروں کے ''قرض'' کی ادائیگی میں مصروف ہوگیا۔ اور گزشتہ دو ہفتوں سے علیل اور صاحبِ فراش ہوں۔

ادھر میری اصل خواہش آپ کو خود جواب تحریر کرنے سے بھی زیادہ یہ تھی کہ ایسے اہم موضوع پر خط وکتابت کی بجائے بالمشافہ ملاقات کی شکل نکال کر تفصیلی گفتگو کی جائے! اسی غرض سے میں نے بعض ذرائع سے آپ کے بارے میں معلومات حاصل کرنی چاہی تھیں کہ اگر آپ کوئی معمر بزرگ ہوں تو میں خود حاضر خدمت ہونے کی سبیل نکالوں —— اور اگر نوجوان علماء میں سے ہوں تو آپ کو لاہور آنے کی دعوت دوں۔ اس کا آپ نے جس قدر برا منایا اس سے حیرت ہوئی —— تاہم آپ کے دوسرے خط کے اسلوبِ نگارش سے میرا مقصد حاصل ہوگیا —— اس لیے کہ اس نوعمری کا لاابالیانہ پن —— اور اٹھتی ہوئی جوانی کا متحدیانہ انداز آپ کی عمر کی غمازی کررہا ہے —— آپ کے اس دوسرے خط کا ایک ''ترکی بہ ترکی'' قسم کا جواب بھی تنظیم کے دفتر والوں نے تیار کرلیا تھا لیکن میں نے اسے روک لیا —— اس لیے کہ میں خود ہی کچھ معروضات پیش کرنے کی خواہش رکھتا تھا۔ اس اثنا میں معاصر ماہنامہ ''الخیر'' میں آپ کا کھلا

استفسار نظر سے گزرا جس میں آپ نے اپنے پہلے خط کی تلخیص اپنے دوسرے خط کے طنزیہ انداز میں نگارش کی ہے—— بہرحال اب میں حاضر خدمت ہوں' تاخیر کے لیے معذرت کے ساتھ!

آپ نے بعض احادیثِ نبویہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام میری ہدایت و رہنمائی کے لیے درج فرمائی ہیں جن کے لیے میں آپ کا شکرگزار ہوں۔ (اگرچہ ان کے محل و موقع کے ساتھ عدم مناسبت کے ضمن میں بعد میں کچھ عرض کروں گا!) اور خود بھی آپ کی خدمت میں ایک حدیثِ نبویؐ کا تحفہ پیش کرنے کی اجازت چاہتا ہوں۔ یعنی ((لَيْسَ الْمُؤْمِنُ بِالطَّعَّانِ وَلَا بِاللَّعَّانِ وَلَا الْفَاحِشِ وَلَا الْبَذِيِّ)) (ترمذی) اُمید ہے کہ آپ اس پر ضرور توجہ فرمائیں گے۔

جہاں تک حضرت شیخ الہندؒ سے متعلق میری تحریر کا تعلق ہے' اصل تحریر سے یہ بات بالکل واضح ہے کہ نہ اس موضوع پر کچھ لکھنا میرے پیش نظر تھا اور نہ ہی وہ واقعات جن کا میں نے ذکر کیا ہے' خود میرے علم میں پہلے سے تھے۔ مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم کی زندگی کے ''الہلال'' اور ''البلاغ'' والے دور سے اصولاً مجھے تعلق خاطر ہے اور اس کے تذکرے میں ایک بات میرے قلم سے وہ نکل گئی جو مجھے پروفیسر یوسف سلیم چشتی مرحوم و مغفور کی زبانی معلوم ہوئی تھی۔ جس کی شدت کے ساتھ تردید ڈاکٹر احمد حسین کمال صاحب نے کی۔ چنانچہ مجھے تحقیق و تفتیش میں سرگرداں ہونا پڑا جس کی پوری تفصیل میرے اس مضمون میں درج ہے —— اس تحقیق و تفتیش کے دوران حضرت شیخ الہندؒ کی شخصیت کے جو پہلو میری نگاہوں کے سامنے آئے وہ اس سے قبل خود میرے علم میں بھی نہ تھے۔ حالانکہ میں اپنے زمانۂ طالب علمی ہی سے ان کے ترجمۂ قرآن مع حواشی مولانا شبیر احمد عثمانیؒ سے استفادہ کرتا رہا ہوں اور اس وجہ سے مجھے ان دونوں بزرگوں سے ایک گونہ تعلق خاطر حاصل تھا —— میری تحریر کا اصل محرک تو وہ تحریر خود بول رہی ہے کہ وہ شدت تأثر تھا جو حضرت شیخ الہندؒ کی شخصیت کے عظمت کے انکشاف سے مجھ پر ہوا جس کی بنا پر میری یہ حتمی رائے بنی کہ چودھویں صدی ہجری کے مجدد حضرت شیخ الہندؒ تھے—— ساتھ ہی یہ احساس بھی اُبھرا کہ حضرت شیخ الہندؒ کی عظمت سے خود حلقۂ دیوبند کے علماء اور خصوصاً ان کی نوجوان نسل کی اکثریت پوری طرح واقف نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے حلقوں میں حضرت شیخ الہندؒ کی بعض دوسری معاصر شخصیتوں کا چرچا ان کے مقابلے میں زیادہ ہے! (واضح رہے کہ میرا نوجوانی کے دور ہی سے حلقۂ دیوبند کے علماء سے رابطہ رہا ہے۔ جن دنوں میں

ساہیوال میں مقیم تھا تو جامعہ رشیدیہ اور اس سے وابستہ علماء کرام سے شرف ملاقات حاصل ہوتا رہا تھا۔ کراچی میں مولانا محمد یوسف بنوریؒ اور مولانا مفتی محمد شفیعؒ کی خدمت میں حاضری کا بارہا اتفاق ہوا! —— اور لاہور میں جامعہ مدنیہ اور بالخصوص مولانا سید حامد میاں مدظلہ کی خدمت میں بحمداللہ میری مسلسل حاضری رہتی ہے۔ اور ان کے سامنے جب میں نے اپنا یہ خیال ظاہر کیا کہ چودھویں صدی ہجری کے مجدد حضرت شیخ الہندؒ تھے تو وہ بھی چونک سے گئے اور ان کا ردِّعمل تائیدی رنگ لیے ہوئے تھا!) اس تحریر کی دوبارہ اشاعت کا اصل محرک یہی خیال تھا کہ حضرت شیخ الہندؒ کی شخصیت سے لوگوں کو ازسرنو متعارف کرایا جائے۔

البتہ اس کے بین السطور میں آپ نے میری جس ''نیت'' یا ''خواہش'' کا سراغ لگایا ہے' میں اس کی بالکلیہ نہ تردید کرتا ہوں نہ توثیق —— من وجہ اقرار ہے اور —— من وجہ انکار!

ایک شاعر کے قول ''ہم لوگ اقراری مجرم ہیں'' کے مصداق مجھے برملا اعتراف ہے کہ مجھے اللہ تعالیٰ نے جس کام کے لیے اپنی زندگی وقف کر دینے کی توفیق عطا فرمائی ہے' اور جس کے لیے میں نے اپنے پیشۂ طب کو بھی خیرباد کہا ہے' وہ وہی ہے جس کی بیسویں صدی عیسوی میں پہلی بار نہایت زوردار دعوت دی تھی مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم نے ''الہلال'' اور ''البلاغ'' کے ذریعے—— اور جس کے لیے انہوں نے عملی جدوجہد کا آغاز بھی ''حزب اللہ'' کے قیام کی صورت میں کر دیا تھا' لیکن جسے وہ بعض داخلی عوامل اور خارجی موانع کے باعث جلد ہی بددل ہو کر چھوڑ بیٹھے—— مجھے حیرت ہے کہ آپ مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم ہی نہیں' حضرت شیخ الہندؒ کی مساعی کا اصل ہدفِ اوّلین بھی ''صرف اور صرف جہادِ حریت اور تحریک استخلاصِ وطن'' کو قرار دے رہے ہیں اور ''حزب اللہ کی تأسیس اور حکومت الٰہیہ کا قیام عمل میں لانا'' آپ کے نزدیک اس اصل مقصد کا ذریعہ تھا —— مجھے یقین ہے کہ ''الخیر'' والے مضمون میں یہ جملے آپ کے قلم سے سہواً نکل گئے ہیں ورنہ یہ حقیقت آپ پر یقیناً منکشف ہوگی کہ جس طرح پچھلی صدی کی دو عظیم تحریکوں میں سے اوّلین یعنی تحریک شہیدین خالصتاً مسلمانوں کی تحریک تھی اور اس کا اصل مقصد تھا ''اعلائے کلمۃ الحق اور قیامِ حکومتِ الٰہیہ و نظامِ شرعیہ'' اور اس کے ذریعے کے طور پر پیش نظر تھا استخلاصِ وطن' جبکہ دوسری تحریک یعنی ۱۸۵۷ء کا جہادِ آزادی (انگریزوں کے قول کے مطابق ''غدر'') ہندوؤں اور مسلمانوں کی مشترک تحریک تھی۔ اور اس کا اصل مقصد تھا حصولِ آزادی —— البتہ اس میں جن علمائے کرام نے حصہ لیا ان

کے پیشِ نظر یقیناً مقدم الذکر مقصد بھی تھا — اسی طرح مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم کے دَورِ اوّل کا اصل مقصد تھا ''رجوع الی القرآن اور جہاد فی سبیل اللہ برائے اقامت دین اور قیامِ حکومت الٰہیہ'' اور اس کے لیے انہوں نے بالفعل آغاز کر دیا تھا ''حزب اللہ'' کی تاسیس سے — جبکہ ۱۹۲۰ء کے بعد سے ان کی مساعی بالفعل کلیتًا مرتکز ہو گئیں ''صرف اور صرف جہادِ حریت اور استخلاصِ وطن'' کے لیے! — حضرت شیخ الہندؒ کے جہادِ زندگی کا اصل تعلق ہے ''تحریک شہیدین'' سے۔ اگرچہ بیسویں صدی کے اوائل میں ان کی جدوجہد میں زیادہ رنگ غالب نظر آتا ہے ''جہادِ حریت اور استخلاصِ وطن کا'' — اور یہی وجہ ہے کہ ''الہلال'' اور ''البلاغ'' والے ابوالکلام کے بارے میں ان کی زبان سے وہ تاریخی جملہ نکلا کہ ''اس نوجوان نے ہمیں ہمارا بھولا ہوا سبق یاد دلا دیا ہے!'' — اس ضمن میں ایک واقعہ اور بھی سن لیں جو حال ہی میں مولانا سعید احمد اکبر آبادی مدظلہ نے (جو اس وقت شیخ الہندؒ اکیڈمی دیو بند (بھارت) کے ڈائریکٹر ہیں) سنایا کہ جب کانپور کی مسجد کے واقعہ پر صورتِ حال بہت نازک ہو گئی تھی اور کشیدہ تھی اور اس سلسلہ میں نہایت تیز و تند مضامین لکھے تھے مولانا آزاد مرحوم نے۔ تو صورتِ حال کو سنبھالنے کے لیے یو پی کے لیفٹیننٹ گورنر نے دیو بند کا دورہ رکھا اور دارالعلوم میں آمد کا پروگرام بھی بنایا' لیکن ساتھ ہی یہ ہدایت بھی کر دی کہ اس موقع پر مولانا ابوالکلام موجود نہ ہوں — چنانچہ اس وقت کے مہتمم صاحب نے مولانا آزاد کے دارالعلوم میں داخلے پر پابندی لگا دی تو حضرت شیخ الہندؒ نے بھی اس جلسے کا بائیکاٹ کیا اور اس میں شرکت نہیں فرمائی۔ اور جب کچھ لوگوں نے ان کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ ''حضرت! آپ ایک نوجوان کا اس درجہ کیوں خیال فرما رہے ہیں؟'' تو انہوں نے جواباً یہ شعر پڑھا: ؎

کامل اس طبقۂ زہاد سے اٹھا نہ کوئی
کچھ ہوئے تو یہی رندانِ قدح خوار ہوئے [1]

(۱) مولانا سعید الرحمٰن علوی سابق مدیر خدام الدین نے اپنے ایک مقالہ (شائع شدہ ''میثاق'' اکتوبر ۱۹۸۳ء) میں یہ واقعہ لکھا ہے کہ شیخ الہندؒ نے شدید علالت کے دوران جمعیت علماءِ ہند کے دوسرے جلسہ ۱۹ تا ۲۱/ نومبر ۱۹۲۰ء بمقام دہلی کی صدارت بھی فرمائی تھی اور خطبۂ صدارت بھی ارشاد فرمایا تھا۔ بقول مولانا محمد میاں ''بیماری و نقاہت کے سبب تھوڑی دیر بھی اسٹیج پر بیٹھنا دشوار تھا'' لیکن اس اجلاس کے اہم ترین ایجنڈا یعنی امیر الہند کے انتخاب کے سلسلے میں ان کے احساسات یہ تھے ''میری چار پائی اٹھا کر جلسہ گاہ میں لے جائی جائے اور یہ کام کر لیا جائے۔ پہلا شخص جو بیعت کرے گا وہ میں ہوں گا''۔ ◀

خدارا! حقائق و واقعات کو ان کے صحیح پس منظر میں دیکھنے کی کوشش کریں — اور خود اپنے حلقے کی ایک عظیم شخصیت کی زندگی کے ایک دور (اور وہ بھی آخری دور) کے ایک اہم باب پر جو پردۂ خفا پڑ گیا ہے (یا جان بوجھ کر ڈال دیا گیا ہے!) اسے اٹھا کر اصل حقیقت کو دیکھنے کی سعی کریں — بہر حال میرے نزدیک مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم کے اس انتقالِ موقف سے جو جگہ خالی ہوئی تھی اسی کو پُر کرنے کے لیے اٹھے تھے مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی مرحوم — چنانچہ یہ محض ''اتفاق'' نہیں ہے کہ مولانا مودودی مرحوم کی پہلی تصنیف تھی ''**الجهاد في الاسلام**''۔ جو گویا نہایت بسیط اور مدلل صدائے بازگشت تھی ''الہلال'' اور ''البلاغ'' کی دعوت جہاد فی سبیل اللہ کی — اور مولانا آزاد مرحوم کی تفسیر اور مولانا مودودی مرحوم کے ماہنامے دونوں کا نام ایک ہی ہے یعنی ''**ترجمان القرآن**''۔

مولانا مودودی مرحوم کے بعض نظریات سے شدید اختلاف کے باوجود میری رائے ہے کہ انہوں نے اصلاً اس دعوت کے تسلسل کو قائم رکھا جس کے داعیٔ اوّل مولانا آزاد تھے — اور اس سلسلے میں یقیناً قابل لحاظ پیش رفت بھی کی' لیکن افسوس کہ جس طرح ان کے پیش رَو اپنے رُخ کی تبدیلی کے بعد کلیتًا وقف ہو کر رہ گئے تھے ''ہندوستان کی قومی سیاست'' کے — اسی طرح مولانا مودودی اور ان کی قائم کردہ جماعت اسلامی بھی آزادی ہند اور قیامِ پاکستان کے بعد ''پاکستانی قومی سیاست'' کی نذر ہو گئے — اور اس طرح خالص اقامتِ دین و غلبۂ دین کی جدوجہد اور اسلام کی انقلابی دعوت کا تسلسل پھر ٹوٹ کر رہ گیا — چنانچہ اسی کے احیا کے لیے سر دھڑ کی بازی لگا دینے کا عزمِ مصمم کیا ہے ان سطور کے حقیر و عاجز راقم نے — اور اس کام میں وہ اپنے آپ کو محتاج پاتا ہے جملہ علمائے دین' بالخصوص حلقۂ دیو بند کے وابستگان کی اعانت اور سرپرستی کا — چنانچہ یہ ہے میری اصل خواہش یا تمنا جسے آپ نے میری تحریر کے بین السطور پڑھا ہے' اور اس حد تک میں ''اقراری مجرم'' ہوں — لیکن اگر آپ اسے تعبیر کرتے ہیں ''امام الپاکستان'' بننے کی خواہش اور منصب کی تمنا سے تو یہ میرے نزدیک ع ''جو چاہے آپ کا حسنِ کرشمہ ساز کرے'' کے مصداق خالصتاً آپ کے اپنے ذہن کی تخلیق و

◀ مولانا علوی نے یہ واقعہ تاریخ اُمت ص ۵۳ کے حوالے سے لکھا ہے۔ حضرت شیخ الہندؒ کے پیشِ نظر امیر الہند یا امام الہند کے لیے مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم ہی کا نام تھا اور تاریخی شواہد سے ثابت ہے کہ حضرتؒ کے ایما پر اس تجویز کے مفتی کفایت اللہؒ مجوز اور مولانا احمد سعیدؒ مؤید تھے۔ (ج۔ر)

اختراع ہے جس سے میں اظہارِ براءت کرتا ہوں اور آپ سے بھی عرض کرتا ہوں کہ ﴿اِجْتَنِبُوْا كَثِيْرًا مِّنَ الظَّنِّ ۫ اِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ اِثْـمٌ﴾ کی قرآنی ہدایت کو پیشِ نظر رکھیں اور اس سوءِ ظن سے اجتناب فرمائیں۔

الحمدللہ کہ مجھ پر یہ حقیقت پوری طرح منکشف ہے کہ کسی ایک انسانی زندگی کے مختصر سے عرصہ میں کسی خطۂ زمین میں دعوتِ اسلامی کے آغاز سے اقامت وغلبۂ دین کی آخری منزل تک کے جملہ مراحل یا بالفاظِ دیگر اسلامی انقلاب کی تکمیل کا واقعہ تو پوری انسانی تاریخ میں ایک ہی بار ہوا ہے —— یعنی سید الاوّلین والآخرین اور امام الانبیاء والمرسلین ﷺ کے دست مبارک سے —— اور آپ ہی کے مقصد بعثت کی آخری تکمیل (بقول امام الہند حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ)' (ازالۃ الخفاء) کے طور پر یہ کام ایک بار پھر ہوگا —— اور عالمی سطح پر ہوگا' لیکن اس کے لیے آپ ﷺ کے غلاموں کو کئی نسلوں تک مسلسل جدوجہد کرنی ہوگی اور ایک ایک نسل کے دوران اس عمل کو ایک ایک درجہ آگے بڑھا دینا بھی اُمت کے لیے بہت بڑی کامیابی ہے اور جو خوش قسمت افراد اس کے لیے اپنی زندگیاں وقف کر دیں ان کے لیے بہت بڑی سعادت ہوگی۔ اور اس ضمن میں اپنی تمام تر ناکامیوں کے باوصف جو خدمت انجام دی تھی مولانا آزاد نے اسی کے چراغ سے روشن ہوا جماعت اسلامی کا دِیا —— اور اب اس کی بھی ناکامی کے بعد ان شاء اللہ اسی کی خاکستر سے نئی چنگاریاں روشن ہوں گی اور میں اپنی تمام تر بے بضاعتی کے باوجود ''خواہش مند'' ہوں۔

احب الصالحین ولست منهم   لعل اللّٰه یرزقنی صلاحًا

کے مصداق اسی فہرست میں اپنا نام درج کرانے کا —— لیکن ہرگز مبتلا نہیں ہوں اس خبط و حماقت میں کہ یہ عظیم کام میری ''امامت'' میں سرانجام پائے گا اور میں نہ صرف یہ کہ مجددین کی فہرست میں جگہ پا جاؤں گا بلکہ بقول مولانا مودودی ''مجدد کامل'' کے مقام پر فائز ہو جاؤں گا! —— اس ضمن میں' میں درخواست کروں گا کہ آپ میری ایک تالیف ''سرافگندیم'' کا مقدمہ ضرور ملاحظہ فرمالیں۔

اس ضمن میں آپ نے جن احادیثِ نبویہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کا حوالہ دیا ہے اُس میں آپ سے نادانستہ ایک شدید خلط مبحث ہوگیا ہے۔ آپ ذرا غور فرمائیں کہ کیا حکومت کے مناصب کی طلب یا خواہش اور دین کی کسی چھوٹی یا بڑی خدمت کے لیے پیش قدمی ایک ہی

قبیل کی چیزیں ہیں؟ آپ کے استدلال کا غلط نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ کوئی شخص کسی حال میں بھی دین کی خدمت کا داعیہ لے کر نہ اٹھے' اس لیے کہ لامحالہ اس سلسلہ میں جو شخص بھی پہل کرے گا اور دوسروں کو ''مَنْ اَنْصَارِیْ اِلَی اللّٰہِ'' کی ندا دے گا' وہ فطری طور پر خود اس صدا پر لبیک کہنے والوں کا سربراہ' یا رہنما' یا امیر بن جائے گا۔ اور یہ چیز چونکہ ناپسندیدہ ہے لہٰذا لازم ہے کہ سب بیٹھے رہیں اور صورتِ حال کو دن بدن بگڑتے دیکھیں اور خاموش رہیں —— گویا۔

مگس کو باغ میں جانے نہ دینا   کہ ناحق خون پروانے کا ہوگا!

مجھے یقین ہے کہ آپ اپنے طرزِ استدلال کے اس منطقی نتیجے کو پسند نہیں فرمائیں گے —— اور بفرضِ محال اگر آپ کا خیال وہی ہے تو سب سے پہلے آپ اس کا جواب دیں کہ قریب ترین ماضی کی خالص ترین اسلامی تحریک کے داعی ومجاہد کبیر حضرت سید احمد بریلویؒ کے بارے میں آپ کی رائے کیا ہے!! —— کیا انہیں وقت کے ''اربابِ حل وعقد'' نے ''منصبِ امامت'' پر فائز کر دیا تھا یا انہوں نے خود اپنی بیعت کی دعوت لوگوں کو دی تھی!

آپ کے معاصر ''الخیر'' کے آخری اور حد درجے تیکھے سوال یعنی ''مولانا ابوالکلام کے لیے امامتِ ہند کے رفیع منصب کے مجوز ومؤید اس وقت کے خیارِ اُمت' زہد وتقویٰ' اخلاص و للّٰہیت اور علم وفضل میں یکتائے روزگار تھے لہٰذا دریافت طلب امر یہ ہے کہ آں موصوف کی امارت کے مجوز ومؤید کون اور کس معیار کے لوگ ہیں؟'' (ص ۴۶) کا اسی قدر تیکھا اور الزامی جواب تو یہ بنتا ہے کہ حضرت! مجھ سے یہ سوال کرنے کے بجائے پہلے آپ اس کا جواب دیں کہ بقولِ خود آپ کے ''وقت کے خیارِ اُمت'' اور ''زہد وتقویٰ' اخلاص وللّٰہیت (اور) علم وعمل میں یکتائے روزگار'' حضرات کی تجویز وتائید کا وہ حشر کیوں ہوا؟ —— کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ ہم ''نہ خود کچھ کرنا نہ دوسروں کو کچھ کرتے دیکھ سکنا'' کے مہلک مرض میں مبتلا ہو گئے ہوں؟ اور کہیں ایسا تو نہیں کہ آپ کی اس ساری بھناہٹ کا اصل سبب حضرت شیخ الہندؒ کی شخصیت کے آئینے میں موجود الوقت علماء کی اکثریت کی تصویر دیکھ لینا ہو!! گویا ع

آئینہ دیکھ اپنا سا منہ لے کے رہ گئے!

لیکن یہ ساری نوک جھونک غیر مفید بلکہ نقصان دہ ہے۔ اصل اہمیت اس مسئلہ کی ہے کہ ہم غور کریں کہ آیا دین حق اس وقت ''اَلْحَقُّ یَعْلُوْا وَلَا یُعْلٰی'' کے مصداق غالب وسربلند ہے یا سرنگوں اور پامال! بقول حالؔی مرحوم:

پستی کا کوئی حد سے گزرنا دیکھے
اسلام کا گر کر نہ اُبھرنا دیکھے!
مانے نہ کبھی کہ مد ہے ہر جزر کے بعد
دریا کا ہمارے جو اُترنا دیکھے!

اور: ؎

اے خاصۂ خاصانِ رسل وقت دعا ہے
اُمت پہ تری آ کے عجب وقت پڑا ہے!
وہ دیں جو بڑی شان سے نکلا تھا وطن سے
پردیس میں وہ آج غریب الغربا ہے!

پھر اگر معاملہ واقعی مغلوبیت اور پامالی کا ہے تو اس صورت حال کی تبدیلی کا صحیح نہج کیا ہے؟ اور کیا اس ضمن میں وہی راہِ عمل درست اور صحیح نہیں ہے جو تجویز کی تھی ۱۹۱۲ء تا ۱۹۲۰ء مولانا ابوالکلام آزاد نے' اور جس کی کامل تصویب و توثیق فرمائی تھی ''استاذ الاساتذہ'' (یہ الفاظ مولانا مفتی محمد شفیعؒ کے ہیں) اور ''شیخ الشیوخ'' 'امام الہند مولانا محمود حسن دیو بندیؒ نے اس وقت جبکہ ان کی حیاتِ مستعار کا دیا ٹمٹما رہا تھا اور وہ سفر آخرت کے لیے بالکل پابرکاب تھے! —— اور اگر اس وقت ان کے ایما کے مطابق ایک قدم اس لیے نہ اٹھایا جا سکا کہ خیر آبادی مکتب فکر کے ایک عالم دین نے ایک صحیح اور درست لیکن خالص فنی نوعیت کا اعتراض کر دیا تو کیا اس کے بعد سے آج تک ان کے تلامذہ اور متوسلین میں سے کسی نے خالصتاً اس طریق کار پر جدوجہد کا آغاز کیا؟؟

محترم! ؏ ''ہمت ہے تو افکار کی دنیا سے گزر جا!'' کے مصداق ذرا کمر ہمت کسیے اور ان امور پر غور فرمائیے کہ:

(۱) کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ علی گڑھ اور دیو بند کے مابین جس خلیج کو ابتدا ہی میں پاٹ دینے کی کوشش کی تھی حضرت شیخ الہندؒ نے' وہ اس کے بعد روز بروز وسیع سے وسیع تر ہوتی چلی گئی اور مسلمانانِ برصغیر کی ملی اور قومی زندگی کا اصل دھارا علی گڑھ کے زیر اثر آتا چلا گیا —— اور علماء کی حیثیت زندگی کی اصل منجدھار سے ہٹی ہوئی ایک پتلی سی دھار کی ہوتی چلی گئی —— تا آنکہ اب وہ اپنے محدود دائرہ اثر کے جزیروں میں محصور ہو کر رہ گئے ہیں۔ اور

یہ جزیرے بھی دن بدن ﴿نَاْتِی الْاَرْضَ نَنْقُصُھَا مِنْ اَطْرَافِھَا﴾ کے مصداق روز بروز مختصر سے مختصر تر ہوتے چلے جا رہے ہیں؟

(۲) پھر کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ حضرت شیخ الہندؒ طبقۂ علماء کی وہ آخری شخصیت تھے جنہوں نے جو کام بھی کیا' اپنے بل بوتے پر کیا —— جس کا اصل نقشۂ کار بھی ان ہی کے ذہن کی پیداوار تھا —— اور اس پر عملی جدوجہد کی قیادت و رہنمائی بھی خود ان ہی کے ہاتھ میں تھی —— ان کے بعد سے برصغیر میں قومی اور عوامی سطح پر علماء کرام کی مختلف تنظیموں کی حیثیت عظیم تر اور سیکولر مزاج سیاسی تحریکوں کے ضمیموں کی رہی ہے۔ چنانچہ حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ جیسی عظیم شخصیت کی قیادت کے باوصف جمعیت العلماء ہند کی حیثیت کانگریس کے ضمیمے سے زیادہ نہ تھی —— اسی طرح مولانا شبیر احمد عثمانیؒ ایسی نابغہ شخصیت کی قیادت کے باوصف جمعیت علماءِ اسلام کی حیثیت مسلم لیگ کے ضمیمے سے زیادہ نہ تھی —— اور یہی صورتِ حال آج تک جاری ہے کہ اس وقت بھی حلقۂ دیو بند کے سیاسی اور عوامی مزاج کے حامل علماء کرام اپنی تمام تر جلالتِ شان اور مرتبہ و مقام کے باوصف یا موجودہ فوجی آمریت کا ضمیمہ ہیں' یا ایم آر ڈی کا —— اور یا پھر جماعت اسلامی کے مانند ''نیمے دروں' نیمے بروں'' بلکہ صحیح تر الفاظ میں ''نہ اِدھر نہ اُدھر'' کا مصداق بن کر رہ گئے ہیں (اور کم و بیش یہی حال بریلوی مکتبۂ فکر اور اہل حدیث حضرات کی قیادت کا ہے۔)

(۳) پھر کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ علماء کرام جمعہ و جماعت' درس و خطابت' افتاء وارشاد ایسی اہم خدماتِ جلیلہ اور قال اللہ اور قال الرسول ﷺ کی صداؤں اور دینی علوم کو زندہ رکھنے کے عظیم کارنامے' —— اور دین حق اور شریعتِ حقہ کے خلاف اٹھنے والی تحریکوں کے خلاف مساعی عظیمہ کے باوصف غلبہ و اقامتِ دین کے مثبت مقصد کی جانب کوئی قابل لحاظ اور مؤثر اجتماعی تحریک نہیں چلا پا رہے؟ —— علماءِ دیو بند کے ایک حلقے سے تبلیغ دین کے عنوان سے جو عظیم حرکت شروع ہوئی' اس میں شک نہیں کہ وسعت کے اعتبار سے اس کی کوئی نظیر حال میں تو کیا ماضی میں بھی نہیں ملتی —— لیکن کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ وہ بھی انفرادی اصلاح کے مرحلے سے آگے بڑھ کر کسی خطۂ ارضی پر دین حق کے واقعی قیام و نفاذ کے لیے کوئی ''راست اقدام'' کرنے کے بارے میں سوچنے پر بھی آمادہ نہیں!

اندریں حالات —— کیا وقت کا اصل تقاضا یہ نہیں ہے کہ:

۱۔ ایک خالص دینی تحریک۔ خالصتاً غلبہ واقامت دین کے مقصد یا بالفاظِ دیگر ''اسلامی انقلاب'' کے لیے برپا ہو۔ جس میں علماء کرام اور جدید تعلیم یافتہ دونوں حلقوں کے لوگ شامل ہوں اور یہ تحریک وقتی مسائل و واقعات اور خالص سیاسی حالات کی کروٹوں سے صرفِ نظر کرتے ہوئے اصلاً نبی اکرم ﷺ اور صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین ﴿مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ ؕ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗۤ﴾ کے اُسوۂ مبارکہ کو پیش نظر رکھتے ہوئے اور تبعاً ماضیٔ قریب کی خالص اسلامی تحریک ''تحریک شہیدینؒ '' کے طریق کار اور تجربے سے استفادہ کرتے ہوئے ابتداءً ﴿وَجَاهِدْهُمْ بِهٖ جِهَادًا كَبِيْرًا﴾ کے مصداق ''الہدیٰ'' کی سیف قاطع کے ذریعہ الحاد' دہریت' زندقہ اور کفر وشرک کے خلاف جہاد کے لیے پیش قدمی کرے اور وقت آنے پر غلبہ و اقامت دین کے لیے ''راست اقدام'' کرے اور یا اس میں بالفعل کامیاب ہو یا کم از کم ﴿مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَيْهِ ۚ فَمِنْهُمْ مَّنْ قَضٰى نَحْبَهٗ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّنْتَظِرُ ۖ وَمَا بَدَّلُوْا تَبْدِيْلًا ﴾ (الاحزاب) کے مصداق جانوں کا ہدیہ تو بارگاہِ خداوندی میں پیش کر دے۔

۲۔ اس کے لیے تنظیم کی اساس مغرب سے درآمد شدہ اور فی الوقت عمومی طور پر مروّجہ طریقوں پر نہ ہو بلکہ ''بیعت سمع وطاعت وہجرت و جہاد'' کی منصوص' مسنون اور ماثور اساس پر ہو۔

اب اگر ایک حقیر و ناتواں انسان نے وقت کے اس تقاضے پر لبیک کہتے ہوئے اس کام کا بیڑا اٹھا ہی لیا ہے تو کیا علماءِ کرام بالخصوص اس حلقے سے وابستہ حضرات' جو حضرتِ شیخ الہندؒ کی عظمت کے پوری طرح قائل ہیں اور مولانا آزاد مرحوم کو بھی کسی نہ کسی درجے میں ''اپناتے'' ہیں' کا کام یہ ہے کہ اسے طنز و تشنیع کا ہدف بنائیں یا یہ کہ نوجوان اس کا ساتھ دیں —— اور بزرگ اس کی سرپرستی فرمائیں؟ —— جبکہ

(۱) اسے اپنی بے بضاعتی کا پورا اعتراف ہو اور وہ علماء کا حریف ہونا تو درکنار عالم دین ہونے کا سرے سے مدعی ہی نہیں بلکہ اپنے آپ کو محض قرآن حکیم کا ایک ادنیٰ طالب علم اور دین حق کا ایک ادنیٰ خادم قرار دیتا ہو۔

(۲) اپنے بعض پیش رووں کی غلطیوں سے تنبہ حاصل کرتے ہوئے مجتہدِ مطلق ہونے کا ادّعا تو درکنار' فقہیات میں سرے سے دخل ہی نہ دیتا ہو۔

(۳) سلف صالحین کے اتباع اور ''سبیل المؤمنین'' کے التزام کو اپنے لیے لازم قرار دیتا ہو —— اور

(۴) موجود الوقت علماء ومشائخ کی تعظیم وتوقیر کرتا ہو —— اور اپنے آپ کو اُن کے تعاون اور سرپرستی کا محتاج سمجھتا ہو ——!!

آخر میں طویل سمع خراشی کے لیے معذرت خواہ ہوں —— اور اُمید کرتا ہوں کہ آپ اور ادارۂ ''الخیر'' میری باتوں پر ٹھنڈے دل سے غور فرمائیں گے۔ میں اپنی بات کی وضاحت کے لیے علماءِ کرام کی خدمت میں حاضری کو اپنے لیے سعادت خیال کرتا ہوں' اس کا موقع مرحمت فرمائیں تو مزید ممنون ہوں گا۔

فقط

وَالسَّلَامُ عَلَى الَّذِيْنَ يَسْتَمِعُوْنَ الْقَوْلَ فَيَتَّبِعُوْنَ اَحْسَنَهٗ

اسرار احمد عفی عنہ' محرم الحرام ۱۴۰۵ھ

حکیم محمود احمد برکاتی

انتخابِ امام الہندؒ

جمعیت علماءِ ہند' شیخ الہند مولانا محمود حسن اور مولانا ابوالکلام آزاد کی نسبت وحوالہ سے ایک اہم مسئلہ ''نظم جماعت اور انتخابِ امام الہند'' کا ہے' جس کی بہت سی تفصیلات قارئین' محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کی متعدد تحریروں کے ساتھ ساتھ بعض دوسرے مضامین میں بھی پڑھ چکے ہیں۔

خاص طور پر ڈاکٹر صاحب نے اپنے تفصیلی مضامین میں اس مسئلہ پر بڑی شرح و بسط سے لکھا ہے اور یہ ثابت کیا کہ مختلف مراحل سے گزر کر یہ مسئلہ اس موڑ پر پہنچ چکا تھا کہ مولانا ابوالکلام آزاد کی امامت پر شیخ الہندؒ سمیت اکثر و بیشتر حضرات متفق ہو چکے تھے بلکہ شیخ الہندؒ تو نہایت درجہ حساس تھے اور چاہتے تھے کہ جلد از جلد یہ مسئلہ طے ہو اور وہ سب سے پہلے خود بیعت کرنے پر آمادہ تھے۔

جمعیت کا ۱۹۲۰ء کا اجلاس جو حضرت شیخ الہندؒ کی زندگی کا پہلا اور آخری اجلاس تھا (اس لیے کہ ۱۹۱۹ء کے اجلاس میں شیخ الہند جیل میں تھے اور ۱۹۲۰ء کے بعد جلد ہی ان کا انتقال ہو گیا) وہ اس لحاظ سے فیصلہ کن تھا اور عام طور پر اُمید ہو چلی تھی کہ یہ بات طے ہو جائے گی لیکن ہندوستان کی ایک علمی تحریک ''خیر باد'' کے گل سرسبد علامۃ الہند مولانا معین الدین اجمیری قدس سرہ کی مخالفت نے سارے منصوبے کو ایسا التوا میں ڈالا کہ پھر اس سلسلہ میں کوئی مزید پیش رفت نہ ہو سکی۔ اس کے بعد جلد ہی حضرت شیخ الہندؒ انتقال کر گئے۔ ایک مضبوط اور ذمہ دار شخصیت کے اٹھ جانے کا اثر سبھی پر ہوا۔ خود مولانا آزاد کے جذبات بھی سرد پڑ گئے اور ۱۹۲۱ء میں جب لاہور میں اجلاس ہوا تو بقول ملک نصر اللہ خان عزیز اور ڈاکٹر شیر بہادر خان پنی توقع ہی نہیں' یقین تھا کہ اب ضرور کچھ ہوگا' لیکن ایسا نہ ہوا۔ جس کا راز بعد میں یہی کھلا کہ مولانا اجمیری بنیادی طور پر اس معاملہ کے التوا کا باعث بنے تھے' البتہ بعد ازاں بعض دوسرے علماء بھی جن میں مولانا شبیر احمد عثمانیؒ کا نام نمایاں ہے' تجویز کے مخالف ہو گئے تھے۔ اس ضمن میں پروفیسر یوسف سلیم چشتی صاحب نے مولانا عبدالماجد دریابادی بدایونی سے سنے

ہوئے چند جملے نقل کیے تھے جو مبینہ طور پر اس سلسلہ میں مولانا اجمیری نے مولانا آزاد سے مخاطب ہو کر کہے تھے جن میں یہ تیکھے الفاظ بھی شامل تھے کہ:

''ایاز قدر خود بشناس''

سلسلہ خیر باد کے ایک فاضل حکیم محمود احمد برکاتی نے اس موضوع پر قلم اٹھایا ہے اور ایک لمبی تحریر کے ذریعہ یہ ثابت کرنا چاہا ہے کہ مولانا اجمیری نے یہ جملہ نہیں کہا تھا اور بعد میں ان کے مولانا آزاد سے تعلقات و مراسم بہت اچھے رہے۔

ہمیں تعلقات و مراسم کی اچھائی کا انکار بالکل نہیں لیکن یہ سوال اپنی جگہ اہم ہے کہ برکاتی صاحب یہ تسلیم فرماتے ہیں کہ اس مسئلہ کے سلسلہ میں علماء بے حد حساس تھے' ایسا کرنا چاہتے تھے لیکن ۱۹۲۰ء کے اجلاس میں ایسا نہ ہو سکا تو آخر کیوں؟ اور پھر ۱۹۲۱ء کے اجلاس میں لوگوں کی توقع کے باوجود اس کا کسی نے ذکر تک نہ کیا تو اس کا سبب کیا ہے؟

ہم ان کی بات تسلیم کر لیتے ہیں کہ مولانا آزاد اور علامہ اجمیری کے تعلقات بڑے خوشگوار رہے اور ایسا ہونا باعث تعجب اس لیے نہیں کہ شرفاء تعلقات کے معاملہ میں بڑے وضع دار ہوتے ہیں۔

لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ مولانا اجمیری نے یہ جملہ نہیں کہا اور وہ اس کے معرضِ التوا میں ڈالنے کا سبب نہیں بنے —— یہ جملہ نہ سہی تو اس کے قریب قریب کوئی جملہ کہا ہوگا —— آخر اتنی اہم تجویز جس پر شیخ الہند جیسا انسان مصر ہے' اسے روکنے کی غرض سے کسی بھاری پتھر کی ضرورت تو رہتی ہی ہے اور وہ بھاری پتھر مولانا اجمیری کا یہ نہ سہی تو اس کے قریب قریب کوئی چبھتا ہوا جملہ ہوگا۔ اس لیے ڈاکٹر صاحب نے اپنے مضامین میں جو تفصیلات دی ہیں ان کی سچائی اپنی جگہ باقی رہتی ہے اور ان کا انکار ممکن نہیں۔

بہرطور تاریخ کے اس پیچیدہ موضوع کی اہمیت کے پیش نظر محترم برکاتی صاحب کا مضمون پیش خدمت ہے۔ شاید کوئی ''رجل رشید'' ان کڑیوں کے سلسلہ میں مزید خامہ فرسائی کر سکے۔

ہمارے لیے سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ ملت کی اصلاح و بقا کی غرض سے ایک اہم منصوبہ ایسے معرضِ التوا کا شکار ہوا کہ پھر اس کی صدائے بازگشت مدتوں نہ سنی گئی۔

''تنظیم اسلامی'' کے نام سے محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے حال ہی میں جس کوشش کا آغاز کیا ہے' وہ درحقیقت اسی منصوبہ کی صدائے بازگشت ہے —— انہوں نے انہی اصولوں اور مقاصد کو سامنے رکھ کر ایک قافلہ کی ترتیب کی کوشش کی ہے اور اللہ تعالیٰ کا

لاکھ لاکھ شکر ہے کہ لوگ اس طرف متوجہ ہو رہے ہیں' انہوں نے اس رخ پر سوچنا شروع کر دیا ہے' اور اس کی اہمیت کا احساس بڑھنا شروع ہو گیا ہے۔ ہماری دعا ہے کہ رب العزت ڈاکٹر صاحب اور ان کے رفقاء و شرکاء کو دولتِ خلوص و اخلاص سے نوازیں اور ان کی مساعی بارآور ہوں۔ یہ درخت ہرا بھرا ہو اور اس کے سایہ و ثمر سے اُمتِ مسلمہ بھرپور فائدہ اٹھائے ع ''ایں دعا از من واز جملہ جہاں آمین باد!!''

واضح رہے کہ حکیم محمود احمد برکاتی' مولانا سید برکات احمد رحمۃ اللہ علیہ کے پوتے ہیں جن کے شاگرد رشید تھے مولانا معین الدین اجمیریؒ اور جو خود شاگردِ رشید تھے مولانا عبدالحق خیرآبادی کے خلف الرشید مولانا فضل حق خیرآبادی رحمۃ اللہ علیہ کے۔ (ادارہ)

۱۹۲۰ء/۱۳۳۹ھ میں مولانا معین الدین نے جمعیت العلماء ہند کے سالانہ اجلاس میں شرکت کی اور اس اجلاس کی ایک نہایت اہم تجویز کے سلسلے میں نمایاں کردار ادا کیا۔

مولانا ابوالکلام آزاد' مولانا سید سلیمان ندوی اور مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد بہاری کئی سال سے برعظیم کے مسلمانوں کو ایک اہم دینی و ملی فریضے کی طرف اپنے خطبات و مقالات کے ذریعے دعوت دے رہے تھے۔ یہ حضرات مسلمانوں کو دعوت دے رہے تھے کہ نظم جماعت قائم کر کے نصب امامت کریں' مسلم حکومت کے زوال اور غیر مسلم حکومت کے استیلائی حالت میں مسلمانوں کے لیے شرعاً صرف دو ہی صورتیں جائز و باقی رہ جاتی ہیں یا وہ اس ملک سے ہجرت کر جائیں یا پھر نظم قائم کر کے اپنے لیے ایک امیر یا امام کا انتخاب اور نصب کر لیں' ورنہ ان کی زندگی غیر شرعی و جاہلی زندگی ہوگی۔

علماءِ ہند کی ایک تعداد مرتبہ اجمال میں اس تجویز پر تو متفق ہو گئی تھی مگر اس سوال پر گومگو اور کشمکش کا شکار تھی کہ منصبِ امامت کے لیے مختلف اعتبارات سے موزوں تر اور اہل تر فرد کون ہو سکتا ہے؟ ایک حلقہ مولانا عبدالباری فرنگی محلی (۱۹۲۶ء) اور ایک حلقہ شیخ الہند مولانا محمود حسن کی طرف رجحان رکھتا تھا اور ایک حلقہ مولانا ابوالکلام آزاد پر دل نہاد تھا۔ مولانا آزاد کے بعض رفقاء نے ان کے انتخاب کے لیے خطوط اور ملاقاتوں کے ذریعے راہ بھی ہموار کی تھی اور بالخصوص شیخ الہند کو اپنا پرجوش ہم نوا بنا لیا تھا اور وہ کسی امام الہند سے بیعت کے لیے اپنی بے تابی کا اظہار کر چکے تھے اور مولانا آزاد سے بیعت سے متفق بلکہ مؤید تھے۔ چنانچہ ۲۱/۲۰/۱۹ نومبر ۱۹۲۰ء کو جمعیت کے دوسرے سالانہ اجلاس میں شیخ الہند کے حلقے کے علماء نے مولانا آزاد کو

امام الہند منتخب کر لیے جانے کا منصوبہ بنا لیا تھا۔ اجلاس میں بقول بعض مفتی کفایت اللہ نے اور بقول بعض مولانا ابوالمحاسن نے تجویز پیش کی' شیخ الہند کی حمایت و تائید پہلے ہی معروف تھی آخر میں مولانا آزاد کھڑے ہوئے اور انہوں نے امارتِ شرعیہ کے قیام اور اس کے وجوب اور مصالح و منافع پر ایک نہایت مدلل و مفصل اور مرصع و مؤثر تقریر کی جس سے صرف شیخ الہند ہی کا حلقہ نہیں بلکہ حاضرین اجلاس کی اکثریت ایسی مسحور ہوئی کہ مولانا آزاد کے ہاتھ پر بیعت کے لیے آمادہ و مستعد ہو گئی' یہ لمحہ تھا جب مولانا معین الدین نے خطاب کی اجازت مانگی جو بمشکل ملی اور انہوں نے معشر علماء کو اپنے مختصر لیکن مؤثر خطاب میں اس طرف متوجہ کیا کہ:

> ''قیامِ جماعت اور نصب امارت و امامت کے وجوب سے کسی کو انکار نہیں مگر کیا یہ ضروری ہے کہ ہم امام الہند کا انتخاب آج ہی کر گزریں اور مولانا آزاد کے ہاتھ پر بیعت امامت کر لی جائے۔ یہ مسئلہ جتنا اہم ہے اتنے تدبر اور صبر و سکون سے فیصلے کا متقاضی ہے' عجلت اور جذباتی فضا میں فیصلہ کر ڈالنا مناسب نہیں ہے' ہم سب کو غور و فکر اور تبادلۂ خیال کا موقع ملنا چاہیے' تاکہ کوئی صحیح فیصلہ کیا جا سکے۔ اس لیے میری رائے یہ ہے کہ چند دن کے لیے یہ فیصلہ ملتوی کر دیا جائے۔'' (اوکما قال)

اس تقریر نے اجلاس کا رنگ بدل دیا' ایک طرف وہ جذباتی فضا چھٹ گئی جو متعدد علماء' خصوصاً مولانا ابوالمحاسن اور مولانا آزاد کی پرجوش خطابت سے طاری ہوئی تھی دوسری طرف مولانا معین الدین کے بے باکانہ انداز بیان نے دوسرے شرکاء کو جرأت عطا کی۔ چنانچہ ان کے بعد مولانا انور شاہ کاشمیری اور مولانا شبیر احمد عثمانی نے التوا کی حمایت میں تقاریر کیں اور اب اجتماع کا رنگ یہ تھا کہ گویا یہی بہت سوں کے دل کی آواز ہے اور التوا ضروری ہے۔

چنانچہ بیعت کا پروگرام ملتوی کر دیا گیا۔

۱۸/۱۷ ستمبر ۱۹۲۱ء جمعیت کی مجلس منتظمہ کا اجلاس دہلی میں منعقد ہوا اس اجلاس کے ایجنڈے میں ضبطی فتویٰ کے علاوہ مسئلہ انتخاب امام ہند تھا۔ ان علماء دہلی نے جو مولانا آزاد کو امام الہند ماننے کے لیے تیار نہیں تھے مولانا معین الدین کو اس اجلاس میں شرکت کا پابند کیا' یہ اجلاس ہوا لیکن اس میں بھی کچھ نہ ہو سکا۔ پھر نومبر ۱۹۲۱ء میں تیسرا سالانہ اجلاس ہوا' صدارت مولانا آزاد نے فرمائی' لیکن اس اجلاس میں بھی صرف یہ ہوا کہ امیر شریعت (امام ہند) کے اختیارات و فرائض کے تعین کے لیے پندرہ علماء پر مشتمل ایک کمیٹی بنا دی گئی تاکہ وہ بدایوں میں ہونے والے اجلاس میں ان اختیارات و فرائض امیر شریعت کا مسودہ پیش کرے۔

توضیحات

ہم نے غیر متعلق جزئیات کو نظر انداز کر کے اور مثبت انداز میں مولانا معین الدین کا کردار بیان کیا ہے۔ یہ معلومات بیش تر زبانی روایات پر مبنی ہیں رُواۃ ہیں مولانا کے برادر زادے مولانا حکیم نصیر الدین ندوی (نظامی دواخانہ کراچی)، مولانا حکیم پیر ہاشم جان سرہندی مرحوم، مولانا سید حاتم علی رام پوری، مولانا سید منتخب الحق، مولانا عبدالشاہد شیروانی مرحوم، مولانا سید نجم الحسن خیر آبادی، حکیم مولوی پیر سلیم جان سرہندی (ماتلی)۔ ان حضرات کے علاوہ مولانا معین الدین کا ایک مکتوب (بنام مولانا عبدالباری فرنگی محلی) بھی پیش نظر ہے، مگر ماہنامہ میثاق لاہور کا ایک شمارہ جنوری ۱۹۸۴ء کا پیش نظر ہے جس کے مطالعے کے بعد چند توضیحات کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ میثاق کے مقالے سے جو سوالات سامنے آئے ہیں ان کے جوابات عرض ہیں۔

پہلی بات یہ کہ مولانا کی یہ تقریر کس اجلاس میں ہوئی تھی؟ یوسف سلیم چشتی مرحوم کا یہ بیان تو بالکل ہی بے اصل ہے کہ ۱۹۲۲ء کے اجلاس میں ہوئی تھی، لیکن معلوم ہوتا ہے کہ مرورِ زمانہ اور بعض اوراسباب سے کئی حضرات کو اجلاس کا سال صحیح یاد نہیں رہا، مولانا غلام رسول مہر، ملک نصر اللہ خان عزیز کے بیانات میثاق میں نقل ہو چکے ہیں کہ وہ اجلاس جس میں بیعت ہونا تھی مگر مولانا معین الدین وغیرہ کی وجہ سے نہیں ہو سکی۔ ۱۹۲۱ء میں مولانا مودودی نے بھی میرے نام ایک مکتوب میں لکھا تھا:

> ''جہاں تک مجھے یاد ہے یہ اجتماع لاہور میں ہوا تھا نہ کہ دہلی میں...... جمعیت علماءِ ہند کے اس اجلاس میں، مَیں شریک تھا، مجھے صرف اتنا یاد ہے کہ امام الہند کے انتخاب میں بعض اکابر علماء مانع ہوئے تھے اور یہ انتخاب نہ ہو سکا تھا۔''

مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ واقعہ جمعیت کے دوسرے سالانہ اجلاس منعقدہ دہلی نومبر ۱۹۲۰ء میں ہوا تھا، ہمارے سامنے خود مولانا معین الدین کا ایک مکتوب (ملک مولانا حکیم نصیر الدین ندوی) ہے جو ۲ستمبر ۱۹۲۱ء کو لکھا گیا ہے۔ اور اس میں اس واقعہ کا ذکر ہے اور ظاہر ہے کہ جب یہ تقریر ۲ستمبر ۱۹۲۱ء سے پہلے ہو چکی تھی تو مجلس منتظمہ کا اجلاس اور سالانہ اجلاس لاہور کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا جو بالترتیب ۱۸/۱۷ستمبر ۱۹۲۱ء اور نومبر ۱۹۲۱ء کو ہوئے، مولانا لکھتے ہیں:

> ''خالی الذہن علماء ان (مولانا آزاد) کی تقریر سے متاثر ہوئے اور اگر من جانب فقیر

> اس (انتخاب امامت) کے التوا کے متعلق مختصر و جامع تقریر نہ ہوتی تو کچھ عجب نہ تھا کہ حاضرین علماء اسی وقت اس مسئلے کو طے کر دیتے۔''

قصہ یہ ہے کہ قیامِ نظم جماعت اور نصب امام کی دعوت تو کئی سال [(۱)] سے دی جا رہی تھی مگر شیخ الہند کی رہائی اور مراجعت ہند (جون ۱۹۲۰ء) کے بعد اس تحریک میں جان پڑ گئی تھی اور شیخ الہند، مولانا آزاد اور ان کے الہلال سے متاثر اور قدر شناس تھے اور اب ان کی نظر میں مولانا آزاد ہی اس منصب کے اہل تھے۔ شیخ الہند ہی کے اثر سے مفتی کفایت اور مولانا احمد سعید دہلوی نے تجویز و تائید میں حصہ لیا تھا مگر باقی تمام شرکاءِ اجلاس یا خالی الذہن اور لاعلم تھے یا جن کو اس کی سن گن لگ گئی تھی وہ مختلف جہات سے مولانا آزاد کی امامت سے خوش نہیں تھے بعض اختلاف مسلک فقہی کے زیر اثر، بعض مولانا آزاد کی بعض غیر ثقہ عادات (مثلاً تمباکو کشی) غیر عالمانہ سج دھج اور رئیسانہ طرزِ معاشرت، اور بعض مولانا کی کم عمری کے پیش نظر متذبذب اور متأمل تھے، لیکن ہمت و جرأت نہ ہونے کی بنا پر دم بخود تھے اور جب مولانا معین الدین نے ان کے جذبات کو زبان دی اور انتخاب ملتوی کروا دیا تو پھر علماء کے مختلف گروہ بیدار و فعال ہو گئے اور تحریک پس منظر میں چلی گئی۔ مولانا آزاد اور ان کے ہم نوا اور معتقدین کی کوششیں جاری رہیں اس لیے ستمبر ۱۹۲۱ء میں جمعیت کی مجلس منتظمہ کا اجلاس بلایا گیا مگر اب

(۱) عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ اس کے محرک اوّل مولانا آزاد تھے مگر ایک نقطۂ نظر یہ ہے کہ اس کے محرک اوّل مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد بہاری تھے۔ مولانا سید سلیمان ندوی لکھتے ہیں:

> ''مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد بہاری پہلے شخص تھے جنہوں نے اس بھولے ہوئے سبق کو یاد دلایا۔'' (ص ۹ ہندوستان اور مسئلہ امارت، از مولانا عبدالصمد رحمانی، ۱۹۶۹ء)

مولانا ابوالحسن علی لکھتے ہیں:

> ''اس سلسلے میں قیادت و رہنمائی اور سبقت و اوّلیت کی سعادت اللہ تعالیٰ نے مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد صاحب بہاری کی قسمت میں لکھی تھی...... امارت شرعیہ کے قیام کی تحریک اور اس کا علمی وفقہی دستوری خاکہ مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد صاحب ﷫ کے دل درد مند اور فکر ارجمند کا نتیجہ ہے''۔ (ص ۲۲، امارت شرعیہ از مولانا محمد ظفر الدین فتاحی ۱۹۷۴ء)

اسی طرح امارت شرعیہ بہار و اڑیسہ کے ادبیات میں مولانا آزاد کا نام داعیٔ اوّل کی حیثیت سے نہیں لیا گیا، لیکن خود مولانا آزاد کے ایک بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا ابوالمحاسن کو مولانا آزاد نے ہی متوجہ کیا تھا، جب کہ مولانا کے عہد اسارت میں رانچی (بہار) میں ان سے ملے تھے (خطبہ صدارت، اجلاس لاہور) نیز وہ ان کی طرف سے اس کام پر مامور بھی تھے۔ (ص ۶۴، تحریک نظم جماعت ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہانپوری)

نا موافق اور خاموش و مذبذب گروہ فعال ہو چکا تھا۔ اس لیے اس گروہ نے مولانا معین الدین کو تنظیم کے اجلاس میں شرکت کو مؤکد کرنا چاہا۔

''علماء دہلی کا خیال ہے کہ فقیر خصوصیت سے اس جلسے میں شریک ہو۔'' (مکتوب)

مسیح الملک اجمل خاں کے متعلق ان کے فرزند حکیم جمیل خان نے سیرت اجمل میں لکھا ہے کہ وہ:

''اس تجویز سے سخت مخالفت رکھتے تھے اور اسے خطرناک سمجھتے تھے۔''
(سیرت اجمل، ص ۱۶۵، ۱۹۴۶ء)

بہرحال مجلس منتظمہ نے اس مسئلے کے ساتھ کیا معاملہ کیا؟ اس کا اندازہ آپ کو مولانا آزاد کے ان الفاظ سے ہوسکتا ہے:

''گزشتہ موسم گرما میں اس طرف سے مایوسی ہوگئی کہ تمام ملک کے لیے کوئی متفقہ و متحدہ نظم قائم ہو۔'' (خطبہ صدارت)

اس کے فوراً بعد یہ طے کرلیا گیا کہ پہلے صوبوں میں امارتیں قائم کی جائیں۔ کل ہند امارت کی جلد کوئی توقع نہیں رہی۔ چنانچہ بہار و اڑیسہ میں تو امارتِ شرعیہ قائم بھی کردی گئی، جو پہلی بھی تھی اور افسوس کہ آخری بھی،

ضروری اور زیادہ اہم بات یہ کہی گئی ہے کہ مولانا معین الدین نے اپنی تقریر میں مولانا آزاد کو ناموزوں قرار دیتے ہوئے انہیں مخاطب کرکے فرمایا تھا:

''ایاز قدر خود بشناس! کہاں تم اور کہاں یہ رفیع و عالی منصب، تم ایسے نوعمر کو تو اکابر علماء کی موجودگی میں زبان کھولنا بھی مناسب نہیں ہے، رہا تمہارا علم وفضل تو اس کا بھانڈا ابھی پھوٹا جاتا ہے، ذرا منطق کی فلاں کتاب کی عبارت تو پڑھ کر سنادو۔'' (میثاق)

اور راوی ہیں پروفیسر یوسف سلیم چشتی، تو جس طرح چشتی صاحب کے کبرسن کے حافظے نے ۱۹۲۰ء کو ۱۹۲۲ء بنادیا تھا اسی طرح یہ تقریر بھی بے اصل و بے اساس ہے۔

اوّلاً، اس لیے کہ ہم مولانا معین الدین کے اہل حلقہ نے اس واقعے کے سلسلے میں یہی نہیں بلکہ اس سے ملتی جلتی بات بھی نہیں سنی، تا آنکہ مولانا کے متعدد اصحاب سے یہ واقعہ سنا ہے اور انہوں نے خود مولانا سے سنا تھا بلکہ شاید مولانا کے برادر خورد مولانا غازی محی الدین تو اس اجلاس میں شریک بھی تھے۔

ثانیاً، مولانا معین الدین کا یہ انداز گفتگو ہی نہیں تھا نہ ان جیسے عالی ظرف اور شائستہ

بزرگ کے شایانِ شان یہ زبان ہے۔

ثالثاً، مولانا معین الدین اور مولانا آزاد کے روابط ہمیشہ مخلصانہ رہے اور دونوں ایک دوسرے کے قدر شناس اور مدح سرا رہے، محترم حکیم نصیر الدین ندوی صاحب ان دونوں حضرات کی بہت سی ملاقاتوں، طویل طویل نشستوں، علمی مذاکرات اور محافل خورد و نوش کے شاہد ہیں۔

رابعاً، مولانا معین الدین خود اس وقت ۳۹ سال کے تھے اس لیے مولانا آزاد پر نوعمری کا طعن تو ان پر سجتا بھی نہیں، جو ۳۳ سال کے تھے۔

خامساً، منطق کی کسی کتاب کی عبارت تو عبارت خوانی کے امتحان کے لیے موزوں بھی نہیں ہوتی، منطق وحکمت کی کتابوں کی عبارات کا مفہوم تو بے شک عسیر الفہم اور عام علماء ہی نہیں خواص کی دسترس سے بھی بلند ہوتا ہے مگر عبارات میں ذخیرہ الفاظ محدود اور زیادہ تر اصطلاحات پر مشتمل ہوتی ہیں۔ ہاں ادب و تاریخ کی کتابوں میں بے شک ذخیرہ الفاظ وافر و لامحدود ہوتا ہے، عبارت آرائی ہوتی ہے، زورِ کلام ہوتا ہے، غرائب اللغات ہوتے ہیں، اس لیے عبارت خوانی کے امتحان میں وہ کارآمد اور صلاحیت آزما ہوتی ہیں۔

سادساً، خود مولانا آزاد نے اپنے لیے دعوت کب دی تھی، جو ان کی عمر اور ان کے علم کو معرض نقد و افکار میں لایا جاتا۔

سابعاً، التواءِ انتخاب و بیعت کے لیے یہ نکتہ کیا کم مؤثر تھا کہ اتنا اہم فیصلہ اس عجلت میں مناسب نہیں امتحان لینے کی کیا ضرورت ہے؟

واقعہ یہ ہے کہ غور وفکر کی مہلت طلبی کا کوئی جواب نہیں ہوسکتا تھا چنانچہ مولانا آزاد کے حامیوں کو بھی اس کی معقولیت تسلیم کرنی پڑی اور مذبذبین ومنکرین کو بھی حیلہ ہاتھ آگیا اور انتخاب معرض التوا میں جا پڑا۔

۞ ۞ ۞

باب سوم

'فرائض دینی کا جامع تصور'

کے موضوع پر

قرآن اکیڈمی' ماڈل ٹاؤن' میں

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

کے زیر اہتمام

چھ روزہ محاضرات

۲۳ تا ۲۸/ مارچ ۱۹۸۵ء

۞ محاضرات کے لیے شائع شدہ ہینڈ بل کا عکس

۞ عریضہ بنام علماء کرام

۞ میرے تصورِ فرائضِ دینی کا خلاصہ

شائع شدہ 'حکمتِ قرآن' مارچ' اپریل ۱۹۸۵ء

۞ رودادِ محاضرات

شائع شدہ 'حکمتِ قرآن' مئی ۱۹۸۵ء

۞ خطبۂ جمعہ' مسجد دارالسلام' باغِ جناح' لاہور

۲۹/ مارچ ۱۹۸۵ء

مشتمل بر

—— تذکرہ پروفیسر یوسف سلیم چشتی مرحوم

—— محاضرات کی شاندار کامیابی پر اظہارِ تشکر

—— مولانا سید مظفر حسین ندوی (مظفرآباد' آزاد کشمیر) کا تعارف

—— اور ان کی تقریر کے ایک اہم نکتے کی وضاحت

(شائع شدہ میثاق' مئی ۱۹۸۵ء)

ان شاء اللہ' اس سال قرآن اکیڈمی ماڈل ٹاؤن' لاہور میں

۲۳ تا ۲۸ مارچ ۱۹۸۵ء روزانہ بعد نماز مغرب

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

کے زیر اہتمام سالانہ

محاضراتِ قرآنی

کا موضوع:

''قرآن کا تصورِ فرائض دینی''

ہوگا' جس میں ان شاء اللہ العزیز جملہ مکاتب فکر کے جید علماء کرام حصہ لیں گے۔

ذیلی عنوانات: عبادتِ ربّ' شہادت علی الناس' اقامت دین
جہاد فی سبیل اللہ' التزامِ جماعت' بیعت سمع وطاعت

ع "صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کے لیے!"

''حکمت قرآن'' مارچ۔اپریل ۱۹۸۵ء

عریضہ بنام علماءِ کرام

محترم و مکرم جناب ______________________

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

مزاج گرامی!

جناب کے علم میں ہے کہ راقم الحروف اللہ کی کتابِ حکیم کا ایک ادنیٰ طالب علم اور اس کے دین متین کا ایک حقیر خادم ہے۔ اُس نے ایک انجمن ''مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور'' کے نام سے ۱۹۷۲ء میں قائم کی تھی جس کا وہ تاحیات صدر ہے۔ اور ایک دینی جماعت ''تنظیم اسلامی'' کے نام سے ۱۹۷۵ء میں قائم کی تھی جس کا وہ امیر ہے!

انجمن کے جملہ وابستگان اور تنظیم کے تمام شرکاء' ظاہر ہے کہ' راقم ہی کے دروسِ قرآن' اور تحریروں اور تقریروں سے متأثر ہو کر راقم کے معاون و مددگار بنے ہیں — لیکن 'الحمدللہ' کہ میرا مزاج ہمیشہ سے یہ رہا ہے کہ اپنے رفقاء و معاونین کو صرف اپنے ہی فہم و فکر کے حصار میں محصور نہ رکھوں' بلکہ وسیع تر حلقے سے ذہنی و فکری استفادے کی تلقین بھی کروں اور اس کے مواقع بھی پیدا کروں — چنانچہ انجمن کے زیر اہتمام جو سالانہ ''قرآن کانفرنسوں'' اور ''محاضراتِ قرآنی'' کے انعقاد کا سلسلہ جاری رہا ہے اور اُن میں جملہ مکاتب فکر کے علماء کرام اور اصحابِ علم و فضل حصہ لیتے رہے ہیں تو اس سے دوسرے مقاصد کے ساتھ ساتھ یہ مقصد بھی پیش نظر رہا ہے کہ وابستگانِ انجمن اور رفقاءِ تنظیم کا ذہنی افق وسیع ہو اور وہ جس راہ پر چلیں' علیٰ وجہ البصیرت' چلیں!

اس سال ''محاضراتِ قرآنی'' کے ضمن میں راقم نے طے کیا ہے کہ اصحاب علم و فضل کو اپنے دینی فکر' بالخصوص ''تصورِ فرائض دینی'' پر تنقید کی دعوت دے تاکہ اگر انہیں اس میں کوئی غلطی نظر آئے تو اُس کی نشاندہی فرمائیں' بصورت دیگر تائید و تصویب سے نوازیں' — اس مقصد کے لیے راقم نے اپنی دینی سوچ' خصوصاً اپنے تصور فرائض دینی کا ایک ''خلاصہ'' مرتب کیا ہے جو جناب کی خدمت میں اس عریضے کے ساتھ ارسال ہے!

جیسے کہ جناب منسلکہ اوراق میں ملاحظہ فرمالیں گے کہ راقم کا تصور فرائض دینی چھ عنوانات کے ذیل میں مندرج ہے۔ تین اساسی فرائض' اور تین ان کے لوازم' —— ادھر محاضرات بھی ان شاءاللہ چھ یوم جاری رہیں گے۔ بنابریں مناسب تقسیم یہ رہے گی کہ روزانہ ایک ایک عنوان زیر بحث آئے' چنانچہ اگر جناب ان میں سے کسی ایک عنوان پر اظہار خیال فرمانا چاہیں تو اگر دنوں کی ترتیب کے لحاظ سے پروگرام بنالیں تو انسب ہوگا' اگر بحیثیت مجموعی پورے تصور فرائض پر گفتگو کرنی مقصود ہو تو وہ کسی بھی دن کی جا سکے گی۔ بہر حال اس ضمن میں کوئی چیز بھی ''شرط'' کے درجے میں نہیں ہے!

اسی طرح ''ان شاءاللہ العزیز'' سوائے ایک وقت کی پابندی کے اور کوئی پابندی کسی مقرر پر نہیں ہوگی اور آزادانہ اظہارِ خیال کا پورا موقع ہوگا —— اس ضمن میں اس بات کی وضاحت بھی مناسب ہے کہ ان اجتماعات میں راقم خود بھی سراپا گوش رہے گا اور امکانی حد تک ''استفادے'' کی کوشش کرے گا اور بصورت ہرگز کسی بحث مباحثے کی نہیں بنے گی۔

آخر میں جناب سے مؤدبانہ گزارش ہے کہ اپنی گوناگوں مصروفیات اور تمام تر مشاغل کے باوجود اس کام کے لیے ضرور وقت نکالیں۔ اس لیے کہ کسی دینی خدمت وتحریک کی بروقت رہنمائی' خصوصاً جبکہ اُس کا محرک و داعی خود اس کے لیے متدعی ہو ایک اہم دینی فریضہ ہے! —— بصورت دیگر میں اپنے آپ کو یہ کہنے میں حق بجانب سمجھتا ہوں کہ میری جانب سے اللہ تعالیٰ کے حضور میں آپ پر ایک حجت قائم ہو جائے گی کہ میں نے تو رہنمائی چاہی تھی' جناب ہی نے توجہ نہ فرمائی۔ فقط والسلام مع الاکرام۔

رہنمائی کا طالب
خاکسار **اسرار احمد** عفی عنہ
لاہور۔ ۱۲؍فروری ۸۵ء

(نوٹ: یہ عریضہ کم وبیش یک صد علماء کرام کی خدمت میں ارسال کیا گیا)

میرے تصورِ فرائض دینی کا خلاصہ

۞ **تمہید:** انسانی شخصیت کے دو رخ ہیں: ایک علم دوسرے عمل۔ اسلام میں علم صحیح کا مظہر اتم ''ایمان'' ہے جبکہ عمل صحیح کی اساس ''تصورِ فرائض'' پر قائم ہے۔ ''ایمان'' انسان کو علم حقیقت ہی عطا نہیں فرماتا صحیح محرکِ عمل بھی دیتا ہے۔ اس اعتبار سے اوّلین اہمیت اسی کی ہے' چنانچہ ایمان کی ماہیت' اس کی تفاصیل' اس کے درجات' اس کے حصول کے ذرائع اور اس کے لوازم وثمرات اہم ترین موضوعات ہیں' لیکن موجودہ محاضرات میں اصل بحث ان پر نہیں بلکہ ''تصورِ فرائض دینی'' پر ہے!

۞ راقم کے نزدیک ایک مسلمان کے ''اساسی دینی فرائض'' تین ہیں:

(۱) ایک یہ کہ وہ خود صحیح معنی میں اللہ کا بندہ بنے!

☆ اس کے لیے چار اساسی اصطلاحات ہیں: اسلام' اطاعت خدا و رسولؐ' تقویٰ اور عبادت۔

☆ یہ کیفیات انسان میں ہمہ تن' ہمہ وقت اور ہمہ وجوہ مطلوب ہیں نہ کہ جزوی یا جز وقتی —— اِلاّ یہ کہ کبھی غفلت کے باعث یا جذبات کی رو میں بہہ کر یا ماحول کے اثرات سے مغلوب ہو کر کوئی غلط حرکت سرزد ہو جائے' تو اس پر فوری توبہ اللہ کے یہاں لازماً مقبول ہوگی (النساء:۱۷) —— اس کے برعکس اگر جان بوجھ کر کوئی ایک ''معصیت'' بھی مستقل طور پر اختیار کر لی گئی اور اس پر توبہ کی بروقت توفیق نہ ملی تو اس سے نہ صرف تمام نیکیوں کے ضائع چلے جانے بلکہ جہنم میں داخلے' حتیٰ کہ ''خلود فی النار'' تک کا اندیشہ ہے (البقرۃ:۸۱) اِلاّ یہ کہ حقیقی اور واقعی ''اضطرار'' ہو!!

(۲) دوسرے یہ کہ دوسروں کو حتی المقدور اسلام کی تبلیغ کرے اور دین کی دعوت دے!

☆ اس کے لیے یوں تو بے شمار اصطلاحات ہیں جیسے انذار' تبشیر' تذکیر' وعظ' نصیحت' وصیت' تعلیم' تبیین' تلقین۔

☆ لیکن اہم تر اصطلاحات چار ہی ہیں: تبلیغ، دعوت، امر بالمعروف و نہی عن المنکر اور شہادت علی الناس۔

☆ یہ خود انسان کی اپنی شرافت و مروت کا تقاضا بھی ہے اور ابنائے نوع کی ہمدردی و خیر خواہی کا تقاضا بھی، لیکن سب سے بڑھ کر یہ سید المرسلین محمد رسول اللہ ﷺ پر ختم نبوت کا منطقی نتیجہ ہے کہ اب تا قیامِ قیامت تمام انسانوں پر اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی جانب سے اتمامِ حجت یعنی ''شہادت علی الناس'' کی ذمہ داری بحیثیت مجموعی اُمت محمد علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے کندھوں پر ہے!

(۳) تیسرے یہ کہ وہ اللہ کے کلمے کی سربلندی اور اس کے دین حق کے بالفعل قیام اور غلبے کے لیے تن، من، دھن سے کوشاں ہو۔

☆ اس کے لیے قرآن حکیم کی چار اساسی اصطلاحات ہیں: تکبیر رب، اقامت دین، اظہار دین الحق علی الدین کلہٖ اور لیکون الدین کلہ للّٰہ

☆ حدیث نبویؐ میں ایک پانچویں اصطلاح وارد ہوئی ہے: لِتَكُوْنَ كَلِمَةُ اللّٰهِ هِيَ الْعُلْيَا —— اور

☆ تین عام فہم تعبیرات ہیں: قیامِ حکومت الٰہیہ، نفاذِ نظامِ اسلامی اور اسلامی انقلاب!

متذکرہ بالا تین فرائض کی باہمی نسبت اور ان کے ایمان اور ارکانِ اسلام کے ساتھ ربط وتعلق ایک ایسی سہ منزلہ عمارت کی مثال سے خوب واضح ہو جاتا ہے جس کی —— (i) ایک زیرزمین بنیاد ہے جو نظر نہیں آتی لیکن پوری عمارت کی مضبوطی اور پائیداری کا دارومدار اسی پر ہے۔ (ii) اسی بنیاد کا ایک حصہ زمین سے باہر ہے جو نظر آتا ہے جسے عرفِ عام میں ''کرسی'' اور انگریزی میں plinth کہتے ہیں۔ (iii) پہلی منزل پر صرف چار ستون ہیں، دیواریں تعمیر نہیں کی گئیں۔ ظاہر ہے کہ اُوپر کی پوری تعمیر کا وزن ان ہی کے ذریعے بنیاد تک پہنچتا ہے۔ (iv) ان ستونوں پر پہلی چھت قائم ہے (v) دوسری چھت بھی اگرچہ ان ستونوں ہی پر قائم ہے لیکن دیواروں کی تعمیر کے باعث ستون نظر نہیں آتے (vi) اس کے اوپر تیسری اور آخری چھت ہے اور اس کا بھی معاملہ یہی ہے ——!

اس مثال میں:

(ا) زیرزمین بنیاد — ایمان کا ''تصدیق بالقلب'' والا حصہ یعنی یقین قلبی ہے!

(ب) بنیاد کا نظر آنے والا حصہ —— ''اقرارٌ باللسان'' —— یعنی کلمہ شہادت ہے!

(ج) چار ستون چار عبادات کی نمائندگی کرتے ہیں یعنی نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج۔

(د) پہلی چھت اسلام، اطاعت، تقویٰ اور عبادت کی نمائندگی کرتی ہے۔

(ہ) دوسری چھت — تبلیغ، دعوت، امر بالمعروف و نہی عن المنکر اور شہادت علی الناس سے عبارت ہے —— اور

(و) تیسری اور آخری چھت تکبیر رب، اقامت دین، اظہارِ دین، اعلاءِ کلمۃ اللہ یا قیامِ حکومت الٰہیہ کی مظہر ہے! واللہ اعلم!

۞ ان تین اساسی فرائض سے عہدہ برآ ہونے کے لیے تین لوازم لابدمنہ ہیں:

(۱) دوام ''جہاد فی سبیل اللہ''، جس کا ظہور:

☆ فریضہ اوّل کے ضمن میں (i) نفس امارہ (ii) شیطانِ لعین اور اس کی ذریت صلبی و معنوی اور (iii) بگڑے ہوئے معاشرے کے غلط رجحانات اور دباؤ —— کے خلاف جدوجہد اور زور لگانے کی صورت میں ہوتا ہے اور حدیثِ نبویؐ کی رو سے یہی ''افضل الجہاد'' ہے۔

☆ فریضہ ثانی کے ضمن میں دعوت و تبلیغ کے لیے جان و مال کھپانے کی صورت میں ہوتا ہے، اور:

☆ فریضہ ثالث کے ضمن میں سر دھڑ کی بازی لگانے اور جان ہتھیلی پر رکھ کر باطل کی قوتوں سے ''بالفعل'' اور ''بِالْيَد'' پنجہ آزمائی کی صورت میں ہوتا ہے جس کے لیے تن، من، دھن لگا دینے کا عزم، حتیٰ کہ جان دے دینے کی ''آرزو'' کا ہونا لازمی ہے!

گویا جہاد کی پہلی منزل مجاہدہ مع النفس اور آخری منزل قتال فی سبیل اللہ ہے!

واضح رہے کہ اسی کا ''منفی پہلو'' ہجرت ہے،

چنانچہ اس کی بھی پہلی منزل ''اَنْ تَهْجُرَ مَا كَرِهَ رَبُّكَ'' ہے اور آخری یہ کہ اقامت دین کی جدوجہد میں وقت آنے پر گھر بار، مال و منال اور اہل وعیال کو چھوڑ کر نکل جایا جائے!

جہاد کی پہلی دو منزلوں کے لیے اصل آلہ و ہتھیار قرآن مجید ہے یعنی ''جہاد بالقرآن''، چنانچہ ''مجاہدہ مع النفس'' کا مؤثر ترین ذریعہ ہے قرآن کے ساتھ قیام اللیل یا تہجد! اور دعوت و تبلیغ کا پورا عمل بھی قرآن حکیم ہی کی اساس پر اور اسی کے

ذریعے ہونا چاہیے!!

تیسری اور آخری منزل پر عہد حاضر میں ''جہاد بالید'' کی موزوں ترین صورت فواحش ومنکرات کے خلاف پرامن مظاہرے ہیں' لیکن اس میں نوبت فقہاء کرام کی طے کردہ شرائط کے تحت' قتال یعنی ''جہاد بالسیف'' تک بھی آ سکتی ہے۔

(۲) لزومِ اجتماعیت' جس کا تقاضا:

☆ فریضہ اوّل کے ضمن میں صرف صحبت صالح (بجوائے: ''**كُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِیْنَ**'') سے بھی پورا ہوسکتا ہے!

☆ اسی طرح فریضہ ثانی کے ضمن میں درسگاہوں' اداروں' انجمنوں اور سوسائٹیوں سے پورا ہوسکتا ہے!

☆ لیکن فریضہ ثالث کے ضمن میں ''سمع وطاعت فی المعروف'' کے ٹھیٹھ اسلامی اور عسکری اصول پر مبنی جماعت کے بغیر پورا نہیں ہوسکتا (اور یہی مراد ہے آنحضور ﷺ کے ان الفاظ مبارکہ سے کہ: ''**آمُرُكُمْ بِخَمْسٍ : بِالْجَمَاعَةِ وَالسَّمْعِ وَالطَّاعَةِ وَالْهِجْرَةِ وَالْجِهَادِ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ**'' (احمد' والترمذی' عن الحارث الاشعریؓ)

(۳) بیعت —— جو: ——

☆ پہلے دو فرائض کے ضمن میں ''بیعت سلوک و ارشاد'' کی صورت میں کفایت کرتی ہے' لیکن

☆ فریضۂ ثالث کے ضمن میں ''بیعت سمع وطاعت فی المعروف'' کی صورت لازمی و لابدی ہے! چنانچہ اس کا لزوم ثابت ہوتا ہے مسلمؒ کی روایت (عن عبداللہ ابن عمرؓ) سے جس میں آنحضور ﷺ کے یہ الفاظِ مبارکہ وارد ہوئے ہیں کہ ''**مَنْ مَاتَ وَلَیْسَ فِیْ عُنُقِهٖ بَیْعَةٌ مَاتَ مِیْتَةً جَاهِلِیَّةً** —— !'' —— واضح رہے کہ دو ہی صورتیں ممکن ہیں:

(i) اگر کم سے کم شرائط ومعیارات پر اُترنے والا صحیح اسلامی نظامِ حکومت قائم ہے تو اُس کے سربراہ سے بیعت سمع وطاعت ہوگی —— اور (ii) اگر ایسا نہیں ہے تو صحیح اسلامی حکومت کے قیام کے لیے جدوجہد کرنے والی جماعت کے امیر کے ہاتھ پر بیعت سمع و طاعت ہوگی ——

۞ چنانچہ:

(۱) انجمن خدام القرآن کا مقصد ہے ''جہاد بالقرآن''۔ یہی وجہ ہے کہ ۱۹۷۲ء میں اس کے قیام کے وقت اس کے جو ''اغراض و مقاصد'' معین ہوئے وہ یہ تھے:

(۱) عربی زبان کی تعلیم وترویج (۲) قرآن مجید کے مطالعہ کی عام ترغیب وتشویق (۳) علوم قرآنی کی عمومی نشر واشاعت' (۴) ایسے نوجوانوں کی مناسب تعلیم وتربیت جو ''تعلیم وتعلّم قرآن'' کو مقصد زندگی بنا لیں —— اور (۵) ایک ایسی ''قرآن اکیڈمی'' کا قیام جو قرآن حکیم کے فلسفہ وحکمت کو وقت کی اعلیٰ ترین علمی سطح پر پیش کر سکے' اور

(۲) ''تنظیم اسلامی'' ہے ''جملہ دینی فرائض'' کی انجام دہی کے لیے ''بیعت ہجرت وجہاد فی سبیل اللہ وسمع وطاعت فی المعروف'' پر مبنی خالص دینی جماعت!!

میں نے اپنا مافی الضمیر کھول کر بیان کر دیا ہے اب علماء کرام اور اصحابِ دانش کا فرض ہے کہ رہنمائی فرمائی!

خاکسار **اسرار احمد**

سالانہ محاضراتِ قرآنی

کی رُوداد اور

شرکاء کے موقف کا جائزہ

از قلم: ڈاکٹر اسرار احمد

(شائع شدہ ''حکمت قرآن'' مئی ۱۹۸۵ء)

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کے زیر اہتمام جو سالانہ ''محاضراتِ قرآنی'' اس سال ۲۳ تا ۲۸ مارچ ۱۹۸۵ء، قرآن اکیڈمی، ماڈل ٹاؤن، لاہور میں منعقد ہوئے —— ان کے لیے جن علماء کرام کو بلاواسطہ یعنی انجمن کے دفتر سے 'براہِ راست' یا بالواسطہ یعنی بعض مقامات کے رفقاء و احباب کی معرفت دعوت نامے ارسال کیے گئے تھے ان کی کل تعداد لگ بھگ ایک صد تھی۔

ان میں سے جن حضرات نے بالفعل شرکت فرمائی ان کی تعداد ۲۱ ہے۔ جن میں ایک تقسیم تو اس اعتبار سے ہے کہ دس حضرات کا تعلق لاہور سے ہے، آٹھ کا بیرونِ لاہور لیکن اندرونِ پاکستان سے اور تین کا ہندوستان سے —— اور ایک دوسری تقسیم اس اعتبار سے ہے کہ ان میں سے دو تہائی یعنی پندرہ حضرات بلاشک و شبہ ملک گیر شہرت کے حامل اور مختلف مکاتب فکر کے علماء و زعماء کی صف اول سے متعلق ہیں اور ایک تہائی تعداد نسبتاً نوجوان علماء پر مشتمل ہے —— ان حضرات کے اسماءِ گرامی حسب ذیل ہیں:

—— لاہور سے ——

(۱) مولانا محمد مالک کاندھلوی — (۲) مفتی محمد حسین نعیمی
(۳) حافظ عبدالقادر روپڑی — (۴) سید محمد متین ہاشمی

(۵) پروفیسر حافظ احمد یار — (۶) ڈاکٹر بشیر احمد صدیقی
(۷) حافظ عبدالرحمٰن مدنی — (۸) قاری سعید الرحمٰن علوی
(۹) ڈاکٹر خالد علوی — (۱۰) حافظ نذر احمد

—— بیرون لاہور سے ——

(۱) مفتی سیاح الدین کاکاخیل (اسلام آباد) — (۲) سید مظفر حسین ندوی (مظفر آباد)
(۳) سید عنایت اللہ شاہ بخاری (گجرات) — (۴) مولانا عبدالغفار حسن (فیصل آباد)
(۵) مولانا عبدالوکیل خطیب (کراچی) — (۶) مولانا محمد اسحاق روپڑی (کراچی)
(۷) مولانا الطاف الرحمٰن (بنوں) — (۸) مولانا شبیر احمد نورانی (کراچی)

—— ہندوستان سے ——

(۱) مولانا وحید الدین خان (دہلی) — (۲) قاری محمد عبدالعلیم (حیدر آباد)
(۳) میر قطب الدین علی چشتی (حیدر آباد)

راقم الحروف کے پاس الفاظ نہیں ہیں جن کے ذریعے ان حضرات کا شکریہ ادا کیا جا سکے کہ انہوں نے اپنی شدید مصروفیات اور وقیع مشاغل میں سے وقت نکالا اور راقم کی درخواست کو قبول کرتے ہوئے شرکت فرمانے کی زحمت گوارا کی۔ بالخصوص وہ حضرات جنہوں نے سفر کی صعوبت برداشت کی، راقم اور اس کے جملہ رفقاء کے خصوصی شکریے کے مستحق ہیں۔ اللہ تعالیٰ انہیں جزائے خیر عطا فرمائے۔ (آمین)

اس فہرست میں تین نوجوان علماء کا اضافہ تو اس پہلو سے ہے کہ ان میں سے ایک صاحب یعنی مولانا عبدالرؤف (خطیب آسٹریلیا مسجد، لاہور) جو باضابطہ مدعو تھے، ایک دن تشریف لائے تو وقت کی کمی کے باعث راقم نے ان سے معذرت کر لی اور اگلے دن کا وعدہ لے لیا لیکن دوسرے روز وہ تشریف نہ لا سکے —— ایک صاحب یعنی کوٹ رادھا کشن کے مولانا عبدالحکیم سیف صاحب، جنہوں نے از خود حصہ لینے کی خواہش کی اور مقالہ پیش کیا۔ اور ایک صاحب، یعنی اکبر الدین قاسمی جو اپنے ذاتی جذبے اور شوق کے تحت حیدر آباد دکن سے تشریف لائے، لیکن چونکہ آخری وقت پہنچ پائے لہٰذا عملاً حصہ نہ لے سکے —— راقم ان تینوں حضرات کا بھی تہ دل سے ممنون ہے —— اور ایک بزرگ شخصیت یعنی مولانا سعید احمد اکبر

آبادی کا اس اعتبار سے کہ اگرچہ وہ شرکت کی شدید خواہش کے باوجود اپنی شدید علالت اور معالجین کی قطعی ممانعت کے باعث تشریف تو نہ لا سکے لیکن ان کا ایک پینتیس منٹ کا ٹیپ شدہ خصوصی پیغام اور انٹرویو پہلے اجلاس میں سنوایا گیا —— گویا سلسلۂ محاضرات کا ''افتتاح'' اسی سے ہوا —— اس طرح مولانا موصوف کی بھی ''بالفعل'' نہیں تو ''بالقوۃ'' شرکت ان محاضرات میں ہوگئی۔ اس حساب سے ان محاضرات کے ''شرکاء'' کی کل تعداد ۲۵ بنتی ہے۔

عجیب حسن اتفاق ہے کہ ٹھیک یہی تعداد ان حضرات کی ہے جنہوں نے مصروفیت یا کسی دوسرے عذر کی بنا پر شرکت سے معذرت کی' یا مزید برآں اجمالی تائید وتصویب سے بھی نوازا' یا بھرپور تائید وتحسین فرمائی یا اجمالی اختلافات کا اظہار فرمایا یا بعض نکات پر تفصیلی اختلافی تحریریں ارسال فرمائیں —— یا شدید اظہارِ بیزاری واعلانِ براءت فرمایا! عجیب تر اتفاق یہ ہے کہ ان میں سے بھی بائیس حضرات تو وہ ہیں جنہیں ہماری جانب سے دعوت نامہ ارسال ہوا تھا اور تین وہ ہیں جنہوں نے ازخود ''کرم'' فرمایا اور اپنے جذبۂ نصح واخلاص کے تحت ہماری ''رہنمائی'' کی خدمت سرانجام دی —— راقم الحروف ان تمام حضرات کا بھی بلا استثناء تہہ دل سے ممنون ہے اور اپنی اور اپنے جملہ رفقاء کی جانب سے ان کی خدمت میں ہدیۂ تشکر و امتنان پیش کرتا ہے —— عمومی دلچسپی کے لیے ان حضرات کے اسماء گرامی کی فہرست بھی ذیل میں درج کی جارہی ہے:

(۱) مولانا سید ابوالحسن علی ندوی (لکھنؤ)
(۲) مولانا محمد منظور نعمانی (لکھنؤ)
(۳) مولانا اخلاق حسین قاسمی (دہلی)
(۴) مولانا عبدالکریم پاریکھ (ناگپور)
(۵) مولانا سید شمس پیرزادہ (بمبئی)
(۶) مولانا نور الحق ندوی وازہری (پشاور)
(۷) حضرت مولانا خان محمد (کندیاں شریف)
(۸) مولانا گوہر رحمان صاحب (مردان)
(۹) مولانا محی الدین لکھوی (دیپالپور)
(۱۰) مولانا محمد اسحٰق صدیقی (کراچی)
(۱۱) مولانا سمیع الحق (اکوڑہ خٹک)
(۱۲) مولانا عبدالحق حقانی (اکوڑہ خٹک)
(۱۳) مولانا قاضی شمس الدین (گوجرانوالہ)
(۱۴) مولانا محمد طاسین (کراچی)
(۱۵) مولانا بدیع الدین شاہ (پیر جھنڈا' سندھ)
(۱۶) مولانا محمد یوسف لدھیانوی (کراچی)
(۱۷) مولانا محمد ازہر (ملتان)
(۱۸) مولانا محمد عبداللہ (اسلام آباد)
(۱۹) سید اسعد گیلانی (لاہور)
(۲۰) مولانا نعیم صدیقی (لاہور)
(۲۱) حافظ احسان الٰہی ظہیر (لاہور)
(۲۲) پروفیسر طاہر القادری (لاہور)

(۲۳) جناب جاوید احمد (لاہور) (اور ازخود ''کرم'' فرمانے والے)
(۲۴) جناب عبدالمجیب (کراچی) اور (۲۵) جناب محمد عبداللہ (لاہور)

راقم الحروف ایک بار پھر ان تمام حضرات کی خدمت میں ہدیۂ تشکر پیش کرتا ہے اور اُمید رکھتا ہے کہ آئندہ بھی یہ حضرات اسی طرح تعاون فرماتے رہیں گے' بقول غالبؔ ؎

ہاں بھلا کر ترا بھلا ہو گا اور درویش کی صدا کیا ہے!

اس سال کے ''محاضرات'' متعدد اعتبارات سے منفرد شان کے حامل تھے:

اوّلاً —— اس اعتبار سے کہ مسلسل چھ دن روزانہ ساڑھے تین چار گھنٹے ایک ہی موضوع پر اوسطاً روزانہ چار حضرات نے اظہارِ خیال فرمایا' لیکن آخر وقت تک نہ مقررین کے جوش و خروش میں کوئی کمی آئی نہ سامعین کے ذوق وشوق اور دلچسپی ہی میں کسی کمی کا احساس ہوا۔

ثانیاً —— حاضرین و سامعین کی تعداد بھی گزشتہ سالوں کے مقابلے میں بہت زیادہ رہی۔ حالانکہ قرآن اکیڈمی شہر سے بہت دور اور ٹریفک کے ذرائع کے اعتبار سے بہت الگ تھلگ جگہ پر واقع ہے اور رات کے نو دس بجے کے بعد وہاں سے واپسی کے لیے کسی چیز کا دستیاب ہونا بہت دشوار ہے۔ تاہم اس کا ایک ظاہری سبب یہ تھا کہ چونکہ اسی موقع پر اور اُسی جگہ ''تنظیم اسلامی پاکستان'' کا سالانہ اجتماع بھی ہو رہا تھا اور ساڑھے تین صد کے قریب لوگ تو وہاں مستقل مقیم ہی تھے' لہٰذا شہر سے روزانہ دو ڈھائی صد حضرات کی شرکت سے بھی بھرپور جلسے کا سماں بندھ جاتا تھا۔

ثالثاً —— اور اہم ترین یہ کہ ان محاضرات کے ''موضوعِ بحث'' کے طور پر قرآن حکیم کے ایک طالب علم اور اللہ کے دین متین کے ایک خادم نے' جو دینی وملی خدمات کے میدان میں ایسا نووارد بھی نہیں بلکہ لگ بھگ چالیس برس سے سرگرمِ عمل ہے اور تقریباً بیس سال سے تو اپنی انفرادی سوچ اور آزادانہ نقطۂ نظر کے ساتھ بحمد اللہ پوری تندہی کے ساتھ دینی خدمت میں مشغول ہے' اپنے دینی فکر کا ''لبّ لباب'' ' اپنے مطالعے کا نچوڑ اور بالخصوص اپنے ''تصورِ فرائض دینی کا خلاصہ'' متعین الفاظ میں مرتب کر کے پیش کیا تھا۔ اور اس پر ''موافقین'' اور ''مخالفین'' سب کو آزادانہ اظہار خیال کی کھلی دعوت دی تھی۔ راقم نے جب اس کا فیصلہ کیا تھا تو اس کے حاشیہ خیال میں بھی یہ بات نہ تھی کہ وہ کوئی بہت انوکھا اور نادر کام کرنے چلا ہے۔ لیکن جب محاضرات کے دوران بلا استثنائے واحد جملہ مقررین و مقالہ نگار حضرات' بالخصوص ''ناقدین'' و ''مخالفین'' نے برملا اعتراف کیا کہ ''ایسا کم از کم معلوم تاریخ میں پہلی بار ہوا ہے!'' اور ''اس

وسعت قلب کی کوئی دوسری مثال نظر نہیں آتی!'' اور ''عام طور پر تو لوگ اختلاف کرنے والوں کو اپنے پلیٹ فارم کے قریب تک بھی پھٹکنے نہیں دیتے!'' اور ''یہ ایک نہایت اعلیٰ مثال ہے!'' اور ''اُمید ہے کہ اس سے بہت اچھی اور مبارک و مستحسن روایت قائم ہوگی اور مفید نتائج برآمد ہوں گے''۔ وغیرہ وغیرہ —— تو راقم کے قلب کی گہرائیوں سے شکر خداوندی کا جذبہ بالکل (امام راغب کی بیان کردہ مثال کے مطابق) ''عینٌ شکوری'' کی سی کیفیت کے ساتھ ابھرا۔ اور راقم نے اپنے اس اقدام کی برکات کو جو خالصتاً اللہ تعالیٰ کی رہنمائی اور توفیق ہی کی بنا پر ممکن ہوا تھا چشم باطن ہی نہیں سر کی آنکھوں سے بھی دیکھا۔ فَلِلّٰہِ الحمد والمنۃ!!!

رابعاً —— یہ کہ محاضرات کے پورے سلسلے کے دوران نہایت خوشگوار فضا قائم رہی اور خالص افہام و تفہیم کا ماحول برقرار رہا۔ چھ دن میں کوئی ایک چھوٹی سے چھوٹی مثال بھی تلخی یا ناخوشگواری کی پیش نہیں آئی۔ حالانکہ سامعین کی غالب اکثریت ان لوگوں پر مشتمل تھی جو راقم کے دروس و خطابات اور تحریر و تقریر سے متأثر ہو کر اس کے رفیق و شریک کار اور اعوان و انصار بنے ہیں —— اور دُور ہی دُور سے کسی کا متفق یا مداح ہونا دوسری بات ہے' کسی دینی کام میں عملی شرکت اس کے بغیر نہیں ہوتی کہ اس کے داعی و قائد کے ساتھ صرف اتفاقِ رائے اور ہم خیالی ہی نہیں کسی نہ کسی درجہ میں محبت و عقیدت کا تعلق قائم نہ ہو جائے —— ادھر ان محاضرات کے دوران راقم کے دینی فکر پر شدید تنقیدیں ہی نہیں ہوئیں اس کے بارے میں استہزائیہ انداز بھی اختیار کیا گیا لیکن یہ اللہ تعالیٰ کا خصوصی فضل و احسان ہے کہ راقم اور اس کے ساتھیوں نے یہ سب کچھ نہایت خندہ پیشانی اور صبر و تحمل کے ساتھ سنا اور ایک لمحے کے لیے بھی تلخی و ناگواری تو دور کی بات ہے ماحول پر تکدر بھی طاری نہ ہونے دیا بلکہ اس کے برعکس بحمد اللہ و بفضلہٖ ایک شگفتگی کی سی کیفیت مسلسل طاری رہی! —— ذٰلِکَ فَضۡلُ اللّٰہِ یُؤۡتِیۡہِ مَنۡ یَّشَآءُ وَاللّٰہُ ذُو الۡفَضۡلِ الۡعَظِیۡمِ!

یہ ناقابل یقین کیفیت ایسے ہی پیدا نہیں ہوگئی بلکہ اس کے لیے اللہ تعالیٰ نے راقم الحروف کو بروقت کچھ فیصلے کرنے کی توفیق عطا فرمائی —— جو یہ ہیں:

ایک یہ کہ راقم نے محاضرات کے آغاز سے ہفتہ عشرہ قبل ہی ''بالکل'' اس طرح جیسے نماز یا روزہ سے قبل نیت ''باندھی'' جاتی ہے اپنی اس نیت کو شعوری طور پر پختہ کیا کہ میں ان محاضرات کے دوران علماءِ کرام کے ارشادات کو اپنے فکر کے جملہ صغریٰ کبریٰ اور تمام تانے بانے کو امکانی حد تک ذہن سے نکال کر مقدور بھر کھلے کانوں سے سنوں گا اور کھلے دل و دماغ

کے ساتھ ان پر غور کروں گا اور اگر مجھے کہیں کوئی ''روشنی'' ملی اور دل نے گواہی دی کہ میں نے کسی معاملے میں افراط و تفریط سے کام لیا ہے تو اس کا کھلا اعتراف کرتے ہوئے اپنی پوری سوچ کو از سرِ نو استوار کرنے سے دریغ نہ کروں گا۔ پھر میں نے یہ ''نیت'' صرف ''سرًّا'' ہی نہیں ''جھرًا'' اور ''علانیۃً'' علیٰ رؤس الاشہاد بھی کی چنانچہ اپنے خطابِ جمعہ میں مسجد دارالسلام' باغ جناح' لاہور کے بھرے مجمع میں اس کا اعلان کیا —— جدید سائیکالوجی کے ماہرین خواہ اسے ''خود تلقینی'' (auto suggestion) سے تعبیر کریں' لیکن میں نے اس طرزِ عمل کو بہت مفید پایا ہے اور میرے نزدیک یہی حکمت نماز کے لیے نیت ''باندھنے'' یا روزہ کے لیے نیت کے مسنون الفاظ زبان سے ادا کرنے کی ہے! —— بہرحال اپنے اسی شعوری فیصلے کے منطقی نتیجے کے طور پر راقم نے بعض ایسے تنظیمی امور سے متعلق فیصلوں کو بھی ملتوی کر دیا جن کا اعلان اسی سالانہ اجتماع کے موقع پر ہونے والا تھا۔ اور اپنے ساتھیوں سے صاف عرض کر دیا کہ ان معاملات پر اب ان محاضرات کے بعد از سرِ نو غور ہوگا! —— اپنے اسی فیصلے پر بأحسن وجوہ عمل کرنے کے لیے راقم نے اپنے لیے طے کر لیا تھا کہ اس کی حیثیت ان محاضرات میں محض ''سامع'' کی ہوگی۔ اگر کسی موقع پر ناگزیر ہی ہو گیا تو صرف خالص استفہامی انداز میں سوال کر لوں گا۔ اپنے اس فیصلے کی اہمیت کا احساس بھی راقم الحروف کو اس وقت ہوا جب مولانا وحید الدین خاں صاحب نے دہلی سے آمد کے فوراً بعد فرمایا کہ اس قسم کے موضوعات پر بحث کھلے مجمعوں میں ہونی درست نہیں ہے اور اس پر راقم نے عرض کیا کہ اس میں میری حیثیت صرف ''سامع'' کی ہوگی۔ اگر شدید ضرورت محسوس کی تو بھی میں صرف سوال کروں گا جوابی تقریر ہرگز نہیں کروں گا تو وہ فوراً مطمئن ہو گئے —— (عجیب حسن اتفاق یا سوءِ اتفاق ہے کہ پورے محاضرات کے دوران راقم نے صرف ایک سوال کیا اور وہ مولانا وحید الدین خاں صاحب ہی سے تھا' اور اس پر جب انہوں نے صاف اعتراف کر لیا کہ اس سوال کا میرے پاس کوئی جواب نہیں ہے!! اگرچہ اس سے ان کی تقریر کا تأثر مجروح ہو گیا لیکن میرے دل میں ان کی محبت و عظمت پہلے سے دوچند ہوگئی!!

دوسرے یہ کہ راقم نے محاضرات کے آغاز سے ایک دن قبل رفقائے تنظیم اسلامی کے اجتماع میں اسی کی تلقین اپنے رفقاء کو کی' بلکہ صحیح تر الفاظ میں اس کا حکم دیا کہ (i) جملہ علماء کرام —— خواہ وہ ہمارے موافق ہوں یا ناقد ہمارے محسن ہیں' ان کی تشریف آوری ایک عظیم تعاون ہے' لہٰذا ان کا ادب پورے طور پر ملحوظ رہے۔ (ii) ان کی تقاریر کو کھلے کانوں

—— اور کھلے دلوں کے ساتھ سنیں اور کھلے ذہن کے ساتھ ان پر غور کریں۔ اگرچہ جذباتی طور پر متأثر ہونا درست نہ ہوگا' بلکہ ہمیں ان کے دلائل کو اپنے دینی فکر کے صغریٰ کبریٰ کے ساتھ تقابل کر کے پورے شعور وادراک کے ساتھ رد یا قبول کرنا ہے ﴿لِيَهْلِكَ مَنْ هَلَكَ عَنْ بَيِّنَةٍ وَّيَحْيٰى مَنْ حَيَّ عَنْ بَيِّنَةٍ﴾ (iii) محاضرات کے دوران نظم پوری طرح برقرار رہے —— اور کسی ناگواری کیا بے چینی تک کا اظہار نہ ہوا' اختلافی باتیں پورے صبر وتحمل سے سنیں اور سوالات بھی صرف بغرض استفہام ہوں۔ ان میں نہ ''جارحیت'' ہو نہ ''جرح'' کا انداز!!

راقم اس پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتا ہے کہ اس نے اسے اور اس کے رفقاء کو ان فیصلوں پر الفاظِ ظاہری اور روح باطنی دونوں کے اعتبار سے بتمام وکمال عمل پیرا ہونے کی توفیق عطا فرمائی۔ ؎

''ایں سعادت بزورِ بازو نیست!
تا نہ بخشد خدائے بخشندہ!''

بدقسمتی سے اس تصور کا دوسرا رخ اتنا شاندار نہیں ہے۔ راقم الحروف ع ''خوگر حمد سے تھوڑا سا گلہ بھی سن لے!'' کے مصداق علماء کرام بالخصوص اکابر علماء سے معذرت کے ساتھ عرض کرنے کی اجازت چاہتا ہے کہ ان کا ادب واحترام اپنی جگہ' محاضرات میں شرکت کی صورت میں ان کے تعاون واحسان کا بارِگراں برحق' لیکن ان کی اکثریت نے موضوعِ بحث کا حق ادا نہیں کیا۔ اور اکثر وبیشتر نے صرف متفق علیہ امور پر وعظ ونصیحت پر اکتفا کی۔ اگرچہ یہ بات اپنی جگہ ان کے عظمت وکردار کی مظہر ہے کہ بعض حضرات نے بلا عذر اعتراف کیا اور بعض نے متعین عذرات کی بنا پر وضاحت فرمائی کہ وہ اصل موضوع پر بحث کی تیاری کا حق ادا نہ کر سکے اور ان شاء اللہ آئندہ کسی موقع پر مزید تفصیل اور وضاحت کے ساتھ بات کریں گے —— چنانچہ بعض حضرات نے اس قسم کے مباحث و مذاکرات کے لیے ایک مستقل فورم یا پلیٹ فارم کے قیام کی تجویز پیش فرمائی —— راقم کے لیے یہ بات نہایت خوش آئند ہے۔ اس لیے کہ اس کا ذہن اور مزاج ابتدا ہی سے یہی ہے' اور اگرچہ اپنے کام میں شدید مشغولیت وانہماک کے باعث وہ علماء کرام سے ذاتی سطح پر زیادہ ربط ضبط قائم نہ رکھ سکا لیکن اس نے ''قرآن کانفرنسوں'' اور ''محاضراتِ قرآنی'' کے ذریعے دراصل اسی نوع کے مشترک پلیٹ فارم کے قیام کی سعی کی ہے۔ پھر تنظیم اسلامی میں ''حلقۂ مستشارین'' کا قیام بھی اس کے اسی اندازِ فکر اور افتادِ طبع کی عکاسی کرتا ہے۔ اور جب اور جہاں ممکن ہوتا ہے وہ علماء

کرام کی خدمت میں طالب علمانہ حاضری کو اپنی سعادت سمجھتا ہے! وَاللّٰهُ عَلٰى مَا اَقُوْلُ وَكِيْلٌ!! —— بہرحال اس سال کے محاضراتِ قرآنی ان شاء اللہ العزیز اس سلسلے میں ایک اہم سنگِ میل ثابت ہوں گے اور خاص اس موضوع پر مزید مجالس مذاکرہ کا انعقاد انجمن خدام القرآن اور تنظیم اسلامی کے زیر اہتمام وقتاً فوقتاً کیا جاتا رہے گا۔ بید اللّٰہ التوفیق والتیسیر۔

آئندہ مزید غور وفکر کے دروازے کو کھلا رکھتے ہوئے' ان محاضرات کی حد تک راقم الحروف کو اپنے عجز بیان' بالخصوص اندازِ تحریر کی خامی سے پیدا شدہ چند غلط فہمیوں پر تنبہ کے سوا اپنے اساسی موقف کی کسی غلطی یا اپنے فکر کے صغریٰ کبریٰ کی کسی خامی یا اُن سے حاصل شدہ نتائج کے ضمن میں کسی افراط یا تفریط کا سراغ نہیں ملا —— بلکہ اس کے برعکس راقم کو ان امور کے ضمن میں متعدد علماء کرام کی جانب سے نہایت زوردار تصویب وتائید حاصل ہوئی ہے اور بحمد اللہ ان محاضرات کے نتیجے میں راقم اپنے موقف پر پہلے سے زیادہ جازم و عازم ہے! —— تاہم جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے۔ مزید گفت وشنید اور بحث وتمحیص کا سلسلہ پوری ذہنی وقلبی آمادگی کے ساتھ جاری رہے گا۔

راقم کو اپنے عجز بیان —— اور اظہار مافی الضمیر کی کوتاہی کا یوں تو مستقلاً ہی اقرار و اعتراف ہے' تاہم ان محاضرات کی موضوعِ بحث تحریر کا معاملہ یہ ہے کہ یہ بہت رواداری میں لکھی گئی تھی' لہٰذا اس میں بعض فاش غلطیاں ایسی ہوگئیں جنہوں نے شدید مغالطوں کو جنم دیا' چنانچہ ان میں سے بعض کا راقم نے جمعہ ۲۲ مارچ کو مسجد دارالسلام میں خطابِ جمعہ میں اعتراف و اعلان بھی کر دیا تھا۔ تاہم چونکہ مقررین حضرات تو وہاں موجود نہ تھے۔ لہٰذا مجھے ان سے کوئی گلہ نہیں کہ اکثر ناقدین نے ان ہی کو اپنے اظہارِ خیال کا موضوع بنایا —— بہرحال راقم ان کے شکریے کے ساتھ ان امور کے ضمن میں اپنے اصل موقف کو درج ذیل کر رہا ہے:

(۱) ان میں سب سے پہلی ''غلطی'' یہ ہوئی کہ راقم نے علماء کرام کے نام اپنے خط کے آخر میں یہ الفاظ استعمال کر دیے کہ:

> ''آخر میں جناب سے مؤدبانہ گزارش ہے کہ اپنی گوناگوں مصروفیات اور تمام تر مشاغل کے باوجود اس کام کے لیے ضرورت وقت نکالیں۔ اس لیے کہ کسی دینی خدمت وتحریک کی بروقت رہنمائی' خصوصاً جبکہ اُس کا محرک وداعی خود اس کے لیے

متعدی ہوا ایک اہم دینی فرض ہے!—— بصورت دیگر میں اپنے آپ کو یہ کہنے میں حق
بجانب سمجھتا ہوں کہ میری جانب سے اللہ تعالیٰ کے حضور میں آپ پر ایک حجت قائم
ہو جائے گی کہ میں نے تو رہنمائی چاہی تھی' جناب ہی نے توجہ نہ فرمائی۔''

اب اسے میں اپنی بدقسمتی کے سوا اور کسی چیز پر محمول نہیں کر سکتا کہ بعض علماء کرام نے اس کا مطلب یہ سمجھا کہ میں گویا اس کا مدعی ہوں کہ میں نے ان پر ''اتمامِ حجت'' کر دیا ہے کہ وہ میری تنظیم میں شامل اور میری بیعت میں داخل ہوں۔ ''معاذ اللہ'' ع ''یہ تاب' یہ مجال' یہ طاقت نہیں مجھے!'' اور حاشا وکلا میرے ذہن کے کسی دور دراز گوشے میں بھی ایسی کوئی بات موجود نہیں ہے!

(۲) دوسری اہم غلطی یہ ہوئی کہ راقم نے ایک مسلمان کے تین اساسی دینی فرائض میں سے اوّلین یعنی ''یہ کہ وہ خود صحیح معنی میں اللہ کا بندہ بنے!'' کی وضاحت کے ضمن میں سورۃ البقرۃ کی آیت ۸۱ کا جو حوالہ دیا اس سے بجا طور پر مغالطہ ہوا کہ شاید میں بھی معتزلہ کی طرح 'عصاۃِ اہل ایمان' کے لیے ''خلود فی النار'' کے امکان کا قائل ہوں۔ میں اس سے بھی اظہارِ براءت کرتا ہوں۔ میرے نزدیک صحیح بات وہی ہے جو احادیث صحیحہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام سے ثابت ہے' یعنی جس شخص کے دل میں رائی کے دانے کے برابر بھی ایمان ہوگا اگر اس کے گناہوں کا وزن نیکیوں سے بڑھ کر ہوا تو وہ اپنے گناہوں کے بقدر سزا بھگت کر بالآخر دوزخ سے نکال لیا جائے گا اور جنت میں داخل کر دیا جائے گا۔

میں تسلیم کرتا ہوں کہ اس مقام پر اس آیۂ مبارکہ کا حوالہ بے محل اور غلط ہے —— رہا یہ سوال کہ اس آیت کا صحیح مدلول میرے نزدیک کیا ہے تو میرے نزدیک یہ آیت اپنے نفس مضمون کے اعتبار سے ان احادیث نبویہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام سے مشابہت رکھتی ہے جن میں تنبیہہ اور ترہیب کی غرض سے بعض اعمال پر نفی ایمان کی وعید سنائی گئی ہے۔ ان آیاتِ مبارکہ اور احادیثِ شریفہ کے ضمن میں نہ یہ روش درست ہے کہ ان کے ظاہری الفاظ سے بالکل قانونی اور منطقی معانی نکالے جائیں جس سے شدید مایوسی پیدا ہو جائے' نہ یہ صحیح ہے کہ ان کی ایسی توجیہیں کی جائیں کہ ان کی تاثیر ہی ختم ہو کر رہ جائے اور بے خوفی اور لاپرواہی جنم لے لے! بلکہ دوسری آیات واحادیث کی روشنی میں ان کی ایسی تعبیر کی جانی چاہیے جس سے سامع او رقاری میں ''بین الخوفِ والرّجاء'' کی کیفیت قائم رہے۔ واللہ اعلم —— بہرحال اس مسئلے کا اصل تعلق ایمان اور عمل کے باہمی لزوم یا عدم لزوم اور ایمان میں کمی بیشی کے امکان یا عدم امکان کے ضمن میں اس اختلاف سے ہے جو ہمارے یہاں اسلاف سے چلا

آ رہا ہے اور جس کے ضمن میں تا حال راقم کی رائے یہ ہے کہ اس دنیا کی حد تک اور قانونی وفقہی سطح پر صحیح بات یہی ہے کہ ایمان جدا ہے اور عمل جدا' اور نفس ایمان میں کمی بیشی نہیں ہوتی لیکن حقیقت کے اعتبار سے صحیح بات یہ ہے کہ نہ صرف یہ کہ ایمانِ حقیقی یعنی یقین قلبی گھٹتا بھی ہے اور بڑھتا بھی بلکہ ایمان اور عمل صالح لازم وملزوم ہیں اور یہ لزوم دوطرفہ ہے' یعنی ایمان بڑھے گا تو عمل صالح میں بھی لازماً اضافہ ہوگا اور معاصی میں لامحالہ کمی آئے گی اور ایمان گھٹے گا تو عمل صالح میں کمی واقع ہوگی اور معاصی میں اضافہ ہوگا اور اسی طرح عمل صالح بڑھے گا تو اس سے ایمان میں بھی اضافہ ہوگا اور عمل صالح میں کمی آئے گی اور معاصی بڑھیں گے تو اس سے ایمان بھی متأثر ہوگا اور اس میں لازماً کمی آئے گی —— اور —— اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس سے اپنی پناہ میں رکھے —— بہرحال اس کا منطقی نتیجہ یہ ہے کہ امکان کے درجے میں یہ احتمال موجود ہے کہ اعمالِ صالحہ کے مسلسل فقدان اور معاصی پر دوام واصرار بالخصوص اکل حرام پر جان بوجھ کر استمرار ومداومت کے نتیجے میں ایمان کی پونجی بالکل ختم ہو جائے اور احادیثِ نبویہؐ میں وارد شدہ الفاظ: ((**لَیْسَ وَرَاءَ ذٰلِکَ مِنَ الْاِیْمَانِ حَبَّۃُ خَرْدَلٍ**))—— یا ((**آیَۃُ الْمُنَافِقِ ثَلَاثٌ...... وَاِنْ صَامَ وَصَلّٰی وَزَعَمَ اَنَّـہٗ مُسْلِمٌ .....**)) کا مصداق وجود میں آجائے!!—— اور ظاہر ہے کہ اگر اسی حالت میں موت واقع ہو جائے تو ایسے شخص کا معاملہ اس کا سا نہیں ہوگا جو ایمان کے ساتھ دنیا سے رخصت ہوا ہو خواہ گناہوں کا بہت سا انبار اپنے ساتھ لے گیا ہو۔ **هذا ما عندی حتی الوقت والعلم عند الله وارجو ان ینبهنی الله والذین اوتوا العلم ان کنت خاطیا**—— !!—— بہرحال جو شخص ایمان کے ساتھ دنیا سے رخصت ہوا ہو خواہ اس کی مقدار کتنی ہی قلیل کیوں نہ ہو اس کا معاملہ اس سے بالکل جدا ہے اور اس کے ضمن میں میرا موقف وہی ہے جو جملہ اہل سنت کا ہے اور مجھے اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے پوری اُمید ہے کہ اسی پر میری موت واقع ہوگی!

(۳) تیسرا سلسلۂ مغالطات پیدا ہوا راقم کی حسب ذیل عبارت سے:

''فریضۂ ثالث کے ضمن میں ''بیعت سمع وطاعت فی المعروف'' کی صورت لازمی و لابدی ہے۔ چنانچہ اس کا لزوم ثابت ہوتا ہے مسلم کی روایت (**عن عبد الله بن عمر رضی الله عنهما**) سے جس میں آنحضور ﷺ کے یہ الفاظ مبارکہ وارد ہوئے ہیں کہ ''**من مات ولیس فی عنقه بیعة مات میتةً جاهلیةً**——!'' —— واضح رہے کہ دو ہی صورتیں ممکن ہیں: (i) اگر کم سے کم شرائط ومعیارات پر اترنے والا صحیح اسلامی نظامِ

حکومت قائم ہے تو اس کے سربراہ سے بیعت سمع و طاعت ہوگی اور (ii) اگر ایسا نہیں
ہے تو صحیح اسلامی حکومت کے قیام کے لیے جدوجہد کرنے والی جماعت کے امیر کے
ہاتھ پر بیعت سمع و طاعت ہوگی —— اور تیسری کوئی صورت ممکن نہیں!''

(i) اس سے بعض حضرات نے تو یہ نتیجہ اخذ فرمالیا کہ راقم بزعم خویش اس مقام پر فائز ہوگیا ہے کہ سب مسلمانوں پر شخصاً اس کی بیعت لازم ہوگئی ہے۔ اس سے تو اسی نوع کا اظہارِ براءت کافی ہے جس نوع کا اظہارِ براءت میں ابتدا میں پہلی غلطی کے ضمن میں کر چکا ہوں —— راقم کے نزدیک حال تو کجا مستقبل میں بھی جتنی دور تک نگاہ فی الوقت جاسکتی ہے اس کا کوئی امکان نظر نہیں آتا کہ کسی ایک امام کی بیعت اس طرح لازم ہو جائے کہ اس کے دائرے سے باہر لازماً کفر ہو۔ اس کا نظری امکان اگر کوئی ہے تو صرف اس آخری زمانے میں جبکہ حضرت عیسیٰ علیٰ نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام کے نزول کے بعد کوئی صورت ایسی بن جائے کہ پورے کرۂ ارضی پر ایک ہی اسلامی ریاست بالفعل قائم ہو جائے —— اس سے پہلے اس کا کوئی نظری امکان بھی موجود نہیں ہے —— کجا راقم الحروف کی بیعت! ع ''زعشق تا بہ صبوری ہزار فرسنگ است''۔

(ii) ایک دوسرا مغالطہ جو میری تحریر سے پیدا ہوا وہ یہ ہے کہ میں صحیح مسلمؒ کی محولہ بالا حدیث مبارک کو بالکل ظاہری اور قانونی معنوں میں لے رہا ہوں اور میرے نزدیک بیعت سمع و طاعت فی المعروف کا لزوم ہر شخص کے لیے اور ہر حال میں ہے اور اس میں کوئی استثناء نہیں ہے۔ میں تسلیم کرتا ہوں کہ میں اس مغالطے میں فی الواقع مبتلا رہا ہوں، لیکن اللہ تعالیٰ جزائے خیر عطا فرمائے رفیق مکرم ڈاکٹر تقی الدین احمد صاحب کو کہ انہوں نے لگ بھگ چھ ماہ قبل صحیحین کی ایک حدیث کی جانب توجہ مبذول کرائی جس سے یہ ''تیسری'' امکانی صورت بھی سامنے آتی ہے کہ کم از کم معیار پر پوری اترنے والی اسلامی حکومت کے موجود نہ ہونے کی صورت میں: اگر انسان کو (ا) اقامت دین کی جدوجہد کے لیے کوئی ایسی جماعت بھی نظر نہ آئے جس پر اس کا دل مطمئن ہو سکے اور (ب) خود وہ دیانتاً محسوس کرے کہ اس میں وہ ہمت و صلاحیت موجود نہیں ہے کہ خود داعی کی حیثیت سے کھڑا ہو اور ایک قافلہ ترتیب دے تو اس کے لیے جائز ہوگا کہ وہ انفرادی مساعی پر ہی اکتفا کرے —— چنانچہ راقم نے اس معاملے میں اپنا موقف تبدیل کر لیا تھا لیکن کچھ اس بنا پر کہ جو خیال دل میں برسوں بیٹھا رہا ہو اسے خواہ شعوری طور پر دل سے نکال بھی دیا جائے اس کے کچھ نہ کچھ اثرات کچھ عرصے تک غیر شعوری طور پر برقرار رہتے ہیں —— اور کچھ اس بنا پر کہ، جیسے کہ ابتدا میں عرض کیا جا چکا ہے، یہ تحریر بہت

''رواداری'' میں سپردِ قلم ہوئی تھی —— یہ الفاظ قلم سے نکل گئے کہ ''اور تیسری کوئی صورت ممکن نہیں ہے!'' بہرحال راقم اس سے محاضرات سے قبل ہی رجوع کر چکا تھا۔ جس کا ثبوت یہ ہے کہ ''حکمت قرآن'' میں اشاعت کے وقت یہ الفاظ حذف کر دیے گئے تھے!!

اللہ تعالیٰ جزائے خیر عطا فرمائے ذاتی سطح پر میرے مشفق و مربی اور تنظیم اسلامی کی سطح پر حلقۂ مستشارین کے رکن رکین مولانا سید حامد میاں صاحب کو کہ اگرچہ وہ اپنی شدید مصروفیات کے باعث اس بار محاضرات کے لیے کوئی تحریر تو سپردِ قلم نہ کر سکے لیکن انہوں نے خاص اس غلطی پر تنبیہہ فرمانے کے لیے راقم کو طلب فرمایا اور قدرے برہمی کے انداز میں فرمایا کہ ''اس حدیث سے یہ مطلب تو کسی نے بھی نہیں لیا اور ہمارے تو اسلاف میں بے شمار لوگ ایسے گزرے ہیں جنہوں نے نہ کسی سے بیعت سمع و طاعت کی نہ لی!'' —— تو اگرچہ فوری طور پر میرے ذہن میں ایک خیال کلبلایا کہ ''کسی شے کا عدمِ ذکر یا عدمِ ثبوت اس کے وجود کی نفی کو مستلزم نہیں ہے!'' —— (اس لیے کہ میرے علم میں استاذی المکرّم مولانا منتخب الحق قادری کا بیان کردہ یہ واقعہ ہے کہ ایک بار اچانک علامۃ الہند مولانا معین الدین اجمیریؒ کے ذاتی کتب خانے کی ایک خاص الماری کی صفائی کرتے ہوئے جس کی چابی وہ کبھی کسی کو نہیں دیتے تھے اور اس موقع پر کسی خاص مجبوری سے مولانا کے حوالے کی تھی، اچانک ان کی نگاہ سے ایک رجسٹر گزرا جس میں ان لوگوں کے نام اور پتے درج تھے جنہوں نے حضرت مولاناؒ سے بیعت جہاد کی ہوئی تھی —— مولانا منتخب الحق صاحب کا فرمانا ہے کہ اس روز میری سمجھ میں یہ بات بھی آئی کہ کیوں مولانا نے اپنی رہائش قبرستان میں ایک بالکل ویران و سنسان جگہ پر رکھی ہوئی تھی!) لیکن میں نے اس معاملے میں بحث کی طوالت سے بچنے کے لیے عرض کیا کہ ''مولانا! اگر اس حدیثِ نبویؐ کو ظاہری اور قانونی معنوں میں نہ لیا جائے لیکن اس کا حوالہ بیعت جہاد اور بیعت سمع و طاعت فی المعروف کے لیے تشویق و ترغیب کے طور پر دیا جائے تو......؟'' اس پر مولانا نے فوراً بلاتوقف فرمایا: ''اس میں کوئی حرج نہیں ہے!'' —— گویا موضوع زیر بحث کی حد تک اس حدیث مبارکہ کا حاصل بھی وہی ہے جو سورۃ البقرۃ کی آیت ۸۱ کا!!

(iii) بعض حضرات کو یہ غلط فہمی بھی لاحق ہوئی کہ شاید میرے نزدیک اگر کوئی شخص ایک بار مجھ سے بیعت سمع و طاعت فی المعروف میں منسلک ہو جائے تو پھر اگر وہ کسی بھی صورت میں اس بیعت کا حلقہ اپنی گردن سے نکال دے گا تو ''مَنْ شَذَّ شُذَّ فِي النَّارِ'' کی وعید شدید کا مستحق

ہوگا۔ میں اس سے بھی علیٰ رؤس الاشہاد اعلانِ براءت کرتا ہوں۔ میرے نزدیک یہ معاملہ اس ''الجماعة'' کا ہے جو اصلاً تو دورِ نبویؐ میں نبی اکرم ﷺ کی زیر امارت قائم تھی اور تبعاً صرف خلافت راشدہ تک قائم رہی جبکہ اُمت میں دینی و مذہبی' سیاسی و ملی' ملکی و علاقائی اور حکومتی وانتظامی ہر اعتبار سے وحدت کلی برقرار رہی —— اس کے بعد سے آج تک' اور مستقبل میں دُور دُور تک اس ''الجماعة'' کا حقیقی اور واقعی اعتبار سے وجود خارج از بحث ہے۔ البتہ نظری طور پر کہا جا سکتا ہے کہ پوری اُمتِ مسلمہ بحیثیتِ مجموعی اسی ''الجماعة'' کے حکم میں ہے!

اقامتِ دین اور اعلائے کلمۃ الحق کے لیے قائم ہونے والی کسی بھی جماعت میں شمولیت اور اس کے امیر سے سمع وطاعت فی المعروف کی بیعت انسان پر اس وقت لازم ہوتی ہے جب دو شرطیں پوری ہو جائیں: ایک یہ کہ اس کے دینی فکر اور طریق کار سے مجموعی طور پر اتفاق ہو اور دوسرے یہ کہ اس کے خلوص و اخلاص پر دل گواہی دے دے۔ پھر اس بیعت پر قائم رہنا بھی اسی وقت تک لازم ہوگا جب تک یہ دونوں باتیں برقرار رہیں —— بصورت دیگر اگر (i) انسان کے علم میں ایسے شواہد آئیں جن کی بنا پر اس خلوص و اخلاص پر اعتماد متزلزل ہو جائے یا (ii) انسان دیانتاً یہ محسوس کرے کہ داعی نے جو راستہ ابتداءً اختیار کیا تھا اور جس کی اس نے دعوت دی تھی وہ اس سے منحرف ہو گیا ہے یا (iii) خود انسان کا ذہن بدل جائے اور وہ خود اس طریق کار پر مطمئن نہ رہے جس پر تحریک کا آغاز کیا گیا تھا یا (iv) اسے کوئی ایسی جماعت نظر آ جائے جو اس سے بہتر طریق پر' اور اس سے بہتر قائد کی قیادت میں اقامتِ دین کی جدوجہد کر رہی ہو —— تو اس کا بیعت کو فسخ کرنا جائز ہی نہیں واجب ہو جائے گا —— اِلّا یہ کہ باطن میں پیچھے ہٹنے کا اصل سبب تو کمزوری اور بزدلی یا کوئی ذاتی مصلحت و منفعت ہو لیکن ظاہری سہارا انسان متذکرہ بالا چار صورتوں میں سے کسی کا لے لے —— تو اس صورت میں چاہے دنیا میں اس پر کوئی حکم نہ لگایا جا سکے لیکن عنداللہ وہ ضرور قابل مؤاخذہ ہوگا! —— البتہ جب تک کسی شخص میں کسی قائد یا امیر سے بیعت سمع وطاعت کے ضمن میں وہ دونوں مثبت اساسات برقرار رہیں جن کا ذکر اوپر ہو چکا ہے اور ان چار منفی کیفیات میں سے کوئی کیفیت پیدا نہ ہو جو فسخ بیعت کے ضمن میں بیان ہو چکی ہیں اس وقت تک اس کا اس جماعت میں شامل رہنا اور بیعت کا وہ حق ادا کرنا لازم ہوگا جو صحیحین میں حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث میں بایں الفاظ بیان ہوا ہے:

بَایَعْنَا رَسُوْلَ اللّٰہِ ﷺ عَلَی السَّمْعِ وَالطَّاعَةِ فِی الْعُسْرِ وَالْیُسْرِ وَالْمَنْشَطِ وَالْمَکْرَہِ وَعَلٰی اَثَرَةٍ عَلَیْنَا وَعَلٰی اَنْ لاَ نُنَازِعَ الْاَمْرَ اَھْلَہٗ وَعَلٰی اَنْ نَقُوْلَ

بِالْحَقِّ حَیْثُمَا کُنَّا لَا نَخَافُ فِی اللّٰہِ لَوْمَةَ لَائِمٍ

صرف اس فرق کے ساتھ کہ نبی اکرم ﷺ کے بعد ہر بیعت سمع و طاعت میں ''فِی الْمَعْرُوْفِ'' کی قید بہتر تو یہ ہے کہ لفظاً ہو' ورنہ معناً لازماً مراد ہوگی!

الغرض ——

راقم ان محاضرات کے بعد بھی' ان تصریحات اور ان سے لازم آنے والی حدود و قیود کے ساتھ' فرائض دینی کے جامع تصور کے ضمن میں اپنے موقف پر جازم و عازم ہے۔ ان محاضرات کے نتیجے میں تو راقم کو اپنے موقف میں کسی اساسی اور بنیادی تبدیلی کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔ اب اللہ ہی سے دعا ہے کہ اگر میرے اس فکر میں کوئی کجی یا غلطی ہے تو اپنے خصوصی فضل و کرم اور کسی خاص ذریعے سے مجھے متنبہ فرما دے۔ اَللّٰھُمَّ اَرِنَا الْحَقَّ حَقًّا وَّارْزُقْنَا اتِّبَاعَهٗ وَاَرِنَا الْبَاطِلَ بَاطِلًا وَّارْزُقْنَا اجْتِنَابَهٗ آمِین یَا رَبَّ الْعَالَمِیْن!

راقم الحروف کو پورا احساس ہے کہ قارئین ''حکمت'' محاضرات کے جملہ بالفعل و بالقوہ اور حاضرانہ و غائبانہ شرکاء کے افکار و خیالات سے فرداً فرداً واقف ہونا چاہیں گے۔ اس ضمن میں یہ گزارش ہے کہ ہم تک تحریریں تو صرف معدودے چند حضرات کی پہنچی ہیں۔ اکثر و بیشتر حضرات نے تقاریر کی تھیں۔ مقدم الذکر حضرات سے ہم یہ درخواست کریں گے کہ وہ اپنی تحریروں پر ہماری مندرجہ بالا تصریحات کی روشنی میں نظر ثانی فرما لیں تو بہتر ہوگا' تا کہ وقت اور قلم و قرطاس کا ضیاع کم ہو اور فائدہ زیادہ! —— اور مؤخر الذکر حضرات سے مزید درخواست یہ ہوگی کہ ہماری ان تصریحات کو بھی مدّ نظر رکھ کر اپنی تقاریر کے خلاصے خود مرتب فرما دیں تا کہ انہیں سلسلہ وار شائع کر دیا جائے —— سر دست مؤیدین و موافقین اور مخلفین و ناقدین کا مختصر جائزہ پیش خدمت ہے:

راقم کو سب سے زیادہ کھلی اور بھرپور تائید و تصویب —— بلکہ حد درجہ حوصلہ افزائی تو ملی ہے مولانا سعید احمد اکبر آبادی مدظلہٗ سے' جو بلاشبہ برصغیر پاک و ہند کے چوٹی کے علماء میں سے ہیں اور اس اعتبار سے تو ''آپ اپنی مثال'' کے مصداقِ کامل ہیں کہ ایک طرف دار العلوم دیوبند کے فارغ التحصیل اور عرصۂ دراز سے اس کی مجلس شوریٰ کے رکن ہیں اور مختلف اوقات میں دار العلوم ڈابھیل اور مدرسہ عالیہ فتح پوری میں مدرس رہے ہیں تو دوسری جانب سینٹ سٹیفن کالج دہلی کے لیکچرار' مدرسہ عالیہ کلکتہ کے پرنسپل اور مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے ڈین آف

تھیالوجی رہے ہیں اور ایک طرف عربی زبان اور علومِ دینیہ پر عبور رکھتے ہیں تو دوسری طرف انگریزی زبان وفکر پر پوری قدرت رکھتے ہیں۔ اور ان سب پر مستزاد ہے ان کی ۱۹۳۸ء سے تا حال ''ندوۃ المصنفین'' دہلی کی رکنیت اور ماہنامہ ''برہان'' کی ادارت —— اور بیسیوں اعلیٰ پایہ کی علمی کتب کی تصنیف —— اور اب حضرت شیخ الہندؒ اکیڈمی، دیوبند کی سربراہی۔

ان کے ٹیپ شدہ خیالات تو لفظ بلفظ اور من وعن ماہنامہ ''میثاق'' کی اپریل ہی کی اشاعت میں شائع ہو رہے ہیں، وہاں ملاحظہ فرما لیے جائیں لیکن عندالملاقات جو ایک ''لطیفہ'' صادر ہوا وہ تفنن طبع کے لیے حاضر خدمت ہے —— ایک ملاقات میں (مذکورہ ٹیپ شدہ انٹرویو والی نہیں، اس لیے کہ اس موقع پر تو راقم موجود نہ تھا) راقم اور اس کے دو رفقاء کی موجودگی میں مولانا نے تائید وتحسین اور حوصلہ افزائی کے ضمن میں بہت کچھ فرما کر اور ڈھیر ساری دعائیں دینے کے بعد فرمایا کہ ''بس آپ کی ایک بات سے مجھے شدید اختلاف ہے اور اس سے مجھے بہت کوفت اور تکلیف ہوتی ہے!'' اس پر راقم سہم کر ہمہ تن گوش ہو گیا تو اس مطلع کا مقطع یہ ارشاد ہوا کہ ''وہ یہ کہ آپ یہ کیوں کہتے ہیں کہ میں عالمِ دین نہیں ہوں...... آپ عالم ہیں، آپ خطیب ہیں، آپ ادیب ہیں......'' راقم الحروف کو اس وقت ان کی شخصیت میں حضرت شیخ الہندؒ کے مزاج کی جھلک نظر آئی، جنہوں نے اپنے بیٹوں اور شاگردوں کی عمر کے ایک نوجوان کو جو مستند عالم دین بھی نہ تھا —— اور وضع قطع سے بھی کوئی مذہبی شخصیت نظر نہ آتا تھا، جس طرح اپنی آنکھوں پر بٹھایا تھا وہ ان کے معتقدین ومتوسلین کی ایک عظیم اکثریت کو آج بھی ناپسند ہے!
—— بہرحال اس ضمن میں کسی کو غلط فہمی نہ ہو۔ راقم مولانا اکبرآبادی کے ان الفاظ کو صرف دلجوئی اور حوصلہ افزائی پر محمول کرتا ہے —— اور اپنے بارے میں خود اس کا خیال اوّل و آخر یہی ہے کہ وہ قرآن حکیم کے علم وحکمت کا ایک ادنیٰ طالب علم اور اللہ کے دین متین کا ایک ادنیٰ خادم ہے —— اور بس!! —— اور اسے اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے پوری اُمید ہے کہ اس کے سوا کوئی اور ''دعویٰ'' یا ''ادّعا'' نہ اس کے دل میں آئے گا نہ زبان پر!!

محاضرات کے ''بالفعل'' اور ''حاضر'' شرکاء میں سے نو حضرات نے راقم کے دینی فکر اور تصورِ فرائض دینی کی واشگاف اور زوردار یا نسبتاً دبے اور دھیمے الفاظ میں تصویب وتائید فرمائی۔ پانچ حضرات نے بنیادی اور واضح طور پر اختلاف کیا اور سات حضرات کچھ بین بین رہے۔ یعنی انہوں نے بعض پہلوؤں کی تصویب وتحسین فرمائی اور بعض کے ضمن میں کچھ احتیاطوں کا مشورہ دیا۔ راقم کا ظن غالب ہے کہ راقم کی ان پہلی تصریحات کے بعد جو اوپر

وضاحت کے ساتھ درج ہو چکی ہیں، یہ حضرات بھی مؤیدین ہی کی فہرست میں شامل ہوں گے۔

قسم اوّل میں سرفہرست ہیں مولانا مفتی سیاح الدین کاکاخیل، جن کا تعلق اصلاً حلقۂ دیوبند سے ہے۔ ثانوی طور پر ان کا شمار جماعت اسلامی کے ہم خیالوں اور ہمدردوں بلکہ سرپرستوں میں ہوتا ہے، ایک طویل عرصہ تک ریاست پاکستان کی اسلامی نظریاتی کونسل کے رُکن رہے ہیں اور فی الوقت اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد کے انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اکنامکس میں کام کر رہے ہیں —— دوسرے نمبر پر ہیں مولانا سید عنایت اللہ شاہ صاحب بخاری جو مفتی صاحب ہی کی طرح اصلاً حلقۂ دیوبند ہی سے تعلق رکھتے ہیں، لیکن سماعِ موتی اور حیات النبی ﷺ کے مسئلے میں ایک جداگانہ رائے کے حامل ہونے کی بنا پر جداگانہ تشخص رکھتے ہیں اور ''جمعیت اشاعت التوحید والسنۃ'' کے امیر اور سربراہ ہیں۔ تیسری اہم شخصیت ہیں مولانا سید مظفر حسین ندوی جو ندوہ میں اپنے زمانۂ تعلیم کے دوران مولانا سید مسعود عالم ندوی مرحوم اور مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہ، دونوں کے یکساں منظورِ نظر شاگرد تھے۔ ۴۸-۱۹۴۷ء کے جہاد کشمیر میں عملاً حصہ لینے والوں بلکہ اس کا آغاز کرنے والوں میں سے تھے —— اور ایک طویل عرصہ تک حکومتِ آزاد کشمیر کے دینی تعلیم وتربیت کے شعبوں میں خدمات سرانجام دیتے رہے ہیں۔ چوتھی اہم شخصیت ہے ڈاکٹر بشیر احمد صدیقی صاحب کی جو اصلاً تو شرق پور کے نقشبندی خانوادے سے منسلک ہیں، تاہم عرفِ عام میں بریلوی حلقوں سے زیادہ ربط وضبط رکھتے ہیں اور فی الوقت پنجاب یونیورسٹی کے شعبہ معارف اسلامیہ میں تدریس کی خدمات سرانجام دے رہے ہیں۔ پانچویں واضح مؤید ہیں مولانا قاری سعید الرحمٰن علوی جو ایک عرصہ تک ہفت روزہ ''خدام الدین'' کی ادارت کے فرائض سرانجام دیتے رہے ہیں۔ اور آج کل جامع مسجد، شاہ جمال، لاہور میں خطیب کی ذمہ داری ادا کر رہے ہیں۔ بقیہ چار حضرات میں سے دو کراچی کے معروف اہل حدیث علماء وخطباء ہیں یعنی مولانا عبدالوکیل خطیب اور مولانا محمد اسحٰق روپڑی اور دو ہمارے حیدرآباد دکن سے آئے ہوئے مہمان تھے۔ یعنی مولانا قاری محمد عبدالعلیم اور میر قطب الدین علی چشتی ——!!

اقامتِ دین کی فرضیت، التزامِ جماعت اور بیعت ہجرت و جہاد فی سبیل اللہ، وسمع و طاعت فی المعروف کے لزوم کے تصورات سے مجموعی اور اساسی اختلاف کا اظہار کرنے والوں میں سرفہرست تھے مولانا عبدالغفار حسن مدظلہ، اور مولانا وحیدالدین خاں (از دہلی) —— ان

کے بارے میں یہ امر قابل ذکر ہے کہ ماضی میں ان دونوں حضرات کا طویل اور فعال تعلق رہا ہے جماعت اسلامی سے۔ چنانچہ مولانا عبدالغفار حسن کا شمار جماعت اسلامی پاکستان کی صف اوّل کے رہنماؤں میں ہوتا تھا اور مولانا وحید الدین خان جماعت اسلامی ہند کی مرکزی مجلس شوریٰ کے رکن تھے۔ عجیب بات ہے کہ تیسری حد درجہ تیز وتند اور اختلافی ہی نہیں ''مخالفانہ'' تقریر تھی ڈاکٹر خالد علوی صاحب کی جو پنجاب یونیورسٹی میں جمعیت طلبہ کے سرپرست شمار ہوتے ہیں۔ کچھ اسی انداز کی لیکن غیر واضح تقریر تھی حافظ نذر احمد صاحب کی۔ البتہ اسی فکر کی حامل لیکن حد درجہ دھیمی اور مؤثر تقریر تھی مولانا محمد مالک کاندھلوی مدظلہٗ کی۔ اگرچہ اس میں دلیل واستدلال سے زیادہ تلقین ونصیحت اور جذباتی اپیل کا رنگ تھا —— واللہ اعلم!!

تیسری فہرست میں نمایاں ترین نام ہیں مولانا مفتی محمد حسین نعیمی، مولانا حافظ عبدالقادر روپڑی اور مولانا سید محمد متین ہاشمی کے، پھر نمبر آتا ہے، پروفیسر احمد یار، مولانا الطاف الرحمٰن بنوی، حافظ عبدالرحمٰن مدنی، مولانا عبدالحکیم سیف اور مولانا شبیر احمد نورانی کا۔ ان حضرات کے بارے میں راقم پہلے ہی عرض کر چکا ہے کہ ان شاء اللہ راقم کی پیش نظر تحریر میں وارد تصریحات کے بعد ظن غالب یہی ہے کہ انہیں کوئی اختلاف نہیں رہے گا۔

جن پچیس حضرات نے ''محاضرات'' کے لیے تفصیلی تحریریں ارسال فرمائیں یا محض خطوط تحریر فرمائے ان کی تفصیل حسب ذیل ہے:

(۱) مولانا محی الدین لکھوی نے بھرپور تائید کی اور کلی اتفاق کا اظہار فرمایا۔ مولانا پنجاب کے ایک نہایت مشہور اہل حدیث خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کے دادا حافظ محمد لکھویؒ نے پنجاب میں ترویج توحید اور ردِّ بدعات کے ضمن میں نہایت مجاہدانہ کردار ادا فرمایا تھا اور پنجابی میں منظوم تفسیر قرآن لکھی تھی۔ ان کے والد مولانا محمد علی لکھوی سے راقم کی ملاقات مدینہ منورہ میں ۱۹۷۰ء میں مولانا عبدالغفار حسن مدظلہٗ کے مکان پر ہوئی تھی۔ ان کے چھوٹے بھائی مولانا معین الدین لکھوی اس وقت جمعیت اہل حدیث کے امیر اور پاکستان کی موجودہ نیشنل اسمبلی کے رکن ہیں —— مولانا خود کبھی جماعت اسلامی میں شامل ہوئے تھے لیکن جلد ہی بددل ہوکر علیحدہ ہو گئے تھے۔ ۱۹۵۱ء میں جو پہلا الیکشن پنجاب کی صوبائی اسمبلی کا ہوا تھا مولانا اس کے لیے اپنے ذاتی اثر ورسوخ کی بنیاد پر منتخب ہوئے تھے لیکن بعد میں جماعت اسلامی نے انہیں ''adopt'' کر لیا تھا۔ چنانچہ کئی سال تک وہ پنجاب کی صوبائی اسمبلی میں جماعت اسلامی کے ''اکلوتے'' نمائندے کی حیثیت سے کام کرتے رہے تھے۔ مولانا ان معدودے چند لوگوں

میں سے ہیں جن میں اہلحدیثیت کی سختی اور درشتی کے ساتھ ساتھ تصوف کی مٹھاس اور چاشنی بھی موجود ہوتی ہے —— (اس کی ایک نادرِ روزگار مثال امرتسر اور لاہور کا خانوادۂ غزنویہ ہے) مولانا اپنا بعض ''تفردات'' کے باعث کچھ عرصہ سے الگ تھلگ زندگی گزار رہے ہیں لیکن اب اُمید ہے کہ یہ کیفیت ختم ہو جائے گی۔ اللّٰھُمَّ آمِین!! —— مولانا موصوف کا خط اس شمارے میں شائع کیا جا رہا ہے۔

(۲) مولانا گوہر رحمٰن صاحب رکن جماعت اسلامی، شیخ الحدیث دارالعلوم تفہیم القرآن مردان اور رکن قومی اسمبلی نے بھی نہایت حوصلہ افزا اور تحسین آمیز خط تحریر فرمایا۔ ان کا خط بھی شامل اشاعت کیا جا رہا ہے۔

(۳) مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے بھی —— جو اس وقت بلاشبہ پورے عالم اسلام کی چوٹی کی دینی شخصیتوں میں سے ہیں —— اگرچہ محاضرات کے نفس موضوع پر تو نہ کچھ تائیداً فرمایا نہ تنقیداً۔ البتہ راقم الحروف کی دلجوئی اور حوصلہ افزائی کے لیے جو الفاظ تحریر فرمائے وہ خود ان کی عظمت کے تو شاہد عادل ہیں ہی راقم کے لیے تا زیست سرمایۂ افتخار رہیں گے۔ ان کا خط بھی شائع کیا جا رہا ہے۔

(۴) پانچ حضرات نے مصروفیت کی بنا پر شرکت سے معذرت کرتے ہوئے راقم اور اس کی مساعی کے لیے نیک خیالات وجذبات کا اظہار فرمایا اور دعائے خیر سے نوازا۔ راقم کو ایک گونہ فخر ہے اس پر کہ اس فہرست میں حضرت مولانا خان محمد صاحب، سجادہ نشین، خانقاہ سراجیہ، کندیاں شریف، مولانا نور الحق صاحب ندوی وازہری (پشاور)، مولانا اخلاق حسین قاسمی (دہلی)، مولانا محمد اسحاق صدیقی (کراچی) اور مولانا سمیع الحق (اکوڑہ خٹک) ایسے حضرات کے اسمائے گرامی شامل ہیں۔

(۵) تین حضرات نے شرکت کا ارادہ ظاہر فرمایا تھا۔ لیکن بعد میں کسی سبب سے تشریف نہ لا سکے، یہ ہیں مولانا عبدالقیوم حقانی (اکوڑہ خٹک)، مولانا عبدالکریم پاریکھ (ناگپور، انڈیا) اور قاضی شمس الدین صاحب گوجرانوالہ۔

(۶) تین حضرات کی جانب سے محض معذرت موصول ہوئی بلاکسی تائید یا تنقید کے یعنی شاہ بدیع الدین صاحب پیر آف جھنڈا (سندھ)، جناب شمس پیرزادہ (بمبئی) اور حافظ احسان الٰہی ظہیر (لاہور)

(۷) دو حضرات نے مختصر معذرت اور اجمالی اظہارِ اختلاف پر مشتمل خطوط تحریر فرمائے۔ ایک مولانا محمد منظور نعمانی مدظلہ مدیر ''الفرقان'' (لکھنؤ) اور دوسرے سید اسعد گیلانی یکے از مرکزی

قائدین جماعت اسلامی۔

(۸) پانچ حضرات نے تفصیلی اختلافی نوٹ ارسال فرمائے۔ یہ ہیں (i) مولانا محمد طاسین صاحب، مدیر مجلس علمی، کراچی (ii) مولانا محمد ازہر، مدیر ماہنامہ ''الخیر'' ملتان (iii) پروفیسر طاہر القادری، لاہور (vi) جناب جاوید احمد، لاہور ——اور (v) جناب عبدالمجیب، کراچی —— ان میں سے مؤخر الذکر دو حضرات میں متعدد امور مشترک ہیں: ایک یہ کہ دونوں نے ازخود ''کرم فرمائی'' کی ہے۔ وہ ہمارے مدعوئین میں شامل نہ تھے۔ دوسرے یہ کہ دونوں جماعت اسلامی کے ''سابقین'' کے زمرہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ اور تیسرے یہ کہ دونوں کا موقف وہی ہے جو مولانا عبدالغفار حسن اور مولانا وحیدالدین خان کا ہے!

(۹) تین حضرات نے راقم اور اس کی مساعی سے شدید اظہارِ بیزاری اور اعلانِ براءت فرماتے ہوئے شرکت سے ''انکار'' فرمایا۔ یہ ہیں (i) جماعت اسلامی کے حلقے کے مشہور ادیب اور دانشور جناب نعیم صدیقی (ii) ماہنامہ ''بینات'' کراچی کے مدیر مولانا محمد یوسف لدھیانوی اور (iii) مرکزی جامع مسجد اسلام آباد کے خطیب مولانا محمد عبداللہ صاحب۔

(۱۰) ازخود ''کرم'' فرمانے والوں میں ایک اور صاحب محمد عبداللہ، لاہور ہیں جنہوں نے ایک تحریر عنایت فرمائی جو نصف تائید و تحسین اور نصف تنقید و اختلاف پر مشتمل ہے۔

راقم ان تمام حضرات کا تہہ دل سے شکریہ پہلے بھی ادا کر چکا ہے۔ آخر میں دوبارہ ان کی خدمت میں ہدیۂ تشکر پیش کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہے کہ انہیں اس تعاون کا بھرپور صلہ عطا فرمائے۔

یہ فہرست نامکمل رہ جائے گی اور حق تلفی بھی ہوگی اگر راقم ڈاکٹر غلام محمد مدظلہ، خلیفۂ مجاز مولانا سید سلیمان ندویؒ کا شکریہ ادا نہ کرے کہ وہ اپنی شدید مجبوری کے باعث محاضرات میں شرکت سے معذرت پیش فرمانے کے لیے خود چل کر قرآن اکیڈمی تشریف لائے (اس لیے کہ چند روز قبل پنجاب یونیورسٹی کے کسی امتحان کے ضمن میں ان کی لاہور تشریف آوری ہوئی تھی لیکن بعض اسباب سے فوری واپسی لازمی تھی!) دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کے اخلاقِ عالیہ و کریمانہ کا کوئی ادنیٰ عکس راقم کو بھی عطا فرما دے۔

''محاضرات'' کی بات لمبی ہوگئی۔ معذرت خواہ ہوں ——ع

لذیذ بود حکایت دراز تر گفتم!!

۞۞۞

ضمیمہ

(۱) مکتوب گرامی مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، لکھنؤ

محبِّ گرامی منزلت ڈاکٹر صاحب زید توفیقہ و مکارمہ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

عنایت نامہ ۱۴/مارچ جلد پہنچ گیا۔ آپ کی کریم النفسی اور وسیع القلبی پر مسرت ہوئی۔ یہاں کی بعض اہم مصروفیتوں اور ذمہ داریوں کی بنا پر ریاض کی کانفرنس میں شرکت سے جو ۲۷/مارچ کو ہونے والی تھی، میں نے معذرت کا تار دے دیا، اس سے زیادہ اہم کام حیدرآباد اور کلکتے میں پیش آ گئے۔ اب واپسی پر بھی پاکستان آنے کا مسئلہ نہیں رہا۔ اس کے لیے کسی دوسرے موزوں وقت اور مناسب سفر کا انتظار کرنا پڑے گا۔

سفر پاکستان کے سلسلے میں دو باتیں بے تکلف عرض کر دینا چاہتا ہوں کہ اُمید ہے کہ آپ ان کو ان کی صحیح اسپرٹ پر لیں گے کہ ایک یہ کہ........................

دوسری بات یہ کہ (آپ سے بے تکلف کہتا ہوں کہ) میں وہاں کسی تنظیم و تحریک کی دعوت پر آنے کے بجائے آزادانہ طریقے پر حاضری کو ترجیح دیتا ہوں تاکہ بے ہمہ و باہمہ رہوں۔ یہ طویل تجربوں اور دعوتی مصلحتوں پر مبنی ہے، جب ان شاء اللہ آؤں گا اور آپ مناسب سمجھیں گے اور وقت مناسب ہوگا تو آپ مجھے اپنے یہاں دعوت دے سکتے ہیں اور میرے کسی خطبے یا خطبات کا انتظام کر سکتے ہیں۔ مولانا عبدالمالک کو میں نے ایسا ہی اشارہ دیا ہے جنہوں نے مجھے حجاز میں دعوت پیش کی تھی اور یاد دہانی کا خط بھی آیا۔ اس کا تعلق کسی ناگواری یا بدگمانی سے نہیں۔ آپ کی صلاحیتوں، قوتِ عمل اور جدوجہد کی قدر کرتا ہوں اور اپنے جیسے قاصر الہمت اور ضعیف انسان پر ترجیح دیتا ہوں۔ اُمید ہے کہ آپ میری اس معذوری یا نزاکت کو اس کی صحیح جگہ دیں گے۔

جب بھی پاکستان آیا (تو ان شاء اللہ اگر کوئی شدید مانع پیش نہ آیا تو) لاہور آؤں گا اور آپ کو بھی وقت دوں گا اور اپنے مطالعے و تجربے کے مطابق اخلاص کے ساتھ آپ کے رفقاء و طالبین علوم قرآن کو مشورہ بھی دوں گا۔ خدا کرے یہ خط کسی گرانی و بدگمانی کا باعث نہ ہو۔

والسلام

مخلص ابوالحسن علی

(۲) مکتوب گرامی مولانا گوہر رحمٰن' مردان

محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب
صدر مرکزی انجمن خدام القرآن' لاہور
السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آپ کا گرامی نامہ تو مل چکا ہے' لیکن انہی ایام میں قومی اسمبلی کے اجلاس ہو رہے ہیں۔ اس لیے شرکت سے معذور ہوں۔

آپ اور آپ کی انجمن نے اصلاح معاشرہ کے لیے ''جہاد بالقرآن'' کا جو طریقۂ کار اختیار کیا ہے میں اس کی تحسین کرتا ہوں اور دعا گو ہوں کہ اللہ رب العالمین اس جدوجہد میں برکت ڈالے اور کامیابی عطا فرمائے۔

خاتم النبیین محمد رسول اللہ ﷺ کے اصلاحی اور انقلابی کام کا آغاز قرآن پڑھنے اور پڑھانے سے ہوا تھا اور آخر دم تک یہی قرآن آپ کا حقیقی اسلحہ رہا ہے۔ ہر قسم کی اعتقادی اور عملی واخلاقی برائیوں اور بیماریوں کا علاج صرف قرآن کریم اور سنت رسولؐ ہے: ﴿وَنُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْاٰنِ مَا هُوَ شِفَآءٌ وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ۙ وَلَا يَزِيْدُ الظّٰلِمِيْنَ اِلَّا خَسَارًا﴾ قرآن پر ظلم کی کئی قسمیں ہیں۔ قرآن کی تلاوت اور اس کے علوم سے غفلت اختیار کرنا بھی ظلم ہے' اس پر عمل نہ کرنا بھی ظلم ہے اور قرآن وسنت کے خلاف دوسرے قوانین پر فیصلے کرنا بھی ظلم ہے۔ جو لوگ قرآن کریم کی تعلیمات سے غافل ہو جاتے ہیں ان پر شیطان کو مسلط کر دیا جاتا ہے: ﴿وَمَنْ يَّعْشُ عَنْ ذِكْرِ الرَّحْمٰنِ نُقَيِّضْ لَهٗ شَيْطٰنًا فَهُوَ لَهٗ قَرِيْنٌ﴾ ہر دور کے مجددین و مصلحین نے اپنے تجدیدی اور اصلاحی جدوجہد کا آغاز قرآن کی تعلیمات کی اشاعت سے کیا ہے۔ برصغیر میں شاہ ولی اللہ کی تجدیدی واصلاحی تحریک کا آغاز بھی قرآن کریم کے فارسی ترجمے سے ہوا تھا۔ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کی تحریک اقامت دین کا آغاز بھی ترجمان القرآن میں قرآنی تعلیمات کی اشاعت سے ہوا تھا۔ شیخ حسن البناء شہید کی تحریک کا آغاز بھی قرآن کریم کے درسوں ہی سے ہوا تھا۔ میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کی کوششوں کو بھی مفید تر بنائے۔ والسلام

گوہر رحمان
شیخ الحدیث دارالعلوم تفہیم القرآن' مردان (رکن قومی اسمبلی)

(۳) مکتوب گرامی مولانا محی الدین لکھوی

من محی الدین اللکھوی' الی الاخ المحترم دکتور اسرار احمد' لاھور
السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ' امابعد: فرمانِ نبویؐ ہے:

((تَرَكْتُ فِيْكُمْ اَمْرَيْنِ' لَنْ تَضِلُّوْا مَا تَمَسَّكْتُمْ بِهِمَا' كِتَابَ اللّٰهِ وَسُنَّتِيْ))

معلوم ہوتا ہے کہ کتاب اللہ کے بارے میں آپ نے حق تلاوت ادا کیا ہے' لیکن سنت رسول ﷺ سے آپ نے استغنا رکھا ہے اور بزرگانِ دین سے زیادہ متأثر رہے ہیں۔ ورنہ اکمالِ دین اور اتمامِ نعمت ہو جانے کے بعد آپ کو اس قدر تکلف کی ضرورت نہ تھی۔ اگرچہ آپ کی کاوش قابل داد ہے اور آپ کا ''تصور فرائض دینی'' مستحسن ہے۔ بات صرف یہ ہے کہ اہل ایمان کے لیے یہ بھی ایک فریضہ ہے کہ ﴿وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا﴾ اور اس آیۂ مبارکہ پر عمل کی صرف ایک صورت ہے۔ وہ یہ کہ

((اِنِّیْ آمُرُكُمْ بِخَمْسٍ' بِالْجَمَاعَةِ وَالسَّمْعِ وَالطَّاعَةِ وَالْهِجْرَةِ وَالْجِهَادِ))

اس وقت جو انارکی اور انتشار پھیل چکا ہے اس کی وجہ سے ہم موجودہ دور کو شر القرون کہیں تو غلط نہیں اور میرا اس حدیث شریف پر پورا یقین ہے کہ:

((مَنْ مَاتَ وَلَيْسَ فِيْ عُنُقِهٖ بَيْعَةٌ مَاتَ مِيْتَةً جَاهِلِيَّةً))

آپ ''تنظیم اسلامی'' کے نام پر بیعت لیتے رہیں۔ ﴿فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ﴾ کی رو سے یہ صحیح ہے۔ لیکن میرا مشورہ یہ ہے کہ آپ عالمی سطح پر یہ تحریک چلائیں اور عوام وخواص کو دعوت دیں' تاکہ دینی جماعتیں مل کر عالمی سطح پر یا ایک امیر کا انتخاب کریں اور پورے عالم اسلام میں اتحاد پیدا ہو جائے' یا کم از کم عالمی سطح پر ایک متحد اسلامی جمعیت معرضِ وجود میں آ جائے۔

بہرحال میں نظامِ امارت میں آپ کے ساتھ ہوں اور آپ کو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا مژدہ سناتا ہوں کہ ''مَنْ تَمَسَّكَ بِسُنَّتِيْ عِنْدَ فَسَادِ اُمَّتِيْ فَلَهٗ اَجْرُ مِائَةِ شَهِيْدٍ'

والسلام محی الدین
الہ آباد المعروف قلعہ تارے والا' ڈاک خانہ خاص'
براستہ دیپالپور' ضلع اوکاڑہ

(نوٹ) میں بوجوہ ''محاضرات'' میں حاضری نہیں دے سکا' لیکن احیاءِ نظامِ امارت میں آپ کے ساتھ ہوں۔ جب بھی ممکن ہوا ملاقات کے لیے حاضر ہوں گا۔ ان شاء اللہ!

خطابِ جمعہ

مسجد دارالسلام لاہور‘ ۲۹؍مارچ ۱۹۸۵ء

◆ پروفیسر یوسف سلیم چشتی مرحوم ومغفور کی یاد میں جلسہ

◆ سالانہ محاضراتِ قرآنی کی شاندار کامیابی پر اللہ کا شکر

◆ نصرتِ خداوندی کے حصول کا یقینی طریقہ: نصرتِ خدا اور رسولؐ

یعنی غلبہ واقامت دین کی جدوجہد

مولانا سید مظفر حسین ندوی (مظفر آباد) کی تقریر کے حوالے سے!

مرتبہ: شیخ جمیل الرحمٰن

(’تذکرہ و تبصرہ‘ ماہنامہ ’میثاق‘ بابت مئی ۱۹۸۵ء)

خطبہ مسنونہ اور دعا کے بعد:

حضرات! آپ میں سے اکثر کو اس کا اندازہ ہے کہ ۲۲؍مارچ سے کل ۲۸؍مارچ تک پورا ہفتہ میرا اور میرے ساتھی یعنی تنظیم اسلامی کے رفقاء اور مرکزی انجمن خدام القرآن کے جو فعال وابستگان ہیں‘ ان کا وقت شدید مصروفیت اور مشقت میں گزرا ہے۔ ۲۲؍مارچ کے جمعہ کی تقریر‘ خطبہ اور نماز ہوئی۔ پھر اسی شام کو مغرب کے بعد ہم نے پروفیسر یوسف سلیم چشتی مرحوم و مغفور کی یاد میں ایک جلسہ منعقد کیا۔ الحمد للہ ثم الحمد للہ کہ وہ جلسہ بہت کامیاب رہا۔ جلسہ کے صدر جناب چیف جسٹس (ریٹائرڈ) شیخ انوار الحق صاحب تھے۔ موصوف اپنی ایک دوسری مصروفیت کی وجہ سے دورانِ جلسہ اجازت لے کر چلے گئے تھے۔ بعدہ جلسہ جناب علامہ شبیر احمد بخاری سابق وائس چانسلر جامعہ اسلامیہ بہاولپور کی صدارت میں جاری رہا۔ مقررین نے بڑے ذوق وشوق کے ساتھ شرکت کی اور سامعین نے بھی ہمیں مایوس نہیں کیا۔ بلکہ واقعتاً ہماری توقع سے کہیں بڑھ کر اس اجلاس میں شرکاء کی تعداد تھی —— پھر ہفتہ کی صبح کو ہماری مرکزی انجمن خدام القرآن کا ایک فنکشن تھا۔ وہ بھی صبح نو بجے سے شروع ہو کر ایک بجے دوپہر کو ختم ہوا۔ پھر اسی شام سے محاضراتِ قرآنی کا قرآن اکیڈمی میں سلسلہ شروع ہو گیا جو جمعرات ۲۸؍مارچ کی شب تک چلتا رہا اور ہر اجلاس عموماً رات کو ۱۰ بجے تک جاری رہتا تھا۔ پھر اتوار کی صبح سے تنظیم اسلامی کے دس سالہ اجتماع کا آغاز ہوا جو کل ۲۸؍تاریخ کو ظہر کے وقت اختتام پذیر ہوا۔ اس طرح روزانہ صبح آٹھ بجے سے لے کر ایک بجے تک اور شام کو عصر سے لے کر رات دس بجے تک ہماری شدید ترین مصروفیت رہی ہے۔

محاضراتِ قرآنی کے ضمن میں اللہ تعالیٰ کا بڑا فضل ہوا ہے اور میرے پاس الفاظ نہیں ہیں جن کے ذریعہ میں اللہ سبحانہ‘ کا شکر ادا کرسکوں۔ ان محاضرات کو جو گونا گوں کامیابی حاصل ہوئی ہے وہ ہماری ہر توقع سے بڑھ کر ہے۔ ہم نے قریباً اسّی اہل علم وفضل حضرات کو ان محاضرات میں شرکت کی دعوت دی تھی کہ وہ ان محاضرات کے موضوع ’’قرآن کا تصور فرائض دینی‘‘ پر اظہار خیال فرمائیں —— میں نے قرآن حکیم‘ سنت و سیرتِ محمد علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے معروضی مطالعہ سے فرائض دینی کا جو جامع تصور اخذ کیا ہے جس کے پیش نظر عملی جدوجہد کے لیے میں قریباً بیس سال سے ہمہ تن لگا ہوا ہوں‘ اس کا خلاصہ بھی ان حضرات کی خدمت میں ارسال کر دیا تھا اور ان سے استدعا کی تھی کہ علماء کرام اور اصحابِ دانش تشریف

لائیں اور رہنمائی فرمائیں کہ اس تصورِ دینی میں کیا صواب ہے اور کیا خطا یا تقصیر ہے! ان مدعوین میں سے پچیس تیس کے مابین حضرات تشریف لائے۔ ان میں ہمارے ملک کے چوٹی کے علماء بھی شامل ہیں۔ حضرت مولانا سید عنایت اللہ شاہ بخاری مدظلہ گجرات والے جو ایک خاص مکتبۂ فکر اور مسلک کے چوٹی کے علماء میں سے ہیں (۱)۔ حضرت مولانا محمد مالک کاندھلوی (۲) شیخ الحدیث جامعہ اشرفیہ لاہور نہ صرف یہ کہ ملک گیر شہرت کے حامل ہیں بلکہ وہ ضیاء صاحب کی نامزد کردہ مجلس شوریٰ کے بھی رکن رہے ہیں اور اس اعتبار سے بھی نمایاں ہوئے ہیں۔ مولانا مفتی سیاح الدین صاحب کاکاخیل مدظلہٗ جو اسلامی نظریاتی کونسل کے قریباً مستقل رکن رہے ہیں اور بہت معروف شخصیت ہیں۔ ان کا زیادہ تر اتفاق' تعاون اور اشتراکِ عمل جماعت اسلامی کے ساتھ ہے (۳)۔ مولانا مفتی محمد حسین نعیمی مدظلہٗ' بریلوی مکتب فکر کی ایک نمایاں شخصیت ہیں (۴)۔ وہ بھی مجلس شوریٰ کے کافی عرصہ رکن رہے ہیں۔ ویسے تو موصوف ملک کی سطح پر معروف ہیں لیکن لاہور کی تو بہرحال وہ ایک نمایاں شخصیت ہیں۔ مولانا عبدالغفار حسن صاحب مدظلہٗ اصلاً اہل حدیث مسلک سے تعلق رکھنے والی ایک معروف شخصیت ہیں۔ انہوں نے جماعت اسلامی میں ایک طویل عرصہ گزارا ہے اور ۱۹۵۳ء کی اینٹی قادیانی تحریک کے سلسلہ میں جب مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی مرحوم ومغفور اسیر رہے تھے تو کچھ عرصہ مولانا موصوف جماعت اسلامی کے امیر بھی رہے ہیں۔ پھر وہ اسی زمانہ یعنی ۱۹۵۷ء میں علیحدہ ہوئے تھے جس زمانہ میں چند دوسرے حضرات اور میں خود علیحدہ ہوا تھا۔ پھر مولانا نے طویل عرصہ تک تدریس حدیث کی ذمہ داری جامعہ اسلامیہ مدینہ منورہ میں ادا کی ہے۔ مزید یہ کہ وہ بھی اسلامی نظریاتی کونسل کے رکن رہے ہیں اور شوریٰ کے بھی (۵) —— پھر مولانا عبدالقادر

(۱) شاہ صاحب قبلہ نے پورے خاکہ کی تصویب وتوثیق فرمائی۔ (مرتب)

(۲) مولانا موصوف مدظلہٗ نے جماعت سازی میں اندیشوں کا اظہار فرمایا۔ (مرتب)

(۳) مفتی صاحب قبلہ نے بیعت کے مسئلہ کے سوا پورے خاکہ سے اتفاق فرمایا۔ بیعت کے مسئلہ پر گفتگو کسی آئندہ موقع کے لیے ملتوی فرمادی۔ (مرتب)

(۴) مفتی صاحب موصوف نے "قرآن کے تصور فرائض دینی" کے جزو اوّل و دوم سے اور جماعت کے التزام سے کامل اتفاق فرمایا لیکن بیعت اور جہاد بالسیف کو چند اہم شرائط سے مشروط قرار دیا۔ (مرتب)

(۵) مولانا موصوف مدظلہ نے ہر نوع کی دینی جماعت بنانے سے بھرپور اختلاف کیا۔ (مرتب)

صاحب روپڑی (۱) مدظلہٗ اہل حدیث علماء میں چوٹی کی شخصیتوں میں سے ہیں —— یہ سب شریک ہوئے۔ میں یہ تو نہیں کہتا کہ شرکت کرنے والے جن حضرات کے نام میں نے آپ کو بتائے ہیں یہ اپنے اپنے حلقوں کی چوٹی کی شخصیتیں ہیں لیکن یہ ضرور جانتا ہوں کہ یہ حضرات کرام اپنے اپنے حلقہ کی چوٹی کی شخصیتوں میں سے ضرور ہیں۔ اس میں کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں۔ ان کے علاوہ بھی اپنے اپنے مقام ومرتبہ کے لحاظ سے پاکستان کے بہت سے علماء نے شرکت فرمائی۔

ہندوستان سے مولانا وحید الدین خاں صاحب (۲) مدظلہٗ دہلی سے تشریف لائے۔ بہت معروف شخصیت ہیں۔ آپ نے شاید نام سنا ہو۔ ان کو سیرت پر لکھی ہوئی ایک کتاب پر پچھلے سال ایک بڑا انعام ملا تھا۔ ہمارے صدر ضیاء الحق ہر سال سیرت پر جو فنکشن منعقد کرتے ہیں' اس میں کتابوں پر انعام ملتے ہیں تو یہ عالمی سطح پر مقابلہ ہوتا ہے۔ اس میں انہیں انعام ملا تھا۔ طویل عرصہ سے ان کی زیر ادارت دہلی سے ماہنامہ "الرسالہ" نکلتا ہے جو دینی اور علمی حلقوں میں بہت معروف ہے —— حیدرآباد دکن سے دو علمی شخصیتیں تشریف لائیں۔ ان میں سے ایک صاحب تو آل انڈیا سطح پر ایک منصب کے حامل ہیں۔ قراء حضرات کی ایک آل انڈیا تنظیم ہے' اس کے وہ اعزازی معتمد اعلیٰ (سیکرٹری جنرل) ہیں۔ وہ ہیں حضرت مولانا قاری عبدالعلیم صاحب مدظلہٗ۔ وہ اس جمعہ میں بھی تشریف لائے ہوئے ہیں۔ میں اپنی تقریر کے بعد ان سے مختصر خطاب نیز خطبۂ جمعہ ارشاد فرمانے اور صلوٰۃ جمعہ کی امامت کرنے کی درخواست کروں گا۔ دوسرے صاحب مولانا قاری قطب الدین علی چشتی مدظلہٗ ہیں جو حیدرآباد دکن کی ایک معروف علمی و دینی شخصیت ہیں۔ یہ دونوں حضرات کل ہی لاہور پہنچے ہیں (۳)۔ حیدرآباد دکن سے تو یہ قریباً پونے دو ہزار میل کا سفر طے کر کے ۱۹؍مارچ ہی کو دہلی پہنچ گئے تھے لیکن پاکستان کا ویزا ملنے میں ان حضرات کو بڑی دشواریوں' دقتوں اور پریشانیوں سے سابقہ پیش آیا۔ بہرحال یہ حضرات کل ۲۸؍مارچ کو لاہور پہنچ گئے اور کل ان حضرات نے محاضرات کو اپنے قیمتی خیالات سے مستفید فرمایا۔

(۱) مولانا موصوف مدظلہٗ نے بھی مفتی سیاح الدین کاکاخیل مدظلہ کے مطابق موقف اختیار کیا۔ (مرتب)

(۲) مولانا موصوف مدظلہٗ نے مولانا عبدالغفار حسن کے موقف کی تائید کی۔ (مرتب)

(۳) ان دونوں حضرات نے بھی ڈاکٹر صاحب کے موقف کی مکمل تائید فرمائی۔ (مرتب)

ان محاضرات میں جن پچیس تیس علماء اور اہل علم و فضل حضرات نے اظہارِ خیال فرمایا ان میں سے چند حضرات کے نام میں نے پیش کیے ہیں۔ میرے لیے بڑا مشکل مسئلہ ہے کہ ان میں سے اور دوسرے حضرات میں سے کس کو صفِ اوّل کی شخصیتیں کہا جائے اور کن کو صفِ دوم کی شخصیتیں قرار دیا جائے۔ بہرحال میں اپنی معلومات اور ان حضرات کی اکثریت کو معروف ہونے کے اعتبار سے صفِ اوّل کی شخصیات قرار دے رہا ہوں —— ان حضرات کی تشریف آوری اور اشتراک و تعاون کے اعتبار سے میرے نزدیک بہت بڑی کامیابی ہے۔ برصغیر پاک و ہند کا کوئی نمایاں مکتبِ فکر ایسا نہیں ہے جس کے چوٹی کے علماء میں سے کوئی نہ کوئی شریک نہ ہوا ہو۔ پھر یہ کہ ان محاضرات میں جو سنجیدہ و باوقار فضا برقرار رہی وہ نہایت ہی خوش آئند' لائق تحسین اور قابل داد ہے۔ بعض مقررین نے بعض اعتبارات سے میری چند آراء سے کھل کر شدید اختلاف کیا ان پر شدید تنقیدیں کیں۔ اب میری انجمن اور میری تنظیم کا جلسہ ہے' میری ہی صدارت میں محاضرات کی تمام نشستیں منعقد ہو رہی ہیں' شرکاء کی عظیم ترین اکثریت بھی میرے فکر سے اتفاق رکھنے والے اور میرے کاموں میں دامے درمے سخنے تعاون کرنے والوں پر مشتمل رہی ہے' لیکن سب نے ان اختلافات اور تنقیدوں کو بڑے صبر' سکون اور تحمل سے سنا —— اسی لیے تو میں نے ان محاضرات کا موضوع ''قرآن کا تصورِ فرائض دینی'' رکھا تھا تاکہ دوسرے اہل علم و فضل کے تائیدی اور اختلافی آراء اور ان کے دلائل ہم سب کے سامنے آجائیں اور اگر واقعی ہم پر ہماری کوئی غلطی واضح ہو جائے تو اس کی اصلاح کی جا سکے۔ مجھے خوب معلوم تھا کہ بعض حضرات کی طرف سے اختلافی آراء آئیں گی اور تنقیدیں ہوں گی۔ اس موقع پر یہ انتقال ذہنی ہے کہ مجھے فوراً یاد آیا کہ قرآن مجید میں سورۂ ہود کی آیت ۱۱۸ کے آخر میں فرمایا: ﴿وَلَا يَزَالُوْنَ مُخْتَلِفِيْنَ﴾ اور اگلی آیت کے درمیان میں فرمایا: ﴿وَلِذٰلِکَ خَلَقَهُمْ﴾ ''لوگ اختلاف تو کرتے ہی رہیں گے'' —— اور اسی لیے تو اللہ نے ان کو پیدا فرمایا ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے یہ دنیا اس حکمت پر تخلیق فرمائی ہے کہ اس میں اختلاف ہے۔ شکلوں کا اختلاف ہے' رنگوں کا اختلاف ہے' زبانوں کا اختلاف ہے' مزاج کا اختلاف ہے' اندازِ فکر کا اختلاف ہے' آراء کا اختلاف ہے' تعبیر و استنباط کا اختلاف ہے۔ ع ''ہر گلے را رنگ و بوئے دیگر است'' والا معاملہ ہے۔ صحابہ کرام ؓ میں بھی اختلاف تھا۔ کسی کا مزاج کچھ ہے' کسی کا دوسرا مزاج ہے۔ کوئی بالکل درویش منش ہے' کوئی کاروباری صلاحیت بہت رکھتا ہے۔ کوئی مردِ میدان بہت زیادہ ہے' بڑا شجاع' دلیر اور بہادر ہے۔ کوئی اعلیٰ پائے کا

خطیب ہے۔ کسی کو ہم کہتے ہیں کہ وہ فقہائے صحابہؓ میں سے ہیں۔ ان کو دین و شریعت کا خصوصی فہم اللہ تعالیٰ نے عطا فرمایا ہے۔ وہؓ قانون و قضا میں دور رس نگاہ رکھتے ہیں۔ کسی کو قراءت قرآنِ مجید سے بہت زیادہ شغف ہے۔ کسی پر زہد کا انتہائی غلبہ ہے۔ کوئی تدبر' فراست میں یکتائے زمانہ ہے' انتظامی صلاحیتیں ان میں بے انتہا ہیں۔ تو ہر گلے را رنگ و بوئے دیگر است کا معاملہ تھا۔ ﴿وَلِذٰلِکَ خَلَقَهُمْ﴾ اللہ نے بنایا ہی ایسا ہے۔ یہ گوناگونی' یہ بوقلمونی' یہ رنگا رنگی نہ ہو تو یہاں بڑی یکسانیت پیدا ہو جائے جس سے طبیعت اُکتا جائے۔ پھر یہ کہ اختلاف رائے سے اصلاح کی راہیں کھلتی ہیں۔ اخلاص و خلوص موجود ہو' ہٹ دھرمی اور ضد و انانیت نہ ہو تو اختلاف رحمت ثابت ہوتا ہے۔ معاملہ وہی ہے جو اس مصرع میں سامنے آتا ہے ع

اے ذوق اس چمن کو ہے زیب اختلاف سے!

تو حقیقت یہ ہے کہ میں نے محاضرات میں یہ موضوع رکھا ہی اس لیے تھا کہ ہمارے اہل علم و فضل کی آراء سامنے آجائیں تاکہ ان کی روشنی میں ہم اپنے فکر' اپنی دعوت' اپنے کام اور اپنی جدوجہد کے ہدف پر غور و فکر کر سکیں اور جو صحیح بات بھی دلائل کے ساتھ سامنے آئے' اسے قبول کر کے اصلاح کر سکیں۔ لہٰذا اختلافات سامنے آئے اور کھل کر سامنے آئے' لیکن قابل شکر بات یہ ہے کہ کوئی تلخی نہیں۔ میں نے اپنے ساتھیوں سے تاکیداً یہ کہہ دیا تھا کہ بالکل سامع بن کر بیٹھیں اور اختلافات و تنقیدات کو کھلے کانوں اور کھلے دماغوں سے سنیں' البتہ استفہام کے لیے کوئی سوال کرنا ہو تو اسے تحریری طور پر کر لیں۔ کوئی جرح' کوئی تنقید اور ان کو اپنی بات بڑھانے کی کوشش' اپنی بات منوانے کی سعی' ان باتوں سے میں نے سختی سے اپنے ساتھیوں کو منع کر دیا تھا۔ سامعین میں صرف ہماری انجمن اور تنظیم کے رفقاء ہی نہیں تھے۔ دوسرے حضرات بھی تھے۔ بہرحال کسی نے اس نوع کے سوالات بھیجے بھی تو میں نے ان کو روک لیا۔ استفہامی نوعیت کے سوالوں میں سے بھی وقت کی کمی کی وجہ سے چند ہی سوالات متعلقہ مقرر کی خدمت میں پیش کیے گئے۔

جو اہل علم و فضل حضرات ان محاضرات میں تشریف لائے ان میں سے متعدد حضرات نے علیٰ رؤس الاشہاد اس بات کا اعتراف کیا کہ برصغیر پاک و ہند کی جہاں تک معلوم تاریخ ہے اس میں یہ پہلا موقع ہے کہ اس نوع کی ایک مجلس ترتیب دی گئی اور اہل علم و فضل کو دعوت دی گئی کہ آیئے مجھے اور میرے ساتھیوں کو ہماری غلطیاں بتایئے۔ ہم سمجھنا چاہتے ہیں اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی طرف سے ہم پر دین کے جو فرائض اور تقاضے عاید ہوتے ہیں ہم ان کو جاننا

چاہتے ہیں اور ان کو ادا کرنے کے لیے کمربستہ ہوئے ہیں۔ ہمیں کوئی شوقِ مجلس آرائی اور انجمن آرائی اور کوئی شوقِ سیادت وقیادت نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ ان سے ہمیں اپنی حفظ وامان میں رکھے اور ان سے بچائے —— اللہ تعالیٰ کا احسان ہے کہ نہایت خوشگوار ماحول میں یہ چھ دن کے مسلسل محاضرات ہوئے۔ ایک لمحہ کے لیے بھی کسی طور پر بھی مناظرے کی کیفیت پیدا نہیں ہوئی—— میں نے تو پہلے ہی طے کر کے اعلان کر دیا تھا کہ میں اس گفتگو میں محض سامع بنا رہوں گا اور کسی اختلاف اور کسی رائے پر بھی اظہارِ خیال نہیں کروں گا۔ استفہامی سوال کے لیے میں نے اپنا حق رکھا تھا لیکن میں نے اس کو بھی استعمال نہیں کیا۔ البتہ صرف دو ضمنی مختصر سوالات کیے۔ اس سے زیادہ میں نے اس گفتگو میں کوئی حصہ نہیں لیا۔

البتہ بعض علماء کے متعلق پوری مجلس نے یہ محسوس کیا کہ وہ تیاری کر کے نہیں آئے تھے۔ انہوں نے ایسے نکات پر جن پر کسی کو سرے سے اختلاف ہو ہی نہیں سکتا ایک وعظ کہہ دیا۔ اپنی جگہ درحقیقت وہ مواعظ بھی نہایت قیمتی تھے لیکن جس مقصد کے لیے یہ محاضرات منعقد کیے گئے تھے اس کے اعتبار سے وہ غیر متعلق تھے اور جو اصل نکتہ تھا جس میں اختلاف رائے کی گنجائش تھی اور جس کے متعلق رہنمائی مطلوب تھی' یعنی لزومِ اجتماعیت' اس کے تقاضے' ان کی انجام دہی کے لیے بیعت ہجرت وجہاد فی سبیل اللہ وسمع وطاعت فی المعروف پر مبنی خالص دینی جماعت کا قیام —— تو اس پر اظہارِ خیال سرے سے کیا ہی نہیں گیا۔ نہ ان کی تصویب وتوثیق کے متعلق کچھ فرمایا گیا اور نہ ہی اس سے اختلاف کرتے ہوئے کتاب وسنت سے دلائل پیش کیے گئے۔ بایں ہمہ ان مواعظِ حسنہ کو بھی جملہ شرکاء نے صبر وسکون اور توجہ سے سنا۔ میرے لیے یہ بات نہایت ہی اطمینان بخش ہے اور حقیقت یہ ہے کہ میں اس پر کتنا ہی اللہ کا شکر کروں' شکر کا حق ادا نہیں ہوسکتا۔ بس اسی پر اکتفا کرتا ہوں فللّٰہ الحمد والمنۃ۔

میری اپنی سوچ اور اپنے فکر کے اعتبار سے ان محاضرات کی اہم ترین بات یہ ہے کہ میں نے محسوس نہیں کیا کہ کسی صاحب کی طرف سے کوئی بڑی بنیادی اختلافی بات محکم دلائل کے ساتھ آئی ہو —— اختلاف کی نوعیت عموماً یہ رہی ہے کہ بعض حضرات کے نزدیک جماعت یا تنظیم کے قیام سے بہت سے اندیشے ہیں کہ کہیں ایسا نہ ہو جائے کہیں ویسا نہ ہو جائے۔ بعض ضروری احتیاطیں ہونی چاہئیں وغیرہ وغیرہ۔ بعض حضرات نے میری بعض ان تعبیرات سے شدید اختلاف کیا جن کے متعلق میں گزشتہ جمعہ کی اپنی تقریر میں پیشگی اعتراف کر چکا تھا کہ

رواداری میں کچھ الفاظ ایسے استعمال ہو گئے ہیں کہ جن سے بعض حضرات کو مغالطہ ہوا ہے۔ مثلاً میں نے اس خط میں جو اہلِ علم وفضل کی خدمت میں بھیجا گیا تھا۔ یہ لکھا تھا کہ:

''آخر میں جناب سے مؤدبانہ گزارش ہے کہ وہ اپنی گوناگوں مصروفیات اور تمام تر مشاغل کے باوجود اس کام کے لیے ضرور وقت نکالیں۔ اس لیے کہ کسی دینی خدمت و تحریک کی بروقت رہنمائی' خصوصاً جبکہ اُس کا محرک وداعی خود اس کے لیے متدعی ہو' ایک اہم دینی فریضہ ہے!—— بصورت دیگر میں اپنے آپ کو یہ کہنے میں حق بجانب سمجھتا ہوں کہ میری جانب سے اللہ تعالیٰ کے حضور میں آپ پر حجت قائم ہو جائے گی کہ میں نے تو رہنمائی چاہی تھی جناب ہی نے توجہ نہیں فرمائی۔''

میرے خط کی عبارت کے اس حصے میں جو الفاظ آئے ہیں کہ ''آپ پر ایک حجت قائم ہو جائے گی'' ان کا مفہوم یہ سمجھا گیا کہ میں اس طرح ان سے اپنی بیعت کرا کے تنظیم اسلامی میں شامل ہونے کی دعوت دے کر ''حجت'' قائم کر رہا ہوں۔ حاشا وکلا میرا یہ مقصد ہرگز نہیں تھا۔ میں اسے اپنی کوتاہ قلمی اور اپنی تقصیر سمجھتا ہوں کہ ان الفاظ سے بعض حضرات نے یہ مفہوم اخذ کیا —— میرا اس عبارت سے مقصود یہ تھا کہ مجھے یہ اندازہ تھا کہ علماء کرام آسانی سے میری دعوت قبول نہیں کریں گے تو میں نے ایک انتباہ کے طور پر لکھا تھا کہ وہ میری دعوت پر لبیک کہیں اور تشریف لائیں۔ اس مفہوم ومعنی میں مَیں نے لفظ حجت استعمال کیا تھا کہ دیکھئے کہ میں نے تو آپ سے ہدایت ورہنمائی چاہی تھی' آپ نے نہیں دی تو اللہ تعالیٰ کے یہاں آپ جواب دہ ہوں گے۔ ایک تو وہ ہے جسے آپ ہدایت دینا چاہتے ہیں لیکن وہ سرتابی کرتا ہے —— اب دیکھئے وہی انتقالِ ذہنی والا معاملہ ہے۔ میرا ذہن سورۂ عبس کی ان آیات کی طرف منتقل ہوا: ﴿وَاَمَّا مَنْ جَآءَكَ يَسْعٰى ﴿٨﴾ وَهُوَ يَخْشٰى ﴿٩﴾ فَاَنْتَ عَنْهُ تَلَهّٰى ﴿١٠﴾﴾ جو شخص چاہتا ہے کہ مجھے بتاؤ' میری جو غلطی ہے اس کی نشاندہی کرو—— اب اس کے باوجود کوئی استغناء کا انداز اختیار کرتا ہے تو اس کے لیے جواز اور عذر پیش کرنے میں مشکل پیش آسکتی ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ کسی شرعی عذر کی بنا پر لاہور کا سفر کرنا یا تشریف لانا ممکن نہ ہو۔ توقع ہے کہ جن حضرات کو عبارت کے اس حصہ سے مغالطہ لاحق ہوا ہے ان کی غلط فہمی ان شاء اللہ اس وضاحت سے رفع ہو جائے گی۔ چند دوسری تعبیرات کی میں وضاحت آگے کروں گا —— تین حضرات کے مجھے خطوط آئے ہیں کہ ہم تو تم سے اتنے بیزار ہیں کہ آنے کے لیے بھی تیار نہیں ہیں۔ ٹھیک ہے ایک مزاج ہے' افتاد ہے۔ باقی بعض اکابر علماء جو تشریف نہیں لا سکے ان کے

نہایت عمدہ اور حوصلہ افزا خطوط آئے ہیں۔ ان میں جن جذبات کا اظہار کیا گیا وہ میرے لیے سرمایۂ زیست رہیں گے۔

مولانا سعید احمد اکبر آبادی مدظلہٗ جو اس وقت برصغیر کے چوٹی کے علماء میں سے ہیں‘ میں بلاخوفِ تردید اپنے تجربہ اور علم کے اعتبار سے یہ کہہ سکتا ہوں کہ مولانا موصوف اپنی عمر‘ اپنے وسیع تجربے اور اپنے علم و فضل کی بنیاد پر واقعتاً اس دور میں چوٹی کے عالم ہیں۔ وہ شخص جو کلکتہ کی قدیم اور معیاری درس گاہ مدرسہ عالیہ کا طویل عرصہ تک پرنسپل رہا ہو۔ وہ شخص جو علی گڑھ یونیورسٹی کا طویل عرصہ تک شعبۂ دینیات کا صدر رہا ہو۔ وہ شخص جو بے شمار نہایت اعلیٰ اور تحقیقی کتابوں کا مصنف ہے۔ میں نے اپنے زمانۂ طالب علمی میں ان کی بعض کتابیں پڑھی تھیں جن میں ''حقیقت وحی'' سے میں نے بہت استفادہ کیا تھا۔ آج تک میری لائبریری میں شاید وہ نسخہ موجود ہو جس کے بعض ابواب کو میں نے انڈر لائن کر کے پڑھا تھا جس طرح میں میڈیکل کی کتابیں پڑھا کرتا تھا۔ میری یہ عادت تھی کہ ضروری حصوں کو سرخ نیلی اور دوسری رنگوں کی پنسلوں سے انڈر لائن کیا کرتا تھا تا کہ حسب ضرورت ان میں ربط قائم کر سکوں اور جب کبھی موقع آئے تو صرف ایک نگاہ دوڑا کر رنگوں کے اختلاف سے مضمون کے نکات کو باہمی جوڑ کر نتیجہ نکال سکوں —— اسی انداز سے میں نے مولانا موصوف کی کتاب ''حقیقتِ وحی'' کا مطالعہ کیا تھا۔ یہ ۱۹۵۲ء کی بات ہے۔ وہ شخص اُس وقت اتنے اعلیٰ پائے کا مصنف تھا۔ ابھی سیرت عثمان رضی اللہ عنہ پر ان کی بڑی محققانہ اور ضخیم کتاب آئی ہے۔ انہوں نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے نہایت عرق ریزی اور تحقیق سے سرکاری خطوط جمع کیے ہیں۔ سیرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا پر ان کی محققانہ تصنیف موجود ہے۔ پھر یہ کہ حضرت شیخ الہندؒ کے نام سے دارالعلوم دیوبند میں ایک اکیڈمی قائم ہوئی ہے۔ اس کے وہ ڈائریکٹر ہیں —— وہ محاضرات میں بنفس نفیس تشریف لانا چاہتے تھے‘ وہ اس کے بڑے خواہش مند تھے کہ خود آ کر میرے موقف کی کلی تائید فرمائیں۔ فی الوقت وہ کراچی میں مقیم ہیں۔ کافی علیل ہیں۔ ان کے معالجوں نے سفر کی ان کو بالکل اجازت نہیں دی تو ہمارے ایک رفیق ان کا پیغام ٹیپ کرا کے لے آئے تھے جس میں انہوں نے ہر پہلو سے تائید کی ہے‘ کسی پہلو سے تنقید نہیں کی۔ یہ ٹیپ محاضرات کے پہلے اجلاس میں سنایا گیا —— لہٰذا بتائیے کہ مولانا مدظلہٗ کی یہ تائید میرے لیے سرمایۂ زیست ہے یا نہیں؟

اسی طرح حضرت مولانا ابوالحسن علی ندوی مدظلہٗ (جو برصغیر پاک و ہند میں علی میاں کے

نام سے مشہور و معروف ہیں) وہ صرف برصغیر ہی کے نہیں بلکہ عالمی شہرت کے عالم اور مفکر تسلیم کیے جاتے ہیں۔ عالم عرب میں وہ جتنے محبوب و مقبول ہیں اس کا کسی کو اندازہ ہو ہی نہیں سکتا۔ عرب مولانا کی عربی زبان کی تحریر و تقریر سے چٹخارے لیتے ہیں۔ ان کی تحریر و تقریر اتنی اعلیٰ عربی میں ہوتی ہے کہ عرب جو اہل زبان ہیں اس کو لوہا مانتے ہیں۔ ان کے ہاں گنتی کے لوگ ہوں گے جو علی میاں مدظلہٗ کے پائے کی عربی لکھ اور بول سکتے ہوں۔ ان کا خط بھی بڑا حوصلہ افزا آیا ہے۔ ایسے جملے بھی ہیں‘ جن کو میں یہاں نقل بھی نہیں کر سکتا۔ اسی طرح حضرت مولانا گوہر رحمٰن مدظلہٗ نے اپنے مکتوب گرامی میں اس عاجز کی حوصلہ افزائی فرمائی ہے اور جہاد بالقرآن کی تحسین و تائید فرمائی ہے۔ نیز قومی اسمبلی کے اجلاس کی وجہ سے عدم شرکت پر معذرت کی ہے۔

یہ سب کچھ عرض کرنے کی غایت یہ ہے کہ مجھے توقع ہے کہ یہ محاضرات ان شاءاللہ ہماری دعوت کے لیے سنگ میل ثابت ہوں گے۔ اللہ کی نصرت و تائید کے بھروسے پر جس چھوٹی سی دینی خدمت کا میں نے آغاز کیا تھا‘ اس پر بہرحال بیس سال بیت گئے ہیں۔ اب تھوڑا وقت باقی ہے لیکن انسان کی یہ کمزوری ہے کہ اس نے جو کام شروع کیا ہو وہ چاہتا ہے کہ اسے پھلتا اور پھولتا دیکھے۔ پھل لاتا ہوا دیکھے۔ اگرچہ سورۃ الصّف میں ایک عجیب نکتہ آیا ہے۔ فرمایا گیا ہے: ﴿وَاُخْرٰی تُحِبُّوْنَهَا نَصْرٌ مِّنَ اللّٰهِ وَفَتْحٌ قَرِیْبٌ﴾ ایک چیز تمہیں بڑی محبوب ہے کہ فتح ہو‘ کامیابی ہو‘ نتائج نکلیں اور تمہیں اپنے لگائے ہوئے پودے درخت بنتے اور برگ و بار لاتے نظر آئیں یہ تمہیں پسند ہے۔ اللہ کو تو اس سے غرض ہی نہیں۔ اللہ کو یہ کرنا ہو تو آنِ واحد میں کر دے۔ اللہ تو تمہارا امتحان لینا چاہتا ہے کہ تم اس کے دین کے غلبہ کے لیے اپنا تن من دھن لگاتے ہو یا نہیں! اللہ کی نگاہ میں تو وقعت آخرت کی کامیابی کی ہے‘ اس کامیابی کی ہے ہی نہیں۔ یہ تو اونچ نیچ ہے جو ہوتی ہی رہتی ہے: ﴿تِلْکَ الْاَیَّامُ نُدَاوِلُهَا بَیْنَ النَّاسِ﴾ (آل عمران: ١٤٠) —— ''وَاُخْرٰی تُحِبُّوْنَهَا''۔ میں ایک نوع کی تعریض ہے کہ تمہاری نگاہ میں اس کی بڑی اہمیت ہوگی‘ ہماری نگاہ میں تو اسے پرکاہ کے برابر بھی وقعت نہیں ہے۔ ہمارا معاملہ تو یہ ہے کہ ہم دیکھنا چاہتے ہیں کہ کون ع ''شمع سودائی دل سوزیٔ پروانہ ہے'' جو ہمارے دین کے لیے اپنا سب کچھ لگا دے وہ کامیاب ہے۔ چاہے ایک قدم ہی چل پایا ہو کہ موت نے آلیا ہو گویا پہلے ہی قدم پر شہادت قدم چوم لے۔

اس پہلو سے یہ ہماری کمزوری ہے کہ ہم چاہتے ہیں کہ ہماری نگاہوں کے سامنے ہمارا

کام بڑھے' پھلے' پھلے پھولے' نتائج نکلیں۔ میں نے بہرحال اپنی جوانی اور کسی شخص کی عمر کا جو بھی بہترین حصہ ہوتا ہے وہ اس کام میں لگایا ہے۔ اس لیے فطری خواہش ہے کہ یہ کام پائیدار بنیادوں پر آگے بڑھے۔ دعوتِ قرآنی بھی آگے بڑھے اور اقامتِ دین کی جدوجہد بھی صحیح صحیح رخ پر علیٰ منہاج النبوۃ نبی اکرم ﷺ کے نقوش پائے مبارک کو سامنے رکھتے ہوئے آگے بڑھے۔ باقی رہا یہ کہ کون کہاں تک پہنچے گا اور کس منزل تک یہ جدوجہد پہنچے گی یہ کسی کو معلوم نہیں۔ جب قرآن میں خود حضور ﷺ سے فرمایا گیا کہ اے نبیؐ! آپ کہہ دیجیے: ﴿وَمَآ اَدۡرِیۡ مَا یُفۡعَلُ بِیۡ وَلَا بِکُمۡ ؕ﴾ (الاحقاف:۹) ''مجھے کچھ پتا نہیں میرا کیا بنے گا اور تمہارا کیا بنے گا!'' اور ﴿وَاِنۡ اَدۡرِیۡۤ اَقَرِیۡبٌ اَمۡ بَعِیۡدٌ مَّا تُوۡعَدُوۡنَ ﴿۶۵﴾﴾ (الحج) ''مجھے کچھ پتا نہیں جس عذاب کی تمہیں دھمکی دی جارہی ہے وہ آیا سر پر آن کھڑا ہے یا ابھی کچھ مہلت ہے'' —— مجھے کچھ معلوم نہیں ہے —— تو ہمیں کیا پتا! ع ''گہے بر پشت پائے خود نہ بینیم''۔ انسان کا حال تو یہ ہے کہ وہ کبھی خود اپنے پیر کی پشت پر رکھی ہوئی چیز کو نہیں دیکھ پاتا' جسے ہم کہتے ہیں کہ ناک تلے کی شے نظر نہیں آتی۔ دعویٰ وہ یہ کرتا پھرتا ہے کہ میں یہ دیکھ رہا ہوں وہ دیکھ رہا ہوں' اور یہ مستقبل ہے۔ البتہ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ قرائن وموجود شواہد سے انسان پیش آنے والے واقعات وحالات کا صحیح اندازہ لگا لیتا ہے جسے علامہ اقبال نے یوں تعبیر کیا ہے ع ''گاہ مری نگاہِ تیز چیر گئی دلِ وجود'' —— کبھی ایسا بھی ہوتا ہے اللہ تعالیٰ مستقبل کی کوئی جھلک دکھاتا ہے اور جیسے علامہ نے کہا ہے ؎

آب روانِ کبیر تیرے کنارے کوئی
دیکھ رہا ہے کسی اور زمانے کے خواب!

اور یہ کہ ؎

پردہ اٹھادوں اگر چہرۂ افکار سے
لا نہ سکے گا فرنگ میری نواؤں کی تاب!

یہ دونوں کیفیات ہوتی ہیں۔ بہرحال میرے لیے یہ بات بہت ہی موجب اطمینان ہے کہ جو کام میں نے اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے اسی کی تائید ونصرت کے بھروسہ پر شروع کیا تھا اس سمت میں رفتہ رفتہ ہمارے قدم آگے بڑھ رہے ہیں۔ **فَلِلّٰہِ الۡحَمۡد والمنة!**

میں نے آج کے لیے جو موضوع اپنے سامنے رکھا تھا اس پر گفتگو کا موقع ہی نہیں آیا اور

کافی وقت محاضراتِ قرآنی کے متعلق تاثرات کے بیان میں صرف ہوگیا —— ان ہی محاضرات میں ایک بزرگ' مظفر آباد آزاد کشمیر سے تشریف لائے تھے جن کا نام نامی ہے مولانا سید مظفر حسین ندوی —— مجھے ان کے متعلق یہ اندازہ تو تھا کہ بہت خاموش طبع' بہت شریف النفس اور بہت نیک انسان ہیں۔ اس مرتبہ جب وہ ہمارے ساتھ پانچ چھ دن رہے تو اندازہ ہوا کہ صاحب دل شخصیت بھی ہیں —— ان کو دو اطراف سے فیض بھی پہنچا ہے اور اسی اعتبار سے ان کو دو اطراف سے ذہنی مناسبت بھی ہے۔ وہ جب ندوہ (لکھنؤ) میں زیر تعلیم تھے تو مولانا سید ابوالحسن علی میاں مدظلہ' اور مولانا مسعود عالم ندویؒ دونوں ان کے استاد تھے۔ مولانا علی میاں ندوی حنفیُ المسلک ہیں اور مولانا مسعود عالم ندویؒ سلفیُ المسلک یعنی اہل حدیث تھے۔ مولانا علی میاں بھی اگرچہ جماعت اسلامی کے ابتدائی دور میں اس میں شریک ہوئے تھے لیکن بہت جلد چند اختلافات اور کچھ چیزوں سے مایوس و بددل ہوکر علیحدہ ہوگئے تھے۔ یہ ۱۹۴۳ء کا زمانہ تھا۔ اس کے بعد ان کا زیادہ وقت تبلیغی جماعت کے ساتھ گزرا ہے۔ جبکہ مولانا مسعود عالم ندویؒ جب جماعت میں آئے تو تا دمِ واپسیں جماعت ہی میں رہے۔ عالم عرب میں مولانا مودودی مرحوم کو متعارف کرانے والے یہی ہیں۔ مولانا مودودی کی کتابوں کا عربی میں ترجمہ کرنے اور ان کو عرب میں پھیلانے کا ابتدائی کام مولانا مسعود عالم ندویؒ ہی نے سرانجام دیا ہے۔ وہ بھی ندوہ کے صاحب قلم تھے اور اپنے عربی مضامین کے باعث جو وہاں عربی رسائل و جرائد میں شائع ہوتے رہتے تھے ایک معروف عربی انشا پرداز کی حیثیت سے کافی معروف و مشہور تھے۔ یہ مولانا سید مظفر حسین ندوی مدظلہ' ان دونوں کے شاگرد ہیں۔ لہٰذا دونوں کے مزاج ایک حسین توازن کے ساتھ ان میں جمع ہیں۔ ان کو میں مجمع البحرین اگر کہوں تو بالکل درست ہوگا۔ ایک طرف ان میں حنفیت بھی ہے دوسری طرف اس میں سختی وتشدد کے بجائے توسع ہے۔ بڑی وسعتِ قلبی ہے۔ پھر یہ کہ ان کا ایک انقلابی مزاج بھی ہے جو ابتدائی دور میں جماعت اسلامی کا تھا اور تبلیغی جماعت کا تقویٰ' تدین' دھیما پن بھی ان کی طبیعت کا ایک جزو ہے۔ مزید یہ کہ ۱۹۴۷ء میں جو جہاد کشمیر میں ہوا تھا تو جہاں تک میرا گمان ہے وہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے اس کا آغاز کیا تھا۔ اس کی تحریک کرنے والے وہی ہیں۔ انہوں نے ہی لوگوں کو اس مقصد کے لیے جمع اور آمادہ کیا تھا۔ بہرحال اس جہاد کی نمایاں ترین شخصیت وہ رہے ہیں۔ اس میں تو کوئی شک نہیں' البتہ میں اس کی تحقیق کروں گا کہ اس کی تحریک کرنے والے وہی ہیں یا کوئی اور!

سید مظفر حسین صاحب نے محاضرات میں جو تقریر کی اس کے آخر میں انہوں نے محاضرات کے موضوع کے بارے میں تو ایک جملہ کہا کہ مجھے پوری چیز سے اتفاق ہے۔ یہ جملہ ہی بہت قیمتی ہے۔ البتہ انہوں نے اپنی تقریر میں جو اہم بات فرمائی وہ میں ان ہی کے حوالے سے آپ کے سامنے بیان کرنا چاہتا ہوں —— دیکھئے ایک تو وہ نقطۂ نظر ہے جو بحیثیت ایک مخلص پاکستانی ہم میں سے ہر ایک کا ہونا چاہیے۔ اور ایک وہ نقطۂ نظر ہے جو ہمارا مومن و مسلم کی حیثیت سے ہونا چاہیے۔ ان دونوں نقطہ ہائے نظر سے ہمارے عمل میں مضبوطی اور پختگی آئے گی —— انہوں نے یہ بات بایں الفاظ نہیں کہی ہے۔ لیکن اس کا جو مفہوم میں نے سمجھا ہے اُسے اپنے الفاظ میں بیان کر رہا ہوں —— ہمارا خالص مادہ پرستانہ نقطۂ نظر بھی اگر ہو کہ یہ پاکستان ہمارا ملک ہے' ہمارا وطن ہے۔ اسے مشرق و مغرب سے خطرات لاحق ہیں۔ ہمارے دشمنوں کے بڑے مضبوط حلقے (lobbies) ہمارے ملک کے اندر موجود ہیں۔ تھوڑے تھوڑے عرصہ کے بعد یہاں ہنگامے ہوتے رہے ہیں۔ کبھی لسانی فسادات ہو گئے۔ جیسے کہ بھٹو کے دور میں سندھ میں ہو گئے اور اس موقع پر اندیشہ لاحق ہوا تھا کہ پتا نہیں اب یہ کشتی اس گرداب سے نکل سکے گی یا نہیں؟ کبھی کبھی سنی شیعہ فسادات ایک ہولناک صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ فی الوقت قادیانیوں کا جارحانہ انداز امن و امان کے نقض کا موجب بن سکتا ہے۔ اب ذہنوں میں سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس ملک کی بقا کے لیے' اس کے استحکام کے لیے کوئی سہل نسخہ بھی ہے یا نہیں! ٹھیک ہے طویل نسخے موجود ہیں: ﴿وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ﴾(الانفال: ٦٠). تیاری جاری رکھو۔ جتنی بھی امکان میں ہے۔ اتحاد پیدا کرو۔ جو بھی اپنے ranks کے اندر اختلافات ہیں انہیں دور کرو۔ یکجہتی پیدا کرو۔ علاقائی سطح پر انصاف کا معاملہ ہو۔ لوگوں کو ان کے جائز حقوق دیے جائیں تاکہ انہیں اطمینان ہو۔ وہ احساس محرومی میں مبتلا نہ ہوں۔ پھر یہ کہ اگر خارج میں ہمارے کچھ دشمن ہیں تو خارجہ پالیسی کے تحت کچھ دوست بھی تلاش کیے جائیں۔ ان میں سے کسی چیز سے بھی اختلاف نہیں ہے لیکن یہ وہ امور ہیں کہ خالص مادہ پرستانہ اور لادینی نقطۂ نظر رکھنے والے ذہن کا آدمی بھی ان کے متعلق سوچے گا۔ دشمنوں کے مقابلہ میں دوستوں کی تلاش' ان سے معاہدے' اگر معاہدے نہ ہوں تو کوئی اطمینان ہو۔ یہ باتیں تو ہر شخص سوچے گا۔ اسلحہ جمع کرنے کے متعلق ہر ملک سوچے گا کہ کتنا ہم خود بنا سکتے ہیں اور کتنا دوسروں سے لے سکتے ہیں اور وہ کہاں سے مل سکتا ہے' کہاں سے نہیں مل سکتا۔ یہ سوچیں تو

ہر محبّ وطن کی ہوں گی خواہ وہ مومن و مسلم ہو یا کافر ہو —— لیکن سید صاحب موصوف نے دو آیات کے حوالے سے اس کا آسان ترین نسخہ بتایا ہے جس کے مؤثر ہونے میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہے جو تیر بہدف (sure shot) ہے۔ اس نسخہ کا پہلا جز و تو سورۂ محمد کی آیت ۷ میں ہے: ﴿یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اِنْ تَنْصُرُوا اللّٰهَ یَنْصُرْكُمْ﴾ "اے اہل ایمان اگر تم اللہ کی مدد کرو گے تو اللہ تمہاری مدد کرے گا"۔ تو یہ اس نسخہ کا پہلا جزو ہے تم اللہ کی مدد کرو اللہ تمہاری مدد کرے گا۔ اب حدیث میں اس انداز کی بہت سے باتیں آئی ہیں۔ فرمایا گیا کہ اگر تم تمام تفکرات کو ایک فکر میں مدغم کرو —— مجھے اس مدغم کے لفظ سے ایک تاریخی واقعہ یاد آیا۔ مغل بادشاہ محمد شاہ رنگیلا کے دور میں جب ایران کا نادر شاہ علاقوں پر علاقے فتح کرتے ہوئے دہلی کی طرف بڑھ رہا تھا تو علاقہ کے ذمہ دار پرچے پر پرچے بھیج رہے تھے کہ بادشاہ سلامت کچھ کیجیے' دشمن منزل بمنزل دارالحکومت کی طرف بڑھتا چلا آ رہا ہے۔ لیکن شاہ صاحب کی جو رنگ رنگیلی محفلیں جما کرتی تھیں' شراب نوشی ہوتی رہتی تھی۔ لہٰذا شاہ کی طبع پر ان پرچوں کا پڑھنا بھی گراں گزرتا تھا تو جو رقعہ آتا تھا اسے وہ بغیر پڑھے شراب کے جام میں پھاڑ کر ڈال دیتے تھے کہ ع

ایں دفتر بے معنی غرق مئے ناب اولیٰ!

یہ انداز مطلوب ہے کہ دنیا کے تمام تفکرات کو غرق کر دو ایک فکر میں اور وہ فکر آخرت ہے۔ اس کا نتیجہ کیا نکلے گا وہ ارشادِ نبوی علیٰ صاحبہ الصلوٰۃ والسلام کے حوالہ سے ذہن نشین کر لیجئے۔ فرمایا الصادق والمصدوق ﷺ نے: ((مَنْ جَعَلَ الْهُمُوْمَ هَمًّا وَّاحِدًا هَمَّ آخِرَتِهٖ كَفَاهُ اللّٰهُ هَمَّ دُنْيَاهُ)) "جس شخص نے اپنے تمام تفکرات کو بس ایک ہی فکر یعنی اپنی آخرت کی فکر میں سمو دیا تو اللہ ذمہ لیتا ہے اُس شخص کے تمام دنیا کے تفکرات کو دور کرنے کا" —— بتائیے کہ اس سے زیادہ آسان نسخہ کوئی ہے؟ بس اس کے لیے تھوڑے سے ایمانِ حقیقی کی ضرورت ہے۔ اگر وہ تھوڑا سا واقعی یقین کہیں سے میسر آ جائے ؎

یقیں پیدا کر اے ناداں یقیں سے ہاتھ آتی ہے
وہ درویشی کہ جس کے سامنے جھکتی ہے فغفوری

یہ یقین ہے اصل مسئلہ۔ اسی طریقہ سے ایک طویل حدیث کے درمیان میں آتا ہے: ((مَنْ كَانَ فِيْ حَاجَةِ اَخِيْهِ كَانَ اللّٰهُ فِيْ حَاجَتِهٖ)) "جو شخص اپنے کسی بھائی کی ضرورت پوری کرنے میں لگا ہوا ہے' اللہ اس کی ضرورت پوری کرنے میں لگ جاتا ہے"۔ اب آپ

بتایئے کہ جو ایک انسان اپنے ایک بھائی کی ضرورت پوری کرنے میں لگا ہوا ہے' اللہ کی نگاہ میں اس کی اتنی قدر ہے کہ اس کی ضرورت خود وہ پوری فرماتا ہے تو اگر اللہ کے دین کی ضرورت کوئی پوری کر رہا ہو تو اس کے ساتھ اللہ کا معاملہ کیا ہوگا! یہ ہے انداز اس آیت کریمہ کا: ﴿یٰۤاَیُّهَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡۤا اِنۡ تَنۡصُرُوا اللّٰهَ یَنۡصُرۡكُمۡ وَیُثَبِّتۡ اَقۡدَامَكُمۡ﴿۷﴾﴾ ''اے اہل ایمان! اگر تم اللہ کی مدد کرو گے تو اللہ تمہاری مدد کرے گا اور تمہارے قدم جما دے گا''۔ پھر تمہارے قدموں میں کوئی لغزش نہیں ہوگی' تم ثابت قدم رہو گے تو یہ ہے اس نسخہ کا جزو اوّل ——

دوسرا جزو کیا ہے؟ اسے سورۂ آل عمران کی آیت ۱۶۰ سے سمجھئے۔ فرمایا: ﴿اِنۡ یَّنۡصُرۡكُمُ اللّٰهُ فَلَا غَالِبَ لَكُمۡ﴾ ''اگر اللہ تمہاری مدد کرے گا تو کوئی تم پر غالب نہیں آ سکے گا''۔ یہ بڑی یقین دہانی والی بات ہے۔ جس کا پشت پناہ اللہ بن گیا ہو' جس کا مددگار اللہ ہو تو اب کیا کوئی اللہ پر غالب آ سکتا ہے؟ لیکن یہاں ایک دھمکی بھی ہے: ﴿وَاِنۡ یَّخۡذُلۡكُمۡ فَمَنۡ ذَا الَّذِیۡ یَنۡصُرُكُمۡ مِّنۡۢ بَعۡدِهٖ﴾. ہوش میں آؤ ''اگر اللہ ہی تمہارا ساتھ چھوڑ دے تو کون ہے وہ جو تمہاری مدد کر سکے اس کے بعد'' —— امریکہ بچا لے گا! میزائل بچا لیں گے! اسلحہ بچا لے گا! اگر اللہ نے چھوڑ دیا تو کوئی بچانے والا نہیں۔ نہ کثرت تعداد بچاتی ہے۔ نہ کوئی اور مادی شے بچاتی ہے۔ جنگ حنین میں بارہ ہزار مسلمان تھے' لیکن ابتدا میں شکست ہوئی: ﴿وَّیَوۡمَ حُنَیۡنٍ ۙ اِذۡ اَعۡجَبَتۡكُمۡ كَثۡرَتُكُمۡ﴾(التوبة:۲۵). حنین میں جنگ کے دن تمہیں اپنی کثرت پر ناز ہو گیا تھا۔ نتیجہ دیکھ لیا! —— اس بات کو جان لیجیے کہ اللہ تعالیٰ کفار کے ساتھ خالص مادّی سطح پر معاملہ کرتا ہے۔ اگر ان کی آپس کی جنگ ہے تو ان کا معاملہ تو حساب کتاب سے ہوگا۔ اسباب و وسائل کی کمی بیشی فیصلہ کن ہوگی۔ مسلمان کا معاملہ بالکل مختلف ہے۔ اس کے ساتھ معاملہ کے اللہ تعالیٰ کے معیارات بالکل جدا ہیں۔ یہ معیار معلوم کرنا ہے تو حضرت طالوت کا جالوت جیسے باجبروت اور عسکری لحاظ سے نہایت مضبوط لشکر سے مقابلہ کا انجام دیکھو۔ جہاں ان مؤمنین کا یہ قول قرآن مجید نے نقل کیا ہے جن کو یقین تھا کہ مرنے کے بعد اللہ کے حضور میں حاضر ہونا ہے: ﴿كَمۡ مِّنۡ فِئَةٍ قَلِیۡلَةٍ غَلَبَتۡ فِئَةً كَثِیۡرَةًۢ بِاِذۡنِ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ مَعَ الصّٰبِرِیۡنَ﴿﴾﴾ (البقرة) ''بارہا تھوڑی جماعت غالب ہوئی ہے بڑی جماعت پر اللہ کے حکم سے' اور اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے'' یہ معیار معلوم کرنا ہے تو معرکۂ بدر دیکھو جسے اللہ تعالیٰ نے یوم الفرقان قرار دیا ہے۔ حق و باطل کے درمیان امتیاز کرنے والا دن۔ جس روز اللہ تعالیٰ کی مدد

سے تین سو تیرہ بے سروسامان مؤمنین صادقین ایک ہزار کفار کے لشکر پر غالب آئے جو ہر طرح کے ہتھیاروں اور کیل کانٹوں سے لیس اور مسلح تھے۔

ہم مؤمنین صادقین اور کفار کے معاملہ کے تناسب کو دنیوی معیارات سے گڈمڈ کرتے ہیں اور اصل صورت حال یہ ہے کہ عام طور پر ہم اپنے معاملات کو ان معیارات پر سوچنے کے عادی ہو گئے ہیں جو اللہ کے پیمانے اور معیارات کفار کے لیے ہیں۔ مسلمان کا معاملہ بالکل مختلف ہے۔ ان سے تو مستقل وعدہ ہے کہ: ﴿وَاَنۡتُمُ الۡاَعۡلَوۡنَ﴾ ''تم ہی غالب و سربلند رہو گے''۔ لیکن یہ وعدہ مشروط ہے اس سے کہ: ﴿اِنۡ كُنۡتُمۡ مُّؤۡمِنِیۡنَ﴾ ''بشرطیکہ تم مؤمن ہو'' یعنی سربلندی اور غلبہ کے لیے مؤمن صادق ہونا لازمی شرط ہے —— وہ بھی فرداً فرداً نہیں بلکہ جماعتی اور منظّم طور پر۔ علامہ اقبال نے اسی بات کو یوں کہا ہے ؎

فضائے بدر پیدا کر فرشتے تیری نصرت کو
اُتر سکتے ہیں گردوں سے قطار اندر قطار اب بھی!

تو سید مظفر حسین ندوی مدظلہٗ نے یہ نسخہ تجویز فرمایا کہ اگر ہم بحیثیت قوم وملت اللہ کے دین کے حامی اور مددگار بن جائیں اور اسے اپنے ملک میں مخلصانہ جذبہ کے ساتھ صحیح خطوط پر قائم کرنے میں کامیاب ہو جائیں۔ انفرادی طور پر خود بھی حقیقی مؤمن بن جائیں اور اجتماعی نظام کو بھی کتاب وسنت کی تعلیمات کے مطابق استوار کر کے قائم و نافذ کر دیں تو ان شاء اللہ ہمارے ساتھ معاملہ وہ ہوگا جس کی بشارت ان آیات میں دی گئی ہے: ﴿اِنۡ تَنۡصُرُوا اللّٰهَ یَنۡصُرۡكُمۡ﴾ اور ﴿اِنۡ یَّنۡصُرۡكُمُ اللّٰهُ فَلَا غَالِبَ لَكُمۡ﴾ —— اصل میں یہ باتیں تو بالکل سامنے کی ہیں' دو اور دو چار کی نوعیت کی ہیں۔ متعدد بار یہ مضمون اس انداز میں بیان بھی ہوا ہوگا' لیکن انہوں نے جس پُرتاثیر انداز سے بیان کی اس کی شان ہی نرالی تھی۔ مجھے اس موقع پر ایک واقعہ یاد آیا۔ یہ واقعہ ہے کوئی کہانی نہیں ہے کہ امیر افغانستان کی والدہ شدید بیمار تھیں۔ مقامی اطباء حکماء بالکل مایوس ہو چکے تو علاج کے لیے حکیم اجمل خاں مرحوم کو دہلی سے بلایا گیا۔ حکیم صاحب نے دیکھا بھالا اور پھر نسخہ لکھوانا شروع کیا تو امیر کابل نے کہا کہ یہ ساری دوائیاں تو ہم استعمال کرا چکے ہیں۔ اس پر حکیم اجمل خاں صاحب نے جواب دیا کہ ''بدست اجمل خان بخور!'' یہ دوائیاں اب اجمل خاں کے ہاتھ سے کھلاؤ۔ تو دوائیوں کا معاملہ اپنی جگہ ہے۔ لیکن دیکھنا یہ ہے کہ کس کے ہاتھ سے اور کس کی تجویز اور کس کے نسخے سے وہ دوائی کھلائی

جارہی ہے۔اس میں بڑا فرق ہے تو میں نے محسوس کیا کہ سید صاحب مدظلہ نے جس طرح دل اور جذبے میں ڈوب کر یہ بات کہی ہے اور جس یقین کے ساتھ کہی ہے۔ یہ قال نہیں حال معلوم ہوتا تھا۔اس کا میرے دل پر گہرا اثر ہوا اور اسی وقت میں نے یہ طے کرلیا تھا کہ ان کی بات انہی کے حوالے سے جمعہ کی اجتماع میں اپنے الفاظ میں آپ حضرات کو منتقل کروں گا۔

اب اس مضمون کو تھوڑا سا اور آگے بڑھائیے۔ نبی اکرم ﷺ کی نصرت کا خاص طور پر قرآن مجید میں دو جگہ ذکر آیا ہے۔ایک جگہ مثبت انداز میں اور ایک جگہ منفی اسلوب سے —— مثبت والے انداز کی جو آیت ہے وہ تو ہمارے ایک کتابچے کی اساس و بنیاد ہے۔ وہ سورۃ الاعراف کی آیت ۱۵۷ کے آخری جزو پر مشتمل ہے جس میں نبی اکرم ﷺ سے ہمارے تعلق کی بنیادیں' اللہ تعالیٰ نے چار الفاظ کے حوالے سے معین فرمائی ہیں —— اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بتادیا تھا کہ جب میرے الرسول النبی الامی مبعوث ہوں گے تو میری ایک رحمتِ خاص ہے وہ میں نے محفوظ (reserve) کی ہوئی ہے۔ وہ ان لوگوں کے لیے مخصوص ہے جو ہمارے اس الرسول النبی الامّی کے ساتھ یہ معاملہ کریں گے۔ وہ اُس رحمت کے حق دار ہوں گے —— وہ کیا معاملہ ہے! اسے ان الفاظ مبارکہ میں بیان کیا: ﴿فَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِهٖ وَعَزَّرُوْهُ وَنَصَرُوْهُ وَاتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِیْٓ اُنْزِلَ مَعَهٗٓ ۙ اُولٰٓئِکَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ﴾ (الاعراف) پس جو لوگ ان پر ایمان لائیں گے اور ان کی تعظیم وتوقیر' عزت واحترام کریں گے اور ان کی نصرت و مدد کریں گے اور اس نور کا اتباع کریں گے جو ان کے ساتھ نازل کیا جائے گا تو کامل فلاح ان ہی کے لیے ہے۔ یہاں "النُّوْرَ الَّذِیْٓ اُنْزِلَ مَعَهٗٓ" سے مراد قرآن مجید ہے۔ اس میں کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں ہے۔ بہرحال اس موضوع کو جو حضرات تفصیل سے سمجھنا چاہیں ان کو میں اس موضوع پر اس کتابچہ کے مطالعہ کرنے کی دعوت دوں گا[1] —— تو یہاں مثبت انداز میں فرمایا گیا کہ اگر تم فلاح وکامیابی چاہتے ہو تو اس کی چار شرائط ہیں: حضور ﷺ پر ایمان' حضورؐ کی تعظیم' حضورؐ کی نصرت اور قرآنِ حکیم کا اتباع —— اب غور طلب بات یہ ہے کہ حضور ﷺ کی نصرت و مدد سے کیا مراد ہے؟ کیا حضورؐ کو اپنی کسی ذاتی ضرورت کے لیے مدد درکار تھی! کیا آپؐ کو اپنے کسی گھریلو مشکل کے حل کے لیے مدد درکار تھی۔ کیا آپؐ نے اپنی پوری زندگی میں اپنی مالی مدد کے لیے دستِ سوال دراز کیا! —— میرے لیے آنسو ضبط کرنا

(۱) "نبی اکرم ﷺ سے ہمارے تعلق کی بنیادیں" کے نام سے یہ کتابچہ مطبوعہ شکل میں موجود ہے۔ (مرتب)

مشکل ہوجاتا ہے اس واقعہ پر جب بھی اس کا تصور آجاتا ہے کہ جو معاملہ حضور ﷺ نے حضرت ابوبکرؓ کے ساتھ کیا۔ ان سے زیادہ جگری اور کون ہوگا جن کے متعلق فرمایا: ((لَوْ کُنْتُ مُتَّخِذًا خَلِیْلًا لَا تَّخَذْتُ اَبَابَکْرٍ خَلِیْلًا)) حضور ﷺ تو یہاں ایک باہمہ اور بے ہمہ شخص کا نقشہ پیش فرمارہے ہیں۔ اس دنیا میں خلیل میرا کوئی نہیں —— فرماتے ہیں کہ "اگر میں کسی کو اس دنیا میں خلیل بناتا تو ابوبکر کو بناتا" میرا خلیل صرف اللہ ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ حضور ﷺ کے اندر محبت اور شفقت اتنی بے پایاں تھی کہ ہر صحابی محسوس کرتا تھا کہ حضور ﷺ میرے خلیل ہیں۔ یہ تو ظرف وحسن سلوک کا معاملہ ہے کہ ہر شخص یہ محسوس کرتا تھا کہ شاید آپ کی نظر عنایت و التفات مجھ ہی پر ہے۔ حضرت ابوذرغفاری رضی اللہ عنہ تو حدیث ہی ان الفاظ سے روایت کرتے ہیں: اَوْصَانِیْ خَلِیْلِیْ "میرے دوست' میرے خلیل ﷺ نے مجھے یہ وصیت کی تھی" —— تو جس واقعہ کا میں ذکر کرنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ مکہ میں مشرکین نے فیصلہ کرلیا تھا کہ بنی ہاشم کے علاوہ قریش کے تمام خاندان کے چند نوجوان رات کو چھپ کر حملہ کریں گے اور یکبارگی حضورؐ کو شہید کردیں گے تاکہ بنی ہاشم کسی ایک خاندان کو موردِ الزام نہ ٹھہرا سکیں۔ حضورؐ کو اس سازش کا علم ہوگیا تھا لیکن اللہ کے اذن کے بغیر نبی اپنا شہر چھوڑ نہیں سکتا۔ لہٰذا حضورؐ بھی ہجرت کے حکم کا انتظار کر رہے ہیں اور ابوبکرؓ بھی منتظر ہیں —— حالات روز بروز مخدوش ہوتے جارہے تھے۔ حضرت ابوبکرؓ کو تشویش لاحق تھی کہ کہیں مشرکین مکہ یہ آخری اقدام نہ کر بیٹھیں۔ لہٰذا وہ کافی بے چین تھے اور حضورؐ سے بار بار پوچھتے تھے کہ اجازت آئی یا نہیں اور حضورؐ جواب میں فرماتے کہ ابھی اجازت نہیں آئی —— ایک دن دوپہر کے وقت نبی اکرم ﷺ حضرت ابوبکرؓ کے مکان پر تشریف لائے۔ اس طرح دوپہر کے بعد کسی کے گھر جانا عرب کے تمدن اور روایات کے اعتبار سے ایک غیر معمولی بات تھی۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت ہے کہ حضورؐ دوپہر کے غیر معمولی وقت ہمارے گھر تشریف لائے اور آتے ہی والد صاحب سے فرمایا کہ خاص بات ہے تخلیہ کرادو۔ حضرت ابوبکرؓ نے عرض کیا کہ حضورؐ آپ کی اہلیہ عائشہؓ کے سوا کوئی اور ہے ہی نہیں —— اس وقت تک حضرت عائشہؓ آپؐ کے نکاح میں آچکی تھیں —— حضورؐ نے فرمایا ہجرت کی اجازت آگئی ہے۔ اب حضرت ابوبکرؓ کی خوشی کی جو کیفیت ہوگی اس کا آپ اندازہ کر لیجیے کہ انہوں نے حضورؐ کو بتائے بغیر دو اونٹنیاں خوب کھلا پلا کر تیار کی ہوئی تھیں۔ اونٹ کا یہ معاملہ ہے کہ اگر اسے خوب کھلایا پلایا جائے تو اس کے اندر قوت جمع

(energy store) ہوجایا کرتی ہے۔ دور دراز کا سفر ہے۔ پھر تعاقب کا بھی اندیشہ ہے لٰہذا حضرت ابوبکرؓ نے دو تیز رفتار اونٹنیاں خوب فربہ کر رکھی تھیں۔ لٰہذا بڑے مسرت کے انداز میں عرض کرتے ہیں کہ حضورؐ میں نے دو اونٹنیاں تیار کر رکھی ہیں —— اب ہے وہ مرحلہ حضورؐ تھوڑی دیر توقف فرما کر ارشاد فرماتے ہیں کہ ''ٹھیک ہے ایک اونٹنی میں استعمال کروں گا اور میں اس کی قیمت ادا کروں گا'' —— یہ سن کر رو پڑے حضرت ابوبکرؓ اور عرض کیا: ''حضورؐ کیا یہ جان اور مال کسی اور کے لیے ہیں!'' —— یہ تو ان کے الفاظ ہیں۔ میں ان کی تعبیر یوں کیا کرتا ہوں کہ حضورؐ مجھ سے بھی اتنی مغائرت! —— تو یہ تھا نبی اکرم ﷺ کا معاملہ —— کس کام کے لیے آپؐ کو مدد درکار تھی۔ وہ مدد تھی اللہ کی مدد۔ اللہ کے دین کی مدد۔ اللہ کے دین کے غلبہ کی جدوجہد کی مدد۔ اللہ کی کبریائی کے نظام کو برپا اور قائم کرنے کے کام میں مدد —— حضورؐ کو کوئی ذاتی مدد' کوئی خاندانی مدد' کسی اور مسئلہ میں استمداد! معاذ اللہ' ثم معاذ اللہ —— سیرتِ مطہرہ میں تو حضورؐ کی بےنفسی کا یہ عالم سامنے آتا ہے کہ جب آپ سواری پر تشریف فرما ہوتے تھے اور آپ کا کوڑا زمین پر گر جاتا تھا تو سواری کو بٹھانا' اس سے اترنا اور کوڑا خود اٹھانا آپ کو اس سے کہیں زیادہ پسند تھا کہ کسی سے فرمائیں کہ ذرا مجھے کوڑا اٹھا دینا —— تو حضورؐ کو جو نصرت مطلوب تھی وہ اللہ کے دین کے غلبہ اور اس کی کبریائی کے نفاذ کے لیے مطلوب تھی۔ اسی نصرت کا مثبت انداز میں یہاں ذکر آیا ہے: ﴿فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِهٖ وَعَزَّرُوْهُ وَنَصَرُوْهُ وَاتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ مَعَهٗٓ ۙ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ﴿١٥٧﴾﴾

اب اسی کو منفی طور پر سورۃ التوبہ میں بیان کیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سے یہ حسن اتفاق ہوا ہے کہ یہ معاملہ بھی اسی ہجرت کا ہے جس کا ایک پہلو میں نے آپ حضرات کو ابھی سنایا۔ میرے ذہن میں یہ بات پہلے اس طرح نہیں تھی —— سورۃ التوبہ میں فرمایا: ﴿اِلَّا تَنْصُرُوْهُ فَقَدْ نَصَرَهُ اللّٰهُ اِذْ اَخْرَجَهُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ثَانِيَ اثْنَيْنِ اِذْ هُمَا فِي الْغَارِ اِذْ يَقُوْلُ لِصَاحِبِهٖ لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا ۚ﴾ (آیت ۴۰) —— غزوۂ تبوک کے موقع پر فرمایا جا رہا ہے کہ یہ جو تم سے کہا جا رہا ہے کہ اللہ کی راہ میں نکلو تو اگر تمہاری ہمتیں پست ہوئی جا رہی ہیں' اگر تم زمین میں دھنسے جا رہے ہو ﴿اثَّاقَلْتُمْ اِلَى الْاَرْضِ﴾' تمہارے پاؤں من من بھر کے ہو گئے ہیں' تمہیں حضور ﷺ کے ساتھ قیصر روم کے خلاف جہاد و قتال کے لیے نکلنا بہت شاق اور گراں گزر رہا ہے' تو ذرا یاد کرو اللہ محتاج نہیں ہے۔ اگر تم اس مرحلہ پر ہمارے رسول کی مدد نہیں

کرو گے تو اللہ نے ہر مرحلہ پر اپنے رسول کی مدد کی ہے۔ جب یہ صرف دو تھے اور غار میں تھے تو کون تھا ان کو دشمنوں سے بچانے والا! —— جب کہ حضرت ابوبکرؓ اپنے لیے اور اپنی جان کے لیے نہیں بلکہ حضورؐ کی جان کی وجہ سے اس قدر پریشان ہوئے کہ سرگوشی سے عرض کیا کہ حضورؐ ان دشمنوں نے جو غار کے دہانے تک پہنچ گئے ہیں اگر قدموں کی طرف جھک کر غار میں جھانک بھی لیا تو ہم دیکھ لیے جائیں گے —— ہوا یہ کہ غار کے دہانے پر مکڑی کا جالا تھا۔ اور نیچے کبوتری کا گھونسلا تھا۔ جس میں انڈے موجود تھے۔ جو علامت تھے اس بات کی کہ کوئی فرد غار کے اندر داخل نہیں ہوا۔ ہوتا تو جالا ٹوٹ جاتا۔ گھونسلہ اور انڈے بکھر جاتے —— ذرا قدرت الٰہی کا اندازہ کیجئے کہ بچاتا ہے تو مکڑی کے جالے اور کبوتری کے گھونسلے اور انڈوں سے۔ ماہر ترین کھوجی غار تک تعاقب کرنے والے مشرکین کے اس دستہ کو لے آیا ہے جس کا سردار ابوجہل ہے جس کی ذہانت اور زیرکی کی وجہ سے مشرکین قریش اسے ابوالحکم کہتے ہیں۔ کھوجی اصرار کر رہا ہے کہ میرا علم اور میرا تجربہ بتاتا ہے کہ محمد (ﷺ) اور ابوبکر (رضی اللہ عنہ) دونوں اس غار تک آئے ہیں اور یہاں سے آگے نہیں گئے' لٰہذا ہوں نہ ہوں غار میں ہیں —— اب غور کیجئے کہ کیا بات تھی! وہ کیوں رکے رہے۔ وہ ذرا جھک کر دیکھ لیتے! کس قدر باریک پردہ ہے! لیکن اصل بات تو اس طرح نصرتِ الٰہی کا ظہور تھا۔ انسانوں کے دل اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہیں' يُصَرِّفُ كَيْفَ يَشَآءُ وہ تو جس طرف چاہے ان کو پھیر دے۔ لٰہذا ابوجہل غار کے دہانے پر کھڑا ہے اور پکار رہا ہے کہ اے محمد! (ﷺ) اگر اندر ہو تو نکل آؤ' میں وعدہ کرتا ہوں کہ تمہیں قتل نہیں کروں گا بلکہ زندہ مکہ لے جاؤں گا —— اس وقت حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ گھبرائے اور حضور ﷺ نے تسلی میں یہ بات فرمائی: لَا تَحْزَنْ اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا ''کیوں گھبراتے ہوا ے ابوبکر! اللہ ہمارے ساتھ ہے''۔ پس اللہ نے مدد فرمائی تو اس طرح فرمائی —— البتہ دیکھنا یہ ہے کہ اللہ پر اور اس کے رسول ﷺ پر ایمان لانے کے مدعیان بھی مدد کرتے ہیں کہ نہیں۔ یہی ان کا امتحان ہے۔ زندگی کا فلسفہ یہی ہے کہ یہ امتحان کے لیے ہے ؎

قلزمِ ہستی سے تو اُبھرا ہے مانندِ حباب
اس زیاں خانے میں تیرا امتحاں ہے زندگی!

تمہارے ایمان کا امتحان ہے۔ تمہارے شوقِ عبادت کا امتحان ہے۔ تمہارے جذبۂ انفاق کا امتحان ہے۔ تمہارے طرزِ عمل کا امتحان ہے۔ تمہارے جوشِ جہاد کا امتحان ہے۔ تمہارے ذوق

شہادت کا امتحان ہے۔ امتحان کے سوا اور کچھ یہاں مطلوب نہیں: ﴿خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَیٰوۃَ لِیَبْلُوَکُمْ اَیُّکُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا﴾ (الملک:۲) موت و حیات کے اس سلسلہ کی غایت ہی جانچنا اور پرکھنا ہے۔ اس کے سوا اور کچھ نہیں —— اس نصرت کو سمجھنے کے لیے سورۃ الاعراف اور سورۃ التوبہ کی یہ آیات ذہن نشین کر لیں۔ اب دو آیات کا مفہوم مجھے اور بیان کرنا ہے جس کے بعد میری آج کی گفتگو مکمل ہو جائے گی۔

اب دیکھئے کہ نصرت اصلاً درکار ہے دین کی۔ آپ نے نوٹ کیا ہوگا کہ میں نے آج شروع کی دعاؤں میں وہ دعا بھی شامل کی جو خطبہ میں ہم ہمیشہ مانگتے ہیں کہ: اَللّٰھُمَّ انْصُرْ مَنْ نَّصَرَ دِیْنَ مُحَمَّدٍ ﷺ واجْعَلْنَا مِنْھُمْ. ''اے اللہ مدد فرما ہر اُس بندے کی جو مدد کرے تیرے نبی محمد ﷺ کے دین کی اور ہم کو ان ہی میں سے بنا دے' انہی میں شامل فرما دے''۔ وَاخْذُلْ مَنْ خَذَلَ دِیْنَ مُحَمَّدٍ ﷺ وَلَا تَجْعَلْنَا مَعَھُمْ ''اور ہر اس شخص کو رسوا کر دے' اپنی توفیق اس سے سلب کر لے' اس کی مدد سے دستکش ہو جا جو تیرے نبی محمدؐ کے دین سے دستکش ہو رہا ہو اور اے اللہ ہمیں ان کے ساتھ شامل نہ کیجیو''۔ میں اس کی تعبیر یوں کیا کرتا ہوں کہ اے اللہ ! ہم کبھی دھوکہ سے بھی ایسے لوگوں کے پھندے میں نہ پھنس جائیں۔ معاشرے میں ایسے لوگ ہر دور میں موجود رہتے ہیں جو گندم نما جو فروش کے زمرے میں آتے ہیں۔ دکھاتے گندم ہیں اور بیچتے جو ہیں۔ بظاہر دین کی خدمت ہے اصل میں دنیا مطلوب ہے۔ کوئی چودھراہٹ مقصود ہے شہرت درکار ہے۔ کسی اور پہلو سے کوئی منفعت پیش نظر ہے تو ایسے گندم نما جو فروش موجود ہوتے ہیں۔ پس ہم کسی کی گندم نمائی سے دھوکہ کھا کر اس کے ساتھی نہ بن جائیں۔ یہ ہے دعا۔ اس میں آپ نے دیکھا کہ نصرت و مدد کس کی درکار ہے! دین کی —— لیکن اس دین کی نسبتیں دو ہو جاتی ہیں۔ یہ ہے وہ بات جو میں دو مزید آیات کے حوالے سے سمجھانا چاہتا ہوں۔

آپ جانتے ہیں کہ دین کس کا ہے؟ اللہ کا۔ نبی کی طرف اس کی نسبت مجازی ہے۔ دین کی ایک نسبت ہماری طرف بھی ہے: ﴿لَکُمْ دِیْنُکُمْ وَلِیَ دِیْنِ﴾ ''تمہارا دین تمہارے لیے اور میرا دین میرے لیے''۔ میرا دین' تمہارا دین' اس کا دین' یہ سب نسبتیں مجازی ہیں۔ دین محمد ﷺ' یہ بھی مجازی نسبت ہے۔ دین کی اصل نسبت کس کی طرف ہے! اللہ کی طرف ''دین اللہ''۔ اس لیے کہ دین اس کو کہتے ہیں کہ کسی ہستی یا ادارہ کو مطاع مطلق مان کر اس کی اطاعت

کے مطابق پوری زندگی کا نقشہ بنایا جائے —— یہ نقشہ قبول کرنے والے کا دین ہوگا —— اگر کسی بادشاہ کی حاکمیت کو مطلق العنان تسلیم کر لیا گیا اور اس کی Absolute Sovereignity مان لی گئی۔ اسے قانون سازی کا مختارِ کل تسلیم کر لیا گیا کہ وہ جو چاہے قانون بنائے جس چیز کو چاہے حلال قرار دیدے۔ جس کو چاہے حرام ٹھہرا دے تو اس نظریہ کے تحت جو نظام بنے گا اور رائج ہوگا وہ دین الملک کہلائے گا۔ یہ لفظ سورۂ یوسف میں آیا ہے: ﴿مَا کَانَ لِیَاْخُذَ اَخَاہُ فِیْ دِیْنِ الْمَلِکِ﴾ (آیت ۷۶)۔ اس کو آپ قیاس کر لیجیے جمہور کی حاکمیت کے اصول پر' جمہور کے قانون سازی کے اختیارِ مطلق کے اصول پر —— اس اصول پر جو نظام بنے گا وہ کہلائے گا دین الجمہور —— اور اللہ کو حاکم مطلق مان کر جیسے ہم نے تبرکاً قراردادِ مقاصد میں مانا ہوا ہے۔ تبرکاً ہی ہے ورنہ اندر خانہ آج تک تو مانا نہیں۔ آج کی تاریخ تک تو مانا نہیں۔ جھوٹ کہتا ہے جو یہ کہتا ہے کہ مانا ہوا ہے۔ فلاں چیز مستثنٰی فلاں چیز مستثنٰی' تو کیا مانا! خاک مانا؟ جس چیز میں بیگمات ناراض ہوں' وہ مستثنٰی' جس میں امریکہ ناراض ہو وہ مستثنٰی' جس میں کارخانہ دار ناراض ہو وہ مستثنٰی' جس میں زمیندار ناراض ہو وہ مستثنٰی۔ تو کیا مانا! اللہ کو حقیقتاً حاکم مطلق مان لینا یہی تو ایک بات ہے۔ یہی تو توحید ہے ؎

یہ ایک سجدہ جسے تو گراں سمجھتا ہے!
ہزار سجدوں سے دیتا ہے آدمی کو نجات

لیکن یہ بڑی بھاری بات ہے۔ قولِ ثقیل ہے۔ ایک اللہ کا بندہ بن جانا انفرادی اعتبار سے بہت مشکل ہے اور اجتماعی اعتبار سے صرف اللہ تعالیٰ کی حاکمیت کے اصول پر پورے نظام زندگی کو استوار کر دینا آسان کام نہیں ہے۔ یہ کام تو وہ ہے جو محمد رسول اللہ ﷺ نے سرانجام دیا تھا۔ کوشش ہم کر سکتے ہیں' کوشش کرنے ہی میں ہمارے لیے کامیابی ہے' کر لینا آسان کام نہیں ہے۔ بہر حال عرض یہ کر رہا تھا کہ اللہ کو حاکم مطلق مان کر جو نظام بنے گا وہ کہلائے گا دین اللہ! —— یہ اصطلاح سورۃ النصر میں استعمال ہوئی ہیں: ﴿اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰہِ وَالْفَتْحُ ۝۱ وَرَاَیْتَ النَّاسَ یَدْخُلُوْنَ فِیْ دِیْنِ اللّٰہِ اَفْوَاجًا ۝۲﴾

تو دین اصلاً اللہ کا ہے اس کے غلبہ اور اس کی سربلندی کے لیے جدوجہد کرنا کس کی مدد ہوئی؟ اللہ کی مدد! اس کو غالب اور سربلند کرنے کے لیے اللہ نے اپنا رسول ﷺ بھیجا: ﴿ھُوَ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَہٗ بِالْھُدٰی وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْھِرَہٗ عَلَی الدِّیْنِ کُلِّہٖ وَلَوْ کَرِہَ

الْمُشْرِكُوْنَ﴿۹﴾ (الصف) ''وہی ہے اللہ جس نے بھیجا اپنے رسول کو الہدیٰ اور دین الحق دے کر تا کہ وہ غالب کرے اسے کل کے کل دین پر چاہے یہ بات مشرکوں کو کتنی ناگوار گزرے''۔ تو دین غالب کرنے کا فرض منصبی کس کا؟ رسول ﷺ کا! اگر تم اس دین کی سربلندی اور غلبہ کے لیے تن من دھن لگا رہے ہو' رسولؐ کے دست و بازو بن رہے ہو تو کس کی مدد ہوئی! رسولؐ کی مدد۔ تو یہ دو نصرتیں ہو گئیں۔ دین کی مدد' دین کی نصرت ایک طرف اللہ کی مدد و نصرت ہے اور دوسری طرف رسولؐ کی مدد و نصرت ہے۔ اس کے لیے دو آیات نوٹ کر لیں۔

ایک آیت تو سورۃ الحدید کی (آیت ۲۵) ہے۔ یہ آیت کریمہ قرآن مجید کی جامع ترین آیات میں سے ایک ہے۔ میں اس وقت اس کا ترجمہ سنا سکتا اور مختصر تشریح کر سکتا ہوں۔ چونکہ اس سے زائد کے لیے وقت نہیں ہے۔ فرمایا: ﴿لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ﴾ ''ہم نے بھیجا اپنے رسولوں کو روشن تعلیمات اور واضح نشانیوں کے ساتھ''۔ بینات کا دونوں پر اطلاق ہوگا۔ جو تعلیمات وہ لے کر آئے وہ بھی روشن اور فطرت انسانی کی جانی پہچانی اور وہ جو معجزے لائے وہ بھی بین' واضح اور روشن۔ ﴿وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِيْزَانَ﴾ ''اور ان کے ساتھ ہم نے کتاب بھی نازل کی' میزان بھی اتاری''۔ میزان سے مراد سب کے نزدیک شریعت ہے وہ نظامِ عدل جو اللہ نے دیا۔ معاشی میدان میں یوں عدل و انصاف ہوگا۔ سیاسی میدان میں یوں عدل و انصاف ہوگا۔ شوہر اور بیوی کے حقوق و فرائض کا یہ توازن ہوگا۔ آجر اور مستاجر کے مابین حقوق و فرائض کا یہ توازن ہوگا۔ بائع اور مشتری کے مابین حقوق و فرائض کا یہ توازن ہوگا۔ فرد اور اجتماعیت کے مابین حقوق و فرائض کا یہ توازن ہوگا۔ زندگی کے ہر گوشے اور ہر پہلو میں توازن ہوگا۔ شریعت کی میزان میں ہر ایک کا حق تُلے گا اور ایک کا حق دوسرے کا فرض ہے۔ والدین کے جو حقوق ہیں اولاد پر وہ اولاد کے والدین کے بارے میں فرائض ہیں۔ شوہر کے بیوی پر جو حقوق ہیں وہ بیوی کے شوہر کے متعلق فرائض ہیں۔ بات تو ایک ہی ہے۔ پس پوری اجتماعی زندگی میں حقوق و فرائض کا ایک توازن ہے —— اب غور کیجیے کہ سب کچھ کیوں کیا گیا کہ اللہ نے رسول بھیجے' تعلیمات اتاریں' بینات اتاریں۔ کتاب نازل فرمائی' میزان اتاری' کس لیے! کاہے کے لیے! یہ کوئی اللہ کی hobby ہے' کوئی مشغلہ ہے' کوئی تفریح ہے یا کوئی کارِ عبث ہے! **معاذ اللہ ثم معاذ اللہ**—— ہم نے یہی سمجھا ہے کہ بے مقصد کام ہے۔ اِلاّ ماشاء اللہ۔ اس دین کو' اس قرآن کو' اس شریعت کو ایک طرف رکھے رہیے ع ''چشمِ عالم

سے رہے پوشیدہ یہ آئیں تو خوب'' —— اسے بند رکھنے ہی میں عافیت ہے۔ یہ پٹارہ کھل گیا تو ہماری خیر نہیں۔ ہماری چودھراہٹوں کی خیر نہیں' ہماری پیشوائیوں کی خیر نہیں۔ علامہ اقبال نے بڑے سادہ الفاظ میں ابلیس کی زبان سے کہلوایا ہے:

جانتا ہوں میں یہ اُمت حامل قرآں نہیں
ہے وہی سرمایہ داری بندۂ مومن کا دیں
جانتا ہوں میں کہ مشرق کی اندھیری رات میں
بے ید بیضا ہے پیرانِ حرم کی آستیں!
عصر حاضر کے تقاضاؤں سے ہے لیکن یہ خوف
ہو نہ جائے آشکارا شرعِ پیغمبر کہیں!

نئے تقاضے ابھر رہے ہیں' نئے نظریات جنم لے رہے ہیں اور محسوس ہو رہا ہے کہ شاید ؎

جو حرف قُلِ الْعَفْوَ میں پوشیدہ تھی اب تک
اس دور میں شاید وہ حقیقت ہو نمودار

کچھ تقاضے ہیں جو سامنے آ رہے ہیں' لیکن ہمارا وطیرہ یہ ہے کہ ؎

مست رکھو ذکر و فکرِ صبحگاہی میں اسے
پختہ تر کردو مزاجِ خانقاہی میں اسے

اور: ہے یہی بہتر الٰہیات میں الجھا رہے!
یہ کتاب اللہ کی تاویلات میں الجھا رہے
پختہ تر کردو مزاجِ خانقاہی میں اسے

اور: ابن مریم مر گیا یا زندۂ جاوید ہے
ہیں صفاتِ ذاتِ حق حق سے جدا یا عینِ ذات
ہیں کتاب اللہ کے الفاظ حادث یا قدیم!
امت مرحوم کی ہے کس عقیدے میں نجات

ان گتھیوں کو سلجھاؤ۔ گویا اسی کے سمجھنے سمجھانے پر دنیا و آخرت کی فلاح اور نجات کا دار و مدار ہے۔ پھر یہ تو پرانے زمانے کی باتیں ہیں۔ اب تو نور و بشر کی گرما گرم بحث ہی نہیں جدال ہو رہا ہے۔ اسی میں لڑتے اور لڑاتے رہو۔ حضور ﷺ کا سایہ تھا یا نہیں تھا۔ اسی جھگڑے میں الجھاتے

رہو۔انہی مسائل پر مناظرے ہوں۔پھر بڑے بڑے میلے ٹھیلے ہیں۔عرس ہیں۔کبھی فلاں بزرگ کا عرس ہے کبھی فلاں کا۔اخبارات میں روزانہ ہی کسی نہ کسی کے عرس کے بڑے بڑے اشتہار چھپتے رہتے ہیں۔مزاروں کی تصاویر بڑی عقیدت سے خریدی اور گھروں میں آویزاں کی جارہی ہیں۔ یہ ہیں وہ چیزیں جو بطور کھلونا دے دی گئی ہیں ع ''کھلونے دے کے بہلایا گیا ہوں!''

یہ باتیں دکھی دل کی پکار بن کر نوکِ زبان پر آگئیں۔سلسلۂ کلام یہ ہے کہ غور طلب بات یہ ہے کہ الکتاب (قرآن مجید) کس لیے اللہ تعالیٰ نے نازل فرمائی تھی اور المیزان (شریعت اسلامی) کس لیے اللہ تعالیٰ نے اتاری تھی۔اس کو نہایت وضاحت وصراحت کے ساتھ آگے بیان فرمایا گیا: ﴿لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ﴾ تاکہ لوگ عدل وانصاف پر کاربند ہوں۔قائم ہوں۔یہ ترازو نصب کیا جائے۔یہ دھرم کنڈا صرف دکھاوے کے لیے نہ ہو بلکہ اس میں ہر چیز فی الواقع تلے اور حق دار کو اس کا پورا حق ملے۔لیکن یہ ترازو نصب کون ہونے دے گا! جو اپنے حق سے زیادہ لے رہا ہے وہ پسند کرے گا کہ میزانِ عدل سے تول کرلے؟ جو محروم ہیں وہ تو چاہیں گے کہ بھائی ترازو سے تولو۔یہ کیا کہ دونوں ہاتھوں سے بھر بھر کرلے جارہے ہو اور ہمیں ایک مٹھی پر ٹرخا رہے ہو وہ تو چاہیں گے۔چاہے ہمت نہ ہو' جرأت نہ ہو کھڑے نہ ہوسکیں۔لیکن جو اپنے حق سے زائد لے رہے ہیں وہ کبھی چاہیں گے کہ عدل وقسط کی میزان قائم ہو' نصب ہو —— اور یہ وہ لوگ ہیں جو چاہے دلیل سے قائل بھی ہوجائیں بالفعل مانیں گے کبھی نہیں۔یہ لاتوں کے بھوت ہیں باتوں سے کبھی ماننے والے نہیں۔اسی لیے فرمایا: ﴿وَاَنْزَلْنَا الْحَدِيْدَ﴾ ''ہم نے لوہا بھی اتارا ہے کہ نہیں''۔پنجابی میں کہتے ہیں کہ نہیں ''چار کتاباں عرشوں آیاں پنجواں آیا ڈنڈا!'' اسی کو اقبال نے یوں کہہ دیا ع ''عصا نہ ہو تو کلیمی ہے کارِ بے بنیاد'' —— لوگ میری باتوں سے گھبراتے ہیں کہ یہ کیا باتیں کرتا ہے! لیکن میں قرآن حکیم کی انقلابی دعوت پیش کرتا ہوں —— اللہ تعالیٰ خود فرما رہے ہیں کہ: ﴿وَاَنْزَلْنَا الْحَدِيْدَ﴾ ''اور ہم نے لوہا اتارا ہے'' کیوں اتارا ہے! اس لیے کہ اس میں جنگ کی صلاحیت ہے اور لوگوں کے لیے اس میں کچھ دوسری منفعتیں بھی ہیں۔چمٹا' پھکنی' توا' پرات اور بھی روزمرہ کے استعمال کی ہزاروں چیزیں بھی اس لوہے سے بنتی ہیں لیکن حقیقت میں اس کا اصل مقصد یہ ہے کہ اس سے اسلحہ بنایا جائے۔چنانچہ فرمایا: ﴿فِيْهِ بَاْسٌ شَدِيْدٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ﴾ —— اور یہ اس لیے اتارا گیا ہے کہ اس اسلحہ کی طاقت کو وہ لوگ جو میرے دین کے ماننے والے ہیں جو میرے نازل کردہ نظام

عدل وقسط پر ایمان رکھتے ہیں' ہاتھ میں لیں اور ان لوگوں کی سرکوبی کریں جو میرے دین سے سرتابی کریں —— ﴿وَلِيَعْلَمَ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ وَرُسُلَهٗ بِالْغَيْبِ﴾ ''تاکہ اللہ دیکھے کہ کون ہیں اس کے وفادار بندے جو اس لوہے کی طاقت کو ہاتھ میں لے کر غیب میں رہتے ہوئے بھی اللہ کی اور اس کے رسولوں کی مدد کرتے ہیں''۔اللہ کی مدد کیا ہے! اس کے نازل کردہ دین کی سربلندی اور اس کا نفاذ —— رسول کی مدد کیا ہے! اس کے لائے ہوئے دین کی سربلندی اور اس کا نفاذ —— آخر میں فرمایا: ﴿اِنَّ اللّٰهَ قَوِيٌّ عَزِيْزٌ﴾ ''بے شک اللہ تعالیٰ بذاتہٖ قوت والا اور زبردست ہے۔غالب ہے۔وہ اس کا محتاج نہیں ہے کہ تمہاری مدد ہوگی تو اس کا دین قائم ونافذ ہوگا سربلند ہوگا۔اس کی تکوینی حکومت اس کائنات کے ذرے ذرے پر مستولی ہے۔اس دنیا میں اس کا تشریعی نظام قائم کرنے کی ذمہ داری بغرض امتحان ان لوگوں کے سپرد کی گئی ہے جو اس پر اور اس کے رسولوں پر ایمان لانے کے مدّعی ہیں۔وہ دیکھنا اور جانچنا چاہتا ہے کہ یہ مدعیانِ ایمان اللہ کے دین کی تنفیذ کے لیے اپنے تن من دھن کی قربانی کے لیے بھی تیار ہیں یا نہیں —— اس کے لیے یہ ضرور ہے کہ اس فریضہ کی انجام دہی کے لیے ہمیں سیرت مطہرہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام میں جو تدریج ملتی ہے اسے ملحوظ رکھا جائے۔بصورت دیگر فساد رونما ہوجائے گا۔فتنہ اٹھ کھڑا ہوگا۔بارہ برس تک صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کو حضور ﷺ نے مار کھانے کی مشق کرائی ہے اور خود ماریں کھائی ہیں۔صحابہؓ نے نہایت بہیمانہ مظالم کو برداشت کیا ہے اور دشمنوں میں سے کسی کا بال تک بیکا نہیں کیا —— نہ یہ کیا کہ ہاتھ میں ہتھوڑا پکڑ کر خانہ کعبہ میں جو تین سو ساٹھ بت رکھے ہوئے تھے ان کو توڑنا شروع کردیتے —— پورے نظم وضبط کے ساتھ اپنے ہاتھ بندھے رکھے۔یہ تمام باتیں سیرت مطہرہ کی روشنی میں جملہ مراحل انقلابِ اسلامی کے بیان میں آٹھ دس تقریروں کے ذریعے آپ کے سامنے میں تفصیل سے بیان کرچکا ہوں۔(۱)

اسی نصرت کے تذکرہ کی آیت پر سورۃ الصف ختم ہوتی ہے۔وہاں بھی دو نصرتوں کا بیان ہے۔ایک اللہ کی نصرت دوسری رسول کی نصرت۔فرمایا: ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْٓا اَنْصَارَ اللّٰهِ﴾ ''اے اہل ایمان! اللہ کے مددگار بنو''۔یہاں زور دار دعوت کا اسلوب ہے۔آگے فرمایا: ﴿كَمَا قَالَ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ لِلْحَوَارِيّٖنَ مَنْ اَنْصَارِيْٓ اِلَى اللّٰهِ﴾۔جیسے کہ یاد کرو

(۱) الحمد للہ یہ تقاریر ''منہج انقلابِ نبوی ﷺ'' کے عنوان سے شائع ہوچکی ہیں (مرتب)

چھ سو برس قبل عیسیٰ ابن مریمؑ نے صدا لگائی تھی ——— حضورﷺ پر وحی کا آغاز ۶۱۰ عیسوی میں ہوا ہے۔ چنانچہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور حضورﷺ میں چھ صدیوں کا فصل ہے ——— تو فرمایا کہ جیسے آج ہمارا آخری رسول تمہیں پکار رہا ہے کہ مدد کرو اللہ کی اور مدد کرو میری۔ اسی طرح چھ سو برس قبل آواز لگی تھی اور حضرت عیسیٰؑ ابن مریم نے اپنے حواریین کو پکارا تھا کہ کون ہے میرا مددگار اللہ کی طرف' میں نے تو دعوت اِلی اللہ کا فیصلہ کر لیا ہے۔ میں تو اللہ کے دین کے قیام کی جدوجہد کے لیے آگے بڑھ رہا ہوں۔ اب کون ہے جو میرا مددگار اور ساتھی بنے۔ میرے اعوان وانصار میں شامل ہو۔ یہ ندا تھی حضرت مسیح علیہ السلام کی کہ ﴿مَنْ اَنْصَارِیْٓ اِلَی اللّٰہِ ؕ﴾۔ اللہ کے کام میں' اللہ کے دین کے لیے کون معین و معاون بنتا ہے۔ دیکھئے دو نسبتیں آ گئیں مَنْ اَنْصَارِیْٓ کون ہے میرا مددگار۔ اور 'اِلَی اللّٰہِ' اللہ کی طرف یعنی اللہ کے دین کے لیے—— اس کے بعد تاریخ کی ایک جھلک دکھائی گئی۔ تمہیں یاد ہے کہ حضرت عیسیٰؑ کی دعوت قبول کرنے والے کتنے کم تھے—— بارہ تو وہ تھے جن کو حواری کہا جاتا ہے اور جو ہر وقت آنجنابؑ کی خدمت میں حاضر رہتے تھے۔ ان میں سے ایک غداری کر گیا تھا۔ دوسرا پیٹر تھا جس نے جب بہت ہی وفاداری اور عقیدت مندی کا اظہار کیا تھا تو حضرت مسیحؑ نے فرمایا تھا کہ' پیٹر! صبح مرغ کی بانگ سے پہلے پہلے تم دو یا تین مرتبہ میرا انکار کرو گے''۔ تو جب حضرت عیسیٰ کو گرفتار کرنے کے لیے رومی فوج کے دستے نے ایک حواری کی غداری اور مخبری کی وجہ سے آپ کی پناہ گاہ پہنچ کر پکڑ دھکڑ شروع کی تو پیٹر جزع فزع کرنے لگا۔ اس نے آنجنابؑ سے بے تعلقی کا اظہار کیا' آپؑ کے حواری ہونے سے انکار کیا۔ یہ تمام باتیں موجودہ اناجیل میں مذکور ہیں۔ اب رہ گئے دس حواری تو حضرت مسیح کے رفع آسمانی (اور عیسائیوں کے بقول مصلوب ہونے) کے بعد ان سے اب جو دعوت شروع ہوئی تو اس نے جڑ پکڑنی شروع کی ان حواریوں پر ظلم وستم کے پہاڑ توڑے گئے۔ ان کی دعوت پر ایمان لانے والوں کو زندہ آگ میں جلایا گیا۔ لیکن حق کا چراغ روشن سے روشن تر ہوتا گیا۔ چنانچہ فرمایا: ﴿کَمَا قَالَ عِیْسَی ابْنُ مَرْیَمَ لِلْحَوَارِیّٖنَ مَنْ اَنْصَارِیْٓ اِلَی اللّٰہِ ؕ قَالَ الْحَوَارِیُّوْنَ نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰہِ فَاٰمَنَتْ طَّآئِفَۃٌ مِّنْۢ بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ وَکَفَرَتْ طَّآئِفَۃٌ ۚ﴾ ''جیسے کہ عیسیٰ نے پکارا حواریوں کو کہ کون ہے میرا مددگار اللہ کی طرف تو حواریوں نے لبیک کہا کہ ہم ہیں اللہ کے مددگار۔ پس بنی اسرائیل میں سے ایک گروہ ایمان لایا اور ایک گروہ نے کفر کی روش اختیار کی'' ﴿فَاَیَّدْنَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا عَلٰی عَدُوِّھِمْ﴾ ''پس ہم نے

ان اہل ایمان کی ان کے دشمنوں کے خلاف مدد کی'' ﴿فَاَصْبَحُوْا ظٰھِرِیْنَ ﴿۱۴﴾﴾ پھر وہی اہل ایمان غالب ہوئے'' ——— وہی بات آ گئی۔ اِنْ تَنْصُرُوا اللّٰہَ یَنْصُرْکُمْ ——— اور اِنْ یَّنْصُرْکُمُ اللّٰہُ فَلَا غَالِبَ لَکُمْ ۔

سورۃ الصّف کی اس آخری آیت میں اہل ایمان کے لیے اللہ کے دین کی نصرت کی پُرزور دعوت آ گئی۔ فرمایا جا رہا ہے کہ اے مسلمانو! تاریخ اپنے آپ کو دوہرا رہی ہے۔ پھر ہمارا رسول ہے جو تمہیں اللہ کے دین کی نصرت کے لیے پکار رہا ہے۔ آؤ اللہ کے دین توحید کے قیام ونفاذ کے لیے اس کے دست و بازو بنو ——— مجھے بے ساختہ اقبال کا یہ شعر یاد آ گیا۔

آگ ہے' اولادِ ابراہیم ہے' نمرود ہے
کیا کسی کو پھر کسی کا امتحاں مقصود ہے؟

تاریخ تو اپنے آپ کو دہراتی رہے گی۔ آج ہم میں سے ہر شخص کی سعادت اسی میں ہے کہ اس پکار کو کھلے کانوں سے سنے اور کھلے دل سے قبول کرے۔

یہ ہے وہ تیر بہدف (sure shot) اور مجرب نسخہ۔ تم اللہ کے دین کی مدد میں لگو' اللہ تمہارے دنیا کے تمام معاملات کا ذمہ خود لے گا:

﴿یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ تَنْصُرُوا اللّٰہَ یَنْصُرْکُمْ وَیُثَبِّتْ اَقْدَامَکُمْ﴾ ——— اور ﴿اِنْ یَّنْصُرْکُمُ اللّٰہُ فَلَا غَالِبَ لَکُمْ ۚ وَاِنْ یَّخْذُلْکُمْ فَمَنْ ذَا الَّذِیْ یَنْصُرُکُمْ مِّنْۢ بَعْدِہٖ ؕ﴾

بَارَکَ اللّٰہُ لِیْ وَلَکُمْ فِی الْقُرْاٰنِ الْعَظِیْمِ وَنَفَعَنِیْ وَاِیَّاکُمْ بِالْاٰیَاتِ وَالذِّکْرِ الْحَکِیْمِ

❁❁❁

باب چهارم

اِسلامی انقلاب

کی جدوجہد کے دو لازمی اجزاء:

(۱)

جہاد بالقرآن

(۲)

اِلتزامِ جماعت

و

لزومِ بیعت

☆

ڈاکٹر اسرار احمد

کی دو تقاریر جو

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

کے زیرِ اہتمام چھٹے سالانہ محاضراتِ قرآنی
منعقدہ ۲۵ تا ۲۷ مارچ ۱۹۸۴ء میں کی گئیں

(۱)

زیرِ صدارت: **مولانا سعید احمد اکبر آبادیؒ**

جہاد بالقرآن

(شائع شدہ 'میثاق' اگست و ستمبر ۱۹۸۴ء)

(۲)

التزامِ جماعت اور لزومِ بیعت

(شائع شدہ 'میثاق' اپریل ۱۹۸۵ء)

جہاد بالقرآن

ترتیب وتسوید: (شیخ) جمیل الرحمٰن

قال اللّٰہ تعالٰی عزوجل فی سورۃ الفرقان:

اعوذ باللّٰہ من الشَّیطٰن الرَّجیم ۔ بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

﴿فَلَا تُطِعِ الۡکٰفِرِیۡنَ وَجَاهِدۡهُمۡ بِهٖ جِهَادًا کَبِیۡرًا ۝﴾ صدق اللّٰہ العظیم

محترم صدرِ مجلس، مکرم علمائے عظام اور معزز حاضرین کرام:

آپ حضرات کو اخباری اعلان سے یہ علم ہو چکا ہے کہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کے زیر اہتمام ہونے والے اس چھٹے سالانہ محاضراتِ قرآنی میں مجھے بطور افتتاحیہ ''جہاد بالقرآن'' کے موضوع پر کچھ عرض کرنا ہے' چنانچہ میں نے اس وقت کی اپنی گفتگو کے عنوان کے طور پر سورۃ الفرقان کی آیت ۵۲ کی تلاوت کی ہے۔ اس میں نبی اکرم ﷺ سے اللہ تعالیٰ نے خطاب کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: ﴿فَلَا تُطِعِ الۡکٰفِرِیۡنَ﴾ ''(اے نبی ﷺ!) آپ ان کافروں کا کہنا بالکل نہ مانئے'' ﴿وَجَاهِدۡهُمۡ بِهٖ جِهَادًا کَبِیۡرًا ۝﴾ ''اور ان کے ساتھ مجاہدہ کیجیے' کشمکش کیجیے اس قرآن کے ذریعے سخت مجاہدہ اور شدید کشمکش''۔ چونکہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کا قیام اسی بنیاد پر عمل میں آیا تھا' چنانچہ اس کے زیر اہتمام دسمبر ۱۹۷۳ء سے مسلسل سات سال تک قرآن کانفرنسوں کے انعقاد کا سلسلہ جاری رہا اور لاہور اور کراچی میں بفضلہٖ تعالیٰ ہم نے سات نہایت عالی شان سالانہ قرآنی کانفرنسیں منعقد کیں۔ اس کے بعد بعض اسباب سے ہم نے عنوان بدلا جن میں سب سے بڑا سبب یہ تھا کہ جس کے متعلق میں سمجھتا ہوں کہ یہ ہمارے لیے باعث مسرت اور یہ بارگاہِ رب العزت میں ہماری ان حقیر کوششوں کے مقبول ہونے کا کسی درجہ میں سہی ایک مظہر بھی ہے کہ 'قرآن کانفرنس' کا لفظ اتنا

مقبول ہوا' اتنا معروف اور مشہور ہوا کہ جابجا نہ صرف متعدد قرآن کانفرنسیں' جنہیں بجا طور پر قرآن کانفرنسیں قرار دیا جا سکتا ہے' منعقد ہوئیں بلکہ بات یہاں تک جا پہنچی کہ اگر کسی تجوید کے مدرسہ کے سالانہ جلسۂ تقسیم اسناد کا انعقاد ہوا تو اس کا عنوان بھی 'قرآن کانفرنس' قرار دیا جانے لگا تو ہم نے پھر اس کو چھوڑ کر ''محاضراتِ قرآنی'' کی اصطلاح سے ان مجالس کے انعقاد کا سلسلہ شروع کیا۔ اس میں بنیادی طور پر پیش نظر یہ بات تھی کہ کانفرنسوں میں ایک طرف سامعین کا اور دوسری طرف مقررین کا جو ہجوم ہو جایا کرتا ہے اور تحریری مقالات وخطبات کی بجائے عام طور پر تقریریں زیادہ ہوتی ہیں' تو مطلوبہ مقاصد کماحقہٗ حاصل نہیں ہوتے۔ گو یقیناً اس سے یہ فائدہ تو حاصل ہوا کہ قرآن مجید لوگوں کی نظر و التفات کا نقطہ ماسکہ و ارتکاز (focus) بنا' اس کی طرف توجہات مرتکز ہوئیں' اس کی تلاوت کے ساتھ اس کے مطالعے' اس کی تعلیم وتعلم اور اس میں تفکر وتدبر کے شوق و ذوق میں اضافہ ہوا۔ میرے نزدیک الحمدللہ یہ بھی بہت بڑا کام ہے' لیکن تجربے سے معلوم ہوا کہ اس قسم کے جلسوں کی افادیت اتنی نہیں جتنی ایک پرسکون ماحول میں مقالہ پیش کیا جائے یا لیکچر دیا جائے' پھر اس پر گفتگو' مذاکرہ اور افہام و تفہیم کا بھی موقع ہو اس سے حاصل ہو سکتی ہے۔ اگرچہ میں اعتراف کرتا ہوں کہ محاضراتِ قرآنی سے جو مقصد حاصل کرنا پیش نظر تھا' تاحال اسے ہم پوری طرح روبعمل نہیں لا سکے ہیں لیکن اس مرتبہ ان شاء اللہ ان محاضرات کی ایک نشست اسی طرز پر منعقد ہو گی جس میں ''اجارہ کی شرعی حیثیت'' کے موضوع پر ایک مقالہ پیش ہو گا اور اس پر دیگر علمائے کرام اور اہل دانش وبینش کو گفتگو کا موقع فراہم کیا جائے گا تاکہ اس موضوع کے تمام جوانب واطراف کھل کر سامنے آ جائیں۔ بہرحال آج ہم اللہ تعالیٰ کی توفیق سے اس چھٹے محاضراتِ قرآنی کی پہلی نشست کا آغاز کر رہے ہیں جو برصغیر پاک و ہند کے مشہور ومعروف عالم دین' ممتاز شخصیت مولانا سعید احمد اکبر آبادی مدظلہ' ڈائریکٹر شیخ الہندؒ اکیڈمی دیوبند' رکن مجلس شوریٰ دارالعلوم دیوبند اور ایڈیٹر ماہنامہ برہان دہلی (بھارت) کی صدارت میں منعقد ہو رہی ہے۔ مولانا کی یہ بڑی کرم فرمائی ہے کہ پیرانہ سالی اور شدید مصروفیات کے باوجود وہ ہماری درخواست پر بھارت سے تشریف لائے اور ازراہِ تلطف وتعاون موصوف نے ان محاضرات کی تین نشستوں کی صدارت قبول فرمائی اور تین موضوعات پر اپنے گراں قدر ارشادات سے محاضرات کو مستفید فرمانے کی منظوری بھی عطا فرما دی جس کے لیے میں ذاتی طور پر اپنی جانب سے اور مرکزی انجمن خدام القرآن کی طرف سے' مزید جملہ شرکاءِ مجلس کی جانب سے مولانا موصوف کی خدمت میں دل کی

گہرائیوں کے ساتھ ہدیۂ تشکر پیش کرتا ہوں‘ یہ شکریہ محض رسمی نہیں ہے بلکہ نبی اکرم ﷺ کے اس ارشاد کی تعمیل میں خلوصِ دل کے ساتھ ہے کہ مَنْ لَمْ یَشْکُرِ النَّاسَ لَا یَشْکُرُ اللّٰہَ۔

درحقیقت یہ محاضراتِ قرآنی جہاد بالقرآن ہی کے سلسلے کی کڑیاں ہیں‘ لہٰذا میں نے مناسب سمجھا کہ میں اس نشست میں جہاد بالقرآن کے موضوع پر چند باتیں ابتدا میں عرض کر دوں۔ یہی باتیں درحقیقت مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کے تمام مقاصد کی نشاندہی بھی کریں گی اور اس کے لیے ہمارے استدلال کا جو صغریٰ کبریٰ ہے‘ ان شاء اللہ اس کو بھی سامنے لے آئیں گی۔

جس آیتِ مبارکہ کی میں نے تلاوت کی ہے‘ اس میں دو چیزیں نہایت اہم ہیں۔ ایک لفظ ''جہاد'' جو اِس آیتِ مبارکہ میں دو مرتبہ آیا ہے‘ ایک فعل امر کے طور پر ''جَاھِدْ'' اور دوسرے مفعول مطلق کے طور پر ''جِهَادًا كَبِيْرًا'' ـــــ یعنی نہ صرف جہاد بلکہ شدید جہاد‘ بہت بڑا جہاد۔ یہاں دوسرا اہم لفظ ''بِہٖ'' آیا ہے۔ اس آیت میں حکم دیا جا رہا ہے جناب محمد رسول اللہ ﷺ کو: ﴿وَجَاهِدْهُمْ بِهٖ جِهَادًا كَبِيْرًا﴾ ''آپؐ ان سے جہاد کیجیے اس (قرآن) کے ذریعے سے بہت بڑا جہاد''۔

یہاں ''بِہٖ'' کا جو چھوٹا سا ٹکڑا آیا ہے‘ میں معذرت کے ساتھ عرض کرتا ہوں کہ اکثر و بیشتر ہمارے اہلِ علم حضرات بھی اس کی اہمیت پر غور و فکر کیے بغیر سرسری طور پر گزر جاتے ہیں۔ میرا مشاہدہ ہے کہ جہاں بھی قرآن کے لیے ''بِہٖ'' بطور ضمیر مجرور آیا ہے‘ ہمارے اہل علم‘ اِلا ماشاء اللہ‘ اس کا حق ادا نہیں کرتے۔

اس ''بِہٖ'' کی اہمیت کے اظہار کے لیے دو مثالیں پیش کرتا ہوں۔

پہلی مثال سورۂ بنی اسرائیل سے ہے‘ جہاں فرمایا: ﴿وَمِنَ الَّيْلِ فَتَهَجَّدْ بِهٖ نَافِلَةً لَّكَ ﴾ (آیت ۷۹) ''اور (اے نبی ﷺ!) کچھ رات جاگتے رہیے اس (قرآن) کے ساتھ‘ یہ بڑھوتری ہے آپؐ کے لیے''۔ میرا اندازہ ہے کہ تہجد کی فضیلت‘ اس کی اہمیت اور اس کا مقام و مرتبہ تو ہمارے یہاں معروف اور مشہور ہے‘ کسی کو اس کی توفیق ملی ہو یا نہ ملی ہو‘ لیکن اس کی عظمت اور برکات سے ہر وہ مسلمان بخوبی واقف ہو گا جس کا تھوڑا بہت بھی دینی مزاج ہے۔ لیکن یہاں بھی ''بِہٖ'' پر اتنی توجہ نہیں ہوتی جتنی ہونی چاہیے۔ تہجد میں اہم ترین شے قیام‘ وہ بھی طویل قیام‘ اور اس میں ترتیل کے ساتھ تلاوتِ قرآن ہے:

﴿يٰٓاَيُّهَا الْمُزَّمِّلُ ۝ قُمِ الَّيْلَ اِلَّا قَلِيْلًا ۝ نِّصْفَهٗٓ اَوِ انْقُصْ مِنْهُ قَلِيْلًا ۝

اَوْ زِدْ عَلَيْهِ وَرَتِّلِ الْقُرْاٰنَ تَرْتِيْلًا ۝﴾ (المزّمل)

''اے اوڑھ لپیٹ کر سونے والے! رات کو نماز میں کھڑے رہا کرو‘ مگر کم‘ آدھی رات‘ یا اس سے کم کر لو‘ یا اس سے کچھ زیادہ بڑھا دو‘ اور قرآن کو خوب ٹھہر ٹھہر کر پڑھو''۔

لیکن ہوتا یہ ہے کہ جو لوگ اس کا اہتمام کرتے ہیں عموماً وہ عام نوافل کی طرح آٹھ رکعتیں پڑھ لیتے ہیں‘ پھر بیٹھ کر مختلف اوراد و وظائف میں مشغول ہو جاتے ہیں اور زیادہ وقت اس میں صرف کرتے ہیں (الا ماشاء اللہ)۔ یہ بھی بہت غنیمت ہے‘ لیکن اس کی برکات سے کما حقہٗ استفادہ تب ہو گا جب اِس میں طویل قیام ہو اور اس میں ترتیل کے ساتھ قرآنِ مجید کی تلاوت ہو۔

دوسری مثال سورۂ مریم کی ہے‘ جہاں فرمایا:

﴿فَاِنَّمَا يَسَّرْنٰهُ بِلِسَانِكَ لِتُبَشِّرَ بِهِ الْمُتَّقِيْنَ وَتُنْذِرَ بِهٖ قَوْمًا لُّدًّا ۝﴾

''پس یقیناً (اے نبی ﷺ!) اس کلام کو ہم نے تمہاری زبان میں آسان کر کے نازل کیا ہے‘ تاکہ تم اس (قرآن) کے ذریعے پرہیزگاروں کو خوشخبری دے دو اور ہٹ دھرم لوگوں کو اس کے ذریعے سے خبردار کرو''۔

یہاں بھی غور فرمائیے کہ تبشیر و انذار کے لیے قرآن مجید ہی کو ذریعہ قرار دیا گیا ہے۔ لیکن ہوتا کیا ہے! یہ کہ ہمارے یہاں وعظوں اور خطبوں میں اکثر و بیشتر یہ کام اولیاء اللہ کے تذکروں یا مولانا رومؒ کی مثنوی سے لیا جاتا ہے۔ قرآن کی طرف بہت ہی کم توجہ دی جاتی ہے۔ بعینہٖ یہی معاملہ زیرِ نظر آیتِ کریمہ کا ہے: ﴿وَجَاهِدْهُمْ بِهٖ جِهَادًا كَبِيْرًا﴾ معلوم ہوا کہ یہاں جس جہاد کا حکم دیا جا رہا ہے اس شد و مد کے ساتھ‘ اس اہتمام کے ساتھ‘ اس تاکید و زور (emphasis) کے ساتھ‘ تو اس کے لیے ایک ذریعہ‘ ایک آلہ‘ ایک ہتھیار ہے جو جناب محمد رسول اللہ ﷺ کو عطا ہوا ہے۔ اس کے لیے بھی ایک تلوار ہے جو آپؐ کے دستِ مبارک میں تھمائی گئی ہے اور وہ ہے قرآن حکیم۔ لہٰذا ارشاد ہوا: ''اور (اے نبی ﷺ!) ان (مشرکین و کفار) کے ساتھ جہاد کیجیے اس (قرآن) کے ذریعے سے بہت بڑا جہاد''۔

جہاد اور قرآن: دو مظلوم ترین حقیقتیں

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ آگے بڑھنے سے قبل یہاں لفظ ''جہاد'' کی تھوڑی سی وضاحت کر دی جائے۔ پہلی بات یہ کہ میرے نزدیک جہاد ہمارے دین کا مظلوم ترین تصور (concept) ہے۔ مظلوم ہونے کے اعتبار سے اس کے ہم پلہ دوسری شے جو آتی ہے وہ

قرآن ہے۔ ہمارے دین کی یہ دو مظلوم ترین حقیقتیں ہیں۔ جہاد کے بارے میں اتنے مغالطے ذہنوں میں ہیں کہ حد و شمار نہیں۔ پھر خاص طور پر ہماری تاریخ میں ایک دور وہ بھی آیا کہ جب ہم براہِ راست محکوم ہوئے، نہ صرف سیاسی اعتبار سے بلکہ ذہنی وفکری اعتبار سے بھی۔ یعنی ہم دو طرفہ غلامی کے پنجے میں گرفتار ہوئے۔ اُس وقت اہل مغرب کی طرف سے ہم پر جہاد کے حوالے سے بڑے جارحانہ حملے ہوئے اور استہزاء و تمسخر کا معاملہ ہوا۔ انہی کا یہ الزام ہے کہ:
ع ''بوئے خوں آتی ہے اِس قوم کے افسانوں سے!'' چنانچہ اس ضمن میں ہمارا انداز معذرت خواہانہ (apologetic) رہا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اگرچہ اب یہ دَور اصلاً گزر چکا ہے، لیکن تا حال اس کے باقیات السیّئات کچھ لوگوں کے ذہنوں میں موجود ہیں، اور جب تک ہم اُن کو اچھی طرح کھرچ نہیں دیں گے اُس وقت تک دین کی کوئی مثبت، پائیدار اور فعال تحریک جو نتیجہ خیز بھی ہو، اٹھانا ممکن نہیں ہوگا۔

دوسری بات یہ کہ جہاد کے بارے میں سب سے پہلا مغالطہ ذہنوں میں یہ بٹھا دیا گیا اور اس کے نتائج بہت دُوررس ہیں کہ جہاد کے معنی ''جنگ'' ہیں۔ اس بارے میں میری رائے ہے کہ اغیار اور بیگانوں کی کارستانی کے ساتھ ساتھ یگانوں اور اپنوں کی بھی غلطیاں ہیں۔ اپنوں کی بڑی اکثریت نے بھی جہاد کو ''جنگ'' ہی قرار دیا جب کہ قرآن مجید مستقل طور پر دو اصطلاحات استعمال کرتا ہے، ایک ''جہاد فی سبیل اللہ'' اور دوسری ''قتال فی سبیل اللہ''۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ اکثر و بیشتر ہمارے دینی لٹریچر میں جنگ کے تمام مدارج و مراحل کے لیے بطورِ عنوان لفظ جہاد استعمال ہو جاتا ہے اور جنگ کو ''جہاد'' ہی سے موسوم کیا جاتا ہے۔ چنانچہ ہوتے ہوتے ہمارے ذہنوں میں جہاد اور قتال مترادف کی حیثیت سے جاگزیں ہو گئے اور عام طور پر یہ سمجھا جانے لگا کہ جہاد کے معنی جنگ ہیں۔

تیسری بات یہ کہ ظاہر ہے جنگ ہر وقت اور ہمیشہ تو نہیں ہوتی، لہٰذا جہاد فرضِ کفایہ رہ گیا اور فرضِ عین کی فہرست سے خارج ہو گیا۔ جب کبھی جنگ کا مرحلہ آتا تھا تو جتنی نفری کی ضرورت ہوتی تھی وہ نکل آتی تو بقیہ لوگوں کی طرف سے وہ فرض ادا ہو جاتا تھا۔ یہی فرضِ کفایہ کا تصور ہے اور بالکل صحیح تصور ہے۔ لیکن جہاد و قتال کو مترادف سمجھ لینے کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہمارے یہاں جو فقہی تصورات و معیارات اور سوچ کے جو پیمانے ہیں ان میں جہاد گویا صفِ اوّل کی شے رہا ہی نہیں۔ اس کا فرضِ عین ہونا پس منظر میں چلا گیا، حتیٰ کہ ذہنوں سے اَوجھل اور محو ہو گیا۔ اِلا ماشاءاللہ!

چوتھی بات یہ کہ اس پر ستم بالائے ستم اور بناءالفاسد علی الفاسد یہ ہوا کہ ہم نے یہ تصور کر لیا کہ مسلمان جب بھی جنگ کرے تو گویا وہ جہاد فی سبیل اللہ کر رہا ہے۔ حالانکہ ایک مسلمان ذاتی حیثیت سے جہاں فاجر و فاسق ہو سکتا ہے وہاں ظالم بھی ہو سکتا ہے۔ چنانچہ مسلمانوں کا کوئی بادشاہ یا کوئی سربراہ یا کوئی گروہ ظالم بھی ہو سکتا ہے اور ایک ناحق جنگ بھی شروع کر سکتا ہے، صرف اپنے مفادات کے لیے، صرف اپنے اقتدار کو وسعت دینے کے لیے، اپنی حدودِ سلطنت کی توسیع کے لیے، جبکہ اُن کے پیش نظر دین کی کوئی خدمت نہ ہو، اعلائے کلمۃ اللہ کا کوئی مقصد نہ ہو۔ ظاہر ہے کہ ایسی جنگ جہاد یا قتال فی سبیل اللہ کیونکر شمار ہو جائے گی، جبکہ ہمارے سامنے نبی اکرم ﷺ کی یہ واضح حدیث موجود ہے:

عَنْ اَبِیْ مُوْسٰی رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ قَالَ جَآءَ رَجُلٌ اِلَی النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَقَالَ: اَلرَّجُلُ یُقَاتِلُ لِلْمَغْنَمِ وَالرَّجُلُ یُقَاتِلُ لِلذِّکْرِ وَالرَّجُلُ یُقَاتِلُ لِیُرٰی مَکَانُہٗ فَمَنْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ؟ قَالَ: ((مَنْ قَاتَلَ لِتَکُوْنَ کَلِمَۃُ اللّٰہِ ھِیَ الْعُلْیَا فَھُوَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ)) [1]

حضرت ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ کے پاس ایک شخص آیا، اس نے دریافت کیا کہ حضور! ایک شخص جنگ کرتا ہے مالِ غنیمت کے لیے، ایک شخص جنگ کرتا ہے اپنے ذکر اور شہرت کے لیے اور ایک شخص جنگ کرتا ہے اپنی (یا اپنے قبیلہ کی) سربلندی دیکھنے کے لیے، تو کس کی جنگ اللہ کے راستے میں ہوگی؟ حضورؐ نے (جواب میں) ارشاد فرمایا: ''صرف اس کی جنگ فی سبیل اللہ ہوگی جو اس لیے جنگ کرے تاکہ اللہ کا کلمہ سب سے بلند ہو جائے۔''

خیال رہے کہ یہ حدیث متفق علیہ ہے۔ تو قتال فی سبیل اللہ وہ جنگ ہے جو اللہ کے جھنڈے کی سربلندی کے لیے کی جائے، نہ کہ ہر مسلمان کی یا مسلمانوں کی حکومت کی ہر نوع کی جنگ جہاد و قتال فی سبیل اللہ قرار دی جائے گی۔ بہرحال یہ ہیں وہ مغالطے جو کچھ تو اغیار کی کرم فرمائی سے اور کچھ اپنوں کی ستم ظریفی سے تہہ در تہہ ذہنوں میں بیٹھ گئے ہیں۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ اس تصور کو نکھار کر سامنے لایا جائے کہ جہاد فی سبیل اللہ درحقیقت ہے کیا، اور جہاد فی سبیل اللہ اور قتال فی سبیل اللہ میں فرق کیا ہے!

---

(۱) صحیح البخاری، کتاب الجھاد والسیر، باب من قاتل لتکون کلمۃ اللّٰہ ھی العلیا۔ وصحیح مسلم، کتاب الامارۃ، باب من قاتل لتکون کلمۃ اللّٰہ ھی العلیا ......

میں نے اس پر بہت غور کیا کہ ایک عام اردو دان کے لیے وہ لفظ کون سا ہو گا جو لفظ جہاد کے مفہوم کو صحیح صحیح ادا کر دے۔ اہلِ علم جانتے ہیں کہ لفظ جہاد بابِ مفاعلہ سے ہے اور باب مفاعلہ کے اکثر مصادر میں فریقین کی شرکت ہوتی ہے۔ پھر ایک دوسرے پر غالب آنے کا مفہوم بھی اس میں شامل ہوتا ہے' جیسے بحث سے مباحثہ' جہد سے مجاہدہ اور جہاد' اور قتل سے مقاتلہ اور قتال۔ قتال میں بات دوطرفہ ہو جاتی ہے جبکہ قتل یک طرفہ عمل ہے۔ کوئی شخص جا رہا ہے' کسی نے گولی مار دی یا خنجر گھونپ دیا درآنحالیکہ اس کے سان گمان میں بھی نہیں تھا کہ میرے ساتھ یہ حادثہ ہو جائے گا' یہ قتل ہے۔ لیکن جب دو فریق آمنے سامنے ہو کر ایک دوسرے کو قتل کرنے کے درپے ہو جائیں تو یہ ان فریقین کے مابین قتال یا مقاتلہ ہے۔ اسی طرح جہد کا عمل ہے۔ یہ عام فہم لفظ ہے اور اردو میں کوشش کے معنی میں مستعمل ہے۔ اس سے جہاد و مجاہدہ کے معنی و مفہوم ہوں گے کوششوں کا تصادم' کوششوں کا ٹکراؤ' کوششوں کا مقابلہ ——— جس کے لیے ایک لفظ ہو گا ''کشمکش'' یا ''کشاکش''۔ انگریزی میں اسے کہیں گے: struggle۔ آپ کو معلوم ہو گا کہ اس کے بعد صلہ (preposition) کے طور پر against کا لفظ آتا ہے۔ یعنی کوئی رکاوٹ ہے' کوئی چیز درمیان میں راستہ روکنے والی ہے تو اسے ہٹانے اور دُور کرنے کے لیے اس سے کشمکش کرنا۔ درحقیقت جہاد یا مجاہدہ کا صحیح صحیح لغوی مفہوم یہی ہے۔

فرائضِ دینی اور جہاد کی منازل

میں اختصار کے ساتھ آپ کے سامنے اپنے غور و فکر کے نتائج پیش کرنا چاہتا ہوں۔ اس مسئلہ پر غور و فکر کے نتیجے میں جہاد کے تین بڑے بڑے درجے اور ہر درجہ کے تین پہلو یا تین قسمیں میرے سامنے آئی ہیں ——— میں ان کو اہلِ علم کے سامنے ان کی تائید و توثیق یا اصلاح کے لیے پیش کر رہا ہوں۔ میں قرآن مجید کا ادنیٰ طالب علم ہوں' مجھے اہلِ علم کی رہنمائی حاصل ہونے پر دلی مسرت ہو گی۔ میں خلوصِ دل سے یہ بات کہہ رہا ہوں کہ مجھ پر میری غلطی واضح کر دی جائے تو میں سرِتسلیم خم کرنے میں ایک لمحہ کے لیے بھی تردّد نہیں کروں گا' بلکہ غلطی کی نشاندہی کرنے والے صاحب کا صمیمِ قلب سے احسان مند ہوں گا۔

میرے نزدیک یہ تین بڑے بڑے درجے ان بنیادی فرائض سے متعلق ہیں جو ہمارا دین اپنے ماننے والوں پر عائد کرتا ہے۔ دین کی طرف سے ہر مسلمان پر جو تین بنیادی فرائض عائد ہوتے ہیں ان کی بنیادی تفہیم کے لیے ایک تین منزلہ عمارت کی تمثیل یا تشبیہہ بہت ہی مفید ہے۔

پہلی منزل: عبادتِ ربّ

فرائضِ دینی کی پہلی منزل ہے خود اللہ کا بندہ بننا۔ اور یہ بندگی ہمہ وجوہ' ہمہ تن اور ہمہ وقت ہو گی' جزوی نہیں ہو گی۔ قرآن میں فرمایا گیا ہے:

﴿یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِی السِّلْمِ كَآفَّةً﴾ (البقرة:۲۰۸)

''اے ایمان والو! اسلام میں داخل ہو جاؤ پورے کے پورے۔''

ایک اور جگہ فرمایا:

﴿وَاَنِیْبُوْۤا اِلٰی رَبِّكُمْ وَاَسْلِمُوْا لَهٗ مِنْ قَبْلِ اَنْ یَّاْتِیَكُمُ الْعَذَابُ ثُمَّ لَا تُنْصَرُوْنَ۝۵۴﴾ (الزمر)

''اور اپنے ربّ کی طرف رجوع کرو اور اس کی فرمانبرداری قبول کر لو (اس کے سامنے سرِتسلیم خم کر دو) اس سے پہلے پہلے کہ تم پر عذاب آ جائے' پھر تمہاری کوئی مدد نہیں کی جائے گی۔''

اس رویہ کا دینی اصطلاح میں نام ہے اسلام' سرِتسلیم خم کرنا' گردن نہادن' to surrender۔ اسی کے لیے مزید دو اصطلاحات ہیں: اطاعت اور تقویٰ۔ اطاعت کا مفہوم ہے مقاومت و مدافعت ترک کر کے برضا و خوشی فرمانبرداری قبول کر لینا' جس کے لیے قرآن مجید میں بار بار حکم دیا گیا: ﴿اَطِیْعُوا اللّٰهَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ﴾ ''اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول (ﷺ) کی''۔ اسے انگریزی میں یوں کہیں گے:

"To give up all kinds of resistance whole heartedly."

یعنی ''خوش دلی سے ہر نوع کی مقاومت و مزاحمت ترک کر دینا۔''

جبکہ ''تقویٰ'' کا مفہوم ہے اللہ کے احکام کو توڑنے سے بچنا' اس کی نافرمانی سے باز رہنا۔ تقویٰ کا حکم قرآن مجید میں بڑی تکرار اور تاکید سے آیا ہے۔ اس ضمن میں چوٹی کی آیت ہے:

﴿یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ۝﴾ (آل عمران)

''اے اہلِ ایمان! اللہ کا تقویٰ اختیار کرو جیسا کہ اس کے تقویٰ کا حق ہے اور تم پر موت نہ آئے مگر حالت فرمانبرداری میں۔''

اطاعت اور تقویٰ میں بالترتیب مثبت اور منفی رویہ سامنے آتا ہے۔ بات ایک ہی ہے۔ گویا ایک ہی تصویر کے دو رُخ ہیں۔

اس پہلی منزل کے لیے چوتھی اور آخری جامع ترین اصطلاح ہے ''عبادت''۔ اس میں اسلام' اطاعت اور تقویٰ کے تمام مفاہیم آ جاتے ہیں۔ اس لفظِ عبادت کے سمجھنے کے لیے فارسی کے دو الفاظ کو جو اردو میں مستعمل ہیں' جمع کریں گے تو مفہوم ذہن نشین ہو جائے گا۔ وہ الفاظ ہیں ''بندگی'' اور ''پرستش''۔ بندگی غلامی کو کہتے ہیں اور اس میں اطاعت کا پہلو غالب ہے' جبکہ پرستش کے معنی ہیں مخلصانہ اور والہانہ محبت۔ سورۃ الزمر میں نبی اکرمﷺ کو مخاطب کر کے فرمایا گیا: ﴿فَاعْبُدِ اللّٰهَ مُخْلِصًا لَّهُ الدِّيْنَ ۞﴾ ''پس (اے نبیﷺ!) اللہ کی بندگی کیجیے اس کے لیے اپنی اطاعت کو خالص کرتے ہوئے''۔ پھر سورۃ البیّنۃ میں ان دونوں کو نہایت حسین و جمیل اسلوب بیان میں بایں طور جمع کر دیا گیا: ﴿وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ ۙ حُنَفَآءَ......﴾ (آیت ۵) ''اور اُن کو اِس کے سوا کوئی حکم نہیں دیا گیا تھا کہ اللہ کی بندگی کریں اپنے دین (اطاعت) کو اس (اللہ تعالیٰ) کے لیے خالص کرتے ہوئے' بالکل یکسو ہو کر''۔ قرآن مجید میں جن و انس کی تخلیق کی غایت یہی عبادتِ ربّ قرار دی گئی ہے' از روئے آیت مبارکہ: ﴿وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ ۞﴾ (الذّٰریٰت) ''میں نے جنوں اور انسانوں کو فقط اپنی بندگی کے لیے تخلیق کیا ہے''۔

فرائض دینی کی اس پہلی منزل کو سر کرنے کے لیے ایک بندۂ مؤمن کو سہ گونہ جہاد کرنا پڑے گا' یعنی مجاہدہ و کشمکش کرنی پڑے گی۔

پہلی منزل کے تین جہاد

اس پہلی منزل پر سب سے پہلے کشمکش کرنی پڑے گی اپنے نفس سے۔ نفس کے متعلق قرآن میں فرمایا گیا ہے: ﴿اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَةٌۢ بِالسُّوْٓءِ﴾ (یوسف:۵۳) ''یقیناً نفس تو بدی پر اکساتا ہی ہے''۔ ''اَمَّارَةٌ'' اَمر سے مبالغہ کا صیغہ ہے' یعنی بہت ہی زیادہ اُکسانے والا' نہایت سختی سے حکم دینے والا۔ لہٰذا اللہ کا بندہ بننے کے لیے پہلی کشمکش خود اپنے نفس کے ساتھ کرنی پڑے گی۔ ایک حدیث میں نفس کے خلاف جہاد کو ایک اعتبار سے ''افضل الجہاد'' قرار دیا گیا ہے۔ حضرت ابوذر غفاریؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہﷺ نے ارشاد فرمایا: ((اَفْضَلُ الْجِهَادِ اَنْ تُجَاهِدَ نَفْسَكَ وَهَوَاكَ فِيْ ذَاتِ اللّٰهِ تَعَالٰى)) (۱) ''افضل جہاد یہ ہے کہ تم اپنے نفس اور اپنی خواہشات کو اللہ کا مطیع بنانے کے لیے ان کے خلاف جہاد کرو''۔ حضرت

(۱) رواہ الدیلمی' بحوالہ کنز العمال ۲۶۹/۴۔

فضالہ بن عبیدؓ روایت کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہﷺ کو یہ ارشاد فرماتے ہوئے سنا: ((اَلْمُجَاهِدُ مَنْ جَاهَدَ نَفْسَهٗ)) (۱) ''اصل مجاہد وہ ہے جو اپنے نفس کے ساتھ جہاد کرے''۔ پس پہلی کشمکش ہر اُس شخص کو اپنے نفس سے کرنا ہو گی جو واقعتاً اللہ کا بندہ بننا چاہتا ہے۔ اسی نفس کے متعلق مولانا رومؒ نے کیا خوب بات کہی ہے:

نفس ما ہم کمتر از فرعون نیست
لیکن اُو را عون ایں را عون نیست!

یعنی میرا یہ نفس بھی فرعون سے کم نہیں ہے۔ فرق بس اتنا ہے کہ فرعون کے پاس لاؤلشکر تھا لیکن اس کے پاس لاؤلشکر نہیں ہے' ورنہ میرا نفس اندر سے وہی کچھ دعویٰ کر رہا ہے جو فرعون نے کیا تھا۔ اس کا دعویٰ تھا ملکِ مصر کے بارے میں: ﴿اَلَيْسَ لِيْ مُلْكُ مِصْرَ﴾ (الزخرف:۵۱) ''کیا مصر کی بادشاہت میری نہیں ہے؟'' اسی طرح میرا نفس میرے وجود پر حکومت کا دعوے دار ہے۔ پس سب سے پہلا اور سب سے بڑا جہاد ''مجاہدہ مع النفس'' ہے۔ جس نے اس منزل کو سر نہیں کیا اور وہ آگے بڑھنے کی کوشش کر رہا ہے تو میرے نزدیک اس کے لیے ہلکے سے ہلکا لفظ ''حماقت'' ہے۔

نفس امارہ کو تقویت دینے کے لیے ایک طاقت موجود ہے' وہ ہے شیطانِ لعین اور اس کی صلبی و معنوی ذریت۔ اس کا کام ہی یہ ہے کہ وہ اس نفس کو تقویت پہنچائے' اس میں پھونکیں مارے اور اس میں جتنے بھی سفلی محرکات ہیں انہیں مشتعل کرے۔ ایک حدیث کی ابتدا میں الفاظ آتے ہیں:

((اِنَّ اِبْلِيْسَ لَهٗ خُرْطُوْمٌ كَخُرْطُوْمِ الْكَلْبِ وَاضِعُهٗ عَلٰى قَلْبِ ابْنِ آدَمَ يُذَكِّرُهٗ بِالشَّهَوَاتِ وَاللَّذَّاتِ وَيَاْتِيْهِ بِالْاَمَانِيِّ وَيَاْتِيْهِ بِالْوَسْوَسَةِ عَلٰى قَلْبِهٖ لِيُشَكِّكَهٗ فِيْ رَبِّهٖ)) (۲)

''ابلیس کی بھی تھوتھنی ہے کتے کی تھوتھنی کی طرح۔ وہ اسے ابن آدم کے دل پر رکھ دیتا ہے اور اسے خواہشاتِ نفس اور مرغوب چیزوں پر اُبھارتا ہے' وہ اس کو لمبی لمبی امیدیں (wishful thinkings) دلاتا اور اس کے دل میں وسوسے پیدا کرتا ہے' تاکہ اسے اپنے ربّ کے بارے میں شکوک و شبہات میں مبتلا کر دے''۔

(۱) سنن الترمذی' ابواب فضائل الجہاد۔
(۲) رفع البأس عن حدیث النفس للشوکانی' ح: ۴۰' راوی: معاذ بن جبلؓ۔

ایک اور متفق علیہ حدیث ہے:

((اِنَّ الشَّیْطٰنَ یَجْرِیْ مِنَ الْاِنْسَانِ مَجْرَی الدَّمِ))(۱)

''شیطان انسان کے اندر خون کی مانند دوڑتا ہے۔''

قرآن مجید میں مختلف اسالیب سے بے شمار مقامات پر شیطان کے اغوا اور فریب سے خبردار اور متنبہ کیا گیا ہے۔ ایک مقام پر فرمایا: ﴿اِنَّ الشَّیْطٰنَ لَکُمْ عَدُوٌّ فَاتَّخِذُوْہُ عَدُوًّا ط﴾ (فاطر:۶) ''(لوگو!) یقیناً شیطان تمہارا دشمن ہے' پس تم بھی اسے دشمن سمجھو (دشمن جانو)''۔

اور سورۃ الکہف میں بڑا پیارا انداز ہے' جس میں ایک لطیف سا طنز بھی موجود ہے۔ فرمایا:

﴿وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِکَۃِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِیْسَ ط کَانَ مِنَ الْجِنِّ فَفَسَقَ عَنْ اَمْرِ رَبِّہٖ ط اَفَتَتَّخِذُوْنَہٗ وَذُرِّیَّتَہٗٓ اَوْلِیَآءَ مِنْ دُوْنِیْ وَھُمْ لَکُمْ عَدُوٌّ ط بِئْسَ لِلظّٰلِمِیْنَ بَدَلًا ۝﴾

''اور (یاد کرو) جب ہم نے فرشتوں سے کہا کہ آدم کو سجدہ کرو تو انہوں نے سجدہ کیا سوائے ابلیس کے۔ وہ جنوں میں سے تھا' سو اُس نے اپنے ربّ کے حکم سے روگردانی کی۔ کیا تم مجھے چھوڑ کر اس کو اور اس کی ذریت (صلبی و معنوی) کو اپنا دوست بناتے ہو؟ حالانکہ وہ تمہارے دشمن ہیں۔ ایسے ظالموں کے لیے بہت ہی برا بدلہ ہے۔''

چنانچہ کشمکش کرنا ہوگی' مجاہدہ کرنا ہوگا شیطان اور اس کی صلبی و معنوی ذریت کے ساتھ اور اس کو شکست دینا ہوگی۔ اس لفظ ''شکست'' سے میرا ذہن اچانک علامہ اقبال کے فارسی کلام میں اُن کی نظم ''نالۂ ابلیس'' کی طرف منتقل ہوا جو مجھے بہت پسند ہے۔ شیطان اللہ تعالیٰ سے فریاد کرتا ہے کہ پروردگار! یہ انسان تو میری چوٹ کا نہیں' میرے مقابلے کا نہیں' ایک مشتِ خس ہے جس کے لیے میری ایک چنگاری کافی ہے۔ اس انسان کو اگر سوکھی گھاس ہی بنانا تھا تو مجھ میں اس قدر تیز و تند آگ رکھنے کا کیا فائدہ ہوا!

ابن آدم چیست؟ یک مشتِ خس است!   مشتِ خس را یک شرار از من بس است

(۱) صحیح البخاری' کتاب الاعتکاف' باب زیارۃ المرأۃ زوجھا فی اعتکافہ۔ اس کے علاوہ صحیح بخاری میں یہ حدیث متعدد مقامات پر الفاظ کی کمی بیشی کے ساتھ متعدد طرق سے وارد ہوئی ہے۔ وصحیح مسلم' کتاب السلام' باب بیان انہ یستحب لمن رؤی خالیا بامرأۃ وکانت زوجتہ او محرما لہ ان یقول : ھذہ فلانۃ' لیدفع ظن السوء بہ۔ وسنن ابی داوٗد' کتاب الصیام' باب المعتکف یدخل البیت لحاجتہ۔

اندریں عالم اگر جز خس نبود   ایں قدر آتش مرا دادن چہ سود؟

نظم کا آخری شعر تڑپا دینے والا ہے۔

اے خدا یک زندہ مردِ حق پرست   لذتے شاید کہ یابم در شکست!

''الٰہی! کوئی تو زندہ مردِ حق پرست ایسا ہو جو مجھے شکست دے دے' تاکہ میں بھی تو کبھی شکست کا لذت آشنا ہو سکوں۔''

تو دوسری کشمکش اور دوسرا مجاہدہ یہ ہوگا۔

تیسری کشمکش ایک بگڑے ہوئے معاشرے کا جو سماجی دباؤ (social pressure) ہے' اس سے ہوگی۔ معاشرے کا دباؤ آپ کو ایک خاص رُخ پر دھکیلے گا۔ اس لیے کہ ایک ہجوم جس سمت میں جا رہا ہو اُس سمت میں چلنا بہت آسان ہے۔ آپ کو کوئی زور نہیں لگانا پڑے گا' وہ آپ کو خود دھکیل کر لے جائے گا۔ ع

زمانہ با تو نسازد تو با زمانہ بساز!

''زمانہ تمہارے ساتھ موافقت نہیں کرتا تو تم اس کے ساتھ موافقت کر لو!''

اس طرح کوئی تصادم نہیں ہوگا' کوئی کشمکش نہیں ہوگی' کوئی مزاحمت نہیں ہوگی۔ دُنیوی نقطۂ نظر سے عافیت اسی میں ہے' چین اور سکون سے زندگی بسر ہوگی کہ زمانہ تم سے موافقت نہیں کر رہا تو تم زمانے کے ساتھ موافقت کر لو۔ لیکن غیرت وحمیت کا تقاضا بالکل برعکس ہے ع

زمانہ با تو نسازد تو با زمانہ ستیز!

''زمانہ تم سے موافقت نہیں کرتا تو تم اس سے لڑو!''

پس دینی فرائض کی پہلی منزل پر تین اطراف و جوانب میں یہ تین کشمکشیں ہیں جو ہر اُس شخص کو کرنی ہوں گی جو واقعتاً اللہ کا بندہ بننے کا ارادہ اور عزم رکھتا ہو۔

دوسری منزل: شہادت علی الناس

فرائض دینی کی دوسری منزل ہے اس دین کو عام کرنا' دوسروں تک پہنچانا' اسے پھیلانا۔ اس کے لیے چار اصطلاحات اہم ہیں۔ پہلی دو اصطلاحات ہیں: ''تبلیغ'' اور ''دعوت''۔ یہ بھی اطاعت و تقویٰ کی طرح تصویر کے دو رُخ اور مثبت و منفی مفہوم کے حامل الفاظ ہیں۔ تبلیغ سے مراد پہنچانا اور دعوت سے مراد لوگوں کو کھینچ کر راہِ حق پر لے آنا ہے۔ یہ بھی ایک ہی عمل کے دو رُخ ہیں۔ تبلیغ کے لیے نبی اکرمﷺ کو یہ تاکیدی حکم ہوا:

﴿یٰٓـاَیُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَیْکَ مِنْ رَّبِّکَ ط وَاِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهٗ ط﴾ (المائدة:٦٧)

''اے رسول (ﷺ)! پہنچائیے جو آپ کی طرف آپ کے ربّ کی جانب سے نازل ہوا ہے۔ اور اگر آپ نے ایسا نہ کیا تو (گویا) اپنی رسالت کا حق ادا نہ کیا۔''

نبی اکرم ﷺ نے حجۃ الوداع میں اُمّت کو جو آخری تاکیدی حکم دیا وہ اسی تبلیغ کا تھا۔ فرمایا: ((فَلْیُبَلِّغِ الشَّاهِدُ الْغَائِبَ)) (۱) ''پس جو موجود ہے (مخاطب ہے) اسے چاہیے کہ (یہ پیغام) اس کو پہنچائے جو یہاں موجود نہیں ہے!'' مزید برآں آنحضور ﷺ نے یہ فرما کر ہر مسلمان کے لیے فریضۂ تبلیغ آسان ترین فرما دیا: ((بَلِّغُوْا عَنِّیْ وَلَوْ آیَةً)) (۲) ''میری طرف سے پہنچاؤ چاہے ایک آیت ہی کیوں نہ ہو''۔ دعوت کے لیے نبی اکرم ﷺ کو تاکیدی حکم ہوا:

﴿اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّکَ بِالْحِکْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ ط﴾ (النحل:۱۲۵)

''(اے نبی ﷺ!) اپنے ربّ کے راستے کی طرف بلائیے حکمت اور اچھی نصیحت کے ساتھ اور ان (کفار و مشرکین) کے ساتھ مجادلہ کیجیے احسن طریقے سے۔''

یہ بڑی مہتم بالشان آیت ہے، اس پر میں بعد میں کچھ عرض کروں گا۔ یہاں اتنا سمجھ لیجیے کہ اس آیت میں دعوت کی تین سطحیں (levels) بیان ہوئی ہیں۔

دعوت کے ضمن میں ایک مزید اٹل اور رہنما اصول اس آیت مبارکہ میں بیان کر دیا گیا:

﴿وَمَنْ اَحْسَنُ قَوْلًا مِّمَّنْ دَعَآ اِلَی اللّٰهِ وَعَمِلَ صَالِحًا وَّقَالَ اِنَّنِیْ مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ ۝﴾ (حٰمٓ السجدة)

''اور اُس سے بڑھ کر اچھی بات کس کی ہو سکتی ہے جو اللہ کی طرف بلائے اور نیک عمل کرے اور کہے یقیناً میں خود بھی فرمانبرداروں (مسلمانوں) میں سے ہوں!''

یعنی دعوت اللہ کی طرف ہو، اس کے ساتھ ہی داعی کی سیرت و کردار عملِ صالح کا مظہر ہو۔ مزید برآں وہ اپنے آپ کو مسلمان سمجھے، مسلمان کہلائے۔ اس کی دعوت کسی فقہی مسلک کی طرف نہ

(۱) صحیح البخاری، کتاب الحج، باب الخطبه ایام منی۔ وصحیح مسلم، کتاب القسامة والمحاربین والقصاص والدیات، باب تغلیظ تحریم الدماء والاعراض والاموال۔

(۲) صحیح البخاری، کتاب احادیث الانبیاء، باب ما ذکر عن بنی اسرائیل۔ وسنن الترمذی، ابواب العلم، باب ما جاء فی الحدیث عن بنی اسرائیل۔

ہو اور نہ ہی اس کا لیبل چسپاں ہو۔ جو شخص اللہ کی طرف دعوت دے اس سے بہتر بات اور کسی کی نہیں ہو سکتی۔

اسی دوسری منزل کے لیے دو اصطلاحات مزید ہیں جو بڑی اہم ہیں، لیکن ان کا ادراک و شعور قریباً معدوم کے درجے میں آ گیا ہے۔ ہمارے معاشرے میں، الا ماشاء اللہ، چند ہی لوگ ہوں گے جو اِن کی اہمیت کو سمجھتے ہوں گے اور ان پر عمل کرتے ہوں گے۔ ان میں تیسری اصطلاح ہے: ''امر بالمعروف و نہی عن المنکر''، یعنی نیکیوں کا پرچار، اُن کی تلقین، اُن کا حکم اور برائیوں سے، بدی سے لوگوں کو روکنا، بدی اور برائی کے راستہ میں آڑے آنا۔ ہماری ایک دینی تحریک میں امر بالمعروف پر ایک درجہ میں عمل بھی ہو رہا ہے تو اس میں نہی عن المنکر سے صرفِ نظر ہے۔ حالانکہ حدیث شریف میں نہی عن المنکر پر زیادہ زور اور تاکید ہے۔ صحیح مسلم کی حدیث ہے۔ حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ حضور اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((مَنْ رَاٰی مِنْکُمْ مُنْکَرًا فَلْیُغَیِّرْهُ بِیَدِهٖ، فَاِنْ لَّمْ یَسْتَطِعْ فَبِلِسَانِهٖ، فَاِنْ لَّمْ یَسْتَطِعْ فَبِقَلْبِهٖ، وَذٰلِکَ اَضْعَفُ الْاِیْمَانِ)) (۱)

''(اے مسلمانو!) تم میں سے جو کوئی کسی منکر کو دیکھے تو اس پر لازم ہے کہ وہ اسے اپنے ہاتھ (یعنی طاقت) سے روکے، اگر اس کی استطاعت نہ رکھتا ہو تو زبان سے روکے (یعنی نصیحت و تلقین کرے) اور اگر اس کی بھی طاقت نہ ہو تو (کم از کم) دل میں اسے برا جانے (اس پر کڑھے اور پیچ و تاب کھائے) اور یہ کمزور ترین ایمان (کی نشانی) ہے۔''

ہمارے اس دَور کے لحاظ سے مسلم شریف کی ایک اور حدیث بہت اہم اور قابل التفات ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضور ﷺ نے فرمایا:

((مَا مِنْ نَبِیٍّ بَعَثَهُ اللّٰهُ فِیْ اُمَّةٍ قَبْلِیْ اِلَّا کَانَ لَهٗ فِیْ اُمَّتِهٖ حَوَارِیُّوْنَ وَاَصْحَابٌ یَاْخُذُوْنَ بِسُنَّتِهٖ وَیَقْتَدُوْنَ بِاَمْرِهٖ، ثُمَّ اِنَّهَا تَخْلُفُ مِنْ بَعْدِهِمْ خُلُوْفٌ یَقُوْلُوْنَ مَا لَا یَفْعَلُوْنَ وَیَفْعَلُوْنَ مَا لَا یُؤْمَرُوْنَ، فَمَنْ جَاهَدَهُمْ بِیَدِهٖ فَهُوَ مُؤْمِنٌ وَمَنْ جَاهَدَهُمْ بِلِسَانِهٖ فَهُوَ مُؤْمِنٌ وَمَنْ جَاهَدَهُمْ بِقَلْبِهٖ فَهُوَ مُؤْمِنٌ، وَلَیْسَ وَرَآءَ ذٰلِکَ مِنَ الْاِیْمَانِ حَبَّةُ خَرْدَلٍ)) (۲)

''مجھ سے پہلے جس نبی کو بھی اللہ تعالیٰ نے مبعوث فرمایا، اس کی امت میں اس کے ایسے

(۱) صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب بیان کون النهی عن المنکر من الایمان (۲) حواله سابقه

حواری اور ساتھی ہوا کرتے تھے جو اس نبی کی سنت پر عمل کرتے تھے اور اس کے حکم کی پیروی کرتے تھے۔ پھر اُن حواریین کے بعد ایسے نالائق جانشین آ جاتے تھے جو کہتے وہ تھے جو کرتے نہیں تھے اور ایسے کام کیا کرتے تھے جن کا انہیں (اللہ کی طرف سے) حکم نہیں ہوا کرتا تھا۔ تو ایسے لوگوں سے جو ہاتھ سے جہاد کرے تو وہ مؤمن ہے' اور جو زبان سے جہاد کرے تو وہ بھی مؤمن ہے' اور جو دل سے جہاد کرے تو وہ بھی مؤمن ہے' اور اس کے ورے تو رائی کے دانے کے برابر بھی ایمان نہیں ہے۔''

یہ ہے ہمارے دین میں نہی عن المنکر کی اہمیت۔

اس دوسری منزل کے لیے چوتھی جامع ترین اصطلاح ہے ''شہادت علی الناس''۔ جیسے پہلی منزل کے لیے جامع ترین اصطلاح میں نے ''عبادت'' بیان کی تھی' دوسری منزل کے لیے ''شہادت علی الناس'' جامع ترین اصطلاح ہے۔ جناب محمدﷺ آخری نبی اور آخری رسول ہیں۔ لہٰذا آپؐ کی اُمت بھی آخری اُمت ہے۔ یہ اُمت اس لیے برپا کی گئی ہے کہ تا قیامِ قیامت نوعِ انسانی پر اپنے قول و عمل سے حق کی شہادت دے۔ ارشادِ الٰہی ہے:

﴿وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا﴾ (البقرۃ:۱۴۳)

''اور اسی طرح (اے مسلمانو!) ہم نے تمہیں بہترین اُمت بنایا ہے تا کہ تم نوعِ انسانی پر گواہ ہو جاؤ اور رسول تم پر گواہ ہو جائیں۔''

سورۃ الحج کی آخری آیت اس موضوع پر بڑی عظیم آیت ہے۔ فرمایا:

﴿وَجَاهِدُوْا فِي اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ ۭ هُوَ اجْتَبٰىكُمْ﴾

''اور جہاد کرو اللہ کے لیے جیسا کہ (اور جتنا کہ) اس کے لیے جہاد کا حق ہے۔ اس نے تمہیں چن لیا ہے (پسند کر لیا ہے' ایک خاص مقصد کے لیے تمہارا انتخاب ہو گیا ہے)۔''

درمیان میں ایک جملہ معترضہ ہے:

﴿وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ ۭ مِلَّةَ اَبِيْكُمْ اِبْرٰهِيْمَ ۭ هُوَ سَمّٰىكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ ڏ مِنْ قَبْلُ وَفِيْ هٰذَا﴾

اس کے بعد اُمت کے اجتباء (چن لیے جانے) کا مقصد بایں الفاظ بیان ہوا:

﴿لِيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ شَهِيْدًا عَلَيْكُمْ وَتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ ښ﴾

''تا کہ رسول تم پر گواہ ہوں اور تم پوری نوعِ انسانی کے لیے گواہ بن جاؤ۔''

یعنی لوگوں پر اپنے قول و عمل سے حق کی شہادت دے کر حجت قائم کرو تا کہ قیامت کے دن عدالتِ خداوندی میں گواہی دے سکو' testify کر سکو کہ پروردگار! ہم نے تیرا دین ان تک پہنچا دیا تھا۔ سورۃ البقرۃ کی آیت میں پہلے اُمت کا ذکر ہوا اور پھر رسولؐ کا' لیکن یہاں پہلے رسولؐ اور پھر اُمت کا ذکر ہے۔

شہادت علی الناس وہ اصطلاح ہے کہ یہاں آ کر اُمتِ محمد علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کا تعلق کارِ رسالت سے جڑ جاتا ہے۔ چونکہ آنحضورﷺ آخری نبی اور آخری رسول ہیں لہٰذا یہ آپؐ کی ذمہ داری ہے کہ دعوت و تبلیغ کے ذریعے اور اپنے قول و عمل کی ہم آہنگی کی شہادت کے ذریعے ''دین الحق'' کو بالفعل قائم کر کے اس کی برکات کے ذریعے لوگوں پر حجت قائم کریں۔ اس شہادت کی اہمیت کا اندازہ سورۃ النساء کی اس آیت سے لگایئے' فرمایا:

﴿فَكَيْفَ اِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ اُمَّةٍ بِشَهِيْدٍ وَّجِئْنَا بِكَ عَلٰى هٰٓؤُلَاۗءِ شَهِيْدًا﴾ (النساء)

''اس دن کیا حال ہو گا جس دن ہم ہر اُمت پر ایک گواہ کھڑا کریں گے' اور (اے نبیﷺ!) ان سب پر آپ کو گواہ بنا کر لائیں گے!''

عدالتِ خداوندی میں رسولؐ دراصل استغاثہ کے گواہ ہوں گے' وہ کہیں گے اے پروردگار! میں نے تیرا پیغام اپنے قول و عمل سے شہادت دیتے ہوئے بنی نوعِ انسان تک پہنچا کر اُن پر حجت قائم کر دی تھی۔ رسول اللہﷺ کے بعد شہادت علی الناس کی یہ ذمہ داری اُمت کے کاندھوں پر ہے۔

شہادت علی الناس کی ذمہ داری کی نزاکت کو سمجھ لیجیے۔ اگر بالفرض رسولؐ اللہ تعالیٰ کا پیغام نہ پہنچاتے تو اللہ کے یہاں وہ مسئول ہوتے۔ انہوں نے پہنچا دیا تو وہ بری ہو گئے۔ اب لوگ جواب دہ ہوں گے[1]۔ نبی اکرمﷺ نے حجۃ الوداع کے موقع پر سوا لاکھ کے مجمع سے گواہی لے لی: ((اَلَا هَلْ بَلَّغْتُ؟)) اور پورے مجمع نے بیک زبان ہو کر گواہی دی: قَدْ بَلَّغْتَ وَاَدَّيْتَ وَنَصَحْتَ۔ تین بار یہ سوال و جواب ہوئے۔ اس کے بعد حضورؐ نے آسمان کی طرف'

(۱) یہی بات سورۃ الاعراف میں اس اسلوب سے بیان فرمائی گئی:

﴿فَلَنَسْـَٔلَنَّ الَّذِيْنَ اُرْسِلَ اِلَيْهِمْ وَلَنَسْـَٔلَنَّ الْمُرْسَلِيْنَ ۶﴾

''پس یہ لازماً ہو کر رہنا ہے' کہ ہم ان لوگوں سے باز پرس کریں جن کی طرف ہم نے رسول بھیجے اور رسولوں سے بھی پوچھیں (کہ انہوں نے ہمارا پیغام پہنچا دیا تھا یا نہیں اور ان کو کیا جواب ملا)''۔ (جمیل الرحمٰن)

پھر مجمع کی طرف اپنی انگشتِ مبارک سے اشارہ کرتے ہوئے تین بار فرمایا: ((اَللّٰھُمَّ اشْھَدْ)) ''اے اللہ تو گواہ رہنا! پھر حاضرین سے مخاطب ہو کر فرمایا: ((فَلْیُبَلِّغِ الشَّاھِدُ الْغَائِبَ))''--- اُمت کا اِجتباء جہاں بہت بڑا اعزاز ہے وہاں بہت بڑی ذمہ داری بھی ہے۔ اگر اُمت نے اس شہادت علی الناس کا فریضہ انجام نہیں دیا تو بنی نوعِ انسان کی گمراہی کے وبال سے عدالتِ خداوندی میں بچنا محال ہو جائے گا اور نبی اکرمﷺ کی گواہی ہمارے خلاف ہو جائے گی۔

دعوت و تبلیغ کی تین سطحیں

اس تبلیغ و دعوت کی بھی تین سطحیں ہیں جن کو سمجھنا ضروری ہے' ورنہ ہو سکتا ہے کہ ہم اس مغالطہ میں مبتلا رہیں کہ ہم تو تبلیغ کا حق ادا کر رہے ہیں' درآں حالیکہ وہ صورتِ تبلیغ ہو' حقیقی تبلیغ نہ ہو۔ میں تسلیم کرتا ہوں کہ الحمدللہ اس دور میں ایک خاص سطح پر تبلیغ و دعوت کے لیے ایک بہت وسیع حرکت ہو چکی ہے۔ اس کے حجم کا جہاں تک تعلق ہے وہ بڑا متاثر کن ہے اور ہزاروں بلکہ لاکھوں افراد اس گلوب پر ہر وقت حرکت میں رہتے ہیں۔ لیکن میں پوری ہمدردی اور دلسوزی کے ساتھ عرض کر رہا ہوں کہ تبلیغ اور دعوت کے لیے اگر ہم نے قرآنی ہدایات کو اپنا امام نہ بنایا اور ان کے مطابق کام نہ کیا جا سکا تو مطلوبہ نتائج برآمد نہ ہوں گے۔ اس ضمن میں وہی دو آیات دوبارہ ملاحظہ کیجیے جو میں پہلے پیش کر چکا ہوں۔ پہلی آیت ہے:

﴿یٰۤاَیُّھَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَیْکَ مِنْ رَّبِّکَ ؕ وَاِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَہٗ ؕ﴾ (المائدۃ:۶۷)

اس آیتِ مبارکہ میں نبی اکرمﷺ کو جس تبلیغ کا حکم دیا گیا ہے وہ قرآن مجید ہے۔ ارشاد ہوا: ﴿بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَیْکَ مِنْ رَّبِّکَ ؕ﴾ ''تبلیغ کیجیے اس کی (یعنی قرآن کی) جو آپ پر اتارا گیا ہے آپ کے ربّ کی جانب سے''۔ پس تبلیغ کا اصل محور و مرکز قرآن مجید ہونا چاہیے۔ پھر حضورﷺ کے ارشادِ مبارک نے ہر مسلمان کے لیے قرآن حکیم کی تبلیغ کے کام کو آسان بنا دیا ہے۔ آپؐ نے فرمایا: ((بَلِّغُوْا عَنِّیْ وَلَوْ اٰیَۃً)) ''پہنچاؤ میری جانب سے چاہے ایک ہی آیت پہنچاؤ''۔ یہاں ''عَنِّیْ'' کا لفظ خاص طور پر قابل توجہ ہے۔ یہ لفظ یہاں جس معنی و مفہوم کا حامل ہے اسے انگریزی میں ادا کیا جائے تو وہ ہو گا ''on my behalf''۔ قرآن مجید کی تبلیغ کی اصلاً ذمہ داری ہے نبی اکرمﷺ کی۔ چنانچہ اسی آیتِ مبارکہ کے اگلے حصہ میں فرمایا: ﴿وَاِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَہٗ ؕ﴾ ''اور اگر آپ (ﷺ) نے بالفرض یہ کام

نہیں کیا تو آپؐ نے تبلیغ رسالت کا حق ادا نہ کیا''۔ میں نے ترجمہ میں لفظ ''بالفرض'' کا اضافہ اس لیے کیا ہے کہ نبی اکرمﷺ کے متعلق ذرا سا یہ گمان کہ آپ قرآن حکیم کی تبلیغ میں کوتاہی فرمائیں گے' ایمان کے منافی ہو جائے گا۔ معاذ اللہ' ثم معاذ اللہ۔ یہ اسلوبِ بیان درحقیقت امت کے انتباہ (warning) کے لیے اختیار فرمایا گیا ہے کہ کہیں وہ اس ذمہ داری سے غافل نہ ہو جائے جو پوری اُمت پر بحیثیت کُل اور ہر مسلمان پر بحیثیتِ اُمتیِ رسولؐ عائد ہوتی ہے۔

دوسری آیت جس کی تفصیل میں نے مؤخر کر دی تھی' اس کے حوالے سے دعوت کی تین سطحوں کا سمجھنا ضروری ہے۔ آیت مبارکہ ہے:

﴿اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّکَ بِالْحِکْمَۃِ وَالْمَوْعِظَۃِ الْحَسَنَۃِ وَجَادِلْھُمْ بِالَّتِیْ ھِیَ اَحْسَنُ ؕ﴾ (النحل:۱۲۵)

''(اے نبیؐ) دعوت دو اپنے ربّ کے راستہ کی طرف حکمت و دانائی کے ساتھ' اور عمدہ وعظ و نصیحت کے ساتھ' اور (ہٹ دھرم' ضدی اور حجتی) لوگوں کے ساتھ مجادلہ کرو اس طریق پر جو بہت ہی عمدہ ہو۔''

ہر دور اور ہر معاشرے میں آپ کو لوگوں کی تین سطحیں ملیں گی۔ ایک سب سے بلند سطح کے لوگ ہوتے ہیں' یعنی ذہین اقلیت (intellectual minority)۔ اسی کو intelligentsia بھی کہتے ہیں۔ یہی brain trust کہلاتا ہے۔ یہ طبقہ اگرچہ قلیل ترین اقلیت میں ہوتا ہے لیکن معاشرے میں مؤثر ترین ہوتا ہے اور معاشرے کا رُخ متعین کرنے میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ جیسے انسان کے جسم میں دماغ ہے جو وزن کے لحاظ سے کم و بیش آدھ سیر کا ہو گا' لیکن یہ اس کے پورے وجود اور پورے تن و توش کو کنٹرول کرتا ہے۔ ہاتھ پکڑ سکتا ہے' لیکن کس شے کو پکڑے' کس کو نہ پکڑے' اس کا فیصلہ نہیں کر سکتا' اس کا فیصلہ دماغ کرتا ہے۔ ٹانگیں اسے لے کر چل سکتی ہیں' لیکن کس سمت میں چلیں' کس میں نہ چلیں' اس کا فیصلہ دماغ کرتا ہے۔ اسی طرح معاشرے کا رُخ درحقیقت یہی ذہین اقلیت متعین کرتی ہے۔ اس کو جب تک دعوت دینے کا تقاضا دلیل کے ساتھ' برہان کے ساتھ پورا نہیں کیا جائے گا' یہ طبقہ کوئی اثر قبول نہیں کرے گا۔ جیسے قرآن حکیم یہود کو کھلا چیلنج کرتا ہے:

﴿قُلْ ھَاتُوْا بُرْھَانَکُمْ اِنْ کُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ ﴿۱۱۱﴾﴾ (البقرۃ)

''(اے نبیﷺ! ان سے) کہہ دو کہ اپنی دلیل لاؤ اگر تم سچے ہو۔''

اگر اس ذہین اقلیت کو اعلیٰ علمی وفکری سطح پر مدلل طور پر آپ دین کی دعوت پیش نہیں کریں گے اور اسے by pass کرنے کی کوشش کریں گے تو یہ ذہین اقلیت دین کے حق میں ہموار نہ ہو سکے گی۔ اگرچہ by pass دل کے آپریشن میں بہت مفید ہوتا ہے، لیکن اسلامی انقلابی عمل میں یہ طرزِ عمل بہت خطرناک ہوتا ہے۔ اگر عوامی سطح پر بات پھیلتی چلی جا رہی ہے لیکن ذہین اقلیت میں وہ بار نہیں پا رہی تو کوئی نتیجہ نہیں نکلے گا، اجتماعی سطح پر کوئی تبدیلی نہیں آئے گی۔ لہٰذا یہاں ہدایت آئی: ﴿اُدۡعُ اِلٰی سَبِیۡلِ رَبِّکَ بِالۡحِکۡمَۃِ﴾ ''اے نبی! (لوگوں کو) حکمت کے ساتھ اپنے ربّ کے راستے کی طرف دعوت دیجیے''۔ اس حکمت کے ساتھ جس کے متعلق ایک مقام پر فرمایا: ﴿وَمَنۡ یُّؤۡتَ الۡحِکۡمَۃَ فَقَدۡ اُوۡتِیَ خَیۡرًا کَثِیۡرًا ؕ﴾ (البقرۃ:۲۶۹) ''اور جس کو حکمت و دانائی ملی، اسے حقیقت میں بڑی دولت مل گئی (بہت خیر مل گیا)''۔ مجھے بڑا افسوس ہے کہ بعض لوگوں نے یہاں ''حکمت'' کو حکمت عملی کے معنی میں لے کر اس آیت ِمبارکہ کی بڑی حق تلفی کی ہے۔ حکمت ِعملی بالکل دوسری چیز ہے، اگرچہ وہ بھی یقیناً مطلوب شے ہے، لیکن یہاں جس شان کے ساتھ یہ لفظ آیا ہے، درحقیقت اس کا مفہوم حکمت عملی نہیں ہے، بلکہ دلائل و براہین کے ساتھ، دانائی کے ساتھ، اس دعوت کو پیش کرنا ہے۔ اگر سوسائٹی کی ذہین اقلیت کو اِس وقت اور اس دَور کی اعلیٰ علمی وفکری سطح پر دعوت پیش نہ کی جا سکے تو معاشرہ بحیثیت ِمجموعی کبھی متاثر نہیں ہوسکتا۔

دعوت کی دوسری سطح ''عوامی'' ہے۔ عوام کو دعوت عمدہ وعظ اور دل نشین نصیحت کے ذریعے دی جائے گی، کیونکہ انہیں کسی دلیل اور حجت کی ضرورت نہیں ہوتی۔ ان کے لیے ضرورت ہے موعظۂ حسنہ کی، وہی ان کے لیے کفایت کرے گی۔

اس سطح پر یہ بات نہایت اہم ہے کہ سننے والے یہ محسوس کریں کہ جو وعظ کر رہا ہے وہ ہم پر اپنی دین داری، علمیت اور شخصیت کی دھونس نہیں جمانا چاہتا، بلکہ وہ مخلص ہے اور ہماری خیرخواہی کے لیے بات کہہ رہا ہے۔ اسے کسی دُنیوی اجر اور صلہ کی ضرورت نہیں ہے۔ ساتھ ہی انہیں یہ اعتماد ہو کہ وہ بہروپیا نہیں ہے، ﴿اَتَاۡمُرُوۡنَ النَّاسَ بِالۡبِرِّ وَتَنۡسَوۡنَ اَنۡفُسَکُمۡ﴾ والا معاملہ نہیں ہے، بلکہ جو کچھ یہ کہہ رہا ہے اپنی ذاتی اور نجی زندگی میں اس پر خود بھی عمل پیرا ہے۔ یہ دو چیزیں جمع ہو جائیں، ایک موعظۂ حسنہ اور دوسرے واعظ کا اعلیٰ کردار تو معاملہ ہوگا: از دل خیزد بر دل ریزد، اور ع

دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے!

یہ ہے عوامی سطح پر دعوت و تبلیغ۔ میں جانتا ہوں کہ اس دور میں اعلیٰ تعلیم یافتہ حضرات کے

ایک بڑے طبقے میں عام طور پر وعظ کو ایک گالی کی حیثیت حاصل ہوگئی ہے۔ بڑے ہی استحقار کے انداز میں کہا جاتا ہے ''اجی وعظ کہہ رہے ہیں''۔ حالانکہ وعظ بڑی عظیم اور مؤثر شے ہے اور قرآنی اصطلاح ہے، لیکن اس کا ایک مقام اور محل ہے جہاں یہ تأثیر دکھاتا ہے۔ یہ عمل غیر موقع اور بے محل ہوگا تو غیر مؤثر رہے گا۔ ظلم کا مطلب ہی یہ ہے: وَضۡعُ الشَّیۡءِ فِیۡ غَیۡرِ مَحَلِّہٖ ۔ یعنی ''کسی چیز کو اپنے اصل مقام کی بجائے کسی اور جگہ رکھنا''۔ ان عوام کو آپ فلسفہ پڑھائیں گے تو حماقت ہوگی اور intellectuals کو آپ وعظ پلائیں گے تو یہ کام بھی غیر معقول ہوگا۔ ہر شے کو اپنی جگہ پر رکھنا ہی عدل ہے۔

تیسری سطح جو ہر معاشرے میں موجود ہوتی ہے، وہ ان لوگوں پر مشتمل ہوتی ہے جو ہٹ دھرم ہوتے ہیں، جو کبھی مان کر نہیں دیتے، جن کے اپنے مفادات ہوتے ہیں، جن کی امدادِ باہمی کی انجمنیں بنی ہوتی ہیں، جن کے مفادات باطل نظام سے وابستہ ہوتے ہیں اور وہ اپنے مفادات کی وجہ سے کورچشم ہو چکے ہوتے ہیں۔ بلکہ بسا اوقات علیٰ وجہ البصیرت لوگوں کو گمراہ کر رہے ہوتے ہیں۔ اگر ان لوگوں کے زہر کا تریاق فراہم نہ کیا جائے تو یہ عوام الناس کو گمراہ کرتے چلے جائیں گے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے یہاں مناظرہ کا فن وجود میں آیا۔ پھر اس نے باقاعدہ ایک خاص تکنیک اور تخصص (specialization) کی شکل اختیار کی۔ موجودہ دور میں کچھ لوگوں نے اسے پیشہ ہی بنا لیا تو اس میں چند خرابیاں در آئیں۔ مثلاً مجمع عام ہے، داد مل رہی ہے، تحسین ہو رہی ہے، تالیاں بج رہی ہیں، نعرے لگ رہے ہیں۔ گویا اتنی بڑی جیوری(Jury) ہے جس کے سامنے دو پہلوان عقلی کشتی لڑ رہے ہیں۔ یہ مناظرہ اور مجادلہ کا احسن انداز نہیں۔ قرآن مجید جسے مجادلہ کہتا ہے وہ احسن طریق پر محکم دلائل اور برہان کے ساتھ ہونا ضروری ہے۔

دعوت کی یہ تیسری سطح لازمی ہے۔ اگر یہ کام آپ نہیں کریں گے تو اغیار سے شکست کھا جائیں گے۔ کون نہیں جانتا کہ ہمارے معاشرے میں عیسائیت کی تبلیغ ہو رہی ہے۔ ہم کنویں کے مینڈک کی طرح ایک ہی دائرے میں چکر لگاتے رہے اور فقہی تعبیرات، راجح و مرجوح، افضل و مفضول کے ردّ و قبول میں آپس میں ہی مناظرے اور دنگل جماتے رہے اور جما رہے ہیں، جبکہ اندر ہی اندر عیسائیت دیمک کی طرح ہمارے معاشرے کو کھاتی چلی جا رہی ہے۔ اسی طرح دعوتی سطح پر اس دور میں قادیانیت بہت فعال ہوگئی ہے[1]۔ قادیانی مبلغین کا

(۱) یہ تقریر قادیانیوں کے بارے میں صدارتی آرڈیننس سے قبل کی ہے۔ (مرتب)

انداز بڑا جارحانہ ہوتا ہے اور ایک عام آدمی تو کجا اچھا بھلا پڑھا لکھا' بلکہ عالم دین بھی ان کے مناظرین ومبلغین کے سامنے ٹھہر نہیں سکتا۔ الا ماشاءاللہ۔ ان قادیانی مناظرین ومبلغین کو جس طرح خاص موضوعات پر تربیت دی گئی ہے' اس کے ردّ اور ابطال کے لیے جب تک ہمارے ذہین وفطین لوگوں کو اسی طرح ٹریننگ نہ ملے یہ مسئلہ حل نہ ہوگا۔ ایک وقت میں جب یہاں انگریزی حکومت کی سرپرستی میں بڑے زور وشور کے ساتھ عیسائیت کی تبلیغ شروع ہوئی تھی اور پادری فینڈر نے برصغیر میں تہلکہ مچا دیا تھا' اگر اُس وقت وہ مردِ حق کھڑا نہ ہو گیا ہوتا جس کا نامِ نامی مولانا رحمت اللہ کیرانوی ہے' رحمتہ اللہ علیہ' تو آپ اندازہ نہیں کر سکتے کہ ہندوستان میں مسلمان کس طرح عیسائیت کے اس سیلاب کی نذر ہو جاتے۔ اس پادری فینڈر نے پورے ہندوستان کے علماء کو جامع مسجد دہلی کی سیڑھیوں پر کھڑے ہو کر للکارا اور کھلے طور پر دعوتِ مبارزت دی۔ مولانا کیرانوی خم ٹھونک کر میدان میں آئے اور پادری فینڈر کو میدان چھوڑ کر ہندوستان سے بھاگنا پڑا۔ پھر وہ ترکی پہنچا اور وہاں بھی اس نے یہی ہتھکنڈے شروع کیے۔ عثمانی سلطنت نے مولانا کیرانوی کو ترکی آنے کی دعوت دی۔ مولانا جب وہاں پہنچے تو پادری فینڈر وہاں سے بھی فرار ہو گیا۔ تو دعوت کی یہ بھی ایک سطح ہے۔ یہ تیسری سطح ہے۔ کچھ لوگ اس کا تحقیر کے انداز میں ذکر کرتے ہیں' حالانکہ یہ بھی کرنے کا کام ہے۔ البتہ واضح رہے کہ قرآن اس کے لیے ہمیں ایک امتیازی اخلاقی معیار قائم رکھنے کا حکم دے رہا ہے: ﴿جَادِلْهُمْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ﴾ یعنی اس مجادلے میں بھی بالکل مخالفین کی سطح پر نہ اتر آؤ' بلکہ تمہارا داعیانہ کردار اور اس کی ایک اخلاقی شان ضرور برقرار رہنی چاہیے۔

ظاہر بات ہے کہ ایک شخص ان تینوں سطحوں پر کام نہیں کر سکتا۔ ہر کام کے اپنے اپنے تقاضے ہیں۔ جو سب سے اونچا کام ہے اس کے لیے اس دور میں ''علم کو مسلمان بنانے'' کی ضرورت ہے۔ آج علم ملحد ہو چکا ہے۔ اس کے بارے میں بڑی پیاری بات علامہ اقبال نے کہی ہے ؎

عشق کی تیغ جگر دار اڑا لی کس نے؟
علم کے ہاتھ میں خالی ہے نیام اے ساقی!

معرفتِ خداوندی کی تلوار اس علم کی نیام میں سے نکل گئی ہے۔ یہ نرا خول ہے' اور محض خالی نہیں ہے' بلکہ اس میں الحاد کا خنجر اس تلوار کی جگہ پیوست کر دیا گیا ہے۔ اس علم کو مسلمان بنانا آسان

نہیں ہے۔ لوگ نظامِ تعلیم کی بات کیا کرتے ہیں۔ میں یہ کہا کرتا ہوں کہ نظام اتنی بڑی بات نہیں ہے' یہ تو تعلیم دینے کا ایک ذریعہ ہے۔ سوال یہ ہے کہ اسلامی علم کہاں ہے جسے پہنچایا جائے؟ محض دینیات کا ایک پیریڈ یا اسلامیات کا ایک شعبہ قائم کرنے سے کام نہیں چلے گا' جبکہ طبیعیات' معاشیات' عمرانیات' سیاسیات اور جو دوسرے علوم ایک طالب علم حاصل کر رہا ہے' ان کے رگ و پے میں الحاد اور مادہ پرستی سرایت کیے ہوئے ہے۔ اسی لیے علامہ اقبال نے کہا تھا ؎

گلا تو گھونٹ دیا اہل مدرسہ نے ترا
کہاں سے آئے صدا لا الٰہ الا اللہ!

توحید کی بنیاد پر جب تک پورے علم کی تدوین نو نہیں ہوگی' تمام علوم کو جب تک مسلمان نہیں بنایا جائے گا' ہماری نئی نسل کے اذہان کو اسلام کے سانچے میں ڈھالنا ممکن نہیں۔ ظاہر بات ہے کہ یہ آسان کام نہیں ہے۔ جب تک سینکڑوں اور ہزاروں اعلیٰ صلاحیتیں رکھنے والے نوجوان ((خَیْرُکُمْ مَنْ تَعَلَّمَ الْقُرْاٰنَ وَعَلَّمَهٗ)) (۱) کو اپنا اصولِ عمل (motto) بنا کر میدان میں نہیں آئیں گے اور ان کو اداروں اور حکومت کی جانب سے مناسب ذرائع مہیا نہیں کیے جائیں گے اُس وقت تک یہ کام کیسے ہوگا! ہاں وعظ کی سطح پر ہمیں زیادہ جوہر قابل (talent) مل سکتا ہے۔ رہا مجادلہ کی سطح پر افراد کی ضرورت تو اس کے لیے خصوصی تربیت گاہوں کی ضرورت ہے۔

دعوت کی تینوں سطحوں پر کام کرنے کے لیے ضرورت اس امر کی ہے کہ وہ باصلاحیت نوجوان جن کے دل میں واقعی دین کا کام کرنے کی تڑپ ہے' ولولہ ہے' اُمنگ اور جذبہ ہے' وہ آگے بڑھیں' ان اعلیٰ وارفع مقاصد کے لیے اپنا دُنیوی کیریئر قربان کریں اور اپنی جانیں ان مقاصد کے حصول میں کھپائیں' تب جا کر ہی یہ کام ہوگا۔ اور یہ ہے جہاد فی سبیل اللہ کی دوسری منزل ـــــ دین کی تبلیغ اور دعوت کے لیے مال وجان کو ان تینوں سطحوں پر کھپانا۔

عجب حسنِ اتفاق ہے کہ میں نے نہی عن المنکر سے متعلق جو دو حدیثیں بیان کی ہیں ان میں نہی عن المنکر کے کام کی انجام دہی کے لیے تین سطحوں ہی کا بیان ہوا ہے۔ پہلی سطح یہ ہے کہ بدی اور برائی کو ہاتھ یعنی قوت وطاقت سے روک دینا۔ دوسری یہ کہ اگر طاقت نہ ہو تو زبان سے

(۱) صحیح البخاری' کتاب فضائل القرآن' باب خیرکم من تعلم القرآن وعلمه۔ وسنن الترمذی' ابواب فضائل القرآن' باب ما جاء فی تعلیم القرآن۔

وعظ سے اور تلقین و نصیحت سے اس کو روکنا' اس کی مذمت کرنا۔ اور تیسری سطح یہ ہے کہ اگر اس کی بھی طاقت نہ ہو تو دل میں اسے برا جاننا' اس پر گھٹن محسوس کرنا' اس پر پیچ و تاب کھانا۔ اور یہ آخری سطح ایمان کے کمزور ترین ہونے کی دلیل ہے۔ دوسری حدیث میں ان تینوں سطحوں کے لیے نبی اکرم ﷺ نے ''جہاد'' کا لفظ استعمال فرمایا۔

اس دوسری منزل کے لیے ایک دوسرا عنوان ''نظریاتی کشمکش'' یا ''فکری تصادم'' ہے۔ اگر آپ توحید کو پھیلانا چاہتے ہیں تو مشرکانہ اوہام رکھنے والے موجود ہیں' ان سے نظریاتی سطح پر تصادم اور مقابلہ ہوگا۔ آپ کو walk over نہیں مل جائے گا۔ کس قدر اہم بات ہے کہ قرآن مجید نے یہی لفظ ''جہاد'' مشرک والدین کے ضمن میں دو جگہ استعمال کیا ہے' ایک سورۃ لقمان میں اور دوسرے سورۃ العنکبوت میں۔ جو نوجوان نبی اکرم ﷺ پر ایمان لے آئے تھے تو ان کے مشرک والدین ان پر دباؤ ڈالتے تھے کہ وہ واپس اپنے آبائی دین پر آ جائیں۔ سورۃ لقمان میں ارشاد ہے:

﴿وَاِنْ جَاهَدٰکَ عَلٰٓی اَنْ تُشْرِکَ بِیْ مَا لَیْسَ لَکَ بِهٖ عِلْمٌ لا فَلَا تُطِعْهُمَا﴾ (آیت ۱۵)

معلوم ہوا کہ مشرک بھی مجاہد تھے۔ وہ مجاہد فی سبیل الشرک اور مجاہد فی سبیل الطاغوت تھے اور نبی اکرم ﷺ اور آپؐ کے اصحاب ؓ بھی مجاہد تھے اور وہ تھے مجاہد فی سبیل اللہ اور مجاہد فی التوحید۔ یہ جہاد اور یہ کشمکش آپ کو ہر دور میں ملے گی اور یہ بات بغیر استثناء کے حقیقتِ نفس الامری ہے ۔

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز
چراغِ مصطفویؐ سے شرارِ بولہبی!

تیسری منزل: غلبہ و اقامتِ دین

جہاد کی تیسری منزل سب سے کٹھن' سب سے بھاری اور سب سے مشکل ہے۔ اور یہ ہے دین کو غالب کرنے' قائم کرنے اور نافذ کرنے کے لیے' اعلائے کلمۃ اللہ کے لیے' اس مقصد کے لیے کہ دین کا تجزیہ اور اس کے حصے بخرے کیے بغیر وہ کل کا کل اللہ کے لیے ہو جائے' جہاد کرنا۔ جیسے انفرادی سطح پر فرمایا گیا: ﴿وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِیَعْبُدُوا اللّٰهَ مُخْلِصِیْنَ لَهُ الدِّیْنَ لا حُنَفَآءَ﴾ ویسے ہی اجتماعی سطح پر دین کے غلبہ کے لیے جہاد و قتال کا حکم دیا گیا۔ فرمایا: ﴿وَقٰتِلُوْهُمْ حَتّٰی لَا تَکُوْنَ فِتْنَةٌ وَّیَکُوْنَ الدِّیْنُ کُلُّهٗ لِلّٰهِ﴾ . یہ ہے جہاد کی بلند ترین چوٹی اور

سب سے کٹھن اور مشکل مرحلہ۔ اس کی وجہ بھی اظہر من الشمس ہے۔ پہلی منزل پر ذاتی سطح پر نفس کے ساتھ کشمکش تھی۔ دوسری منزل پر اہل زیغ کے ساتھ نظریاتی اور فکری سطح پر کشمکش تھی۔ اس تیسری منزل پر طاغوتی نظام کو ہٹانے کا مرحلہ درپیش ہوتا ہے' اس لیے کہ دو نظام کسی حال میں بھی co-exist نہیں کر سکتے۔ پچاس مذاہب بھی ایک بالاتر نظام کے تحت اکٹھے رہ سکتے ہیں۔ مذاہب باہمی اختلافات کے علی الرغم پُرامن طور پر پہلو بہ پہلو زندگی گزار سکتے ہیں۔ یہ بالکل قابل عمل ہے ـــــ اس لیے کہ دنیا کا غالب تصور یہی ہے کہ مذہب تو لوگوں کے انفرادی اور نجی مسائل و معاملات سے تعلق رکھتا ہے۔ اجتماعیات کے تمام امور میں مذہب کا عمل دخل اِس دور میں تسلیم ہی نہیں کیا جاتا۔ یہ سیکولر فیلڈ ہے۔ جیسا کہ انگریز کے دور میں ہندوستان میں اصل نظامِ اجتماعی (Law of the Land) سرکارِ انگلشیہ کا تھا۔ ہندوستان میں رہنے والے تمام مذاہب کے لوگوں کو آزادی تھی کہ وہ اپنے شخصی معاملات میں اپنے اپنے مذہب پر عمل کریں۔ انگریزی حکومت کو اس پر کوئی اعتراض نہیں تھا۔ جیسے دستوری اور نظری طور پر موجودہ بھارت میں بھی یہ بات تسلیم شدہ ہے اور تمام مذاہب کے حقوق دستور میں معین ہیں۔

بہرحال ایک ملک میں دین یعنی نظامِ اجتماعی ایک ہی رہ سکتا ہے۔ دو نظام نہ رہ سکتے ہیں نہ چل سکتے ہیں۔ جس طرح ایک نیام میں بیک وقت دو تلواریں نہیں سما سکتیں' اسی طرح ایک ملک میں دو نظام نہیں چل سکتے۔ ایک گدڑی میں بہت سے درویش سما سکتے ہیں' لیکن ایک شال میں دو بادشاہ نہیں سما سکتے۔ معلوم ہوا کہ ہر نظام اپنا غلبہ چاہتا ہے اور اگر اسلام محض مذہب نہیں' بلکہ دین ہے' جیسا کہ فی الواقع وہ ہے: ﴿اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ قف﴾ تو اس کو غلبہ درکار ہے۔ یہ منزل انگریزوں کی دو سو سالہ غلامی کی وجہ سے ہمارے ذہنوں سے اوجھل ہو گئی تھی اور اب بھی بڑی مشکل سے یہ تصور لوگوں کے ذہنوں کے سامنے آ رہا ہے۔ چونکہ غلامی کے تقریباً دو سو سال کے درمیان اسلام دین نہیں رہا تھا' صرف مذہب بن گیا تھا' لہٰذا ہمارا سارا تصور اکثر و بیشتر تو پہلی منزل تک محدود ہے' یعنی عبادات اور حلال و حرام کے موٹے موٹے احکام ہم جانتے ہیں۔ دوسری منزل کی طرف بھی پیش رفت ہوئی' یعنی تبلیغ' دین کو پہنچانا' اسے عام کرنے کی کوشش کرنا۔ لیکن یہ بات ذہنوں سے اوجھل ہو گئی کہ ہمارا دین اپنا غلبہ چاہتا ہے۔ اَلْحَقُّ یَعْلُوْ وَلَا یُعْلٰی عَلَیْهِ. اسلام دین ہے اور دین ہوتا ہی وہ ہے جو غالب ہو۔ علامہ اقبال کا بڑا پیارا شعر ہے ۔

بندگی میں گھٹ کے رہ جاتی ہے اک جوئے کم آب
اور آزادی میں بحرِ بیکراں ہے زندگی!

میں بڑے جزم کے ساتھ کہتا ہوں کہ اسلام جب غالب ہوتا ہے تو دین ہوتا ہے اور جب مغلوب ہوتا ہے تو صرف مذہب رہ جاتا ہے۔ ہماری دوسو سالہ سیاسی اور فکری غلامی نے اس مذہبی تصور کو اس طریقے سے ہمارے ذہنوں میں نقش اور راسخ کر دیا ہے کہ اگر بڑی محنت کے بعد کسی کے سامنے یہ تصور واضح ہوتا ہے کہ اسلام مذہب نہیں بلکہ دین ہے تو تھوڑے عرصہ کے بعد مضمحل ہو کر ذہنوں سے اوجھل ہو جاتا ہے اور پھر توجہ اس کے مذہبی تصور تک محدود ہو جاتی ہے۔ ہمارا اسلام کا محض مذہبی تصور انگریزی دَور میں اتنا راسخ ہو چکا تھا کہ ہمارے بعض زعماء نے انگریز حکومت کی بھی بڑی مدح کی تھی کہ اس نے ہمیں بڑی مذہبی آزادی دے رکھی ہے۔ لہٰذا حکومت کے خلاف کوئی تحریک چلانا یا اس میں حصہ لینا مسلمانوں کے لیے قطعی نامناسب ہے۔ اسی پر مردِ قلندر اقبال نے یہ پھبتی چست کی تھی ؎

ملا کو جو ہے ہند میں سجدے کی اجازت
ناداں یہ سمجھتا ہے کہ اسلام ہے آزاد!

اسلام کا غلبہ اور اسلام کا ایک دین کی حیثیت سے بالفعل قائم و نافذ کرنا' یہ ہے ہمارے فرائضِ دینی کی تیسری اور بلندترین منزل۔

اقامتِ دین کا مرحلہ اور تصادم

اب آیئے ایک قاعدہ کلیہ اور اٹل اصول کی طرف! وہ یہ کہ آپ اپنا نظام لانا چاہتے ہیں تو فی الوقت نافذ و قائم نظام کو ہٹانا ہوگا۔ جیسا کہ مولانا رومؒ نے کہا ؎

گفت رومی ہر بنائے کہنہ کا باداں کنند
می ندانی اوّل آں بنیاد را ویراں کنند

انقلاب کے لیے یہ عمل لازم و لابدی اور ناگزیر ہے۔ سیدھی سی بات ہے کہ جو نظام بھی کہیں قائم ہوتا ہے' اس کے ساتھ کچھ لوگوں کے مفادات' چودھراہٹیں' سیادتیں اور قیادتیں وابستہ ہوتی ہیں۔ یہ مراعات یافتہ طبقات جن کو اپنے حق سے زیادہ مل رہا ہے' جو دوسروں کے حقوق پر ڈاکہ ڈال رہے ہیں' جن کے پاس اختیارات اور حقوق کا ناجائز ارتکاز ہو گیا ہے' وہ کبھی گوارا نہیں کر سکتے کہ کوئی اس نظام کو چھیڑے' اسے ہاتھ لگائے۔ وہ تو اس کے تحفظ کے لیے فوراً اٹھ

کھڑے ہوں گے کہ ؏

نظامِ کہنہ کے پاسبانو! یہ معرضِ انقلاب میں ہے

ہوش میں آؤ' اپنی قوتوں کو مجتمع کرو' یہ ایک آندھی آ رہی ہے جو تمہارے مفادات اور تمہاری مراعات کو خس و خاشاک کی طرح اڑا کر لے جائے گی۔ یہ کشمکش بڑی شدید ہے۔ قرآن مجید میں تین مقامات پر یہ الفاظ وارد ہوئے ہیں:

﴿هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ﴾

(التوبۃ:۳۳' الفتح:۲۸' الصف:۹)

اور ان میں سے دو مقامات پر آیت کا خاتمہ ﴿وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ﴾ کے الفاظ پر ہوا ہے۔ یعنی یہ ایک اٹل قانون ہے کہ مشرک کبھی دینِ حق کا غلبہ برداشت نہیں کر سکیں گے۔ تصادم ہو کر رہے گا۔ اب نظریاتی تصادم اگلے مرحلہ میں داخل ہو گا اور بالفعل (Physical) تصادم ہو گا۔ اب طاقت' طاقت سے ٹکرائے گی۔

اس بالفعل تصادم (Physical Collision) کے بھی تین مرحلے ہیں۔ اس کے پہلے مرحلہ کو ہم کہیں گے ''صبرِ محض'' کہ ماریں کھاؤ مگر اپنی مدافعت میں بھی ہاتھ نہ اٹھاؤ۔ بارہ برس مکہ میں یہی حکم رہا کہ اگر تمہیں دہکتے ہوئے انگاروں پر ننگی پیٹھ لٹایا جا رہا ہے تو لیٹ جاؤ' مگر جوابی کارروائی نہیں کر سکتے۔ اس کو جدید اصطلاح میں کہیں گے: Passive Resistance- یعنی کلمۂ توحید اور کلمہ طیبہ پر قائم رہو' لیکن ہاتھ اٹھانے کی اجازت نہیں ہے۔

اس تصادم کا دوسرا مرحلہ یہ ہے کہ اگر طاقت اتنی فراہم ہو گئی ہے کہ اقدام کیا جا سکتا ہے تو آگے بڑھو اور باطل کو للکارو اور چیلنج کرو۔ اس نظام کی کسی دکھتی ہوئی رگ کو چھیڑو۔ اسے جدید اصطلاح میں کہا جائے گا Active Resistance یعنی اقدام۔

اس کا تیسرا اور آخری مرحلہ ہے Armed Conflict یا مسلح تصادم یعنی اب ہاتھ بھی کھول دیے گئے ہیں اور اذنِ قتال دے دیا گیا ہے:

﴿اُذِنَ لِلَّذِيْنَ يُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا ۭ وَاِنَّ اللّٰهَ عَلٰي نَصْرِهِمْ لَقَدِيْرُۨ﴾ (الحج)

''(آج سے) ان لوگوں کو اجازت دے دی گئی جن کے خلاف جنگ کی جا رہی ہے' کیونکہ وہ مظلوم ہیں' اور اللہ یقیناً ان کی مدد پر پوری قدرت رکھتا ہے۔''

مکی دور صبرِ محض کا دور تھا۔ مدینہ منورہ کی طرف ہجرت کے بعد نبی اکرم ﷺ نے اقدام فرمایا اور چھاپے مار دستے بھیج کر قریش کی تجارت کے دونوں راستوں کو' جو مکہ سے یمن اور مکہ سے شام کی طرف جاتے تھے' مخدوش بنا دیا۔ گویا قریش کی دکھتی ہوئی رگ کو چھیڑ دیا' کیونکہ ان کی معاش کا بہت بڑا انحصار ان ہی راستوں کے ذریعہ تجارت پر تھا۔

صبرِ محض کے بعد ہر انقلابی عمل میں ''مسلح تصادم'' کا لازمی اور آخری مرحلہ آتا ہے۔ یہ انقلابی دعوت وقت کے جن فراعنہ کے مفادات کو چیلنج کرتی ہے' وہ جب اس دعوت کو توسیع پذیر ہوتے ہوئے دیکھتے ہیں تو اس کو کچلنے کے لیے اپنی عسکری طاقت کو میدان میں لاتے ہیں اور اس طرح مسلح تصادم کا تیسرا اور آخری مرحلہ شروع ہو جاتا ہے۔ ہر انقلابی دعوت کو لازماً اس آخری مرحلہ سے سابقہ پیش آ کر رہتا ہے۔ اس لیے کہ یہ انقلابی دعوت وقت کے رائج و نافذ نظام کے ساتھ retaliate کرتی ہے۔ اب تک تو وہ جھیل رہی تھی' برداشت کر رہی تھی' لیکن جب وہ اقدام کا مرحلہ شروع کرتی ہے تو نظامِ باطل اس کو کچلنے کے لیے اپنی پوری طاقت کے ساتھ بڑھتا ہے اور آخری مرحلے پر مسلح تصادم کا آغاز ہو جاتا ہے۔ اسلامی انقلاب کی صورت میں یہی مسلح تصادم جہاد کی آخری چوٹی ''قتال فی سبیل اللہ'' بن جاتا ہے۔ چنانچہ نبی کریم ﷺ کی انقلابی جدوجہد میں ایک وقت وہ تھا کہ اپنی مدافعت میں بھی ہاتھ اٹھانے کی اجازت نہیں تھی' لیکن آخری مرحلے پر وہ وقت بھی آیا کہ جس کے متعلق حکمِ الٰہی آتا ہے:

﴿كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ وَهُوَ كُرْهٌ لَّكُمْ ۚ وَعَسٰٓى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْئًا وَّهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۚ وَعَسٰٓى اَنْ تُحِبُّوْا شَيْئًا وَّهُوَ شَرٌّ لَّكُمْ ۗ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿٢١٦﴾﴾ (البقرة)

''(مسلمانو!) تم پر جنگ فرض کر دی گئی ہے' اور وہ تمہیں ناپسند ہے' اور ہو سکتا ہے کہ تمہیں کوئی چیز ناپسند ہو درآنحالیکہ اسی میں تمہارے لیے خیر ہو' اور ہو سکتا ہے کہ کوئی چیز تمہیں پسند ہو درانحالیکہ اس میں تمہارے لیے شر ہو۔ اللہ جانتا ہے' تم نہیں جانتے۔''

اس قتال کا ہدف (target) یہ ہے کہ مسلمانو! اب جبکہ تمہاری تلوار نیام سے باہر آ گئی ہے' تو یہ اُس وقت تک نیام میں نہیں جائے گی جب تک فتنہ و فساد بالکل فرو نہ ہو جائے اور اللہ کے خلاف بغاوت بالکل کچل نہ دی جائے اور دین کل کا کلُ اللہ ہی کے لیے نہ ہو جائے۔ از روئے الفاظِ قرآنی: ﴿وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ

لِلّٰهِ ۚ﴾ (الانفال:۳۹) یہاں فتنہ سے مراد کیا ہے' اس کی ہمارے اکثر اصحابِ علم مختلف تشریحات و توجیہات کرتے ہیں۔ میں معذرت کے ساتھ عرض کرتا ہوں کہ چونکہ ہمارا دین کا تصور غیر انقلابی بن گیا ہے لہٰذا جہاں کہیں بھی انقلابی بات آتی ہے تو پہلو بچا کر نکلنے کی کوشش ہوتی ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ فتنوں کا شمار مشکل ہے' استحصال بھی فتنہ ہے' ناانصافی بھی فتنہ ہے' لیکن وہ اصل فتنہ کیا ہے جو اِس آیت میں مراد ہے اور جو اُمّ الفتن ہے؟ وہ یہ ہے کہ یہ زمین اللہ کی ہے' اس کا جائز حاکم صرف اُس کی ذات ہے۔ از روئے الفاظ قرآنی: ﴿لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ﴾ گر زمین پر تشریعی معاملات اور اجتماعی نظامِ حیات میں اللہ کے سوا کسی اور کا حکم چل رہا ہے تو یہ اس کے خلاف صریح بغاوت ہے۔ یہی سب سے بڑا فتنہ ہے۔

یہاں فتنہ سے اصلاً یہی فتنہ مراد ہے۔ اسی کے متعلق ایک مقام پر فرمایا گیا: ﴿وَالْفِتْنَةُ اَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ ۚ﴾ (البقرة:۱۹۱) اور ایک دوسرے مقام پر فرمایا گیا: ﴿وَالْفِتْنَةُ اَكْبَرُ مِنَ الْقَتْلِ ۗ﴾ (البقرة:۲۱۷) غور کیجیے وہاں قتال و مقاتلہ کن کے خلاف تھا! اپنی ہی قوم اور اپنے قبیلہ کے لوگ' اپنے ہی بھائی بند' اپنے ہی اعزہ و اقارب مدمقابل تھے' لیکن وہ طاغوتی نظام کے علمبردار تھے اور اُمتِ محمد علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام اس بات پر مامور کی گئی تھی کہ اجتماعی نظام خالصتاً توحید کے انقلابی نظریے پر قائم ہو۔ جیسے فرمایا گیا: ﴿اَلَا لِلّٰهِ الدِّيْنُ الْخَالِصُ ۗ﴾ (الزمر:۳) اور: ﴿اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ ۗ﴾ (الشوریٰ:۱۳) سورۃ التوبۃ اور سورۃ الصّف میں جہاں خاتم النبیین والمرسلین ﷺ کی بعثت کی امتیازی شان یہ بیان ہوئی ہے: ﴿هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ﴾ تو دونوں مقامات کے آخر میں فرمایا گیا: ﴿وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُوْنَ ۝﴾ ''اور چاہے مشرکوں کو یہ کتنا ہی ناگوار ہو!''

جن لوگوں کے مفادات اور جن کی قیادت و سیادت نظامِ باطل سے وابستہ ہو وہ اس بات کو کیسے برداشت کر سکتے ہیں کہ ان کا طاغوتی نظام بیخ و بنُ سے اکھاڑ کر توحید پر مبنی نظامِ عدل و قسط قائم کیا جائے۔ وہ تو مزاحمت کریں گے' مخالفت کریں گے اور اپنی پوری طاقت دین اللہ کے قیام و نفاذ کو روکنے کے لیے صرف کر دیں گے۔ لہٰذا اللہ کے فرماں برداروں کے لیے ایک ہی راستہ ہے کہ وہ اللہ کے باغیوں سے پنجہ آزمائی کریں' ان سے نبرد آزما ہوں اور اللہ تعالیٰ کی تشریعی حکومت کو قائم کرنے کے لیے اپنا تن' من' دھن سب کچھ قربان کر دیں' تاکہ ''حق بحق

دارِرسید' والا معاملہ ہو جائے۔ جو لوگ یہ قربانی دیں تو وہ سرخرو ہیں۔ از روئے الفاظ قرآنی:

﴿مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَيْهِ ۚ فَمِنْهُمْ مَّنْ قَضٰى نَحْبَهٗ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّنْتَظِرُ ۖ وَمَا بَدَّلُوْا تَبْدِيْلًا ﴿۲۳﴾﴾ (الاحزاب)

''اہل ایمان میں سے وہ لوگ بھی ہیں جنہوں نے اللہ سے کیے ہوئے عہد کو سچا کر دکھایا ہے (اس کی راہ میں گردنیں کٹا کر سرخرو ہو چکے ہیں) پس ان میں سے کوئی اپنی نذر پوری کر چکا اور کوئی اپنی باری آنے کا منتظر ہے' اور ان اہل ایمان نے اپنے اس رویے اور طرزِ عمل میں ذرّہ برابر تبدیلی نہیں کی۔''

لیکن اگر ایمان کے دعوے دار بیٹھے رہیں' باطل کے ساتھ کوئی کشمکش نہ کریں' بلکہ اس کے زیرِ عافیت چین کی بانسری بجائیں' اپنے معیارِ زندگی کی بلندی ہی مقصود و مطلوب بن جائے تو یہ طرزِ عمل دُنیوی قانون میں بھی اعانتِ جرم ہے۔ یہ باغیوں کے ساتھ ایک نوع کا تعاون قرار دیا جاتا ہے۔ ﴿ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ﴾ کا سب سے بڑا سبب یہی بغاوت ہوتی ہے۔ کائنات کے تکوینی نظام پر جس اللہ کی حکومت قائم ہے' یہ زمین اُسی اللہ کی ہے' لہٰذا اس پر اس کی تشریعی حکومت بھی قائم ہونی چاہیے۔ ﴿اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ﴾ حکم دینے کا اختیار صرف اسی کو حاصل ہے۔ لیکن اس اصل الاصول کو چھوڑ کر خواہ کوئی فردِ واحد ہو' کوئی قوم ہو' عوام ہوں' کسے باشد' کوئی بھی ہو' وہ اگر اپنا حکم چلوا رہا ہے تو درحقیقت وہ خدائی کا مدعی ہے اور اللہ کا باغی ہے۔ مسلمان تو وہ ہے جو صرف اللہ کا وفادار ہو۔ اس موقع پر اچانک میرا ذہن اس مقدمۂ بغاوت کی طرف منتقل ہوا جو ہمارے ہی شہر کراچی کے خالق دینا ہال میں ہمارے چند اکابر کے خلاف پہلی جنگ عظیم کے دوران قائم ہوا تھا۔ یہ مقدمہ اس امر کی شہادت دیتا ہے کہ ہماری تاریخ میں کچھ لوگ ایسے بھی ہیں کہ جن کے ذکر سے ہمیں کسی درجے میں سہارا ملتا ہے کہ انہوں نے وہی طرزِ عمل اختیار کیا جو ایک مسلمان کے شایانِ شان ہے۔ ان اکابر نے پہلی جنگ عظیم کے اس ٹربیونل کے سامنے جو انگریزی حکومت نے بغاوت کے مقدمہ کے لیے قائم کیا تھا' برملا کہا تھا کہ ہاں ہم انگریزی حکومت کے باغی ہیں' اس لیے کہ مسلمان صرف اللہ کا وفادار ہو سکتا ہے' وہ کبھی غیر اللہ کا وفادار نہیں ہو سکتا!

ایمان اور جہاد لازم و ملزوم ہیں

بہرحال یہ ہیں جہاد کے تین درجے۔ ان کو مزید پھیلائیں گے تو نو (۹) درجے بن

جائیں گے اور نویں منزل پر جا کر یہ جہاد قتال بنتا ہے جو اس کی چوٹی اور اس کا نقطۂ عروج ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سورۃ الصّف میں جہاں جہاد کی بات ہوئی وہاں یہ بات صراحت سے سامنے آتی ہے کہ جہاد تو ایمان کی بنیاد (base) ہے۔ جہاد نہیں کرو گے تو عذابِ جہنم سے چھٹکارا پانے کی امید محض امیدِ موہوم ہے۔ ﴿تِلْكَ اَمَانِيُّهُمْ﴾ ''یہ محض تمہاری خوش فہمیاں ہیں''۔ اس کی کوئی برہان اور دلیل تمہارے پاس نہیں ہے۔ عذابِ الیم سے رُستگاری کے لیے ایمان اور جہاد لازم و ملزوم ہیں۔ چنانچہ اسی سورۂ مبارکہ میں فرمایا گیا:

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا هَلْ اَدُلُّكُمْ عَلٰى تِجَارَةٍ تُنْجِيْكُمْ مِّنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ ﴿۱۰﴾ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَتُجَاهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ ۭ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۱۱﴾﴾ (الصف)

''اے اہل ایمان! میں بتاؤں تمہیں وہ تجارت جو تم کو عذابِ الیم سے نجات دلا دے؟ (وہ یہ ہے کہ) ایمان (پختہ) رکھو اللہ اور اُس کے رسول پر اور جہاد کرو اُس کی راہ میں اپنے مالوں سے اور اپنی جانوں سے' یہ تمہارے لیے بہتر ہے اگر تم جانتے ہو۔''

معلوم ہوا کہ ایمان کے ساتھ جہاد ناگزیر ہے۔ اس سے تو مفر ہے ہی نہیں۔ یہ تو نجات کی شرطِ لازم ہے۔ قرآن مجید تو یہ بتاتا ہے کہ جہاد نہیں تو ایمان نہیں۔ دلیل کے لیے سورۃ الحجرات کی آیت ۱۵ دیکھئے! فرمایا:

﴿اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوْا وَجَاهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۭ اُولٰۗىِٕكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ ﴿۱۵﴾﴾

''مؤمن تو صرف وہ لوگ ہیں جو اللہ اور اس کے رسول پر اس شان سے ایمان لائے کہ ان کے قلوب تشکیک اور خلجان میں نہیں پڑے (بلکہ ان کو یقینِ قلبی حاصل ہو گیا) اور جنہوں نے جہاد کیا اپنے مالوں سے اور اپنی جانوں سے اللہ کی راہ میں۔ بس صرف یہی لوگ ہیں جو (اپنے دعوائے ایمان میں) سچے ہیں۔''

اس آیتِ مبارکہ میں حصر کے دو اسلوب آئے ہیں' ایک اِنَّمَا اور دوسرے اُولٰٓئِكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ۔ اسی لیے میں نے ترجمانی میں اس اسلوب کو پیشِ نظر رکھا ہے۔

آگے چلیے۔ اگر کوئی دُنیوی محبت اللہ کی راہ میں جہاد سے روکنے کے لیے پاؤں میں بیڑی بن کر پڑ گئی تو قرآن مجید کا فتویٰ کیا ہے! اس کے لیے سورۃ التوبہ کی آیت ۲۴ ملاحظہ کیجیے:

﴿قُلْ اِنْ كَانَ اٰبَآؤُكُمْ وَاَبْنَآؤُكُمْ وَاِخْوَانُكُمْ وَاَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيْرَتُكُمْ وَاَمْوَالُ نِاقْتَرَفْتُمُوْهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسٰكِنُ تَرْضَوْنَهَآ اَحَبَّ اِلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَجِهَادٍ فِيْ سَبِيْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ ؕ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ ﴿۲۴﴾﴾

اللہ کی محبت‘ اس کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کی محبت اور اللہ کی راہ میں جہاد کی محبت کی عظمت و اہمیت پر قرآن حکیم کی یہ بڑی جامع اور مہتم بالشان آیت ہے۔ اس آیت میں مسلمانوں کے سامنے ایک معیار اور کسوٹی رکھ دی گئی ہے۔ ان سے فرمایا گیا ہے کہ اپنے باطن میں ایک ترازو نصب کر لو اور پھر جائزہ لے لو کہ تمہاری اصلی دلی محبتوں کا کیا حال ہے۔ فرمایا کہ اے نبی صلی اللہ علیہ وسلم! ان مسلمانوں سے کہہ دیجیے کہ اپنے دل میں نصب شدہ میزان کے ایک پلڑے میں آٹھ محبتیں ڈالو۔ یعنی اپنے باپوں کی محبت‘ اپنے بیٹوں کی محبت‘ اپنے بھائیوں کی محبت‘ اپنی بیویوں کی محبت اور اپنے رشتہ داروں اور اعزّہ و اقارب کی محبت۔ ماں‘ بیٹی‘ بہن اور شوہر کی محبتوں کا بھی ان میں احاطہ ہو گیا۔ یہ پانچ محبتیں علائق دُنیوی سے متعلق ہیں۔ پھر ان کے ساتھ چھٹی محبت اس مال کی جو بڑے چاؤ کے ساتھ تم نے جمع کیا ہے‘ ساتویں اس کاروبار کی محبت جو تم نے بڑی محنت سے جمایا ہے‘ جس میں تم نے خون پسینہ ایک کیا ہے‘ جس کے متعلق تم کو اندیشے لاحق رہتے ہیں کہ کہیں کساد بازاری نہ آ جائے‘ کہیں گھاٹا نہ ہو جائے‘ اور آٹھویں ان مکانوں کی محبت جو تم نے بڑے ارمانوں سے تعمیر کیے ہیں‘ جن کی زیبائش و آرائش پر تم نے پانی کی طرح پیسہ لگایا ہے۔ یہ تین محبتیں اسباب و سامانِ دُنیوی سے متعلق ہیں۔ اب تقابل کے لیے دوسرے پلڑے میں تین محبتیں ڈالو۔ ایک اللہ کی محبت‘ دوسری اس کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کی محبت اور تیسری اس کی راہ میں جہاد کی محبت۔ اب دیکھو کون سا پلڑا بھاری پڑا‘ کون سا جھکا! اگر ان آخر الذکر محبتوں کا پلڑا ہلکا رہ گیا اور علائق و سامانِ دُنیوی کی محبتوں والا پلڑا بھاری پڑ گیا تو جاؤ گومگو کی حالت میں مبتلا رہو اور انتظار کرو! میں محاورے کے طور پر فَتَرَبَّصُوْا کا صحیح مفہوم ادا کرنے کے لیے کہا کرتا ہوں کہ ”جاؤ دفع ہو جاؤ“ ﴿حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ ؕ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ ﴿۲۴﴾﴾ ”حتیٰ کہ اللہ اپنا فیصلہ سنا دے‘ اور اللہ ایسے فاسق لوگوں کو ہدایت نہیں دیتا۔“

یہاں فاسق کا لفظ انتہائی قابل توجہ ہے۔ جس مسلمان کا دل جہاد کی محبت سے خالی اور اس کی اہمیت و عظمت سے غافل ہے اس کا شمار بھی فاسقوں میں ہوتا ہے۔ میرا ظن غالب ہے

کہ اسی آیت مبارکہ سے متاثر ہو کر اقبال نے یہ شعر کہا تھا:

یہ مال و دولت دُنیا‘ یہ رشتہ و پیوند
بتانِ وہم و گماں لا الٰہ الا اللہ!

معلوم ہوا کہ جہاد سے تو مفر ہے ہی نہیں۔ سورۃ الحجرات کی متذکرہ بالا آیت اس بات پر دلالت کرتی ہے‘ بلکہ میرے غور و فکر کی حد تک نصِ قطعی ہے کہ ایمانِ حقیقی کے دو رکن ہیں: ایک ہر نوع کے ریب و تشکیک اور ذہنی خلجان سے مبرا یقینِ قلبی اور دوسرا اللہ کی راہ میں اپنے مالوں اور اپنی جانوں سے جہاد۔

بلاشبہ کلمۂ شہادت‘ اقامتِ صلوٰۃ‘ ایتائے زکوٰۃ‘ حج اور صومِ رمضان‘ پانچ ارکانِ اسلام ہیں۔ ان میں شہادتین کو بنیاد اور دوسرے چار کو ستون کا مقام حاصل ہے۔ بنیاد اور ستون کے بغیر کسی عمارت کی تعمیر کا تصور ممکن ہی نہیں‘ لہٰذا میں فرائض دینی کے جامع تصور کو ظاہر کرنے کے لیے جو تین منزلہ عمارت کی مثال پیش کیا کرتا ہوں اس کی ہر منزل کے لیے یہ ارکانِ اسلام ناگزیر ہیں۔ لیکن ایمانِ حقیقی کے دو رکن ہیں۔ ایک قلبی یقین اور دوسرا جہاد فی سبیل اللہ۔ جہاں تک میں نے غور و فکر کیا ہے‘ نجات کا کوئی دوسرا راستہ اس جہاد کے بغیر مجھے نظر نہیں آتا۔ سورۃ العصر میں نجاتِ اُخروی کے جو ناگزیر لوازم بیان فرمائے گئے ہیں ان میں تیسرا لازمہ اور تیسری ناگزیر شرط ”تواصی بالحق“ قرار دی گئی ہے۔ سورۂ ہود کی پہلی آیت مبارکہ میں یہ اصول بیان فرمایا گیا ہے:

﴿الٓرٰ ۟ كِتٰبٌ اُحْكِمَتْ اٰيٰتُهٗ ثُمَّ فُصِّلَتْ مِنْ لَّدُنْ حَكِيْمٍ خَبِيْرٍ ﴿۱﴾﴾

”ال ر۔ یہ ایک ایسی کتاب ہے کہ اس کی آیتیں محکم کی گئی ہیں‘ پھر صاف صاف بیان کی گئی ہیں ایک حکیم باخبر کی طرف سے۔“

چنانچہ قرآن حکیم اسی تواصی بالحق کی شرح کے لیے مزید کئی اصطلاحات بیان کرتا ہے۔ جہاد فی سبیل اللہ کی اصطلاح بھی اس کی توضیح و تشریح اور تفصیل ہے۔

جہاد کی چوٹی: قتال فی سبیل اللہ

قتال فی سبیل اللہ اسی جہاد فی سبیل اللہ کی چوٹی اور اس کا ذروۂ سنام ہے۔ یہ مقامِ محبوبیت ہے۔ از روئے الفاظِ قرآنی: ﴿اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِهٖ صَفًّا كَاَنَّهُمْ بُنْيَانٌ مَّرْصُوْصٌ ﴿۴﴾﴾ (الصّف) ”یقیناً اللہ اُن لوگوں سے محبت کرتا ہے جو اُس کی راہ

میں جنگ کرتے ہیں صفیں باندھ کر گویا کہ وہ سیسہ پلائی ہوئی دیوار ہیں۔''

سورۃ البقرۃ میں ارشاد ہے:

﴿وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ یُّقْتَلُ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ اَمْوَاتٌ ؕ بَلْ اَحْیَآءٌ وَّلٰکِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ۝﴾

''اور جو لوگ اللہ کی راہ میں مارے جائیں' اُنہیں مردہ مت کہو' وہ زندہ ہیں' مگر تمہیں (ان کی زندگی کا) شعور نہیں ہوتا۔''

اور سورۂ آلِ عمران میں فرمایا:

﴿وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِیْنَ قُتِلُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ اَمْوَاتًا ؕ بَلْ اَحْیَآءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ یُرْزَقُوْنَ ﴿۱۶۹﴾﴾

''اور جو لوگ اللہ کی راہ میں قتل ہوئے ہیں اُنہیں مردہ نہ سمجھو' وہ تو حقیقت میں زندہ ہیں' اپنے ربّ کے پاس رزق پا رہے ہیں۔''

یہ وہ اعلیٰ و ارفع مرتبہ ہے کہ خود نبی اکرم ﷺ اس کی تمنا اور آرزو فرمایا کرتے تھے۔ ارشادِ نبویؐ ہے:

((لَوَدِدْتُ اَنِّیْ اُقْتَلُ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ ثُمَّ اُحْیَا ثُمَّ اُقْتَلُ ثُمَّ اُحْیَا ثُمَّ اُقْتَلُ ثُمَّ اُحْیَا ثُمَّ اُقْتَلُ)) (۱)

''میرے دل میں بڑی آرزو اور بڑی تمنا ہے کہ میں اللہ کی راہ میں قتل کر دیا جاؤں' پھر مجھے زندہ کیا جائے' پھر قتل کیا جاؤں' پھر زندہ کیا جائے' پھر قتل کیا جاؤں' پھر زندہ کیا جاؤں اور پھر قتل کیا جاؤں۔''

کتبِ احادیث میں نبی اکرم ﷺ کی یہ دعائیں منقول ہیں:

((اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَسْئَلُکَ شَھَادَةً فِیْ سَبِیْلِکَ))

اور:

((اَللّٰھُمَّ ارْزُقْنِیْ شَھَادَةً فِیْ سَبِیْلِکَ))

لیکن سورۃ المجادلہ میں اللہ تعالیٰ نے اپنی یہ سنت بیان فرمائی ہے:

﴿کَتَبَ اللّٰہُ لَاَغْلِبَنَّ اَنَا وَرُسُلِیْ ؕ اِنَّ اللّٰہَ قَوِیٌّ عَزِیْزٌ ﴿۲۱﴾﴾

''اللہ تعالیٰ نے لکھ دیا ہے (یعنی طے فرما دیا ہے) کہ میں اور میرے رسول ہی غالب

---

(۱) صحیح البخاری' کتاب التمنی' باب ما جاء فی التمنی ومن تمنی الشھادۃ۔ وصحیح مسلم' کتاب الامارۃ' باب فضل الجھاد والخروج فی سبیل اللہ۔

ہو کر رہیں گے۔ یقیناً اللہ ہی زورآور اور زبردست ہے۔''

رسولوں کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے خاص تحفظ حاصل ہوتا ہے اور وہ مقتول نہیں ہوتے۔ اس لیے کہ عالمِ ظاہری میں اس طرح رسول کے مغلوب ہونے کا پہلو نکلتا ہے' البتہ انبیاء علیہم السلام کو یہ خصوصی تحفظ نہیں دیا گیا۔ چنانچہ ان میں سے بعض قتل بھی کیے گئے' جس کی سب سے بڑی مثال حضرت یحییٰ علیہ السلام کا قتل ہے۔

ضمناً یہاں یہ بات بھی سمجھ لیجیے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے زندہ رفعِ آسمانی کی یہ بھی ایک دلیل ہے' کیونکہ وہ بھی ایک رسول تھے۔ پھر اللہ تعالیٰ کی یہ سنت بھی ہے کہ جس قوم کی طرف رسول مبعوث کیا جاتا ہے وہ قوم اگر رسول کا انکار کر دے' اس پر صرف معدودے چند لوگ ہی ایمان لائیں تو اہلِ ایمان کو بچا کر اس قوم کو عذابِ استیصال کے ذریعہ اسی دنیا میں ہی تباہ و برباد اور ہلاک کر دیا جاتا ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل کی طرف مبعوث کیے گئے تھے۔ ﴿وَاِذْ قَالَ عِیْسَی ابْنُ مَرْیَمَ یٰبَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ اِنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰہِ اِلَیْکُمْ﴾ بنی اسرائیل نے آنجنابؑ کا انکار کیا لیکن انہیں عذابِ استیصال سے نیست و نابود نہیں کیا گیا۔ یہ نزولِ عیسیٰ علیہ السلام کے لیے دلیل ہے۔ حضرت مسیحؑ قربِ قیامت میں جناب محمد ﷺ کے اُمتی کی حیثیت سے نزول فرمائیں گے اور ان شاء اللہ انہی کے ہاتھوں تمام یہودی عذابِ استیصال و ہلاکت کا مزہ چکھیں گے۔

میں عرض کر چکا ہوں کہ ایمان اور جہاد لازم و ملزوم ہیں اور جہاد کی چوٹی قتال ہے۔ البتہ قتال ہر وقت نہیں ہوتا' موقع و محل کے اعتبار سے ہوتا ہے۔ اگر کوئی اسلامی حکومت بالفعل قائم ہو اور اسے غیر مسلموں سے فی سبیل اللہ جنگ کا مرحلہ درپیش ہو اور حالات کے لحاظ سے حسبِ ضرورت فوج موجود ہو یا مزید ضرورت کے لیے لوگ جنگ کے لیے نکل آئیں تو قتال فرضِ عین نہیں فرضِ کفایہ ہو جائے گا۔ لیکن ''جہاد'' وہ چیز ہے جو ایک مسلمان پر شعور کی عمر کو پہنچتے ہی فرض ہو جاتا ہے۔ اس جہاد کے مختلف مدارج ہیں' جن میں سے بعض کا میں قدرے تفصیل سے ذکر کر چکا ہوں اور بعض کی طرف میں نے محض اشارات پر اکتفا کیا ہے۔ ''قتال'' اس جہاد کے عمل کی آخری چوٹی اور اس کا ذروۂ سنام ہے۔ اس کی اہمیت کا اندازہ اس حدیث سے لگایئے جو صحیح مسلم میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((مَنْ مَّاتَ وَلَمْ یَغْزُ وَلَمْ یُحَدِّثْ بِهٖ نَفْسَهٗ مَاتَ عَلٰی شُعْبَةٍ مِّنْ نِّفَاقٍ)) (۱)

---

(۱) صحیح مسلم' کتاب الامارۃ' باب ذم من مات ولم یغز ولم یحدث نفسہ بالغزو۔

''جو شخص اس حال میں مر جائے کہ نہ تو اُس نے اللہ کی راہ میں جنگ کی ہو اور نہ ہی اس کے دل میں اس کا خیال آیا ہو (اس کی تمنا اور آرزو بھی پیدا نہ ہوئی ہو) تو ایسے شخص کی موت ایک نوع کے نفاق پر ہو گی''۔

بقول اقبال ؎

شہادت ہے مطلوب و مقصودِ مؤمن
نہ مالِ غنیمت' نہ کشور کشائی!

جہاد کے لیے جدید اصطلاح: انقلابی عمل

اگرچہ میں بھی اس بات کا قائل ہوں کہ ہمیں حتی الامکان جدید اصطلاحات سے احتراز کرنا چاہیے اور کتاب وسنت کی اصل اصطلاحات سے چمٹے رہنا چاہیے' عافیت اسی میں ہے' ورنہ بالکل غیر شعوری اور غیر محسوس طور پر غلط نظریات اذہان میں رینگ کر آ جاتے ہیں اور پیوست ہو جاتے ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ایک یہ دشواری بھی پیش آتی ہے کہ ہر دَور کی اپنی زبان ہوتی ہے' ہر دور کی چند مخصوص اصطلاحات ہیں جو بات کی تفہیم کے لیے ضروری ہوتی ہیں۔ اگر اس زبان میں ان اصطلاحات کے ساتھ بات نہیں کی جائے گی تو ابلاغ کا حق ادا نہیں ہو گا۔ لہٰذا میرے نزدیک درمیانی راہ یہ ہے کہ وقتی طور پر ابلاغ اور افہام کے لیے ان اصطلاحات کو استعمال ضرور کیا جائے ــــــ لیکن اپنے فکر کو مستقلاً اُن اصطلاحات کے حوالے سے استوار کیا جائے جو کتاب وسنت کی ہیں۔ اسی مقصد کے پیش نظر میں یہ بات عرض کرنے کی جرأت کر رہا ہوں کہ ''جہاد'' کے لیے آج کے دور کی اصطلاح ہے ''انقلاب''۔ انقلابی عمل ہی دراصل جہاد ہے۔ البتہ اس میں تھوڑا سا فرق واقع ہوتا ہے۔ میں نے جہاد کے حوالے سے جو تین سطحیں (levels) بیان کی ہیں' انقلابی عمل میں ان کی ترتیب بدل جائے گی۔ جب ہم انقلاب کی بات کریں گے تو سب سے پہلے دعوت کا مرحلہ آئے گا۔ اس لیے کہ ہر انقلابی فکر کی propagation' اس کی نشر و اشاعت' اس کو پھیلانا' اس کو عام کرنا' اسے ذہنوں میں اُتارنا' اس کو دلائل کے ساتھ حق ثابت کرنا' اس انقلابی عمل کا نقطۂ آغاز ہوتا ہے۔ لہٰذا اس طرح درمیانی منزل اب پہلی ہو گئی ہے۔

انقلابی عمل کے لیے تنظیم ناگزیر ہے

انقلابی عمل کا دوسرا مرحلہ کیا ہوتا ہے! یہ کہ جو لوگ اس فکر کو قبول کریں انہیں منظّم کیا

جائے۔ اس لیے کہ انقلاب بغیر جماعت کے نہیں آتا۔ میں ہرگز یہ نہیں کہتا کہ انفرادی طور پر دین کا کوئی کام نہیں ہو سکتا۔ انفرادی سطح پر تبلیغ ہو سکتی ہے۔ میرے نزدیک اس کی سب سے اعلیٰ اور درخشاں مثال حضرت نوح علیہ السلام کی ہے کہ ساڑھے نو سو برس دعوت دیتے رہے۔ سورۂ نوح کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ آنجناب علیہ السلام نے کس کس طور اور طریقے سے دعوت و تبلیغ کے فریضہ کی انجام دہی کے لیے مساعی کیں اور پھر کتنی حسرت کے ساتھ بارگاہِ الٰہی میں عرض کیا:

﴿رَبِّ اِنِّیْ دَعَوْتُ قَوْمِیْ لَیْلًا وَّنَهَارًا ۝۵ فَلَمْ یَزِدْهُمْ دُعَآءِیْۤ اِلَّا فِرَارًا ۝۶ وَاِنِّیْ كُلَّمَا دَعَوْتُهُمْ لِتَغْفِرَ لَهُمْ جَعَلُوْۤا اَصَابِعَهُمْ فِیْۤ اٰذَانِهِمْ وَاسْتَغْشَوْا ثِیَابَهُمْ وَاَصَرُّوْا وَاسْتَكْبَرُوا اسْتِكْبَارًا ۝۷ ثُمَّ اِنِّیْ دَعَوْتُهُمْ جِهَارًا ۝۸ ثُمَّ اِنِّیْۤ اَعْلَنْتُ لَهُمْ وَاَسْرَرْتُ لَهُمْ اِسْرَارًا ۝۹﴾

''اے میرے ربّ! میں نے اپنی قوم کے لوگوں کو شب و روز تیری طرف بلایا' مگر میری دعوت نے اُن کے فرار ہی میں اضافہ کیا۔ اور جب بھی میں نے اُن کو بلایا تاکہ تو انہیں معاف کر دے' انہوں نے کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیں اور اپنے کپڑوں سے مُنہ ڈھانک لیے اور اپنی روش پر اَڑ گئے اور بڑا تکبر کیا۔ پھر میں نے انہیں بآوازِ بلند دعوت دی۔ پھر میں نے علانیہ بھی ان کو تبلیغ کی اور چپکے چپکے بھی سمجھایا۔''

لیکن قوم مردہ ہو چکی تھی۔ اس نے حضرت نوح علیہ السلام کی دعوتِ توحید کو قبول نہیں کیا' بلکہ اس سے اعراض و انکار کیا۔ ساڑھے نو سو برس کی دعوت و تبلیغ کا جو نتیجہ نکلا اس کو سورۂ ہود کی آیت ۴۰ کے آخر میں بیان کیا گیا ہے: ﴿وَمَآ اٰمَنَ مَعَهٗۤ اِلَّا قَلِیْلٌ﴾ ''اور تھوڑے ہی لوگ تھے جو اس (نوحؑ) کے ساتھ ایمان لائے تھے''۔ یہاں ''قلیل'' وہ معنی دے رہا ہے جو انگریزی میں a little دیتا ہے' یعنی بہت ہی کم' معدودے چند۔ قرآن حکیم میں تدبر کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرتؑ پر ان کے گھر والے ہی ایمان لائے تھے اور ان میں سے بھی ایک بیٹے نے دعوتِ حق قبول نہیں کی تھی' وہ کفر پر ہی اڑا رہا تھا۔ ممکن ہے کہ انگلیوں پر گنے جانے والے چند اور لوگ بھی ایمان لائے ہوں' بہرحال ساتھی نہ ملے' جمعیت فراہم نہیں ہوئی' لہٰذا اگلا قدم کیسے اٹھتا! اعوان و انصار نہ ہوں تو اگلی منزل کی طرف پیش رفت کیسے ہو! لیکن حضرت نوح علیہ السلام کی استقامت و مصابرت دیکھئے کہ ساڑھے نو سو برس دعوت و تبلیغ میں کھپا دیے اور اپنا فرضِ منصبی ادا کر دیا۔ ہمارے لیے اس میں یہ سبق ہے کہ ایک مخلص شخص اپنی پوری زندگی اس کام میں لگا دے' وہ اللہ تعالیٰ کے ہاں سرخرو اور کامیاب ہو گا۔ معاشرہ اگر مر چکا ہے' حق کو قبول کرنے کی

صلاحیت معدوم ہو چکی ہے تو کوئی مثبت جواب نہیں ملے گا' ساتھی میسر نہیں آئیں گے۔ اس میں اُس کا کوئی قصور نہیں۔ چونکہ اگلا قدم اٹھانے اور اگلی منزل کی طرف پیش رفت کرنے کا موقع ہی نہیں ملا' لہٰذا وہ بریٴ الذمہ ہے۔

اسی طرح تربیت وتزکیہ' تدریس وتعلیم اور تصنیف وتالیف یہ سارے کام دین کے ہیں اور یہ انفرادی طور پر بھی ہو سکتے ہیں اور بحمد اللہ ہمارے یہاں یہ سب ہی کام ہو رہے ہیں۔ لیکن جب آخری منزل اور اصل ہدف کی بات ہوگی جس کو میں اب انقلاب سے تعبیر کر رہا ہوں' یعنی دین کا غلبہ' دین کا قیام' دین کا نفاذ' دین کی سربلندی' تو کوئی احمق شخص ہی ہو سکتا ہے جو یہ سمجھے کہ یہ کام انفرادی طور پر ممکن ہے۔ بلکہ ایسا خیال رکھنے والا شخص فاتر العقل ہی ہو سکتا ہے۔ میں کہا کرتا ہوں کہ تنظیم کے بغیر کوئی اجتماعی کام نہیں ہو سکتا' چاہے وہ خیر کے لیے ہو چاہے شر کے لیے ہو۔ جو اشخاص لوگوں کی جیبیں کاٹتے ہیں' ان کی بھی تنظیم ہوتی ہے۔ ڈاکوؤں کے بھی گروہ (gangs) ہوتے ہیں' تنظیم ہوتی ہے۔ تخریب کاری کے لیے بھی تنظیمیں قائم ہیں۔ لہٰذا اقامتِ دین اور اظہارِ دین کے لیے تنظیم اور جماعت ناگزیر ہے' اس سے مفر نہیں۔ بقول فیض احمد فیضؔ ؎

جز دار اگر کوئی مفر ہو تو بتاؤ
ناچار گنہگار سوئے دار چلے ہیں!

حضرت نوح علیہ السلام کے بالکل برعکس دوسری مثال میں حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کی دیا کرتا ہوں۔ سورۃ الشوریٰ کی آیت ۱۳ میں جن پانچ اولوالعزم رسولوں کا ذکر ہوا ہے' ان میں زمانی ترتیب کے لحاظ سے اوّلین ہیں حضرت نوح علیہ السلام اور آخری ہیں جناب محمد ﷺ۔ درمیان میں تین رسول ہیں' حضرت ابراہیم' حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ علیہم السلام۔ اس طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام بالکل وسط میں آتے ہیں۔ اب دیکھئے' اوّل وآخر میں کتنی متضاد کیفیت ہے کہ ایک نے ساڑھے نو سو برس دعوت دی' لیکن کوئی اعوان وانصار نہیں ملے۔ جمعیت ہی فراہم نہیں ہوئی تو اگلا قدم کیسے اٹھے! اور دوسرے کا معاملہ یہ ہے کہ کل بیس برس میں دنیا کا عظیم ترین صالح انقلاب برپا فرما دیا۔ میں بیس سال فتح مکہ اور اس کے بعد غزوۂ حنین کی کامیابی کے اعتبار سے کہہ رہا ہوں' کیونکہ اس کے ساتھ ہی جزیرہ نمائے عرب کی حد تک انقلابِ اسلامی کی تکمیل ہوگئی تھی۔ محمد رسول اللہ ﷺ کی جدوجہد میں مابہ الامتیاز اور فیصلہ کن چیز کیا ہے! اسے سورۃ الفتح کی آیات ۲۸'۲۹ کے حوالے سے سمجھئے۔ فرمایا:

﴿هُوَ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّیْنِ كُلِّهٖ

ؕ وَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِیْدًا ۝ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ ؕ وَالَّذِیْنَ مَعَهٗۤ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَیْنَهُمْ......﴾

''وہ (اللہ) ہی ہے جس نے اپنے رسولؐ کو ہدایت کاملہ اور دینِ حق کے ساتھ بھیجا ہے تاکہ اس کو پوری جنسِ دین پر غالب کر دے' اور اس حقیقت پر اللہ کی گواہی کافی ہے۔ محمد (ﷺ) اللہ کے رسول ہیں اور جو لوگ ان کے ساتھ ہیں وہ کفار پر سخت اور آپس میں رحیم ہیں......''

بقول شاعرِ مشرق ؎

ہو حلقہ یاراں تو بریشم کی طرح نرم
رزمِ حق و باطل ہو تو فولاد ہے مؤمن!

محمد رسول اللہ ﷺ کی جمعیت اور تنظیم کو تصور میں تو لائیے۔ وہ لوگ کہ جن کی دین سے وابستگی اور دین کے لیے ایثار کا یہ عالم تھا کہ وہ اس شان سے نبی اکرم ﷺ کے اعوان وانصار بنے ہیں کہ ع ''ہرچہ بادا باد ما کشتی درآب انداختیم'' والا نقشہ ہے۔ جو غزوۂ بدر سے قبل ایک مشاورت میں کہہ رہے ہیں کہ ''اے اللہ کے رسول (ﷺ)! آپ ہم سے کیا پوچھ رہے ہیں! بسم اللہ کیجیے جو بھی آپ کا ارادہ ہو' کیا عجب کہ اللہ ہمارے ذریعے آپ کو آنکھوں کی ٹھنڈک عطا فرما دے۔ جو کہہ رہے ہیں کہ حضور ﷺ! آپ ہمیں حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کے ساتھیوں پر قیاس نہ فرمائیے جنہوں نے کہا تھا:

﴿فَاذْهَبْ اَنْتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَآ اِنَّا هٰهُنَا قٰعِدُوْنَ ۝۲۴﴾ (المائدۃ)

''پس (اے موسیٰ!) تم جاؤ اور تمہارا ربّ جائے اور دونوں جنگ کرو' ہم تو یہاں بیٹھے رہیں گے۔''

جہاں آپؐ کا پسینہ گرے گا وہاں اپنا خون بہانا ہمارے لیے سعادت ہوگی۔ حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا جملہ یاد کیجیے جو کہہ رہے ہیں کہ حضورؐ! آپ ہم سے کیا مشورہ لے رہے ہیں' اِنَّا اٰمَنَّا بِكَ وَصَدَّقْنَاكَ. ہم آپ پر ایمان لا چکے ہیں' ہم آپؐ کی تصدیق کر چکے ہیں' ہم آپؐ کو اللہ کا رسول تسلیم کر چکے ہیں۔ اب خدا کی قسم! اگر آپؐ ہمیں حکم دیں گے تو ہم اپنی سواریاں سمندر میں ڈال دیں گے۔ اگر آپؐ ہمیں حکم دیں گے تو ہم اپنی اونٹنیوں کو دبلا کر دیں گے لیکن برک الغماد تک جا پہنچیں گے (جو عرب کا ایک دور دراز علاقہ ہے جس کی راہ میں لق ودق صحرا پڑتا ہے۔)

یہ ہے وہ فیصلہ کن اور مابہ الامتیاز بات کہ اگر جمعیت نہ ہو‘ اس میں بنیانِ مرصوص کی کیفیت نہ ہو‘ اس میں سمع و طاعت کا وصف و جوہر نہ ہو‘ اس میں نظم وضبط نہ ہو‘ وہ تربیت یافتہ نہ ہو‘ اس کو اللہ کی رضا ہر چیز سے زیادہ محبوب نہ ہو‘ اس کو زندہ رہنے سے زیادہ اللہ کی راہ میں جان دینا عزیز نہ ہو تو اگلی منزلوں کی طرف پیش رفت اور پیش قدمی کے مراحل آئیں گے ہی نہیں۔ حضرت نوح علیہ السلام کو ایسے ساتھی نہ ملے‘ لہٰذا اگلے مرحلے کا معاملہ درپیش ہی نہ ہوا۔ لیکن آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ کے فضل سے ایسے اعوان و انصار مل گئے جنہوں نے دعوتِ توحید پر لبیک کہا‘ دعوتِ حق کو قبول کیا‘ اس کے مطابق اپنے آپ کو ڈھالا اور انہوں نے دعوت الی اللہ‘ اعلائے کلمۃ اللہ‘ شہادت علی الناس اور اقامتِ دین کے لیے شدائد و مصائب‘ فقر و فاقہ‘ کشمکش و تصادم‘ جہاد و قتال کے مراحل میں جاں نثاری‘ قربانی و ایثار‘ صبر و تحمل اور استقامت کی وہ مثالیں قائم کیں کہ ان کی نظیر تاریخ انسانی نہ آج تک پیش کر سکی ہے اور نہ آئندہ پیش کر سکے گی۔ اللہ کی طرف سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ایسے جاں نثار اصحاب کا ملنا اس لیے بھی تھا کہ اظہار دین الحق آپ کے فرائض منصبی میں شامل تھا‘ بفحوائے ﴿لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ﴾. چونکہ آپؐ آخری نبی اور رسول ہیں لہٰذا بنفس نفیس دینِ حق کو ایک نظامِ اجتماعی کی حیثیت سے قائم اور نافذ کر کے تا قیامِ قیامت نوعِ انسانی پر حجت قائم کرنا بھی آپؐ کے فرائض منصبی میں ایک امتیازی شان رکھتا تھا۔

اب آیئے سورۃ الشوریٰ کی آیت ۱۳ کی طرف۔ اولوالعزم من الرسل میں سے بالکل وسط میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ذکر ہے۔ آنجنابؑ کی بعثتیں بھی دونوعیّتوں کی حامل تھیں۔ ایک آنجنابؑ آلِ فرعون کی طرف رسول تھے۔ ﴿اِذْهَبْ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى ﴿۲۸۴﴾﴾ (طٰہٰ) اور دوسرے آپؑ بنی اسرائیل کی طرف مبعوث ہوئے تھے۔ آنجنابؑ کی دعا پر آپ کی معاونت کے لیے آپؑ کے بھائی حضرت ہارون علیہ السلام کو بھی نبوت سے سرفراز فرمایا گیا تھا۔ مصر میں دونوں حضرات دعوت و تبلیغ اور بنی اسرائیل کی تربیت و تزکیہ میں ہمہ وقت و ہمہ تن لگے رہے‘ حتیٰ کہ فرعون کے اعراض‘ سرکشی‘ دشمنی اور انکار کے باعث ہجرت کا مرحلہ آ گیا اور آپؑ کو حکم ہوا کہ بنی اسرائیل کو ساتھ لے کر مصر سے نکل جائیں۔ آپؑ کے ساتھ لاکھوں کی جمعیت تھی۔ جب آپؑ بنی اسرائیل کے ہمراہ صحرائے سینا پہنچے تو اگلا اور آخری مرحلہ دین کے قیام اور غلبہ کے لیے قتال کا درپیش ہوا اور وحیٔ الٰہی کے ذریعے حکم ہوا کہ ارضِ مقدس (فلسطین) میں داخل ہو جاؤ۔ چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بنی اسرائیل سے کہا:

﴿يٰقَوْمِ ادْخُلُوا الْاَرْضَ الْمُقَدَّسَةَ الَّتِيْ كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ وَلَا تَرْتَدُّوْا عَلٰٓى اَدْبَارِكُمْ فَتَنْقَلِبُوْا خٰسِرِيْنَ ﴿۲۸۱﴾﴾ (المائدۃ)

''اے برادرانِ قوم! اس مقدس سرزمین میں داخل ہو جاؤ جو اللہ نے تمہارے لیے لکھ دی ہے‘ اور پشت پھیر کر پیچھے مت پلٹو‘ ورنہ ناکام و نامراد لوٹو گے۔''

لیکن قوم بزدل اور تھڑدلی نکلی اور اس نے کورا جواب دے دیا:

﴿قَالُوْا يٰمُوْسٰٓى اِنَّا لَنْ نَّدْخُلَهَآ اَبَدًا مَّا دَامُوْا فِيْهَا فَاذْهَبْ اَنْتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَآ اِنَّا هٰهُنَا قٰعِدُوْنَ ﴿۲۸۴﴾﴾ (المائدۃ)

''انہوں نے کہا: اے موسیٰ! ہم تو وہاں کبھی نہ جائیں گے جب تک وہ (زبردست لوگ) وہاں موجود ہیں۔ بس تم اور تمہارا ربّ‘ دونوں جاؤ اور لڑو‘ ہم یہاں بیٹھے ہیں۔''

نتیجہ یہ نکلا کہ انقلابی عمل وہیں رک گیا۔ اگر اقامتِ دین کا کام اجتماعی قوت اور منظّم جمعیت کے بغیر ممکن ہوتا تو اللہ کے دو جلیل القدر پیغمبروں حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون (علیٰ نبینا وعلیہما الصلوٰۃ والسلام) کے مبارک ہاتھوں سے تکمیل پا جاتا۔ لیکن ساتھیوں کی بزدلی اور پیٹھ دکھانے کے باعث انقلابی عمل تکمیل تک نہ پہنچ سکا۔ حالانکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے قوم کو اللہ کی طرف سے بشارت دی تھی کہ ارضِ مقدس تمہارے لیے لکھی جا چکی ہے‘ اب تمہاری ہمت درکار ہے‘ پیٹھ دکھاؤ گے تو ناکام و خاسر ہو جاؤ گے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام قوم کی اس ڈھٹائی‘ نافرمانی‘ بزدلی اور کورے جواب سے اتنے آزردہ اور دل گرفتہ ہوئے کہ ان کی زبان پر آ گیا:

﴿رَبِّ اِنِّيْ لَآ اَمْلِكُ اِلَّا نَفْسِيْ وَاَخِيْ فَافْرُقْ بَيْنَنَا وَبَيْنَ الْقَوْمِ الْفٰسِقِيْنَ ﴿۲۸۵﴾﴾ (المائدۃ)

''اے میرے ربّ! مجھے تو سوائے اپنی ذات اور اپنے بھائی کے کسی اور پر کوئی اختیار نہیں‘ پس تو ہم میں اور ان نافرمانوں میں جدائی ڈال دے۔''

قوم کی اس بزدلی اور کم ہمتی کا نتیجہ یہ نکلا کہ اللہ تعالیٰ نے بطورِ پاداش اپنا حکم سنا دیا:

﴿قَالَ فَاِنَّهَا مُحَرَّمَةٌ عَلَيْهِمْ اَرْبَعِيْنَ سَنَةً ۚ يَتِيْهُوْنَ فِي الْاَرْضِ ۭ﴾ (المائدۃ:۲۶)

''اللہ تعالیٰ نے فرمایا: (ان کی نافرمانی اور بزدلی کی وجہ سے) ان پر ارض مقدس چالیس سال تک حرام کر دی گئی ہے۔ اب یہ اسی صحرا میں (اس مدت تک) بھٹکتے رہیں گے۔''

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اس واقعہ سے سبق ملتا ہے کہ اگر جمعیت موجود ہو لیکن وہ غیر منظم ہو‘ اس میں سمع وطاعت کا جوہر نہ ہو‘ اس میں نظم وضبط نہ ہو تو بھی انقلابی عمل آخری مرحلہ میں داخل نہیں ہو سکے گا۔ اس کے لیے وہ جماعت درکار ہے جس کے متعلق آنحضور ﷺ نے فرمایا:

((آمُرُکُمْ بِخَمْسٍ: بِالْجَمَاعَةِ وَالسَّمْعِ وَالطَّاعَةِ وَالْهِجْرَةِ وَالْجِهَادِ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ)) (۱)

’’(مسلمانو!) میں تمہیں پانچ باتوں کا حکم دیتا ہوں۔ التزامِ جماعت کا‘ اور سننے اور ماننے کا‘ اور اللہ کی راہ میں ہجرت اور جہاد کا۔‘‘

ایک اور روایت میں ((آمُرُکُمْ بِخَمْسٍ)) کے بعد الفاظ آتے ہیں: ((اَللّٰہُ اَمَرَنِیْ بِھِنَّ)) ’’اللہ نے مجھے ان کا حکم دیا ہے‘‘۔ اس طرح یہ حکم مزید مؤکد ہو جاتا ہے۔ پس معلوم ہوا کہ اقامت دین کے مرحلے کو طے کرنے کے لیے ٹھیٹھ اسلامی اصولِ سمع وطاعت پر مبنی ایک منظم جماعت ناگزیر ہے۔ یہ بات بھی واضح رہے کہ جہاد کی میں نے جو سطحیں بیان کی ہیں‘ اُن سے عہدہ برآ ہونے کے لیے بھی جماعتی زندگی لازم ہے۔ اکیلا شخص معاشرے کے دباؤ‘ نفس کی ترغیبات اور ابلیس لعین کی تحریصات کے مقابلے میں مشکل ہی سے ٹھہر سکتا ہے۔

انقلابی دعوت وتربیت اور اس کا ذریعہ

انقلابی جدوجہد میں دعوت کے ساتھ تربیت کا مرحلہ آتا ہے۔ اس کی اہمیت کو اکبرالٰہ آبادی نے بڑی خوبصورتی کے ساتھ اس شعر میں بیان کیا ہے ؎

تو خاک میں مل اور آگ میں جل جب خشت بنے تب کام چلے
اِن خام دلوں کے عنصر پر بنیاد نہ رکھ تعمیر نہ کر!

علامہ اقبال نے اکبرالٰہ آبادی کو اپنا مرشدِ معنوی مانا ہے۔ اسی حقیقت کو اقبال نے جس طرح ادا کیا ہے اس کی اپنی ایک شان ہے۔ فرمایا: ؎

خام ہے جب تک تو ہے مٹی کا اک انبار تو
پختہ ہو جائے تو ہے شمشیرِ بے زنہار تو!

اور علامہ کی فارسی شاعری میں یہ مضمون نقطۂ عروج پر آتا ہے۔ ؎

(۱) مسند احمد ۱۳۰/۴۔ وسنن الترمذی‘ ابواب الامثال‘ باب ما جاء فی مثل الصلاۃ والصیام والصدقۃ۔

با نشۂ درویشی در ساز و دمادم زن!
چوں پختہ شوی خود را بر سلطنتِ جم زن!!

یہ تربیت ہے‘ یہ تزکیہ ہے‘ یہ تعلق باللہ ہے‘ یہ رضائے الٰہی کے حصول کی آرزو اور تمنا ہے۔ ان چیزوں سے وہ اجتماعی طاقت وجود میں آتی ہے جس کو سلطنتِ جم پر دے مارنا ہے‘ جس کو باطل اور طاغوت سے جا ٹکرانا ہے۔

انقلابی عمل کے اگلے تین مراحل وہی ہیں جو بیان ہو چکے ہیں: صبرِ محض‘ اقدام اور مسلح تصادم۔ لیکن یہ جو پہلا مرحلہ ہے‘ جسے انقلابی عمل میں اصل حیثیت واہمیت اور اوّلیت حاصل ہوتی ہے‘ اس کے دو مرحلے وہ ہیں جہاں جہاد قرآن کے ذریعے ہوگا۔ پہلا مرحلہ نظریاتی تصادم اور نظریاتی کشمکش کا ہے اور اس کے لیے بندۂ مؤمن کے ہاتھ میں جو تلوار ہے وہ قرآن ہے۔ از روئے الفاظِ قرآنی: ﴿وَجَاھِدْھُمْ بِہٖ جِھَادًا کَبِیْرًا﴾ اس کے ساتھ حکمت بھی ہو۔ فرمایا: ﴿ذٰلِکَ مِمَّآ اَوْحٰٓی اِلَیْکَ رَبُّکَ مِنَ الْحِکْمَةِ﴾ کہ اس حکمت کے ذریعے دعوت وتبلیغ ہو۔ یہ قرآن موعظۂ حسنہ بھی ہے۔ فرمایا: ﴿قَدْ جَآءَتْکُمْ مَّوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّکُمْ﴾ اسی میں جدال بھی ہے۔ مشرکین‘ ملحدین‘ منافقین اور اہل کتاب کے ساتھ مجادلہ کا ذریعہ بھی یہی قرآن ہے۔ سورۃ النحل کی اس آیت میں یہ تمام طریقے نہایت حسین انداز سے آ گئے ہیں: ﴿اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّکَ بِالْحِکْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْھُمْ بِالَّتِیْ ھِیَ اَحْسَنُ ط﴾ (آیت ۱۲۵) پس قرآن کی تلوار ہاتھ میں لے کر نظریاتی تصادم اور کشمکش کے میدان میں کود پڑو۔ انذار قرآن کے ذریعے سے ہو۔ ارشادِ الٰہی ہے: ﴿وَاُوْحِیَ اِلَیَّ ھٰذَا الْقُرْاٰنُ لِاُنْذِرَکُمْ بِہٖ وَمَنْ بَلَغَ ط﴾ (الانعام:۱۹) تبشیر قرآن کے ذریعے سے ہو۔ میں آپ کو سورۂ مریم کی آیت سنا چکا ہوں جس میں انذار اور تبشیر دونوں کا ذریعہ قرآن ہی کو قرار دیا گیا ہے: ﴿فَاِنَّمَا یَسَّرْنٰہُ بِلِسَانِکَ لِتُبَشِّرَ بِہِ الْمُتَّقِیْنَ وَتُنْذِرَ بِہٖ قَوْمًا لُّدًّا ○﴾ میں اپنے اس احساس کا اعادہ کر رہا ہوں کہ اس ’’بِہٖ‘‘ پر ہمارے اکثر اہل علم نے کما حقہٗ توجہ نہیں دی۔ سورۃ الکہف کی پہلی دو آیات میں بھی نہایت خوبصورت اسلوب سے انذار وتبشیر کے لیے ذریعہ قرآن ہی کو قرار دیا گیا ہے۔ فرمایا:

﴿اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْٓ اَنْزَلَ عَلٰی عَبْدِہِ الْکِتٰبَ وَلَمْ یَجْعَلْ لَّہٗ عِوَجًا ۝۱ قَیِّمًا لِّیُنْذِرَ بَاْسًا شَدِیْدًا مِّنْ لَّدُنْہُ وَیُبَشِّرَ الْمُؤْمِنِیْنَ الَّذِیْنَ یَعْمَلُوْنَ

الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمْ اَجْرًا حَسَنًا ۙ﴿۲﴾

''کل حمد وثنا اور شکر وسپاس اللہ کے لیے ہے جس نے اپنے بندے پر یہ کتاب نازل فرمائی اور اس میں کوئی ٹیڑھ نہ رکھی۔ ٹھیک ٹھیک سیدھی بات کہنے والی کتاب' تاکہ وہ لوگوں کو خدا کے سخت عذاب سے خبردار کر دے اور ایمان لا کر نیک عمل کرنے والوں کو خوشخبری دے دے کہ ان کے لیے اچھا اجر ہے۔''

تذکیر ہو تو قرآن سے ہو۔ فرمایا: ﴿فَذَكِّرْ بِالْقُرْاٰنِ مَنْ يَّخَافُ وَعِيْدِ ۝﴾ (ق)

''پس تم اس قرآن کے ذریعہ سے ہر اُس شخص کو نصیحت کر دو جو میری تنبیہہ سے ڈرے''۔ معلوم ہوا کہ دعوت وتبلیغ کہہ لیں یا نظریاتی تصادم وکشمکش کہہ لیں' اس کا ذریعہ' اس کا آلہ قرآن ہے۔ جبکہ ہم نے تو اِس قرآن کو وعظ کا ذریعہ بھی نہیں بنایا۔ اقبال نے اس کا مرثیہ کہا ہے ؎

واعظ دستاں زن و افسانہ بند — معنیٰ اُو پست و حرفِ اُو بلند
از خطیب و دیلمی گفتارِ اُو — با ضعیف و شاذ و مرسل کارِ اُو

یعنی واعظ کا حال یہ ہے کہ ہاتھ خوب چلاتا ہے اور سماں بھی خوب باندھتا ہے۔ اس کے الفاظ بھی پُرشکوہ اور بلند وبالا ہوتے ہیں لیکن معنی ومفہوم کے اعتبار سے نہایت پست اور ہلکے۔ اس کا سارا وعظ قرآن کے بجائے خطیب بغدادی اور دیلمی سے ماخوذ ہوتا ہے اور اس کا سارا سروکار بس ضعیف' شاذ اور مرسل روایات سے رہ گیا ہے۔ ہمارے عام واعظین نہ معلوم کہاں کہاں سے ضعیف حدیثیں لاتے ہیں۔ میں معذرت کے ساتھ عرض کرتا ہوں کہ بدقسمتی سے ہمارے دور میں ضعیف حدیثوں کے حوالے سے تبلیغ ایک باقاعدہ ادارے کی صورت اختیار کر گئی ہے۔ فضائل کے بیان اور نیکیوں کی تلقین کے لیے اولیائے کرامؒ کی غیر مصدّقہ کرامات کا ذکر ہے۔ وعظ ونصیحت کے لیے ضعیف بلکہ موضوع حدیثوں کا سہارا ہے' حالانکہ موعظۂ حسنہ تو یہ قرآن ہے۔ دل کی کایا پلٹ دینے کے وصف کا حامل یہ قرآن ہے' لیکن تلقین یہ کی جاتی ہے کہ اس کو سمجھنا بھی مت! تفسیر تو درکنار اس کا ترجمہ بھی نہ پڑھنا! اس کی تو بس تلاوت کر کے ثواب حاصل کر لیا کرو! وعظ ونصیحت کے لیے ضعیف روایات یا بے سروپا قصے کہانیاں ہیں' جن کو ایک عام معقول انسان کا ذہن بھی قبول نہ کرے اور ان کو تسلیم کرنے پر اس کا دل تیار نہ ہو۔ اس کے ذریعہ سے ابلاغ کیا ہوگا؟

جیسے کہ میں نے عرض کیا' انقلابی عمل میں پہلا مرحلہ دعوت کا ہے' جس کے لیے نظریاتی تصادم میں ہماری تلوار قرآن ہے اگرچہ اس کا حق ادا کرنا اور اس کو صحیح طور پر استعمال

کرنا آسان کام نہیں ہے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ ((خَيْرُكُمْ مَنْ تَعَلَّمَ الْقُرْآنَ وَعَلَّمَهُ)) کی بشارتِ نبویؐ کو چند سعید روحیں اپنا مقصدِ زندگی بنائیں۔ اُن کو اس کے لیے زندگیاں لگانی ہوں گی۔

دوسرا مرحلہ ہے تربیت۔ اس کے لیے بھی ہمارے پاس اصل تلوار قرآن ہے۔ ذرا غور تو کیجیے کہ قرآن مدعی ہے اس حقیقت کا کہ ﴿شِفَآءٌ لِّمَا فِي الصُّدُوْرِ﴾ میں ہوں۔ لیکن ہم نے تزکیۂ نفس کے لیے کہاں کہاں بھیک مانگی ہے اور پھر اس کے لیے فلسفے اور پورے پورے نظام مدوّن کیے ہیں۔ مگر اِس کوچے میں گزر نہیں ہے تو قرآن کا نہیں ہے۔ اقبال نے اس کا بھی نوحہ کیا اور مرثیہ کہا ہے ؎

صوفیِ پشمینہ پوشِ حال مست — از شرابِ نغمۂ قوال مست
آتش از شعرِ عراقی در دلش — در نمی سازد بقرآں محفلش

''پشمینہ پوش صوفی اپنے حال میں مست اور قوالی کی شراب سے مدہوش ہے۔ اس کے دل میں عراقی کے شعر سے آگ بھڑک اُٹھتی ہے لیکن اس کی محفل میں قرآن کا کہیں گزر نہیں ہے۔''

اور بالفرض کچھ ہو بھی تو اس کا کوئی اثر نہیں' جو مدعی ہے ''شِفَاءٌ لِّمَا فِي الصُّدُوْرِ'' ہونے کا اور جس کے بارے میں اُس کا نازل کرنے والا خود ارشاد فرماتا ہے:

﴿وَنُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْاٰنِ مَا هُوَ شِفَآءٌ وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ﴾ (بنی اسراء یل:۸۲)

''ہم اس قرآن کے سلسلۂ تنزیل میں وہ کچھ نازل کر رہے ہیں جو اہل ایمان کے لیے شفا اور رحمت ہے۔''

لیکن اس کی ناقدری کا یہ عالم ہے کہ ہم نے سارے کوچے کھنگال لیے' در در سے بھیک مانگ لی' لیکن یہ دروازہ بند ہے۔ حالانکہ تربیت وتزکیہ بھی اسی قرآن کے ذریعے ہوگا! میں سمجھتا ہوں کہ اس بات کو بھی اس دور میں اقبال نے خوب پہچانا ہے۔ میں علمائے کرام کی عظمت اور ان کے مقام ومرتبہ کا معترف ہوں' لیکن اس حقیقت کو بیان کیے بغیر بھی چارہ نہیں کہ ان حقائق کا جو انکشاف اقبال پر ہوا ہے اور ان کا جو شعور وادراک علامہ کو حاصل ہوا ہے وہ مجھے اس دور میں اور کہیں نظر نہیں آتا۔ کس خوبصورتی سے کہتے ہیں: ؎

کشتنِ ابلیس کارے مشکل است — زانکہ اُو گم اندر اعماقِ دل است
خوشتر آں باشد مسلمانش کنی — کشتۂ شمشیرِ قرآنش کنی!

’’شیطان کو بالکل ہلاک کر دینا بہت مشکل کام ہے۔ اس لیے کہ وہ انسان کے دلوں میں ڈیرا لگا لیتا ہے اور اس کی رسائی انسان کے دل کی گہرائیوں تک ہے۔ بہتر راستہ یہ ہے کہ اسے قرآن کی حکمت و ہدایت کی شمشیر سے گھائل کر کے مسلمان بنا لیا جائے۔‘‘

غور کیجیے ہر شعر میں احادیث نبویہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے مفہوم کو کس خوبی سے سمو دیا ہے! یہ حدیث نبویؐ گزر چکی ہے کہ آپؐ نے فرمایا:

((اِنَّ الشَّيْطٰنَ يَجْرِىْ مِنَ الْاِنْسَانِ مَجْرَى الدَّمِ)) (متفق علیہ)

’’شیطان انسان کے وجود میں اس طرح سرایت کر جاتا ہے جیسے کہ خون۔‘‘

پہلے شعر میں اس کا حوالہ ہے۔ دوسرا شعر بھی ایک حدیثِ نبویؐ سے ماخوذ ہے۔ ایک مرتبہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ ہر انسان کے ساتھ ایک شیطان ہوتا ہے۔ کسی صحابی نے بڑی ہمت اور جرأت کی (اللہ تعالیٰ انہیں اجر دے، وہ دریافت نہ کرتے تو یہ حکمت ہم تک کیسے پہنچتی) انہوں نے سوال کیا کہ حضور ﷺ! کیا آپ کے ساتھ بھی ہے؟ آپ نے جواب میں فرمایا: ’’ہاں ہے، لیکن میں نے اسے مسلمان کر لیا ہے!‘‘ یہ ہے وہ بات جو دوسرے شعر میں علامہ نے کہی ہے کہ اس قرآن کی شمشیر سے گھائل کر کے شیطان کو مسلمان بنایا جا سکتا ہے۔

اگر زہر ایسا ہے جو پورے وجود میں سرایت کرتا ہے تو یہ قرآن بھی وہ تریاق ہے جو پورے وجود میں سرایت کرتا ہے۔ ظاہر ہے اگر تریاق زہر سے زیادہ مؤثر نہ ہو تو زہر کا اثر کیسے زائل ہوگا! اس بات کو بھی اقبال نے اس طرح کہا ہے ؎

چوں بجاں در رفت جاں دیگر شود
جاں چوں دیگر شد جہاں دیگر شود!

یعنی یہ قرآن جب کسی کے اندر سرایت کر جاتا ہے تو اس کے اندر ایک انقلاب آ جاتا ہے۔ اب وہ انسان بالکل بدلا ہوا انسان بن جاتا ہے۔ یہ باطنی انقلاب ہے، اندر کی تبدیلی ہے۔ یہ باطنی انقلاب، یہ اندر کی تبدیلی ایک عالمی انقلاب کا پیش خیمہ بنتی ہے، ورنہ انقلاب کہاں سے آئے گا۔ ’’جہاں دیگر شود‘‘ کا اصل مفہوم تو یہ ہوگا کہ جس انسان کے اندر قرآن کے ذریعے تبدیلی آ گئی اس کے لیے جہاں بدل گیا، اس کی دیکھنے والی نگاہ بدل گئی، اس کا زاویہ نظر بدل گیا، اس کی اقدار بدل گئیں۔ اب اس کے لیے یہ جہاں وہ نہیں ہے، بلکہ ’’جہانِ نو ہو رہا ہے پیدا یہ عالم پیر مر رہا ہے‘‘ والا معاملہ ہے۔ جب کسی کے دل میں قرآن اتر جائے تو اس کے لیے اب یہ عالم نیا عالم ہے۔ اس کا نقطۂ نظر اور مطلوب و مقصود بدل گیا ہے۔ اسی لیے میں کہہ رہا ہوں کہ اگر ایسے

فدائین کی ایک منظم جماعت وجود میں آ جائے جن کے دلوں میں قرآن جاگزیں ہو جائے تو یہ تبدیلی عالمی انقلاب کا پیش خیمہ بن سکتی ہے۔ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے اندر جوشِ ایمانی اور اعلائے کلمۃ اللہ کے لیے ایثار و قربانی کا جذبہ اسی قرآن کی بدولت ہی پیدا ہوا تھا۔ یہ مختصر سی اور بے سروسامان جماعت ایک ہاتھ میں قرآن اور ایک ہاتھ میں تلوار لے کر کسریٰ و قیصر یعنی وقت کی دو عظیم سلطنتوں سے جا ٹکرائی تھی اور بیس سال کے مختصر عرصہ میں اول الذکر کو بالکل نیست و نابود کر کے رکھ دیا تھا، جبکہ آخر الذکر کو مشرقِ وسطیٰ اور شمالی افریقہ سے بالکلیہ بے دخل کر دیا تھا اور ان علاقوں پر اللہ کے دین کا جھنڈا لہرانے لگا تھا۔

حاصل کلام یہ کہ انقلابی عمل کی دو سطحیں ہیں، یا یوں کہہ لیں کہ جہاد کے دو levels ہیں۔ مجاہدہ مع النفس کے لیے ہمارا آلہ جہاد قرآن ہے اور نظریاتی کشمکش اور تصادم کے لیے بھی ہماری تلوار قرآن ہے۔

تحدیث بالنعمۃ کے طور پر عرض کرتا ہوں کہ اسی جہاد بالقرآن کا عزم لے کر میں ۱۹۶۵ء کے اواخر میں ساہیوال سے لاہور منتقل ہوا تھا، ورنہ ۱۹۵۴ء میں لاہور سے ایم بی بی ایس کر کے میں ساہیوال میں مقیم ہو گیا تھا۔ لاہور آ کر میں نے بالکل تن تنہا اس کام کو شروع کیا۔ اُس وقت کوئی ساتھی، کوئی ادارہ اور کوئی انجمن نہیں تھی۔ ’’میثاق‘‘ کا چارج سنبھالا تو تنہا خود ہی اس کا ایڈیٹر، خود ہی مالک، خود ہی پروف ریڈر، حتیٰ کہ خود ہی اس کا کلرک اور چپڑاسی۔ پھر دارالاشاعت الاسلامیہ قائم کیا تو وہ بھی تنہا، وہی ’’میثاق‘‘ والی صورت حال تھی۔ ساتھ ہی مولانا حسرت موہانی کے اس مصرعہ ع ’’ہے مشقِ سخن جاری، چکی کی مشقت بھی‘‘ کے مصداق مطب بھی کر رہا تھا، نبضیں بھی دیکھ رہا تھا اور نسخے بھی لکھ رہا تھا۔ اسی دوران کئی علاقوں میں مطالعۂ قرآن کے حلقے قائم کیے اور منتخب نصاب کا درس شروع کیا۔ قرآن کی دعوت کا یہ اعجاز کہ اعوان و انصار ملتے چلے گئے۔ ۱۹۷۲ء کے اوائل میں میں نے میثاق میں ’’مرکزی انجمن خدام القرآن‘‘ اور اس کے زیرِ انتظام قرآن اکیڈمی کے قیام کا خاکہ پیش کیا۔ الحمد للہ بعض دردمند اور اہلِ دل حضرات نے اس پر لبیک کہی اور ۱۹۷۲ء کے وسط میں باقاعدہ انجمن قائم ہو گئی۔ میں نے انجمن کے خاکے اور پھر دستور کی تقدیم میں یہ شعر درج کیا تھا ؎

گئے دن کہ تنہا تھا میں انجمن میں!
یہاں اب مرے رازداں اور بھی ہیں!

الحمد للہ ۱۹۷۲ء سے ۱۹۸۴ء تک قریباً بارہ سال انجمن کے قیام پر گزر گئے ہیں۔ اس

عرصہ میں جو بھی بن پایا ہے اور جس کام کی بھی اللہ کی طرف سے توفیق ملی ہے وہ آپ حضرات کے سامنے ہے۔ انجمن کا قیام‘ اس کے لیے دفاتر‘ رہائشی کوارٹرز‘ ہاسٹل‘ جامع القرآن قرآن اکیڈمی کی تعمیرات‘ علوم ومعارف قرآن کی نشر واشاعت کے لیے مکتبہ کا قیام‘ دعوت رجوع الی القرآن کا پیغام پہنچانے کے لیے پاکستان کے دوسرے شہروں کے دورے اور دروس وخطابات کے ذریعے دین کے جامع تصور کو اُجاگر کرنے کی کوشش‘ قرآن کانفرنسوں اور محاضراتِ قرآنی کا انعقاد‘ مختلف شہروں میں قرآنی تربیت گاہوں کا انتظام‘ ساتھ ہی اسی پیغام کے لیے بیرون پاکستان کے اسفار‘ میں نے یہ کام صرف اس مقصد کے لیے گنوائے ہیں کہ میں چاہتا ہوں کہ ان سب کاموں کو آپ ’’جہاد بالقرآن‘‘ کے عنوان کے تحت اپنے حافظے میں درج کر لیں۔

ایک وقت وہ بھی آیا جب خالصتاً اللہ ہی کی طرف سے اس دور کے سب سے مؤثر ذریعہ ابلاغ ٹیلی ویژن پر پورے پندرہ ماہ تک ’’الہدیٰ‘‘ کے نام سے قرآن مجید کا پیغام ملک کے گوشے گوشے تک پہنچا۔ پہلی مرتبہ جب اسلام آباد سے ٹی وی کے ایک پروڈیوسر صاحب مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کے دفتر میں رمضان المبارک میں روزانہ ’’الکتاب‘‘ کے عنوان سے تقاریر کی تجویز لے کر تشریف لائے تو اُس وقت انجمن کی مجلس منتظمہ کا اجلاس ہو رہا تھا۔ میں وہاں سے اٹھ کر ان سے ملنے گیا۔ انہوں نے کہا کہ پورے رمضان میں روزانہ بارہ منٹ کا ’’الکتاب‘‘ کے عنوان سے ایک پروگرام ہوگا‘ اس میں آپ کو ایک پارے کے بارے میں کچھ بیان کرنا ہوگا۔ میں نے کہا مجھے ایک آیت کے لیے بسا اوقات ایک گھنٹہ درکار ہوتا ہے اور آپ ایک پارے کے لیے مجھے بارہ منٹ عطا کر رہے ہیں‘ میں اس مختصر سے وقت میں کہوں گا کیا؟ میں نے معذرت کی کہ مجھ میں اس کی نہ صلاحیت ہے اور نہ جرأت۔ آپ کسی اور کو تلاش کیجیے۔ میں دفتر والوں سے یہ کہہ کر کہ ان کی چائے وغیرہ سے تواضع کر کے ان کو رخصت کر دو‘ انجمن کے اجلاس میں واپس آ گیا۔ ساتھیوں نے پوچھا کہ کون صاحب تھے؟ کیا معاملہ تھا؟ میں نے جب بتایا تو سب اراکین میرے سر ہو گئے کہ آپ نے یہ کیا کیا‘ وہ پانچ منٹ بھی دیں تو ضرور لے لیں! وہ اس ذریعہ ابلاغ کی اہمیت سے واقف تھے۔ بہرحال اراکین کے اصرار پر میں دوبارہ اٹھ کر گیا‘ وہ صاحب ابھی چائے پی رہے تھے۔ میں نے ان سے کہا کہ ساتھیوں کے اصرار پر میں یہ پیشکش منظور کرتا ہوں۔

چنانچہ دو سال رمضان المبارک میں روزانہ ’’الکتاب‘‘ کا پروگرام ٹی وی پر نشر ہوا‘ پھر

تیسرے سال رمضان ہی میں ’’الٓمٓ‘‘ سیریز چلی‘ پھر ’’الہدیٰ‘‘ کا ہفتہ وار پروگرام نشر ہوا۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے خاص فضل سے یہ راستہ پیدا فرما دیا۔ پھر بالکل درمیان میں ’’الہدیٰ‘‘ کا پروگرام ختم ہو گیا۔ درمیان میں اس لیے عرض کر رہا ہوں کہ میں اس پروگرام میں ’’مطالعۂ قرآن حکیم کا منتخب نصاب‘‘ سلسلہ وار بیان کر رہا تھا۔ وہ نصف ہوا تھا کہ اچانک اس پروگرام کو بند کر دیا گیا۔ لیکن میں قطعی مطمئن ہوں کہ یہ اللہ ہی کا فیصلہ ہے اور اس میں یقیناً خیر ہے۔ ارشادِ الٰہی ہے:

﴿وَعَسٰٓی اَنْ تَکْرَهُوْا شَیْئًا وَّهُوَ خَیْرٌ لَّكُمْ ۚ وَعَسٰٓی اَنْ تُحِبُّوْا شَیْئًا وَّهُوَ شَرٌّ لَّكُمْ ۗ وَاللّٰهُ یَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۲۱۶﴾﴾ (البقرۃ)

’’ہوسکتا ہے کہ ایک چیز تمہیں ناگوار ہو اور وہ تمہارے لیے بہتر ہو۔ اور ہوسکتا ہے کہ ایک چیز تمہیں پسند ہو اور وہ تمہارے لیے بری ہو۔ اللہ جانتا ہے‘ تم نہیں جانتے۔‘‘

اس ’’الہدیٰ‘‘ کے پروگرام کے ذریعے ملک بھر میں ایک پیاس پیدا ہوگئی۔ لوگوں کی یہی پیاس ہے جو مجھے کھینچ کر جگہ جگہ لے جا رہی ہے اور عرصہ سے صورت حال یہ ہے کہ میں عموماً لاہور سے ہفتہ کی صبح کو نکلتا ہوں اور جمعرات کی رات یا جمعہ کی صبح کو یہاں واپس پہنچتا ہوں۔ اگر آج شہر شہر جا کر میں قرآن کا پیغام پہنچا رہا ہوں تو ظاہر بات ہے کہ اس کے لیے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے ’’الہدیٰ‘‘ کے پروگرام کو بنایا‘ ورنہ ہمیں کون جانتا تھا‘ اور اگر ہم پچاس برس بھی لگے رہتے تو اپنے محدود ذرائع و وسائل سے اتنا وسیع حلقہ تعارف پیدا نہیں ہوسکتا تھا اور معاشرے میں اتنی پیاس پیدا نہیں ہوسکتی تھی جو بظاہر احوال نظر آ رہی ہے۔

بہرکیف میں گفتگو کے اختتام سے قبل عرض کرنا چاہتا ہوں کہ قرآن ہی ہمارا ذریعۂ دعوت ہے۔ نظریاتی تصادم اور کشمکش کے لیے ہماری تلوار قرآن حکیم ہے۔ جہاد بالقرآن ہی ہمارا طریقۂ کار ہے۔ نفس اور شیطان سے کشمکش کے لیے بھی ہمارے ہاتھ میں واحد تلوار قرآن مجید ہے۔ تزکیہ نفس کے لیے قرآن نے جو پروگرام دیا ہے‘ اس میں دو مؤثر ترین چیزیں ہیں‘ ایک قیام اللیل‘ دوسری اس قیام میں ترتیل کے ساتھ زیادہ سے زیادہ قرآن کی تلاوت وقراءت۔ ابتدا میں قیام اللیل کا حکم اطلاقی شان کے ساتھ آیا تھا:

﴿یٰٓاَیُّهَا الْمُزَّمِّلُ ﴿۱﴾ قُمِ الَّیْلَ اِلَّا قَلِیْلًا ﴿۲﴾ نِّصْفَهٗۤ اَوِ انْقُصْ مِنْهُ قَلِیْلًا ﴿۳﴾ اَوْ زِدْ عَلَیْهِ وَرَتِّلِ الْقُرْاٰنَ تَرْتِیْلًا ﴿۴﴾﴾ (المزّمّل)

’’اے اوڑھ لپیٹ کر سونے والے (ﷺ)! رات کو نماز میں کھڑے رہا کرو مگر کم۔

آدھی رات‘ یا اس سے کچھ کم کرلو‘ یا اس سے کچھ زیادہ بڑھادو‘ اور قرآن کو خوب ٹھہر ٹھہر کر پڑھو۔‘‘

بعد میں جب اس نے ایک معین شکل اختیار کی تو حکم آیا:

﴿وَمِنَ الَّيْلِ فَتَهَجَّدْ بِهٖ نَافِلَةً لَّكَ﴾ (بنی اسراءیل:۷۹)

’’اور رات کو اِس (قرآن) کے ساتھ قیام کرو‘ یہ تمہارے لیے نفل ہے۔‘‘

رات کا جاگنا اور مجرد جاگنا نہیں‘ بلکہ قیام میں قرآن کی طویل قراءت وتلاوت‘ یہ دو ہتھیار ہیں جن سے ایک بندۂ مؤمن کی جہاد بالقرآن کے لیے سیرت کی تعمیر ہوتی ہے اور اس دعوتِ موعظہ اور مجادلہ میں تأثیر پیدا ہوتی ہے۔

اللہ تعالیٰ اس قرآن کو ہاتھ میں لے کر ہمیں باطل کے خلاف نبرد آزما ہونے اور خود اپنے شیطان اور اپنے نفس سے لڑنے کے لیے اس قرآن کی تلوار کو استعمال کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

اَللّٰهُمَّ آنِسْ وَحْشَتَنَا فِيْ قُبُوْرِنَا‘ اَللّٰهُمَّ ارْحَمْنَا بِالْقُرْاٰنِ الْعَظِيْمِ‘ وَاجْعَلْهُ لَنَا اِمَامًا وَّنُوْرًا وَّهُدًى وَّرَحْمَةً‘ اَللّٰهُمَّ ذَكِّرْنَا مِنْهُ مَا نَسِيْنَا وَعَلِّمْنَا مِنْهُ مَا جَهِلْنَا‘ وَارْزُقْنَا تِلَاوَتَهٗ آنَاءَ الَّيْلِ وَآنَاءَ النَّهَارِ وَاجْعَلْهُ لَنَا حُجَّةً يَّا رَبَّ الْعَالَمِيْنَ!

اسلامی انقلاب کے لیے التزامِ جماعت اور لزومِ بیعت

ترتیب وتسوید: شیخ جمیل الرحمٰن

خطبہ مسنونہ کے بعد!

اعوذ باللّٰہ من الشّیطٰن الرَّجیم ۔ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

﴿اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ ط يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَيَقْتُلُوْنَ وَيُقْتَلُوْنَ قف وَعْدًا عَلَيْهِ حَقًّا فِي التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِيْلِ وَالْقُرْاٰنِ ط وَمَنْ اَوْفٰى بِعَهْدِهٖ مِنَ اللّٰهِ فَاسْتَبْشِرُوْا بِبَيْعِكُمُ الَّذِيْ بَايَعْتُمْ بِهٖ ط وَذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ﴿۱۱۱﴾ اَلتَّآئِبُوْنَ الْعٰبِدُوْنَ الْحٰمِدُوْنَ السَّآئِحُوْنَ الرّٰكِعُوْنَ السّٰجِدُوْنَ الْاٰمِرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَالنَّاهُوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَالْحٰفِظُوْنَ لِحُدُوْدِ اللّٰهِ ط وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۱۲﴾﴾ (التوبۃ)

محترم صدرِ مجلس‘ علمائے کرام‘ معزز حضرات اور محترم خواتین!

میں نے پرسوں ’’جہاد بالقرآن‘‘ کے موضوع پر اظہارِ خیال کے آخر میں عرض کر دیا تھا کہ مجھے آج بھی آپ حضرات کی سمع خراشی کرنی ہے۔ اگرچہ میں نے کل عرض کر دیا تھا کہ آج کی نشست میں پہلی تقریر صدرِ اجلاس محترم مولانا سعید احمد اکبر آبادی مدظلہ کی ہوگی‘ جس کا عنوان ہے: ’’مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم —— سیرت وشخصیت —— علمی کارنامے —— اور شیخ الہندؒ کا ان سے خصوصی تعلق خاطر‘‘(۱) لیکن چونکہ میری آج کی گفتگو مولانا موصوف کی تقریر سے کسی حد تک متعلق ہے۔ لہٰذا میں صرف اس تبدیلی کے لیے معذرت خواہ ہوں۔ اس کے فوراً بعد صدرِ مکرم کا خطاب ہوگا۔

(۱) یہ تقریر ماہنامہ ’’حکمتِ قرآن‘‘ کے اگست ۱۹۸۴ء کے شمارے میں شائع ہو چکی ہے اور اس کتاب میں بھی شامل ہے۔ (مرتب)

قرآن مجید کے مطالعہ سے ایک لطیف حقیقت جو سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ بندۂ مؤمن کی شخصیت کے تین رخ ہیں۔ جیسے ہمارا تصورِ مکان ہے' (three dimensional concept of space) ویسے ہی بندۂ مؤمن کی شخصیت کے بھی تین ابعاد (dimensions) ہیں۔ تین جوانب واطراف ہیں جن میں سے دو کا تعلق ظاہر سے ہے اور اس پہلو سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ ایک تصویر کے دو رخ ہیں۔ تیسرے کا تعلق باطن سے ہے۔ مطالعہ قرآن حکیم کا میں نے جو منتخب نصاب مرتب کیا ہے جو مرکزی انجمن خدام القرآن کی دعوت اور تنظیم اسلامی کی تحریک کی جڑ اور بنیاد ہے' اس کے تیسرے حصے میں ایمانیات کے مباحث میں قرآن حکیم کے دو مقامات سے میں نے ان دو ظاہری رخوں کو بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہ دونوں مقامات ایک دوسرے کے لیے توضیحی یعنی (complimentary) نوعیت کے ہیں۔ دونوں مل کر ایک حقیقت کی تکمیل کرتے ہیں۔ قرآن مجید میں ایک طرف سورۃ النور میں حقیقت ایمان کو ایک نہایت بلیغ اور نہایت فصیح تمثیل کے ذریعہ سے بیان کیا گیا: ﴿اَللّٰہُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ﴾ پھر جن لوگوں کے قلوب اس نور سے منور ہو جاتے ہیں' ان کی شخصیت کی جھلک ان الفاظِ مبارکہ میں دکھا دی گئی:

﴿فِیْ بُیُوْتٍ اَذِنَ اللّٰہُ اَنْ تُرْفَعَ وَیُذْکَرَ فِیْھَا اسْمُہٗ ۙ یُسَبِّحُ لَہٗ فِیْھَا بِالْغُدُوِّ وَالْاٰصَالِ ۝ رِجَالٌ ۙ لَّا تُلْھِیْھِمْ تِجَارَۃٌ وَّلَا بَیْعٌ عَنْ ذِکْرِ اللّٰہِ وَاِقَامِ الصَّلٰوۃِ وَاِیْتَآءِ الزَّکٰوۃِ ۪ۙ یَخَافُوْنَ یَوْمًا تَتَقَلَّبُ فِیْہِ الْقُلُوْبُ وَالْاَبْصَارُ ۝﴾

اب یہ نقشہ ہے کہ ان کی طبیعت کا میلان کیا ہے؟ اور ان کے دل کو سکون میسر آتا ہے تو کہاں آتا ہے! ان گھروں میں جو اللہ کے ذکر کے لیے مخصوص ہیں۔ جیسا کہ حضور ﷺ کی ایک حدیث میں آتا ہے: ((وَرَجُلٌ قَلْبُہٗ مُعَلَّقٌ بِالْمَسَاجِدِ)) وہ لوگ جن کا دِلی تعلق مسجدوں سے ہے' وہ صبح وشام اس میں اللہ کا ذکر کرتے ہیں' تسبیح کرتے ہیں' اگرچہ وہ دُنیوی کاروبار میں بھی منہمک رہتے ہیں' معاش کی ذمہ داریاں بھی ادا کر رہے ہیں' لیکن رِجَالٌ وہ جواں مرد کہ ان کو کوئی کاروبارِ دنیوی' کوئی لین دین' کوئی خرید وفروخت' کوئی مصروفیت اللہ کے ذکر' اقامت صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ سے باز نہیں رکھتی۔ وہ خوف رکھتے ہیں اس دن سے یعنی قیامت کا جس میں اُلٹے جائیں گے دل اور آنکھیں —— اب یہ ایک نقشہ ہے' ایک رخ ہے۔ اطاعت' عبادت' ذکر' ان چیزوں کو جمع کر لیجیے تو بندۂ مؤمن کی سیرت اور شخصیت کا ایک رخ بن گیا۔

سورۂ آل عمران کے آخری رکوع میں مؤمنین صادقین کی جو عظیم دعائیں آئی ہیں ان دعاؤں کے بعد' ان دعاؤں کی قبولیت کے طور پر جو الفاظ مبارکہ وارد ہوئے ہیں وہ میرے موضوع سے متعلق ہیں اور ان ہی میں ایک بندۂ مؤمن کی سیرت وشخصیت کا دوسرا رخ سامنے آتا ہے۔ ارشاد فرمایا گیا:

﴿فَاسْتَجَابَ لَھُمْ رَبُّھُمْ اَنِّیْ لَآ اُضِیْعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنْکُمْ مِّنْ ذَکَرٍ اَوْ اُنْثٰی ۚ بَعْضُکُمْ مِّنْ ۢ بَعْضٍ ۚ فَالَّذِیْنَ ھَاجَرُوْا وَاُخْرِجُوْا مِنْ دِیَارِھِمْ وَاُوْذُوْا فِیْ سَبِیْلِیْ وَقٰتَلُوْا وَقُتِلُوْا لَاُکَفِّرَنَّ عَنْھُمْ سَیِّاٰتِھِمْ وَلَاُدْخِلَنَّھُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِھَا الْاَنْھٰرُ ۚ ثَوَابًا مِّنْ عِنْدِ اللّٰہِ ؕ وَاللّٰہُ عِنْدَہٗ حُسْنُ الثَّوَابِ ۝﴾

''جواب میں ان کے ربّ نے فرمایا' میں تو تم میں سے کسی عمل کرنے والے کا عمل ضائع کرنے والا نہیں ہوں' خواہ وہ مرد ہو خواہ عورت' تم ایک دوسرے کے ہم جنس ہو۔ تو جن لوگوں نے میری خاطر ہجرت کی' جو اپنے گھروں سے نکالے گئے' جو میری راہ میں ستائے گئے اور میرے لیے لڑے' قتل بھی کیا اور مقتول بھی ہوئے میں لازماً ان کی سب خطائیں معاف کر دوں گا اور لازماً ان کو ایسے باغات میں داخل کروں گا جن کے دامن میں ندیاں بہتی ہوں گی۔ یہ اجر ہے ان کا اللہ کے پاس اور بہترین جزا تو اللہ ہی کے پاس ہے۔''

یہ دوسرا رخ ہے۔ ہجرت' مصائب' صبر ومصابرت' جہاد اور قتال —— سورۂ آل عمران کی آخری آیت میں امر کے صیغے میں صبر ومصابرت اور باطل کے مقابلے میں پامردی دکھانے' حق کا بول بالا کرنے کے لیے کمربستہ رہنے کا ذکر فرمایا گیا ہے: ﴿یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اصْبِرُوْا وَصَابِرُوْا وَرَابِطُوْا ۟﴾ —— یہ دوسرے رخ کی تکمیل ہے۔

اصل میں یہ دونوں رخ جمع ہوں تو وہ بات بنتی ہے جس کی رپورٹ دی تھی ایران کے سپہ سالار رستم کے ان جاسوسوں نے جن کو اس تحقیق کے لیے بھیجا گیا تھا کہ بے سروسامان اور لوٹ مار کی خوگر اس عرب قوم کی کایا پلٹ اور قلبِ ماہیت کے اسباب کیا ہیں؟ آخر ان مٹھی بھر مسلمانوں کی فوج میں یہ عزم وحوصلہ کیسے پیدا ہوا کہ وہ ایران جیسی وقت کی ایک عظیم ترین قوت سے ٹکرا رہے ہیں اور اسے پاش پاش کر رہے ہیں! اس رپورٹ کا یہ جملہ نہایت جامع اور حالات کی حقیقی تصویر کے طور پر تاریخ میں نقل ہوا ہے کہ یہ بڑے عجیب وغریب قسم کے لوگ

ہیں: هُمْ رُهْبَانٌ بِاللَّيْلِ وَفُرْسَانٌ بِالنَّهَارِ ''یہ رات کے راہب ہیں اور دن کے شاہسوار ہیں''۔ ان کی راتیں اپنے اللہ کے حضور میں قیام وسجودِ الحاح وگریہ اور دعا ومناجات میں بسر ہوتی ہیں' ان کی داڑھیاں اور ان کی سجدہ گاہیں خشیت الٰہی کے آنسوؤں سے تر ہوتی ہیں اور دن کو یہی لوگ برق کی طرح میدانِ جنگ میں کوندتے ہیں' لپکتے جھپٹتے ہیں' یہ اس راہ میں گردن کٹا دینے کو اپنے لیے باعث سعادت سمجھتے ہیں' جبکہ دنیا جنگ کے جن طور طریقوں سے آج تک واقف چلی آ رہی ہے وہ تو یہ ہیں کہ فوجیوں کی راتیں شراب وکباب اور شباب سے کھیلنے میں بسر ہوتی ہیں۔ جس بستی یا اس کے آس پاس کسی فوج کا پڑاؤ ہو جائے کیا وہاں کی کسی جوان خاتون کی عصمت وعفت محفوظ رہ سکتی ہے! لیکن یہ وہ اعجوبۂ انوکھے اور نرالے اللہ کے سپاہی تھے کہ ان کی زندگی' ان کی شخصیت کے یہ دو رخ اتنے ظاہر ونمایاں تھے کہ جو غیر مسلم ایرانی جاسوسوں کو بھی نظر آ گئے —— تیسرا رخ ہے باطن کا —— وہ ہے اخلاص فی النیۃ' وہ ہے اخلاص فی العبادۃ' وہ ہے مقامِ شکر' وہ ہے مقام توکل اور مقامِ رضا' جو میرے نزدیک ان سب مقاماتِ عالیہ سے بلند ترین مقام ہے۔ اس کے بارے میں میرا خیال ہے کہ علامہ اقبال کا یہ شعر حرفِ آخر ہے' جو وہ کہہ گئے ہیں ؎

بروں کشید ز پیچاکِ ہست و بود مرا
چہ عقدہ ہا کہ مقامِ رضا کشود مرا

انسان کو دنیا میں پیچ وتاب کی جو کیفیات لاحق رہتی ہیں' ان سے نکال لینے والا درحقیقت مقامِ رضا ہے—— ان باطنی لطائف سے متعلق ہمارے صوفیاء نے بڑی معرکۃ الآراء بحثیں کی ہیں۔

بہرحال ایک بندۂ مؤمن کی شخصیت کے یہ تین رخ ہیں۔ ان میں سے ہر رخ پر آج کی نشست میں گفتگو ہونے والی ہے۔ ظاہری دو رخ تو میری آج کی گفتگو میں زیر بحث آ رہے ہیں۔ تصوف کے موضوع پر اسی نشست میں ان شاء اللہ العزیز دو مقالے پیش ہوں گے' ایک مقالہ مولانا الطاف الرحمٰن صاحب بنوی جو قرآن اکیڈمی میں معلم ہیں' پیش فرمائیں گے' ان کے مقالہ کا عنوان ''حقیقت تصوف'' ہے۔ دوسرا مقالہ مولانا ڈاکٹر غلام محمد صاحب مدظلہ کا ہے۔ وہ اس سمندر کے شناور ہیں۔ مولانا سید سلیمان ندویؒ کے خلیفہ مجاز ہیں۔ وہ جب گفتگو کریں گے تو وہ صرف ''قال'' پر نہیں بلکہ ''حال'' پر مبنی ہوگی' ان شاء اللہ العزیز۔ ان کے مقالہ کا انوکھا موضوع یہ ہے: ''حضرت عمرؓ اور تصوف''۔ عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ

حضرت عمرؓ کو زیادہ دلچسپی دین کے ظاہری احکام سے تھی۔ چند لوگوں نے حضرت عمرؓ کی شخصیت کو اپنے بہت سے غلط مقاصد کے لیے استعمال کیا ہے۔ چنانچہ تصوف دشمنی کے لیے بھی اسے exploit کیا گیا ہے اور حَسْبُنَا كِتَابُ اللّٰهِ کے قولِ حق سے آج اُرِيْدَ بِهِ الْبَاطِلُ کا کام لیا جا رہا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ بہت ہی قیمتی بات ہوگی کہ تصوف کے بارے میں حضرت عمرؓ کی سیرت کا یہ پہلو بھی ہمارے سامنے آ جائے—— اسی سے متعلق ایک موضوع ہے ''فلسفہ مذہب واخلاق'' اس پر قرآن اکیڈمی کے ڈائریکٹر برادرم ڈاکٹر ابصار احمد صاحب ایک مقالہ پیش کریں گے[1]۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ تینوں مقالے تصویر کے باطنی رُخ سے متعلق ہیں' البتہ تصویر کے ظاہری دو رخوں کے متعلق مجھے بھی کچھ عرض کرنا ہے اور جس کے متعلق محترم صدرِ مجلس نے بھی کچھ ارشاد کرنا ہے' یعنی دعوت رجوع الی القرآن اور جہاد —— جس کا غلغلہ اس صدی میں سب سے پہلے مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم نے بلند کیا۔ میری مراد ''الہلال'' اور ''البلاغ'' کے ابوالکلام آزاد سے ہے۔ اس دور میں یہ دو اہم چیزیں نمایاں ہو کر سامنے آئیں جن کی طرف اس صدی میں نہایت جوش وخروش سے متوجہ کرنے والے مولانا آزاد مرحوم تھے۔ ایک قرآن اور دوسرا جہاد —— ان ہی کے بارے میں مجھے آج مزید کچھ باتیں عرض کرنی ہیں۔

میں نے اپنی پہلی تقریر میں عرض کیا تھا[2] کہ میرے نزدیک جہاد اور انقلابی عمل دونوں مترادف الفاظ ہیں۔ صرف اس فرق کے ساتھ کہ جہاد فی سبیل اللہ قرآن کی اصطلاح ہے۔ بڑی اہم مقدس ومحترم اصطلاح ہے جبکہ انقلابی عمل اس دور کی اصطلاح ہے —— اس جہاد یا انقلابی عمل کے چند مراحل میں نے پرسوں بیان کیے تھے۔ آج ان کو قدرے تفصیل سے بیان کرنا اس وقت میرے پیش نظر ہے —— وہ تین تین مراحل کے دو sets ہیں۔

تین مراحل تمہیدی ہیں اور تین مراحل تکمیلی —— تمہیدی مراحل سے کیا مراد ہے! یہ کہ جب ایک شخص کسی انقلابی دعوت کو لے کر اٹھتا ہے تو اس کا پہلا کام یہ ہے کہ وہ اس انقلابی فکر کو قبول کرنے والوں کی ایک جماعت پیدا کرے۔ اس جماعت کے لیے تین چیزیں لازمی ہیں:

(۱) جن مقالات کا ذکر اس تقریر میں آیا ہے' ان کی اشاعت ماہنامہ ''حکمت قرآن'' لاہور میں شروع ہو چکی ہے۔ (مرتب)

(۲) یہ تقریر ''جہاد بالقرآن'' کے عنوان سے اگست اور ستمبر ۱۹۸۴ء کے میثاق میں شائع ہو چکی ہے اور اب یہ تقریر اسی عنوان سے کتابی شکل میں بھی موجود ہے۔ (مرتب)

دعوت وتبلیغ، تنظیم اور تربیت۔ اس لیے کہ جماعت جب تک پختہ نہ ہو، منظّم نہ ہو، انقلاب نہیں آ سکتا۔ جزوی کام ہو سکتے ہیں۔ درس وتدریس کا کام، تعلیم وتعلّم کا کام، تصنیف وتالیف کا کام، اصلاح تزکیۂ نفس کا کام یہ سب ہو سکتے ہیں۔ لیکن انقلاب برپا کرنے کے لیے، دین کے غلبہ کے لیے یہ لازم ہے کہ ان تین مراحل کے ذریعہ سے ایک جماعت، ایک تنظیم وجود میں آ جائے —— تین مراحل جو تکمیلی ہیں وہ درحقیقت اس جماعت کے مخالف و باطل نظریات اور قوتوں کے ساتھ تصادم کے تین مرحلے ہیں: صبرِ محض (passive resistance) —— اقدام (active resistance) —— اور جنگ، قتال، مسلح تصادم (armed coflict)۔ اس موقع پر اس نکتہ پر غور فرما لیجیے کہ جہاں تک تین تکمیلی مراحل کا تعلق ہے وہ تمام انقلابی تحریکوں میں یکساں ہیں۔ اصل فرق جو ایک انقلاب کو دوسرے انقلاب سے ممیّز کرتا ہے وہ پہلے دو مراحل ہیں۔ تمہیدی مراحل میں بھی ایک مرحلہ مشترک ہے۔ فرق ہے دعوت اور تربیت کے اصولوں کا۔

دعوت کا فرق کیا ہے؟ ایک اشتراکی دعوت ہے اس کا رخ ہے مادی۔ صد فی صد مادی اور الحاد و زندقہ کی طرف جس میں اخلاق اور روحانیت کا سرے سے کوئی گزر نہیں —— ایک انقلابِ محمدیؐ ہے جس کا رخ ہے توحید کی طرف، آخرت کی طرف، اخلاق کی طرف، روحانیت کی طرف —— معلوم ہوا کہ یہاں سے راستے بالکل جدا بلکہ قطعی مخالف سمتوں کی طرف ہو گئے —— پھر تربیت کا معاملہ بھی ہے۔ مادّی انقلاب کے لیے مادّی تربیت کافی ہے۔ جب وہ نہ اللہ کو مانیں نہ آخرت کو تو ان کے تزکیۂ نفس کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ خواہ مخواہ ان کا اور اپنا وقت ضائع کرنا ہے۔ اس انقلاب کے جو dimensions ہیں یہ چیزیں اس کے بالکل خلاف ہیں۔ اس مادّی انقلاب کے ثمرات روحانی انقلاب کے ثمرات کے بالکل برعکس ہیں۔ لیکن انقلابِ محمدیؐ، انقلابِ اسلامی کے لیے یہ شرطِ لازم ہے۔ یہ نہ ہو تو کچھ بھی نہیں —— تیسری چیز تنظیم وہاں بھی درکار ہے، یہاں بھی درکار ہے۔ نظام نہیں ہو گا، discipline نہیں ہو گا تو جماعت کی شکل نہیں ہے بلکہ پھر ہجوم ہے۔ اس فرق کو نمایاں کیا ہے علامہ اقبال نے اس شعر میں ؎

عید آزاداں شکوہِ ملک و دیں   عید محکوماں ہجومِ مؤمنین

تنظیم اور ہجوم میں تو زمین و آسمان کا فرق ہے۔ اسی تنظیم کے لیے تو اقبال نے یہ بھی کہا ہے ؎

نغمہ کجا و من کجا ساز و سخن بہانہ ایست
سوئے قطار می کشم ناقۂ بے زمام را!

میری قوم منتشر ہے اس کو تنظیم اور نظم میں کس دینا ہی میری شاعری کا مقصود ہے، ورنہ میں کہاں اور شاعری کہاں! —— بہرحال جیسا کہ میں نے عرض کیا کہ تنظیم، صبرِ محض، اقدام اور مسلح تصادم، یہ ہر انقلابی عمل میں مشترک مراحل ہوتے ہیں۔ ہم جب سیرت کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہماری نگاہیں عموماً آخری دو تکمیلی مراحل پر جمی رہتی ہیں —— اس مطالعہ میں دعوت، تربیت و تنظیم کے تمہیدی اور ابتدائی مراحل میں ہمارے یہاں بڑی حد تک غور و فکر کا فقدان ہے۔ اکبرالٰہ آبادی نے بہت خوبصورتی سے اس طرف توجہ دلائی ہے ؎

خدا کے کام دیکھو بعد کیا ہے اور کیا پہلے
نظر آتا ہے مجھ کو بدر سے غارِ حرا پہلے

وہ غارِ حرا کے مراقبے، پھر وہ قیام اللیل: ﴿قُمِ الَّيۡلَ اِلَّا قَلِيۡلًا ﴿۲﴾ نِّصۡفَهٗۤ اَوِ انۡقُصۡ مِنۡهُ قَلِيۡلًا ﴿۳﴾ اَوۡ زِدۡ عَلَيۡهِ وَرَتِّلِ الۡقُرۡاٰنَ تَرۡتِيۡلًا ﴿۴﴾﴾ (المزمل) پھر دعوت وتبلیغ، پھر دعوت پر لبیک کرنے والوں کی تنظیم۔ ساتھ ہی ان کا تزکیہ اور تعلیم و تربیت۔ پھر نظم اور discipline کی سخت ترین مشق۔ بارہ سال تک حکم تھا کہ اپنی مدافعت میں بھی ہاتھ نہ اٹھاؤ، چاہے تمہیں دہکتے انگاروں پر کباب بنایا جا رہا ہو —— اس سے زیادہ کسی نظم کی پابندی کا آپ تصور نہیں کر سکتے —— یہ ہیں وہ مراحل جن سے گزر کر وہ جماعت بنی جو صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی جماعت ہے جس کو قرآن مجید نے کہا ہے حزب اللہ —— کسی جماعت کا پختہ ہونا، اصل میں یہ ہوتی ہے کلید کامیابی —— یہ خام رہ گئی تو ناکام ہو جائے گی۔ اس سیرت کی پختگی اور اس تربیت کے بغیر اگلے مراحل میں قدم رکھیں گے تو معلوم ہو گا جیسے ریت کا ایک گولہ ہے جسے اگر شیشہ پر بھی مار دیا جائے تو شیشہ قائم رہے گا ریت بکھر جائے گی۔ اسی بات کی تفہیم کے لیے میں نے پچھلی تقریر میں آپ کو اکبرالٰہ آبادی کا یہ شعر سنایا تھا ؎

تو خاک میں مل اور آگ میں جل جب خشت بنے تب کام چلے
ان خام دلوں کے عنصر پر بنیاد نہ رکھ تعمیر نہ کر!

پھر اقبال نے اس مضمون کو کمال تک پہنچایا ہے ؎

خام ہے جب تک تو ہے مٹی کا اک انبار تو
پختہ ہو جائے تو ہے شمشیر بے زنہار تو!

اور اسی کو فارسی میں علامہ نے مزید بلندی اور رفعت پر پہنچا دیا ؎

با نشہ درویشی در ساز و دما دم زن
چوں پختہ شوی خود را بر سلطنت جم زن!

میں عرض کر چکا ہوں کہ یہ جو دو ابتدائی مراحل ہیں دعوت و تبلیغ اور تزکیہ و تربیت' تو ان کے لیے جو تلوار ہے وہ قرآن مجید ہے۔ ''جہاد بالقرآن'' کے عنوان سے میں پرسوں اس پر تفصیلی گفتگو کر چکا ہوں۔ انقلاب محمدی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام میں ہمیں نظر آتا ہے کہ دعوت و تبلیغ کا مرکز و محور بھی قرآن اور تزکیہ و تربیت کا مرکز و محور بھی قرآن —— ان دونوں کو جمع کیجیے تو وہ جہاد بالقرآن ہے۔

آج میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ ہیئت اجتماعیہ کے وجود میں آنے اور پھر اس کی جدوجہد کے لیے ہمیں کتاب و سنت سے کیا رہنمائی حاصل ہوتی ہے! —— میں نے پرسوں عرض کیا تھا آج اس کا اعادہ کر رہا ہوں کہ اولوالعزم من الرسل کے بارے میں قریباً اجماع ہے کہ وہ پانچ ہیں جن کا ذکر سورۃ الشوریٰ کی آیت ۱۳ میں آیا ہے۔ ان میں اوّلین ہیں حضرت نوح علیہ السلام اور آخری جناب محمد صلی اللہ علیہ وسلم۔ زمانی ترتیب سے درمیان میں حضرت ابراہیمؑ حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ علیہم السلام۔ ان میں ایک عجیب نقشہ سامنے آتا ہے۔ حضرت نوحؑ ساڑھے نو سو برس دعوت دیتے رہے' کوئی جمعیت وجود میں نہیں آئی تو اگلا قدم اٹھانے کا سوال ہی نہیں۔ معاشرہ اگر مر چکا ہے اور وہ اس دعوت کو جھٹلا چکا ہے تو اس کی کوئی ذمہ داری آنحضرتؐ پر نہیں۔ ان کے ثبات اور استقامت کے لیے بس یہی کافی ہے کہ وہی دعوت آخری سانس تک دیتے رہے۔ جیسا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمایا گیا تھا: ﴿فَلِذٰلِکَ فَادْعُ ج وَاسْتَقِمْ کَمَآ اُمِرْتَ ج﴾ (الشوریٰ: ۱۵). اب اگر معاشرہ ساتھ دے گا تو بات آگے چلے گی' اعوان و انصار ملیں گے تو اگلا قدم اٹھے گا۔ نہیں ملے تو کوئی پروا نہیں۔ اس میں حضرت نوحؑ کے لیے ناکامی کا کوئی سوال نہیں۔ ناکامی معاشرے کی ہے' قوم کی ہے۔ اس کے بالکل برعکس معاملہ ہے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا کہ کل بیس برس میں دعوت و تبلیغ بھی ہوگئی' تنظیم بھی ہوگئی' تزکیہ و تربیت بھی ہوگئی' صبر محض کا مرحلہ بھی گزر گیا' اقدام ہوگیا' مسلح تصادم بھی ہوگیا اور لکھوکھہا مربع میل کے رقبہ کے ملک پر اللہ کا دین بالفعل قائم ہوگیا —— دیکھئے کس قدر نمایاں فرق ہے —— میرا خیال ہے کہ اسی فرق کو واضح کرنے کے لیے قرآن مجید میں حضرت نوح علیہ السلام کی مدتِ دعوت ساڑھے نو سو برس بیان کی گئی ہے ورنہ کسی اور رسول کی مدتِ دعوت کا قرآن میں ذکر نہیں ہے۔ اسی سے

اوّل و آخر کا فرق نہایت نمایاں ہوگیا ہے۔ واللہ اعلم —— ان پانچ اولوالعزم من الرسل کے وسط میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کا معاملہ آتا ہے کہ جمعیت بہت بڑی تھی لیکن بودی۔ کچے لوگ' تھڑدلے لوگ۔ جب نقد جاں ہتھیلی پر رکھ کر میدانِ قتال میں آنے کا وقت آیا تو کورا جواب دے دیا: ﴿فَاذْهَبْ اَنْتَ وَرَبُّکَ فَقَاتِلَآ اِنَّا هٰهُنَا قٰعِدُوْنَ ﴿۲۴﴾﴾ (المائدۃ) ''موسیٰ تم جاؤ اور تمہارا ربّ جائے اور تم دونوں کافروں سے قتال کرو' ہم تو یہیں بیٹھے رہیں گے''۔ نتیجہ یہ نکلا کہ وہ ارضِ مقدس جو انہیں دی جا چکی تھی اللہ تعالیٰ نے ان کی بزدلی کی پاداش میں چالیس برس تک وہ ان پر حرام کر دی: ﴿فَاِنَّهَا مُحَرَّمَةٌ عَلَيْهِمْ اَرْبَعِيْنَ سَنَةً ج يَتِيْهُوْنَ فِي الْاَرْضِ ط﴾ (المائدۃ: ۲۶)۔ انہی چالیس سالوں کے دوران حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہما السلام کا انتقال ہوگیا۔ یہ دونوں حضرات والا قدر اپنی جسمانی آنکھوں سے اس حیاتِ دنیوی میں اپنی اس جدوجہد کو اس مقام پر پہنچنا نہ دیکھ سکے کہ اللہ کا دین بالفعل کسی خطۂ ارضی میں قائم اور نافذ ہو جائے۔

اب ہمارے لیے یہ مسئلہ انتہائی غور طلب ہے کہ وہ جمعیت کس بنیاد پر وجود میں آتی ہے۔ تنظیم کی بنیاد کیا ہے؟ اس ضمن میں آپ سے عرض کروں گا کہ سورۃ الفتح کی آخری دو آیات پیشِ نظر رکھیے۔ ان میں جو آخری سے ماقبل کی آیت ہے اس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا امتیازی ہدف متعین ہوا: ﴿هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ ط وَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا ۝﴾ —— لیکن سوچئے کہ وہ کون سی جمعیت اور قوت تھی جن کے ساتھ مل کر آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اس امتیازی منصب رسالت کو ادا فرمایا اور جزیرہ نمائے عرب پر بیس سال کی مدت میں اللہ کا دین بالفعل قائم و نافذ فرما دیا —— ! اگر بالفرض حضرت نوح علیہ السلام کی طرح جناب محمد صلی اللہ علیہ وسلم بھی اکیلے رہ جاتے یا آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بھی ﴿وَمَآ اٰمَنَ مَعَهٗٓ اِلَّا قَلِيْلٌ ۝﴾ (ھود) والا معاملہ ہوتا یا بالفرض صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی جمعیت بھی حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم بنی اسرائیل کی طرح بودی' بزدل اور تھڑدلی ہوتی اور قتال سے انکار کر دیتی تو کیا اس عالم اسباب و علل میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اکیلے اپنے امتیازی فرض منصبی اظہارِ دینِ حق کو ادا فرما سکتے تھے! سورۃ الفتح کی آخری آیت آتی ہے جس میں اس مبارک جمعیت کے اوصاف بیان فرمائے گئے جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھی' آغاز ہوتا ہے: ﴿مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ ط وَالَّذِيْنَ مَعَهٗٓ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ﴾ (آیت ۲۹)۔ میں آج اس آیت کی طرف آپ حضرات کی خاص طور پر توجہ مبذول کرانا چاہتا ہوں۔

میں نے تصویر کے جو دو رُخ آپ کے سامنے رکھے‘ وہ دونوں یہاں جمع ہیں —— ایک طرف ان کی یہ کیفیت: ﴿اَشِدَّآءُ عَلَی الْکُفَّارِ﴾ ان کی جمعیت کا پہلا وصف‘ بمقابلۂ کفار‘ بمقابلۂ باطل۔ اور کس شان کے ساتھ! کہ بیٹے کی تلوار باپ کے خلاف نیام سے باہر نکلنے کے لیے بے تاب ہے۔ غزوۂ بدر میں عتبہ بن ربیعہ‘ اس کے ایک بیٹے اور ایک بھائی نے جب مبارزت طلب کی تھی تو مسلمانوں کے لشکر کی طرف سے پہلے تین انصاری مقابلہ کے لیے نکلے تھے۔ اس پر عتبہ نے کہا یہ ہماری توہین ہے۔ ہمارے مدمقابل ہمارے برابر کے ہونے چاہئیں۔ تو کون نکلے تھے؟ عتبہ کے بیٹے حضرت حذیفہ ؓ —— رحمتِ عالم ﷺ نے گوارا نہ کیا یہ بات دوسری ہے۔ حضور ﷺ نے انہیں روک دیا۔ پھر حضرت حمزہ‘ حضرت علی اور حضرت ابوعبیدہ (رضی اللہ عنہم) نکلے۔ یہی معاملہ حضرت عبدالرحمٰن بن ابی بکرؓ کے ساتھ ہوا۔ وہ غزوۂ بدر تک ایمان نہیں لائے تھے اور کفار کے لشکر کے ساتھ جنگ میں شریک ہوئے تھے۔ بعد میں جب وہ ایمان لے آئے تو انہوںؓ نے حضرت ابوبکر ؓ سے کہا کہ ابا جان! بدر میں ایک موقع پر آپ میری تلوار کی زد میں آ گئے تھے‘ لیکن میں نے آپ کو چھوڑ دیا۔ میں نے آپ کا لحاظ کیا۔ حضرت ابوبکرؓ نے جواب دیا: بیٹے تمہاری جنگ چونکہ باطل کے لیے تھی‘ لہٰذا تمہارے لیے تو یہ خونی رشتہ بامعنی تھا۔ اللہ کی قسم اگر تم میری زد میں آ گئے ہوتے تو میں تمہیں کبھی نہ چھوڑتا۔ غزوۂ بدر کے مشرک قیدیوں کے متعلق حضرت عمر ؓ نے مشورہ دیا کہ قیدیوں میں جو جس صحابی کا رشتہ دار ہو اس کو وہ صحابیؓ اپنے ہاتھ سے قتل کرے۔ یہاں بھی رحمۃ للعالمینؐ نے فدیہ لے کر چھوڑنے کا فیصلہ کیا بعد میں وحی نے حضرت عمرؓ کی رائے کی تائید کی۔ یہ ہے ﴿اَشِدَّآءُ عَلَی الْکُفَّارِ﴾ کی تصویر —— ﴿رُحَمَآءُ بَیْنَھُمْ﴾ کا رخ دیکھنا ہو تو اس مواخات میں دیکھ لیجیے جو مدینۃ النبیؐ میں مہاجرین و انصار کے مابین ہوئی تھی۔ ایک انصاری صحابیؓ نے یہاں تک پیشکش کی تھی کہ ان کی دو بیویوں میں سے جو مہاجر بھائی کو پسند ہو میں اس کو طلاق دے دوں گا وہ اس سے نکاح کر لیں۔ جنگ یرموک میں زخمیوں کی جانب سے ایک مسلمان سپاہی نے آواز سنی کوئی زخمی پکار رہا تھا العطش! العطش! ' پانی پانی۔ وہ پانی کا پیالہ لے کر دوڑ کر اس زخمی کے پاس پہنچے تو دوسری طرف پانی پانی کی پکار آئی۔ ان زخمی نے کہا پہلے میرے اس بھائی کو پانی پلاؤ۔ وہ وہاں پہنچے تو تیسری طرف سے یہی صدا آئی۔ انہوں نے بھی اصرار کیا کہ پہلے اس کو پانی پلاؤ۔ وہاں پہنچے تو چوتھی طرف سے یہی پکار آئی۔ ان تیسرے صاحب کے اصرار پر چوتھے کے پاس پہنچے تو وہ اپنی جان‘ جان آفرین

کے سپرد کر چکے تھے۔ یکے بعد دیگرے یہ تینوں کے پاس پہنچے تو یہ تینوں بھی اللہ کو پیارے ہو چکے تھے۔ یہ تھی قربانی‘ یہ تھا ایثار‘ یہ تھا ﴿رُحَمَآءُ بَیْنَھُمْ﴾ کا نقشہ — اور یہ کامل عکاسی ہے: ﴿فَالَّذِیْنَ ھَاجَرُوْا وَاُخْرِجُوْا مِنْ دِیَارِھِمْ وَاُوْذُوْا فِیْ سَبِیْلِیْ وَقٰتَلُوْا وَقُتِلُوْا﴾ کی۔

اور جو دوسرا نقشہ ہے: ﴿فِیْ بُیُوْتٍ اَذِنَ اللّٰہُ...... الی اخر الایۃ﴾ وہ آگے آ رہا ہے:

﴿تَرٰىھُمْ رُکَّعًا سُجَّدًا یَّبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰہِ وَرِضْوَانًا سِیْمَاھُمْ فِیْ وُجُوْھِھِمْ مِّنْ اَثَرِ السُّجُوْدِ ذٰلِکَ مَثَلُھُمْ فِی التَّوْرٰىۃِ وَمَثَلُھُمْ فِی الْاِنْجِیْلِ﴾ (آیت ۲۹)

''تم جب انہیں دیکھو گے رکوع و سجود میں مشغول پاؤ گے۔ سجدوں کے اثرات ان کے چہروں پر ظاہر ہوں گے۔ وہ اللہ کے فضل اور اس کی خوشنودی کی طلب میں مصروف ملیں گے۔ ان کی یہی صفت تورات میں بیان ہوئی ہے اور انجیل میں بھی۔''

ان دو آیات کو ذہن میں رکھیے اور اب آگے آیئے تاکہ یہ سمجھا جا سکے کہ اس رشتہ یعنی ﴿مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ وَالَّذِیْنَ مَعَہٗٓ﴾ کو آپس میں جوڑنے والی شے کون سی ہے؟ قرآن مجید نے اس کے لیے جو لفظ استعمال کیا ہے‘ وہ بہت اہم ہے اور وہ ہے نصرت۔ سورۃ الصّف جو میرے نزدیک جہاد و قتال فی سبیل اللہ کے موضوع پر قرآن مجید کی جامع ترین سورت ہے۔ یہ اس موضوع پر قرآن مجید کا ذروۂ سنام (climax) ہے۔ اس سورۃ کا اس پر اختتام ہوتا ہے:

﴿یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کُوْنُوْٓا اَنْصَارَ اللّٰہِ کَمَا قَالَ عِیْسَی ابْنُ مَرْیَمَ لِلْحَوَارِیّٖنَ مَنْ اَنْصَارِیْٓ اِلَی اللّٰہِ﴾ (آیت ۱۴)

''اے لوگو جو ایمان لائے ہوئے ہو‘ اللہ کے مددگار بنو‘ جیسے کہ عیسٰی ابن مریم نے حواریوں سے کہا تھا: کون ہے اللہ کی طرف (بلانے میں) میرا مددگار۔''

یہاں نوٹ کیجیے کہ نصرت کی دو نسبتیں آئی ہیں۔ دین اللہ کا ہے‘ اس کے غلبے کے لیے تن من دھن لگاؤ گے تو یہ نصرت ہے اللہ کی —— ہمایوں کو ہندوستان سے شیر شاہ سوری نے نکال باہر کیا تھا تو ایران کے بادشاہ طہماسپ کی فوجوں نے ہندوستان کی حکومت دوبارہ حاصل کرنے کے لیے ہمایوں کی مدد کی۔ اس سے بڑا محسن ہمایوں کا کون ہوگا!

﴿ظَھَرَ الْفَسَادُ فِی الْبَرِّ وَالْبَحْرِ﴾ اللہ کی تشریعی حکومت کا تختہ الٹا ہوا ہے‘ اب اس حکومت کو دوبارہ قائم کرنا ہے تو جو اس کام کے لیے خود کو وقف کر دیں‘ لگا دیں‘ کھپا دیں‘ ان

سے بڑھ کر اللہ کا مددگار اور کون ہوگا! یہ نصرت اللہ کی ہے‘ لیکن اصلاً یہ فرضِ منصبی ہوتا ہے رسول کا۔ لہٰذا جو یہ کام کرتے ہیں وہ رسول کی نصرت کرتے ہیں۔ نصرت کی یہ دو نسبتیں ہیں‘ ان کو اچھی طرح جان لیجیے۔ ان ہی دو نسبتوں کا بیان ہوا ہے۔ پہلے اللہ تعالیٰ کی طرف سے اہل ایمان کے لیے مطالبہ آیا: ﴿كُوْنُوْٓا اَنْصَارَ اللّٰهِ﴾ — ’’اللہ کے مددگار بنو‘‘۔ آگے رسول کی طرف سے دعوت آئی: ﴿مَنْ اَنْصَارِيْٓ اِلَى اللّٰهِ﴾ — ’’کون ہے میرا مددگار اللہ کے راستہ میں‘‘۔ اسی بات کی تفہیم کے لیے سورۃ الحدید کی آیت ۲۵ کو دیکھئے‘ فرمایا:

﴿لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِيْزَانَ لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ ۚ وَاَنْزَلْنَا الْحَدِيْدَ فِيْهِ بَاْسٌ شَدِيْدٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَلِيَعْلَمَ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ وَرُسُلَهٗ بِالْغَيْبِ ۭ﴾

یہاں بھی نصرت کی دو نسبتیں بیان ہوئیں: ﴿وَلِيَعْلَمَ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ وَرُسُلَهٗ بِالْغَيْبِ ۭ﴾ ’’اللہ دیکھ لینا چاہتا ہے کہ کون ہیں اس کے وفادار بندے جو اس سے غیب میں ہونے کے باوجود اس کی اور اس کے رسولوں کی مدد کرتے ہیں‘‘ — رسول کی نصرت چونکہ اللہ کی نصرت یعنی اس کے دین کے غلبے کے لیے جان و مال لگانا ہے۔ لہٰذا رسول کی نصرت پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے رحمت اور فوز و فلاح کی بشارت ہے جس کا ذکر سورۃ الاعراف کی آیت ۱۵۷ کے آخر میں بایں الفاظ مبارکہ وارد ہوا: ﴿فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِهٖ وَعَزَّرُوْهُ وَنَصَرُوْهُ وَاتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ مَعَهٗٓ ۙ اُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝﴾ ’’جو لوگ اس پر (اللہ کے رسول محمد ﷺ پر) ایمان لائیں اور ان کی توقیر و عزت کریں اور اُن کی حمایت و نصرت کریں اور اس روشنی (یعنی قرآن مجید) کی پیروی اختیار کریں جو اُنؐ کے ساتھ نازل کی گئی ہے تو یہی لوگ فلاح پانے والے ہیں‘‘۔ آیت کے آخر میں حصر کا اسلوب ہے۔ معلوم ہوا کہ فوز و فلاح منحصر ہے ان چار کاموں پر۔ جناب محمد رسول اللہ ﷺ پر ایمان‘ ان کا احترام‘ دعوت و تبلیغ‘ شہادت علی الناس اور اظہار دین الحق علی الدین کلہ کی جدوجہد میں ان کی نصرت اور قرآن حکیم کا اتباع ---

جیسا کہ میں نے عرض کیا کہ رسول اللہ ﷺ کی دین کے غلبے کے لیے نصرت اصلاً اللہ کی نصرت ہے لہٰذا سورۂ محمد میں اللہ تعالیٰ اہل ایمان کو بشارت دیتا ہے کہ اگر تم اللہ کی اس کے دین کے غلبے کے لیے مدد کرو گے تو وہ اہل ایمان کی مدد کرے گا اور باطل و طاغوتی قوتوں کے مقابلہ میں ان کے قدم مضبوطی سے جمادے گا: ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ تَنْصُرُوا اللّٰهَ يَنْصُرْكُمْ وَيُثَبِّتْ

اَقْدَامَكُمْ ۝﴾ — حاصل گفتگو یہ ہے کہ ﴿مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ ۭ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗٓ﴾ میں پہلا نقطۂ ماسکہ‘ پہلی جوڑنے والی چیز نصرت رسول ہے علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام۔ لہٰذا یہ لفظ نصرت بہت اہم ہے۔ اس کو نوٹ فرما لیجیے!

اس تعلق کو قائم کرنے کے لیے قرآن مجید نے جو دوسرا عنوان قائم کیا ہے‘ وہ ہے مبایعت۔ میں نے دانستہ لفظ بیعت استعمال نہیں کیا اسے ذرا روکا ہے۔ اس سے آپ لوگوں کو الرجی ہے۔ مبایعت ذرا ثقیل تو ہو گیا لیکن نیا لفظ ہے تو شاید آپ اس پر غور کرنے کے لیے تیار ہو جائیں —— یہ لفظ مبایعت باب مفاعلہ میں بیع سے بنا ہے۔ دو اشخاص کہہ لیں‘ دو فریق کہہ لیں‘ دو شخصیتیں کہہ لیں۔ ان کے مابین جو معاہدہ طے پا جائے‘ بیع و شراء تو یہ مبایعہ یا مبایعت ہے۔ قرآن حکیم میں سورۃ التوبہ کی آیت ۱۱۱ میں بیع و شراء دونوں الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ اسی آیت کی تلاوت سے میں نے آج کی گفتگو کا آغاز کیا تھا۔ قرآن مجید نے دین کی اس حقیقت کو متعدد مقامات پر ’’تجارت‘‘ کے لفظ سے واضح کیا ہے۔ اس لیے کہ اس کا مفہوم و تصور (concept) بڑا واضح ہے۔ ہر معمولی شخص بھی جانتا ہے کہ تجارت کسے کہتے ہیں؟ تجارت کے لیے سرمایہ درکار ہوتا ہے۔ پونجی لگتی ہے خواہ کم ہو یا زیادہ۔ ساتھ ہی محنت لگتی ہے۔ ان دونوں کے اشتراک کا نام تجارت ہے۔ اس تجارت سے پیش نظر منفعت ہے۔ چنانچہ سورۃ الصّف کی یہ آیت ذہن میں لائیے:

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا هَلْ اَدُلُّكُمْ عَلٰي تِجَارَةٍ تُنْجِيْكُمْ مِّنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ ۝ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَتُجَاهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ ۭ﴾

’’اے اہل ایمان میں تمہاری رہنمائی کروں‘ تمہیں بتاؤں ایک تجارت‘ ایک سوداگری جو تم کو دردناک عذاب سے بچالے‘ چھٹکارا دلا دے؟ ایمان پختہ رکھو اللہ پر اور اس کے رسول پر اور محنت کرو‘ کشمکش کرو اللہ کی راہ میں اپنے مالوں سے اور اپنی جانوں سے۔‘‘

یہاں لفظ تجارت بہت جامع ہے —— اسی تجارت کی نہایت مہتم بالشان اسلوب سے شرح ہے جو سورۃ التوبہ کی اس آیت مبارکہ میں آئی ہے: ﴿اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰي مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ ۭ﴾ ’’اللہ نے اہل ایمان سے ان کی جانیں اور ان کے مال خرید لیے ہیں جنت کے عوض‘‘۔ اس سودے کا ظہور کس طور پر ہو رہا ہے؟ اسے آگے بیان کیا گیا ہے: ﴿يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَيَقْتُلُوْنَ وَيُقْتَلُوْنَ ۣ﴾ ’’وہ اللہ کی راہ میں قتال کرتے ہیں‘ قتل

کرتے ہیں اور قتل ہوتے بھی ہیں''۔آگے بڑا لطیف نکتہ آ رہا ہے' غور کیجیے گا۔ چونکہ یہ سودا نقد نہیں ہے بلکہ ادھار ہے۔ جان و مال تو یہاں دینا ہوگا' جنت وہاں آخرت میں ملے گی۔ادھار سودا کر کے آدمی کے دل میں وسوسے آتے ہیں کہ قیمت ملے کہ نہ ملے۔اس لیے اس آیت میں آگے کس قدر تاکید آ رہی ہے:﴿وَعۡدًا عَلَیۡهِ حَقًّا فِی التَّوۡرٰىةِ وَالۡاِنۡجِیۡلِ وَالۡقُرۡاٰنِ ؕ وَمَنۡ اَوۡفٰی بِعَهۡدِهٖ مِنَ اللّٰهِ﴾ کسی وسوسے کو قریب پھٹکنے نہ دو۔ یہ تو اللہ کا وعدہ ہے اس کے ذمہ حق کے ساتھ۔ تین مرتبہ اس کی توثیق ہوئی ہے۔ تین مرتبہ کے وعدے کے بعد بھی کوئی شک باقی رہ سکتا ہے! تورات میں یہ وعدہ آ چکا' انجیل میں یہ وعدہ آ چکا' قرآن میں یہ وعدہ آ چکا اور سوچو تو سہی کہ اللہ سے زیادہ اپنے وعدے کا وفا کرنے والا کون ہے! لہٰذا ﴿فَاسۡتَبۡشِرُوۡا بِبَیۡعِکُمُ الَّذِیۡ بَایَعۡتُمۡ بِهٖ ؕ﴾ ''پس خوشیاں مناؤ اس بیع پر جو تم نے کی ہے''—— یہاں ''بَایَعۡتُمۡ'' باب مفاعلہ ہے۔ دو فریقوں کے مابین خرید و فروخت —لین دین —— ﴿وَذٰلِکَ هُوَ الۡفَوۡزُ الۡعَظِیۡمُ○﴾ ''اور یہی اصل اور بڑی کامیابی ہے۔''

اب ایک اہم بات پر غور کیجیے۔ یہاں بیع تو اصلاً ہے اللہ اور بندے کے درمیان لیکن اللہ نہ کبھی زمین پر اُترا اور نہ کبھی اترے گا کہ وہ یہ خریداری' یہ بیع و شراء خود کرے۔ لہٰذا نبی اکرم ﷺ اس کے نمائندے کی حیثیت سے سامنے ہیں۔ بیع کس سے ہے! اللہ سے۔ اور بیعت کس سے ہے! محمد رسول اللہ ﷺ سے—— اس حقیقت کو کس قدر خوبصورتی سے اس آیت میں واضح کیا ہے جو میں ابھی آپ کو سنانے والا ہوں۔ اس آیت کو اس اعتبار سے مزید اہم سمجھئے کہ یہ اسی سورۃ الفتح میں ہے جس میں فرمایا گیا تھا:﴿مُحَمَّدٌ رَّسُوۡلُ اللّٰهِ ؕ وَالَّذِیۡنَ مَعَهٗۤ﴾ یہ (link) کیا ہے! نقطۂ ماسکہ کیا ہے! وہ رشتہ کیا ہے جس نے ان کو آپس میں جوڑ دیا ہے!—— آپ کو معلوم ہے' اسی سورۃ الفتح میں بیعت رضوان مذکور ہے:﴿لَقَدۡ رَضِیَ اللّٰهُ عَنِ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ اِذۡ یُبَایِعُوۡنَکَ تَحۡتَ الشَّجَرَةِ﴾ (آیت ۱۸) —— اس سے قبل آیت ۱۰ میں اس بیعت کی حقیقت کو ایسے حسین و عجیب اسلوب سے بیان کیا گیا ہے کہ اگر انسان واقعتاً غور کرے تو عظمت کے احساس سے سر خود بخود جھکتا ہے۔ فرمایا:

﴿اِنَّ الَّذِیۡنَ یُبَایِعُوۡنَکَ اِنَّمَا یُبَایِعُوۡنَ اللّٰهَ ؕ یَدُ اللّٰهِ فَوۡقَ اَیۡدِیۡهِمۡ ۚ﴾

''(اے نبی ﷺ!) جو لوگ آپ سے بیعت کر رہے ہیں حقیقت میں وہ اللہ سے بیعت کر رہے ہیں اللہ کا ہاتھ ان کے ہاتھ پر ہے۔''

چونکہ ہاتھ میں ہاتھ دے کر بیعت ہوتی ہے۔ البتہ خواتین سے نبی اکرم ﷺ نے جب کبھی بیعت لی ہے اس میں کبھی مصافحہ نہیں ہوا: لَا اُصَافِحُ النِّسَاءَ بعض خواتین نے ہاتھ بڑھائے بھی تھے—— ہمارے ملک کی جو خاتونِ اوّل ہیں' اخباری اطلاعات کے مطابق انہوں نے یہی plea لی تھی جب خواتین کی محفل میلاد میں کسی بچی نے اعتراض کر دیا تھا کہ ہمارے ملک کی خاتونِ اوّل نے ایک غیر محرم مرد سے ہاتھ ملایا! تو انہوں نے یہی عذر پیش کیا تھا کہ اس نے ہاتھ بڑھا دیا تھا' میں کیا کرتی! میں اسے شرمندہ کیسے کرتی!—— لیکن محمد رسول اللہ ﷺ اُمت کے تمام مردوں اور عورتوں کے لیے بمنزلہ باپ ہیں اور خواتین کے ہاتھ بڑھ چکے ہیں اور وہ کہہ رہی ہیں اَلَا تُصَافِحُنَا 'کیا آپ ہم سے مصافحہ نہیں فرمائیں گے؟'' یعنی آپ ﷺ نے ہم سے بیعت تو لی نہیں! اس لیے کہ بیعت کا جو معروف طریقہ ہے ہاتھ میں ہاتھ دے کر قول و قرار کرنا اس کے مطابق تو عمل ہوا نہیں۔ حضور ﷺ کا جواب تھا: لَا اُصَافِحُ النِّسَاءَ —— احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ خواتین سے بیعت لینے کے لیے حضور ﷺ کا طریقہ یہ تھا کہ یا تو کپڑا ہوتا تھا۔ ایک سرا حضور ﷺ کے ہاتھ میں ہے اور ایک سرا اس خاتون کے ہاتھ میں۔ یا ایک طشت میں پانی ڈال کر ایک طرف نبی اکرم ﷺ نے اپنا دست مبارک ڈبو دیا اور دوسری طرف خاتون نے—— ہاتھ مس تو نہیں ہو رہا ہے لیکن اس میں کچھ نہ کچھ معاملہ ضرور ہے۔ اب یہ تو اہل تصوف جانیں کہ کون سا روحانی اور برقی عمل ہو رہا ہے—— ہم کو تو ظاہر نظر آتا ہے۔ ظاہر کی پیروی کرنے کو ہم اتباعِ رسول کا لازمی تقاضا سمجھتے ہیں۔ اس میں یقیناً کوئی باطنی و روحانی چاشنی بھی ہے' وہ نَافِلَةً لَّکَ کے درجے میں ہے۔ بہرحال اس میں کوئی نہ کوئی حکمت ہے ضرور۔ ورنہ اس تکلف کی ضرورت کیا ہے؟ **فعل الحکیم لا یخلو عن الحکمة.** ہمارے لیے زیادہ سلامتی اور عافیت اسی میں ہے کہ ظاہر پر عمل کیا جائے ؎

بمصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر باو نہ رسیدی تمام بولہبی است

یہ باتیں میں آج کی گفتگو میں اس لیے عرض کر رہا ہوں کہ آج چند لوگوں نے مجھ سے عجیب وغریب باتیں کہی ہیں کہ ہم ایک دینی جماعت کے رکن ہیں۔ اس کا ایک ''دستور'' ہے۔ اس کا ایک ''امیر'' ہے۔ چونکہ ہم دستور کو تسلیم کر کے جماعت میں شامل ہوئے ہیں لہٰذا بیعت ہوگئی۔ اب کیا ضروری ہے کہ ہاتھ میں ہاتھ دے کر ہی بیعت کی جائے —— میں نے ان سے

کہا کہ یہی بات آج کا صوفی کہتا ہے کہ نماز کا مقصد کیا ہے! اللہ سے لو لگانا — میں نے اللہ سے لگائی ہوئی ہے! مجھے نماز کی کیا ضرورت ہے! — دین کے ظاہر کے لیے جب آپ اس حدیث کا حوالہ دیتے ہیں اور بالکل صحیح دیتے ہیں کہ صَلُّوْا کَمَا رَأَیْتُمُوْنِیْ اُصَلِّیْ ——— اور اس میں ذرا سے فرق پر آپ کے یہاں ہنگامے ہیں۔ من دیگرم تو دیگری والا معاملہ ہے۔ اور اس بیعت کے معاملہ میں ظاہر کو اس طرح اٹھا کر پھینک دیں' اس کی کوئی قدر و قیمت نہ رہے — یہ درحقیقت ہمارے تضادات ہیں — بہرحال میں نے برسبیل تذکرہ یہ باتیں کہی ہیں۔

گفتگو یہ ہو رہی تھی کہ ایک بندۂ مؤمن کی اصلاً بیع ہوتی ہے اللہ کے ساتھ لیکن اس عالم واقعہ میں بیعت اللہ کے رسولؐ کے ہاتھ پر ہوتی ہے۔ پھر رسول اللہ ﷺ کے نائبین کے ہاتھ پر ہوتی ہے — پھر جو بھی انؐ کے نقش قدم پر چلیں گے ان کے ہاتھ پر ہوگی۔ یہ بیعت کی بنیاد ہے جو ان کو جوڑتی ہے' ایک قوت بناتی ہے' ان کو متحد کرتی ہے اور ایک جمعیت کی شکل دیتی ہے اور جمعیت بھی کیسی! اس بیعت کے بعد لامحالہ وہ ڈسپلن وجود میں آئے گا جس کی اس عالم واقعہ میں صرف ایک ہی مثال ہے جس کو army discipline کہتے ہیں۔ فوج کا نظم و ضبط' بلاچون و چرا حکم کی بجاآوری' سمع و طاعت۔ آپ نے کبھی غور کیا کہ سمع و طاعت کیوں کہا گیا! بادیٔ النظر میں یہاں ''سمع'' کا لفظ زائد ہے' بے کار ہے۔ آخر اطاعت ہوگی تو کوئی حکم سن کر ہی تو ہوگی۔ پھر کس لیے یہ سمع و طاعت۔ اور قرآن مجید کی یہ اصطلاح ہے: ﴿وَاسْمَعُوْا وَاَطِیْعُوْا﴾ — اور ﴿اِذْ قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا﴾ اور ﴿وَقَالُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا غُفْرَانَکَ رَبَّنَا وَاِلَیْکَ الْمَصِیْرُ﴾ — غور کیجیے کہ سمع و طاعت کا جوڑا کیوں آیا؟ ایک اطاعت وہ ہوتی ہے جو حکم کی غایت اور اس کے مقصد کو سمجھنے کے بعد واجب ہوتی ہے اور ایک اطاعت وہ ہے جو مجرد سننے پر واجب ہوتی ہے۔ یہ فوج کی اطاعت ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ فوج میں اگر ماتحت اپنے بالاتر سے پوچھنے لگے کہ ''جناب اس حکم کی غایت کیا ہے؟ پہلے مجھے سمجھائیے'' اگر معاملہ یہ ہو تو ظاہر بات ہے کہ فوج کا ڈسپلن تو ختم ہوا۔ اس کو انگریزی کی مشہور نظم چارج آف لائٹ بریگیڈ میں دو جملوں میں بڑی خوبصورتی سے ادا کیا گیا ہے:

Their's not to reason why?
Their's but to do & die!

فرق صرف یہ ہے کہ رسول کی اطاعت مطلق ہے۔ اس لیے کہ رسول ہی تو درحقیقت اللہ کا

نمائندہ ہے۔ اس کے ساتھ کوئی شرط نہیں ہے' بلکہ اس کے لیے تو فرمانِ ربانی یہ ہے: ﴿وَمَنْ یُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰہَ﴾۔ البتہ رسول کے بعد کسی کی اطاعت مطلق نہیں ہے' مقید ہے الکتٰب وَالسُنۃ سے۔ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے واضح احکام کا جو دائرہ ہے اس کے اندر اندر ہے۔ اس کے باہر ہے تو لَا سمع و لاطاعۃ ہے۔ معروف میں اطاعت لازم ہے' واجب ہے' فرض ہے۔ پھر یہ کہ جہاں تک اطاعت کی کیفیت کا تعلق ہے تو وہی سمع و طاعت درکار ہے۔ ثابت کر دیجیے کہ یہ حکم کسی نص کے خلاف ہے تو بات دوسری ہے۔ ثابت نہ کر سکیں تو ماننا پڑے گا' سمجھ میں آئے یا نہ آئے' اچھا لگے یا نہ لگے' انشراح صدر ہو یا نہ ہو۔

میں اپنی اس بات کی دلیل کے طور پر آپ کو چند احادیث سنانا چاہتا ہوں۔ ان میں سے پہلی حدیث متفق علیہ ہے۔ کاش وہ لوگ جن میں دین کے ظاہر کے متعلق کوئی اختلاف نہیں ہے اور جو تسلیم کرتے ہیں کہ سنت رسولؐ واجب الاطاعت ہے۔ میں یہاں حنفی' اہل حدیث اور بریلوی کے چکر میں نہیں پڑتا۔ اتباع اور اطاعت رسولؐ کی فرضیت سے ان میں کسی کو بھی اختلاف نہیں ہے' جو اختلافات ہیں' ان کی نوعیت یہ ہے کہ آیا یہ سنت ثابتہ ہے یا نہیں۔ جو روایت آ رہی ہے وہ کس نوع اور کس درجے کی ہے۔ سند کے اعتبار سے اس کا مقام کیا ہے! ضعیف ہے یا قوی ہے! مرسل ہے کہ مرفوع ہے۔ شاذ ہے کہ مشہور ہے۔ اس سے زیادہ مضبوط کوئی اور روایت ہے۔ یہ بحثیں ہیں اور ہوں گی۔ اصولاً کوئی اختلاف نہیں ہے — پھر آج یہاں جو حضرات تشریف لائے ہیں ان میں سے کون نہیں جانتا ہے کہ جو روایت متفق علیہ ہو' جس کی صحت پر ائمہ حدیث میں سے چوٹی کے دو محدثین امام بخاری اور امام مسلم رحمہما اللہ کا اتفاق ہو' احادیث میں اس سے بلند کسی حدیث کے پختہ ہونے کا کوئی درجہ نہیں ہے۔ یقینی ہونے کے اعتبار سے ایسی حدیث قریباً قرآن کے ہم وزن مانی جاتی ہے — اب میں آپ کو جو حدیث سنانے والا ہوں اسے امام بخاریؒ اور امام مسلمؒ نے روایت کیا ہے۔ یہ متفق علیہ روایت ہے۔ میں آپ سے درخواست کروں گا کہ اس حدیث کے ایک ایک لفظ کو توجہ اور غور سے سماعت فرمائیے۔ خاص طور پر ان الفاظ پر جو اکثر جوڑوں کی صورت میں آئے ہیں۔ حضرت عبادہ بن صامت ؓ سے روایت ہے کہ:

بَایَعْنَا رَسُوْلَ اللّٰہِ ﷺ عَلَی السَّمْعِ وَالطَّاعَۃِ' فِی الْعُسْرِ وَالْیُسْرِ'
وَالْمَنْشَطِ وَالْمَکْرَہِ' وَعَلٰی اَثَرَۃٍ عَلَیْنَا' وَعَلٰی اَنْ لَا نُنَازِعَ الْاَمْرَ اَھْلَہٗ'

وَعَلٰی اَنْ نَقُوْلَ بِالْحَقِّ اَيْنَمَا كُنَّا' لَا نَخَافُ فِي اللّٰهِ لَوْمَةَ لَائِمٍ (۱)

''ہم نے بیعت کی رسول اللہ ﷺ سے''۔کس بات کی بیعت کی؟''**عَلَی السَّمْعِ وَالطَّاعَةِ**''اس پر کہ سنیں گے اور اطاعت کریں گے۔کن کن حالات میں!''**فِی الْعُسْرِ وَالْيُسْرِ** '' چاہے تنگی ہو یا آسانی' مشکل ہو یا آسان۔''**وَالْمَنْشَطِ وَالْمَكْرَهِ**'' **منشط نشاط** سے بنا ہے۔اگر کسی حکم کی آپ کی طبیعت سے موافقت ہے۔آپ کی رائے بھی اس کے حق میں ہے تو آپ خوش دلی' انشراحِ صدر اور نشاطِ طبع کے ساتھ اس حکم پر عمل کرتے ہیں۔ یہ **منشط** ہے۔ **مکرہ** بنا ہے **اکراہ** سے۔اگر آپ کی ذاتی رائے کچھ اور ہے' آپ کا ذاتی میلان ورجحان کچھ اور ہے۔لیکن اس کے باوجود آپ اسے مان رہے ہیں۔تو یہ ہے اکراہ کے ساتھ' ناگواری کے ساتھ' اپنی طبیعت پر جبر کے ساتھ ماننا۔تو حکم ہر حال میں ماننا ہے۔چاہے طبیعت میں انشراح وانبساط ہو چاہے طبیعت کو مجبور کر کے ماننا پڑے۔یہاں تک تو جوڑے کی شکل میں بیعت کے لوازم کا ذکر ہوا۔اب آگے علیحدہ علیحدہ امور آ رہے ہیں جن میں سے ہر ایک اہم ہے۔

''**وَعَلٰى اَثَرَةٍ عَلَيْنَا**'' اور اس پر بیعت کی کہ چاہے دوسروں کو ہم پر ترجیح دی جائے۔ہم اس کی بھی اطاعت کریں گے—— جماعتی زندگی کا جو سب سے بڑا فتنہ ہوتا ہے اس کا یہاں سدباب کر دیا گیا ہے۔ظاہر بات ہے کہ جس شخص کے ہاتھ پر بیعت ہو رہی ہے' وہ ہر آن تو موجود نہیں رہ سکتا۔کسی مہم پر وہ کسی کو اپنا نائب بنا کر بھیجے گا۔نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: ((**مَنْ اَطَاعَنِيْ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ وَمَنْ عَصَانِيْ فَقَدْ عَصَى اللّٰهَ وَمَنْ اَطَاعَ اَمِيْرِيْ فَقَدْ اَطَاعَنِيْ وَمَنْ عَصٰى اَمِيْرِيْ فَقَدْ عَصَانِيْ**)) بالکل معقول' مربوط اور منطقی بات ہے۔''جس نے میری اطاعت کی' پس اس نے اللہ کی اطاعت کی اور جس نے میری نافرمانی کی' اس نے اللہ کی نافرمانی کی اور جس نے میرے مقرر کردہ امیر کی اطاعت کی اس نے میری اطاعت کی اور جس نے میرے مقرر کردہ امیر کی نافرمانی کی اس نے میری نافرمانی کی''—— دوسری امارتوں کا جو نصب ہوگا مثلاً امیر جیش ہے۔حضور ﷺ کہیں کوئی لشکر بھیج رہے ہیں تو اس کا کسی کو امیر یا سپہ سالار مقرر فرما رہے ہیں —— یا حضور ﷺ مدینہ سے باہر کسی مہم پر بنفس نفیس لشکر لے کر تشریف لے جا رہے ہیں تو مدینہ میں کسی کو اپنا نائب مقرر فرمایا ہے تو ایسے مواقع پر فطری طور پر کسی کے

(۱) صحیح البخاری' کتاب الاحکام' باب کیف یبایع الامام الناس 'و کتاب الفتن' باب قول النبی ﷺ سترون بعدی امورًا تنکرونها۔وصحیح مسلم' کتاب الامارۃ' باب وجوب طاعۃ الامیر فی غیر معصیۃ ......

دل میں یہ بات آ سکتی ہے کہ میں زیادہ حق دار ہوں' میں زیادہ باصلاحیت ہوں' میری standing زیادہ ہے' میں بہت پرانا ہوں۔مجھ پر دوسروں کو ترجیح کیوں دے دی گئی! آپ کو معلوم ہے کہ موتہ کی طرف جو لشکر بھیجا گیا تھا' اس کا امیر حضرت زیدؓ بن حارثہ کو مقرر کیا گیا تھا تو اس پر چہ میگوئیاں ہوئیں۔اس معاملہ کو آپؐ نے اپنی عمر شریف کے آخری دور میں ایک لشکر کا امیر حضرت اسامہؓ بن زیدؓ کو بنا کر منطقی انتہا تک پہنچا دیا۔جس میں حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ جیسے جلیل القدر آپؐ کے صحابہ بھی شامل تھے۔یہ بھی دوسرے تمام صحابہ کرامؓ کی طرح مامور تھے اور حضرت اسامہؓ امیر۔یہ اس لیے کہ معلوم ہو جائے کہ میری تربیت کس حد تک مؤثر ہو چکی ہے۔**وَعَلٰى اَثَرَةٍ عَلَيْنَا** .شعوری طور پر یہ بات جانتے ہوئے بیعت کرو کہ ہم ہر حال میں اطاعت کریں گے۔خواہ ہم محسوس کریں کہ دوسروں کو ہم پر ترجیح دی جا رہی ہے تا کہ اس فتنے کی ابتدا ہی میں جڑ کٹ جائے اور اس مرحلہ پر آ کر کوئی انتشار برپا نہ ہو۔

''**وَعَلٰى اَنْ لَا نُنَازِعَ الْاَمْرَ اَهْلَهٗ**'' اور اس پر بیعت کی کہ جو لوگ اصحابِ امر ہوں گے ہم ان سے کبھی جھگڑا نہیں کریں گے۔اس میں ایک استثناء ہے جس کا ایک دوسری روایت میں اس مقام پر ان الفاظ میں ذکر ہے: **وَعَلٰى اَنْ لَا نُنَازِعَ الْاَمْرَ اَهْلَهٗ اِلَّا اَنْ تَرَوْا كُفْرًا بَوَاحًا عِنْدَكُمْ مِنَ اللّٰهِ فِيْهِ بُرْهَانٌ.** الا آنکہ تم کھلا کھلا کفر دیکھو جس کے لیے تمہارے پاس اللہ کی طرف سے واضح و روشن دلیل ہو اس حال میں سمع و طاعت نہیں ہے۔اگر یہ نہیں ہے تو **لَا نُنَازِعَ الْاَمْرَ** —— یہی بات عام ہدایت ورہنمائی کے لیے اس حدیث میں وارد ہوئی ہے کہ: **لَا طَاعَةَ لِمَخْلُوْقٍ فِيْ مَعْصِيَةِ الْخَالِقِ.**

حضرت عبادہؓ بن صامت آگے آخری بات بیان فرماتے ہیں کہ ہم نے بیعت کی اور عہد کیا اس بات پر: **وَعَلٰى اَنْ نَقُوْلَ بِالْحَقِّ اَيْنَمَا كُنَّا' لَا نَخَافُ فِي اللّٰهِ لَوْمَةَ لَائِمٍ** ''ہم حق کہتے رہیں گے جہاں بھی ہوں اور ہم ہرگز نہیں ڈریں گے کسی ملامت گر کی ملامت سے''۔ یعنی معاذ اللہ غلامانہ ذہنیت پیدا کرنا اس بیعت کا مقصد نہیں ہے۔معاذ اللہ مقلدانہ مزاج بنانا اسلام کا ہرگز منشا نہیں ہے—— اپنی سوچ کو آزاد رکھو' غور کرتے رہو' اپنی آنکھیں کھلی رکھو۔دین کے لیے کام کرنا سب کا مشترکہ مقصد ہے۔کسی ایک کا مقصد نہیں ہے جو مرحلہ بھی درپیش ہو' اس موقع پر اس کے تقاضوں کے فہم کے لیے تمہارا ذہن کام کرے۔اس کے موافقت یا مخالفت' اس کے حق اور اختلاف کے بارے میں تم بھی سوچو' اپنی رائے کا برملا اظہار کرو۔البتہ **فَاِذَا**

عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ جب اجتماعی مشورے کے بعد امیر کا فیصلہ سامنے آ جائے تو مانو۔ اس کے حکم کی تعمیل کرو۔

اندازہ کیجیے یہ ہے ڈسپلن۔ اس ڈسپلن کے بغیر انقلاب نہیں آ سکتا۔ اس ڈسپلن کی اہمیت کو غزوۂ احد سے سمجھیے۔ آپ نے غور کیا کہ اس غزوہ میں فتح ہو چکی تھی۔ قرآن کہتا ہے: ﴿وَلَقَدْ صَدَقَكُمُ اللّٰهُ وَعْدَهٗۤ اِذْ تَحُسُّوْنَهُمْ بِاِذْنِهٖ ۚ﴾ "اور اللہ نے نصرت کا جو وعدہ تم سے کیا تھا اس نے پورا کر دیا۔ جب تم انہیں گاجر مولی کی طرح کاٹ رہے تھے"—— پھر یہ فتح شکست میں کیوں بدل!؟ اسی آیت میں اجمالاً اس کا ذکر ہے۔ اس کی تفصیل احادیث اور سیر کی مستند کتابوں میں ملتی ہے۔ اُحد کے میدان میں پہاڑ کے ساتھ ایک درّہ تھا۔ اس امکان کے پیش نظر نبی اکرم ﷺ نے حضرت عبداللہ بن جبیر رضی اللہ عنہ کی سربراہی میں پچاس صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا ایک دستہ تعینات کر دیا تھا کہ مبادا دشمن کی فوج کا کوئی دستہ پہاڑ کے پیچھے سے آ کر اس درّے کے راستے مسلمانوں پر عقب سے حملہ کر دے۔ اس دستہ کو نبی کریم ﷺ نے اتنی شدید تاکید کی تھی کہ اگر تم دیکھو کہ ہمیں شکست ہو گئی ہے اور ہماری لاشیں پرندے نوچ رہے ہیں تب بھی اس جگہ کو نہ چھوڑنا—— مسلمانوں کو جب اللہ کی نصرت سے فتح ہوئی اور دشمن منتشر ہونے لگا تو اس دستے میں اختلاف ہوا کہ حضور ﷺ کا منشا تو یہ تھا کہ شکست کی صورت میں ہمیں یہ جگہ نہیں چھوڑنی لیکن اب جبکہ مسلمانوں کو فتح ہو رہی ہے تو ہمیں بھی دشمن کو قتل کرنے کے لیے میدانِ جنگ میں چلنا چاہیے۔ دستہ کے امیر حضرت عبداللہ بن جبیرؓ ان کو روکتے رہے کہ جب تک نبی اکرم ﷺ کا حکم نہ آئے ہمیں اسی جگہ ٹھہرنا چاہیے۔ لیکن ان پچاس میں سے زیادہ سے زیادہ پینتیس حضرات تھے جنہوں نے دستہ کے امیر کی بات نہیں مانی اور میدانِ جنگ میں جا شامل ہوئے۔ خالدؓ بن ولید جو اس وقت تک ایمان نہیں لائے تھے اور عرب کے مانے ہوئے جرنیل تھے۔ انہوں نے جب اس درّے کو خالی دیکھا' اُحد پہاڑ کے پیچھے سے ایک لمبا چکر کاٹ کر اپنے دستے کے ساتھ اس درّے کی جانب سے عقب سے مسلمانوں پر حملہ کر دیا۔ جو پندرہ صحابیؓ رک گئے تھے وہ اس یلغار کو نہ روک سکے اور سب کے سب شہید ہو گئے۔ دشمن کی فوج نے جب یہ دیکھا کہ پیچھے سے خالد بن ولید کے دستے نے حملہ کر دیا تو ان کے اکھڑے ہوئے قدم جم گئے اور انہوں نے پلٹ کر مقابلہ شروع کر دیا اور مسلمانوں کی یہ فتح شکست میں تبدیل ہو گئی۔ اسی کی طرف اشارہ ہے آیت کے اگلے حصہ میں: ﴿حَتّٰۤى اِذَا فَشِلْتُمْ وَتَنَازَعْتُمْ فِى الْاَمْرِ

وَعَصَيْتُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَاۤ اَرٰىكُمْ مَّا تُحِبُّوْنَ ؕ﴾ "مگر جب تم نے کمزوری دکھائی اور حکم کے بارے میں اختلاف کیا" دیکھئے وہی لفظ آ گیا: لَا نُنَازِعُ الْاَمْرَ —— "تم نے اپنے سردار کے حکم کی خلاف ورزی کی جیسے ہی اللہ نے تمہیں وہ چیز دکھائی جو تمہیں محبوب تھی"(۱) —— دیکھا آپ نے پینتیس افراد کی طرف سے ڈسپلن توڑنے کی سزا ستر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی شہادت کی شکل میں ملی جن میں حضرت حمزہ بھی تھے اور حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہما بھی۔ پھر یہ کہ خود نبی اکرم ﷺ بھی زخمی ہوئے۔ یہ سب اس لیے ہوا کہ ہم تمہیں آزمانا اور سبق دینا چاہتے تھے اور تمہارے دلوں کو پاک کرنا چاہتے تھے ﴿وَلِيَبْتَلِىَ اللّٰهُ مَا فِىْ صُدُوْرِكُمْ وَلِيُمَحِّصَ مَا فِىْ قُلُوْبِكُمْ ؕ﴾ تمہاری تنظیم کا یہ جھول رفع ہو جانا چاہیے اور تمہیں ڈسپلن کا پابند اور خوگر بننا چاہیے ابھی تو ابتدائے عشق ہے۔ ابھی تو عشق کے امتحان اور بھی ہیں۔ تمہیں اللہ کے دین کا جھنڈا چاردانگ عالم میں بلند کرنا ہے۔ ﴿كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ ؕ﴾ تم عالمی اسلامی صالح انقلاب کے ہراول ہو —— تمہاری جانب سے کامل سمع وطاعت کا مظاہرہ ہونا چاہیے اگر ابھی یہ ڈھیل ہے تو آگے کیسے چلو گے! —— یہ ہے بیعت سمع وطاعت۔

میں اس موقع پر ایک ضمنی بات کہہ کر آگے بڑھوں گا —— ایک دوسری بیعت بھی ہے' میں اسے حق مانتا ہوں اور وہ ہے بیعت ارشاد۔ لیکن وہ بیعت سمع وطاعت نہیں ہے۔ اس بیعت ارشاد کے لیے قرآن وسنت میں بنیاد ہے۔ قرآن مجید میں سورۃ الممتحنۃ میں بیعت النساء کا پوری تفصیل کے ساتھ ذکر ہے: ﴿يٰۤاَيُّهَا النَّبِىُّ اِذَا جَآءَكَ الْمُؤْمِنٰتُ يُبَايِعْنَكَ عَلٰۤى اَنْ لَّا يُشْرِكْنَ بِاللّٰهِ شَيْـًٔا وَّلَا يَسْرِقْنَ وَلَا يَزْنِيْنَ وَلَا يَقْتُلْنَ اَوْلَادَهُنَّ وَلَا يَاْتِيْنَ بِبُهْتَانٍ ......﴾ (آیت ۱۲) یہ بیعت نساء ہے۔ اور حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ کی ایک اور روایت میں یہ الفاظ ملتے ہیں کہ لیلۃ العقبہ میں اسی کی بیعت حضور ﷺ نے انصارِ مدینہ سے لی تھی۔ اس میں بالکل یہی الفاظ ہیں:

اَخْبَرَنِىْ اَبُوْ اِدْرِيْسَ عَائِذُ اللّٰهِ بْنُ عَبْدِ اللّٰهِ اَنَّ عُبَادَةَ بْنَ الصَّامِتِ رضی اللہ عنہ

(۱) اکثر مفسرین نے یہاں مَا تُحِبُّوْنَ سے مراد مالِ غنیمت کی محبت لی ہے' جبکہ بعض نے اس سے مراد فتح لی ہے۔ یہ حضرات سورۃ الصّف کی آیت ﴿وَاُخْرٰى تُحِبُّوْنَهَا ؕ نَصْرٌ مِّنَ اللّٰهِ وَفَتْحٌ قَرِيْبٌ ؕ﴾ سے اپنی رائے کے لیے استدلال کرتے ہیں۔ یہ رائے انسب معلوم ہوتی ہے۔ (مرتب)

وَكَانَ شَهِدَ بَدْرًا وَهُوَ اَحَدُ النُّقَبَاءِ لَيْلَةَ الْعَقَبَةِ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ قَالَ وَحَوْلَهٗ عِصَابَةٌ مِنْ اَصْحَابِهٖ بَايِعُوْنِيْ عَلٰى اَنْ لَا تُشْرِكُوْا بِاللّٰهِ شَيْئًا وَلَا تَسْرِقُوْا وَلَا تَزْنُوْا وَلَا تَقْتُلُوْا اَوْلَادَكُمْ وَلَا تَاْتُوْا بِبُهْتَانٍ تَفْتَرُوْنَهٗ بَيْنَ اَيْدِيْكُمْ وَاَرْجُلِكُمْ وَلَا تَعْصُوْا فِيْ مَعْرُوْفٍ فَمَنْ وَفٰى مِنْكُمْ فَاَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ وَمَنْ اَصَابَ مِنْ ذٰلِكَ شَيْئًا فَعُوْقِبَ فِي الدُّنْيَا فَهُوَ كَفَّارَةٌ لَهٗ وَمَنْ اَصَابَ مِنْ ذٰلِكَ شَيْئًا ثُمَّ سَتَرَهُ اللّٰهُ فَهُوَ اِلَى اللّٰهِ اِنْ شَاءَ عَفَا عَنْهُ وَاِنْ شَاءَ عَاقَبَهٗ فَبَايَعْنَاهُ عَلٰى ذٰلِكَ (صحیح البخاری، کتاب الایمان)

لیلۃ العقبہ میں حضور ﷺ نے یہ بیعت لی ہے۔ یہ بیعت ارشاد ہے۔ نیکیوں کے لیے، بھلائیوں کے لیے، برائیوں سے بچنے کے لیے، تزکیہ نفس کے لیے۔

اب میں تاریخی اعتبار سے ایک اجمالی سا نقشہ آپ حضرات کے سامنے رکھنا چاہتا ہوں۔ دیکھئے نبی اکرم ﷺ نے بیعتیں لیں۔ بیعت عقبہ اولیٰ، بیعت عقبہ ثانیہ اور بیعت شجرہ، اسی کا دوسرا نام بیعت رضوان ہے۔ ان بیعتوں کا ذکر تو سیرت کی تمام کتابوں میں مل جاتا ہے۔ بیعت رضوان کا بیان تو قرآن مجید میں موجود ہے۔ ایک بیعت کا ذکر امام بخاریؒ نے کیا ہے۔ اس شعر میں جو صحابہ کرامؓ غزوۂ احزاب میں پڑھ رہے تھے۔ جب وہ خندق کھود رہے تھے تو ان کی زبانوں پر یہ شعر جاری تھا ؎

نَحْنُ الَّذِيْنَ بَايَعُوْا مُحَمَّدًا

عَلَى الْجِهَادِ مَا بَقِيْنَا اَبَدًا

”ہم وہ لوگ ہیں جنہوں نے محمد (ﷺ) سے جہاد کے لیے بیعت کی ہے۔ جب تک ہم زندہ رہیں۔“

اس بات کو خاص طور پر نوٹ کیجیے کہ بیعت رضوان ابھی نہیں ہوئی۔ سورۃ الفتح ابھی نازل نہیں ہوئی —— یہ بیعت جہاد جس کا اس شعر میں ذکر ہے کب ہوئی! اب یہ تحقیق کی بات ہے کہ بالفعل بھی ایسا کوئی واقعہ ہوا تھا! یا یہ کہ اس کو تعبیر کیا گیا ہے اس امر سے کہ رسول اللہ ﷺ پر ایمان لانے کے معنی ہی یہ ہیں کہ ہم نے بیعت جہاد کی ہے۔ یہ کسی محقق کے کرنے کا کام ہے کہ بیعت جہاد کب اور کہاں لی گئی! یا جیسا کہ میں نے ابھی عرض کیا کہ یہ ایمان لانے کی تعبیر ہے: **نَحْنُ الَّذِيْنَ بَايَعُوْا مُحَمَّدًا عَلَى الْجِهَادِ مَا بَقِيْنَا اَبَدًا**۔ میں اپنی رائے پیش کر رہا

ہوں، میرا گمان ہے کہ عقبہ اولی کی بیعت وہ تھی جو میں نے حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ کی روایت کے حوالے سے ابھی آپ کو سنائی ہے۔ جو بیعت ارشاد اور تزکیہ کے لیے جڑ اور بنیاد ہے۔ اور عقبہ ثانیہ میں نبی اکرم ﷺ نے انصارؓ سے جو بیعت لی وہ چونکہ حضور ﷺ کی حفاظت کے لیے تھی، اس لیے اس میں یقیناً جہاد کے لیے بیعت کے بھی الفاظ ہوں گے۔

یہاں ایک نکتہ اور عرض کر دوں۔ اگر آپ غور کریں گے تو نبی اکرم ﷺ کو کسی نوع کی بیعت لینے کی ضرورت نہیں تھی۔ اس لیے کہ حضور ﷺ تو اللہ کے رسول ہیں۔ رسول سے تعلق تو ایمان کا ہے۔ ایمان لائے اور ہمہ تن مطیع ہو گئے جیسا کہ سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ نے غزوۂ بدر سے پہلے مجلس مشاورت میں کہا تھا کہ حضور ﷺ ہم سے کیا پوچھ رہے ہیں: **اِنَّا اٰمَنَّا بِكَ وَصَدَّقْنَاكَ** ہم آپ ﷺ پر ایمان لا چکے ہیں، ہم نے آپ ﷺ کی تصدیق کی ہے۔ اب ہمارے پاس کون سا اختیار رہ گیا ہے! —— ﴿وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ اِذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ اَمْرًا اَنْ يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ اَمْرِهِمْ ط﴾ رسول مان لیا تو بات ختم۔ میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں اور اہل علم کی تصویب یا تصحیح کے لیے یہ بات پیش کی ہے کہ درحقیقت یہ ساری بیعتیں حضور ﷺ نے صرف اُسوہ اور سنت چھوڑنے کے لیے لی تھیں۔ ورنہ مجھے یقین ہے جتنا اس بات کا یقین ہے کہ اس وقت آپ حضرات یہاں تشریف رکھتے ہیں اور میں آپ سے خطاب کر رہا ہوں۔ اتنا ہی مجھے اس کا یقین ہے کہ وہ چودہ سو صحابہ کرامؓ جو مدینہ سے چل کر حدیبیہ تک پہنچے تھے۔ اس موقع پر نبی اکرم ﷺ جنگ کا فیصلہ فرماتے تو ان میں سے کوئی ایک نہیں تھا جو پیٹھ دکھا دیتا۔ ان کے دلوں میں تو آگ لگی ہوئی تھی۔ وہ حضرت عمرؓ کے طرزِ عمل سے بھی سامنے آ رہی ہے اور حضرت علیؓ کے طرزِ عمل سے بھی —— تمام صحابہ کرامؓ کے طرزِ عمل سے سامنے آ رہی ہے کہ جب نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ احرام کھول دو اور جو ہدی کے جانور لائے ہو ان کی قربانی دے دو، انہیں یہیں ذبح کر دو۔ لیکن ایک بھی نہیں اٹھا۔ ان کے دلوں کی کیفیت عجیب تھی۔ ان کی تلواریں نیاموں سے باہر آنے کے لیے بے تاب تھیں۔ وہ سوچ رہے تھے شاید جلد ہی وحی الٰہی آ جائے اور حضور ﷺ جنگ کا فیصلہ فرما لیں — پھر بیعت کی ضرورت کیا تھی۔ وہاں بیعت ہونی چاہیے تھی سمع و طاعت کی بیعت — حضور ﷺ کو ان کے جذبات کو ٹھنڈا کرنا ہے۔ انہیں روکنا ہے، لیکن درحقیقت بیعت شجر، حضور ﷺ کا اسوہ اور سنت تھی بعد میں آنے والوں کے لیے —— اگر ہم یہ مانتے ہیں کہ دین ہمہ اوست۔ دین تو نام ہی اتباعِ رسول ﷺ کا ہے۔ تو ہم بعد کے

زمانے کے لیے وہ بنیاد کہاں سے لاتے۔ اگر وہ بات سنت وسیرتِ رسول علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام سے ثابت نہ ہوتی!

نبی اکرم ﷺ کے بعد خلافت راشدہ کا نظام قائم ہوا۔ اس کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں دین و دنیا ایک وحدت ہیں جیسے دورِ نبویؐ و رسالت میں ویسے ہی دورِ خلافت راشدہ میں۔ جو امام دنیا کا ہے' وہی امام دین کا ہے۔ وہی مسجد نبویؐ کی نمازوں کا امام بھی ہے اور خطیب بھی۔ لہٰذا ایک ہی بیعت ہے' حضرات ابوبکر' عمر کی' عثمان کی' علی رضی اللہ عنہم کی۔

یہ بیعت سیاسی بھی ہے' حکومت کی بھی ہے اور یہ بیعت دینی بھی ہے—— البتہ اس دور میں لوگوں کو ایک مغالطہ ہو گیا ہے میں چاہتا ہوں کہ اس کی اصلاح کے لیے کچھ عرض کر دوں۔ اکثر لوگ بیلٹ کو بیعت کا مترادف اور قائم مقام سمجھ رہے ہیں' یہ مغالطہ ہی نہیں حماقت ہے۔ اس دور کا جو بیلٹ ہے وہ مشورے کے قائم مقام ہے۔ مشورے کے بعد حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر بیعت ہوئی ہے۔ پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے چھ صحابہؓ کا امیر کے انتخاب کے لیے جو بورڈ قائم کیا تھا' اس نے کتنی دیر تک مشورہ کیا ہے اور پھر حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ کو اختیار سپرد کیا ہے کہ وہ حضرات عثمان وعلی رضی اللہ عنہما میں سے ایک کو خلیفہ اور امیر المؤمنین نامزد کر دیں۔ پھر فیصلہ سے قبل حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف نے مدینہ میں بہت سے مردوں عورتوں حتیٰ کہ نوعمروں سے مشورہ لیا ہے۔ یہ تمام تفاصیل سیر کی کتابوں میں محفوظ ہیں۔ اس کے بعد انہوں نے حضرت عثمانؓ کا نام پیش کیا ہے۔ پھر بیعت عام ہوئی ہے۔ حضرت علیؓ کو جب خلافت کی پیشکش کی گئی ہے تو آپؓ نے مدینہ میں مقیم اکابر صحابہؓ کو مسجد نبوی میں جمع کیا ہے اور پھر مشورہ کے بعد بیعت لی ہے۔ لہٰذا بیلٹ اور بیعت کو بالکل علیحدہ کر دیجیے۔ یہ قطعی طور پر ایک دوسرے سے جدا عمل ہیں —— اس دور میں مشورے کا جو بھی نظام بنے۔ یہ اصحاب علم ودانش کا کام ہے کہ وہ اسلامی اصولوں کو سامنے رکھ کر مشورے کا کوئی نظام بنائیں اور جب ضرورت ہو گی تو ان شاء اللہ بن جائے گا اور جب تک وہ وقت نہیں آتا بحثیں ہی ہوتی رہیں گی۔ حاصل کچھ نہیں ہو گا۔ ذہنی انتشار ہی بڑھتا رہے گا۔ بہرحال بیعت اور بیلٹ بالکل جدا ہیں۔ بیلٹ مشورے کا معاملہ ہے۔ مشورے کے بعد وہ مسئلہ طے ہو گا جس کے لیے بیلٹ کرایا جائے گا۔

خلافت راشدہ کے بعد نری خلافت رہ گئی۔ خلافت تو ہے لیکن اس میں سے دینی عنصر نکل گیا۔ اب محض حکمرانی ہے۔ لہٰذا آپ کو معلوم ہے کہ دو بیعتیں شروع ہو گئیں۔ اس دینی عنصر

نے بیعت ارشاد کی شکل اختیار کر لی۔ سیاسی اور حکومتی سطح پر بنواُمیہ اور بنوعباس کے خلفاء سے بیعت ہو رہی ہے۔ ان دو بیعتوں کا نظام چلتا رہا۔ تا آنکہ مغربی امپریلزم کے سیلاب نے ہمارے سیاسی اور حکمرانی کے نظام کی دھجیاں بکھیر دیں۔ ریت کے گھروندوں کے مانند ہماری حکومتیں بیٹھ گئیں۔ لہٰذا بیعت حکومت ختم ہو گئی۔ اب ایک ہی بیعت رہ گئی اور وہ بیعت ارشاد ہے۔ اس کو تو ختم کرنے والا کوئی نہیں تھا —— اس میں جو مختلف سلاسل وجود میں آ گئے تھے وہ تا حال چل رہے ہیں —— جیسے فقہ کے چار مسالک مشہور ومعروف ہیں اور چل رہے ہیں —— البتہ جو احیائی تحریکیں اٹھیں —— یہ ہے اہم اور غور طلب بات —— وہ سب بیعت کی بنیاد پر اٹھیں۔ ایک استثنا ہے جس کا میں بعد میں ذکر کروں گا—— سوڈان میں انگریزی حکومت سے ٹکراؤ کے لیے مہدی سوڈانی کی جو تحریک اٹھی وہ بیعت کی بنیاد پر تھی۔ طرابلس (موجودہ لیبیا) میں سنوسی کی تحریک اطالویوں کے خلاف بیعت کی بنیاد پر اٹھی۔ نجد سے جو تحریک اٹھی اگرچہ وہ براہِ راست مغربی سامراج کے غلام نہیں ہوئے تھے لیکن شیخ محمد بن عبدالوہابؒ کی تجدید دین و احیائے اسلام کے لیے جو تحریک اٹھی تھی وہ بھی بیعت کی بنیاد پر۔ پھر میرے نزدیک ان تمام تحریکوں میں سب سے عظیم تحریک' دورِ صحابہ سے مماثلت میں قریب ترین تحریک وہ تحریک تھی جسے ہم تحریک شہیدین کے نام سے جانتے ہیں۔ اس کی بنیاد بھی بیعت پر۔ اس تحریک میں کم از کم مجھے دور نبوت کا نقشہ نظر آتا ہے۔ جیسے حضور ﷺ نے بہت سی بیعتیں لی ہیں جن کا ذکر احادیث میں ملے گا۔ یہاں تک کہ سنن نسائی میں حضرت جریر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ میں نے حضور ﷺ سے ہر مسلمان کی خیرخواہی کے لیے بیعت کی۔ عَنْ جَرِيْرٍ قَالَ بَايَعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ عَلَى النُّصْحِ لِكُلِّ مُسْلِمٍ۔ بیعتِ عقبہ اولیٰ' بیعتِ عقبہ ثانیہ' بیعتِ رضوان کا حوالہ میں پہلے دے چکا ہوں۔ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی ایک روایت جو متفق علیہ ہے۔ مزید سن لیجیے: قَالَ كُنَّا اِذَا بَايَعْنَا رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ عَلَى السَّمْعِ وَالطَّاعَةِ يَقُوْلُ لَنَا فِيْمَا اسْتَطَعْتُمْ ''جب ہم رسول اللہ ﷺ سے سمع وطاعت کی بیعت کرتے تو آپؐ ہم سے فرماتے کہ جس چیز کی تم طاقت رکھو''۔ معلوم ہوا کہ حضور ﷺ نے مختلف مواقع پر مختلف امور کے لیے صحابہ کرامؓ سے بیعتیں لی ہیں۔ یہی نقشہ آپ کو تحریک شہیدین میں ملے گا۔ بیعت ارشاد بھی ہے۔ بیعت جہاد بھی ہے۔ بیعت اتباع شریعت بھی ہے اور آخری بیعت وہ تھی جو اس آخری وقت لی گئی جب انتہائی نامساعد حالات تھے۔ نہ راشن ہے' نہ ساز وسامان ہے' گویا کہ مشہد بالاکوٹ کا انتظار ہو رہا ہے۔ اس وقت سید صاحبؒ نے آخری بیعت لی تھی کہ مجھ سے اس بات پر بیعت

کرو کہ ہر شخص اپنے ساتھی کو اپنے اوپر ترجیح دے گا اور مقدم رکھے گا: ﴿یُؤْثِرُوْنَ عَلٰی اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ﴾ —— اس بیعت سے معذرت کی شاہ اسمٰعیل شہیدؒ نے اس عذر کی بنیاد پر کہ میں بوڑھا ہو چکا ہوں' میرے قویٰ کمزور پڑ گئے ہیں' میں اس بیعت کا حق ادا نہیں کر سکتا!

ذہن میں رکھیے کہ شاہ اسماعیل شہیدؒ کون ہیں۔ امام الہند شاہ ولی اللہ دہلویؒ کا پوتا۔ شاہ عبدالعزیزؒ' شاہ عبدالقادرؒ اور شاہ رفیع الدینؒ کا بھتیجا۔ شاہ عبدالغنیؒ کا لخت جگر۔ علم کا پہاڑ' 'عبقات' کا مصنف' میں دعوے سے کہتا ہوں کہ اس دور کے جو فارغ التحصیل علماء ہیں ان کے نوے فیصد حضرات اس کتاب کو سمجھنا تو درکنار' صحیح پڑھ بھی نہیں سکتے۔ منصب امامت جیسی کتاب کا مصنف' تقویۃ الایمان جیسی کتاب کا مصنف۔ کس کے ہاتھ پر بیعت کی جو انؒ کے مقابلہ میں علم میں ان کا پاسنگ نہیں۔ سید احمد بریلویؒ اپنی جلالت شان کے باوجود علم میں شاہ اسماعیل کے پاسنگ بھی نہیں تھے۔ عمر میں چھوٹے' چھ سال کا فرق۔ شاہ اسماعیلؒ چھ سال بڑے ہیں سیدؒ صاحب سے —— میں نے ابھی حال ہی میں کراچی میں تحریک شہیدین پر ایک تقریر کی ہے۔ لہٰذا چند کتابوں سے مراجعت کی تو پہلی مرتبہ میرے علم میں آیا کہ سید صاحبؒ شاگرد بھی ہیں شاہ اسماعیلؒ کے —— بعض کتابیں انہوں نے شاہ صاحبؒ سے پڑھی ہیں۔ وہ نسبت بھی ہے لیکن یہ کہ اس اللہ کے بندے نے ہاتھ میں ہاتھ دینے کے بعد جو نباہ کیا ہے وہ بے مثال ہے۔ یہ ہمارے ماضی قریب کی تاریخ ہے۔ قریباً ڈیڑھ سو صدی قبل کی بات ہے —— سید صاحبؒ نے اپنے ساتھیوں کے ساتھ تاریخ کا longest march کیا ہے۔ ماؤزے تنگ کا مارچ اس کے مقابلے میں کیا حیثیت رکھتا ہے! ۔ وہ جو ہجرت کی ہے اور رائے بریلی میں تکیہ شاہ علم اللہ کو چھوڑا ہے اور ندی کو پار کیا ہے تو دو نفل شکرانے کے ادا کیے ہیں کہ اللہ تیرا شکر ہے کہ تو نے اپنے دین کے لیے ہجرت کی توفیق عطا فرمائی اور پھر کہاں سے کہاں! رائے بریلی سے گوالیار' گوالیار سے ٹونک' وہاں سے جیسلمیر' پھر عمر کوٹ جہاں اکبر پیدا ہوا تھا۔ پھر وہاں سے حیدر آباد۔ پھر پیر جی گوٹھ' پیر پگاڑا صاحب کی بستی۔ وہاں سے شکار پور پھر درّہ بولان کراس کر کے کوئٹہ پھر قندھار ہوتے ہوئے کابل اور وہاں سے پشاور۔

یہ باتیں اس وقت میرے موضوع سے متعلق نہیں ہیں۔ تحریک شہیدین کی بات چلی تو یہ باتیں بھی زیر گفتگو آ گئیں۔ اس وقت مجھے جو عرض کرنا تھا وہ یہ کہ یہ عظیم الشان تحریک بیعت کی بنیاد پر اٹھی —— اس کے ساتھ ہی میں آپ کو یہ بات بتانا چاہتا ہوں کہ یہ نہ سمجھئے کہ بالاکوٹ

کے مقام پر ان قائدینؒ اور ان کے نیک ساتھیوں کی شہادت کے بعد یہ تحریک ختم ہو گئی اور اس کے کچھ اثرات نہیں رہے۔ معاذ اللہ —— اس کے بعد بھی اس تحریک کے بنگال میں' بہار میں' یو پی میں' جنوبی ہند میں باقیات الصالحات پھیلے ہیں اور انہوں نے وہاں دعوت وتبلیغ کا کام کیا ہے۔ یہ اپنی جگہ ایک مستقل موضوع ہے۔ بالاکوٹ میں دنیوی اور ظاہری نقطۂ نظر سے تحریک ناکام ہوئی ہے تو یہ نہ سمجھئے کہ اس کے اثرات بھی ختم ہو گئے۔ یہ دارالعلوم دیوبند کا قیام' اس کے علمائے حق' یہ اسی تحریک کی ایک کڑی ہے۔ اسی دیوبند کی ایک عظیم ترین شخصیت ہیں شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندیؒ —— یہاں تک اس بیعت کا تار نہیں ٹوٹا' چل رہا ہے۔ مولانا عبیداللہ سندھیؒ آخر شیخ الہند کے ساتھ کسی عہد میں بندھے ہوئے تھے کہ اِدھر حکم ہوا اُدھر یہ اپنا گھر بار چھوڑ کر افغانستان نکل گئے۔

اگر اسی مسئلہ پر ہمارے ہاں باقاعدہ تحقیق ہو تو مجھے یقین ہے کہ بہت سی اہم باتیں جن پر ماضی کا پردہ پڑا ہے' منظر عام پر آ جائیں۔ میں نے جب مولانا ابوالکلام آزاد کے متعلق یہ روایت 'میثاق' اکتوبر ۱۹۷۵ء میں شائع کی تھی کہ جمعیت العلماء ہند کے ۱۹۲۲ء کے اجلاس میں حضرت شیخ الہندؒ کے ایما پر مولانا مفتی کفایت اللہ مرحوم اور مولانا احمد سعید مرحوم نے یہ تحریک پیش کی تھی کہ مولانا آزاد مرحوم کو امام الہند مان کر تمام علماء ان کے ہاتھ پر جہاد کی بیعت کریں۔ لیکن مولانا معین الدین اجمیری مرحوم کے ایک اصولی اعتراض کی وجہ سے اس پر عمل نہیں ہوا (یہ مضمون میں نے علیحدہ پمفلٹ کی شکل میں طبع کرا لیا ہے اور آج حاضرین میں ہدیتاً تقسیم ہو جائے گا)(۱) اس پر کراچی سے ڈاکٹر احمد کمال صاحب کا خط آیا جس میں اس بات کو خلافِ واقعہ بتایا گیا تھا۔ لامحالہ مجھے پھر معاملہ کی تحقیق کرنی پڑی' جس کے نتیجے میں معلوم ہوا کہ میں نے جس روایت کا حوالہ دیا تھا وہ بالکل صحیح تھی۔ اس میں صرف سن کے تعین میں تسامح ہو گیا تھا۔ یعنی یہ اجلاس ۱۹۲۲ء میں نہیں ۱۹۲۰ء میں منعقد ہوا تھا۔ بہرحال یہ تمام بحث پمفلٹ کے مطالعہ سے آپ کے سامنے آ جائے گی۔ اس تحقیق کے دوران اور بھی عجیب عجیب انکشاف ہوئے۔ مولانا معین الدین اجمیریؒ خیر آبادی مکتب فکر کی ایک عظیم شخصیت تھے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ آخری شخصیت' لیکن میرے نزدیک اس مکتبہ فکر کی آخری شخصیت مولانا اجمیریؒ کے شاگرد رشید مولانا منتخب الحق صاحب ہیں جو بفضلہٖ تعالیٰ بقید حیات ہیں۔ ان کے بعد شاید منطق وفلسفہ قدیم کا یہ مکتب فکر ختم ہو جائے۔ مولانا اجمیریؒ کے متعلق مولانا منتخب الحق صاحب مدظلہ

(۱) یہ مضمون اسی تالیف میں شامل ہے جو یقیناً قارئین کی نگاہ سے گزر چکا ہوگا۔ (مرتب)

نے مجھے بتایا کہ مولاناؒ اپنی لائبریری کی الماریوں کی چابیاں کتابوں کی صفائی کے لیے اکثر کسی نہ کسی شاگرد کو دے دیا کرتے تھے۔لیکن ایک الماری ایسی تھی کہ جس کی چابی وہ اپنے شاگردوں میں کبھی کسی کو نہیں دیتے تھے۔مولانا منتخب الحق صاحب نے بتایا کہ ایک مرتبہ ایسی چوک ہوئی کہ انہوں نے اس کی چابی مجھے دے دی کہ ذرا اس الماری کی کتابیں وغیرہ صاف کرلو—— وہاں میں نے دیکھا کہ ایک رجسٹر رکھا ہوا تھا۔اس میں ان لوگوں کے نام اور پتے درج تھے جو مولانا مرحوم کے ہاتھ پر انگریز کے خلاف بیعت جہاد کیے ہوئے تھے۔اس دور میں یہ چیز کہاں ہے! نہ معلوم ہندوستان میں کتنے علماء ہوں گے جنہوں نے اسی طرز پر بیعت جہاد لی ہوگی۔لیکن یہ کہ کوئی مرحلہ آئے تو بات سامنے آئے۔مناسب جمعیت فراہم ہو تو اس کا آگے ظہور ہو۔

میں اب جو بات عرض کرنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ اس سلسلہ کی آخری کڑی تھی وہ کوشش جو حضرت شیخ الہندؒ نے اپنی زندگی کا چراغ گل ہونے سے چند یوم قبل کی تھی کہ یہ تار ٹوٹنے نہ پائے۔یہ کوشش ۱۹۲۰ء کے جمعیت العلماء ہند کے اجلاس میں جو دہلی کی جامع مسجد میں منعقد ہوا تھا' کی گئی تھی کہ دیے سے دیا جلتا رہے' چراغ سے چراغ روشن ہوتا رہے۔حضرت شیخ الہندؒ کی کوشش یہ تھی کہ مولانا ابوالکلام آزاد کے ہاتھ پر بیعت کی جائے۔وہ امام الہند مانے جائیں اور پھر جہاد کیا جائے۔ میں نے مولانا معین الدین اجمیریؒ کا ذکر پہلے کر دیا۔میرے دل میں ان کا بڑا احترام ہے۔علمی وجاہت کے اعتبار سے بھی اور اس لیے بھی کہ وہ خود اپنی جگہ بیعت جہاد لے رہے تھے' لیکن مسئلہ درپیش تھا کہ تمام علمائے ہند کی طرف سے بیعت کی جائے۔یہ بہت بڑی بات تھی۔اس لیے کہ اس وقت جمعیت العلماء ہند کا پلیٹ فارم صرف علمائے دیوبند کا نہیں تھا۔وہ تو مشترک پلیٹ فارم تھا۔اس میں اس وقت فرنگی محل کے علماء بھی تھے' اس میں بدایون کے علماء بھی تھے۔اس میں بریلی مکتب فکر کے علماء بھی تھے۔مجھے تو یہ واقعہ پروفیسر یوسف سلیم چشتی مرحوم ومغفور نے سنایا تھا اور انہوں نے یہ واقعہ مولانا عبدالحامد بدایونی مرحوم کے برادر بزرگ مولانا عبدالماجد بدایونی مرحوم سے سنا تھا جو اس اجتماع میں بنفس نفیس موجود تھے۔

پروفیسر یوسف سلیم چشتی مرحوم ومغفور کے نام کا ذکر آ گیا ہے' بہت سے احباب نے مجھے یاد دلایا تھا کہ ان محاضرات میں ان کا کوئی ذکر ہی نہیں ہوا' حالانکہ ہماری تمام قرآن کانفرنسوں اور محاضراتِ قرآنی کی ایک نشست کی وہ رونق ہوا کرتے تھے' بلا استثناء —— میں نے ان سے بہت کچھ سیکھا ہے اور بہت کچھ حاصل کیا ہے —— بہرحال وہ اللہ کے حضور حاضر ہو چکے۔اللہ

تعالیٰ ان کی خطاؤں سے درگزر فرمائے اور انہیں اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے۔جذبات میں آ کر وہ کبھی انتہا پسندی کا مظاہرہ کر جاتے تھے' اس کو علیحدہ رکھ کر میں نے ان سے زیادہ سچا آدمی اپنی پوری زندگی میں نہیں دیکھا۔کسی شے کا خوف ان کو نہیں تھا اور سچ کہنے سے کوئی باک نہیں تھا۔کبھی انہوں نے یہ نہیں دیکھا کہ میری اس بات سے کون ناراض ہوگا اور کس کی تیوری پر بل چڑھ جائیں گے۔جو بات کہی ہے سچ سمجھ کر کہی ہے —— ہوسکتا ہے کہ آدمی مغالطہ میں ہو یہ دوسری بات ہے' لیکن ہمیشہ بات وہی کہی ہے جو ان کے نزدیک حق ہو —— ان کے انتقال پر ہمارے یہاں جو کچھ ہوا ہے وہ بھی آپ کے سامنے ہے —— ایکٹر مر جائیں تو اخبارات کے صفحے کے صفحے کالے نہیں کہہ رہا رنگین ہو جاتے ہیں اور خصوصی ایڈیشنوں کی مسابقت شروع ہو جاتی ہے' لیکن وہ درویش ایسے گیا ہے کہ جیسے پتا ہی نہیں۔میرا خیال یہ تھا کہ ان کے جنازے پر لاہور ٹوٹ پڑے گا لیکن جب وہاں جا کر جو حال دیکھا ہے سو دیکھا ہے۔چند لوگ نماز جنازہ کے لیے۔پانچ صفیں بھی مشکل سے بنی تھیں' وہ بھی طاق تعداد بنانے کی خاطر۔

بہرحال میں عرض کر رہا تھا کہ وہ جو کوشش تھی اور بات یہ آ گئی تھی کہ اس وقت جمعیت علمائے ہند کا پلیٹ فارم مشترک تھا۔اہل حدیث حضرات سن لیں کہ اس وقت کوئی جمعیت اہل حدیث نہیں تھی۔اہل حدیث علماء بھی اسی میں شامل تھے۔مولانا داؤد غزنوی مرحوم ومغفور اس اجلاس میں شریک تھے—— جب مولانا آزاد مرحوم کو امام الہند بنانے اور ان کے ہاتھ پر بیعت جہاد کرنے کی تحریک پیش ہوئی تو مولانا معین الدین اجمیری مرحوم کھڑے ہو گئے' اور انہوں نے ایک بات کہی—— انہوں نے تجویز کی مخالفت نہیں کی۔اسے مخالفت نہیں کہا جا سکتا—— مولانا اجمیری مرحوم نے کہا کہ اتنا بڑا فیصلہ اچانک مجمع عام میں نہیں ہونا چاہیے اس سے پہلے اس تجویز پر مجلس شوریٰ یا جو بھی ان کا نظام تھا' اس میں اس پر غور ہونا چاہیے—— بات اتنی وزنی تھی کہ اس کو رد کرنے کا کوئی سوال ہی نہیں—— مولانا شبیر احمد عثمانی جو پہلے اصل تجویز کی تائید کر چکے تھے' انہوں نے بھی مولانا اجمیری مرحوم کی بات کی تائید کی اور اس وقت اصل تجویز مجلس شوریٰ کے سپرد کر دی گئی۔ چند اور باتیں بھی ہیں جو آپ کو اس پمفلٹ سے معلوم ہو جائیں گی۔اسے گھر جا کر پڑھیے گا—— اس اجلاس کے دس روز بعد حضرت شیخ الہندؒ کا انتقال ہو گیا۔ بہرحال اس تجویز کے پیچھے جو اصل قوت تھی جو اس تار کو جوڑے رکھنا چاہتی تھی اور جو ہندوستان گیر پیمانے پر بیعت جہاد کی تجدید و تحریک کی آرزومند تھی وہ دنیا سے رخصت ہوگئی

اَللّٰھُمَّ اغْفِرْلَہٗ وَارْحَمْہُ —— مولانا سعید الرحمٰن صاحب علوی ہم سب کے شکریہ کے مستحق ہیں کہ انہوں نے ایک مضمون کے ذریعہ حضرت شیخ الہندؒ کے یہ الفاظ ہم تک پہنچا دیے کہ یہاں تک ان کا حال تھا کہ وہ فرماتے ہیں کہ ''میں بیعت کیے بغیر مرنا نہیں چاہتا۔ میری چارپائی سٹیج پر لے جاؤ''۔ اس لیے کہ اٹھنے کی تو پوزیشن ہی نہیں تھی۔ اس اجلاس کا ان کا خطبہ صدارت مولانا شبیر احمد عثمانی ؒ نے پڑھ کر سنایا تھا۔ انہی ایام میں جب حضرت شیخ الہندؒ علی گڑھ یونیورسٹی گئے تھے تو پالکی میں لٹا کر انہیں وہاں پہنچایا گیا تھا۔ اور چارپائی پر لیٹے لیٹے انہوں نے نہایت دردمندی اور دلسوزی کے ساتھ علی گڑھ کے طلبہ کو ان کا دینی فرض یاد دلایا تھا —— لیکن یہ ان کے اندر جو جذبہ تھا وہ ان سے یہ کام کرا رہا تھا۔ جسم تو بالکل گھل چکا تھا۔ ٹی بی آخری اسٹیج کو پہنچ چکی تھی جبھی تو انگریز نے انہیں مالٹا سے رہا کیا تھا اور ہندوستان بھیجا تھا۔ ورنہ رہائی کا کیا سوال تھا۔

جب حضرت شیخ الہندؒ کا انتقال ہو گیا تو وہ تجویز ٹھپ ہو گئی۔ وہ دن اور آج کا دن وہ تار ٹوٹا ہوا ہے —— دو تار بیک وقت ٹوٹے ہیں —— توجہ کیجیے گا —— ایک تارِ خلافت ٹوٹا —— آج ساٹھ برس سے زیادہ ہو گئے کہ کوئی صرف نام کا ادارہ بھی پورے عالم اسلام میں موجود نہیں ہے —— کہیں کوئی علامتی خلافت کا ادارہ بھی موجود نہیں —— دوسرا تار بیعت جہاد کا ٹوٹا۔ میں پورے ادب و احترام لیکن نہایت دکھ اور رنج کے ساتھ عرض کرتا ہوں کہ مجھے ایک طرف تو ان حضرات کے طرزِ عمل پر نہایت افسوس ہوتا ہے جو مدعی ہیں متبع سنت ہونے کے اور ظاہر حدیث پر عمل کرنے کے لیے۔

کیسی کیسی حدیثیں ہیں کہ جنہیں یہ حضرات گھول کر پی گئے۔ وہ انہیں نہ صحیح بخاری میں نظر آئیں نہ صحیح مسلم میں —— رفع یدین کی احادیث، وہ بھی قولی نہیں عملی، صحابہ کرامؓ کی رپورٹ ہے، حضورﷺ کا اپنا کوئی قول نہیں —— اس پر معرکے ہیں۔ اس پر من دیگرم تو دیگری والا معاملہ ہے۔ یہ حدیثیں کہاں گئیں! ذرا سنیے تو سہی حضورﷺ کا فرمان، قولی حدیث۔ **رواہ مسلم عن عبداللہ بن عمر** ؓ: **قال سمعت رسول اللہ ﷺ یقول** ''حضرت عبداللہ بن عمرؓ روایت کرتے ہیں کہ میں نے خود سنا رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے'' ((**مَنْ خَلَعَ یَدًا مِنْ طَاعَةٍ لَقِیَ اللّٰہَ یَوْمَ الْقِیَامَةِ وَلَا حُجَّةَ لَہٗ وَمَنْ مَاتَ وَلَیْسَ فِیْ عُنُقِہٖ بَیْعَةٌ مَاتَ مِیْتَةً جَاھِلِیَّةً**)) ''جس نے ہاتھ کھینچ لیا امیر کی اطاعت سے تو وہ قیامت کے دن اللہ سے اس

حال میں ملے گا کہ اس کے لیے کوئی عذر اور حجت نہیں ہوگی اور جو شخص مرا اس حال میں کہ اس کی گردن میں بیعت کا حلقہ نہ تھا، بیعت کا قلادہ نہ تھا وہ جاہلیت کی موت مرا''۔ ایک اور حدیث بھی سن لیجیے اگرچہ وہ ایک دوسرے طریق سے میں آپ کو سنا چکا ہوں۔ امام بخاریؒ روایت کرتے ہیں:

عَنْ جُنَادَةَ بْنِ اَبِیْ اُمَیَّةَ قَالَ دَخَلْنَا عَلٰی عُبَادَةَ بْنِ الصَّامِتِ وَھُوَ مَرِیْضٌ قُلْنَا اَصْلَحَکَ اللّٰہُ حَدِّثْ بِحَدِیْثٍ یَنْفَعُکَ اللّٰہُ بِہٖ سَمِعْتَہٗ مِنَ النَّبِیِّ ﷺ قَالَ دَعَانَا النَّبِیُّ ﷺ فَبَایَعْنَاہُ فَقَالَ فِیْمَا اَخَذَ عَلَیْنَا اَنْ بَایَعْنَا عَلَی السَّمْعِ وَالطَّاعَةِ فِیْ مَنْشَطِنَا وَمَکْرَھِنَا وَعُسْرِنَا وَیُسْرِنَا وَاَثَرَةٍ عَلَیْنَا وَاَنْ لَا نُنَازِعَ الْاَمْرَ اَھْلَہٗ اِلَّا اَنْ تَرَوْا کُفْرًا بَوَاحًا عِنْدَکُمْ مِّنَ اللّٰہِ فِیْہِ بُرْھَانٌ

میں کہتا ہوں کہ ہمارے صوفیوں کے لیے پھر بھی گنجائش ہے، ان کے لیے پھر بھی سہارا ہے کہ ہم نے بیعت کی ہوئی ہے اور بیعت لے بھی رہے ہیں۔ بیعت ارشاد کے سلاسل تو جاری ہیں، لیکن یہ حضرات اس کے بھی قائل نہیں۔ وہ کہاں کھڑے ہیں، یہ حدیثیں انہیں پکار رہی ہیں —— دوسری طرف میں اسی ادب و احترام لیکن رنج و افسوس کے ساتھ ان علمائے کرام سے عرض کرتا ہوں جو خود کو حضرت شیخ الہند ؒ کے سلسلہ تلمذ سے وابستہ کہتے ہیں کہ یہ حضرات کس حال میں ہیں! حضرت شیخ الہندؒ کا یہ حال کہ بستر مرگ پر فرما رہے ہیں کہ میری چارپائی سٹیج پر لے جاؤ، میں بیعت کیے بغیر مرنا نہیں چاہتا اور بیعت سمع و طاعت اور ہجرت و جہاد کس کے ہاتھ پر کرنے کے لیے آمادہ ہیں جو ان سے عمر کے لحاظ سے پینتیس یا چالیس سال چھوٹا ہے اور جو تقویٰ، طہارت اور علم و فضل کے اعتبار سے ان کا پاسنگ بھی نہیں ہے۔ ان کا ظرف اتنا وسیع ہے کہ برملا اعتراف فرمایا کرتے تھے کہ اس نوجوان یعنی ابوالکلام آزاد نے ہمیں ہمارا بھولا ہوا سبق یاد دلا دیا۔ اسی لیے خود بھی ان کے ہاتھ پر بیعت جہاد کرنے کا فیصلہ کرتے ہیں اور اس امر کی کوشش فرماتے ہیں کہ جمعیت العلماء ہند ابوالکلام آزاد مرحوم کے ہاتھ پر من حیث الجماعت ان کو امام الہند تسلیم کر کے ان کے ہاتھ پر بیعت جہاد کر لے۔

میں نے عرض کیا تھا کہ گزشتہ ڈیڑھ دو صدی قبل جو تحریکیں اُٹھیں، وہ بیعت کی بنیاد پر اٹھیں۔ اس میں ایک استثناء ہے۔ اس کا ذکر یہاں مناسب ہوگا۔ مولانا آزاد مرحوم نے الہلال اور البلاغ کے ذریعہ حکومت الٰہیہ کے قیام کے لیے ایک جماعت کی ضرورت پر جو مدلل

مقالے لکھے تھے اس کے نتیجے میں اس وقت ''حزب اللہ'' کے نام سے ایک جماعت مولانا آزاد مرحوم نے قائم کی تھی لیکن وہ محدود رہی اور کوئی تحریک بپا نہ ہوسکی۔ ۱۹۲۰ء میں ان کے ہاتھ پر بیعت جہاد کی شیخ الہند کی تجویز روبعمل نہ آسکی۔ جس کے اسباب میں بیان کر چکا ہوں۔ مولانا آزاد تو اس ناکامی سے بددل ہو کر اس کام سے دستبردار ہوگئے اور ان کی مساعی کا تمام تر میدان استخلاصِ وطن کی جولان گاہ بن گیا — آزاد مرحوم ہی کے فکر سے متاثر ہو کر مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی مرحوم و مغفور کی دعوت پر ۱۹۴۱ء میں تجدید و احیائے دین کے لیے ''جماعت اسلامی'' کا قیام عمل میں آیا(۱)۔ اور یہ دستوری و آئینی طرز کی جماعت تھی۔ اس نے ہیئت اجتماعیہ کے لیے بیعت کے مسنون طریقے کو اختیار نہیں کیا — لیکن اسی دور میں مصر میں اسلام کی نشأۃ ثانیہ کے لیے شیخ حسن البنا شہیدؒ نے الاخوان المسلمون قائم کی تو اس کی بنیاد بیعت پر ہی رکھی۔ تنظیم اسلامی کی مجلس مشاورت نے اپنے رفیق ڈاکٹر تقی الدین صاحب کے سپرد یہ کام کیا کہ وہ الاخوان المسلمون کے تنظیمی ڈھانچے کے متعلق تحقیق کریں۔ چنانچہ انہوں نے اخوان سے متعلق بے شمار کتابوں کا مطالعہ کیا۔ کراچی میں ان حضرات سے ملاقاتیں کیں جن کا قریبی تعلق اخوان سے رہا ہے تو معلوم ہوا کہ اس تنظیم کے تین درجے تھے جس میں سب سے اونچا درجہ وہ تھا جس سے وابستگی بیعت کی بنیاد پر ہوتی تھی۔

اب میں کھل کر چند صاف صاف باتیں عرض کرنا چاہتا ہوں۔ اچھی طرح جان لیجیے کہ اس دور میں جس سے ہم آج کل گزر رہے ہیں' یہ بیعت سمع و طاعت صرف دو طرح کی ہوسکتی ہے' تیسرا کوئی امکان نہیں ہے۔ ایک یہ کہ اگر اسلامی نظامِ حکومت کہیں قائم ہے تو اس کے سربراہ سے بیعت ہوگی۔ دوسرے یہ کہ اگر ایسا نہیں ہے تو جو جماعت جہاد یعنی انقلابی عمل کے ذریعہ اسلامی نظام قائم کرنے کے لیے اٹھے گی اس کے امیر کے ہاتھ پر بیعت ہوگی — نبی اکرمﷺ نے فرمایا ہے: ((یَدُ اللّٰہِ عَلَی الْجَمَاعَۃِ))۔ حضرت عمر فاروقؓ فرماتے ہیں: لَا اِسْلَامَ اِلَّا بِالْجَمَاعَۃِ — اور حضورﷺ فرماتے ہیں: ((لَا جَمَاعَۃَ اِلَّا بِالْاِمَارَۃِ)) — اگر اسلامی نظام قائم ہے تو اس کا جو سربراہ ہے وہ صدر نہیں ہوا کرتا' وہ امیر المؤمنین ہے۔ اس کے ہاتھ پر بیعت ہے اور اگر نہیں ہے تو اس کو قائم کرو۔ یہ دو ہی شکلیں ہیں۔ اسلامی نظام قائم کرنے کی جدوجہد کے لیے جماعت درکار ہے۔ اس جماعت کے امیر کے ہاتھ پر بیعت

(۱) اگرچہ مولانا مودودی مرحوم نے اپنی تحریک کا رشتہ اشارتاً و کنایتاً بھی مولانا آزاد مرحوم کے فکر سے نہیں جوڑا۔

ہوگی۔ تیسری کوئی شکل ہے ہی نہیں — کیسے ایک بندۂ مؤمن مرسکتا ہے بغیر بیعت کے۔ یا اسلامی حکومت ہے' اسلامی نظام ہے تو اس کے سربراہ کے ہاتھ پر بیعت ہے۔ ملک گیر پیمانے پر بیعت لینے کا نظام قائم ہوگیا جیسا کہ خلافت راشدہ میں اور خلافت بنی اُمیہ و بنی عباس میں قائم تھا — اگر نہیں ہے تو اس کو قائم کرنے والی جماعت کے امیر کے ہاتھ پر بیعت ہے۔ تیسری کوئی شکل ممکن نہیں لہٰذا ہر بندۂ مؤمن پر لازم ہے' واجب ہے' فرض ہے کہ بیعت کا قلادہ اس کی گردن میں پڑا ہو۔ اگر یہ نہیں ہے تو نبی اکرمﷺ کا فتویٰ عبداللہ بن عمرؓ کی حدیث میں آچکا ہے جو مسلم شریف کی روایت ہے جس کے آخر میں حضورﷺ کے الفاظ آتے ہیں: ((وَمَنْ مَاتَ وَلَیْسَ فِیْ عُنُقِہٖ بَیْعَۃٌ مَاتَ مِیْتَۃً جَاھِلِیَّۃً)) (۱)

مناسب ہوگا کہ میں اس اشکال کا ذکر بھی کردوں جو لوگوں کو لاحق ہوتا ہے کہ آخر اس دور میں مسلمانوں کے خلاف قتال کیسے ہوگا! چونکہ عام طور پر مسلم اکثریت کے ممالک کے حکمران مسلمان ہی ہیں۔ بالکل عملی مسئلہ ہے اور یہ اشکال پیدا ہوتا ہے۔ لہٰذا اس کو کتاب وسنت کی روشنی میں رفع ہونا ضروری ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ بعض اعتبارات سے مسلمانوں کا مسلمانوں سے قتال کا معاملہ یعنی مسلمان حکومت کے خلاف بغاوت کا معاملہ بڑا پیچیدہ ہے۔ چاہے ملک میں اسلامی نظام رائج نہ ہو۔ کفار کے مقابلہ میں قتال کا معاملہ دوسرا ہے۔ دو عوامل ایسے ہیں کہ مسلمانوں کا کسی مسلمان حکومت کے خلاف بغاوت اور مسلمانوں کا آپس میں قتال خارج از بحث ہے۔ میں اسے تسلیم کرتا ہوں۔ اگرچہ مولانا الطاف الرحمٰن بنوی صاحب یہاں تشریف فرما ہیں۔ انہوں نے گزشتہ محاضرات میں جو مقالہ پیش کیا تھا جو ''میثاق'' کے جنوری ۱۹۸۴ء کے شمارے میں شائع ہوچکا ہے۔ اس مقالہ میں انہوں نے مستند حوالہ جات سے بتایا تھا کہ بعض فقہاء کی رائے یہ ہے کہ کسی فاجر و فاسق مسلمان حکومت کے خلاف خروج اور بغاوت حرام مطلق نہیں ہے۔ البتہ اس کے لیے نہایت کڑی شرائط ہیں۔ یہ پوری ہوجائیں تو خروج کیا جاسکتا ہے لیکن مسئلہ علمی ہے' دقیق ہے' باریک ہے' اہل علم اس پر غور کر کے کوئی حتمی رائے قائم کریں۔ میں جو کچھ عرض کر رہا ہوں' وہ یہ ہے کہ اس جدید دور کے حالات کو سمجھیے۔ ممکن اس لیے نہیں ہے کہ عوام اور حکومت کے درمیان طاقت کا بہت بڑا فصل ہے۔ کوئی نسبت بنتی نہیں۔ آخر قرآن مجید نے بھی کوئی نہ کوئی نسبت تو قائم کی ہے — آخر بدر میں بھی ایک اور تین تھے۔ احد میں ایک اور چار تھے۔ لیکن جب ''موتہ'' میں ایک اور تینتیس کی نسبت ہوگئی تو جو نتیجہ نکلا وہ

(۱) اس مسئلہ پر محترم ڈاکٹر اسرار احمد کی وضاحت ''محاضرات قرآنی'' کی روداد میں آچکی ہے۔ (مرتب)

آپ کو معلوم ہے۔ زید بن حارثہ شہید' جعفر طیار ابن ابی طالب شہید' عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہم شہید۔
حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ اس نرغے سے بقیہ لشکر کو نکال کر لے آئے یہ بھی بڑی کامیابی ہے۔
اب جو معاملہ ہے وہ ایک اور تینتیس کیا' ایک اور تینتیس سو سے بھی زیادہ ہے۔ چونکہ عوام بالکل
نہتے اور حکومت کے پاس فوج کی جو مضبوط طاقت ہے وہ آپ کو معلوم ہے۔ دوسری اہم بات
کیا ہے! اصل میں تمدن میں جو ارتقاء ہوا ہے' بعض لوگ اسے بالکل نظر انداز کر دیتے ہیں۔ یہ
دور وہ نہیں ہے جس میں عمرانی اور تمدنی مسائل ابھی develop نہیں ہوئے تھے۔ اس وقت
کیا تھا؟ حکومت بدلنے کا ارادہ کرنا بھی بغاوت تھا اور آج حکومت کو بدلنا' اس کو بدلنے کی
کوشش کرنا' عوام کا مسلمہ حق ہے۔ زمین وآسمان کا فرق واقع ہو گیا۔ اس لیے کہ اس وقت تک
ابھی ریاست اور حکومت کے درمیان فرق و امتیاز نہیں تھا۔ اس دور میں تصور یہ تھا کہ ریاست
اور حکومت ایک ہے۔ لہٰذا حکومت کے خلاف اقدام گویا ریاست کے خلاف اقدام شمار ہوجاتا
تھا۔ آج تو مشرق و مغرب کا فرق واقع ہو چکا ہے۔ ریاست اور شے ہے حکومت اور شے
ہے۔ ہم کسی حکومت کے وفادار نہیں ہیں۔ ہماری وفاداری ریاست کے ساتھ ہے اور حکومت کو
بدلنا جمہور کا حق ہے۔ لہٰذا زمین وآسمان کا فرق ہو گیا۔ جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ تبدیلی صرف
بغاوت ہی کے ذریعہ آسکتی ہے' وہ لوگ تمدن میں جو فرق واقع ہو چکے ہیں' ان کو نظر انداز
کرتے ہیں۔ ایک اور اہم بات۔ وہ یہ کہ اس دور میں دنیا میں ایک تصور (concept) مضبوط
بنیادوں پر استوار ہوا ہے جس کی کامیابی کے مظاہر آپ کو ہر چہار طرف نظر آ رہے ہیں۔ وہ
تصور یہ ہے کہ عوام کو کسی بھی مطالبہ کے لیے پرامن مظاہرہ کا حق ہے۔ عوام اپنے سیاسی حقوق
کے لیے مظاہرہ کر سکتے ہیں۔ وہ اگر حکومت کے کسی اقدام یا فیصلے کو غلط سمجھتے ہیں تو اس کے
خلاف مظاہرہ کر سکتے ہیں لیکن نظم و ضبط میں رہیں —— اور مظاہرہ کریں۔

میں یہ سمجھتا ہوں کہ سورۃ التوبہ میں آیت ۱۱۱ کے بعد جو آیت ۱۱۲ ہے وہ بڑی عظیم آیت
ہے۔ اس میں ایک طرف تو وہ ظاہری اور باطنی اوصاف بیان ہو گئے جو ایک بندۂ مؤمن کی
سیرت میں درکار ہیں۔ بڑی دلکش اور عجیب ہے یہ آیت —— اس میں تین تین اوصاف کے
تین سیٹ ہیں۔ ایک طرف وہ چھ اوصاف بیان ہوئے جو ایک بندۂ مؤمن کی زندگی میں
انفرادی سطح پر مطلوب ہیں۔ دوسری طرف ایک مسلم معاشرے کا فرد ہونے کے اعتبار سے ایک
بندۂ مؤمن پر جو اجتماعی ذمہ داری عائد ہوتی ہے اس کے لیے جو اوصاف ہونے چاہئیں وہ
بیان ہو گئے۔ وہ بھی تین ہی بیان ہوئے۔ فرمایا:

﴿اَلتَّآئِبُوْنَ الْعٰبِدُوْنَ الْحٰمِدُوْنَ السَّآئِحُوْنَ الرّٰكِعُوْنَ السّٰجِدُوْنَ﴾
''(یہ مؤمنین جنہوں نے جنت کے عوض اپنی جان اور اپنا مال اللہ کے ہاتھ بیچ دیا ہے)
اللہ کی طرف بار بار پلٹنے والے ہیں۔ عبادت گزار ہیں' اس کا شکر ادا کرنے والے' اس
کی ثنا کرنے والے ہیں۔ اس کے (دین) کی خاطر زمین میں گردش کرنے والے ہیں
اور اس کے آگے رکوع اور سجدے کرنے والے ہیں۔''

چھ اوصاف تو یہ ہو گئے۔ آگے جو تین اوصاف آ رہے ہیں وہ بڑے غور اور توجہ کے متقاضی ہیں:

﴿اَلْاٰمِرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَالنَّاهُوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَالْحٰفِظُوْنَ لِحُدُوْدِ اللّٰهِ﴾
''نیکی کا حکم دینے والے ہیں' بدی سے روکنے والے ہیں اور اللہ کی حدود کی حفاظت
کرنے والے ہیں۔''

اس آیت میں بتا دیا گیا ہے کہ جو بندۂ مؤمن اللہ سے بیع و شراء کا معاملہ کرتا ہے' وہ ان
اوصاف کا حامل ہوتا ہے —— ان آخری اوصاف میں کلید ہے اس سارے مسئلہ کی۔ ایک
مسلمان ملک میں اسلامی نظام قائم کرنے کے لیے جو انقلابی جماعت میدان میں آئے گی وہ
اس بنیاد پر آئے گی کہ صرف امر بالمعروف' نہی عن المنکر اور تحفظ حدود اللہ کا فریضہ انجام
دے۔ فلاں شے منکر ہے' ہم اسے نہیں ہونے دیں گے۔ اگر ہمارے پاس عوامی تائید کی طاقت
ہے تو ہم اسے چیلنج کریں گے کہ یہ اسلام کے خلاف کام ہے۔ ہم اسے نہیں ہونے دیں گے اور
اسی میں مسئلہ کا حل موجود ہے۔ وہ چیزیں جو سب کے نزدیک منکر ہیں۔ جو بریلوی ہیں' وہ بھی
مانتے ہیں کہ بے حیائی' نیم عریانی' تبرج جاہلیہ' مرد و عورت کے سارے مخلوط طور طریقے منکر
ہیں۔ جو دیوبندی ہیں وہ بھی جانتے ہیں کہ یہ تمام کام منکر ہیں' اہل حدیث ہیں ان کو بھی ان
کے منکر ہونے میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ یہی وہ چیز ہے کہ جو تمام فقہی اختلافات کے باوجود
لوگوں کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کر دے گی —— میں پرسوں آپ کو وہ حدیث سنا چکا جو مسلم
شریف کی روایت ہے اور اس کے راوی ہیں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ۔ وہ کہتے ہیں کہ
حضور ﷺ نے فرمایا: ((مَا مِنْ نَبِيٍّ بَعَثَهُ اللّٰهُ فِيْ اُمَّةٍ قَبْلِيْ اِلَّا كَانَ لَهٗ مِنْ اُمَّتِهٖ حَوَارِيُّوْنَ
وَاَصْحَابٌ يَاْخُذُوْنَ بِسُنَّتِهٖ وَيَقْتَدُوْنَ بِاَمْرِهٖ)) ''مجھ سے پہلے اللہ نے جس نبی کو اس کی اپنی
امت میں مبعوث فرمایا تو اس نبی کی اُمت میں اس کے ایسے حواری اور اصحاب ہوتے تھے جو
اپنے نبی کی سنت کو تھامے رکھتے تھے اور اس کے حکم کی اطاعت کرتے تھے'' ((ثُمَّ اِنَّهَا تَخْلُفُ

مِنْ بَعْدِهِمْ خُلُوْفٌ)) ''ان کے بعد ان کے ایسے جانشین آ جاتے تھے جو نالائق ہوتے تھے'' ((یَقُوْلُوْنَ مَا لَا یَفْعَلُوْنَ وَیَفْعَلُوْنَ مَا لَا یُؤْمَرُوْنَ)) ''جو کہتے تھے' اس پر عمل نہیں کرتے تھے اور ایسے کام کرتے تھے جن کا ان کو حکم نہیں دیا گیا تھا''۔ اب حدیث کا اگلا حصہ غور سے سماعت فرمائیے۔ حضورﷺ ارشاد فرماتے ہیں: ((فَمَنْ جَاهَدَهُمْ بِيَدِهٖ فَهُوَ مُؤْمِنٌ وَمَنْ جَاهَدَهُمْ بِلِسَانِهٖ فَهُوَ مُؤْمِنٌ وَمَنْ جَاهَدَهُمْ بِقَلْبِهٖ فَهُوَ مُؤْمِنٌ وَلَيْسَ وَرَاءَ ذٰلِکَ مِنَ الْاِيْمَانِ حَبَّةُ خَرْدَلٍ)) ''تو ایسے لوگوں سے جو شخص ہاتھ یعنی قوت و طاقت سے جہاد کرے تو وہ مؤمن ہے۔ اور جو شخص زبان سے جہاد کرے تو وہ مؤمن ہے اور جو شخص دل سے جہاد کرے یعنی دل میں کڑھے' اس کی نیندیں حرام ہو جائیں' وہ اپنی بے بسی پر مضطرب اور بے کل رہے تو وہ بھی مؤمن ہے اور اگر ان تینوں حالتوں میں سے کوئی بھی نہیں ہے تو ایسا شخص جان لے کہ اس شخص کے دل میں رائی کے برابر بھی ایمان نہیں ہے'' وَلَيْسَ وَرَاءَ ذٰلِکَ مِنَ الْاِيْمَان حَبَّةُ خَرْدَلٍ ــــ اس حدیث میں ''هُمْ'' کی ضمیر مفعولی انتہائی قابل غور ہے۔ نبی اکرمﷺ ان نا خلف جانشینوں کے خلاف جہاد کی تاکید فرما رہے ہیں جو مسند اقتدار پر بیٹھ کر منکرات کو فروغ دے رہے ہوں۔ جن کے عمل' جن کے طور طریقے' جن کا وطیرہ منکرات پر مشتمل ہو۔ جو ذرائع ابلاغ کو منکرات کی تشہیر و اشاعت کے لیے استعمال کر رہے ہوں۔ ان کی سرپرستی کر رہے ہوں اور ایسا ماحول اور ایسی فضا پیدا کرنے کا باعث بن رہے ہوں کہ اس میں معروفات سسک رہے ہوں اور منکرات فروغ پا رہے ہوں۔ معاشرہ جن کی بدولت سنڈاس بن گیا ہو ــــ ان حالات میں اگر مسلمان منکرات کے خلاف ہاتھ سے یا زبان سے یا دل سے جہاد نہ کریں تو الصادق والمصدوق علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ان کے ایمان کی نفی فرمائی ہے۔ منکرات کے خلاف ایک بندۂ مؤمن کا صحیح طرزِ عمل کیا ہونا چاہیے۔ اسے ایک اور حدیث سے بھی سمجھ لیجیے جس کو امام مسلمؒ نے اپنی صحیح میں روایت کیا ہے:

((مَنْ رَاٰی مِنْكُمْ مُّنْكَرًا فَلْيُغَيِّرْهُ بِيَدِهٖ ، فَاِنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ فَبِلِسَانِهٖ ، فَاِنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ فَبِقَلْبِهٖ ، وَذٰلِکَ اَضْعَفُ الْاِيْمَانِ))

''جو کوئی تم میں سے برائی کو دیکھے تو اس پر لازم ہے کہ وہ اسے اپنے ہاتھ یعنی طاقت سے بدل دے۔ اگر وہ اس کی استطاعت نہ رکھتا ہو تو اپنی زبان سے اسے برا کہے اور اسے بدلنے کی کوشش کرے اور اگر اس کی بھی استطاعت نہ رکھتا ہو تو اسے دل سے برا

جانے۔ اس پر دلی کرب محسوس کرے اور یہ ایمان کا کمزور ترین درجہ ہے۔''

اس حدیث کے آخری ٹکڑے میں دوسری روایت میں وہی الفاظ آئے ہیں جو حضرت ابن مسعودؓ سے مروی ہے: وَلَيْسَ وَرَاءَ ذٰلِکَ مِنَ الْاِيْمَانِ حَبَّةُ خَرْدَلٍ ــــ یہ ہے ہمارے دین میں منکرات کے خلاف جہاد کی اہمیت۔ اگر صورتِ حال یہ ہو کہ ایک مسلمان نہ ہاتھ سے' قوت سے برائی کو بدلنے کی اجتماعی جدوجہد کا اپنے اندر داعیہ رکھتا ہو۔ نہ برائی کو برائی کہنے کی ہمت پاتا ہو اور نہ ہی برائی کے خلاف اپنے دل میں کرب اور اضطراب اور نفرت و کراہیت کے جذبات رکھتا ہو تو ایسے شخص کو اپنے ایمان کی خیر منانی چاہیے۔ فضائل کے بیان کی بھی اہمیت ہے۔ مجھے اس سے انکار نہیں۔ اس کے ذریعہ کچھ لوگ انفرادی طور پر نیکوکار بن جائیں گے لیکن معاشرہ بحیثیت مجموعی ہرگز تبدیل نہیں ہوگا جب تک منکرات کے خلاف جماعتی سطح پر منظّم جدوجہد اور جہاد نہ ہو۔

اگر جمعیت فراہم ہو جائے' تعداد بھی معتد بہ ہو' پھر وہ منظّم ہو' تربیت یافتہ ہو تو اس دور میں منکرات کے استیصال اور معروفات کی ترویج کے لیے جہاد کی اور موجودہ دور کی اصطلاح کی رو سے انقلابی عمل کی ضرورت ہے۔ اس کے بغیر نہ اسلامی نظام قائم ہوگا اور نہ کوئی صالح تبدیلی رونما ہوگی ــــ خالصتاً رضائے الٰہی کے حصول کے لیے ایسے بااصول اور جذبۂ قربانی سے سرشار لوگوں کی طاقت فراہم ہو جائے تو کسی منکر کو چیلنج کیجیے۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ﴾ منظّم قوت ہونی ضروری ہے۔ ہمیں حکومت ہرگز درکار نہیں۔ نہ حکومت کا کوئی منصب ہم کو چاہیے۔ ہم صرف آخرت کے طالب ہیں: ﴿تِلْکَ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ نَجْعَلُهَا لِلَّذِيْنَ لَا يُرِيْدُوْنَ عُلُوًّا فِی الْاَرْضِ وَلَا فَسَادًا﴾ انتخابات کی طرف ہم کبھی جائیں گے بھی نہیں۔ ہم ان مناصب پر تھوکتے ہیں۔ ہماری نگاہ میں ان کی پرکاہ کے برابر بھی کوئی حیثیت نہیں ــــ لیکن ہم اس پر عمل کرنے کی کوشش میں جان کی بازی لگانا اپنے لیے سعادت سمجھتے ہیں: ﴿وَالْاٰمِرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَالنَّاهُوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَالْحٰفِظُوْنَ لِحُدُوْدِ اللّٰهِ ط﴾ ہمارا کام اور ہماری ذمہ داری یہ ہے کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ انجام دیں اور حدود اللہ کی حفاظت کے لیے ہر قسم کی قربانی کے لیے خود کو پیش کریں۔ اس آیت میں ﴿وَالْحٰفِظُوْنَ لِحُدُوْدِ اللّٰهِ﴾ فرما کر گویا اسلام کے پورے نظامِ حیات کو بالفعل قائم کرنے کی ذمہ داری بھی عائد کر دی گئی ہے۔ اس فریضہ کو انجام دینے کی جدوجہد کرنے والوں

کے لیے آیت کے آخر میں فرمایا گیا ہے: ﴿وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ○﴾ ان مؤمنین صادقین کے لیے آخرت میں فوز و فلاح کی بشارت ہے۔

اس سارے مسئلہ کی کلید سورۃ التوبہ کی اس آیت میں موجود ہے۔ اگر سیاسی حقوق کے لیے مظاہرہ ہوسکتا ہے تو دین نے جن کاموں کو منکرات قرار دیا ہے ان کو چیلنج کیوں نہیں کیا جا سکتا! ہماری دینی قوتیں جو منتشر ہیں وہ اسی انتخابی سیاست کی وجہ سے منتشر ہیں۔ ہر ایک اپنی بھیڑوں کو سنبھالنے کی فکر میں ہے تاکہ جب الیکشن کا مرحلہ آئے تو ہمارے ووٹوں کی تعداد سب سے زیادہ رہے۔ اسی لیے فقہی اختلافات کو زیادہ ہوا دی جاتی ہے اور باقاعدہ فرقہ واریت پیدا کر کے اُمت کی وحدت کو نقصان پہنچایا جاتا ہے۔ اپنی اپنی بھیڑوں کے گلے علیحدہ علیحدہ (identified) رہیں۔ ممیز رہیں، کہیں گڈمڈ نہ ہو جائیں، لیکن انقلابی عمل کے مطابق کام ہوگا تو یہ ساری تقسیمیں ختم ہو جائیں گی۔ اس لیے کہ ان منکرات کے بارے میں کسی کے نزدیک کوئی اختلاف نہیں ہوسکتا۔

میں آج سوچ رہا تھا کہ کاش کبھی وہ وقت آئے کہ ہم ایک الٹی میٹم دیں کہ ہم ملک میں کسی عورت کی تصویر چھپنے نہیں دیں گے۔ کیا یہ دین کے اعتبار سے جائز ہے جو ہو رہا ہے کہ عورت کو ایک اشتہاری جنس بنا رکھا ہے! اخبارات کو دیکھ لیجیے، اشتہارات کو دیکھ لیجیے، مختلف مصنوعات کو دیکھ لیجیے۔ پھر کسی اور مسئلہ کو لیجیے، منکرات کی ترویج کی کوئی حد ہی نہیں ہے، لیکن اس کے لیے شرط ہے اجتماعی منظم قوت: ﴿وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ﴾۔ اس کے لیے وہ جمعیت درکار ہے جو ایک کمانڈ پر حرکت (move) کرے۔ وہ اتنی منظم ہو کہ اگر وہ سڑکوں پر مظاہروں کے لیے آئے تو پوری ذمہ داری لے سکے۔ اس کا جلوس نکلے تو اس میں کوئی گڑبڑ نہ ہو، گڑبڑ کرنے والوں کے ہاتھ روکنے کا پورا انتظام ہو۔ یہ نہیں کہ جلوس تو ہم نے نکالا ہے لیکن کچھ اور لوگ آ گئے ہیں۔ انہوں نے گڑبڑ کی ہے۔ یہ غلط ہے۔ اس لیے کہ آپ کی تنظیم نہیں، آپ کی جماعت نہیں، آپ لوگوں کے جذبات کو مشتعل کرتے ہیں، آپ کا اندرونی نظم و ضبط اس قدر مستحکم ہو کہ یہ گارنٹی دی جا سکے کہ اگر ہم جلوس نکالیں گے تو جو کچھ ہوگا اس کے ہم ذمہ دار ہوں گے۔ اس کام کے لیے ہجوم درکار نہیں ہے۔ یہ بڑا مبارک اور احسن کام ہے۔ اس میں کامیابی بھی اجر و ثواب کا باعث ہے اور رہی ناکامی تو اللہ کے دین کی راہ میں جان دینے سے بڑی کسی سعادت کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔

بہرحال اس جہاد یا انقلابی عمل کے لیے جو جماعت درکار ہے۔ اس کے اوصاف امام ترمذی اور امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہما کی اس حدیث کے حوالے سے سمجھیے جس کے راوی ہیں حضرت حارث بن اشعری رضی اللہ عنہ۔ وہ کہتے ہیں کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

((آمُرُكُمْ بِخَمْسٍ : بِالْجَمَاعَةِ وَالسَّمْعِ وَالطَّاعَةِ وَالْهِجْرَةِ وَالْجِهَادِ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ))

''میں تمہیں پانچ باتوں کا حکم دیتا ہوں: التزامِ جماعت کا، سمع وطاعت کا، اور اللہ کی راہ میں ہجرت اور جہاد کا۔''

ایک دوسری روایت میں آمُرُكُمْ بِخَمْسٍ کے بعد الفاظ آئے ہیں اَللّٰهُ اَمَرَنِيْ بِهِنَّ اللہ نے مجھے ان کا حکم دیا ہے۔

یہ ہے میری برسوں کی گزارشات کا تکملہ اور تتمہ —— دعوت و تبلیغ اور تزکیہ و تربیت۔ یہ ہے جہاد بالقرآن۔ اگلے سارے مراحل ایک منظم جماعت کے ساتھ حق کے قیام کے لیے عملاً جدوجہد، کشمکش، باطل سے تصادم، اپنے اقتدار کے لیے نہیں، حصولِ حکومت کے لیے نہیں، صرف اللہ کے دین کے لیے: ﴿وَالْحٰفِظُوْنَ لِحُدُوْدِ اللّٰهِ﴾ —— یہ ہے اس دور کی اصل ضرورت۔ بدقسمتی سے ۱۹۲۰ء میں اس کے لیے جو آخری کوشش ہوئی تھی، وہ ناکام ہوئی۔ اس کے بعد سے یہ تار ابھی تک ٹوٹا ہوا تھا۔ اس دوران میں صرف ایک بیعت ہوئی ہے لیکن وہ جزوی تھی۔ صرف فتنۂ قادیانیت کے استیصال کے لیے مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری ؒ کو امیر شریعت کا درجہ دے کر ان کے ہاتھ پر بیعت ہوئی ہے اور اس بیعت کرنے والوں میں کون کون شامل تھے! بیک وقت حضرت مولانا انور شاہ کاشمیری ؒ بھی ان میں شامل تھے۔ شاہ بخاریؒ کا اپنا خلوص و اخلاص اور قربانی و ایثار اپنی جگہ لیکن جہاں تک علم کا تعلق ہے تو شاہ بخاریؒ کو شاہ کاشمیریؒ سے پاسنگ کی نسبت بھی نہیں تھی۔ لیکن پھر بھی شاہ کاشمیریؒ شاہ بخاریؒ کے ہاتھ پر بیعت کر رہے ہیں۔

بہرحال میں اللہ کا شکر ادا کرتا ہوں کہ موجودہ زمانے کے مخالفانہ رنگ کے باوجود اس نے مجھے تنظیم اسلامی بیعت کے مسنون طریقے پر قائم کرنے کی ہمت دی۔ ایک انجمن ہے اس کے متعلق گفتگو برسوں والی تقریر میں ہو چکی ہے۔ لیکن میں نے جب انجمن قائم کی تھی تو اسی وقت اس کے دیباچہ میں لکھ دیا تھا کہ یہ میری آخری منزل نہیں ہے۔ یہ پہلا قدم ہے۔ میرا اصل ہدف ایک ''جماعت'' قائم کرنا ہے اور اس کی تشکیل کے لیے میں نے بیعت کا تصور اسی

وقت دے دیا تھا۔ ۱۹۷۲ء کی میری تحریر مطبوعہ شکل میں موجود ہے لیکن تنظیم اسلامی میں بیعت کا نظام اختیار کرنے کے بعد کچھ عرصہ یہ بات زبان پر لاتے ہوئے کچھ ہچکچاہٹ طاری رہی —— اور جب یہ بات میں نے انشراحِ صدر کے ساتھ بانگ دہل کہی تو نہ جانے کہاں کہاں سے صدائیں اٹھیں ۔

رقیبوں نے رپٹ لکھوائی ہے جا جا کے تھانے میں
کہ اکبر نام لیتا ہے خدا کا اس زمانے میں

کوئی رسالے میں لکھ رہا ہے اور حکومت کو اشارے کر رہا ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ بغاوت ہے۔ کچھ علماء بھی اس میدان میں آ گئے اور بیعت کے خلاف اخباری بیانات جاری ہو گئے۔ اللہ کا شکر ہے کہ ان علماء سے رجوع کرنے کی ہمت اور توفیق اس نے مجھے عطا فرمائی۔ اور مولانا سید حامد میاں مدظلہ کو اللہ تعالیٰ نے کلمۂ حق کہنے کی جرأت عطا فرمائی۔ کیوں؟ خلیفہ مجاز کس کے ہیں اس بطل حریت اور پیکر تقویٰ وطہارت کے جن کا نام ہے حضرت مولانا حسین احمد مدنی ؒ —— مولانا حامد میاں نے برملا کہا کہ یہ بیعت جہاد ہے۔ اس میں کوئی حرج نہیں ہے اور اس میں افضل مفضول کے ہاتھ پر بیعت کر سکتا ہے۔ اس کے لیے انہوں نے مثالیں بھی دیں۔

بہرحال میں نے کوشش کی ہے کہ اس دعوت اور تحریک کا ایک خاکہ آپ حضرات کے سامنے رکھ دوں۔ آگے ہر شخص کا اپنا معاملہ ہے —— میں نے اپنے طور پر تحقیق و تفتیش کی تھی کہ ۱۹۲۰ء میں حضرت شیخ الہندؒ نے مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم کے ہاتھ پر بیعت جہاد کی تحریک کی تھی۔ میں اپنی تحقیق کے حاصل کو تحریر کر چکا ہوں۔ مولانا آزاد مرحوم کے متعلق میرا آج تک جو موقف رہا ہے' اسے میں چند لفظوں میں بیان کر رہا ہوں۔ میری ساری دلچسپی صرف اس ابوالکلام آزاد سے رہی ہے' اب بھی ہے اور ان شاء اللہ کبھی ختم نہیں ہو گی' جو ۱۹۱۲ء سے ۱۹۲۰ء تک نظر آتا ہے۔ رہا بعد کا ابوالکلام تو صحیح صورت حال بھی معلوم نہیں۔ میرا تجزیہ یہ ہے کہ علماء کی مخالفت کے نتیجے میں مولانا بددل ہو گئے۔ چونکہ اس زمانے میں علماء کرام کا کنٹرول بہت شدید تھا اور کسی کے لیے بات کرنی ممکن نہیں تھی اگر اس کے پیچھے علماء کی تائید نہ ہو۔ آج یہ بات نہیں ہے —— بہرحال میرے خیال میں انہیں بددل نہیں ہونا چاہیے تھا۔ دیکھنا یہ ہے کہ حق کیا ہے؟ کوئی ساتھ دے یا نہ دے۔ آدمی کو حق کے راستہ پر ہی ڈٹا رہنا چاہیے۔ مولانا آزاد کی شخصیت کا یہ پہلو بھی میرے لیے قابل احترام ہے اور میں نے بارہا اسے بیان بھی کیا ہے کہ پاکستان

بننے کے بعد پاکستان کے ساتھ ان کا رویہ خیر خواہانہ رہا ہے' وہ اس کے مؤید رہے ہیں' وہ فرمایا کرتے تھے کہ اختلاف رائے کا ایک علیحدہ معاملہ تھا پاکستان بننے کے بعد وہ ختم ہو گیا۔ اب جبکہ پاکستان وجود میں آ گیا تو یہ اسلام کا قلعہ ہے۔ اگر خدانخواستہ اس کو گزند پہنچا تو اسلام کو گزند پہنچے گا۔ ان کی سیرت کا یہ روشن پہلو ہے۔ میں یہ باتیں تفصیل کے ساتھ ''میثاق'' میں لکھ چکا ہوں —— توقع ہے کہ آج کی مجلس کے صدر مولانا سعید احمد اکبر آبادی مدظلہٗ' مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم کی شخصیت پر سیر حاصل روشنی ڈالیں گے۔

اقول قولی ھذا واستغفر اللّٰہ لی ولکم ولسائر المسلمین
والمسلمات !
واخر دعوانا ان الحمد للّٰہ رب العالمین

مولانا سعید احمد اکبر آبادی

کا سوانحی خاکہ

اور

مولانا ابوالکلام آزاد

اور

ڈاکٹر اسرار احمد

کے بارے میں اُن کی رائے

مولانا سعید احمد اکبر آبادی مرحوم

ایک سوانحی خاکہ —— از پروفیسر محمد اسلم

”مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم:

سیرت و شخصیت، علمی و عملی کارنامے
اور حضرت شیخ الہندؒ سے اُن کا خصوصی تعلق“

مولانا سعید احمد اکبر آبادی کا ایک خطاب

ڈاکٹر اسرار احمد اور ان کی دینی خدمت

مولانا اکبر آبادی کا ایک ریکارڈ شدہ بیان اور گفتگو

مرتبہ: شیخ جمیل الرحمٰن

”چند یادیں، چند باتیں“

مولانا اکبر آبادی اور ڈاکٹر اسرار احمد کی ایک گفتگو

مرتبہ: شیخ جمیل الرحمٰن

مولانا سعید احمد اکبر آبادی کی گفتگو کے ضمن میں

مولانا اخلاق حسین قاسمی اور

مولانا محمد منظور نعمانی کے وضاحتی خطوط!

مولانا سعید احمد اکبر آبادی مدظلہٗ

پروفیسر محمد اسلم

سامعین باتمکین!

جناب ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے اس پروقار تقریب کے صدر گرامی قدر پروفیسر مولانا سعید احمد صاحب اکبر آبادی کا آپ حضرات سے تعارف کرانے کی ذمہ داری مجھ پر ڈالی ہے۔ میرے لیے یہ ایک کٹھن کام ہے۔ صاحب صدر گوناگوں خوبیوں کے مالک اور برعظیم پاک و ہند کے نامور عالمِ دین ہیں۔ اس لیے اس مختصر سے مقالے میں ان کا تعارف کماحقہٗ کرانا ممکن نہیں ہے۔

مولانا سعید احمد صاحب اکبر آبادی کا آبائی وطن بچھرایوں ضلع مراد آباد ہے' جو گجرولہ کے نزدیک رؤسا اور شرفا کی مشہور بستی ہے۔ مولانا کے والد مرحوم و مغفور ڈاکٹر ابرار حسین آگرہ میں پریکٹس کرتے تھے اور انہوں نے اپنے فن میں بڑا نام پایا تھا۔

مولانا اکبر آبادی صاحب آگرہ میں ۱۹۰۸ء میں پیدا ہوئے۔ اسی مناسبت سے انہوں نے اپنے نام کے ساتھ اکبر آبادی لکھنا شروع کیا۔

مولانا اکبر آبادی کی ولادت کا واقعہ بھی قابل ذکر ہے۔ ڈاکٹر ابرار حسین مرحوم کے ہاں ایک بچی پیدا ہوئی۔ اور اُس کے بعد کئی سال تک اور کوئی بچہ پیدا نہ ہوا۔ ڈاکٹر صاحب کو اپنی اکلوتی بچی کے ساتھ بڑی محبت تھی۔ ایک بار موصوف طاعون کے کسی مریض کو دیکھ کر اپنے گھر آئے تو بچی فرطِ محبت سے ان کے ساتھ لپٹ گئی اور اُسے 'infection' ہوگئی۔ دوسرے تیسرے دن اس کی بغل میں طاعون کی علامت نمودار ہوئی اور بچی اپنے خالقِ حقیقی کے پاس پہنچ گئی۔

اکلوتی بیٹی کی وفات کا ڈاکٹر صاحب پر اتنا اثر ہوا کہ اُن کا دل دنیا سے اُچاٹ ہوگیا اور موصوف نے برعظیم سے ہجرت کا عزم کرلیا۔ اُن کی یہ خواہش تھی کہ وہ حجاز مقدس چلے جائیں اور وہیں بقیہ زندگی گزاریں۔

ڈاکٹر صاحب ہجرت کی اجازت لینے کے لیے اپنے مرشد حضرت شاہ عبد الغنی

منگلوری رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ یہ وہی بزرگ ہیں جن کے دامنِ ارادت سے اُردو کے نامور شاعر اصغر گونڈوی اور جگر مراد آبادی وابستہ تھے۔ جگر نے ''شعلۂ طور'' میں اپنے مرشد گرامی کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے ؎

پابند شریعت نبیؐ ہوں
خاکِ درِ دولت غنی ہوں

حضرت شاہ عبد الغنی نے ڈاکٹر صاحب سے کہا کہ وہ ہجرت نہ کریں۔ اللہ تبارک وتعالیٰ انہیں فرزند سعید عطا فرمائے گا۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنے مرشد کے کہنے پر ہجرت کا ارادہ ترک کردیا۔ دو تین سال یونہی گزر گئے۔ ڈاکٹر صاحب دوبارہ شاہ صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ انہوں نے ارشاد فرمایا کہ انہوں نے کہا تو تھا کہ اللہ تعالیٰ فرزند سعید عطا کرے گا۔ ڈاکٹر صاحب پر امید ہوکر واپس لوٹے اور کچھ عرصہ بعد اللہ تعالیٰ نے ان کی دلی مراد پوری کردی۔

جس صبح مولانا اکبر آبادی عدم سے وجود میں آئے' اُسی شب ڈاکٹر صاحب نے خواب میں اکابرین دیوبند کو دیکھا۔ انہوں نے ڈاکٹر صاحب کو مبارکباد دی اور فرزند سعید کی ولادت پر اظہارِ مسرت فرمایا۔ ڈاکٹر صاحب نے نومولود کا نام سعید احمد رکھا۔

مولانا بچپن ہی سے بڑے ذہین اور فطین تھے۔ آٹھ نو برس کی عمر میں مشکل سے مشکل شعر کا صحیح مفہوم بیان کردیتے تھے۔ اُن کے نانا محمد ابراہیم مرحوم نے اپنے داماد ڈاکٹر ابرار حسین کو تاکید کی کہ وہ اپنے فرزند کی تربیت میں کوتاہی نہ کریں۔

مولانا سعید احمد صاحب کی ابتدائی تعلیم آگرہ میں ہوئی۔ اس کے بعد انہوں نے پنجاب یونیورسٹی کے السنہ شرقیہ کے امتحانات پاس کیے اور اس سلسلے میں ان کا قیام لاہور میں بھی رہا۔ اُس زمانے میں لاہور علم و ادب کا گہوارہ سمجھا جاتا تھا۔ علامہ اقبال' مولانا تاجور نجیب آبادی' مولانا ظفر علی خان' غلام رسول مہر' عبد المجید سالک' اختر شیرانی' محمد دین تاثیر' حفیظ جالندھری' حافظ محمود شیرانی' ڈاکٹر مولوی محمد شفیع' ڈاکٹر شیخ محمد اقبال' ڈاکٹر عنایت اللہ' ڈاکٹر سید عبد اللہ' ڈاکٹر عبد اللہ چغتائی اور ڈاکٹر برکت علی قریشی جیسے فضلاء کے دم قدم سے لاہور کی ادبی محفلیں قائم تھیں۔ شام کے وقت حضوری باغ میں شاعر اور اہل علم جمع ہوتے اور دیر تک علمی موضوعات پر گفتگو رہتی۔ مولانا ان محافل میں شریک ہوتے۔

مولانا احمد علی صاحب لاہوری رحمۃ اللہ علیہ کے درسِ قرآن کا پورے ملک میں شہرہ تھا۔ موصوف

امامِ انقلاب مولانا عبیداللہ سندھی کے شاگردِ رشید تھے اور انہوں نے شاہ ولی اللہؒ کے فلسفہ کی روشنی میں قرآن حکیم کا مطالعہ کیا تھا۔ مولانا اکبرآبادی اُن کے درس میں بھی شریک ہوا کرتے تھے۔

سکول اور کالج کی تعلیم کے بعد ڈاکٹر ابرار حسین صاحب نے ان سے کہا کہ یہ تعلیم تو انہوں نے اپنی مرضی سے حاصل کی ہے، لیکن اب اُن کی مرضی سے دارالعلوم دیوبند داخل ہو جائیں۔

جب مولانا اکبرآبادی دارالعلوم میں داخل ہوئے تو اُس زمانے میں حضرت مولانا انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ کے درسِ حدیث کا شہرہ برعظیم سے نکل کر مصر و شام تک پہنچ چکا تھا۔ مولانا شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ شارح مسلم شریف دینی حلقوں سے اپنی علمیت کا سکہ منوا چکے تھے۔ علامہ ابراہیم بلیاوی منطق و فلسفہ میں استادِ کل مانے جاتے تھے۔ مولانا اعزاز علی دیوبندی عربی ادب پر آخری سند تسلیم کیے جاتے تھے۔

مولانا حسین احمد مدنیؒ اپنے ورع و تقویٰ کے لیے ضرب المثل تھے۔ حضرت میاں اصغر حسین صاحب پیدائشی ولی مانے جاتے تھے۔ اُسی زمانے میں مولانا رسول خان مرحوم، مفتی عزیز الرحمٰن عثمانی مرحوم، مفتی محمد شفیع دیوبندی اور مولانا محمد ادریس کاندھلوی بھی دارالعلوم میں مصروف تدریس تھے۔

مولانا اکبرآبادی صاحب نے ان تمام حضرات سے استفادہ کیا۔ یہ اُن کی خوش قسمتی تھی کہ انہیں اپنے زمانے کے نامور اساتذہ سے فیض حاصل کرنے کا موقع ملا۔

۱۹۲۶ء میں انہوں نے فریضہ حج ادا کیا۔ سفر حج میں مولانا محمد علی جوہر، مولانا شوکت علی، مولانا محمد سہول بھاگلپوری، مفتی محمد کفایت اللہ — اور شفیع داؤدی جیسے بزرگ ان کے ہم سفر تھے۔

دیوبند سے فراغت کے بعد انہوں نے کچھ عرصہ ڈابھیل میں بھی گزارا۔ اُن دنوں مولانا انور شاہ کشمیری، مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی، مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی اور مولانا شبیر احمد عثمانی بھی وہیں تھے۔ مولانا اکبرآبادی بھی عملہ تدریس میں شامل ہو گئے، لیکن کچھ عرصہ بعد ملازمت ترک کر کے شاہ صاحب کی دعاؤں کے ساتھ اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لیے سینٹ سٹیفن کالج دہلی میں داخل ہو گئے۔ یہیں سے انہوں نے ایم اے کیا اور پھر اسی کالج کے عملہ تدریس میں شامل ہو گئے۔ اسی کالج میں جنرل محمد ضیاء الحق صاحب نے ان کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا۔

مولانا اکبرآبادی صاحب نے مدرسہ عالیہ فتح پوری دہلی میں بھی چند سال پڑھایا ہے۔ وہیں عبدالصمد صارم اور مولانا احتشام الحق تھانوی مرحوم نے ان سے پڑھا تھا۔

مولانا اکبرآبادی، مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی اور مولانا حفظ الرحمٰن سوہاروی نے مل کر ۱۹۳۸ء میں ''ندوۃ المصنفین'' کی بنیاد رکھی۔ یہ ادارہ اب ایک تحریک کی صورت اختیار کر چکا ہے۔ اب تک اسلام کے بارے میں اس ادارے نے صدہا ٹھوس اور تحقیقی کتابیں شائع کی ہیں۔

۱۹۳۸ء میں ہی ندوۃ المصنفین سے ماہنامہ ''برہان'' نکلنا شروع ہوا۔ اُس وقت سے لے کر اب تک مولانا اکبرآبادی ہی اس مجلّہ کے مدیر ہیں۔ اگر ان کے صرف اداریے ہی جمع کیے جائیں تو اُن کی ضخامت ہزاروں صفحات تک پہنچ سکتی ہے۔ اگر ان کی تمام تصانیف اور تحریروں کو ایک جگہ رکھا جائے تو ان کی طوالت ان کے قد سے بڑھ جائے گی۔

مولانا اکبرآبادی صاحب کی تصانیف میں سے صدیق اکبر، عثمان ذوالنورین، غلامانِ اسلام، اسلام میں غلامی کی حقیقت، مولانا عبیداللہ سندھی اور ان کے ناقد، مسلمانوں کا عروج و زوال، وحیٔ الٰہی، فہم قرآن، خطبات اقبال پر ایک نظر، چار علمی مقالات اور نفثۃ المصدور اور ہندوستان کی شرعی حیثیت خاص طور پر مشہور ہیں۔ انہیں عربی، انگریزی، فارسی اور اردو پر یکساں عبور حاصل ہے، اور چاروں زبانوں میں بڑی روانی کے ساتھ تقریر کر لیتے ہیں۔

مولانا اکبرآبادی صاحب ۱۹۴۷ء تک سینٹ سٹیفن کالج دہلی میں پڑھاتے رہے۔ تقسیم ہند کے وقت اِن کا گھر بھی لٹا اور موصوف بمشکل تمام اپنی جان بچا کر اہل و عیال سمیت مراد آباد تشریف لے گئے۔ جب ذرا امی جمی ہوئی تو مولانا ابوالکلام آزاد نے ان سے کہا کہ مدرسہ عالیہ کلکتہ کا تمام عملہ اور طلبہ مشرقی پاکستان چلے گئے ہیں۔ آپ کلکتہ جا کر اس مدرسہ کو دوبارہ کھولیں۔ ۱۹۴۸ء میں مولانا اکبرآبادی صاحب مدرسہ عالیہ کلکتہ کے پرنسپل مقرر ہوئے۔ یہ پہلے ہندوستانی عالم تھے جو اس منصب پر فائز ہوئے۔ ان سے پہلے تقریباً پونے دو سو سال تک انگریز ہی اس مدرسہ کے پرنسپل رہے تھے۔ اس ضمن میں سر ڈینی سن راس اور مارگولیتھ کے نام خاص طور پر لیے جا سکتے ہیں۔

مولانا اکبرآبادی ۱۹۵۹ء تک مدرسہ عالیہ کے پرنسپل رہے۔ انہوں نے مدرسے کو، جو بالکل ختم ہو چکا تھا، دوبارہ کھولا اور پورے ملک سے نامور علماء و فضلاء کو بلا کر مدرسے میں درس و تدریس کا فریضہ سونپا۔

۱۹۵۹ء میں موصوف علی گڑھ تشریف لے آئے۔ یہاں انہیں سنی دینیات کے شعبہ صدر اور فیکلٹی آف تھیالوجی کا ڈین مقرر کیا گیا۔ کچھ عرصہ بعد موصوف 'full' پروفیسر بنا دیے گئے۔

علی گڑھ میں قیام کے دوران میں ہی انہیں کینیڈا کی McGILL یونیورسٹی سے آفر ہوئی اور موصوف ایک سال کے لیے کینیڈا تشریف لے گئے۔

۱۹۶۷ء میں میرا ان سے قریبی تعلق قائم ہوا۔ یوں تو ۱۹۵۵ء سے ہم ایک دوسرے سے آشنا تھے اور ہماری پہلی ملاقات کلکتہ میں ۱۹۵۵ء میں ہوئی تھی' لیکن ۱۹۶۷ء کے اوائل میں مولانا نے مجھے اپنی فرزندی میں قبول کرلیا۔ اس کے بعد میں ہر سال علی گڑھ جانے لگا۔ موسم گرما کی تعطیلات ان کے ساتھ گزارتا اور ان سے اور علی گڑھ کے دوسرے فضلاء سے خوب استفادہ کرتا۔

علی گڑھ یونیورسٹی سے ریٹائرمنٹ کے بعد مولانا اکبرآبادی صاحب تغلق آباد دہلی میں ہمدرد کے ایک تحقیقی ادارے سے منسلک ہوگئے اور وہاں اندازاً چار سال تک کام کرتے رہے۔ اس دوران میں انہوں نے بوعلی سینا کی القانون کو مرتب کیا۔

ہمدرد سے فارغ ہونے کے بعد موصوف کالی کٹ یونیورسٹی میں Visiting Professor مقرر ہوگئے۔ وہاں ایک سال رہنے کے بعد علی گڑھ واپس آئے تو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے انہیں اپنے ہاں Visiting Professor بنا دیا۔ جب یہ مدت پوری ہوئی تو دارالعلوم دیو بند میں ان کے لیے شیخ الہند اکادمی قائم کی گئی۔ موصوف اس اکادمی کے ڈائریکٹر ہیں۔ دیو بند میں قیام کے دوران میں مولانا اکبرآبادی صاحب حجۃ اللہ البالغہ کا درس دیتے ہیں جس میں اساتذہ اور منتہی طلبہ شریک ہوتے ہیں۔

دراصل دیو بند میں ان کے قیام کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ مہتمم صاحب کے ساتھ ایک جید عالم بھی ہر وقت موجود رہیں' جن سے مہتمم صاحب اہم امور میں مشورہ لیتے رہیں۔

مولانا اکبرآبادی صاحب کا شمار بھارت کے چند گنے چُنے علماء میں ہوتا ہے۔ موصوف کئی بار غیر ممالک میں مختلف علمی کانفرنسوں میں بھارت کی نمائندگی کر چکے ہیں۔ موصوف جنوبی افریقہ کے دینی حلقوں میں بھی جانے پہچانے بزرگ ہیں اور متعدد بار جنوبی افریقہ کا دورہ کر چکے ہیں۔

مولانا اکبرآبادی صاحب کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ جتنی اُن کی نظر وسیع ہے' اُتنا ہی اُن کا دل بھی وسیع ہے۔ موصوف ہاتھ کے سخی اور دل کے غنی ہیں' کیوں نہ ہوں' آخر کو شاہ عبدالغنی کی دعا سے پیدا ہوئے ہیں۔

ان دنوں مولانا اکبرآبادی صاحب حضرت علی رضی اللہ عنہ کی حیات و سیرت لکھنے کا سلسلہ شروع کر چکے ہیں۔ اس سے قبل صدیق اکبر رضی اللہ عنہ اور عثمان ذوالنورین رضی اللہ عنہ پر تحقیقی کام کر چکے ہیں۔ الحمدللہ' ثم الحمدللہ! یہ سعادت ان ہی کے حصے میں آئی ہے کہ خلفائے راشدین کی حیات و سیرت پر شاہکار کتابیں تحریر فرمائیں۔ میں ان کتابوں کو ان کے لیے زادِ آخرت سمجھتا ہوں۔

مولانا اکبرآبادی صاحب دارالعلوم کی مجلس شوریٰ کے رکن رکین ہیں اور دارالعلوم کی ترقی و توسیع کے لیے کوشاں ہیں۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ انہیں عمرِ خضر کے ساتھ دین کی زیادہ سے زیادہ خدمت کا موقع عطا فرمائے۔

مولانا ابوالکلام آزاد (مرحوم)

سیرت وشخصیت

علمی وعملی کارنامے —— اور

حضرت شیخ الہندؒ کا ان سے خصوصی تعلق خاطر

(مولانا سعید احمد اکبر آبادی مدظلہ کا ایک خطاب)

معزز حضرات! محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب! علمائے کرام! بزرگو اور دوستو! مولانا ابوالکلام آزاد ہماری ملت کے کاروانِ رفتہ کے ان پاسبانوں اور نگہبانوں میں سے تھے جن کا جب ذکر آتا ہے اور جب ان پر تقریر کرنے کے لیے کوئی مرحلہ سامنے آتا ہے تو عزیزؔ لکھنوی کا وہ شعر بے ساختہ یاد آجاتا ہے ؎

غزل اس نے چھیڑی مجھے ساز دینا　　ذرا عمر رفتہ کو آواز دینا

اس لیے کہ ان کے ساتھ جو پرانی یادیں وابستہ ہیں اور جو پرانے واقعات ان سے متعلق ہیں، ان کا نام زبان پر آتے ہی وہ سب دل ودماغ میں اُجاگر ہوجاتے ہیں اور ایک حسرت پیدا کرتے، ساتھ ہی عہد گزشتہ میں لے جاتے ہیں۔ مولانا ابوالکلام آزاد ان لوگوں میں سے تھے جن کو ہم عبقری (Genius) کہتے ہیں۔ اعلیٰ درجہ کی ذہانت وفطانت اور بلند درجہ کی قوتِ فہم وادراک کے حامل تھے۔ میرا بچپن تھا جب مولانا کی شخصیت اور شہرت کا آفتاب نصف النہار پر تھا۔ میں دیوبند میں پڑھتا تھا اور مولانا کے تذکرے اور چرچے سنتا تھا۔ گو مجھے دیوبند کے قیام کے عرصے میں ان جلسوں میں جانے کا اتفاق نہیں ہوا جن میں مولانا کی بڑی شاندار تقریریں ہوتی تھیں۔ اس لیے کہ میں طالب علمی کے زمانے میں گوشہ نشینی کی زندگی بسر کرتا تھا اور باہر کی دلچسپیوں سے زیادہ واسطہ نہیں رکھتا تھا۔ میرا سب سے پہلا اتفاق مولانا سے ملاقات کا ۱۹۳۶ء

میں ہوا۔ اس کے بعد سے آخر وقت تک جب کہ مولانا اس دنیا سے رخصت ہوئے، مجھے ان کی خدمت میں بیٹھنے، ان کو قریب سے دیکھنے اور ان کی شخصیت کے مطالعے کا بھی موقع ملا۔ اس بنا پر میں اس وقت آپ کے سامنے جو کچھ بھی عرض کروں گا، اس کے دو حصے ہوں گے: پہلا وہ جس کو میں نے اپنے بزرگوں، دوستوں اور ساتھیوں سے سنا ہے اور دوسرا حصہ ان واقعات پر مشتمل ہوگا جن کا میں نے خود ذاتی طور پر مشاہدہ کیا ہے۔

مولانا آزاد کا خاندان اور تعلیم

مولانا ابوالکلام آزاد ایک ایسے گھرانے میں پیدا ہوئے جو پیری مریدی کا گھرانا کہلاتا ہے، جہاں بیعت کا رواج اور تصوف کا بڑا چرچا تھا، اور مولانا آزاد کے والد بزرگوار کے عقیدت مندوں اور مریدوں کا ایک بڑا وسیع حلقہ تھا۔ لیکن مولانا آزاد کی طبیعت میں ان طریقوں سے بغاوت کے رجحانات شروع ہی سے تھے۔ انہوں نے اس طریقے کو پسند نہیں کیا۔ ان کی تعلیم کہاں پر ہوئی اور کس طرح انہوں نے مختلف علوم پڑھے اس کی بھی کچھ زیادہ تفصیل نہیں ملتی ہے۔ لیکن مولانا نے اس کے متعلق خود جو آخری بات اپنی کتاب 'India wins freedom' میں اپنے ذاتی حالات کے سلسلے میں لکھی ہے۔ وہی میرے خیال میں زیادہ مستند سمجھی جانی چاہیے۔ مولانا کی تعلیم کسی مستند اور باقاعدہ مدرسہ میں نہیں ہوئی، لیکن ان کے والد ماجد بہت بڑے بزرگ تھے اور ان کے حلقۂ ارادت میں بڑے بڑے علماء داخل تھے جو صاحبانِ فن تھے اور خاص خاص فنون میں بڑی دستگاہ رکھتے تھے۔ ان کے والد ماجد نے مولانا کو بچپن ہی میں بغرضِ تعلیم مختلف علوم وفنون کے ماہر علماء کے سپرد کر دیا۔

مولانا کا ذوقِ علمی

مولانا نے علوم دینیہ واسلامیہ اور فنون عربیہ کی تحصیل تو کی ہی تھی، لیکن دوسرے علوم وفنون میں ان کی وسعت نظر کا کیا حال تھا! اس کا اندازہ آپ کو اس سے ہوسکتا ہے کہ ہمارے اربابِ علم اس بات کو جانتے ہیں کہ ابوریحان البیرونی کی ایک مشہور کتاب ''قانون مسعودی'' کے نام سے ہے یہ کتاب دقیق ریاضی یعنی 'Higher Mathematics' کی کتاب ہے، جو لوگ ریاضیات میں بہت اونچا مقام رکھتے ہیں وہی اس کتاب کو پڑھ اور سمجھ سکتے ہیں۔ عام تعلیم یافتہ حضرات کی سمجھ میں اس کی بات آتی ہی نہیں —— میں نے متعدد لوگوں سے سنا تھا کہ مدرسہ عالیہ، کلکتہ کے کتاب خانے میں جس زمانے میں مدرسہ کے پرنسپل سر ڈینی سن راس

تھے۔ ۱۹۰۱ء سے ۱۹۱۰ء تک ایک نادر نسخہ 'قانون مسعودی' کا موجود تھا۔ نادر اس لیے کہ اس وقت تک اور شاید تا حال اس کے سوا کسی اور نسخے کا پتا نہیں چلا۔ مدرسہ عالیہ کی لائبریری اپنے بعض نوادر کے اعتبار سے خاص خصوصیت رکھتی تھی۔ بتایا جاتا ہے کہ ایک روز سر ڈینی سن راس جو لائبریری کے انچارج بھی تھے' اور جنہوں نے یہ قانون بنا رکھا تھا کہ کوئی شخص بھی جو سولہ سال سے کم عمر کا ہو اس لائبریری سے استفادہ نہیں کر سکتا۔ ایک روز چپڑاسی نے آ کر اطلاع دی کہ ایک تیرہ چودہ سال کا خوبصورت سا لڑکا کہتا ہے کہ میں لائبریری میں قانون مسعودی کا مطالعہ کرنا چاہتا ہوں۔ سر راس کو بڑا تعجب ہوا' اس نے اس لڑکے کو اپنے پاس بلایا۔ وہ تھے مولانا ابوالکلام آزاد۔ ان سے سر راس نے کہا: میاں صاحبزادے! آپ کیا دیکھنا چاہتے ہیں؟ انہوں نے جواب دیا: قانون مسعودی۔ سر راس نے پوچھا: کیا آپ اسے پڑھ اور سمجھ سکتے ہیں؟ مولانا نے کہا کہ جناب والا آپ کتاب منگا لیجیے اور کوئی صفحہ مجھے بتائیے اگر میں اس کو پڑھ کر آپ کو سنا دوں اور اس کا مطلب بیان کر دوں' تو مجھے اس کے مطالعے کی اجازت ملنی چاہیے۔ چنانچہ سر راس نے یہی کیا۔ انہوں نے اپنی کوٹھی میں جہاں مولانا سے یہ گفتگو ہوئی اور جس میں' میں اپنی پرنسپلی کے زمانہ میں خود بھی رہا ہوں' کتاب کا نسخہ منگایا اور ایک مقام کی نشاندہی کرتے ہوئے کہا کہ صاحبزادے یہاں سے اسے پڑھو' مولانا نے تھوڑی دیر اس کا مطالعہ کیا اس کے بعد اسے سنایا اور اس کا مطلب بھی بیان کر دیا۔ سر ڈینی سن کو بڑا تعجب ہوا' اور انہوں نے اس لڑکے کو مستقل طور پر لائبریری کی کتب سے استفادہ کی اجازت دے دی۔

یہ واقعہ میں نے سُن رکھا تھا لیکن مجھے اس کی صحت پر یقین نہیں آتا تھا کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ مگر اس کے بعد جب میں مدرسۂ عالیہ میں پرنسپل تھا تو میرے زمانہ میں نیشنل پبلک لائبریری کی جو کلکتہ کی بڑی مشہور لائبریری ہے' کی ایک نئی بلڈنگ بنی۔ جس کے افتتاح کے لیے مولانا آزاد وزیر تعلیم حکومت بھارت کی حیثیت سے تشریف لائے تھے۔ مولانا نے تقریر تو اردو میں کی لیکن ان کا خطبہ انگریزی میں چھپا ہوا تھا۔ مولانا نے اس میں اس واقعہ کا مفصل ذکر کیا تھا۔ جس کے بعد اس نسخہ کی تلاش شروع ہوئی تو معلوم ہوا کہ وہ لندن کی لائبریری کو منتقل ہو گیا۔ جب مولانا کے علم میں یہ بات آئی تو ان کی کوشش سے وہ نسخہ وہاں سے حاصل کیا گیا۔ پھر دائرۃ المعارف حیدر آباد دکن کے زیر اہتمام اس کی اشاعت ہوئی اور مولانا ابوالکلام آزاد کا اس پر مقدمہ موجود ہے۔

یہی ایک واقعہ بتاتا ہے کہ مولانا کے اندر عبقریت کتنی اعلیٰ معیار کی تھی۔ وہ اپنی ذہانت و فطانت کے اعتبار سے اپنے ہم عصروں کے اندر بہت ہی ممتاز تھے۔

مولانا آزاد کا علمی مقام

مولانا آزاد کا اپنے علم و فضل کے لحاظ سے کیا مقام تھا! اس سلسلے میں دو واقعات آپ کو سناتا ہوں۔

ایک واقعہ تو یہ ہے جو میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ جس زمانہ میں' میں مدرسہ عالیہ کا پرنسپل تھا' اس زمانے میں مولانا عبدالحلیم صدیقی جو ایک مشہور عالم اور جمعیت العلماءِ ہند کے ایک مشہور ورکر تھے وہ مدرسہ عالیہ میں محدث تھے۔ جب ان کا تین سال کا کنٹریکٹ ختم ہو گیا تو میں نے ویسٹ بنگال گورنمنٹ کے متعلقہ محکمہ کو لکھا کہ ان کے کنٹریکٹ کی تجدید نہ کی جائے' بلکہ ان کو سبکدوش کر دیا جائے تاکہ ان کی جگہ کسی دوسرے توانا اور جوان عالم کا تقرر کیا جا سکے۔ میرا ارادہ تھا کہ میں ان کی جگہ کسی اونچے درجہ کے محدث کو لاؤں گا۔ میری نظر میں اس وقت مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی تھے۔ ان ہی دنوں میں مجھے دہلی آنے کا اتفاق ہوا' مولانا کو علم ہوا تو انہوں نے مجھے بلا بھیجا۔ میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا۔ رمضان کا مہینہ تھا۔ پارلیمنٹ کے اجلاس ہو رہے تھے' وہیں آنے کے لیے مجھے کہا گیا۔ میں پارلیمنٹ میں ان کے کمرے میں پہنچ گیا۔ مولانا نے مجھے نو بجے صبح کا وقت دیا تھا اور ٹھیک نو بجے مولانا اپنے کمرے میں تشریف لے آئے۔ مولانا نے پہلے تو میری مزاج پرسی کی۔ مولانا روزے سے تھے۔ موسم ابھی گرم تھا۔

ہندوستان میں تدریس حدیث اور آخری استاد

تھوڑی دیر بعد مولانا نے کہا: 'میرے بھائی'۔ مولانا کے خطاب کا عموماً انداز یہی ہوتا تھا۔ میں نے آپ کو اس لیے بلایا ہے کہ مجھے معلوم ہوا ہے کہ آپ مولوی عبدالحلیم صدیقی کے کنٹریکٹ کی تجدید کے حق میں نہیں ہیں۔ میں اس کی وجہ آپ سے معلوم کرنا چاہتا ہوں۔ میں نے عرض کیا کہ وہ شیخ الحدیث کی جگہ ہے۔ مولانا اب بوڑھے ہو گئے ہیں۔ وہ اس معیار کی اب تعلیم نہیں دے سکتے جس کی ضرورت ہے۔ لہٰذا میں ان کی جگہ ایک دوسرے محدث کو لانا چاہتا ہوں۔ مولانا ادیب ہیں' بہت لائق اور عالم ہیں لیکن فن حدیث میں جس طور پر پڑھانا چاہیے' اس طرح تعلیم اب ان کے بس میں نہیں ہے۔ بس میرا یہ کہنا تھا کہ مولانا آزاد میرے سر ہو گئے اور فرمایا کہ آپ نے یہ کیا کہا کہ فن حدیث جس طرح پڑھایا جانا چاہیے' اس طرح مولانا عبدالحلیم نہیں پڑھا سکتے۔ میں نے اپنی بساط کے مطابق عرض کیا کہ فن حدیث کو پڑھانے کے لیے اس بات کی ضرورت ہے کہ پڑھانے والا اسمائے رجال سے خوب واقف ہو' طُرق اور

مسانید پر بھی اس کی گہری نظر ہو' درایت اور روایت کے جو اصول ہیں ان پر بھی ان کی نظر ہو' جرح وتعدیل سے بھی وہ بخوبی واقف ہو —— آپ یقین کیجئے کہ اس پر مولانا نے ڈیڑھ گھنٹہ تک مسلسل تقریر کی اور مجھے بتایا کہ فن حدیث دراصل کیا ہے۔ اس کے کتنے اہم شعبے ہیں' کتنی شاخیں ہیں۔ ہر شعبہ اور شاخ کی کیا خصوصیات ہیں۔ ان پر اب تک کون کون سی معتبر کتابیں لکھی گئی ہیں۔ فنِ حدیث کس دور میں اور کس انداز سے ہندوستان میں آیا اور کہاں کہاں اس کی بڑی بڑی درسگاہیں قائم ہوئیں۔ اور فنِ حدیث کو پڑھانے کی خصوصیات کیا رہیں؟ کون کون سے محدثین اب تک ہندوستان میں ایسے گزرے ہیں جو اس فن میں یکتائے روزگار تھے۔ ہوتے ہوتے وہ اس دَور تک آ گئے اور فرمانے لگے کہ آج کل پورے ہندوستان میں فن حدیث کی تعلیم وتدریس اس طور پر نہیں ہو رہی جس طور پر فن حدیث کو پڑھانا چاہیے۔ اس دور میں مولانا عبدالحلیم صدیقی اور ان جیسے گنتی کے محدث ہوں گے جو کچھ نہ کچھ اس فن سے تعلق رکھتے ہیں۔ آنے والے علماء تو معیار کے لحاظ سے ان سے بھی گئے گزرے ہوں گے۔ آپ تجربہ کرنا چاہیں تو کر لیں' لیکن مجھے یقین ہے کہ تجربہ صحیح نہیں ہوگا۔ آخر میں فرمایا: میرے بھائی! اب انور شاہ تو آپ کو ملیں گے نہیں۔ وہ فن حدیث کے اساتذہ میں آخری آدمی تھے جو دنیا سے رخصت ہو گئے۔ اب تو مولانا عبدالحلیم صدیقی ہی کو غنیمت سمجھئے۔ میں رخصت ہونے لگا تو فرمایا: میرے بھائی! میں نے جو کچھ عرض کیا ہے وہ آپ کو یاد رہے گا؟ میں نے از راہِ شوخی کہا: ''میں یاد نہ رکھوں گا تو کیا اپنے آپ سے دشمنی کروں گا''۔ میری اس بات کو مولانا نے نظر انداز کرتے ہوئے فرمایا: ''میرے بھائی! اللہ تعالیٰ آپ کو جزا دے''۔ اس جملہ کو تین مرتبہ دہرایا اور تقریباً گیارہ بجے دروازے تک آ کر مجھے رخصت کیا۔

معمولات کی پابندی

اس وقت مجھے اندازہ ہوا کہ پارلیمنٹ جاری ہے' اس میں بیٹھے ہیں' وزیر تعلیم کی حیثیت سے ان کی مصروفیات بھی بے پناہ ہو گئی تھیں' مجھے ذاتی طور پر علم تھا کہ اس دور میں بھی وہ سختی کے ساتھ اپنے دیرینہ معمولات پر کاربند تھے۔ عموماً وہ رات کو نو بجے سو جاتے تھے' پھر ڈھائی بجے بیدار ہوتے تھے اور اس وقت وہ اپنا لکھنے پڑھنے کا کام کرتے تھے۔ فجر کی نماز پڑھ کر سو جاتے تھے' پھر تقریباً ساڑھے آٹھ بجے اٹھ کر نو بجے دفتر پہنچ جاتے تھے۔ ظاہر ہے کہ وزیر تعلیم کی حیثیت سے مصروفیات کا دائرہ وسیع ہو گیا تھا' پھر عمر بھی ضعیفی کی طرف مائل تھی لیکن ان سب کے

باوجود استحضارِ علم کا یہ عالم اور یہ حال کہ فن حدیث پر تقریباً مسلسل ڈیڑھ گھنٹے تک انتہائی عالمانہ انداز میں تقریر کی' جبکہ سامع صرف اکیلا میں تھا۔

وجودِ باری' مذہب کی ضرورت اور اسلام کی حقانیت

دوسرا یہ واقعہ میرے مشاہدے میں آیا کہ جوش ملیح آبادی اور مولوی عبد الرزاق ملیح آبادی یہ دونوں مولانا ابوالکلام آزاد سے بہت زیادہ قریب تھے۔ مگر دونوں جس عقیدے اور خیال کے تھے' ان میں سے جوش کو تو آپ سب ہی اچھی طرح جانتے ہیں اور مولوی عبدالرزاق ملیح آبادی بھی اُس زمانہ میں جوش سے اس معاملے میں کچھ کم نہیں تھے۔ مولانا آزاد نے ایک دن ان دونوں سے کہا کہ میرا آپ سے بڑا گہرا تعلق ہے۔ آپ میرے پاس آتے جاتے ہیں لیکن میں نے اپنا ایک فرض اب تک ادا نہیں کیا جس کا مجھے بہت افسوس ہے اور میں اس کا سچے دل سے اعتراف کرتا ہوں۔ اب میں چاہتا ہوں کہ آپ حضرات کے سامنے اپنا وہ قرض ادا کر دوں۔ دونوں حضرات نے کہا: وہ کیا ہے؟ فرمایا کہ اللہ کے وجود اور مذہب کی ضرورت اور اسلام کی حقانیت پر آپ دونوں کے سامنے میں ایک تقریر کرنا چاہتا ہوں جو میری طرف سے تبلیغ حق کی ایک کوشش ہوگی۔ آپ حضرات کو حق ہوگا کہ پوری آزادی کے ساتھ میری باتوں پر تنقید کریں' مجھ سے سوالات کریں' مجھ پر جرح کریں' میں پوری خندہ پیشانی سے انہیں سنوں گا اور امکان بھر آپ کے اشکالات کو دور کرنے کی کوشش کروں گا۔

دونوں حضرات نے رضامندی کا اظہار کیا اور کسی آنے والے دن میں صبح نو بجے کا وقت طے ہو گیا۔ مولوی عبدالرزاق ملیح آبادی نے مدرسہ فتح پوری میں آ کر اپنے حلقۂ احباب میں اس کا ذکر کیا تو مولانا محمد میاں مرحوم (جو مولانا حامد میاں مدظلہ کے والد ماجد ہیں جو آپ کے اسی شہر لاہور میں جامعہ مدنیہ کے مہتمم اور رئیس ہیں) اور مولوی قاضی سجاد حسین صاحب جو مدرسہ اسلامیہ فتح پوری دہلی میں اس وقت مدرس تھے' اب پرنسپل ہیں۔ ان دونوں کو جب خبر ہوئی تو انہوں نے کہا کہ یہ تو بہت اچھا موقع ہے۔ کیا ہم کو بھی اس مجلس میں شرکت کی اجازت ہوگی! چنانچہ فوراً مولانا آزاد سے ان کے سیکریٹری کے ذریعے رابطہ قائم کیا۔ مولانا نے فرمایا کہ بڑے شوق سے آپ حضرات بھی تشریف لایئے' اور کوئی بھی آنا چاہے تو میری طرف سے اجازت ہے ——

چنانچہ مولانا محمد میاں مرحوم اور قاضی سجاد حسین صاحب کا یہ بیان ہے کہ ہم بھی پہنچ گئے۔

جوش ملیح آبادی اور مولوی عبدالرزاق ملیح آبادی بھی وہاں موجود تھے۔ ہم چاروں کے سامنے مولانا آزاد نے تقریر کی۔ مولانا محمد میاں کا یہ بیان ہے کہ مسلسل دو گھنٹے تک انہوں نے تقریر کی اور تقریر کا کمال یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ کے وجود اور اس کی توحید پر سارے دلائل وہ تھے جو قرآن مجید میں ہیں لیکن کہیں قرآن کا حوالہ نہیں دیا کہیں کوئی آیت نہیں پڑھی۔ ان ہی دلائل کو عقلی طور پر اس طرح بیان کیا گویا ان کا قرآن سے کوئی تعلق نہیں ہے، حالانکہ تمام دلائل قرآنی ہی تھے — اس طرح پر وجود باری تعالیٰ، اس کی توحید، مذہب کی ضرورت اور مذاہب میں بھی اسلام کی حقانیت پر مسلسل دو گھنٹے تقریر کی۔ اس کے بعد مولوی عبدالرزاق صاحب نے کہا: مولانا! مجھے تو اب اطمینان ہو گیا۔ میں اللہ سے توبہ کرتا ہوں۔

لیکن جوش ملیح آبادی نے کہا: مولانا! میں آپ کے دلائل کا جواب تو نہیں دے سکتا لیکن دل میرا نہیں مانتا، تو مولانا نے کہا کہ میرے بھائی! دل پر تو میرا کوئی قابو اور اختیار نہیں ہے۔ جوش نے کہا کہ مولانا! آپ نے Personal God اور Impersonal God کی جو بحث کی ہے تو میں God کو Impersonal تو ماننے کے لیے تیار ہوں Personal نہیں مان سکتا۔ Impersonal کے معنی وہ ہیں جس کو آج کل Energy کہا جاتا ہے۔ مولانا نے فرمایا، نہیں وہ God نہیں ہے جو Impersonal ہے، وہ God ہو ہی نہیں سکتا۔ مولانا نے پھر ثابت کیا کہ God وہی ہے جو Personal ہے۔ اس کی ایک ذات اور ہستی ہے پھر اس کو مزید قوی دلائل سے ثابت کیا — پس یہ دو واقعات ایسے ہیں جن سے معلوم کیا جاسکتا ہے کہ مولانا کا علم کتنا مستحضر تھا، اور ان کی نگاہ کتنی وسیع تھی۔

مولانا آزاد کی دعوت

مولانا کی شہرت کا آغاز دو چیزوں سے ہوا۔ سب سے پہلے اور سب سے بڑی شہرت کا ذریعہ تو ''الہلال'' اور ''البلاغ'' ہوئے۔ اس کے بعد مولانا کی تقاریر ہوئیں۔ مولانا کو اللہ تعالیٰ نے فنِ خطابت کا وہ کمال عطا فرمایا تھا جو نہایت شاذ و نادر ہی کسی کو عنایت ہوتا ہے۔ تقریر سے زیادہ ان کی تحریر نے مسلمانوں میں ایک تہلکہ مچا دیا۔ تقریر میں بھی فن اور اندازِ خطابت ایسا رچا بسا ہوا تھا کہ تیر کی طرح دل میں پیوست ہوتا تھا۔ اس کی ایک مؤثر ترین وجہ یہ بھی تھی کہ مولانا نے الہلال اور البلاغ میں اپنی تحریروں کے ذریعے مسلمانانِ ہند کو ایک نئی راہ دکھائی جس نے دلوں میں ایک نیا جوش اور نیا ولولہ پیدا کیا۔ عام تعلیم یافتہ مسلمانوں کا جو حال ہوا سو

ہوا، لیکن سب سے اہم بات یہ ہوئی کہ علمائے کرام اور خاص طور پر دارالعلوم دیوبند کے علمائے عظام کا طبقہ اس سے بہت زیادہ متاثر ہوا، اور دیوبند کے حلقے میں سے بھی بالخصوص شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ۔ وہ اس لیے کہ مولانا ابوالکلام آزاد جس چیز کا پیام دیتے تھے اور جو درحقیقت ان کی دعوت کا اصل محور و مرکز تھا وہ سب کچھ وہ تھا جو حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے دل کی آواز تھی، اور ان کے اپنے دل کی لگن اور تڑپ تھی۔ چنانچہ حضرت شیخ الہندؒ مولانا آزاد کی دعوت میں اپنے دل کی تمنا، آرزو، خواہش اور اُمنگ کا عکس دیکھتے تھے۔ اس لیے مولانا آزاد کے سب سے زیادہ قدردان علمائے کرام کے حلقے میں حضرت شیخ الہند تھے۔ حضرت بڑی پابندی سے الہلال منگایا کرتے، اور بڑے ذوق و شوق سے ان کا مطالعہ کرتے تھے۔

مسجد کانپور کا حادثہ

جب کانپور کے مچھلی بازار کی مسجد حکومت انگلشیہ کے ہاتھوں شہید کی گئی، جس کے ردِ عمل میں حکومت کے خلاف ہندوستان کے طول و عرض میں مسلمانوں میں غم و غصہ کا ایک طوفان اٹھا تو حکومت نے آنسو پونچھنے اور اس ہیجان کی شدت کم کرنے کے لیے اس وقت جو یوپی کا گورنر (سر جیمس مسٹن) تھا، اسے دارالعلوم دیوبند بھیجا۔ مولانا ابوالکلام آزاد اس حادثے پر نہایت سخت مضامین لکھ چکے تھے، جن کو اس جوش و خروش میں بڑا دخل تھا جو مسجد کانپور کو شہید کرنے کے باعث مسلمانوں میں انگریزوں کے خلاف پیدا ہو گیا تھا۔ تو وہ بھی دیوبند پہنچ گئے۔ جب مولانا آزاد اس موقع پر دارالعلوم دیوبند کے دروازے پر پہنچے تو انہوں نے دیکھا گورنر یوپی اندر پہنچ چکے ہیں، وہاں باقاعدہ جلسہ ہو رہا ہے، جس میں دیوبند کے تقریباً تمام ہی علمائے کرام موجود ہیں۔ مولانا آزاد نے چاہا کہ وہ اندر جائیں اور جلسہ میں پہنچ کر گورنمنٹ کے اس اقدام پر اپنا احتجاج پیش کریں، لیکن وہاں ان کو دروازے پر ہی منتظمین کی ہدایت پر روک دیا گیا اور ان کو بتایا گیا کہ لارڈ صاحب کا حکم ہے کہ آپ کو اندر نہیں آنے دیا جائے، لہٰذا آپ اندر نہیں جاسکتے۔ مولانا آزاد کیا کرتے، دنگا فساد تو ان کے پیشِ نظر تھا نہیں، مجبور ہو گئے۔ اس وقت مولانا کو معلوم ہوا کہ دیوبند کے سارے اساتذہ تو اندر جلسہ گاہ میں موجود ہیں، لیکن صرف شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ ہیں جو منتظمین کے اس عمل سے سخت ناراض ہیں اور اپنے گھر پر ہی مقیم ہیں۔ ادھر حضرت شیخ الہند کو جب معلوم ہوا کہ مولانا آزاد آئے ہیں اور ان کو دارالعلوم کے دروازے پر روک دیا گیا ہے تو حضرت نے فوراً مولانا آزاد کو اپنے پاس بلوا لیا۔ دو تین دن مولانا دیوبند میں حضرت شیخ الہند ہی کے ہاں مقیم رہے۔ حضرت شیخ الہند کا مولانا آزاد سے تعلقِ خاطر کا یہ واقعہ بھی شاہد ہے۔

حضرت شیخ الہند کی تحریک اور مولانا آزاد کا اس سے تعلق

حضرت شیخ الہند سے بعض ساتھی علماء نے پوچھا: ''حضرت آپ الہلال کا اتنا گہرا مطالعہ کرتے ہیں حالانکہ اس میں تصویریں ہوتی ہیں'' حضرت شیخ الہند نے جو جواب دیا وہ اس بات کا آئینہ دار ہے کہ حضرت شیخ الہند کس نظر سے مولانا آزاد کو دیکھتے تھے۔ حضرت شیخ الہندؒ نے پہلے تو یہ شعر پڑھا ؎

کامل اس طبقہ زہاد سے اٹھا نہ کوئی
کچھ ہوئے تو یہی رندانِ قدح خوار ہوئے

پھر فرمایا کہ میاں تم اس بات کو دیکھتے ہو کہ اس میں تصویریں ہوتی ہیں تم یہ بات نہیں دیکھتے کہ وہ فریضۂ جہاد جس سے ہم سب لوگ غافل تھے اس کو سب سے پہلے جس شخص نے یاد دلایا ہے وہ یہی ابوالکلام آزاد ہیں' لہٰذا ہم ان کے نہایت شکر گزار ہیں' اس لیے میں ان کے پرچوں کو بڑے اشتیاق سے پڑھتا ہوں۔ پھر یہ کہ اس کے بعد میں حضرت شیخ الہند نے جو تحریک شروع کی تھی' تحریک آزادی' (تحریک ریشمی رومال) اس کا حال آپ حضرات کو معلوم ہوگا تو وہ تحریک ایسی تھی کہ اس میں زیر زمین یعنی Under Ground کام ہوتا تھا۔ انگریزی حکومت کے دور میں تو یہ باتیں منظر عام پر آ نہیں سکتی تھیں' لیکن اب اس تحریک کے متعلق تمام حالات شائع ہو گئے ہیں جن سے یہ بات صاف معلوم ہوگئی' کہ حضرت شیخ الہند نے انڈر گراؤنڈ کام شروع کر دیا تھا جہاں باقاعدہ اسلحہ سازی بھی ہوتی تھی' اور باقاعدہ ہتھیار چلانے کی ٹریننگ بھی ہوتی تھی۔ چنانچہ جو لوگ حضرت کے ہم خیال تھے' اور ان کے مشن سے تعاون کرتے تھے۔ حضرت نے ان سب سے عہد و پیمان لیا اور وہ سب شیخ الہندؒ کی ہدایت پر خفیہ طور پر اس دعوت اور مشن کے لیے کام کرتے تھے۔ مولانا عبیداللہ سندھی' حضرت شیخ الہندؒ کے سب سے بڑے معاون تھے۔ دوسرے مولانا محمد میاں جو حضرت شیخ الہند کی ہدایت پر کابل چلے گئے وہیں ان کا انتقال ہوا۔ ان کے صاحبزادے حامد الانصاری غازی ہیں۔ تیسرے مولانا سیف الرحمٰن مرحوم تھے' وہ بھی کابل ہجرت کر گئے تھے۔ پروگرام یہ تھا کہ افغانستان کی حکومت کے تعاون سے اُدھر سے انگریز کے خلاف مسلح اقدام کیا جائے۔ یہ تین بزرگ وہ تھے جو حضرت شیخ الہند کے خاص الخاص اور معتمد علیہ لوگ تھے۔ ان ہی قریب ترین حضرات میں چوتھے نمبر پر مولانا ابوالکلام آزاد کا نام شامل تھا۔ مجھے یہ تو معلوم نہیں کہ اسی واقعہ کے بعد جس کا میں کانپور

کی مسجد شہید کرنے کے سلسلہ میں ذکر کر چکا ہوں' مولانا دوبارہ بھی کبھی دیوبند تشریف لائے یا نہیں' لیکن اتنا یقین کے ساتھ جانتا ہوں کہ مولانا آزاد سے حضرت شیخ الہند کا رابطہ مسلسل قائم رہا' خط و کتابت کے ذریعے سے یا زبانی لوگوں کی وساطت سے۔ حضرت کی اس تحریک کے ایک اہم رکن مولانا آزاد بھی تھے' ان تمام شواہد سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ مولانا کا شیخ الہندؒ سے بڑا قریبی رابطہ و تعلق قائم تھا۔

الہلال کی دعوتِ جہاد و رجوعِ الی القرآن

مولانا آزاد نے جیسا کہ آپ نے سنا الہلال اور البلاغ کے ذریعہ ایک دعوت دی۔ اس دعوت کو حضرت شیخ الہند دعوتِ جہاد فرمایا کرتے تھے لیکن میں سمجھتا ہوں کہ وہ صرف دعوتِ جہاد ہی نہیں تھی بلکہ دعوتِ انقلاب تھی۔ مسلمان اپنے جس فرض کو بھول گئے تھے اس فرض کو مولانا نے یاد دلایا اور اس کے لیے قرآن مجید کی طرف رجوع کرنے کی ضرورت پر نہایت زور دیا۔ چونکہ مسلمانوں کے پاس اصل قوتِ تسخیر قرآن ہی ہے۔ مولانا نے اس کام کو منظّم طور پر کرنے کے لیے ایک جماعت بنائی۔ مولانا نے جو تنظیم بنائی اس کا نام حزب اللہ تھا۔ اس حزب اللہ کے لیے مولانا نے بیعت لی یا نہیں لی' اس کے متعلق میں وثوق سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔ البتہ میرا ذاتی خیال یہ ہے کہ مولانا نے جو حزب اللہ بنائی تھی' اس کے لیے مولانا کے پیش نظر یہ ضرور ہوگا کہ وہ اس میں شمولیت کے لیے بیعت لیں۔ بہرحال یہ مولانا کا مشن تھا اس کے لیے انہوں نے کام شروع کیا تھا اور اس راہ میں پیش رفت بھی کی تھی۔ اتنا مجھے معلوم ہے۔

عوام الناس میں ان کی شہرت کی بنیاد اور اساس ان کی قرآن اور جہاد کی دعوت تھی۔ یہی وجہ تھی کہ وہ ہر جگہ انتہائی مقبول ہوئے۔ آپ کے پنجاب میں مولانا بے حد مقبول تھے۔ اس دور کے بڑے بڑے علماء اور دانشور مولانا آزاد کی تحریر' ان کی تقریر اور ان کی دعوت سے بہت زیادہ متاثر تھے۔ ان کے پیغام نے سوئی ہوئی روحوں کو نہ صرف بیدار کیا بلکہ ان کو ایک ولولہ تازہ سے سرشار کر دیا اور مولانا پورے برصغیر خاص طور پر پنجاب کے لوگوں کی آنکھوں کا تارا اور ان کے محبوب رہنما بن گئے۔

ایک بے مثال خطبہ

اس کے بعد جب تحریک خلافت شروع ہوئی تو مولانا نے اس پر بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ اس مسئلہ پر مولانا کی ملک کے مشہور شہروں میں سے اکثر میں نہایت زوردار اور ولولہ انگیز

تقریریں ہوئیں' جو صرف خطابت ہی کے لحاظ سے نہیں بلکہ علمی اعتبار سے بھی معرکے کی تقاریر
تھیں۔ آگرہ یعنی اکبرآباد میں خلافت کمیٹی کے زیر اہتمام ایک عظیم جلسۂ عام میں مولانا نے
'مسئلہ خلافت' کے موضوع پر نہایت خطیبانہ اور عالمانہ تقریر کی۔ میں خود تو اس جلسہ میں نہیں تھا
لیکن مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی مرحوم اور مولانا عتیق الرحمٰن صاحب نیز دوسرے لوگوں سے'
جو اس جلسہ میں موجود تھے' میں نے سنا کہ 'مسئلہ خلافت' جواب کتابی شکل میں طبع شدہ موجود
ہے۔ یہ پورا کا پورا خطبہ مولانا آزاد نے زبانی دیا تھا۔ اس میں بکثرت حوالہ جات تھے جو بالکل
صحیح تھے۔ جس سے مولانا آزاد کی ذہانت اور ان کے حافظہ کی پختگی کا اندازہ ہوتا ہے۔ ان
حضرات کا کہنا ہے کہ اس کتاب میں بعد میں بھی مولانا نے کوئی اضافہ اور ترمیم نہیں کی۔ بلکہ یہ
کتاب جوں کی توں مولانا کی زبانی تقریر پر مشتمل ہے۔ مولانا آزاد نے اس نوع کی جگہ جگہ
تقریریں کیں اور لوگوں کو تعجب ہوتا تھا کہ مولانا کا دماغ تو پورا ایک کتب خانہ معلوم ہوتا ہے۔
چونکہ شاید ہی مولانا کی کوئی تقریر ایسی ہوتی ہو جس میں مولانا سلف کی کسی نہ کسی معروف علمی
شخصیت کی تحریروں کا باقاعدہ حوالہ نہ دیتے ہوں۔ یہ اس بات کا ثبوت تھا کہ مولانا کا حافظہ اور
ان کا مطالعہ کس قدر مضبوط اور وسیع تھا۔

مولانا آزاد کا تبحر علمی

مولانا آزاد کی علمیت کا ذکر زبان پر آیا تو مجھے یہ بات یاد آئی کہ کچھ لوگ کہا کرتے تھے'
اور شاید اب بھی ایسا کہنے اور سمجھنے والے کچھ لوگ موجود ہوں کہ مولانا آزاد ذہین بہت زیادہ
ہیں لیکن ان کا علم بہت کم ہے۔ لیکن میں آپ کو بتاتا ہوں کہ مولانا کے انتقال کے بعد ایسی ٹھوس
شہادتیں مل گئی ہیں جن سے لوگوں کا یہ قول غلط ثابت ہوجاتا ہے۔ ہمارے یہاں نئی دہلی میں
حکومت کا قائم کردہ ایک محکمہ ہے جس کا نام انڈین کلچر اینڈ سائنس ریسرچ انسٹیٹیوٹ یا اسی سے
ملتا جلتا نام ہے' اس کی ایک بہت بڑی لائبریری ہے اس میں مولانا آزاد کا ذاتی کتب خانہ منتقل
ہوگیا ہے جو بے شمار قیمتی کتابوں پر مشتمل تھا اور اس میں بعض نادر کتب کے نسخے بھی شامل تھے۔
اس لائبریری میں جب مولانا آزادؒ کی کتابوں کا جائزہ لیا گیا تو یہ دیکھ کر بڑا تعجب ہوا کہ بہت کم
کتابیں مولانا آزاد کے کتب خانہ کی ایسی تھیں جن پر مولانا کے نوٹ اور حواشی نہ ہوں۔ اس کے
برعکس ان کتابوں کی تعداد بہت زیادہ تھی جن پر مولانا نے نوٹ اور حواشی تحریر کیے تھے۔ چنانچہ
حکومت نے ایک شخص کو اس کام کے لیے مقرر کیا کہ وہ مولانا کے جن کتابوں پر حواشی ہیں ان

سب کو مرتب کرکے پیش کرے۔ چنانچہ تمام حواشی مرتب ہوئے۔ اس کے کچھ حصے رسالہ
''اسلام اور عصر جدید' دہلی'' میں قسط وار چھپ گئے ہیں۔ ان سے مولانا کی دقت نظر اور گہرے
غور وفکر کا اندازہ ہوتا ہے۔ الغرض مولانا آزاد کا مطالعہ بہت وسیع تھا۔ ان کا حافظہ بھی نہایت
قوی تھا۔ ساتھ ہی انتہائی ذہین و فطین تھے۔

آزادی کی مشترکہ جدوجہد اور عالم اسلام

مولانا آزاد کی سیاسی زندگی میں اغلباً ۲۶ء سے یہ موڑ آیا کہ مولانا نے جمعیت علماء ہند
کے کاموں سے وہ عملی دلچسپی لینی چھوڑ دی جو وہ پہلے مسلسل لیتے رہے تھے۔ یہ ایک حقیقت ہے
کہ اس دور سے مولانا کی تقریباً تمام تر عملی سیاسی دلچسپیاں کانگریس کے لیے وقف ہوگئی تھیں۔
جمعیت علماء ہند کے سالانہ جلسوں میں وہ اکثر تشریف لاتے تھے تقریر بھی کرتے تھے۔ یہ ایک
الگ بات ہے۔ لیکن یہ میرے ذاتی مشاہدہ کی بات ہے کہ باوجود اس کے کہ وہ جمعیت کی
ورکنگ کمیٹی کے تقریباً ہر دور میں ممبر رہے اور وہ اس کے اجلاسوں میں تشریف بھی لاتے تھے۔
لیکن جمعیت کے ساتھ ان کی پہلے جو عملی وابستگی تھی' اور اس کے کاموں میں جو سرگرمی تھی' وہ
تقریباً ختم ہوچکی تھی' اور ان کی عملی سرگرمیوں کا میدان کانگریس تھی۔ اب ایسا کیوں ہوا؟ مجھے
اس کی تحقیق کا موقع نہیں ملا۔ لیکن میں اس معاملہ میں بطورِ قیاس یہ سمجھتا ہوں کہ ہوسکتا ہے کہ
مولانا آزاد کو یہ محسوس ہوا ہو کہ ہماری رجوع الی القرآن اور جہاد فی سبیل اللہ کی دعوت ناکام
ہوگئی ہے یا یہ کہ دعوت نے اتنی تیز رفتاری سے لوگوں کے اذہان وقلوب کو مسخر نہیں کیا کہ وہ اس
کے لیے اس ایثار وقربانی کے لیے آگے آسکیں جو اس دعوت کے لیے ضروری ہے۔ پھر ترکی
میں خلافت کا ادارہ خود مصطفیٰ کمال نے ختم کردیا۔ اس طرح مسلمانوں کے جوش عمل پر مایوسی
اور سردمہری طاری ہوگئی۔ لہٰذا انہوں نے سوچا کہ اب تحریک کو دوبارہ زندہ اور متحرک وفعال
بنانے کا امکان تو نظر نہیں آتا اس لیے اب سب سے پہلے انگریز کی حکومت کے ہندوستان سے
خاتمہ کی طرف زیادہ توجہ ہونی چاہیے' چونکہ نہ صرف ہمارے ہی راستہ کی سب سے بڑی رکاوٹ
یہ ہے بلکہ پورے عالم اسلام کو اسی انگریزی حکومت کے ہاتھوں سے بالواسطہ اور بلاواسطہ سخت
نقصان پہنچ رہا ہے۔ عالم اسلام کی بھلائی کے لیے بھی انگریزی حکومت کا ہندوستان سے خاتمہ
نہایت ضروری ہے۔ ظاہر ہے کہ استخلاصِ وطن کے لیے ملک کی عظیم غیر مسلم اکثریت کی حمایت
ضروری تھی' اور چونکہ انڈین نیشنل کانگریس ایک غیر فرقہ وارانہ جماعت تھی' لہٰذا انہوں نے سوچا

ہوگا کہ پہلے متحدہ قوت سے انگریزی حکومت پر ضرب کاری لگائی جائے۔ میری رائے یہ ہے کہ انہوں نے ان خطوط پر سوچا ہوگا۔ اور برادران وابنائے وطن کے ساتھ ایک مشترکہ پلیٹ فارم سے اس حکومت کی غلامی سے آزادی حاصل کرنے کے لیے اپنی توجیہات اور مساعی کو مرتکز کر دیا ہوگا۔

مولانا آزاد کا انقلابی تحریکات سے تعلق

مولانا ابوالکلام آزاد ایک زمانہ میں بہت بڑے انقلابی تھے' جنہوں نے ان کی زندگی کے حالات پڑھے ہیں ان کو علم ہوگا کہ مولانا نے خود اعتراف کیا ہے کہ ایک زمانے میں ملک میں جو انقلاب پسند تھے جن کو انتہا پسند (Extremist) یا جن کو دہشت پسند (Terrorist) کہا جاتا ہے' مولانا آزاد کا ان سے بھی کچھ عرصہ تعلق رہا ہے۔ مولانا جلد ہی ان سے الگ ہو گئے۔ چونکہ انہوں نے علیٰ وجہ البصیرت اس طریقے کو صحیح نہیں سمجھا اور انہوں نے کانگریس کے ساتھ استخلاصِ وطن کے لیے تعاون کیا۔ لیکن کانگریس میں اعلیٰ مقام پر فائز رہنے کے باوجود تین باتیں خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں اور یقینی ہیں:

- ایک یہ کہ مولانا نے اپنی وضع قطع کو کبھی نہیں بدلا۔ کانگریس میں ہمیشہ اسی وضع کے ساتھ رہے۔
- دوسرے یہ کہ مسلمانوں کے حقوق اور اسلام کے مفادات کو انہوں نے قربان کرنا تو درکنار کبھی نظر انداز بھی نہیں کیا۔ ان امور کے لیے وہ برابر مساعی وجدوجہد کرتے رہے۔
- تیسرے یہ کہ قرآن مجید کا جو انقلابی فکر ہے اس کو اجاگر اور مہمیز کرنے والا تحقیقی حواشی کے ساتھ اس کا ترجمہ ان کے پیش نظر تھا' اس پر بھی وہ برابر کام کرتے رہے۔ اس کا قدرے تفصیلی ذکر میں آگے کروں گا۔

مولانا آزاد اور پاکستان

یہ بات کون نہیں جانتا کہ مولانا آزاد کو تحریک سے اختلاف تھا' لیکن میں اپنی ذاتی اور عینی شہادت کی بنا پر کہتا ہوں کہ ملک کی تقسیم اور آزادی کے بعد اکتوبر ۱۹۴۷ء میں مولانا آزاد نے لنچ کے لیے چند سربرآوردہ مسلمان رہنماؤں کو مدعو کیا۔ میں تو ان سب سے چھوٹا تھا' اور ان حضراتِ کرام کے ساتھ نتھی ہوتا تھا۔ ان حضرات میں قابلِ ذکر حضرات ڈاکٹر ذاکر حسین خان صاحب' مولانا حبیب الرحمٰن صاحب لدھیانوی' مولانا مفتی عتیق الرحمٰن صاحب' مولانا حفظ الرحمٰن صاحب سیوہاروی ہیں۔ اور بھی چند اکابر اس لنچ میں شریک ہوئے' جن کے نام اس وقت ذہن میں مستحضر نہیں ہیں۔ بہر حال میں بھی مدعوین میں شامل تھا۔

لنچ سے فارغ ہونے کے بعد مولانا آزاد نے فرمایا کہ میں نے آپ حضرات کو اس لیے بلایا ہے کہ میں آپ حضرات سے چند خاص باتیں کرنا چاہتا ہوں۔ سب نے کہا ضرور ارشاد فرمائیے۔ مولانا نے فرمایا:

''پہلی بات تو یہ ہے کہ ہمارا نظریہ پاکستان سے اختلاف تھا' وہ اپنی جگہ تھا' اس کے لیے ہمارے پاس ٹھوس وجوہ اور قوی دلائل تھے۔ لیکن اب جب کہ ملک تقسیم ہو گیا ہے اور پاکستان وجود میں آ گیا ہے تو ہم کو پاکستان کے کسی لیڈر یا کسی شخص کے متعلق اپنے دل میں کوئی رنجش اور کدورت نہیں رکھنی چاہیے۔ میرے بھائی! وقت کی ایک سیاست تھی۔ جس سیاست کو کامیاب ہونا تھا وہ ہو گئی۔''

اس کے بعد پھر فرمایا:

''دوسری بات یہ کہ اب پاکستان کے لیے کسی طرح کی بدخواہی کرنا یا اس کے لیے کسی طرح کی بداندیشی کرنا نہ صرف ہمارے ملک ہندوستان کے لیے مضر ہے بلکہ خاص طور پر ہندوستان میں رہ جانے والے مسلمانوں کے لیے بھی انتہائی مضر' مہلک اور خطرناک ہے۔ اس واسطے کہ اگر پاکستان بھی ختم ہو گیا یا پاکستان پر کوئی زوال آیا تو پھر ہندوستان کے مسلمان منہ دکھانے کے قابل بھی نہیں رہیں گے اور پھر اس پر مستزاد یہ کہ برصغیر میں مسلمانوں کا مستقبل انتہائی تاریک ہو جائے گا۔ ان کے لیے یہاں کوئی گنجائش نہیں ہوگی۔ مولانا نے صاف لفظوں میں کہا کہ اب پاکستان کے ساتھ ہمارا بالکل دوسرا رویہ ہونا چاہیے اور ہم سب کو دعا کرنی چاہیے اور تمنا کرنی چاہیے کہ پاکستان پھلے پھولے اور مستحکم ہو۔
سیاسی اعتبار سے ہماری حکومت بھی کہتی ہے کہ ہندوستان اور پاکستان ایک region ایک ہی خطہ کے دو ملک ہیں' اس region کی سلامتی اور خوشحالی اسی پر موقوف ہے کہ دونوں ملک اچھے پڑوسیوں کی طرح مل جل کر رہیں' اور دونوں ملکوں میں خیر سگالی اور خیر اندیشی کے جذبات پروان چڑھیں۔''

بھارت کی حکومت کی طرف سے تو یہ ایک سیاسی بات بھی ہو سکتی تھی لیکن میں مولانا آزاد کے متعلق آپ کو بتاتا ہوں کہ وہ تنہائیوں میں ہم سے بڑے شدت اور خلوص کے ساتھ یہ کہا کرتے تھے کہ اب پاکستان سے کوئی اختلاف ہمیں نہیں ہونا چاہیے۔

مسلمانوں کے دینی' ثقافتی مسائل اور فرقہ وارانہ سیاست

جہاں تک ہندوستان کے مسلمانوں کا تعلق ہے' تو ان کے متعلق مولانا برملا کہا کرتے تھے کہ:

''ہماری زندگی کے دو حصے ہیں ایک دینی اور ثقافتی زندگی اور ایک ہے ہماری قومی اور

سیاسی زندگی۔ تو جہاں تک ہماری دینی اور ثقافتی زندگی کا تعلق ہے، میں صاف لفظوں میں آپ سے کہتا ہوں کہ اس میں کوئی (compromise) نہیں ہوسکتا۔ اس موقعے پر مولانا بے ساختہ ہاتھوں کو جھٹک دیا کرتے تھے۔ اور تکرار کے ساتھ کہا کرتے تھے کہ ہم اپنے دین پر قائم رہیں گے، اپنی ثقافت پر قائم رہیں گے، اس معاملے میں ہم کسی کے ساتھ کسی نوع کا بھی سمجھوتا نہیں کریں گے۔''

لیکن جہاں تک سیاست کا تعلق ہے، مولانا نے کہا کہ میں نے پہلے بھی کہا اور اب بھی کہتا ہوں کہ:

''جس ملک میں مسلمان اقلیت میں ہوں وہاں الگ سیاست کا میدان بنانا ان کے حق میں مفید نہیں ہوگا۔ لہٰذا فرقہ وارانہ سیاست کو چھوڑ کر آپ لوگ اب ملکی سیاست میں بھرپور حصہ لیں۔''

مولانا کو جب بھی موقع ملتا وہ مسلمان لیڈروں کو اسی کی تاکیدی نصیحت کیا کرتے تھے۔
پاکستان بننے کے بعد کبھی بھی مولانا کی زبان سے نہ جلوت میں نہ خلوت میں، کوئی بدخواہی کی بات نہیں نکلی بلکہ وہ برملا کہا کرتے تھے، کہ:

''اب پاکستان کو لازماً باقی رہنا چاہیے۔ اسے مضبوط اور خوشحال ہونا چاہیے، یہی بات اس کے لیے اور ہندوستانی مسلمانوں کے لیے مفید اور بہتر ہے۔''

مولانا کے کیریکٹر کی دوخوبیاں

مولانا آزاد کے متعلق میں عینی شاہد اور ذاتی معلومات کی بنا پر آپ کو بتاتا ہوں کہ دو چیزیں ان کے اندر لاجواب تھیں:

- پہلی یہ کہ اپنے مخالف کو کبھی برا بھلا کہنا وہ جانتے ہی نہیں تھے۔ مولانا کے متعلق لوگوں نے کیا کچھ نہیں کہا، ان کے ساتھ کیا کچھ نہیں کیا گیا، لیکن میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ ایک مرتبہ بھی کبھی میں نے مولانا کی زبان سے قائداعظم یا لیاقت علی خان یا مسلم لیگ کے کسی دوسرے لیڈر یا خود مسلم لیگ کے متعلق بدگوئی سنی ہی نہیں۔ ان میں اس قدر وسعتِ ظرف تھی کہ کبھی کسی کی برائی نہیں کرتے تھے، کبھی غیبت نہیں کرتے تھے۔
- دوسری بات یہ کہ ان کے اندر خودداری نہایت اعلیٰ درجے کی تھی۔ اس کا ایک واقعہ میں آپ کو بتلاؤں۔ قرآن مجید کے ترجمہ کی ''ترجمان القرآن'' کے نام سے جو پہلی جلد شائع ہوئی تھی تو اس کے کاتب تھے مولانا عبدالقیوم۔ بعد میں وہ ہمارے رسالہ برہان سے وابستہ ہوگئے

تھے۔ وہ کہتے ہیں کہ مولانا کا بالی گنج میں جو مکان تھا وہیں انہوں نے مولانا عبدالقیوم کو کتابت کے دوران رہنے کے لیے بلا لیا تھا۔ جہاں وہ نو دس مہینے مقیم رہے۔ ان نو دس مہینوں کے قیام میں مولانا عبدالقیوم جو مشاہدات بیان کرتے ہیں، وہ بڑے عجیب وغریب ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ مولانا کی بالی گنج میں جو دومنزلہ کوٹھی تھی، میں نے بھی اسے دیکھا ہے۔ تو جب مولانا پر افلاس اور فقر وفاقہ کا دور آیا تو مولانا آزاد نے اس کا اوپر کا حصہ کرائے پر دے دیا یا نیچے کا۔ یہ مجھے اس وقت یاد نہیں۔ بہرحال کوٹھی کا ایک حصہ کرائے پر دے دیا، اور ایک حصہ میں خود رہائش رکھی۔ مولانا عبدالقیوم بتاتے تھے کہ ہم نے کئی بار دیکھا کہ دوپہر کو کھانے کا وقت ہوگیا اور مولانا کے گھر میں چولہا نہیں جلا۔ معلوم ہوا کہ مولانا کے گھر کھانا نہیں پکا۔ ایسے حالات میں مولانا اپنے ذاتی ملازم کو بلاتے اور خاموشی سے اسے چونی دیتے، اور اس سے بازار سے سالن روٹی منگاتے اور مولانا اور ان کی اہلیہ اسی میں گزارا کرلیتے۔ یہ وقت بھی مولانا پر گزرا ہے۔

ایک دن پنڈت جواہر لال نہرو اور گاندھی جی مولانا آزاد کی کوٹھی پر ان سے ملنے کے لیے آئے تو مولانا آزاد اس وقت کھدر کا جو کرتہ پہنے ہوئے تھے وہ مونڈھے کے اوپر سے پھٹا ہوا تھا۔ تو اسی کرتے کو پہنے ہوئے مولانا ان حضرات سے ملے، مگر انہوں نے مونڈھے پر ایک چادر ڈال لی۔ ان حضرات نے مولانا سے کہا کہ ہمیں معلوم ہوا ہے کہ آج کل آپ مالی مشکلات سے دوچار ہیں، اس ضمن میں ہم آپ کے ساتھ تعاون کرنا چاہتے ہیں۔ مولانا نے جواب دیا کہ مجھے کسی تعاون کی ضرورت نہیں ہے اور ان حضرات کے اصرار کے باوجود مولانا نے کوئی امداد قبول نہیں کی ——

مولانا خیرالدین مرحوم، جو مولانا آزاد کے والد ماجد تھے، کلکتہ میں میمن اور دہلی اور یوپی کے تاجر حضرات، جو کلکتہ میں تجارت کرتے تھے، ان کی بہت بڑی تعداد ان کی مرید تھی۔ مولانا آزاد کے والد کے انتقال کے بعد ان کے مختلف وفود نے مولانا آزاد سے اصرار کیا کہ آپ اپنے والد مرحوم کی گدی سنبھال لیے ہم آپ کی وہی تعظیم وتکریم اور خدمت کریں گے جو آپ کے والد بزرگوار کی کیا کرتے تھے۔ مولانا آزاد نے صاف کہہ دیا کہ وہ راہ میرے والد کی راہ تھی، میں اس راہ کا آدمی نہیں ہوں۔ میں اس نوع کا کوئی تعلق رکھنا نہیں چاہتا۔ انہوں نے کہا کہ ہم تو آپ کی خدمت میں وعظ ونصیحت کے کچھ کلمات سننے کے لیے آنا چاہتے ہیں۔ تو مولانا نے کہا کہ اس مقصد کے لیے میں ہفتہ میں دو دن پیر اور جمعرات آپ کو دیتا ہوں۔ عصر سے لے کر

مغرب تک آپ لوگ تشریف لا سکتے ہیں مگر ساتھ ہی تاکید کی کہ میں کسی قسم کا کوئی نذرانہ، کسی قسم کا کوئی عطیہ آپ حضرات سے قبول نہیں کروں گا۔

الغرض ان کی بے نیازی اور ان کی خودداری کا یہ عالم تھا کہ خود تکلیف اٹھاتے تھے لیکن کسی سے نذرانہ یا عطیہ قبول نہیں کرتے تھے، یہ ان کا مستقل مزاج تھا ——

مولانا کا اخلاق

پھر ان کے اخلاق کا یہ عالم تھا کہ میں بارہ چودہ سال تک بارہا ان کی نجی صحبتوں میں شریک رہا ہوں لیکن میں نے کبھی کسی کے متعلق ان کی زبان سے کوئی برا کلمہ یا شکوہ وشکایت کا جملہ نہیں سُنا۔ آپ میں سے اکثر حضرات نے وہ واقعہ سنا ہوگا کہ جب تحریکِ پاکستان کا بہت زور تھا اور یہ تحریک اپنے شباب پر تھی تو اس زمانے میں مولانا ابوالکلام آزاد دہلی سے الٰہ آباد جارہے تھے، جب ان کی گاڑی علی گڑھ کے اسٹیشن پر پہنچی تو علی گڑھ یونیورسٹی کے چند طلبہ نے مولانا کے ساتھ گستاخی کا معاملہ کیا، اور مولانا کے ساتھ نہایت نازیبا حرکات کیں۔ پنڈت سندرلال کا بیان ہے کہ ہم نے جب دوسرے دن اخبارات میں پڑھا کہ علی گڑھ اسٹیشن پر مولانا آزاد کے اوپر رکیک حملہ ہوا، اور ان کے ساتھ اہانت آمیز حرکات کی گئی ہیں تو میں فوراً الٰہ آباد پہنچا تاکہ میں مولانا سے اس واقعے پر اظہارِ افسوس کروں، اور ان کی دلجوئی کروں۔ پنڈت جی کا بیان ہے کہ میں نے جاتے ہی کہا مولانا! بڑے افسوس کی بات ہے کہ علی گڑھ یونیورسٹی کے طلبہ نے آپ کے ساتھ یہ حرکت کی۔ مولانا بجائے غصہ کے کچھ مسکرائے اور اسی حالت میں کہا کہ پنڈت جی کیا کیا جائے۔ اپنی ہی اولاد ہے، اپنے ہی بچے ہیں۔ شرارت بچے کیا ہی کرتے ہیں، ہوگئی شرارت۔ اب اس پر افسوس سے کیا حاصل، ہم کو کام تو ان ہی سے لینا ہے۔ الغرض مولانا نے اس پر اپنے کسی غم وغصہ کا کوئی اظہار نہیں کیا، کوئی ناگواری ان کے اوپر طاری نہیں تھی۔ اور وہ اس افسوس ناک واقعے کو بھی پی گئے اور ٹال گئے۔

تو یہ تھے مولانا ابوالکلام آزاد اپنے کیریکٹر کے اعتبار سے اور اپنے اخلاق کے اعتبار سے۔

آزادی کے بعد مولانا آزاد کی عظیم الشان خدمات

اب مجھے مولانا آزاد کے ان اہم کاموں کے متعلق کچھ عرض کرنا ہے کہ جو آزادی کے بعد مولانا نے ہندوستان میں رہ جانے والے مسلمانوں کے لیے انجام دیے تھے۔ ہندوستان میں مسلمانوں کے جو ثقافتی مراکز تھے، مولانا نے ان کو محفوظ رکھنے اور ان کو ترقی دینے کی بڑی کوشش کی۔

دائرۃ المعارف

چنانچہ دائرۃ المعارف حیدرآباد دکن، جو عربی کے نادر مخطوطات کی اشاعت کا ایک نامور ادارہ ہے، اسے مولانا مرحوم نے قائم رکھا اور نہ صرف اسے قائم رکھا بلکہ اس زمانے میں اس کی ساٹھ ہزار روپے ماہوار گرانٹ مقرر کرادی۔ اللہ کا شکر ہے کہ وہ ادارہ تقسیم سے پہلے جس طرح جاری تھا اس سے کہیں ترقی کے ساتھ وہ اب بھی جاری ہے۔

رضا لائبریری

اسی طرح ریاست رام پور کا شاندار کتب خانہ جس کا نام رضا لائبریری ہے، اس کے متعلق عام خیال یہ تھا کہ تقسیم کے بعد یہ اجڑ جائے گا۔ مولانا آزاد نے اس کو باقاعدہ حکومت کی تحویل میں لے لیا اور اسے یوپی گورنمنٹ کی نگرانی میں دے دیا۔ اللہ کا شکر ہے کہ یہ لائبریری ترقی کررہی ہے اور اس کا لاکھوں روپے کا سالانہ بجٹ یوپی کی حکومت پورا کررہی ہے۔

خدا بخش لائبریری

اسی طرح پٹنہ کی مشہور عالم خدا بخش لائبریری کو بھی مولانا کی کوششوں سے حکومت کی طرف سے تمام حفاظتی انتظامات مہیا کیے گئے، اور اس کے لیے بھی مولانا نے لاکھوں روپے کے سالانہ بجٹ کی منظوری حاصل کی۔ یہ ادارہ بھی نہ صرف باقی ہے بلکہ ترقی پذیر ہے۔

مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

اسی طرح علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا معاملہ ہے، اس کو بچانے میں مولانا آزاد کا بہت بڑا حصہ ہے۔ وہاں مولانا نے آزادی کے بعد اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ قائم کیا، عربی کے شعبے کو کافی ترقی دی، اسلامیات کے شعبے کو وسیع تر کیا، اور آج اگر آپ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کو دیکھیں تو آپ کو اندازہ ہوگا کہ وہ ہندوستان یعنی بھارت ہی کی نہیں بلکہ ایشیا کی ان عظیم الشان یونیورسٹیوں میں سے ہے جن پر مسلمان بجا طور پر فخر کرسکتے ہیں۔ اس کی ترقی میں بہت بڑا دخل مولانا ابوالکلام آزاد کا ہے۔

جامعہ ملّیہ اور دیگر ملّی ادارے

کم وبیش یہی صورت حال جامعہ ملیہ دہلی کی ہے جو بھارت کی ایک مثالی یونیورسٹی کا مقام حاصل کرچکی ہے۔ مزید براں کئی دینی مدرسے اور ثقافتی مراکز مولانا کی کوششوں سے

شرارت پسندوں کی دست برد سے محفوظ رہے۔ الغرض مولانا ابوالکلام آزاد نے آزادی کے بعد نہایت نامساعد حالات میں بھارت میں مسلمانوں اور اسلام کی خدمت بڑی جرأت، دلیری، ہمت اور بہادری کے ساتھ کی ہے۔

عظیم ترین کارنامہ ''ترجمان القرآن''

علمی طور پر مولانا کے بہت عظیم الشان کارنامے ہیں، لیکن ان کا سب سے بڑا اور عظیم ترین کارنامہ ہے: ''ترجمان القرآن'' جو مولانا کی تفسیر ہے۔ اس کو تفسیر کے بجائے ترجمہ اور اس پر مفصل حواشی کہنا زیادہ موزوں ہوگا۔ اس کی سب سے بڑی خصوصیت وہ ہے جس کے متعلق مولانا آزاد نے خود اس کے مقدمے میں لکھا ہے کہ اب تک جتنے بھی تراجم کیے جا چکے اور تفاسیر لکھی جا چکی ہیں، یہ کام اب تک کسی نہ کسی خاص نقطۂ نظر کے تحت کیا جاتا رہا ہے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ تفسیر کے جتنے بھی ادوار ہیں، اُن میں پہلا دور ہے تفسیر ماثور کا۔ تفسیر ماثور کے معنی ہیں، تفسیر قرآن احادیث کے ذریعے سے، جیسا کہ ابن جریر طبری کی تفسیر ہے۔ یہ ایک اہم چیز ہے اس میں کوئی شبہ نہیں ہے، لیکن اس میں سب سے بڑا نقص یہ ہے جس کی طرف امام احمد ابن حنبل ؒ نے بھی اشارہ کیا ہے، کہ اس کے اندر درج شدہ روایتوں کی جانچ پرکھ میں وہ احتیاط اور سختی نہیں برتی جو برتنی چاہیے تھی۔ امام احمد ابن حنبل نے فرمایا کہ تین چیزیں ایسی ہیں جن کے پیش نظر احادیث کو نہایت احتیاط سے قبول کرنا چاہیے، ایک ملاحم، دوسری مغازی اور تیسری تفسیری روایات۔ امام موصوف نے فرمایا کہ ایسی احادیث جرح وتعدیل اور جانچ پرکھ کے بغیر تفسیر میں داخل کر دی جاتی ہیں جن کی وجہ سے قرآن مجید کے مطالب اور مقصود میں انتشار واختلال پیدا ہو جاتا ہے، دوسری بات میں عرض کروں، وہ یہ کہ ضعیف روایات کے علاوہ تفسیر ماثور میں اسرائیلیات نے بہت راہ پائی ہے۔

اسرائیلیات وہ روایتیں ہیں جو قدیم محرف کتب سماویہ کے مطابق ایک طبقے نے عام طور پر مسلمانوں میں پھیلا دی ہیں۔ ان پر ہمارے قدیم وجدید علماء نے بڑی تفصیل سے بحثیں کی ہیں۔ ان اسرائیلیات کا نہایت ہی قلیل حصہ ایسا ہے جس کے متعلق علماء یہ کہتے ہیں کہ ان کو درج کیا جا سکتا ہے چونکہ وہ ہماری کسی منصوص اور صحیح روایت سے معارض نہیں۔ لیکن ان اسرائیلیات کا بہت بڑا حصہ وہ ہے جو قابل رد ہے اور جو درحقیقت قرآن مجید کے اوپر ایک نوع کی تعدی اور زیادتی کا حامل ہے۔ مثلاً ہاروت و ماروت کا ذکر قرآن مجید میں آیا ہے۔ ان کے بارے میں اسرائیلیات کی ایک عام روایت ہے جس کے متعلق نہایت افسوس کے ساتھ عرض

کرتا ہوں، کہ ہمارے شاہ عبدالعزیز ؒ جو کہ بہت بڑے محدث ہیں، یقیناً ان کا مقام بہت بلند ہے، ان کی جو تفسیر عزیزی ہے اس میں انہوں نے اس کو نقل کر دیا ہے۔

وہ روایت یہ ہے کہ ہاروت و ماروت دو فرشتے تھے جو زمین پر دو عورتوں پر عاشق ہو گئے جن کا نام تھا زہرہ اور مشتری۔ وہ جانتی تھیں کہ ان دونوں فرشتوں کے پاس اسمِ اعظم ہے۔ تو انہوں نے ان سے کہا کہ ہم تم کو اس وقت اپنے قرب اور وصل سے شاد کام کریں گی جب تم اسمِ اعظم ہمیں سکھلا دو۔ پس انہوں نے اسمِ اعظم ان کو سکھلا دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ عورتیں آسمان پر چلی گئیں، ایک زہرہ ستارہ اور دوسری مشتری ستارہ بن گئی۔ اور رہے ہاروت و ماروت تو ان کو ایک اندھیرے کنوئیں میں الٹا لٹکا دیا گیا۔ حیرت ہوتی ہے کہ کس طرح کوئی شخص ان کو سن سکتا اور برداشت کر سکتا ہے۔ ایک نہیں بے شمار اسرائیلیات ہیں جن کو عقلِ عام بھی سننا گوارا نہیں کرتی چہ جائیکہ ان کو تفسیری روایات کے طور پر جگہ دی جائے۔ حضرت داؤد علیہ السلام کے متعلق، حضرت سلیمان علیہ السلام کے متعلق، جنت و دوزخ سے متعلق، حضرت آدم علیہ السلام کے جنت سے نکلنے کے متعلق وغیرہ وغیرہ۔

اس قسم کی روایتیں ہیں کہ سمجھ میں نہیں آتا کہ کوئی سمجھ دار آدمی کیسے گوارا کر سکتا ہے کہ اس قسم کی روایات تفسیر میں لائے مگر یہ ہوا۔ اور اکثر تفسیر ماثور کا یہی حال ہے —— اس کے بعد جب علم کلام کے مختلف مذاہب بنے یا فقہ کے مذاہب وجود میں آئے تو ان کے بعد جو تفاسیر لکھی گئی ہیں۔ اگر کوئی ماتریدی ہے تو اس نے اپنے عقیدے کے مطابق لکھی ہے، اگر کوئی اشعری ہے تو اس نے اپنے عقائد کے مطابق لکھی ہے۔ اگر کسی حنفی نے لکھی ہے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ سارا قرآن شریف امام ابوحنیفہ کے مذہب پر نازل ہوا تھا۔ یہی حال دوسرے فقہی مسالک کے مفسرین کا نظر آتا ہے الا ماشاء اللہ۔ اور یہ سلسلہ سلف سے لے کر اب تک جاری ہے —— حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ قرآن مجید ان سب چیزوں سے بلند ہے۔

قرآن کی تفسیر تو اس طرح لکھی جانی چاہیے اور اس طرح سامنے آنی چاہیے کہ یہ معلوم نہ ہو کہ یہ کسی خاص علم کلام یا کسی خاص فقہی مکتب فکر کا پابند ہے۔ امام رازی کی تفسیر میں منطق اور فلسفہ کا اتنا غلبہ ہے کہ ان کی تفسیر کے متعلق یہ قول مشہور ہو گیا ہے کہ تفسیر کبیر میں سب کچھ ہے سوائے قرآن کے۔

مولانا آزاد نے اس صورت حال کا اپنے مقدمہ میں ذکر کیا ہے۔ اسی کا یہ نتیجہ ہے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ ہمارے اکثر علماء منطق اور فلسفہ سے بڑی دلچسپی رکھتے ہیں، فقہ سے بڑا شغف رکھتے

ہیں، حدیث سے بھی دلچسپی موجود ہے، لیکن اگر دلچسپی نہیں ہے تو قرآن کے معارف، اس کے عرفان، اس کی جاوداں انقلابی دعوت سے، اس کے حقیقی پیغام کی طرف التفات کم سے کم ہے، الّا ماشاءاللہ۔

مولانا آزاد نے ترجمان القرآن میں اسی بات کی رعایت ملحوظ رکھی کہ قرآن جو بات جس طرح جس مقام پر کہتا ہے، اسے اسی طرح مسلمانوں کے سامنے پیش کر دیا جائے۔ اس سے بعض غلط فہمیاں بھی پیدا ہوئیں۔ مثلاً سورۃ البقرۃ میں جہاں وہ آیت ہے: ﴿اِنَّ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَالَّذِیۡنَ هَادُوۡا وَالنَّصٰرٰی وَالصّٰبِئِیۡنَ مَنۡ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالۡیَوۡمِ الۡاٰخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهُمۡ اَجۡرُهُمۡ عِنۡدَ رَبِّهِمۡ ۚ وَلَا خَوۡفٌ عَلَیۡهِمۡ وَلَا هُمۡ یَحۡزَنُوۡنَ ﴿۶۲﴾﴾ اس پر بڑا ہنگامہ ہوا، اور غلام احمد پرویز صاحب نے طلوعِ اسلام کے ذریعے اس کو خوب اچھالا۔ چونکہ مولانا نے اس آیت کا لفظ بہ لفظ ترجمہ کر دیا تھا۔ بات صرف اتنی تھی کہ اگر مولانا آزاد اس کے حاشیہ میں یہ لکھ دیتے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے بعد ایمان کا مفہوم بالکل متعین ہو گیا ہے اور اب اس کا مفہوم یہ ہے کہ نجاتِ اُخروی کے لیے اب آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانا لازم، لابد اور ناگزیر ہے۔ قرآن میں اکثر جہاں بھی ایمان لانے کی دعوت ملے گی وہاں عموماً ایمان کی تفاصیل نہیں ملیں گی۔ 'اٰمِنُوۡا' میں ان تمام امور پر ایمان لانا ضروری ہوگا جن پر جگہ جگہ قرآن ایمان لانے کی مختلف اسالیب سے دعوت دیتا ہے، لہٰذا ایمان کی تعریف ہی یہ قرار پا گئی ہے کہ اللہ پر ایمان، اس کی توحید کے ساتھ، اس کی صفاتِ کمال پر ایمان، یومِ آخرت پر ایمان، جزا و سزا پر ایمان، جنت و دوزخ پر ایمان، فرشتوں پر ایمان، وحی پر ایمان، کتابوں پر ایمان، نبوت و رسالت پر ایمان اور اس پر ایمان کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آخری نبی اور آخری رسول ہیں، اور قیامت تک آپ ہی کی دعوتِ رسالت کا دَور جاری و ساری رہے گا —— میں ذاتی طور پر جانتا ہوں کہ مولانا آزاد ان تمام باتوں کو مانتے تھے۔ لوگوں نے مولانا سے پوچھا تو مولانا نے جواب دیا کہ میرا عقیدہ وہی ہے جو تمام مسلمانوں کا ہے اور وہ عقیدہ یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت اور قرآن کے نزول کے بعد اب نجاتِ اخروی کا دار و مدار صرف حضورؐ کا اتباع اور آپؐ کی اطاعت اور قرآن کی پیروی پر ہے۔ آپ سے پہلے کے رسولوں پر ایمان اور سابقہ کتبِ سماوی پر ایمان اور ان کے مطابق عمل سے اب نجاتِ اخروی نہیں ہوگی۔ پھر مولانا سے سوال کیا گیا کہ آپ نے یہاں یہ بات لکھی کیوں نہیں! تو مولانا نے جواب دیا کہ اس مقام پر آیت میں جو بات فرمائی گئی ہے میں نے اتنی بات پر ہی وہاں اکتفا کیا ہے، لیکن میں اس کو اس کے مناسب مقام پر مفصل طور پر بیان کروں گا، اور اس کی وضاحت کروں گا۔

آپ کے اسی شہر لاہور سے مولانا غلام رسول مہر اور ان کے ساتھ چند دوسرے حضرات مولانا آزاد سے جا کر ملے تھے، اور اسی مسئلہ پر ان سے سوالات کیے تھے۔ مولانا آزاد نے وہی جوابات دیے تھے جن کو میں بیان کر چکا ہوں۔ یہ سوالات و جوابات ''میرا عقیدہ'' کے نام سے اسی زمانے سے مطبوعہ موجود ہیں جس میں مولانا آزاد نے صاف لفظوں میں کہا ہے، میرا عقیدہ وہی ہے جو تمام مسلمانوں کا ہے۔

مولانا کا شاہکار ''تفسیر سورۃ الفاتحہ''

پھر مولانا آزاد نے سورۃ الفاتحہ کی جو تفسیر لکھی ہے وہ کس قدر اہم ہے۔ اس میں مولانا کی ادبیت اور اندازِ خطابت عروج پر ہے۔۔ بلاشبہ وہ مولانا آزاد کا شاہکار ہے۔ مولانا آزاد کا ذہن و فکر امام ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے شاگردِ رشید امام حافظ ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ سے شروع ہی سے بہت متاثر تھا۔ ان دونوں آئمہ سلف کے افکار کا مولانا آزاد کے دماغ پر بڑا غلبہ تھا۔ مولانا آزاد کا جو اپنا ذاتی عظیم الشان کتب خانہ تھا، میں نے وہ کتب خانہ خود دیکھا ہے، اس میں علامہ ابن تیمیہؒ اور علامہ ابن قیم کی تقریباً تمام تصانیف موجود تھیں۔ علامہ ابن تیمیہ نے سورۃ التین اور سورۃ العصر کی بڑی جامع اور بڑی عجیب و غریب تفسیر کی ہے۔ مولانا آزاد کے سامنے ان اکابر کے تمام اہم مباحث تھے جن سے مولانا کافی متاثر تھے۔ لہٰذا سورۃ الفاتحہ کی تفسیر میں مولانا آزاد نے اللہ کی ربوبیت، اس کی رحمت اور اس کی ہدایت پر جو بحثیں کی ہیں، اگر آپ علامہ ابن تیمیہؒ کی تفسیر محولہ بالا کو دیکھیں گے تو ان مباحث کا سر رشتہ آپ کو ان کے یہاں مل جائے گا، لیکن مولانا آزاد کا اپنا خاص اسلوبِ نگارش ہے جو دل کو موہ لیتا ہے، اور اس کے مطالعہ سے ذہن و قلب پر گہرے اثرات مرتب ہوتے ہیں۔

چند تاریخی تحقیقات

ا۔ ذوالقرنین کی شخصیت

علاوہ ازیں مولانا آزاد نے اپنے ترجمہ میں یہ خاص بات پیش نظر رکھی ہے کہ جو تاریخی اہم مباحث قرآن مجید میں وارد ہوئے ہیں، ان پر مولانا نے کافی تحقیق کے بعد بڑی تفصیل سے لکھا ہے۔ مثلاً ذوالقرنین کون تھے؟ ذوالقرنین کے متعلق ہمارے متقدمین نے یہ لکھا ہے کہ اس سے سکندر مقدونی مراد ہے حالانکہ قرآن کا معمولی طالب علم بھی بہ ادنیٰ تامل یہ جانتا

ہے کہ ذوالقرنین کے نام سے قرآن میں جس شخصیت کا ذکر کیا گیا ہے وہ ایک خدا آشنا اور
خدا ترس شخصیت تھی جب کہ سکندر مقدونی ان اوصاف سے صرف محروم ہی نہیں بلکہ ان کے
بالکل برعکس اوصاف کا حامل تھا۔مولانا آزاد نے اس مسئلہ پر بڑی دقیق تحقیق کی ہے اور بڑی
تفصیلی بحث کے بعد ثابت کیا ہے کہ ذوالقرنین سکندر مقدونی ہو ہی نہیں سکتا بلکہ وہ ایران کا
ایک نیک خصلت بادشاہ کیخسرو تھا۔مولانا آزاد کی اس تحقیق پر مولانا کے ہم عصر ایک صاحب علم
نے ایک مضمون لکھا اور اس پر کچھ شکوک وارد کر دیے۔محض شکوک وارد کرنے سے تو کام نہیں
بنتا۔سوال یہ ہے کہ اگر ذوالقرنین کیخسرو نہیں ہے تو آپ کے خیال میں وہ کون سی شخصیت تھی۔
اس کے لیے آپ کی تحقیق اور دلائل کیا ہے؟ وہ یہ کام تو کر نہ سکے البتہ شکوک وارد کر دیے
——غرضیکہ ذوالقرنین کے متعلق تحقیق مولانا آزاد کا بہت بڑا کارنامہ ہے ——

۲۔سورۃ الکہف کا ایک مقام اور اس کی تحقیق

اسی طرح قرآن مجید میں اصحابِ کہف کا ذکر آتا ہے تو وہاں دو چیزیں بہت اہم ہیں
ایک تو یہ کہ جس کہف کا قرآن میں ذکر ہے وہ کہاں پر واقع ہے! قرآن نے محض کہف کو کہف
کے طور پر بیان نہیں کیا بلکہ اس کی ایک خصوصیت بھی بتائی ہے کہ یہ کہف اس طرح واقع تھا کہ
وہاں دھوپ نہیں آتی تھی۔اس کی پوزیشن اس طور پر تھی۔دوسری یہ کہ وہاں رقیم کا لفظ آیا ہے۔
اب یہاں رقیم سے کیا مراد ہے' اس میں اختلاف ہے بعض اصحاب نے یہاں تک لکھ دیا کہ
اصحابِ کہف کے ساتھ جو کتا تھا اس کا نام رقیم تھا۔یہ کتنی لغو اور بے سروپا بات ہے۔اب یہ تحقیق
کرنا ہے کہ کہف کہاں تھا اور رقیم سے مراد کیا ہے! چونکہ مستشرقین قرآن مجید میں بیان کردہ ایسے
واقعات کے متعلق کہہ دیتے ہیں کہ سنی سنائی باتیں اور داستانیں پیغمبر اسلام نے قرآن مجید میں
درج کر دیں' ان کی تاریخی حقیقت کوئی نہیں ہے۔تو مولانا آزاد نے اس کا بڑا اہتمام کیا کہ قرآن
مجید میں تاریخی واقعات کے متعلق جو کچھ بھی آیا ہے' اسے اپنی تحقیق کے ذریعے مکمل طور پر ثابت
کریں تاکہ کسی کو یہ کہنے کا موقع نہ ہو کہ یہ محض ہوائی باتیں ہیں۔اس بنا پر مولانا آزاد نے کہف
کے متعلق بڑی تحقیق کی۔انہوں نے آثارِ قدیمہ کی بے شمار کتابوں کا مطالعہ کیا۔اور اپنا یہ نظریہ
قائم کیا کہ اردن میں عمان کے پاس جو پہاڑیاں ہیں' ان میں بے شمار کہف یعنی غار پائے جاتے
ہیں۔ان ہی میں ایک کہف (غار) ایسا ہے جو بالکل اسی کہف کا مصداق ہے جس کا قرآن
مجید میں تفصیل کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے۔پھر جہاں تک رقیم کا تعلق ہے تو مولانا نے اپنی تحقیق

کے نتیجہ میں لکھا ہے کہ فلاں زمانہ میں ایک پادری کو ایک ذریعہ سے ایک غار میں مٹکہ میں
رکھے ہوئے کچھ کاغذات ملے تھے۔مولانا نے ان کاغذات کی دستیابی کی پوری داستان لکھی
ہے' آپ اس کو پڑھیں۔مولانا آزاد کا کمال اصل میں یہ ہے کہ انہوں نے اپنی تحقیقات اس
وقت لکھی تھیں جب کہ کہف اور رقیم کے متعلق تحقیق کا کام مکمل نہیں ہوا تھا۔

اللہ کا شکر ہے کہ اب یہ تحقیقات مکمل ہو گئی ہیں جو مولانا آزاد کے نظریات کے مطابق
ہیں جو مولانا نے اپنی دقیق اور تحقیقی مطالعہ سے قائم کیے تھے۔چنانچہ اردن کے ایک بہت
بڑے فاضل ہیں جو ندوۃ العلماء کے جشن میں لکھنؤ تشریف لائے تھے۔پھر دہلی بھی آئے' مجھ
سے ملاقات میں انہوں نے بتایا کہ یہ تحقیق مکمل ہو گئی ہے کہ اردن میں عمان کی پہاڑیوں میں وہ
کہف موجود ہے جس کا قرآن میں ذکر ہے اور رقیم کا بھی پتا چل گیا ہے۔انہوں نے یہ بھی کہا
کہ انہوں نے اس موضوع پر تمام تحقیقاتی کام پر ایک کتاب بھی لکھی ہے جو شائع ہو چکی ہے۔
افسوس کہ وہ کتاب تاحال میرے مطالعہ میں نہیں آئی گو انہوں نے مجھ سے کتاب بھیجنے کا وعدہ
کیا تھا' لیکن شاید وہ بھول گئے' بہر حال مجھے اپنے چند احباب سے تصدیق حاصل ہو گئی کہ
کتاب شائع ہو چکی ہے ——

مولانا آزاد کا یہ تحقیقی کام وہ چیز ہے کہ جو انتہائی قابلِ ستایش ہے۔پھر صرف اس پہلو
ہی سے نہیں بلکہ اور بھی بے شمار پہلوؤں سے مولانا آزاد کی تفسیر ترجمان القرآن انتہائی قابلِ
قدر خصوصیات کی حامل ہے۔

ترجمان القرآن ——تیسری جلد کا حادثہ

مولانا آزاد کی اس تفسیر کے اب تک اٹھارہ پارے شائع ہوئے ہیں' بارہ پارے جو باقی
رہ گئے' ان کی داستان یہ ہے کہ بعض لوگ یہ کہتے ہیں اور میں بھی ان ہی کے اندر شامل ہوں کہ
مولانا آزاد نے بتلایا تھا کہ انہوں نے ان پاروں کی تفسیر مکمل کر دی ہے' میں نے یہ بات خود
اپنے کانوں سے سنی ہے۔لیکن وہ شائع نہیں ہوئی' اور اب تک یہ پتا بھی نہیں چل سکا کہ وہ کہاں
ہے۔مولانا آزاد کا ۲۲ رفروری ۱۹۵۸ء کو انتقال ہوا تھا اور یہ انتقال تین دن کے ''کومہ''
(بے ہوشی) کے بعد ہوا تھا۔مولانا کے یہ تین دن جو کوما میں گزرے تو ان میں ان کی کوٹھی میں
مختلف لوگ آتے جاتے رہے۔ان کے سامان وغیرہ کو ٹٹولتے اور دیکھتے رہے تو اندیشہ یہ ہے
کہ بعض لوگوں نے مولانا کے بہت سے مسودات کو غائب کر دیا' جن میں آخری بارہ پاروں کی

تفسیر بھی شامل تھی‘ چونکہ مولانا خود فرما چکے تھے کہ انہوں نے اس کی تکمیل کر لی ہے۔ واللہ اعلم!

بہر حال مولانا آزاد کی جو شخصیت ہے اور ان کے متعلق جو کچھ میں نے عرض کیا ہے‘ اس سے آپ بخوبی سمجھ سکتے ہیں کہ وہ ایک خاص مشن کے آدمی تھے۔ ان کی دعوت وہی تھی جس کی طرف ہمارے ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے اپنی دو تقریروں میں اشارات کیے ہیں۔ لیکن ایک تو وہ مسلمانوں سے مایوس ہو گئے‘ یعنی انہوں نے محسوس کیا کہ مسلمانوں میں اتنی سکت نہیں ہے کہ وہ میری تحریک کا ساتھ دیں اور اس کے ساتھ چلیں اور دوسری طرف انہوں نے یہ دیکھا کہ انگریز عالم اسلام کا سب سے بڑا دشمن ہے اگر اس کو ہندوستان کی حکومت سے بے دخل کر دیا جائے تو اس کی کیفیت پر کٹے پرندے کی ہو جائے گی ——— ممکن ہے کہ شیخ الہندؒ کے انتقال کے بعد ان میں تعاون سے محرومی کا بھی احساس پیدا ہوا ہو‘ جس کی علمائے دیوبند کی اکثریت سے ان کو توقع ہو سکتی تھی ——— اس لیے انہوں نے استخلاصِ وطن کی جدوجہد کو اپنی جولان گاہ بنایا ہو ——— واللہ اعلم۔

البتہ یہ بات کہ مولانا آزاد کے پیش نظر آغاز میں تجدید دین اور احیائے اسلام ہی کا کام تھا جس کے لیے قرآن مجید ہی کو انہوں نے اپنی دعوت کا مرکز و محور بنایا تھا۔ جس کا تذکرہ ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے اپنی تقریر میں کیا ہے۔ اس میں کسی قسم کے شک وشبہ کی گنجائش نہیں ہے۔ اس مسئلہ پر دو آراء ممکن ہی نہیں ہیں۔ رہی یہ بات کہ جمعیت العلماء ہند نے جمعیت کے اجلاس میں مولانا آزاد سے اختلاف کیا‘ جس کی طرف ہمارے ڈاکٹر صاحب نے اشارہ کیا ہے‘ تو میں خود تو اس اجلاس میں موجود نہیں تھا۔ لیکن میں نے جو کچھ اپنے دوستوں اور بزرگوں سے سنا ہے وہ یہ ہے کہ اس میں کوئی شک وشبہ نہیں کہ جمعیت العلماء کا ایک جلسہ دہلی میں ۱۹۲۰ء میں ہوا تھا جس میں اس بات کی تجویز زیر غور آئی تھی کہ مولانا آزاد کو امام الہند بنا دیا جائے اور اس جلسہ میں مولانا نے بڑی پر جوش تقریر کی۔ تقریر اتنی پر جوش‘ ولولہ انگیز اور مدلل تھی کہ سب لوگ اس کے لیے تیار ہو گئے‘ لیکن ہمارے دیوبند کے اکابر میں سے مولانا شبیر احمد عثمانیؒ اور مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی مہتمم دارالعلوم دیوبند‘ دونوں اس تجویز کے حامی نہیں تھے غالباً ہمارے استاد حضرت مولانا انور شاہ کشمیری بھی ان کے ہم نوا تھے۔ میری معلومات کی حد تک ان کے حامی نہ ہونے کی وجوہ دو تھیں:

ایک تو یہ کہ ان اکابر کے نزدیک امام الہند ہونے کے لیے صرف علم وفن‘ خطابت اور تحریر اور ذہانت و فطانت اور طباعی کافی نہیں ہے‘ بلکہ تقویٰ اور طہارت بھی ہونی چاہیے۔ اس سے

کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ مولانا آزاد کا باوجود اپنے علم وفضل کے تقویٰ وطہارت میں وہ مقام نہیں تھا جو ہمارے علمائے دیوبند اور ہماری دوسری دینی درس گاہوں کے مشائخ کا تھا۔ صاف بات یہ ہے کہ مولانا آزاد کو اس بات کا احساس وادراک ہی نہیں تھا اگر ہوتا اور وہ سجادہ نشین ہو کر بیٹھ جاتے تو آپ دیکھتے کہ ان کے والد سے سوگنا زیادہ لوگ ان کے مرید ہو جاتے‘ چونکہ ان کے والد ماجد میں خطابت نہیں تھی‘ ادبیت نہیں تھی‘ خاص علمیت نہیں تھی‘ جب کہ اللہ نے مولانا آزاد کو اس سے خوب نوازا تھا لیکن انہوں نے اس راستے کو اختیار ہی نہیں کیا۔ پھر یہ کہ ان کا ظاہر و باطن یکساں تھا مثلاً وہ سگریٹ پیتے تھے تو یہ نہیں کہ چھپ کر پیئیں۔ سب کے سامنے پیتے تھے۔ ظاہر بات ہے کہ تقویٰ کے اعتبار سے مولانا کا کوئی خاص مقام نہیں تھا۔ لہٰذا ہمارے چند علماء نے ان کے امام الہند بنانے کی حمایت نہیں کی تو اس کی پہلی وجہ یہ تھی کہ اس کے لیے تقویٰ وطہارت کی بھی ضرورت ہے اور مولانا آزاد میں اس کی کمی تھی۔

دوسری بات یہ کہ علماء متردد تھے کہ ان حالات میں کیا واقعی امام الہند کا منصب قائم کرنا چاہیے! اس لیے کہ ان کے نزدیک امام وہ ہو سکتا ہے جس کے ہاتھ میں قوتِ تنفیذ ہو۔ یعنی محض زبانی بنا دینے سے تو کوئی امام نہیں ہو جاتا۔ ایسے شخص کو آپ اپنا رئیس‘ سردار کہہ سکتے ہیں۔ لیکن امام تو خلیفہ کے مترادف منصب ہے‘ اور جب تک قوت تنفیذ نہ ہو‘ کسی کو امام قرار دینا صحیح نہیں ہے۔ غلام ہندوستان میں اگر مولانا کو امام بنا دیا تو اس کا مقام وہی ہوگا جیسے ایک لیڈر کا ہوتا ہے لیکن اسلام میں امام کا جو مفہوم ہے وہ تو ادا نہیں ہوگا۔ لہٰذا مولانا کو امام الہند بنانے کی تجویز عملی صورت اختیار نہ کر سکی ——— مولانا معین الدین اجمیری کے متعلق جو بات سامنے آئی ہے اس کا مجھے علم نہیں ہے۔ لیکن اگر مولانا نے ایسی بات کہی بھی ہو تو کچھ زیادہ عجیب نہیں ہے‘ اس کی وجہ یہ ہے کہ مولانا معین الدین اجمیریؒ بہت بڑے منطقی اور فلسفی تھے۔ آپ جانتے ہیں کہ جو لوگ منطقی اور فلسفی ہوتے ہیں وہ بات کہنے میں زیادہ محتاط نہیں ہوتے۔ بسا اوقات وہ ایسی بات بھی کہہ جاتے ہیں جو ان کو کہنی نہیں چاہیے۔ اگر انہوں نے کوئی ایسی بات کہی ہو تو کوئی تعجب کی بات نہیں ہے۔

انسانی عظمت اور مخالفت کی کسوٹی

پھر ایک بات‘ اور وہ یہ کہ دنیا میں اگر کسی شخص کا کوئی مخالف نہیں ہے تو سمجھ لیجیے کہ وہ بڑا آدمی ہے ہی نہیں۔ کوئی شخص بڑا آدمی اس وقت بنتا ہے جب کچھ لوگ اس کے مخالف ہوں۔ یہ

تو لازمی بات ہے کہ بڑا آدمی وہی ہوتا ہے جو عام ڈگر سے ہٹ کر کوئی نئی راہ پیش کرتا ہے۔ وہ دیکھتا ہے کہ یہ راستہ جس پر لوگ اندھا دھند چلے جا رہے ہیں' اس میں آگے کتنے خطرات ہیں۔ وہ دیکھتا ہے کہ مستقبل میں کیا ہونے والا ہے' کیا پیش آنے والا ہے' کیسی آندھی آنے والی ہے۔ وہ ان کو دیکھ کر قوم کو خبردار کرتا ہے۔ ظاہر بات ہے کہ ایسے شخص کو ایک نئی راہ اختیار کرنی ہوگی' نیا اسلوب اپنانا ہوگا۔ اس وقت کے جو عوام ہوتے ہیں وہ اس کے متحمل نہیں ہوتے۔ اس لیے ان کے دلوں میں بیزاری پیدا ہوتی ہے لیکن جو لوگ زیادہ سمجھدار ہوتے ہیں وہ جانتے ہیں کہ یہ داعی کتنی دور کی بات کہہ رہا ہے۔ وہ اپنے مستقبل میں کیا دیکھ رہا ہے۔ وہ اس کے ساتھ ہو جاتے ہیں۔ اس طرح ایک قافلہ بننا شروع ہو جاتا ہے' اور وہ قافلہ ابتدا میں چھوٹا ہوتا ہے لیکن اگر استقامت سے دعوت کا کام جاری رکھا جائے اور مخالفتوں سے دل برداشتہ ہو کر ہمت نہ ہاری جائے اور اپنے موقف پر داعی ڈٹا رہے' اور اپنی دعوت پیش کرتا رہے' اور لوگوں کو تجربہ ہو کہ جس دعوت کو لے کر یہ لوگ اٹھے ہیں اس میں یہ مخلص ہیں اور یہ دعوتِ حقہ ہے تو اگر داعیوں میں استقلال اور ثابت قدمی ہو تو دعوت پھیلتی ہے' اور قافلہ بڑھتا جاتا ہے یہ عام قاعدہ ہے۔ تو حقیقت یہ ہے کہ مولانا آزاد نے جب یہ محسوس کیا کہ جو اصل دعوت ان کے پیش نظر ہے' اس کے لیے ابھی حالات سازگار نہیں ہیں تو انہوں نے دوسرا راستہ اختیار کیا۔ لیکن وہ بھی نہ صرف مسلمانانِ ہند کے مفاد میں تھا بلکہ پورے عالمِ اسلام کے مفاد میں بھی تھا۔ اس لیے کہ انگریز کے پنجۂ استیلاء میں تقریباً پورا عالم اسلام بالواسطہ یا بلا واسطہ گرفتار تھا۔ ہندوستان میں انگریز کی حکومت کے خاتمے کا مطلب یہ تھا کہ اس کی گرفت کمزور ہو جائے اور دوسرے مسلمان ممالک بھی اس کی سیاسی و عسکری غلامی سے نجات حاصل کر سکیں۔

ایک نکتۂ حکمت

مولانا آزاد کے نقادوں نے مولانا کے خلاف بہت کچھ لکھا ہے۔ اس ضمن میں اصولی بات میں عرض کروں گا۔ وہ یہ کہ قرآن مجید فرماتا ہے کہ ﴿إِنَّ الْحَسَنَاتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّئَاتِ﴾ ''نیکیاں برائیوں کو دور کر دیتی ہیں'' —— مجھے بتایا جائے کیا کوئی آدمی ایسا ہے جو سراپا نیکی ہو' سراپا تقویٰ وطہارت ہو' جس کے اندر اس کے منافی کوئی چیز نہ ہو۔ اگر یہ ہے تو قرآن نے جو کہا ہے کہ ﴿فَأَلْهَمَهَا فُجُورَهَا وَتَقْوَاهَا ﴿٨﴾﴾ (الشمس) تو اس کا کیا حل ہوگا! اس کے معنی تو یہ ہوئے کہ اس میں صرف تقویٰ پیدا کیا گیا ہے' فجور کا داعیہ پیدا نہیں کیا گیا۔ انسان کا کمال تو

یہ ہے کہ فجور کا میلان ہو لیکن انسان شعوری طور پر اس سے بچنے کی کوشش کرے۔ اس لیے نبی اکرم ﷺ نے وسوسۂ نفس پر کوئی قدغن نہیں لگائی۔ صحابہ کرامؓ نے کہا کہ حضورؐ ہمارے نفس میں گناہوں کا جذبہ پیدا ہوتا ہے تو حضور ﷺ نے فرمایا کہ ایسا ہونے پر کوئی مضائقہ نہیں۔ اس کے صدور سے بچنے کی کوشش کرو —— میں عرض کرتا ہوں کہ اگر گناہ کی طرف آپ کے دل میں رغبت بھی پیدا نہ ہو تو آپ انسان نہیں فرشتے ہیں۔ انسان کو فرشتوں پر جو فضیلت حاصل ہے وہ اسی وجہ سے ہے کہ فرشتے تو اختیار وارادہ رکھتے ہی نہیں۔ وہ تو مشین ہیں یا اس کے پرزے ہیں' لہٰذا ان کو جس کام پر لگا دیا گیا ہے وہ اس کام کو انجام دے رہے ہیں۔

اس کے برعکس انسان کے اندر ارادہ ہے۔ اس کو اختیار بخشا گیا ہے۔ اس کے نفس میں تقویٰ اور فجور الہام کیا گیا ہے۔ اس کے باوجود وہ صحیح راستہ پر چل رہا ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اس نے جہاد کیا۔ وہ کشمکش سے دوچار ہوا ہے۔ اس نے فجور کو چھوڑ کر تقویٰ کی روش اختیار کی ہے تو یقیناً اس کا مقام بہت بلند وارفع ہوگا۔

ایک شخص لکھ پتی اور کروڑ پتی ہے اور وہ کہتا ہے کہ میں نے کبھی شراب کو ہاتھ تک نہیں لگایا تو یقیناً وہ بہت زیادہ قابل تعریف ہے۔ لیکن ایک شخص جو نانِ شبینہ کا محتاج ہے وہ مونچھوں پر تاؤ دے کر کہتا ہے کہ میں نے کبھی شراب نہیں پی تو ٹھیک ہے کام بہت اچھا ہے لیکن وہ اتنا قابل تعریف نہیں ہے جتنا ایک مالدار شراب سے مجتنب سمجھا جائے گا۔ ایک شخص جو جوان ہے' تندرست اور بڑا خوبصورت ہے وہ یہ کہتا ہے کہ الحمدللہ میں نے آج تک کسی عورت کی طرف بری نگاہ سے نہیں دیکھا یقیناً یہ نوجوان نہایت قابل تعریف ہے' لیکن ایک نابینا یہ کہتا ہے کہ میں نے آج تک کسی عورت کو بری نگاہ سے نہیں دیکھا تو اس نے کون سا تیر مارا۔ تو زندگی کا یہ فلسفہ ہے۔

پس اس بنا پر ہمیں ہر بڑے شخص کو اس طرح نہیں دیکھنا چاہیے کہ گویا وہ فرشتہ ہے۔ یہ تو صرف رسولوں کا خاصّہ ہے کہ وہ بالکل معصوم ہوتے ہیں۔ پھر ہمارے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی خصوصیت ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے فیض صحبت نے ان کو اس مقام پر پہنچا دیا تھا کہ انہوں نے نفس کے بے قابو گھوڑے کے منہ پر لگام ڈال رکھی تھی' لہٰذا ہمیں ہر بڑے شخص کو سنجیدگی کے ساتھ اس نگاہ سے دیکھنا چاہیے کہ کسی بڑے شخص میں اچھی چیزوں کا تناسب کیا ہے! اگر ان کا غلبہ ہے تو ان کی چھوٹی چھوٹی لغزشوں کو نظر انداز کر دینا چاہیے۔

حاشا وکلّا اس کا مقصد یہ نہیں ہے کہ مولانا آزاد میں کسی نوع کا فجور تھا۔ معاملہ صرف اتنا ہے کہ

ہمارے صاحب دل اور صاحب حال علمائے کرام کے نزدیک تقویٰ کا جو معیار ہے' مولانا آزاد اس معیار پر پورے نہیں اترتے تھے' اور ان علمائے کرام کے نزدیک امام الہند کے منصب پر فائز شخصیات میں معیاری تقویٰ ضروری ہے۔ دوسرے یہ کہ ان کی رائے میں ''امام'' ایک ایسی دینی اصطلاح ہے کہ جس کے ہاتھ میں قوت تنفیذ ہونی ضروری ہے۔ اسی لیے جمعیت العلماء کے اجلاس میں مولانا آزاد کو باقاعدہ امام الہند قرار دینے کی تحریک کامیاب نہیں ہو سکی تھی۔

حرفِ آخر

حاصل گفتگو یہ ہے کہ مولانا ابوالکلام آزاد ہماری ملت اسلامیہ کے بڑے قابل قدر اور نابغۂ روزگار شخصیت تھے۔ انہوں نے برصغیر کے مسلمانوں کی جو خدمات انجام دی ہیں' وہ پورے عالم اسلام کے لیے بھی قابلِ قدر ہیں۔ لہٰذا ہمیں دعا کرنی چاہیے کہ اللہ تعالیٰ ان کو ان کے اعمالِ حسنہ کی جزا عطا فرمائے۔ ان کی لغزشوں کی مغفرت فرمائے اور انہیں جنت میں مقام علیین پر فائز فرمائے۔ آمین

واٰخر دعوانا ان الحمد للّٰہ رب العٰلمین o

(ماہنامہ حکمت قرآن' لاہور۔ اگست ۱۹۸۴ء)

نوٹ!

محترم ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہان پوری نے مولانا سعید احمد اکبر آبادی کی اس تقریر پر جن حواشی کا اضافہ کیا ہے' ان میں سے بعض تو نہایت قیمتی ہیں' لیکن بعض ان کے مخصوص ذہن اور فکر کی عکاسی کرتے ہیں' جنہیں نقل کرنے کی صورت میں لامحالہ راقم الحروف کو بھی وضاحت کرنی ہوگی۔ اس طوالت سے بچنے کے لیے حواشی شائع نہیں کیے جا رہے۔ دلچسپی رکھنے والے حضرات سے گزارش ہے کہ اُن کے لیے وہ ان کی شائع کردہ کتاب کی جانب رجوع کریں۔ (شائع کردہ: ادارۂ تصنیف و تحقیق پاکستان' کراچی۔ ۴۱) —— ویسے راقم کو یقین ہے کہ ڈاکٹر صاحب موصوف کی بہت سی غلط فہمیاں اس کتاب سے رفع ہو جائیں گی —— ان شاء اللہ العزیز —— اسرار احمد

ڈاکٹر اسرار احمد اور ان کی دینی خدمت

مولانا سعید احمد اکبر آبادی مدظلہ کی نگاہ میں

مولانا سعید احمد اکبر آبادی دامت فیوضہم برصغیر پاک و ہند کی نہایت مشہور و معروف دینی اور علمی شخصیت ہیں۔ موصوف کا تعارف محترم ڈاکٹر اسرار احمد مدظلہ کے خطاب جمعہ میں بھی موجود ہے جو اسی شمارے میں شامل ہے۔ ۱۹/ مارچ ۱۹۸۵ء کو راقم الحروف مولانا موصوف کی خدمت میں حاضر ہوا تھا۔ مولانا کا محاضرات میں شرکت کا پختہ ارادہ تھا لیکن علالت مانع رہی۔ راقم کی درخواست پر موصوف نے اپنے ارشادات ریکارڈ کرا دیے نیز از راہِ کرم سوالات کے جوابات بھی عنایت فرمائے۔ یہ دونوں چیزیں قریباً لفظ بلفظ کیسٹ سے منتقل کر کے پیش خدمت ہیں۔ جمیل الرحمٰن

بسم اللہ الرحمن الرَّحیم

ڈاکٹر صاحب کا کتابچہ یعنی میرے تصور فرائض دینی کا خلاصہ مجھے دیا گیا اسے میں نے بڑی توجہ سے پڑھا ہے اور یہی نہیں بلکہ اس کے علاوہ ڈاکٹر صاحب کی تمام تحریریں جو میثاق میں نکلتی رہی ہیں یا جو انہوں نے اپنی کتابوں میں لکھی ہیں وہ بھی میری نظر سے گزری ہیں۔ ان سب کو پڑھنے کے بعد میرا مجموعی تاثر یہ ہے کہ ہمارے ہاں عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ جب کبھی کوئی شخص ایک تحریک شروع کرتا ہے تو اس کا نقطۂ آغاز یہ ہوتا ہے کہ جو کام کرنے میں جا رہا ہوں اس وقت تک کسی نے نہیں کیا اور اس رویے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بجائے اس بات کے کہ وہ اپنے پیش رو اور اپنے اسلاف کے کارناموں کی تعریف و تحسین کرے اور ان کی ستائش کرے اور ان کی روشنی میں وہ یہ بتلائے کہ اس نے اپنے لیے یہ راہِ عمل متعین کی ہے' اس کی بجائے وہ تنقید کرتا ہے اور اپنے لیے یہ ثابت کرنا چاہتا ہے کہ جو کام اب تک امت میں نہیں ہوا تھا وہ کرنے جا رہا ہے۔ یہ ایک عام روش ہے' ان حضرات کی جو کہ تحریکِ اسلامی کے بانی ہیں اور اس کی ایک نہیں کئی ایک مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں۔ لیکن ڈاکٹر صاحب کی خصوصیت یہ ہے کہ انہوں نے جب کہ وہ ایک ڈاکٹر تھے اور ان کا 'career' میڈیکل پریکٹیشنز کا تھا اور اس میں وہ

بہت کامیاب تھے لیکن جب انہوں نے یہ فیصلہ کیا کہ انہیں اپنے آپ کو دین اور اسلام کی خدمت کے لیے اپنے خاص نظریے کے ماتحت جو انہوں نے مطالعۂ قرآن سے اخذ کیا ہے' وقف کر دینا ہے تو انہوں نے باقاعدہ علومِ اسلامیہ کی تحصیل کی اور بڑے غور وفکر اور دقتِ نظر سے اپنا لائحہ عمل طے کیا۔ پھر تاریخ اسلام میں جو تحریکیں پیدا ہوئی ہیں ان کا انہوں نے بنظرِ غور مطالعہ کیا اور اس کے بعد پھر جب انہوں نے کام شروع کیا تو نہایت ہی عاجزی اور انکساری کے ساتھ کیا۔ اس میں کوئی تعلّی نہیں ہے' اس میں کوئی انانیت نہیں ہے' اس میں اپنی بالا خانی نہیں ہے —— تو یہ ایک خاص چیز ہے جس نے مجھے ڈاکٹر صاحب کے متعلق بہت ہی متاثر کیا۔ ڈاکٹر صاحب جو کچھ بھی فرماتے ہیں اور لکھتے ہیں وہ کھلے دل سے لکھتے ہیں اور لوگوں کو پھر دعوت دیتے ہیں کہ اس پر اپنے خیالات کا اظہار کریں۔ جو لوگ ان کے معترضین ہوتے ہیں ان کا وہ بڑی خوش دلی کے ساتھ بغیر کسی بیزاری کے اور ناگواری کے جواب دیتے ہیں اور ان کو مطمئن کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں میں یہ عرض کروں کہ مولانا اخلاق حسین قاسمی صاحب اور ڈاکٹر صاحب کی جو خط و کتابت ہوئی ہے اس میں ڈاکٹر صاحب کی زبان سے ایک تقریر میں یہ لفظ نکل گیا تھا کہ میں نیم مقلّد ہوں' مولانا اخلاق حسین صاحب کو ناگوار گزرا اور انہوں نے اس پر اعتراض کیا۔ لیکن میرا اپنا خیال یہ ہے کہ اگر ڈاکٹر صاحب نیم مقلد نہ کہتے بلکہ یہ کہتے کہ میرا تقلید کے معاملے میں وہی رویہ ہے جو حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کا تھا اور جو شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کا تھا تو بات نہ بگڑتی' وہ محض نیم مقلّد کے معنی کچھ سے کچھ سمجھے۔ چونکہ حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ اپنے آپ کو حنفی لکھتے ہیں' لیکن اس کے باوجود انہوں نے لکھا ہے اور وہ یہ کہتے ہیں کہ میرا مسلک جو ہے وہ تلفیق بین المذاہب ہے۔ یعنی میں ہوں حنفی لیکن اگر میں کہیں دیکھتا ہوں کہ امام شافعیؒ کا مذہب قابل ترجیح ہے تو میں اس کو اختیار کر لیتا ہوں۔ چنانچہ حضرت شاہ صاحب کی کتابوں میں اس کی ایک نہیں دسیوں مثالیں ملیں گی۔ تو صرف ایک تعبیر کی وجہ سے بات کچھ سے کچھ ہو گئی ورنہ ڈاکٹر صاحب اگر یہ کہہ دیتے تو میرے نزدیک بالکل درست تھا۔ بہر حال یہ بات اپنی جگہ صحیح ہے کہ ڈاکٹر صاحب میں بڑی عاجزی اور انکساری ہے' خلوص اور للّٰہیت ہے' اپنے بزرگوں کا احترام ہے۔ وہ یہ بتلاتے ہیں کہ جو کام میں کرنے جا رہا ہوں وہ ہمارے بزرگ برابر کرتے رہے' لیکن زمانے کے حالات کے زیر اثر بعض ایسی چیزیں پیش آئیں کہ وہ اپنے راستے سے ہٹ کر ایک دوسری طرف لگ گئے تو یہ ایک الگ چیز تھی اور یہ حقیقت بھی ہے کہ وہ چیزیں جاری نہیں رہ سکیں۔ اب ڈاکٹر صاحب نے ؏ ''من از سرِ نو جلوہ دہم دار ورسن

را!'' کے مصداق —— اسی کام کو آگے بڑھانا شروع کیا ہے اور اس کے لیے مستقل ایک تنظیم انہوں نے قائم کی ہے۔ تنظیم کے سلسلے میں یہ عرض کرنا ہے کہ یہ ایک بڑی اہم بات ہے کہ اس میں انہوں نے تنظیم کے مقاصد میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو بہت اہم درجہ دیا ہے۔ میرا اپنا ذاتی خیال یہ ہے کہ تبلیغ اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ان دونوں کے درمیان عام و خاص کی نسبت ہے۔ یعنی جہاں کہیں بھی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر پایا جائے گا وہاں تبلیغ ضرور ہو گی' لیکن جہاں تبلیغ ہو وہاں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا ہونا ضروری نہیں ہے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ کتنے ہمارے مبلغین ہیں' کتنے عمائدین تبلیغ ہیں جو تبلیغ کرتے ہیں' لیکن ان کے سامنے منکرات منہیات ہوتے رہتے ہیں اس کے لیے وہ کچھ بھی نہیں کرتے اور کچھ نہیں کہتے۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ امر بالمعروف کے ساتھ نہی عن المنکر کا بھی قرآن نے حکم دیا ہے اور حدیث شریف میں تو سب سے زیادہ زور نہی عن المنکر پر ملتا ہے اور یہی وہ چیز ہے جس کی وجہ سے قرآن نے اس امّت کو خیرِ اُمم کہا ہے: ﴿كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَ تَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ﴾ اور اسی طرح فرمایا: ﴿وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا﴾ تو اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ جو نسبت ہمارے رسول کو ہمارے ساتھ ہے وہی نسبت ہم کو دنیا کی تمام قوموں کے ساتھ ہے یعنی جو حضورؐ کا فریضہ تھا جس طرح سے کہ آپؐ نے دینِ حق ہم تک پہنچایا اور ہم کو ایک قوم بنایا اب ہمارا فرض ہے کہ اُسی کو لے کر ہم آگے چلیں اور اُسے دوسروں تک پہنچا دیں۔ تو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر یہ بہت ہی اہم چیز ہے جسے قرآن کریم میں بہت اہم کام قرار دیا گیا ہے۔ محض تبلیغ اس کے لیے کافی نہیں ہے' بلکہ اس کے لیے مستقل ایک تنظیم ہونی چاہیے اور مجھے نہایت افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ ہماری پوری تاریخ اسلام میں قرونِ اولیٰ کے اندر تو اس کا کچھ نشان ملتا ہے کہ وہاں امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے لیے کچھ ادارے تھے لیکن اس کے بعد کہیں نظر نہیں آتے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تبلیغ بھی ہوتی رہی' درسِ قرآن بھی ہوتا رہا' درس حدیث بھی ہوتا رہا' علماء بھی پیدا ہوتے رہے لیکن سماج برابر بگڑتا رہا۔ اسلامی سماج میں جو خرابیاں پیدا ہونی شروع ہوئیں وہ برابر پھیلتی رہیں اور یہاں تک کہ اس بگاڑ کا نتیجہ آج ہم دیکھ رہے ہیں۔ اس کی بڑی وجہ اصل میں یہی ہے کہ ہم نے امر بالمعروف بالخصوص نہی عن المنکر جیسی چیز کو چھوڑ دیا ہے۔ لہٰذا امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو ایک اساسی اور بنیادی حیثیت سے اپنے پروگرام میں شامل کرنے کی بنا پر میں سمجھتا ہوں کہ یہ وہ چیز ہے جو

اصل میں خود قرآن کا مطلوب اور مقصود ہے —— اللہ تعالیٰ یہ جانتا ہے کہ یہ کام تمام مسلمان تو نہیں کر سکتے حالانکہ ہے تو سبھی کا فریضہ۔ اس بنا پر اس کو فرضِ کفایہ بنایا ہے۔ فرض کفایہ کے معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ﴾ —— یعنی تم سب تو نہیں کر سکتے اپنی اپنی جگہ پر تو ہر ایک کو کرنا ہے: ((كُلُّكُمْ رَاعٍ وَكُلُّكُمْ مَسْئُوْلٌ عَنْ رَعِيَّتِهٖ)) —— یعنی تم میں سے ہر شخص راعی ہے اور اپنی رعیت کے متعلق اس سے سوال کیا جائے گا۔ باپ اپنی اولاد کے اوپر ہے' استاد اپنے شاگردوں کے اوپر ہے۔ یوں تو اپنی انفرادی زندگی میں ہر مسلمان راعی ہے ہی لیکن قرآن مجید وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ بھی کہتا ہے' اُس کے معنی یہ ہیں کہ ایک ایسی 'Organization' ہونی چاہیے' مستقل طور پر ایک ایسی جماعت ہونی چاہیے جو اپنے آپ کو وقف کر دے اس کے لیے۔ اور اس کا کام کیا ہوگا! امر بالمعروف ونہی عن المنکر۔ تو گویا یہ جو خود قرآن کے نزدیک بڑی اہم اور بنیادی چیز ہے ڈاکٹر صاحب نے اس کو اپنی تنظیم میں شامل کر کے ایک اتنا بڑا اہم اقدام کیا ہے جو کہ میرے خیال میں اب تک بہت کم لوگوں کے لیے قابل توجہ رہا ہے اور اس بنا پر میں سمجھتا ہوں کہ ہر مسلمان کا یہ فرض ہے کہ ڈاکٹر صاحب کی اس میں اعانت کرے قدمے' دامے درمے جس طرح سے بھی ہو اور مجھے توقع ہے کہ یقیناً ان شاء اللہ تعالیٰ یہ ادارہ بہت ہی اہم اور مفید اور اسلام اور دین کے لیے بہت ہی زیادہ نفع بخش ثابت ہوگا۔

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ○○

سوال و جواب

سوال: مولانا میں سب سے پہلے تو آپ کی خدمت میں ہدیۂ تشکر پیش کرتا ہوں کہ آپ نے اپنے قیمتی خیالات سے مستفید فرمایا۔ ہماری خواہش تو یہ تھی کہ آپ بذاتِ خود بنفس نفیس محاضرات میں شرکت فرماتے' لیکن آپ کی علالت کی وجہ سے یہ ممکن نہیں رہا مگر ہمارے لیے یہ بہت بڑی سعادت ہے کہ آپ کے خیالات اس طرح سے ٹیپ ہو گئے ہیں۔ چند چیزیں ایسی ہیں کہ جن کے بارے میں میں آپ کی رہنمائی کا طالب ہوں۔ ایک چیز تو اشارۃً آپ کی اس گفتگو میں آ گئی ہے کہ امت کے برپا کرنے کے مقاصد میں اہم ترین مقصد امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہے گویا پوری اُمت کے سپرد یہ کام کیا گیا ہے اور امت بحیثیت امت جب اس

کام سے غافل ہو جائے تو خود ہی قرآن رہنمائی فرماتا ہے کہ: ﴿وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ﴾ تو اس سے یہ بات معلوم ہو رہی ہے کہ ایک گروہ تو ایسا ہونا قرآن کے نزدیک ضروری ہے' لازم ہے کہ جو اسی فریضے یعنی دعوت الی الخیر کو انجام دے۔ اس دعوت الی الخیر میں جملہ ایمانیات کی دعوت' اعمال صالحہ کی دعوت' تواصی بالحق کی دعوت' تواصی بالصبر کی دعوت سب شامل ہو ہی جاتی ہے۔ پھر اس جماعت کا اہم کام امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں حصر کے اسلوب میں فرمایا ہے: ﴿اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ﴾ "یہی لوگ ہیں کہ جو کامیاب ہوں گے"۔ میں نے جہاں تک سمجھا ہے وہ یہ ہے کہ یہ لوگ دنیا میں بھی کامیاب ہوں گے اور آخرت میں تو ان شاء اللہ کامیابی اور اللہ کی رحمت ان کے شامل حال ہوگی اور اللہ کی رحمت کے سائے میں وہ ان شاء اللہ جگہ پائیں گے۔ لیکن ہمارے ہاں بعض حضرات جماعت سازی کو صحیح نہیں سمجھتے اور اس کی وجہ بھی ہے کہ کچھ تلخ تجربات ایسے ہیں کہ جو جماعتیں کسی اچھے کام کے لیے بنتی ہیں وہ آگے جا کر کوئی نہ کوئی ایسی صورت اختیار کر لیتی ہیں کہ جو امت میں تفرقے کا باعث ہوتی ہے۔ تاریخ بتاتی ہے کہ یہ امکان موجود رہتا ہے' لیکن ظاہر بات ہے کہ جب ہم کوئی کام اور خاص طور پر دین کا کام کرنے کے لیے اٹھیں گے تو کوئی نہ کوئی ہیئت اجتماعیہ ہمیں بنانی پڑے گی۔ اب سڑک پر حادثات ہوتے ہیں تو لوگ حادثات کی وجہ سے سڑک پر چلنا تو نہیں چھوڑ دیتے۔ انسان کی نیت اگر اللہ کی رضا کا حصول ہے اور وہ یہ کام خلوص کے ساتھ کر رہا ہے تو بہر حال جو لوگ اخلاص کے ساتھ کام کریں گے وہ تو ان شاء اللہ' اللہ کے ہاں ماجور ہوں گے۔ اب ایک امکان اور اندیشے کی وجہ سے ایسی جماعتوں کے متعلق تشویش میں مبتلا ہو جانا کیا آپ کے نزدیک صحیح ہوگا؟

جواب: میرے نزدیک تو لوگ جماعت کے بنانے سے غالباً اس لیے ڈرتے ہیں کہ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ عام طور پر تجربہ یہ رہا ہے کہ جو جماعت بنتی ہے وہ آگے جا کر تحزب کے اندر مبتلا ہو جاتی ہے۔ تحزب کے معنی یہ ہیں کہ ہم چوں ما دیگرے نیست۔ لیکن یہ ضروری ہے' وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ کا صاف مطلب یہ ہے کہ جماعت تو ہونی چاہیے یقیناً ہونی چاہیے لیکن اب جو جماعت ہے ہم کو یہ دیکھنا ہے کہ کیا اس سے تحزب کا خطرہ ہے! کیا وہ اپنے اندر کوئی ایسی انانیت پیدا کرے گی کہ وہ یہ کہے گی کہ راہِ حق پر بس ہم ہی ہیں دوسرے اس پر نہیں ہیں تو مجھ کو اس بات کا یقین ہے کہ ہمارے ڈاکٹر صاحب قبلہ جس طرح تنظیم اسلامی کا کام لے کر چل رہے ہیں اور جو خود

ان کی اپنی فطرت ہے‘ جوخودان کی افتادِطبع ہے‘ جوخودان کا مزاج اوران کی طبیعت ہے وہ ہم کو اس بات کا یقین دلاتی ہے کہ ان شاءاللہ تعالیٰ یہ جماعت تحزب سے الگ تھلگ رہے گی اور اپنا کام برابراسی طرح پر کرتی رہے گی۔ پھر میرے خیال میں جماعت تو ہونا ضروری ہے۔ یہ یقینی بات ہے کہ بغیر 'organization' کے کام نہیں ہوگا۔'organization' تو ضروری ہے‘ لازمی ہے لیکن 'organization' سے جولوگ عام طور پر کچھ مشتبہ ہوتے ہیں وہ اس وجہ سے ہوتے ہیں اوراگر اس کا ان کو اطمینان ہوجائے کہ نہیں یہ جماعت مخلصوں کی جماعت ہے‘ یہ جماعت مؤمنینِ قانتین کی جماعت ہے‘ یہ جماعت ان لوگوں کی ہے جن کے اندر کسی قسم کا کوئی تحزب نہیں ہے اور جس کو کہ قرآن نے خود 'condemn' کیا ہے اور فرمادیا ہے: ﴿كُلُّ حِزْبٍۢ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُوْنَ﴾ یہ بات واضح ہے کہ جوشخص خودقرآن کی تعلیمات کو اس طرح پر عام کررہا ہو وہ اس سے بےخبر نہیں ہوسکتا ہے کہ تحزب سے بچنا بہت ضروری ہے اور اب تک جوکچھ بھی ڈاکٹر صاحب نے لکھا ہے اس سے ہرگز بھی یہ بو پیدا نہیں ہوتی کہ کہیں جا کر کے ان کی تنظیم تحزب کا شکار ہوجائے گی۔

سوال:اس میں کوئی شبہ نہیں کہ الحمدللہ ڈاکٹر صاحب کو اللہ نے یہ توفیق عطا فرمائی ہے کہ انہوں نے جب تنظیم کے قیام کا فیصلہ کیا تو بہت واضح طور پر اس بات کا اعلان کردیا کہ ہرگز‘ ہرگز ہماری جماعت‘ الجماعۃ کے حکم میں نہیں ہے۔ الجماعۃ تو یہ پوری امت ہے اور ہماری جماعت میں شامل ہونا اسلام میں شامل ہونا نہیں ہے بلکہ اسلام کے عائد کردہ فرائض کو اجتماعی طور پر ادا کرنے کے لیے ہم جمع ہورہے ہیں۔اسی طرح اگر کسی کو مجھ پر‘ میری جماعت اور تنظیم پر اعتماد نہ رہے تو اس کا علیحدہ ہوجانا ہرگز ہرگز اسلام سے باہر نکلنا نہیں ہے۔تو یہ وضاحتیں ڈاکٹر صاحب نے ایک بار نہیں کئی بار کی ہیں اور ہماری مطبوعات میں موجود ہیں۔اسی طرح تنظیم کے رفقا کو ان کی ہدایت ہے کہ جو جس مسلک پر ہے اس پر وہ شرح صدر کے ساتھ عمل کرے تو ان وضاحتوں کے بارے میں آپ کی رائے کیا ہے؟

جواب: یہی وہ چیزیں ہیں جو اس بات کی ضمانت ہیں کہ یہ جماعت ان شاءاللہ تعالیٰ اس سے (مراد ہے تحزب) بالکل محفوظ رہے گی۔

سوال: مولانا ایک اور مسئلہ ہے جس میں رہنمائی مطلوب ہے کہ عام طور پر ہمارے ہاں یا تو ادارے اور انجمنیں ہیں‘ جو 'Associations' کی طرز پر محدود کام کررہے ہیں۔کوئی تعلیمی

کام کررہا ہے اور کوئی تحقیقی کام کررہا ہے لیکن اگر کوئی انقلابی کام پیش نظر ہو جس میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر سرفہرست ہو تو ظاہر بات ہے کہ اس کے لیے تو جماعت بنے گی تو اس کی جماعتی ہیئت کے لیے ایک طریقہ تو وہ ہے جو ہم نے مغرب سے اخذ کیا ہے‘ یعنی اس کے کچھ ممبرز ہوں پھر وہ ووٹوں سے اپنا کوئی سربراہ یا صدر منتخب کریں۔ ہم جب تاریخ پر نگاہ ڈالتے ہیں تو ہمیں اس طرز کی کوئی دینی تنظیم سلف میں نظر نہیں آتی بلکہ ہمیں یہ نظر آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے کسی بندے میں کوئی داعیہ پیدا کرتا ہے‘ وہ اٹھتا ہے اور لوگوں کو بلاتا ہے کہ میں اس کام کے لیے اٹھا ہوں۔ جیسے کہ سید احمد شہید بریلوی ؒ کھڑے ہوئے انہوں نے دعوتِ جہاد دی‘ جن لوگوں نے بیعت کی وہ ان کی جماعت میں شامل ہوگئے۔تو ہمیں سلف سے یہی ملتا ہے کہ اس طرز پر وہ جماعت قائم ہوئی ہے جو خالص اسلام کے لیے بن رہی ہو۔انتخابی اور صدارتی طرز کی تنظیم ہمیں سلف میں نظر نہیں آتی۔کیا آپ اتفاق فرمائیں گے کہ ایسی تنظیم جو اعلاءِ کلمۃ اللہ یا امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے لیے بنے وہ بیعت کی بنیاد پر بنے؟

جواب: جی ہاں‘ جماعت کے جو معنی ہیں یعنی جو جماعت ہم بنائیں گے یقیناً اس کا ایک امیر جماعت ہوگا اور امیر جماعت پر اعتماد کر کے آپ کو اپنا کام کرنا ہوگا تو ویسے اعتماد کی شکل کیا ہے! اعتماد کی شکل یہی ہے کہ بیعت کی جائے اور میرے خیال میں تو ہر امیر کو اس بات کا حق حاصل ہے۔امر کے معنی یہ ہیں کہ وہ جو اس معاملے میں رہنمائی کررہا ہے وہ سب کے لیے قابل قبول ہے تو اس بنا پر تو میرے نزدیک اس میں کوئی خرابی نہیں ہے بلکہ یہ تو لازمی ہوجاتا ہے۔

سوال: مولانا جزاک اللہ۔آپ نے یہ مسئلہ صاف کردیا‘ اب ایک مسئلہ یہ ہے کہ بعض ہمارے اہل علم اس بات پر اشکال پیدا کرتے ہیں کہ بیعت صرف خلافت کے لیے ہوسکتی ہے یا پھر جو بیعت رائج ہے وہ صرف بیعت ارشاد ہے‘ وہ لی جاسکتی ہے۔ بیعت سمع وطاعت لینے کا کسی کو حق حاصل نہیں ہے‘ جبکہ ڈاکٹر صاحب کا موقف یہ ہے کہ ہم نے قرآن کا اور اسلام کا اور سیرت مطہرہ کا اور پوری تاریخ کا جو مطالعہ کیا ہے اور معروضی مطالعہ کیا ہے تو یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ ایک بیعت تو وہ ہے کہ جب اسلامی نظام قائم ہو تو خلیفہ اپنی ذات میں کیسا ہی کیوں نہ ہو لیکن اگر شریعت کے مطابق عدالتیں قائم ہیں‘ شریعت کا نفاذ ہے‘ اسی کے مطابق انفرادی و اجتماعی معاملات چل رہے ہیں تو اس وقت تو صحیح ہے کہ سربراہ کی بیعت ہوگی اور اس کے درمیان میں کوئی شخص بھی اپنی بیعتِ سمع وطاعت لینے کے لیے کھڑا ہوگا تو وہ خروج کی تعریف میں آجائے گا‘ اِلَّا یہ کہ وہ شرائط جو فقہاء نے عائد کی ہیں وہ پوری ہورہی ہوں جو بہت مشکل

ہے۔لیکن جب خلافت کا ادارہ بالکل درہم برہم ہو جائے اور کسی ملک میں بھی اسلامی نظام اور اسلامی حکومت اور شریعت کا نفاذ معمولی شکل میں بھی نظر نہ آئے تو اس وقت اس ملک کے اندر پُرامن طریقے سے اگر اسلامی نظام کو قائم کرنے کے لیے کوئی شخص بیعتِ سمع وطاعت لیتا ہے تو آیا اس پر اُن احادیث کا اطلاق ہوتا ہے؟ میرے ناقص مطالعے کے مطابق تو ان کا اطلاق صرف اس وقت ہوتا ہے جب کہ خلافت کا ادارہ اور اسلامی نظام کا ادارہ بالفعل قوتِ نافذہ کے ساتھ اس ملک میں نافذ و رائج ہو۔اس سلسلے میں کچھ رہنمائی فرمائیں۔

جواب: بات یہ ہے کہ بیعت کے تو معنی یہ ہیں کہ ہم نے ایک شخص کو اپنا امیر بنا لیا ہے' وہ ہمارا سربراہ ہے اس معاملے میں اور اس کے لیے جو کچھ بھی وہ ہم سے کہے گا قرآن وسنت کی روشنی میں تو ہم اُس کی بات مانیں گے۔ دیکھئے یہ تو ایسا ہے کہ خلیفہ سے بیعت ہو رہی ہے لیکن جناب عالی قرآن مجید[۱] نے کہا کہ لَا طَاعَةَ اِلَّا فِی مَعْرُوْفٍ ——— کیسی ہی آپ نے بیعت کر لی ہو' لیکن اگر وہ کوئی ایسی بات کہہ رہا ہے جو کہ معروف کے خلاف ہے تو مت کرو۔صاف طور پر بالکل کھلی بات ہے۔اچھا' ویسے مجھے معلوم ہے کہ ایک مرتبہ پنجاب میں مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری کو امیر شریعت بنایا گیا تھا اور کسی اور نے نہیں بلکہ خود میرے استاد محترم حضرت مولانا انور شاہ صاحب نے ان کے ہاتھ پر بیعت کی تھی' حالانکہ ہم لوگوں کو تعجب بھی ہوا کہ شاہ صاحب عطاء اللہ شاہ کے ہاتھ پر بیعت کر رہے ہیں' لیکن شاہ صاحب نے ان کو مانا۔گویا کوئی بھی تنظیمی کام اس کے بغیر چل ہی نہیں سکتا ہے۔طاعت کے بغیر چل ہی نہیں سکتا ہے۔فوج بھی جو ہوتی ہے اس کا ایک کمانڈر انچیف ہوتا ہے اس کے ماتحت ہوتی ہے اور وہ واجب الاطاعت ہوتا ہے۔تو بیعت ایک اصطلاحی لفظ ہے۔بیعت کے معنی بالکل یہ نہیں ہیں کہ ہر بات مانی جائے گی' بلکہ مجھے اس کا افسوس ہوتا ہے کہ تصوف میں جا کر بیعت کے معنی بالکل بگڑ گئے۔یعنی ایک وقت وہ تھا جب بیعت کا مفہوم یہ تھا کہ ہم آپ کے ہاتھ پر بیعت کرتے ہیں اور آپ ہمارے مرشد ہیں ہمارے رہنما ہیں لیکن اس میں آگے بڑھ کر اتنا غلو کیا گیا کہ مرشد کے حکم کے برخلاف اگر اسلام کا کوئی حکم ہے تو لوگوں نے اس کی پرواہ نہیں کی (الا ماشاء اللہ) حالانکہ یہ چیز بالکل غلط ہے۔وہ تو حضرت عمرؓ تک نے فرمایا کہ دیکھو تم نے اگر میرے ہاتھ پر بیعت کی ہے' لیکن اگر میں غلطی

(۱) راقم کا خیال ہے کہ یہاں مولانا حدیث شریف فرمانا چاہتے تھے لیکن لغزشِ زبان کے باعث قرآن مجید کا لفظ ادا ہو گیا۔(ج ر)

کروں تو فوراً تم مجھے مطلع کر دینا اور ایسے دسیوں بیسیوں واقعات ہیں۔وہ تو جب حضور ﷺ نے فرما دیا کہ خواہ کتنا ہی بڑا تمہارا کوئی امام ہو اگر معروف کے خلاف وہ تم کو کوئی حکم دے رہا ہے تو اس کی اطاعت تمہارے اوپر ضروری نہیں ہے بالکل ''لا طاعة'' اس کی اطاعت کرنی ہی نہیں ہے۔ایک طرف اسلام' جو بیعت کرنے والے ہیں ان کو آزادی دیتا ہے کہ تم خود اس کو دیکھتے رہو امیر کو اور دوسری طرف یہ کہ قرآن اور سنت کی تعلیمات کے دائرے کے اندر رہ کر جو امر بالمعروف کر رہا ہے یا نہی عن المنکر کر رہا ہے اس کی اطاعت تمہارے اوپر ضروری ہو گی یہ دونوں چیزیں اگر ہوں تو اس کے اندر کوئی حرج نہیں ہے۔بلکہ میں تو سمجھتا ہوں کہ کوئی تنظیم اس کے بغیر چل ہی نہیں سکتی جب تک کہ ایک شخص کے اوپر آپ مکمل اعتماد نہ کریں اور اس کو امیر نہ بنائیں اور امیر بنانے کے معنی یہ ہیں کہ آپ نے اس کے ہاتھ پر بیعت کر لی تو لہٰذا اس سے لوگوں کا بھڑکنا صرف اس لیے ہے کہ ہماری تاریخ اسلام میں اس بیعت کو بہت غلط معنی میں استعمال کیا گیا ہے اگر صحیح معنی میں استعمال کیا جائے تو بغیر اس کے کوئی تنظیم چل ہی نہیں سکتی یہ تو ضروری ہے۔

سوال: مولانا ایک بات اور ہے کہ عام طور پر بات کہی جاتی ہے کہ دین کا کام کرنے اور درس قرآن دینے کا حق صرف اس شخص کو حاصل ہے جو کسی دار العلوم سے باقاعدہ سند یافتہ ہو اور کسی بزرگ ہستی کا فیض یافتہ ہو۔ڈاکٹر صاحب پر عام طور پر یہ اعتراض وارد کیا جاتا ہے۔جب کہ ایک شخص خود محنت کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کو فہم دیتا ہے۔ظاہر بات ہے کہ جس کو بھی ذہانت ملتی ہے وہ اللہ کی ودیعت کردہ ہوتی ہے انسان کی اپنی خود تو پیدا کردہ نہیں ہوتی۔اب اگر وہ اپنی ذہانت وفطانت کو اللہ کے دین کے لیے صرف کرتا ہے' محنت کرتا ہے' مطالعہ کرتا ہے' لوگوں کی خدمت میں جاتا ہے' غور وفکر اور افہام وتفہیم سے ایک رائے بناتا ہے' اور اس کا جو اپنا اندرونی جذبہ ہے وہ اُسے اس بات پر ابھارتا ہے کہ میرا دین مجھ سے یہ مطالبہ کرتا ہے اور پھر وہ دین کی خدمت کے لیے اپنی زندگی کو وقف کر دیتا ہے لوگوں کو اس طرف دعوت دیتا ہے۔اس پر یہ اشکال اور یہ اعتراض کہ وہ کسی دار العلوم کا سند یافتہ اور فارغ التحصیل نہیں ہے اور کسی سے اس نے فیض حاصل نہیں کیا یعنی اپنا تزکیہ نہیں کرایا اُسے درس قرآن دینے اور بیعت لینے کا حق نہیں ہے تو آیا دین کے کام کے لیے کیا یہ شرائط قرآن وسنت سے عائد ہوتی ہیں یا یہ لوگوں نے بطور احتیاط خود عائد کی ہوئی ہیں۔آپ اس میں کیا رہنمائی فرمائیں گے؟

جواب: سوال یہ ہے کہ جب تک یہ مدارس قائم نہیں ہوئے تھے اس وقت تک جو حضرات درس

قرآن کا کام کرتے تھے‘ درس حدیث کا کام کرتے تھے وہ کس طرح پر کرتے تھے! ان کو کون سی
اتھارٹی حاصل تھی!! بات یہ ہے کہ وہ تو ایک وسیلہ اور ذریعہ ہے مقصود تو نہیں ہے اور اگر آپ یہ
قید لگا دیں کہ وہ کسی مدرسے کا فارغ ہو گا۔ کسی دارالعلوم کا سند یافتہ ہو گا جہاں اس نے باقاعدہ
استادوں سے تعلیم پائی ہو گی صرف اُسی کو حق حاصل ہے تو میں سمجھتا ہوں کہ ایک نہیں کئی ایک
بڑے بڑے نامی گرامی جو علماء تھے‘ جنہوں نے بڑھ کر کام کیے ہیں وہ بھی سب نکل جائیں گے
اور خارج ہو جائیں گے۔ وہ تو صرف یہ ہے کہ آپ کو دیکھنا یہ ہے کہ جو کچھ بھی وہ لکھ رہا ہے جو
کچھ وہ کہہ رہا ہے اس پر آپ اعتراض کیجئے۔ لیکن یہ کہ خود وہ ذاتی طور پر کسی مدرسے سے فارغ
التحصیل نہیں ہے تو یہ تو کوئی چیز نہیں ہے‘ یہ تو کوئی معیار نہیں ہے۔ بہت سارے خدا کے بندے
ایسے ہیں کہ انہوں نے اپنے والد سے چند سبق پڑھے اور جا کر بیٹھ گئے۔ خود ابوالکلام آزاد کے
متعلق آپ کہہ سکتے ہیں کہ وہ کون سے مدرسے سے فارغ التحصیل تھے! مولانا ابوالاعلیٰ مودودی
کے متعلق آپ جانتے ہیں کہ کون سے مدرسے سے فارغ التحصیل تھے! تو ایک نہیں کتنی ہی آپ
کو مثالیں ملیں گی کہ انہوں نے ابتدائی کچھ کتابیں پڑھیں اور اس کے ذریعے پھر کچھ مطالعہ کیا
اور یہ کیا اور وہ کیا۔ اور پھر جہاں تک کہ ڈاکٹر صاحب کا تعلق ہے تو ڈاکٹر صاحب نے تو صاف
طور پر لکھا ہے کہ وہ برابر شروع سے اس میں لگے ہی رہے‘ برابر لگے رہے‘ پڑھتے رہے‘ لوگوں
سے فیض حاصل کیا‘ اُن سے پوچھا‘ غور کرتے رہے اور پھر جہاں تک کہ ڈاکٹر صاحب کی
تحریروں کا تعلق ہے وہ عالمانہ تحریریں ہیں اور بتلاتی ہیں کہ ان کی استعداد علمی جو ہے وہ پختہ
ہے اور اس کی روشنی میں وہ قرآن مجید کی جو تشریح کرتے ہیں اور جو تقریریں کرتے ہیں وہ میں
سمجھتا ہوں کہ بعض اچھے اچھے علماء ہمارے اس طرح سے نہیں کر سکتے ہیں۔ لہٰذا یہ تو بہت ہی
ناقص قسم کا اعتراض ہے۔ یہ تو محض اعتراض برائے اعتراض والا معاملہ ہے۔

سوال: مولانا جزاک اللہ۔ آپ نے اس مسئلہ میں بڑی مفید رہنمائی عطا فرمائی ہے۔ مولانا
آپ نے شروع میں مولانا اخلاق حسین قاسمی مدظلہ کی خط و کتابت کا حوالہ دیا تھا جو ’میثاق‘ میں
شائع ہوئی ہے۔ تو ڈاکٹر صاحب نے اس کی جو وضاحت فرمائی ہے وہ بھی آپ کی نظر سے
گزری ہوگی (اس موقع پر مولانا نے فرمایا۔ جی ہاں! وہ میں نے پوری پڑھی ہے) تو الحمدللہ
مولانا اخلاق حسین قاسمی صاحب بھی اس سے مطمئن ہو گئے۔ پھر یہ کہ مولانا محمد یوسف
لدھیانوی مدظلہ جو ماہنامہ بینات کراچی کے مدیر اعلیٰ ہیں انہوں نے بھی الحمدللہ اس پر اظہارِ

اطمینان کیا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ آج آپ نے جو رہنمائی فرمائی ہے‘ اس کے متعلق میں ان
شاء اللہ ڈاکٹر صاحب سے عرض کروں گا کہ وہ غور فرمائیں کہ حضرت شاہ ولی اللہ ؒ نے جو
مسلک اختیار کیا تھا وہ ڈاکٹر صاحب جیسے شخص کے لیے بہت محفوظ اور مامون نظر آتا ہے۔ اس
ضمن میں کیا آپ ڈاکٹر صاحب کے لیے کوئی مزید رہنمائی عطا فرمائیں گے؟

جواب: اگر کوئی تعلّی نہ ہو تو میں خود یہ عرض کر سکتا ہوں کہ خود میرا مسلک بھی یہی ہے۔ چنانچہ
میں نے جو مضامین لکھے ہیں‘ ان میں کئی جگہ امام شافعی ؒ کے مسلک کو ترجیح دی ہے امام
ابوحنیفہ ؒ کے مسلک پر۔ تو تلفیق بین المذاہب خاص طور پر موجودہ زمانہ میں بہت ضروری
ہے۔ اس کے بغیر تو ہم چل ہی نہیں سکتے۔ اس دور میں کسی خاص ایک امام کا دامن پکڑ کر چلتے
رہیں اور اِدھر اُدھر نہ دیکھیں‘ دوسرے آئمہ فقہاء کی اجتہادی آرا سے استفادہ نہ کریں تو یہ
بالکل ناممکن ہے۔ اگر آپ کو دنیا کے موجودہ مسائل حل کرنے ہیں تو لازمی طور پر آپ کو تلفیق
بین المذاہب پر عمل کرنا ہو گا۔

جزاک اللہ۔ مولانا میں آپ کا انتہائی ممنون ہوں اور دعا گو ہوں کہ اللہ تعالیٰ آپ کو
صحتِ کاملہ عطا فرمائے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ آپ کا جذبۂ تعاون علی البر والتقویٰ ہے کہ اس
علالت اور ضعف کے باوجود آپ نے ہمیں وقت عنایت فرمایا اور اپنے ارشاداتِ عالیہ نیز اس
عاجز کے سوالات کے مفصل جوابات ریکارڈ کرائے۔ آخر میں آپ سے درخواست ہے کہ آپ
ہمارے لیے اور ڈاکٹر صاحب کے لیے دُعا فرماتے رہیے۔ خاص طور پر ڈاکٹر صاحب آپ
جیسے بزرگوں کی دُعاؤں کے بہت محتاج ہیں۔ چونکہ جب کوئی شخص دینی خدمت کے لیے کھڑا
ہوتا ہے‘ دعوت دیتا ہے تو شیطان اس پر جو جال ڈالتا ہے وہ عجب کا‘ تکبر کا‘ اور انانیت کا ڈالتا
ہے۔ دُعا کیجیے کہ اللہ تعالیٰ ان مہلکات سے ڈاکٹر صاحب کو محفوظ رکھے۔

راقم کی اس درخواست پر مولانا مدظلہ نے فرمایا:

ڈاکٹر صاحب کے لیے اور آپ لوگوں کے لیے میں کیا ہوں۔ میں تو یقین رکھتا ہوں کہ
ڈاکٹر صاحب اور ان کے ساتھیوں کے لیے سمندر کی مچھلیاں اور آسمان کے فرشتے دعا
کرتے ہیں۔ بہر حال میری دُعائیں اور نیک تمنائیں آپ حضرات کے ساتھ ہیں۔

☆☆☆

محترم مولانا سعید احمد اکبر آبادی مدظلہ
ڈائریکٹر شیخ الہندؒ اکیڈمی دیوبند (بھارت)
کے ایک حالیہ مکتوب کا ایک اقتباس

ڈاکٹر اسرار احمد صاحب اس زمانے میں ہندوستان آئے جب کہ میں خود پاکستان میں تھا (مراد ہے ڈاکٹر صاحب کا حیدر آباد دکن، دہلی اور علی گڑھ کا اپریل ۱۹۸۴ء کا دورہ) دہلی سے ڈاکٹر صاحب کا ورودِ مسعود علی گڑھ میں بھی ہوا اور جیسا کہ مجھ کو علی گڑھ پہنچنے پر معلوم ہوا کہ ڈاکٹر صاحب کی صحبت و خطابت سے علی گڑھ کے لوگ کافی محظوظ ہوئے۔ **فجزاہ اللہ**۔ خدام القرآن کے جلسہ میں میں نے جو تقریر مولانا ابوالکلام آزاد پر کی تھی وہ ''حکمتِ قرآن'' میں چھاپ دی گئی ہے۔ علی گڑھ میں اسے کئی اربابِ علم نے پڑھا اور پسند کیا۔ آج کل جیسا کہ مجھے معلوم ہوا ہے کہ ڈاکٹر صاحب کو بعض حضرات کی طرف سے مخالفت کا سامنا درپیش ہے، لیکن ہر وہ شخص جب کوئی تحریک شروع کرتا ہے، ابتداءً اسے ان حالات سے گزرنا ناگزیر ہے۔ **وفقنا اللہ جمیعا لما یحب و یرضیٰ**۔ والسلام!

❁❁❁

چند یادیں —— چند باتیں
مولانا سعید احمد اکبر آبادیؒ کی
ڈاکٹر اسرار احمد سے گفتگو

۲۲ اپریل ۱۹۸۵ء کو محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کراچی میں جناب مولانا سعید احمد اکبر آبادی مرحوم و مغفور کی عیادت کو تشریف لے گئے تھے۔ بھائی عبدالواحد عاصم صاحب اور راقم الحروف بھی ہمراہ تھے۔ مولانا مرحوم نے بڑی خوش دلی کے ساتھ ہم سب کا خیر مقدم کیا۔ وہ کافی نحیف، لاغر اور کمزور نظر آ رہے تھے، لیکن چہرے پر طمانیت اور لہجہ صاف تھا۔ البتہ اندازِ گفتگو سے کسی قدر نقاہت کا اظہار ہوتا تھا، مولانا نے محاضراتِ قرآنی کی روداد سننے کی خواہش ظاہر فرمائی۔ محترم ڈاکٹر صاحب نے اختصار کے ساتھ محاضرات کی کارروائی سنائی جس پر مولانا مرحوم نے نہایت مسرت کا اظہار فرمایا اور ڈاکٹر صاحب کو مبارکباد دی کہ آپ نے واقعی نہایت جرأت مندانہ اور قابلِ تحسین قدم اٹھایا تھا کہ خود اپنے پلیٹ فارم پر اپنے ''تصورِ فرائض دینی'' پر ملک کے نامور علمائے کرام کو تنقید اور اختلاف کرنے یا توثیق و تصویب کی دعوت دی۔ مولانا نے فرمایا کہ اس دور میں جب کہ تحزب کا یہ عالم ہے کہ کوئی بھی جماعت اپنے پلیٹ فارم پر اپنے مؤیدین اور متفقین کے علاوہ کسی بھی دوسرے شخص کو چاہے وہ کتنا ہی بڑا اور مشہور عالم دین ہی کیوں نہ ہو، تقریر کی اجازت نہیں دیتی۔ جبکہ اس کا کسی اختلافی بات کہنے کا ارادہ بھی نہ ہو اور وہ صرف دینِ مبین کی مثبت دعوت ہی پر اظہارِ خیال کرنا چاہتا ہو —— اس ضمن میں مولانا مرحوم نے چند واقعات بھی سنائے۔

دوسرے دن ۲۳ اپریل کو ہم مرحوم کی خدمت میں ٹیپ ریکارڈر لے کر دوبارہ حاضر ہوئے۔ مزاج پرسی کے بعد ڈاکٹر صاحب نے مولانا سے عرض کیا:

مولانا! آپ نے مختلف دینی تحریکوں کو قریب سے دیکھا ہے اور بڑی بڑی شخصیتوں سے آپ کا جو بھی تعلق رہا ہے تو آج کی گفتگو میں اگر کوئی ایسی بات آئے جو ہمارے لیے مفید ہو اور

وہ ریکارڈ ہو کر محفوظ بھی ہو جائے تو بہت سوں کے لیے بھی مفید ہو گی۔ان شاء اللہ! مولانا مرحوم ومغفور نے جواب میں جو کچھ ارشاد فرمایا۔ اسے ریکارڈ کر لیا گیا تھا۔ اس گفتگو نے ایک نوع کے انٹرویو کی شکل اختیار کر لی تھی۔ اس کو قریباً لفظ بہ لفظ کیسٹ سے منتقل کر کے پیش کیا جا رہا ہے۔البتہ ربط وتعلق کے لیے بعض باتیں قوسین میں بھی لکھی گئی ہیں۔

مولانا مرحوم ومغفور کی گفتگو میں بعض اکابر اور بعض دینی تنظیموں کے متعلق تنقیدی و اختلافی باتیں بھی آئی ہیں۔ یہ مولانا مرحوم کی ذاتی آراء ہیں جو بے کم و کاست پیش کی جا رہی ہیں ضروری نہیں کہ ڈاکٹر صاحب ان سے بالکلیہ متفق ہوں۔مولانا کی اس گفتگو کا کیسٹ محفوظ کر لیا گیا ہے ——— مولانا مرحوم نے ارشاد فرمایا:

''میری رائے یہ ہے کہ آپ (اپنے کام میں) اللہ کے فضل وکرم سے مخلص ہیں اور آپ نے اپنے اخلاص کا ثبوت دے بھی دیا ہے کہ کسی سے آپ کو کوئی عداوت نہیں ہے' کسی سے آپ کو کوئی رقابت نہیں ہے۔آپ سب کا احترام کرتے ہیں۔دین کے کام میں اہل علم وفضل کا تعاون چاہتے ہیں۔لیکن آپ نے جب (کتاب وسنت سے ماخوذ) ایک مرتبہ اپنے لیے ایک راستہ طے کر لیا ہے تو میرے خیال میں اب آپ بالکل ادھر اُدھر مت دیکھئے کہ کون کیا کہتا ہے' کون اختلاف اور مخالفت کرتا ہے۔آپ کا راستہ صحیح ہے۔آپ اس پر (یکسوئی سے) چلئے۔ اللہ تعالیٰ سے دُعا ہے کہ وہ اِسے آپ کے لیے باعث اجر بنائے۔''

ڈاکٹر اسرار احمد: جی ہاں! اس کے لیے آپ کی دعاؤں کی ضرورت ہو گی۔باقی یہ کہ جو مختلف (دینی) تحریکیں چلی ہیں اس دور میں۔ان کے بارے میں اگر آپ کا مختصر اظہارِ رائے ہو جائے تو وہ ہمارے لیے رہنمائی کا باعث ہو گا۔

مولانا سعید اکبر آبادی: اس کے متعلق میں پہلے جو کچھ کہہ چکا ہوں' وہ بہت کافی ہے (مراد ہے وہ انٹرویو جو ۱۹/ مارچ ۱۹۸۵ء کو لیا گیا تھا اور جو ''میثاق'' بابت مئی ۱۹۸۵ء میں صفحہ ۴۹ پر شائع ہو چکا ہے) آپ نے (مختلف تحریکوں کے متعلق) جو کچھ لکھا ہے' میں اس سے بالکل متفق ہوں۔مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم کی تحریک کے متعلق آپ نے صحیح لکھا ہے کہ وہ اس لیے نہ چل سکی کہ (وقت کے چند جیّد) علماء اس سے متفق نہیں ہو سکے۔اور مولانا آزاد بددل ہو گئے اور مولانا مودودی مرحوم کی تحریک کے متعلق میرا شروع میں خیال تھا جب تک کہ وہ سیاست کے میدان میں عملاً نہیں آئے تھے تو ان کی دعوت کا نہج ٹھیک ہی تھا اگرچہ اس میں

تشتت تھا۔لیکن جب وہ سیاست کے میدان میں آئے تو اُسی وقت سے میرا خیال تھا کہ انہوں نے اصل معاملہ بالکل الٹا کر دیا۔سیاست بعد میں آتی ہے۔دین جو آتا ہے وہ پہلے آتا ہے۔ انہوں نے سیاست کو دین پر مقدم کر دیا اور دین کا جو جائزہ لیا' اس کی تمام اچھائیوں کا اور اس کے محاسن کا وہ محض سیاسی نقطۂ نظر سے لیا۔تو (تقسیم ملک سے قبل) جب تک سیاسی کشمکش رہی تو اس وقت تک تو دین کو سمجھانے اور اس کو واضح کرنے کے لیے (انہوں نے) اچھا کام کیا۔لیکن جب وہ سیاست ختم ہو گئی آزادی کے بعد تو انہوں نے (پاکستان میں) عملی سیاست میں حصہ لینا شروع کر دیا جس میں ناکامی رہی۔دین کا (اس کی حقانیت کو ثابت کرنے کا) کام پس منظر میں چلا گیا' اسلام بطور نعرہ رہ گیا اس میں آپ دیکھتے ہیں کہ ایک تضاد پیدا ہو گیا۔تو یہ معاملہ بالکل وہی ہے کہ اس طرح انہوں نے دین کو سیاست کے تابع کر دیا۔(میرے خیال میں) یہ بڑے افسوس کی بات ہے۔اسی طرح ہمارے یہاں (بھارت میں) مولانا وحیدالدین خان کا معاملہ ہے جو ''الرسالہ'' نکالتے ہیں۔انہوں نے اس کے بالکل برعکس معاملہ کر رکھا ہے اور وہ ہر چیز کو اسی نقطہ نظر سے دیکھتے ہیں۔یعنی اسلام کو محض ایک تبلیغی مذہب سمجھتے ہیں اور سیاست کو دین کا جزو ہی خیال نہیں کرتے ——— رہی پاکستان میں جماعت اسلامی کی حصولِ اقتدار کی کوششیں ——— حالانکہ اسلامی فتوحات یا تمکن فی الارض جس کا اللہ نے وعدہ کیا ہے وہ تو بطورِ نتیجہ آتا ہے۔اس کے لیے کوشش نہیں کی جاتی۔تم نیک بن جاؤ' اللہ (کے دین) کا کام کرو' صحابہؓ کی طرح سے ہو جاؤ' خود بخود تم کو تمکن فی الارض بطور انعام حاصل ہو جائے گا۔چونکہ بقائے اصلح (Survival of the fittest) جو ہے یہ عام قانون ہے۔تم اگر بااصلاح ہو گئے (مراد ہے صالح ہو گئے) تو اللہ نے خود یہ کہا ہے کہ یہ زمین جو ہے تو صالحون اس کے وارث ہوں گے۔تو گویا مقصود بالذات نہیں ہوتی وہ چیز بلکہ مقصود بالذات ہوتا ہے انسان کو انسان بنانا' اس کو مؤمن بنانا' اس کو اللہ اور رسول کا مطیع وفرمانبردار بنانا۔لہٰذا تمکن فی الارض (مؤمنین صالحین) کو بطور انعام اور بطور نتیجہ ملتا ہے۔نہ کہ یہ اُسے آپ اپنا 'aim' اور اس کو اپنا مقصد بنا کر چلیں۔تو یہ تحریکیں جو ہیں اسی وجہ سے ختم ہو گئیں بالکل ——— اور بہت ساری تحریکیں جو کہ وقتی اور جزوی حالات کو سامنے رکھ کر چلی ہیں۔جیسے کہ محمد بن عبدالوہاب نجدیؒ کی تحریک بڑے زور وشور سے چلی' لیکن اس میں صرف مقامی حالات کی اتنی زیادہ رعایت کی ہے اور ان حالات کو رفع کرنے کے لیے اس قدر انتہائی 'step' لیا کہ اس کا جو مقصد تھا وہ آگے چل کر ختم ہو گیا۔تو یہ تمام تاریخ آپ کے سامنے ہے اور ماشاء اللہ آپ کا ذہن کھلا

ہوا ہے، دل میں حوصلہ ہے، قلب میں وسعت ہے، ان سب چیزوں کو سامنے رکھ کر اگر آپ چلیں گے تو یقیناً اللہ تعالیٰ آپ کی نصرت اور آپ کی مدد فرمائے گا۔

ڈاکٹر اسرار احمد: مولانا! کانگریس اور مسلم لیگ کی جو کشمکش تھی اس میں آپ نے بھی کوئی عملی حصہ لیا تھا یا نہیں!

مولانا سعید احمد اکبر آبادی: میں نے اس میں کوئی عملی حصہ نہیں لیا۔ میں کبھی کسی 'body' کا ممبر نہیں رہا۔ کبھی نہیں۔ میں ان سب سے بالکل الگ تھلگ رہا۔

ڈاکٹر اسرار احمد: اس زمانے میں آپ کہاں تھے یعنی ۱۹۴۰ء سے ۱۹۴۶ء تک جب یہ کشمکش زیادہ زوروں پر تھی۔

مولانا سعید احمد اکبر آبادی: میں دہلی میں تھا۔

ڈاکٹر اسرار احمد: کیا ندوۃ المصنفین میں یا کسی مدرسہ میں بھی؟

مولانا سعید احمد اکبر آبادی: فتح پوری مسجد میں دینی مدرسہ تھا، مدرسہ عالیہ کے نام سے۔ وہاں میں بہت پہلے سے مدرس تھا۔ وہاں مولوی فاضل اور منشی فاضل کے امتحانات کی بھی تیاری کرائی جاتی تھی۔ وہیں رہتے ہوئے میں نے مختلف امتحانات دیے انگریزی کے۔ پھر سینٹ اسٹیفن کالج سے میں نے ایم۔ اے کیا۔ ایم۔ اے کرنے کے بعد کالج نے مجھے وہیں بلا لیا۔

ڈاکٹر اسرار احمد: ایم۔ اے آپ نے کس سن اور کس مضمون میں کیا تھا؟

مولانا سعید احمد اکبر آبادی: میں نے ۱۹۳۶ء میں عربی میں ایم۔ اے کیا تھا اور پوری یونیورسٹی میں Top کیا تھا۔ اس کے بعد غالباً ۴۰ء یا ۴۱ء میں انگریزی میں ایم۔ اے کیا جس کے بعد اس سینٹ اسٹیفن کالج نے مجھے مدعو کیا۔ جنرل محمد ضیاء الحق صاحب اسی زمانے میں وہاں طالب علم تھے۔ ۱۹۴۹ء تک میں وہیں رہا۔ اس کے بعد مجھے مولانا ابوالکلام آزاد نے مدرسہ عالیہ کلکتہ کا پرنسپل بنا کر بھیج دیا۔ وہاں تقریباً صفایا ہو گیا تھا۔ جس کے ہاتھ جو لگا وہ لے گیا۔ دس برس میں وہاں رہا۔ اس کے بعد مجھے علی گڑھ یونیورسٹی نے بلا لیا۔ وہاں ڈین آف اسلامیات کی جگہ خالی ہوئی تھی۔ آخر تک میں وہاں رہا۔ آپ کو یہ سن کر تعجب ہو گا کہ اللہ کے فضل و کرم سے پوری زندگی میں ایک جگہ کے علاوہ ہر جگہ مجھے خود ہی پیش کش ہوئی۔ ایک جگہ میں نے خود کوشش کی تو ناکام رہا۔ وہ تھی الٰہ آباد یونیورسٹی۔ وہاں شعبہ عربی کے پروفیسر کی جگہ خالی تھی۔ میں نے درخواست دی، دو مرتبہ انٹرویو ہوا۔ میں تھا (عربی میں) فرسٹ کلاس فرسٹ through out first۔ اور میرے بالمقابل تھے ڈاکٹر سعید حسن۔ وہ تھے سیکنڈ کلاس،

مگر یونیورسٹی نے ان کو لے لیا مجھے نہیں لیا۔ ڈاکٹر شفاعت خاں میرے والد کے بہت گہرے دوست تھے۔ میں نے ان سے ذکر کیا تو انہوں نے جا کر ڈاکٹر عبدالستار صدیقی سے جو شعبہ عربی کے سربراہ اور ڈاکٹر (شفاعت خاں) صاحب کے گہرے دوست تھے، کہا کہ آپ نے یہ کیا ستم کیا؟ تو صدیقی صاحب نے کہا کہ سعید اکبر آبادی بہت قابل ہے، لیکن ڈاکٹر سعید حسن میرا شاگرد ہے۔ میں تو انہی کو لوں گا صاف بات ہے۔ تو ڈاکٹر صاحب جب میں نے یہ دیکھا تو آپ یقین جانیے کہ میں نے قسم کھا لی کہ میں اب کبھی کہیں درخواست نہیں دوں گا، جب کہ اتنے بڑے لوگ بھی جانب داری برتتے ہیں۔ چنانچہ پوری زندگی گزر گئی کہ میں نے کبھی کسی جگہ کے لیے درخواست نہیں دی۔ اللہ نے جو جگہ بھی دی جو مقام بھی دیا سب پیش کشیں تھیں۔

ڈاکٹر اسرار احمد: الٰہ آباد یونیورسٹی والی یہ بات کب کی ہے؟

مولانا سعید احمد اکبر آبادی: (کچھ دیر سوچنے کے بعد) ۱۹۳۶ء میں، میں نے ایم اے کیا تھا عربی میں۔ یہ اغلباً سن ۳۸ یا ۳۹ کی بات ہے۔

ڈاکٹر اسرار احمد: ہمارے ایک عزیز بھی وہاں رہے۔ ڈاکٹر زبید احمد صاحب۔

مولانا سعید احمد اکبر آبادی: ارے وہ تو میرے گہرے دوست رہے ہیں۔ بڑے صاحب علم اور بزرگ شخص تھے۔

ڈاکٹر اسرار احمد: وہ میری والدہ کے حقیقی ماموں تھے۔ ایک اعتبار سے میرے نانا۔

مولانا سعید احمد اکبر آبادی: ماشاء اللہ بہت عمدہ۔ میں ان کو بہت قریب سے جانتا ہوں بڑے اچھے آدمی تھے۔

ڈاکٹر اسرار احمد: ان کے اصغر گونڈوی سے بڑے قریبی تعلقات تھے!

مولانا سعید احمد اکبر آبادی: جی ہاں، جی ہاں۔ اصغر گونڈوی اور جگر مراد آبادی اور میرے والد یہ تینوں پیر بھائی تھے۔ حاجی عبدالغنی مرحوم و مغفور منگلوری سے بیعت تھے۔

ڈاکٹر اسرار احمد: کل آپ نے فرمایا تھا کہ مولانا علی میاں (مدظلہ) کا بھی مشورہ تھا کہ آپ علی گڑھ جائیں۔

مولانا سعید احمد اکبر آبادی: جی ہاں۔ جب علی میاں کو علی گڑھ کی پیش کش کا علم ہوا تو انہوں نے مشورہ دیا کہ میں علی گڑھ یونیورسٹی 'join' کرلوں میں (مدرسہ عالیہ سے) استعفیٰ دے کر گیا تھا کلکتہ سے، وہاں اس وقت جو گورنر اور چیف منسٹر تھے ان دونوں نے مجھے بہت روکا کہ آپ مت جائیے۔ ہمارا یہ مدرسہ بالکل تباہ ہو جائے گا۔ تو میں نے کہا کہ میں نے جناب

کرنل بشیر حسین زیدی صاحب سے جو وائس چانسلر تھے علی گڑھ یونیورسٹی کے‘ ان سے میں نے وعدہ کرلیا ہے اور میرے بعض بزرگوں کا بھی مشورہ ہے کہ علی گڑھ یونیورسٹی میں میری زیادہ ضرورت ہے۔ پھر مدرسہ عالیہ کا تقریباً پڑا ہو گیا۔ وہاں کے لیے کوئی مناسب پرنسپل ملا ہی نہیں۔

ڈاکٹر اسرار احمد: کس سن میں آپ کی علی گڑھ تشریف آوری ہوئی تھی؟

مولانا سعید احمد اکبر آبادی: میں منتقل ہوا ہوں سن ۱۹۵۹ء میں۔ ۱۹۴۹ء میں کلکتہ گیا تھا۔ تقریباً دس سال سے زیادہ وہاں رہا۔

ڈاکٹر صاحب: مولانا ابوالکلام آزاد کا انتقال ہو چکا تھا جنہوں نے آپ کو وہاں بھیجا تھا!

مولانا: جی ہاں! مولانا آزاد کا ۲۲ر فروری ۱۹۵۸ء کو انتقال ہوا تھا۔ مولانا آزاد نے مجھے جب مدرسہ عالیہ کلکتہ کا پرنسپل بنا کر بھیجا تھا تو فرمایا تھا کہ یہ آپ کی ٹریننگ کے لیے ہے۔ اس کے بعد میں آپ کو علی گڑھ یونیورسٹی کا وائس چانسلر بنا کر بھیجوں گا۔ وہ مجھ سے اس قدر خوش تھے۔ وہ تو اللہ کو منظور نہ تھا۔ لیکن مجھے شعبۂ اسلامیات کی سربراہی کی پیش کش ہوئی تو میں نے اُسے منظور کرلیا...... میں خود بھی دیکھ رہا تھا کہ مسلمان کی نئی نسل بہت سے نئے (باطل) نظریات سے مرعوب ہوتی جا رہی ہے۔ اگر جدید تعلیم یافتہ طبقے میں اپنے دین (کی حقانیت) پر اعتماد پیدا ہو جائے اور انہیں دعوت و تبلیغ کا صحیح نہج معلوم ہو جائے (صحیح استدلال کا سرا) ہاتھ آجائے تو یہ دین کی بہت مفید خدمات انجام دے سکتے ہیں۔ مجھے اپنے اُستاد حضرت مولانا انور شاہ کاشمیری کا ایک واقعہ یاد آ گیا۔ یاد نہیں کہ آپ کو پہلے سنایا یا نہیں سنایا —— شاہ صاحبؒ امرتسر تشریف لے گئے۔ تو وہاں کشمیری خاندان کے ایک بہت بڑے بیرسٹر تھے محمد صادق —— وہ ایسے دیندار آدمی تھے۔ وہ حضرت شاہ صاحبؒ سے ملنے آئے‘ لیکن وہ کلین شیو تھے اور سوٹ میں ملبوس —— وہ شاہ صاحبؒ کے سامنے بڑے شرمائے شرمائے سے تھے۔ شاہ صاحب تاڑ گئے اور ان سے کہا کہ بھئی بیرسٹر صاحب! آپ میرے سامنے بیٹھے ہوئے کیوں شرما رہے ہیں! —— وہ چپ۔ شاہ صاحب نے کہا۔ اچھا اس لیے شرما رہے ہیں کہ آپ کی ڈاڑھی مونچھ صاف اور میری اتنی بڑی ڈاڑھی۔ یہ تو شرمانے کی کوئی بات نہیں ہے۔ اس واسطے کہ میری ڈاڑھی بھی دُنیا کے لیے ہے۔ اگر آپ بیرسٹر ہو کر ڈاڑھی رکھیں تو کون آپ کو بیرسٹر سمجھ کر وکیل کرے گا۔ لوگ سمجھیں گے کہ یہ تو ملا جی ہیں۔ یہ بیرسٹر کہاں سے ہو گئے۔ اور اگر میں مولانا صاحب ہو کر ڈاڑھی منڈوا دوں تو لوگ کہیں گے کہ یہ کہاں کے مولانا ہیں۔ یہ تو مسٹر ہیں۔ تو بھائی فعل اگرچہ مختلف ہے لیکن غرض ایک ہی ہے کہ دنیا میں پہچان

ہو۔ کام ہو صرف اللہ (کی خوشنودی) کے لیے تو اس کا اجر ہے۔ تو یہ انداز تھا شاہ صاحب کی حکمتِ تبلیغ کا —— حضرت والا ڈاکٹر صاحب بات اصل میں یہی ہے اور اصل قصہ یہی ہے کہ اگر آپ نے مولانا ہو کر دین کا کام کیا تو کیوں کیا؟ (اس لیے) کہ آپ کو تو روٹیاں اسی کی مل رہی ہیں۔ لیکن جو انگریزی تعلیم یافتہ لوگ ہیں وہ اگر یہ کام کر رہے ہیں تو قدر و قیمت میں ان کی خدمات بہت آگے ہیں اور عملی طور پر یہی مفید ثابت ہوں گی۔ اگر آپ جیسے تعلیم یافتہ حضرات کا دین کی خدمات کے لیے جو 'contribution' ہے وہ اگر نہ ہوتا تو آج کیا ہوتا‘ اندھیرا ہوتا۔ ہمارے علی میاں نے یہی بات کہی جو میرے دل میں بھی تھی کہ دین کی خدمت کسی کا کوئی اجارہ تو ہے نہیں۔ اللہ کبھی (اپنے دین کا) بادشاہوں سے کام لیتا ہے‘ کبھی مجاہدوں سے کام لیتا ہے‘ کبھی صوفیاء سے کام لیتا ہے‘ کبھی علماء سے کام لیتا ہے‘ کبھی آپ جیسے انگریزی تعلیم یافتہ لوگوں سے کام لیتا ہے۔ بالکل۔ جیسی ضرورت ہے اسی کے مطابق کام لیتا ہے۔ آج سائنس اور ٹیکنالوجی نے جو مسائل پیدا کر دیے ہیں‘ جو سوالات اُٹھا دیے ہیں۔ ان کو یہ بیچارے (عام) عالم لوگ کیا سمجھیں گے۔ (الا ماشاءاللہ) یہ تو یہی (جدید تعلیم یافتہ) لوگ ہی سمجھتے ہیں۔ اگر وہ دین بھی جانتے ہیں اور جدید (باطل) نظریات سے بھی واقف ہیں اور اللہ نے ان کو اتنی دیانت داری اور بصیرت بھی دی ہے کہ وہ دین کی تعلیمات کی روشنی میں ان کا توڑ کر سکتے ہیں۔ پھر خود دین پر عمل کرتے ہیں —— تو یہ ہے وقت کی اہم ترین ضرورت۔ آپ تو علی گڑھ ہو آئے ہیں تو آپ نے (ان کیفیات کو) دیکھا ہوگا ——؟

ڈاکٹر صاحب: جی ہاں دو مرتبہ —— علی گڑھ میں تبلیغی جماعت کو جس قدر مقبولیت حاصل ہوئی اُسے دیکھ کر مجھے حیرت آمیز خوشی ہوئی۔

مولانا: جی ہاں۔ تبلیغی جماعت بھی ہے —— آپ کی جماعتِ اسلامی بھی ہے‘ لیکن اس کا اثر اب بہت کم ہو گیا ہے۔ تبلیغی جماعت کا اثر بہت زیادہ ہے۔ بہرحال وہاں تبدیلی آئی ہے خوشگوار تبدیلی۔ جو تعلیم یافتہ حضرات ذہین ہیں اور آزادانہ سوچ رکھتے ہیں ان میں سے بعض آپ کے فکر سے زیادہ قریب ہیں۔

ڈاکٹر صاحب: آپ کی علامہ اقبال سے بھی ملاقاتیں رہی ہیں یا نہیں!

مولانا مرحوم: جی ہاں! ۱۹۲۷ء میں ان کے یہاں آنا جانا تھا۔ اس کو ملاقات تو نہیں کہہ سکتے۔ عبداللہ چغتائی کا ان کے یہاں بہت آنا جانا تھا۔ (دونوں میں) بہت بے تکلفی تھی۔ اور عبداللہ چغتائی سے میرا بہت دوستانہ تھا۔ میں انہی کے ساتھ کبھی کبھار علامہ کے یہاں جاتا تھا تو

علامہ اقبال نے ان کو امام رازیؒ کی ایک کتاب دی جو چھپ کر آئی تھی المباحث المشر قیہ۔ علامہ کو زمان و مکان کی بحث سے بہت دلچسپی تھی۔ اس کتاب میں دو 'chapters' تھے ایک زمان پر اور ایک مکان پر۔ تو علامہ نے چغتائی (صاحب) سے کہا کہ اس کا اُردو میں ترجمہ کرادو۔ چغتائی میرے پاس لے کر آئے اور مجھ سے کہا کہ ان کا ترجمہ کردو تو میں تو دیوبند کا فارغ التحصیل تھا ہی۔ میں نے کہا لائیے۔ میں نے ترجمہ کردیا۔ وہ ترجمہ (چغتائی صاحب نے) لے جا کر علامہ اقبال کو دکھلایا۔ تو وہ بہت متاثر ہوئے اور کہا کہ یہ کون ہے جس سے تم نے یہ (ترجمہ) کرایا ہے۔ انہوں نے کہا کہ ایک سعید صاحب ہیں یہاں اورنٹیئل کالج میں پڑھتے ہیں۔ دیوبند کے فارغ التحصیل ہیں۔ تو انہوں نے مجھے بلا بھیجا۔ ان کو چونکہ حضرت انور شاہ کاشمیریؒ سے بڑی عقیدت تھی اور میں تلمیذ خاص تھا حضرت شاہ صاحبؒ کا۔ تو جب علامہ کو اس نسبت کا علم ہوا تو وہ مجھ سے ہر ملاقات میں بڑی محبت سے پیش آتے رہے۔

ڈاکٹر صاحب: علامہ اس کو عربی میں خود نہیں پڑھ سکتے تھے؟ جبکہ علامہ نے خود ایم۔اے عربی میں کیا تھا ——؟

مولانا مرحوم : بات یہ ہے کہ کالج اور یونیورسٹیوں کی عربی کا معیار کوئی بہت اعلیٰ نہیں تھا۔

ڈاکٹر صاحب: چٹائی توڑ عربی نہیں تھی۔

مولانا مرحوم: جی ہاں۔ بات یہ ہے کہ عربی کی فلسفیانہ اصطلاحات تو کالجوں اور یونیورسٹیوں میں زیر بحث نہیں آتیں اور امام رازیؒ کی تمام فلسفیانہ اصطلاحات خالص دقیق عربی میں تھیں۔

ڈاکٹر صاحب: زمان کے مسئلہ پر تو (علامہ) نے سمجھنا بہت چاہا ہے۔ ڈاکٹر رفیع الدین مرحوم نے بھی اس (مسئلہ) پر ایک کتاب لکھی تھی۔ ویسے علامہ کی ایک بات بہت نمایاں ہے کہ ان کا آخری وقت تک طالب علمانہ انداز رہا ہے۔ آخری وقت تک انہوں نے حضرت شاہ صاحبؒ کشمیری کو بالکل طالب علمانہ انداز میں خطوط لکھے۔ اسی طرح مولانا سلیمان ندویؒ کو بھی نہایت طالب علمانہ انداز میں خطوط لکھا کرتے تھے جب کہ علامہ مولانا سلیمان ندویؒ سے عمر میں خاصے بڑے تھے۔

مولانا مرحوم: ان میں بڑی نیاز مندی تھی۔ شروع میں جب شاہ صاحب کاشمیریؒ لاہور آئے تو اس وقت تک ان کا علامہ سے میل جول نہیں تھا —— علامہ اقبالؒ نے شاہ صاحبؒ کی

اپنے یہاں دعوت کی۔ تو شاہ صاحب نے لکھ دیا کہ میں تمہارے یہاں کھانے پر نہیں آؤں گا۔ چونکہ قادیانیت کے متعلق تمہارے خیالات بہت زیادہ خراب ہیں۔ علامہ نے لکھا کہ مجھے کچھ اشکالات ہیں۔ شاہ صاحبؒ نے جواب بھجوایا کہ مجھے لکھ کر بھیجو۔ (علامہ نے لکھ کر بھیجے) تو شاہ صاحبؒ نے ان کا (مدلل) جواب لکھا۔ علامہ نے جواب میں لکھا کہ میری تسلی ہوگئی۔ میں اپنے سابقہ خیالات سے رجوع کرتا ہوں اور تائب ہوتا ہوں اور میں اس پر ایک مضمون انگریزی میں برائے اشاعت لکھ رہا ہوں۔ تو علامہ شاہ صاحب کو اتنا لوہا مانتے تھے۔

ڈاکٹر صاحب: یہ تو بہت اہم واقعہ ہے شاید لوگوں کے علم میں نہ ہو۔

مولانا مرحوم: جی ہاں۔ میرا خیال ہے کہ وہ مضمون کہیں شائع بھی ہوا ہے۔

ڈاکٹر صاحب: علامہ نے شاہ صاحب سے بڑی مؤدبانہ درخواست کی کہ آپ لاہور تشریف لے آئیں جب شاہ صاحب ڈابھیل جا رہے تھے کہ فقہ اسلامی کی نئی تدوین میں اور آپ مل کر کرلیں لیکن اللہ کو منظور نہیں ہوا اور نہ وہ کام بہت اعلیٰ ہو جاتا۔

مولانا مرحوم: اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کے بعد علامہ بیمار بھی تو ہوگئے اور وہ اس قابل نہیں رہے کہ کام کرسکیں اور اس کی کوئی تنظیم (بھی) نہیں ہوسکی۔ اُدھر ڈابھیل سے آفر آئی ہوئی تھی لہٰذا (شاہ صاحب) وہاں چلے گئے۔ اگر وہ کام ہو جاتا تو بڑی شاندار چیز ہوتی۔

ڈاکٹر صاحب: مولانا اگر مناسب سمجھیں تو ذرا یہ بتا دیجئے کہ یہ کیا مسئلہ تھا! کیوں ڈابھیل جانا پڑا حضرت شاہ صاحبؒ کو؟

مولانا مرحوم: ڈابھیل اس لیے جانا پڑا کہ اصل میں بات یہ تھی کہ دارالعلوم دیوبند کی انتظامیہ نے دارالعلوم کو اپنی ذاتی جائیداد سمجھ کر اُسے استعمال کرنا شروع کردیا تھا اور اس میں اقربا پروری کا بہت دخل ہوگیا تھا۔ منتظم اعلیٰ حافظ محمد احمد صاحب مرحوم نے جو قاری محمد طیب مرحوم کے والد تھے اپنے ایک قریب ترین عزیز کو ناظم مطبخ بنانے کے بعد آپ نے ان کو سپلائی کا ٹھیکہ بھی دے دیا۔ شاہ صاحبؒ نے کہا کہ بھئی یہ کیا تک ہے! وہ ناظم مطبخ بھی ہیں' ملازم بھی ہیں اور ٹھیکیدار بھی ہیں۔ یہ تو بڑی بے تکی بات ہوئی۔ یہ نہیں ہونا چاہیے۔ اس (بات) کا بہت بُرا منایا گیا۔ اس پر شاہ صاحب نے اس روز عصر کی نماز دارالعلوم کی مسجد میں پڑھی اور نماز کے بعد کہا کہ لوگو! ذرا ٹھہر جاؤ۔ لوگ رُک گئے تو شاہ صاحبؒ نے اس وقت یہ حدیث پڑھی: اَلْوَقْفُ لَا یُمْلَکُ۔ یہ دارالعلوم جو ہے وقف ہے۔ کسی کی ذاتی جائیداد نہیں ہے کہ آپ جس طرح چاہیں' اُسے استعمال کریں۔ آپ نے شوریٰ کو بیکار کر رکھا ہے اور مطبخ کا جو نیا انتظام کیا گیا ہے

وہ میں برداشت نہیں کروں گا۔بس بات بڑھی اور اسی (بات) پر استعفا دینے کی نوبت آ گئی۔

ڈاکٹر صاحب: آپ نے مولانا آزاد کے دارالعلوم دیوبند کے داخلے پر پابندی کے سلسلہ میں جو واقعہ سنایا تھا کہ جب (کانپور کی مسجد کے شہید کرنے کے بعد علماء کو مطمئن کرنے کے لیے) گورنر یوپی دارالعلوم دیوبند آیا تھا تو انتظامیہ نے مولانا آزاد کا داخلہ دارالعلوم میں روک دیا تھا اس پر حضرت شیخ الہندؒ نے بھی بطور احتجاج اس جلسہ میں شرکت نہیں کی تھی تو اس کا ذکر جب مولانا عزیز گل صاحب کے سامنے ہوا تو انہوں نے سختی سے اس کی تردید اور نفی کی ——— ان کے علم میں نہیں ہوگا۔

مولانا مرحوم: یہ تو مولانا مفتی عتیق الرحمٰن صاحب کے سامنے کا واقعہ ہے۔انہوں نے مجھے بتایا اور بہت سے لوگوں نے اس کی توثیق کی۔

ڈاکٹر صاحب: میں مزید حیران ہوا کہ مولانا عزیز گل صاحب شیخ الہندؒ کے خدام میں سے ہیں اور ان کے علم میں یہ واقعہ بھی نہیں ہے کہ مولانا ابوالکلام آزاد کے لیے (حضرت شیخ الہندؒ) کی طرف سے امام الہندؒ بنانے اور ان کے ہاتھ پر بیعت کرنے کی کوئی تجویز تھی؟

مولانا: حیرانی کی بات تو ہے۔ورنہ یہ تو بہت مشہور بات ہے۔شاید مولانا (عزیز گل) بھول گئے ہوں ——— ان کی عمر بھی تو اب کافی ہوگی۔

ڈاکٹر صاحب: لیکن میری توجیہہ یہ ہے کہ اغلباً وہ (مولانا عزیز گل صاحب) نوجوان خدام میں سے تھے۔اس لیے ان معاملات میں وہ شریک نہیں ہوتے ہوں گے اس لیے یہ واقعہ ان کے علم میں نہ آیا ہو۔

مولانا مرحوم: جی ہاں۔یہ توجیہہ صحیح ہے۔وہ خدام ہی میں سے تھے۔

ڈاکٹر صاحب: لیکن اب وہ خدام میں سے شاید آخری شخص ہیں جو بفضلہٖ تعالیٰ بقید حیات ہیں اس لیے ان کو ایک تبرک کا درجہ حاصل ہو گیا ہے۔

مولانا مرحوم: جی ہاں ایسا ہی معلوم ہوتا ہے۔ورنہ یہ بات تو تواتر کے درجہ کو پہنچی ہوئی ہے۔

ڈاکٹر صاحب: مجھے تو اس سے بھی زیادہ حیرت اس بات پر ہے کہ مولانا حسین احمد مدنی ؒ نے جو سوانح حضرت شیخ الہندؒ کی لکھی ہے اس میں مرض وفات کا ذکر بھی ہے ——— اس کی ساری تفاصیل کا ذکر بھی ہے۔لیکن اس واقعہ کا انہوں نے بھی ذکر نہیں کیا۔(یعنی) مولانا آزاد کو امام الہندؒ بنانے کے مسئلہ کا ——— اس کا افسوس ہوا۔

راقم الحروف: البتہ مولانا محمد میاں ؒ نے اپنی کتاب میں اس واقعہ کا ذکر کیا ہے۔

ڈاکٹر صاحب: لیکن مولانا مدنی ؒ کا اس اہم واقعہ کا بالکل ہی ذکر نہ کرنا۔اس کا سبب کیا ہو سکتا ہے؟ سمجھ میں نہیں آتا۔

مولانا مرحوم: وہ غالباً مولانا ابوالکلام آزاد کی رعایت کر گئے کہ ان کو ناگوار نہ ہو ورنہ یہ تو بالکل کھلی بات ہے۔مشہور و معروف بات ہے۔

ڈاکٹر صاحب: مولانا آپ نے اپنی پچھلی گفتگو میں (مراد ہے مولانا کا انٹرویو شائع شدہ میثاق بابت مئی ۱۹۸۵ء) تلفیق بین المذاہب کے بارے میں فرمایا تھا کہ یہ تو اب کرنا ہی ہوگا۔ اس کے بغیر تو کام نہیں چلے گا تو یہ لفظ کہاں سے بنا ہے۔ل۔ف۔ق کا اصل مفہوم کیا ہے؟

مولانا مرحوم: تلفیق۔لفق (سے بنا ہے) لفق کے معنی ہیں ملا دینا۔

ڈاکٹر صاحب: اس مادہ سے قرآن وحدیث میں تو کوئی لفظ آتا نہیں میں نے تحقیق کر لی ہے۔

مولانا مرحوم: شاید ایسا ہی ہو ——— لیکن تمام مستند لغات عربی میں یہ لفظ مل جائے گا۔ اور ہمارے بعض متقدمین علماء نے تلفیق بین المذاہب کو استعمال کیا ہے اور اس کی ضرورت پر زور دیا ہے۔

ڈاکٹر صاحب: ہمارے بعض علماء تو اس تلفیق کو بہت بڑی گالی خیال کرتے ہیں۔گویا ان کے نزدیک (تو) یہ درجہ کفر تک پہنچی ہوئی بات ہے!

مولانا مرحوم: ہمارے نزدیک تمام ائمہ فقہاء سب برابر ہیں۔حضرت شاہ ولی اللہ ؒ نے (تلفیق بین المذاہب) کی ہے۔مجدد الف ثانی ؒ نے کی ہے۔اور مولانا تھانوی ؒ تک نے کی ہے۔مولانا تھانویؒ نے بہت سے علماء کو بلا کر لکھا تھا: 'اَلْحِیلةُ النّاجِزَةُ لِلْحَلِیْلَةِ الْعَاجِزَةِ' بتایئے یہ سب کیا ہے! دیکھا کہ کسی مسئلے میں ...... فقہ حنفی پر عمل کرنے سے نقصان ہوگا۔تو اسے چھوڑ کر امام مالکؒ کے مذہب کو اختیار کرنے کا فتویٰ دیا۔اور بہت سے علماء کو بلا کر دکھا دیا۔بولیے یہ کیا ہے! یا مفقود الخبر کے بارے میں فقہ حنفی کا فتویٰ چھوڑ کر امام احمد بن حنبل کے فتوے پر فیصلہ طے کیا۔تو برابر یہ ہوتا ہے۔

ڈاکٹر صاحب: وہ یہ کہتے ہیں کہ مولانا تھانویؒ یہ کر سکتے تھے۔تم کون ہوتے ہو یہ کرنے والے! میں نے عرض کیا کہ ٹھیک ہے میرا تو یہ مقام نہیں ہے لیکن اُصولاً تو بہر حال ایک بات سامنے آ گئی۔

مولانا مرحوم: آپ یہ کہتے کہ مولانا تھانویؒ بھی تو مشتبہ ہیں علماء کے ایک کثیر حلقہ کے

نزدیک —— اس کے بغیر تو جناب والا چارا ہے ہی نہیں۔ اس کے بغیر (یعنی تلفیق بین المذاہب کے بغیر) ایک صحیح اسلامی ریاست چل ہی نہیں سکتی۔

ڈاکٹر صاحب: میں نے آپ کی سب سے پہلے کتاب حقیقتِ وحی طالب علمی کے زمانے میں پڑھی تھی۔

مولانا مرحوم: کتاب کا اصل نام ہے ''وحی الٰہی'' پھر ہے ''فہم قرآن''

ڈاکٹر صاحب: میں نے یہ دونوں ایک ساتھ لی تھیں۔ دونوں کا بہت شوق سے مطالعہ کیا تھا۔ مجھے چونکہ قرآنِ حکیم سے اللہ کے فضل و کرم سے زمانہ طالب علمی ہی میں گہرا شغف ہو گیا تھا تو قرآن سے متعلق جو بھی کسی مستند عالمِ دین کی کوئی چیز مل جاتی تھی' اس کا میں بڑے ذوق و شوق سے مطالعہ کیا کرتا تھا —— آپ کی تاریخ اسلام سے متعلق کتابیں میں نے کم ہی پڑھی ہیں —— یہاں (پاکستان میں) آپ کی تصانیف کون شائع کر رہا ہے؟

مولانا مرحوم: صاحب! کیا عرض کروں! میں نے کئی جگہ مختلف ناشروں کی طرف سے شائع کردہ یہاں اپنی کتابیں دیکھی ہیں۔

ڈاکٹر صاحب: کیا یہ سب بلا اجازت ہو رہا ہے؟

مولانا مرحوم: سب بلا اجازت۔ کسی نے ایک پیسہ آج تک نہیں دیا۔ نہ اجازت لی۔ میں پہلے جب پاکستان آیا تھا تو جناب جنرل محمد ضیاء الحق صاحب کو بطور ہدیہ دینے کے لیے میں چند کتابیں خریدنے کے لیے ایک صاحب کے ساتھ بازار گیا تو کئی جگہ دیکھا کہ میری کتابیں بھی رکھی ہوئی ہیں —— تو ایک جگہ ان صاحب نے میرے متعلق بتا بھی دیا کہ فلاں فلاں کتاب کے مصنف سعید احمد اکبر آبادی یہ ہیں۔ اس کے باوجود کوئی اثر نہیں ہوا اور میری کتابوں کے مجھ سے پورے دام لیے گئے۔ بولے یہ حالت ہے۔ اپنی کتابیں خریدنی پڑیں۔

ڈاکٹر صاحب: اگر آپ ہمیں اجازت دیں تو ہم آپ کی کتابیں چھاپیں۔

مولانا مرحوم: بڑے شوق سے۔ بڑے شوق سے۔ میری کتاب ہے 'صدیق اکبرؓ' —— اور ابھی آ رہی ہے ''عثمان غنی ذوالنورینؓ''۔

ڈاکٹر صاحب: میں یہ دونوں کتابیں دہلی سے خرید کر لے آیا تھا۔ اسی موقع پر مولانا مفتی عتیق الرحمٰن صاحب کو بھی دیکھ آیا تھا۔ وہ بے ہوشی یا گہری نیند کی حالت میں تھے۔ بہرحال مجھے ان کو دیکھنے کی اجازت مل گئی تھی۔ میں ان کو دیکھ آیا تھا۔

مولانا مرحوم: میری کتاب 'صدیق اکبرؓ' کسی نے یہاں 'الفیصل اکیڈمی' کی طرف سے چھاپ دی ہے۔

ڈاکٹر صاحب: مولانا! تبلیغی جماعت کے بارے میں آپ کی رائے کیا ہے؟

مولانا مرحوم: تبلیغی جماعت! میں نے کہا نا کہ اچھا کام کر رہی ہے۔ لیکن اس پر ہم پورا Depend نہیں کر سکتے۔ اور چونکہ مجھے اس سے دلچسپی رہی نہیں۔ اس لیے میں نے زیادہ سوچا نہیں۔ اس سے اگر فائدہ ہو رہا ہے تو اچھا ہے۔

ڈاکٹر صاحب: لیکن یہ کہ انہوں نے نہی عن المنکر کا راستہ بالکل بند کر رکھا ہے...... اس کو بالکل نظر انداز کر رکھا ہے۔ یہ تو دین کے لیے بہت مضر ہے۔

مولانا مرحوم: یہی تو میں نے پہلے کہا تھا اور کل بھی [1]۔ بہرحال اب وہ اسی پر قانع ہو بیٹھے ہیں۔ پھر اب ان میں تحزب بھی بہت زیادہ ہو گیا ہے۔ بہت ہی زیادہ۔

ڈاکٹر صاحب: آپ نے کل مولانا بنوری صاحبؒ کا واقعہ سنایا تھا۔[2]

مولانا مرحوم: جی ہاں' جی ہاں ایک نہیں دسیوں واقعات ہیں۔ یہ لوگ اپنے سوا کسی کو حق پر سمجھتے ہی نہیں ہیں۔ ان میں تحزب و تخالف بہت بڑھ چکا ہے...... (مزید برآں) حضرت مولانا شاہ وصی احمد خاں الٰہ آبادی کے ایک مرید خاص ہیں۔ بہت بڑے مولانا۔ بہت بڑے عالم۔ اور بڑے گوشہ نشین اور بہت خاموش طبیعت۔ انہوں نے ایک کتاب لکھی ہے تبلیغی جماعت کے اُوپر۔ اور بڑی سخت تنقید کی ہے اور یہ لکھا ہے کہ تم بریلویوں کو کہتے ہو کہ بدعتی ہیں۔ اور اس لیے کہتے ہو کہ جو چیز مباح ہے اُس کو انہوں نے سنت' واجب اور فرض قرار دے دیا۔ لیکن تم جو کچھ کر رہے ہو یہ سب بدعات ہیں۔ تم نے اہم دینی اصطلاحات کے معنی اور مفہوم ہی بدل کر رکھ دیے ہیں۔ انہوں نے بڑی سخت تنقید کی ہے۔ میں نے مولانا محمد منظور نعمانی صاحب سے پوچھا تھا کہ حضرت ہے (اس کا آپ کے پاس) کوئی جواب! بولے کوئی جواب نہیں۔

---

(۱) مولانا مرحوم نے اپنی جس پہلی رائے کا حوالہ دیا ہے وہ میثاق بابت مئی کے انٹرویو میں بایں الفاظ بیان ہوئی ہے: ''میرا ذاتی خیال ہے کہ تبلیغ اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے درمیان عام و خاص کی نسبت ہے۔ یعنی جہاں کہیں بھی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر پایا جائے گا وہاں تبلیغ ضرور ہوگی لیکن جہاں (محض) تبلیغ ہو وہاں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا ہونا ضروری نہیں ہے۔''

(۲) اس واقعہ کا ذکر آگے آئے گا۔ (مرتب)

ڈاکٹر صاحب: مولانا نعمانی نے یہ فرمایا کہ کوئی جواب نہیں؟

مولانا مرحوم: جی ہاں! یہی کہا مولانا نے۔ صاحبِ کتاب نے قرآن و حدیث کی روشنی میں یہ ثابت کیا کہ ان کا جو طریقۂ عمل ہے وہ قطعاً غیر شرعی ہے۔ حدیث نے جس چیز کو لازم نہیں کیا اس چیز کو انہوں نے لازم کر دیا ہے۔ اور جناب والا۔ نہی عن المنکر بالکل نہیں کرتے جبکہ حدیث میں اس کی اتنی تاکید ہے۔ پھر انہوں نے گشت کو چلہ کا واجب کا درجہ دے رکھا ہے۔ انہوں نے سینکڑوں مثالیں بیان کی ہیں۔ آج ایک لڑکے کی شادی ہوئی ہے۔ کل اس سے کہا کہ تبلیغ کے لیے چلو لندن اور وہ چلا گیا۔ تو بولیے یہ شریعت کا کہاں حکم ہے۔ دین اعتدال اور توازن کی تعلیم کا نام ہے۔

ڈاکٹر صاحب: تبلیغی جماعت کو اصل میں مولانا علی میاں اور مولانا محمد منظور نعمانی کی شرکت کی وجہ سے کافی شہرت......۔

مولانا مرحوم: مولانا علی میاں بھی تو ہٹ گئے ہیں۔

ڈاکٹر صاحب: مولانا علی میاں کے متعلق تو معلوم ہوا تھا کہ وہ تبلیغی جماعت سے کچھ مایوس ہیں، لیکن مولانا محمد منظور نعمانی کے متعلق......

مولانا مرحوم: جی وہ بھی ہٹ گئے۔ علی میاں نے تو صاف لکھ دیا اپنی سوانح عمری ''کاروانِ زندگی'' میں کہ میں نے راستہ بدل دیا ہے۔ میں نے بہت چاہا کہ یہ لوگ اصلاح کر لیں مگر ان لوگوں نے میری بات کو نہیں مانا تو میں نے اپنا راستہ الگ کر دیا۔ میں نے کہا تھا ان سے کہ کتاب و سنت کی روشنی میں آپ اپنی دعوت کا نہج اور طریقِ کار تبدیل کر لیں۔ لیکن ان حضرات نے میرے دلائل تسلیم نہیں کیے۔ وہ مطمئن نہیں ہو سکے جب کہ میرا اطمینان بھی ختم ہو چکا تھا۔ لہٰذا میں نے یہی مناسب سمجھا کہ میں ہٹ جاؤں۔

ڈاکٹر صاحب: مجھے اتنی تفصیل سے یہ بات معلوم نہیں تھی۔ ان شاء اللہ جلد ہی وقت نکال کر میں ان کی کتاب 'کاروانِ زندگی' کا مطالعہ کروں گا۔

راقم الحروف: مولانا۔ آپ کی یہ محبت و شفقت ہے کہ بیماری وضعف کے باوجود کل بھی آپ نے کافی اہم اور قیمتی باتیں ارشاد فرمائیں اور اپنے تجربات سے مستفید فرمایا اور آج بھی نہایت بیش بہا خیالات اور اہم واقعات ریکارڈ کرائے۔ اب آپ سے درخواست ہے کہ ڈاکٹر صاحب کے لیے کچھ نصیحت فرمائیں۔

مولانا مرحوم: ارے میں کیا اور میری نصیحت کیا۔ ہم تو ان سے نصیحت حاصل کرنے کے لیے آئے تھے۔

ڈاکٹر صاحب: مولانا۔ میرے لیے آپ کی نصیحت بہت قیمتی چیز ہوگی......

مولانا مرحوم: بس یہی ہے کہ آپ اللہ پر توکل کرتے ہوئے اپنا کام کیے جائیے۔ اِدھر اُدھر دیکھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ آپ نے جس کام کا بیڑا اُٹھایا ہے اخلاص کے ساتھ اسی کو کرتے رہیے۔ صرف رضائے الٰہی آپ کا نصب العین رہنا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ اس کام میں برکت عطا فرمائے۔ اس کو آخرت میں شرف قبولیت عطا فرمائے۔ اس کو آخرت میں آپ کے لیے توشہ بنائے۔ میں دعا ہی کر سکتا ہوں۔ جبکہ دل تو یہ چاہتا ہے کہ صحت اجازت دے تو جتنا بھی تعاون ممکن ہو وہ پیش کروں۔

ڈاکٹر صاحب: میرے لیے آپ کا یہ فرمانا ہی سرمایۂ زیست رہے گا۔ ان شاء اللہ!

اس طرح قریباً ایک گھنٹہ تک یہ مبارک مجلس جاری رہی اور ہم مولانا سے ملاقات کر کے رخصت ہوئے کسے خبر تھی کہ راقم کی یہ آخری ملاقات ثابت ہوگی۔

كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ ۝ وَّيَبْقٰى وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلَالِ وَالْاِكْرَامِ ۝

☆☆☆

استدراک

۲۳؍اپریل ۱۹۸۵ء کی جناب مولانا سعید احمد اکبر آبادی مرحوم و مغفور اور محترم ڈاکٹر اسرار احمد مدظلہ کے مابین گفتگو ریکارڈ کر لی گئی تھی۔ جو کیسٹ سے قریباً لفظ بلفظ منتقل کر کے شامل اشاعت کی گئی ہے۔ قارئین کرام نے اس کا مطالعہ فرما لیا ہوگا ——— ۲۲؍اپریل ۱۹۸۵ء کی ملاقات کے موقع پر مولانا مرحوم نے تفصیل سے چند اہم باتیں بتائیں تھیں اور چند اہم واقعات سنائے تھے۔ چونکہ اس موقع پر مولانا مرحوم نے تفصیل سے چند اہم باتیں بتائی تھیں اور چند اہم واقعات سنائے تھے۔ چونکہ اس موقع پر ٹیپ ریکارڈر ساتھ نہیں تھا۔ لہٰذا اس روز کی گفتگو ریکارڈ نہیں ہو سکی۔ اس گفتگو کے بعض نکات ۲۳؍اپریل والے انٹرویو میں مجمل اشارات کے طور پر آئے ہیں۔ راقم الحروف اپنی یادداشت سے ۲۲؍اپریل کی گفتگو کے چند اہم نکات قلم

بندکررہا ہے۔مولانا مرحوم کے ارشادات بالمعنی تحریر کیے جارہے ہیں۔الفاظ مولانا مرحوم کے نہیں ہیں' البتہ راقم کو بفضلہٖ تعالیٰ اطمینان ہے کہ مفہوم و مدعا مولانا مرحوم ہی کا ہے۔مولانا کے ارشادات وخیالات ترتیب وار لکھے جارہے ہیں:

۞ ـــــ مولانا مرحوم نے ڈاکٹر صاحب سے فرمایا:''میں آپ کی کچھ کتابیں پہلے بھی پڑھ چکا تھا اور کچھ کراچی کے موجودہ قیام کے دوران پڑھی ہیں۔ ماشاءاللہ آپ کا فکر صحیح ہے۔ قرآن وسنت سے ماخوذ ہے۔ آپ اخلاص کے ساتھ اپنا کام کیے جائیے۔ اِدھر اُدھر نہ دیکھئے۔ ہمارے معاشرہ کے بگاڑ کے بہت سے اسباب میں سے ایک سبب یہ بھی ہے کہ بدقسمتی سے ہمارے اکثر علماء کرام میں رواداری نہیں رہی۔ان میں تحزب ہے۔کوئی شخص الا ماشاءاللہ اپنے حلقہ کے سوا دوسرے کی بات پر غور کرنا تو کجا کان دھرنے کے لیے بھی تیار نہیں ہوتا بلکہ بعض حضرات نہایت فروعی معاملات کا تعاقب کرتے ہیں اور ان کو اتنی اہمیت دیتے ہیں کہ دین کی اصل حقیقت ان فروعات کے پردے میں چھپ جاتی ہے۔جس حلقہ کے علماء کی عظیم اکثریت نے مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم اور مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی مرحوم کو عالم دین نہیں مانا ان کی نظر میں بھلا آپ کی حیثیت کیا ہوسکتی ہے! ـــــ جو شخص بھی دین کا بنیادی اور ٹھوس کام لے کر اُٹھتا ہے' دعوت دیتا ہے اور اس کی دعوت کے اثرات ظاہر ہونے شروع ہوتے ہیں تو اسے ایسے حالات سے سابقہ پیش آتا ہی ہے جیسے آپ کو پیش آرہے ہیں آپ اس سے کوئی اثر نہ لیں۔ اپنا کام کرتے رہیں۔آپ اپنے اخلاص اور محنت کا اجر اللہ کے یہاں محفوظ پائیں گے۔

۞ ـــــ تبلیغی جماعت کے متعلق مولانا مرحوم نے فرمایا: تبلیغی جماعت ابتدائی چند سالوں تک تحزب سے پاک رہی ہے۔اس کام کے محرک حضرت مولانا محمد الیاس ؒ بڑے اللہ والے شخص تھے۔ بڑے وسیع القلب تھے۔ بڑے منکسر المزاج اور متواضع شخصیت تھے۔ نہایت متقی و متدین تھے۔مسلمانوں کی دینی و اخلاقی پستی پر نہایت کرب اور تکلیف محسوس کرتے تھے۔نہایت مضطرب رہتے تھے۔نہایت بےنفس اور مخلص انسان تھے۔اغلباً سن ۴۴ کا واقعہ ہے جبکہ ان کے کام کو تین چار سال گزرے تھے۔وہ دہلی کے محلّہ کشن گنج کی ایک مسجد میں اپنے چند قریبی ساتھیوں کے ساتھ تشریف لائے۔مقصد لوگوں کو دین کی دعوت دینا اور اپنے کام سے متعارف کرانا تھا۔ مجھے معلوم ہوا تو میں بھی بغرض استفادہ پہنچ گیا۔مغرب کی نماز وہیں مولانا رحمۃ اللہ کی اقتداء میں پڑھی۔مولاناؒ نے جب مجھے دیکھا تو خود ہی پیش قدمی کر کے میرے پاس تشریف لائے۔ بڑی محبت وشفقت اور تپاک سے ملے اور گلے لگایا۔اور فرمایا کہ

''تم نے آ کر میرا کام آسان کردیا۔اب میرے بجائے تم تقریر کرو گے''۔ میں نے عرض کیا کہ حضرت! میں تو آپ کے ارشادات سے مستفید ہونے آیا تھا۔آپ کی موجودگی میں میں تقریر کروں! یہ کیسے ہوسکتا ہے۔ دوسرے لوگ بھی آپ کا وعظ و نصیحت سننے آئے ہیں وہ بھی مایوس ہوں گے۔ فرمانے لگے:''بھائی مجھے تقریر کرنی کب آتی ہے یہ تو اللہ تعالیٰ نے ایک جذبہ اور ایک تڑپ ایک لگن دل میں پیدا کردی ہے جو مجھے کشاں کشاں مختلف جگہوں پر لے جاتی ہے۔تقریر تم ہی کرو گے''۔ میں نے بہت معذرت چاہی' لیکن مولاناؒ نے میری ایک نہیں سنی۔امتثالِ امر میں مجھے تقریر کرنی پڑی۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ میں نے ''دین کے تقاضے'' کے موضوع پر ایک گھنٹہ تقریر کی۔تقریر کے بعد مولانا ؒ نے مجھے گلے لگایا اور میرے رخسار کا بوسہ لیا۔ بعد میں صرف چند منٹ میں مولاناؒ نے میری تقریر کی تصویب فرمائی اور مختصر طور پر اپنے تبلیغی کام سے متعارف کرایا۔

۞ ـــــ مولانا مرحوم نے بعدہ فرمایا:''آپ نے یہ واقعہ سن لیا۔اب دوسرا ایک اہم واقعہ سنیے یہ غالباً ۱۹۷۳ء کی بات ہے کہ مجھے جنوبی افریقہ سے ڈربن یونیورسٹی سے چند لیکچرز دینے کے لیے دعوت نامہ آیا اور میں وہاں چلا گیا۔ وہاں جا کر معلوم ہوا کہ ڈربن سے تقریباً دس میل دور ایک مضافاتی بستی میں تبلیغی جماعت کا ایک بہت بڑا اجتماع ہورہا ہے۔ میں استفادہ کے خیال سے وہاں چلا گیا ـــــ پاکستان سے مولانا محمد یوسف بنوری ؒ بھی تشریف لائے ہوئے تھے۔انہوں نے مجھے دیکھ کر بڑی مسرت کا اظہار فرمایا اور کہنے لگے کہ اب جبکہ تم آگئے ہو تو تم کو آج کے اجتماع میں تقریر کرنی ہوگی۔ میں نے معذرت کی لیکن مولاناؒ اصرار فرماتے رہے۔ مجھے بالآخر ہتھیار ڈالنے پڑے۔مولانا مرحوم مجھے لے کر منتظمین کے پاس پہنچے۔میرا تعارف کرایا اور منتظمین سے کہا کہ آج کے پروگرام میں میری تقریر بھی شامل کرلیں۔ منتظمین نے پہلے تو مختلف عذرات پیش کیے' لیکن جب مولانا بنوریؒ نے زیادہ اصرار کیا تو صاف طور پر جواب ملا کہ ''مولانا! ہم نے یہ پالیسی طے کررکھی ہے کہ ہم اپنے پلیٹ فارم سے کسی ایسے صاحب کو تقریر کی اجازت نہیں دیں گے جو ہمارے کام سے مکمل اتفاق نہ رکھتا ہو اور عملاً ہمارے کام میں شریک نہ ہو''۔مولانا بنوریؒ نے پھر اصرار کیا کہ یہ کوئی ایسی بات نہیں کہیں گے جو اختلافی ہو۔ یہ تو دین کی دعوت ہی پیش کریں گے''۔لیکن منتظمین کسی طرح تیار نہیں ہوئے ـــــ مولانا بنوریؒ کی بات بھی نہیں مانی ـــــ یہ ۱۹۷۳ء کا واقعہ ہے جو میرے ساتھ پیش آیا ـــــ اب تو تحزب اور بھی پختہ ہوگیا ہے۔ایسے دسیوں واقعات میرے علم میں

ہیں کہ یہ حضرات دوسرے علماء کو کس نظر سے دیکھتے ہیں۔ میرے علم میں یہ بات بھی ہے کہ یہ لوگ اپنے متوسلین کو باقاعدہ منع کرتے ہیں کہ دوسرے علماء کے مواعظ اور قرآن کے دروس میں شرکت نہ کیا کریں۔

۞ —— مولانا مرحوم نے فرمایا: ''میرا اندازہ ہے کہ جنوبی افریقہ کے اس اجتماع میں دس ہزار سے بھی متجاوز حضرات شریک تھے۔ پاکستان' بھارت اور افریقہ کے مختلف ممالک سے اُردو بولنے اور سمجھنے والے لوگ آئے ہوئے تھے۔ چار پانچ روز کا اجتماع تھا۔ بڑے معقول انتظامات تھے —— میں نے منتظمین میں سے ایک صاحب سے جو میرے کچھ زیادہ قریب ہو گئے تھے دریافت کیا کہ ان انتظامات پر اندازاً کیا خرچ آتا ہوگا تو انہوں نے بتایا کہ تقریباً پندرہ ہزار ڈالر روزانہ —— میں نے پوچھا کہ فنڈز کا انتظام کیسے ہوتا ہے تو جواب ملا کہ جنوبی افریقہ کے کوئی بڑے سیٹھ ہیں۔ انہوں نے تمام اخراجات اپنے ذمہ لیے ہوئے ہیں۔ میں نے دل میں سوچا کہ شاذ اور انتہائی ضعیف احادیث اور بزرگوں کے اقوال سے فضائل کا جو فلسفہ اختیار کیا گیا ہے اس اعتبار سے سیٹھ صاحب کا یہ مالی تعاون ان کے لیے تو آخرت میں بڑے اعلیٰ مقامات کے حصول کا ذریعہ بنے گا۔

۞ —— مولانا مرحوم نے فرمایا: ''مجھے جس بات کا سب سے زیادہ افسوس ہوتا ہے وہ یہ کہ ان حضرات نے نہی عن المنکر کو اپنے پروگرام سے بالکل خارج کر رکھا ہے۔ دین کے اعتبار سے یہ بہت خطرناک ہے۔ پھر یہ کہ قرآن کا تو ان کی تقریروں اور گفتگوؤں میں حوالہ شاید ہی ملے۔ حدیثوں کا بھی صرف مطلب بیان ہوتا ہے۔ وہ زیادہ تر فضائل سے متعلق ہوتی ہیں یا پھر عذابِ جہنم سے۔ یہ آخری بات تو بہت پسندیدہ ہے لیکن ان کا زیادہ زور بزرگوں کے فرمودات پر ہوتا ہے۔ اور بزرگوں سے منسوب کر کے یہ بڑی عجیب عجیب باتیں کہا کرتے ہیں۔ بہرحال اگر جماعت کو دین کا صحیح فکر اور فہم مل جائے تو یہ ایک بڑی مؤثر طاقت بن سکتی ہے۔ ہم دعا ہی کر سکتے ہیں کہ یہ جو افرادی قوت پیدا ہو رہی ہے یہ صحیح طور پر اسلام کے لیے لگ جائے —— اللہ تعالیٰ ہم سب کو صراطِ مستقیم کی ہدایت عطا فرمائے۔ (جمیل الرحمٰن)

۞۞۞

مولانا سعید احمد اکبر آبادی
کی 'میثاق' میں شائع شدہ گفتگو سے متعلق

دو نہایت اہم وضاحتی خطوط

—— (۱) ——

مکتوب گرامی مولانا اخلاق حسین قاسمی مدظلہ (دہلی)

گرامی قدر محترم ڈاکٹر صاحب' السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

مولانا سعید احمد صاحب اکبر آبادی مرحوم کا انٹرویو میثاق میں نظر سے گزرا' آپ کے اور میثاق کے تعلق سے اس انٹرویو کی بعض باتیں بعض دینی حلقوں میں باعث شکایت بن سکتی ہیں اس لیے یہ چند سطریں میثاق میں شائع کر کے ممنون فرمائیں'

مولانا انور شاہ صاحب کشمیری کے استعفا کا واقعہ اور اس کا پس منظر اس سے بالکل مختلف ہے جو بیماری کے آخری ایام میں مولانا اکبر آبادی کی زبان سے نکلا۔ اس وقت کی مجلس شوریٰ اس دور کے نہایت معتمد اور متدین حضرات پر مشتمل تھی' اس شوریٰ نے اس وقت کے اہتمام پر خویش پروری کا الزام لگایا اور نہ مالی کمزوری کا۔ شاہ صاحب کا استعفا ان کے جوشیلے شاگردوں کی ایک پارٹی کی سیاست کا نتیجہ تھا —— جس پارٹی سے مولانا اکبر آبادی بھی وابستہ رہے'

مولانا محمد سالم صاحب خلف مولانا محمد طیب صاحب اس الزام کی وضاحت میں خود ہی ایک بیان ارسال کریں گے۔

تبلیغی جماعت کے عام کارکنوں سے —— خواص سے نہیں —— کچھ شکایات ضرور رہتی ہیں لیکن اس کے باوجود علماء حق اس تحریک کو مستحسن نظروں سے دیکھتے ہیں' بعض جزوی کمزوریوں کے سبب ایک بنیادی تبلیغی جدوجہد کو اس قدر مطعون کرنا قطعی طور پر نامناسب ہے' مولانا علی میاں صاحب ہوں یا منظور نعمانی صاحب یا دوسرے علماءِ مدارس سب اس تحریک سے وابستہ ہیں' اصلاح حال کی کوشش کی جاتی ہے اور کی جانی چاہیے۔

ایسی صورت میں جبکہ یہ تحریک اپنے سربراہ شیخ الحدیث کی بھاری بھرکم شخصیت سے محروم

ہوگئی ہے اور مولانا انعام الحسن صاحب علالت طبع کے سبب وقت کم دیتے ہیں' اس جدوجہد کو سہارا دینا ضروری ہے —— نہی عن المنکر تبلیغ کا ایک اہم رکن ہے مگر اس کی ادائیگی کے لیے صرف تبلیغی جماعت کو ذمہ دار قرار نہیں دیا جاسکتا —— باہر کے علماء اس کام میں کتنا وقت دیتے ہیں —— وہ غور کریں' ہم غور کریں'

اکبر آبادی صاحب نے مولانا تھانوی کے بارے میں فرمادیا کہ وہ علماء کی نظروں میں مشتبہ تھے —— خدا جانے اس کا کیا مطلب ہے —— مولانا اکبر آبادی تاریخ وادب کے آدمی تھے' حدیث وفقہ کے آدمی نہیں تھے' اس لیے حدیث وفقہ کے مسائل میں مولانا کا اجتہاد اور تلفیق بین المذاہب اہل علم کو شبہ میں ڈالتی تھی۔

فقہی مسائل میں ضرورت کے لحاظ سے ترجیح اور تلفیق اصحاب فن کی ایک جماعت بحث وتذکرہ کے بعد کرسکتی ہے —— یہ کام انفرادی طور پر کرنے کا نہیں ہے۔ علامہ اقبال نے صحیح طور پر ایک مکتوب میں لکھا ہے کہ علمی اور سماجی زوال کے دور میں اجتہاد سے تقلید بہتر ہے۔

آمین' رفع یدین' فاتحہ خلف الامام وغیرہ بعض مشہور مسائل عبادت میں ترجیح اور تلفیق کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ نہ یہ مسائل آج مسلم معاشرہ کو پریشان کررہے ہیں۔

جو مسائل پریشان کررہے ہیں وہ تمدنی' معاشی اور اجتماعی مسائل ہیں جن کو سمجھنے کی اہلیت بھی ہر مذہبی عالم میں نہیں ہے —— انہیں حل کرنے کی منزل تو بعد میں آتی ہے۔ یہ مسائل جدید وقدیم اہل علم کے اجتماعی اجتہاد کا تقاضا کرتے ہیں۔

دراصل آپ دارالعلوم دیوبند کے حالیہ قضیہ میں مولانا اکبر آبادی صاحب کا جو رویہ تھا اس سے اچھی طرح باخبر نہیں ہیں ورنہ آپ مرحوم کو نہ چھیڑتے' مرحوم کی شخصیت اس قضیہ میں متنازع بن گئی تھی اور اس وجہ سے ان کا ذہن اسی گروہ بندی سے متأثر رہا۔

مولانا مرحوم کی جدائی ایک عظیم دینی اور ملی سانحہ ہے' جو ان العمر صاحبزادے کی اندوہناک وفات کے بعد سے وہ بجھتے چلے جارہے تھے' —— خدا تعالیٰ ان کے درجات بلند فرمائے۔

تمام اکابر واحباب کی خدمت میں سلام مسنون۔

اخلاق حسین قاسمی

۲۴ اگست ۸۵ء

—— (۲) ——

مکتوب گرامی مولانا محمد منظور نعمانی مدظلہٗ (لکھنؤ)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

از محمد منظور نعمانی

لکھنؤ

مکرم ومحترم جناب ڈاکٹر اسرار احمد صاحب! احسن اللہ الیکم والینا

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔ خدا کرے مزاج بعافیت ہو۔

یاد آتا ہے کسی عریضہ میں اپنا یہ حال آپ کو لکھ چکا ہوں کہ ہائی بلڈ پریشر کا مریض ہوں۔ اس کی وجہ سے اپنے اوپر یہ پابندی عائد کرلی ہے کہ شدید ضرورت ہی سے کسی چیز کا مطالعہ کرتا ہوں۔ دفتر الفرقان میں کہہ دیا ہے کہ جو رسائل وجرائد آتے ہیں میرے پاس نہ بھیجے جائیں۔ قریباً دو ڈھائی سال سے اس پر عمل ہورہا ہے اور ان کے مطالعہ سے محرومی پر اپنے کو قانع کرلیا ہے۔ اب یاد نہیں کہ کتنی مدت سے میثاق کی اور اسی طرح دوسرے رسائل کی صورت بھی نہیں دیکھی —— دو تین دن ہوئے مولوی خلیل الرحمٰن سجاد سلمہٗ نے ذکر کیا کہ تازہ میثاق میں آپ کا ذکر آیا ہے اس کو دیکھ لینا چاہیے۔ میں نے کہہ دیا کہ وہ مجھے پہنچا دیجو۔ انہوں نے پہنچا دیا اور یہ بھی بتلا دیا کہ صفحہ ۱۲ اور ۱۸ پر آپ کا ذکر ہے۔ میں نے اس کو دیکھا۔ اس کے بعد مولانا اکبر آبادی مرحوم کے اور آپ کے اس پورے سلسلۂ کلام کو بھی پڑھا۔

اس وقت صرف اپنے بارے میں ضروری سمجھ کر ممکن حد تک اختصار کے ساتھ کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں۔ **بل الانسان علی نفسہٖ بصیرۃ۔**

میں یقین دلاتا ہوں کہ مجھے اس کا وہم اور وسوسہ بھی نہیں ہے کہ آپ نے یا اس مکالمہ کے مرتب کرنے والے صاحب نے کوئی بات غلط طور پر مولانا مرحوم کی طرف نسبت کرکے نقل فرمائی ہوگی۔ یا مولانا مرحوم نے میرے بارے میں کوئی بات دانستہ طور پر غلط طور پر بیان فرمائی ہوگی —— اور پورے یقین اور وثوق کے ساتھ یہ بھی عرض کرتا ہوں کہ جو دو باتیں میرے بارے میں کہی گئی ہیں وہ صحیح نہیں ہیں۔ کسی غلط فہمی کا نتیجہ ہوں گی۔

میرا خیال ہے کہ جس طرح اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کی شکل وصورت الگ بنائی ہے غالباً اسی طرح ہر ایک کی ذہنی ساخت بھی الگ ہے۔ بعض حضرات کے متعلق میرا ذاتی تجربہ ہے کہ ایک بات ان کے ذہن اور خیال میں ہوتی ہے پھر وہ ایک واقعہ کی طرح ان کے ذہن میں مرتسم ہو جاتی ہے پھر وہ اس کو واقعہ کے طور پر بیان فرما دیتے ہیں بلکہ لکھ بھی دیتے ہیں ——

میرا خیال وقیاس ہے (**والعلم عند اللہ**) کہ میثاق کی روایت کے مطابق مولانا مرحوم نے حضرت مولانا شاہ وصی اللہؒ الٰہ آبادی (وصی احمد خاں نہیں) کے کسی ''مرید خاص'' کے کسی رسالہ کے بارے میں مجھ سے متعلق جو بیان فرمایا میں اپنے حافظہ پر پورے اعتماد اور وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ اس طرح کی کوئی بات مولانا مرحوم کے اور میرے درمیان کبھی نہیں ہوئی۔ میں نے یہ بات میثاق میں پہلی دفعہ پڑھی ہے —— میرا خیال یہ ہے کہ انہوں نے کبھی ایسا خیال فرمایا ہوگا اور پھر وہ واقعہ کے طور پر ان کے ذہن میں قائم ہو گیا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اس طرح کی بات مولانا مرحوم کی کسی اور صاحب سے ہوئی ہو۔ واللہ اعلم!

اسی طرح صفحہ ۱۸ کی پہلی ہی سطر میں مجھ سے متعلق مولانا مرحوم کا جو بیان نقل ہوا ہے کہ (تبلیغی جماعت کے کام سے مایوس ہو کر) ''وہ بھی ہٹ گئے'' حیرت ہے کہ یہاں میری کسی گفتگو یا تحریر کا حوالہ نہیں دیا گیا ہے —— میرا قیاس اور اندازہ ہے کہ مولانا مرحوم نے یہ بات میرے اس حال اور طرز عمل سے سمجھی ہوگی کہ جس سرگرمی سے میں کسی زمانہ میں اس دعوت وتبلیغ کے کام میں حصہ لیتا تھا۔ ملک کی تقسیم سے پہلے کراچی، کوئٹہ، قلات، پشاور اور کوہاٹ تک کے سفر کرتا تھا اور تقسیم کے بعد بھی بنگال، حیدرآباد اور مدراس جیسے دور دراز علاقوں تک پھرتا تھا۔ کچھ مدت کے بعد میرا وہ حال نہیں رہا۔ اور ہندوستان کے مخصوص حالات کے پیدا کیے ہوئے بعض دوسرے دینی وملی مسائل کی طرف میری توجہ کچھ زیادہ رہی۔ اور اب تو قریباً ۱۰۔۱۲ سال سے معذوری کی وجہ سے خانہ نشینی کی زندگی گزار رہا ہوں۔ غالب گمان اور قرین قیاس یہی ہے کہ مولانا مرحوم نے میرے اس حال سے وہ سمجھا جو انہوں نے آپ سے فرمایا لیکن حقیقت اور واقعہ یہ ہے کہ دینی دعوت کی اس جدوجہد کے بارے میں میری فکر اور رائے میں کوئی ایسی تبدیلی کبھی نہیں آئی جس کو ''ہٹ جانے'' سے تعبیر کیا جا سکے۔

اس کام کے ساتھ میرے تعلق کی سرگزشت مختصر الفاظ میں یہ ہے کہ حضرت مولانا محمد الیاسؒ کی وفات سے قریباً ایک سال پہلے اس دینی دعوت کے سلسلہ ہی کے ایک سفر میں ایک ہفتہ ان کے ساتھ رہ کر میں نے اس کام کو کچھ سمجھا تھا اور عملی حصہ لینا شروع کر دیا تھا۔ پھر ان

کے مرض وفات کے آخری چار مہینوں میں میرا زیادہ تر قیام نظام الدین دہلی حضرتؒ کی خدمت میں رہا۔ اس قیام کے زمانے میں حضرت کی ذات اور ان کی دعوت سے میرا قلبی تعلق بہت بڑھ گیا اور میں نے اپنے وقت کے بڑے حصے کو اس کے لیے گویا وقف کر دیا۔ پھر حضرت کی وفات کے بعد قریباً ۳۔۴ سال تک یہی حال رہا۔ اس کے بعد (جہاں تک یاد ہے) غیر ارادی طور پر اس میں کچھ کمی شروع ہوئی —— یہ کمی صرف عمل اور جدوجہد میں تھی۔

اس کے بعد ایک وقت آیا کہ ہندوستان کے مخصوص حالات سے پیدا ہونے والے دینی وملی کاموں کی ضرورت کے احساس نے اپنی طرف متوجہ کر لیا اور پھر ایک مدت تک زیادہ مشغولیت ان ہی کاموں میں رہی لیکن دینی دعوت والے کام سے بے تعلقی کبھی نہیں ہوئی۔ پھر اب دس سال سے تو اس معذوری کے حال میں ہوں جو آپ کے علم میں ہے۔

اپنی گزری ہوئی زندگی کے بارے میں میرا احساس یہ ہے کہ اس کا نسبتاً اچھا اور آخرت میں زیادہ کام آنے والا حصہ وہی تھا جب میں نے اپنے وقت کا بڑا حصہ اس دینی دعوت کے کام کے لیے وقف کر رکھا تھا اور اس راستے میں مالی اور جانی قربانی کی توفیق مل رہی تھی۔ اپنی زندگی کے بارے میں یہ میری رائے ہے اور ہر صاحب رائے کو اس سے اختلاف کرنے کا حق ہے۔

آخری گزارش یہ ہے کہ اس عریضہ کو میثاق کی کسی قریبی اشاعت میں شائع فرما کر ممنون کرم فرمایا جائے۔ تاکہ اس کے قارئین کو میرا حال اور موقف معلوم ہو جائے۔ **ولكم جزيل الشكر**

دعا کا محتاج وطالب اور دعا گو ہوں۔

والسلام
محمد منظور نعمانی

باب ششم

'قرآن کے نام پر اُٹھنے والی تحریکات

----- اور -----

اُن کے بارے میں علماءِ کرام کے خدشات'

کے موضوع پر

ڈاکٹر اسرار احمد

کی مفصل تقریر

●

اس پر

بعض اکابر ملت اور دینی جرائد

کے تبصرے

●

اور ان کے ضمن میں ضروری وضاحتیں

خطاب جمعۃ الوداع' رمضان المبارک ۱۴۰۴ھ

شائع شدہ 'میثاق' ستمبر ۱۹۸۴ء

● مکاتیب گرامی

—— جناب ڈاکٹر غلام محمد صاحب مدظلہ' کراچی

(خلیفہ مجاز مولانا سید سلیمان ندویؒ)

—— جناب مولانا اخلاق حسین قاسمی مدظلہ

(مہتمم و شیخ التفسیر جامعہ رحیمیہ' دہلی)

—— مولانا سید وصی مظہر صاحب ندوی

(تنظیم اصلاح و خدمت' حیدر آباد' سندھ)

—— مولانا سید حامد میاں مدظلہ

(مہتمم و شیخ الحدیث' جامعہ مدنیہ' لاہور)

(شائع شدہ' میثاق' نومبر ۱۹۸۴ء)

● تبصرے

—— ہفت روزہ 'چٹان' لاہور

—— ہفت روزہ 'تنظیم اہل حدیث' لاہور

(شائع شدہ' میثاق' دسمبر ۱۹۸۴ء)

● مخلصانہ تنقیدوں اور خیر خواہانہ مشوروں کے ضمن میں گزارشات از: اسرار احمد

—— تذکرہ و تبصرہ 'میثاق' دسمبر ۱۹۸۴ء

—— تذکرہ و تبصرہ 'میثاق' جنوری ۱۹۸۵ء

’قرآن کے نام پر اُٹھنے والی تحریکات

اور

اُن کے بارے میں علماءِ کرام کے خدشات‘

خطاب جمعۃ الوداع

رمضان المبارک ۱۴۰۴ھ جامع مسجد دارالسلام باغ جناح، لاہور

مرتب: (شیخ) جمیل الرحمٰن

خطبۂ مسنونہ کے بعد تلاوتِ آیات:

اعوذ باللّٰہ من الشَّیطٰن الرَّجیم ۔ بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

﴿یٰۤاَیُّہَا النَّاسُ قَدۡ جَآءَتۡکُمۡ مَّوۡعِظَۃٌ مِّنۡ رَّبِّکُمۡ وَ شِفَآءٌ لِّمَا فِی الصُّدُوۡرِ ۬ۙ وَ ہُدًی وَّ رَحۡمَۃٌ لِّلۡمُؤۡمِنِیۡنَ ﴿۵۷﴾﴾ (یونس)

﴿اِنَّ اللّٰہَ لَا یَسۡتَحۡیٖۤ اَنۡ یَّضۡرِبَ مَثَلًا مَّا بَعُوۡضَۃً فَمَا فَوۡقَہَا ؕ فَاَمَّا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا فَیَعۡلَمُوۡنَ اَنَّہُ الۡحَقُّ مِنۡ رَّبِّہِمۡ ۚ وَ اَمَّا الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا فَیَقُوۡلُوۡنَ مَاذَاۤ اَرَادَ اللّٰہُ بِہٰذَا مَثَلًا ۘ یُضِلُّ بِہٖ کَثِیۡرًا ۙ وَّ یَہۡدِیۡ بِہٖ کَثِیۡرًا ؕ وَ مَا یُضِلُّ بِہٖۤ اِلَّا الۡفٰسِقِیۡنَ ﴿۲۶﴾﴾ (البقرۃ)

﴿وَ اعۡتَصِمُوۡا بِحَبۡلِ اللّٰہِ جَمِیۡعًا وَّ لَا تَفَرَّقُوۡا ......﴾ (آل عمران:۱۰۳)

رَبِّ اشۡرَحۡ لِیۡ صَدۡرِیۡ وَ یَسِّرۡ لِیۡۤ اَمۡرِیۡ وَ احۡلُلۡ عُقۡدَۃً مِّنۡ لِّسَانِیۡ یَفۡقَہُوۡا قَوۡلِیۡ

اَللّٰھُمَّ وَفِّقۡنَا لِمَا تُحِبُّ وَتَرۡضٰی ...... آمین یا ربّ العالمین

گزشتہ خطابات کا خلاصہ

پچھلے دو جمعوں سے میری گفتگو جس موضوع پر چل رہی ہے اس کا جامع عنوان ہے: ’’جہاد بالقرآن‘‘(۱) ——— اس ضمن میں پہلے جمعہ میں تمہیدی طور پر اُن نکات کو ایک نئی ترتیب سے پیش کیا گیا تھا جو بارہا میں آپ کے سامنے رکھ چکا ہوں۔ قرآن مجید کے مطالعہ سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ نبی اکرم ﷺ کا آلۂ انقلاب قرآن حکیم ہے۔ رسول اللہ ﷺ کی جدوجہد کو اگر دو مرحلوں میں تقسیم کریں تو ایک مکی دَور ہے اور دوسرا مدنی دَور ہے۔ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ مدنی دَور میں نمایاں ترین چیز تلوار ہے جبکہ مکی دَور کی نمایاں ترین چیز قرآن مجید ہے۔ قرآن وہ معنوی تلوار ہے جس نے نظریاتی اور اعتقادی سطح پر شرک، کفر، الحاد اور زندقہ کا قلع قمع کیا۔ مدنی دَور کی تلوار حقیقی تلوار ہے، جس نے مشرکین و کفار کے ساتھ نبرد آزمائی کی۔ اصل میں یہ دو تلواریں اللہ تعالیٰ نے نبی اکرم ﷺ کے سپرد فرمائی تھیں، بفحوائے آیت سورۃ الحدید: ﴿لَقَدۡ اَرۡسَلۡنَا رُسُلَنَا بِالۡبَیِّنٰتِ وَ اَنۡزَلۡنَا مَعَہُمُ الۡکِتٰبَ وَ الۡمِیۡزَانَ لِیَقُوۡمَ النَّاسُ بِالۡقِسۡطِ ۚ وَ اَنۡزَلۡنَا الۡحَدِیۡدَ فِیۡہِ بَاۡسٌ شَدِیۡدٌ......﴾ (آیت ۲۵) ’’ہم نے بھیجا ہے اپنے رسولوں کو واضح نشانیوں کے ساتھ اور ہم نے اتاری ان کے ساتھ کتاب اور میزان تاکہ لوگ انصاف پر قائم رہیں، اور اتارا ہم نے لوہا جس میں سخت لڑائی (کی صلاحیت) ہے‘‘۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے تحت الشعور میں ایک بندۂ مؤمن کی شخصیت کا جو ہیولیٰ ہے اس کے ایک ہاتھ میں قرآن اور دوسرے ہاتھ میں تلوار نظر آتی ہے۔ یہ تصور ہمیشہ سے ہمارے اجتماعی شعور میں موجود ہے۔

اسی طرح جب میں نے نبی اکرم ﷺ کی سیرتِ مطہرہ، آپؐ کی بائیس تیئیس سالہ جدوجہد اور آپؐ کے انقلابی عمل پر غور کیا تو یہی دو اہم مراحل میرے سامنے آئے۔ آنحضور ﷺ نے آغازِ وحی کے بعد تن تنہا توحید کے انقلابی نظریہ کی تبلیغ و دعوت کا آغاز فرمایا۔ اس کا اصلی آلہ قرآن مجید تھا۔ آپؐ کی تمام مساعی کا محور و مدار قرآن مجید ہی تھا۔ جو سعید روحیں آپؐ پر ایمان لائیں آپؐ نے ان کی تربیت و تزکیہ فرمایا، ان کو کتاب و حکمت کی تعلیم دی، انہیں منظم فرمایا اور اس طرح متقی افراد کی ایک جماعت تیار فرمائی۔ ان اصحاب کے قلوب میں ایمان و یقین اس طور سے پیوست اور نقش ہو گیا تھا کہ جس کی بدولت ان کے اندر دینِ توحید

(۱) محترم ڈاکٹر صاحب کے یہ دونوں خطابات ’’جہاد بالقرآن اور اُس کے پانچ محاذ‘‘ کے عنوان سے کتابی صورت میں موجود ہیں۔

کے لیے تن من دھن قربان کرنے کا جذبہ' اس راہ میں پیش آنے والے مصائب و شدائد کو برداشت کرنے کا عزم و حوصلہ' راہِ حق میں جامِ شہادت نوش کرنے کا ذوق وشوق' یہاں تک کہ اگر اللہ کے دین کے لیے گھر بار' بیوی بچے' اعزہ و اقارب کو چھوڑنا پڑے تو اس کے لیے بھی ہمہ تن آمادگی پیدا ہو گئی تھی۔ الغرض ایثار و قربانی کے وہ عزائم جو کسی بھی انقلابی تحریک کے لیے ناگزیر ہوتے ہیں' ان میں اپنے نقطۂ عروج و کمال کو پہنچے ہوئے تھے ـــــ اس جماعت کے ہر فرد کے لیے اپنے ہادی و رہنما ﷺ کا اشارہ بھی حکم کے درجہ میں تھا کہ جو بات آپؐ نے فرما دی اس پر سرِ تسلیم خم ہے۔ نورٌ علیٰ نور یہ کہ ایسا رویہ اور طرزِ عمل صرف رضائے الٰہی کی خاطر پیشِ نظر تھا۔ جدید اصطلاح میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہ ایسے فدائین اور جاں نثاروں کی جماعت تھی جو مکمل طور پر committed افراد پر مشتمل تھی۔ اس میں سمع و طاعت کا نظام بکمال و تمام موجود تھا۔ اس جماعت کے ہر فرد کا تزکیۂ نفس اس کمال تک ہو گیا تھا کہ نفسِ انسانی کے رذیل تقاضوں' شہوات و لذات کے ناشائستہ داعیات' دل کے امراض اور اخلاقی ذمائم پر قابو پا کر انہوں نے اپنے قلوب و نفوس کو پاک کر لیا تھا۔ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی جماعت کے اوصاف کے لیے یہ بات ہی کافی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے خود قرآن حکیم میں متعدد مقامات پر ان کی مدح فرمائی ہے۔

اس سے اگلا مرحلہ یہ ہے کہ اس جماعت نے جدوجہد کی' قربانیاں دیں' کفر کی طاقت سے پنجہ آزمائی کی' مقاتلہ کیا' فَيَقْتُلُونَ وَيُقْتَلُونَ کے مصداق انہوں نے کفار کو قتل بھی کیا اور خود بھی اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کر دیا۔ اس اجتماعی جدوجہد کے ذریعے نبی اکرم ﷺ کی قیادت میں جزیرہ نمائے عرب میں انقلاب برپا ہو گیا۔ لیکن قابل غور بات یہ ہے کہ ایسی جماعت کیسے وجود میں آئی! درحقیقت یہ سب جہاد بالقرآن کے باعث ممکن ہوا۔ قرآن کے ذریعہ دعوت' قرآن کے ذریعہ تذکیر' قرآن کے ذریعہ انذار و تبشیر' قرآن کے ذریعہ تزکیۂ نفس' قرآن کے ساتھ راتوں کا قیام' از روئے الفاظِ قرآنی: ﴿وَمِنَ الَّيْلِ فَتَهَجَّدْ بِهٖ﴾ (الاسراء:۷۹) ''رات کا ایک حصہ جاگ کر گزارو اس قرآن کے ساتھ''۔ ﴿شِفَاءٌ لِّمَا فِي الصُّدُوْرِ﴾ یہ قرآن ہے' اللہ کی طرف سے نازل کردہ وعظ و نصیحت بھی یہ قرآن ہے اور اہل ایمان کے لیے شفاء اور رحمت بھی یہی ہے۔ چنانچہ اس جماعت کی تیاری میں مرکز و محور قرآن رہا ہے۔ قرآن کو اس کا ذریعہ کہہ لیں' اس کا ہتھیار کہہ لیں' اس کا آلہ کہہ لیں' اس کا نسخہ کہہ لیں' یہ سب باتیں قرآن پر راست آئیں گی۔ مولانا حالی نے کیا خوب کہا ہے: ؎

اُتر کر حرا سے سوئے قوم آیا ۔۔۔ اور اک نسخۂ کیمیا ساتھ لایا

یا بقول علامہ اقبال: ؎

در شبستانِ حرا خلوت گزید ۔۔۔ قوم و آئین و حکومت آفرید

جہاد بالقرآن کے پانچ محاذ

دوسرے جمعہ کی تقریر میں وہ پانچ محاذ گنوائے گئے تھے جن پر اِس وقت دینی اعتبار سے جدوجہد اور کشمکش کی ضرورت ہے۔ ان پانچوں محاذوں کے لیے اصل ہتھیار' اصل تلوار قرآن ہے۔ ان محاذوں پر جہاد بالقرآن ہوگا۔

پہلا محاذ جاہلیت قدیمہ کا ہے' جس میں مشرکانہ اوہام' بدعات اور شفاعتِ باطلہ جیسے تصورات ہیں۔ ان کا توڑ صرف قرآن سے ہوگا۔ اور اس کے لیے محض دورۂ ترجمۂ قرآن بہت کافی ہے۔

دوسرا محاذ جاہلیتِ جدیدہ کا محاذ ہے۔ یعنی الحاد اور مادہ پرستی ہے' ہر اُس چیز کا انکار ہے جو انسان کے حواس کی گرفت میں نہ آ سکے اور جو قابل تصدیق (verifiable) نہ ہو۔ اس کے لیے بھی تلوار قرآن ہے' لیکن یہ ذرا محنت طلب معاملہ ہے اور اس کے لیے قرآن کی حکمت اور اس کے فلسفے کی گہرائیوں میں غوطہ زنی کر کے علم و حکمت کے موتی نکالنے ہوں گے۔ معرفت الٰہی کے جو حقائق فطرتِ انسانی میں جبلی طور پر مضمر ہیں ان کو قرآنی استدلال کے ذریعے شعور کی سطح پر لانے کی کوشش کرنی ہو گی اور دورِ جدید کی اصطلاحات کے ذریعے قرآنی طرزِ استدلال کا ابلاغ کرنا ہوگا۔ یہ کام اگر نہیں کریں گے تو جاہلیت جدیدہ کا مقابلہ نہایت مشکل ہوگا۔

تیسرا محاذ بے یقینی اور تذبذب کی کیفیت ہے اور اس کا علاج ہے صحبتِ اصحاب یقین ع ''صحبت صالح تُرا صالح کند!'' یہ سب سے زیادہ آسان اور سہل ذریعے ہے' لیکن یہ اصحابِ یقین بھی قرآن ہی کے ذریعے پیدا ہوں گے۔ ایسے لوگ جب قرآن میں غوطہ زنی کرتے ہیں تو وہ محسوس کرتے ہیں کہ قرآن جو کچھ کہہ رہا ہے' جو تعلیمات پیش کر رہا ہے' جو استدلال کر رہا ہے وہ ان کی بدیہیاتِ فطرت کے مطابق ہے۔ یہ حقائق ان کے باطن میں مضمر ہیں' قرآن ان کو واشگاف اور منکشف کر کے تحت الشعور سے شعور کی سطح پر لا رہا ہے۔ اس طرح قرآن ان کا باطنی تجربہ بن جاتا ہے۔ جیسے آپ کو معلوم ہے کہ چینی میٹھی ہوتی ہے' یہ علم الیقین ہے۔ لیکن

جب آپ نے اسے چکھا تو آپ کے اس تجربے نے بھی بتا دیا کہ چینی واقعی میٹھی ہے۔ تجربہ سے جو یقین حاصل ہوتا ہے وہ حق الیقین ہے۔ قرآن حکیم پر حق الیقین انسان کو اُس وقت حاصل ہوتا ہے جب وہ قرآن حکیم پر غور وفکر اور تدبر میں منہمک ہوتا ہے۔ وہ جب اس کی گہرائیوں میں غوطہ زنی کرتا ہے تو اسے یہ احساس ہوتا ہے کہ قرآن جو کچھ کہہ رہا ہے وہ میرے دل کی آواز ہے‘ میری فطرت اس سے مطابقت رکھتی ہے‘ اور میرا قلب و ذہن اسے قبول کر رہا ہے۔ اس احساس سے درحقیقت وہ یقین پیدا ہوتا ہے جسے حق الیقین کہا جائے گا۔ اسی کو علامہ اقبال نے اپنے لیکچرز میں internal experience کہا ہے۔

چوتھا محاذ ہماری نفس پرستیاں اور شیطان کی وسوسہ اندازیاں ہیں۔ ہمارے نفس کے متعلق قرآن مجید ہمیں متنبہ کرتا ہے: ﴿اِنَّ النَّفۡسَ لَاَمَّارَۃٌۢ بِالسُّوۡٓءِ﴾ (یوسف:۵۳) اور: ﴿بَلۡ یُرِیۡدُ الۡاِنۡسَانُ لِیَفۡجُرَ اَمَامَہٗ ۚ﴿۵﴾﴾ (القیامۃ) ہمارا نفس لذت کوشیوں اور حرام خوریوں کا عادی ہو چکا ہوتا ہے۔ ہمیں غلط کاموں کی عادتیں پڑ گئی ہیں۔ تو ان تمام برائیوں کے لیے تلوار قرآن مجید ہی ہے۔ بقول اقبال: ؎

کشتنِ ابلیس کارے مشکل است زانکہ او گم اندر اعماقِ دل است
خوشتر آں باشد مسلمانش کنی کشتۂ شمشیرِ قرآنش کنی!

ہمارے سامنے پانچواں محاذ فرقہ واریت کا ہے۔ اس فرقہ واریت کی شدت کو کم کرنے اور غیریت کو ختم کرنے کے لیے ہمیں کوئی ایسی جڑ بنیاد اور کوئی ایسا مرکز ومحور درکار ہے جو ذہنی ہم آہنگی پیدا کرے اور پھر یہی ذہنی ہم آہنگی لوگوں کے اندر آپس میں قرب اور وابستگی کا ذریعہ بنے۔ فرقہ واریت کے عفریت کا قلع قمع کرنے کے لیے ہمارے پاس واحد تلوار قرآن مجید ہے اور یہی ہماری ذہنی ہم آہنگی اور باہمی قرب اور وابستگی کا واحد ذریعہ ہے۔ یہی سبق ہمیں سورۂ آل عمران کی آیت ۱۰۳ کے ابتدائی الفاظ میں ملتا ہے: ﴿وَاعۡتَصِمُوۡا بِحَبۡلِ اللّٰہِ جَمِیۡعًا وَّلَا تَفَرَّقُوۡا ......﴾ ”اور اللہ کی رسّی کو سب مل جل کر مضبوطی سے تھام لو اور تفرقہ میں مت پڑو“۔ متعدد احادیثِ نبویؐ میں اس امر کی وضاحت موجود ہے کہ حبل اللہ سے مراد قرآن مجید ہے۔ معلوم ہوا کہ ان پانچوں محاذوں پر ہمیں قرآن کے ساتھ جہاد کرنا ہے۔

قرآن کی بنیاد پر اسلامی انقلابی تحریک کی ضرورت

اب تک جو کچھ عرض کیا گیا وہ پچھلے دو جمعوں کی تقاریر کا خلاصہ بھی ہے اور آج کی گفتگو

کے لیے بمنزلۂ تمہید بھی۔ ایک عرصے سے میرے ذہن میں ایک بڑا سوال بلکہ اشکال رہا ہے۔ میں نے جس قدر قرآن کو پڑھا اور اپنی استعداد کے مطابق اس پر غور وفکر کیا‘ پھر سیرتِ مطہرہ کا معروضی مطالعہ کیا‘ رسول اللہ ﷺ کی حیاتِ طیبہ جن جن مراحل اور اَدوار سے گزری ہے ان پر آپ ﷺ کے منہجِ عمل اور انقلابی لائحہ عمل کو سمجھنے کے لیے سوچ بچار کیا تو اس نتیجہ تک پہنچا کہ قرآن مجید کو مرکز ومحور بنا کر ایک دعوت کا آغاز کیا جائے اور ایک خالص اسلامی انقلابی تحریک برپا کرنے کی سعی و جہد کی جائے۔ مجھے کچھ بزرگ ہستیوں کے افکار میں اس کی بھرپور تائید بھی ملی۔ میرے نزدیک چودھویں صدی ہجری میں دو عظیم ترین شخصیتیں گزری ہیں‘ نہ صرف برعظیم پاک و ہند کی حد تک بلکہ میرے اندازے کے مطابق پورے عالمِ اسلامی کی حد تک۔ ان میں سے ایک علامہ اقبال ہیں جو سکولوں‘ کالجوں اور یونیورسٹیوں کے تعلیم یافتہ لوگوں میں سے تھے اور انہوں نے قدیم وجدید مکاتیبِ فکر کا معروضی مطالعہ کیا۔ چنانچہ انہوں نے کہا ہے: ؎

عذابِ دانش حاضر سے باخبر ہوں میں
کہ میں اس آگ میں ڈالا گیا ہوں مثل خلیل

اور دوسری شخصیت حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی رحمۃ اللہ علیہ ہیں‘ جو دار العلوموں کی فضا سے نکلے تھے اور علمائے حقانی کے صحبت یافتہ اور فیض یافتہ تھے۔ یہ ہیں میرے نزدیک دو عظیم ترین شخصیتیں۔ ان میں سے حضرت شیخ الہندؒ کو میں چودھویں صدی کا مجدد مانتا ہوں۔ قرآن کی بنیاد پر اسلامی انقلابی تحریک برپا کرنے کی کوشش میں مجھے ان دونوں کی طرف سے تائید ملی۔ علامہ اقبال کے اشعار میں مسلمانوں کو رجوع الی القرآن کا بھرپور سبق دیا گیا ہے۔ مثلاً: ؎

گر تو می خواہی مسلماں زیستن نیست ممکن جز بہ قرآں زیستن

معلوم ہوا کہ ہمارے سامنے تجدید واحیائے دین کا راستہ ایک ہی ہے اور وہ یہ ہے کہ ہم قرآن حکیم کی طرف رجوع کریں۔ چنانچہ علامہ نے کتنے پرتاثیر اسلوب سے کہا ہے: ؎

خوار از مہجوریٔ قرآں شدی شکوہ سنج گردشِ دوراں شدی
اے چوں شبنم بر زمیں افتندۂ در بغل داری کتابِ زندۂ

اُمت مسلمہ کے زوال کا سبب قرآن سے دوری ومہجوری ہے اور اس کا علاج یہی ہے کہ مسلمان اس کتابِ زندہ پر عمل پیرا ہو جو وہ بغل میں دبائے بیٹھا ہے یا اسے پیٹھ پیچھے ڈال رکھا

ہے۔(۱) یہی عصائے موسیٰؑ ہے جو ہمارے پاس ہے' بلکہ میں بلا ارادۂ تنقیص عرض کر رہا ہوں کہ عصائے موسویؑ کی تو قرآن کے مقابلے میں کوئی حیثیت ہی نہیں ہے۔ اس لیے کہ عصائے موسیٰؑ کی معجز نمائی حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ ہی رخصت ہوئی' جب کہ نبی اکرم ﷺ کا لایا ہوا معجزہ قرآن مجید آج بھی زندہ ہے اور تا قیامِ قیامت زندہ و پائندہ رہے گا۔ اس کا یہ چیلنج جو چودہ صدی قبل دیا گیا تھا' قیامِ قیامت تک باقی رہے گا: ﴿وَاِنۡ كُنۡتُمۡ فِىۡ رَيۡبٍ مِّمَّا نَزَّلۡنَا عَلٰى عَبۡدِنَا فَاۡتُوۡا بِسُوۡرَةٍ مِّنۡ مِّثۡلِهٖ......﴾ (البقرۃ:۲۳) ''اور اگر تم اس چیز کے بارے میں کسی شک میں ہو جو ہم نے اپنے بندے پر اتاری ہے تو اس کے مانند ایک سورت ہی لے آؤ......''

علامہ اقبال کی ولولہ انگیز ملی شاعری سے تو میں زمانۂ طالب علمی ہی سے روشناس ہو گیا تھا۔ لیکن حضرت شیخ الہندؒ کے متعلق مجھے بہت بعد میں معلوم ہوا کہ پہلی جنگ عظیم کے بعد جب وہ ۱۹۲۰ء میں اسارتِ مالٹا سے رہائی پا کر وطن واپس آئے تو رجوع الی القرآن کی دعوت کو اپنا مقصدِ حیات بنانے کے عزم کا اظہار فرمایا۔ انگریزوں نے حضرت کو اُس وقت چھوڑا تھا جب وہ ٹی بی کی تھرڈ اسٹیج کو پہنچ چکے تھے' ورنہ وہ اس مردِ حق پرست کو کب چھوڑنے والا تھا! حضرت شیخ الہند نے دارالعلوم دیوبند میں ایک عظیم بات ارشاد فرمائی' جسے مولانا مفتی محمد شفیع رحمہ اللہ نے اپنی کتاب ''وحدتِ اُمت'' میں یوں نقل فرمایا ہے:

''مالٹا کی قید سے واپس آنے کے بعد ایک رات بعد عشاء دارالعلوم میں تشریف فرما تھے۔ علماء کا بڑا مجمع سامنے تھا' اُس وقت فرمایا کہ ''ہم نے تو مالٹا کی زندگی میں دو سبق سیکھے ہیں''۔ یہ الفاظ سن کر سارا مجمع ہمہ تن گوش ہو گیا کہ اس استاذ العلماء درویش نے اسّی سال علماء کو درس دینے کے بعد آخر میں جو سبق سیکھے ہیں وہ کیا ہیں؟ (حضرت شیخ الہندؒ نے) فرمایا:

''میں نے جہاں تک جیل کی تنہائیوں میں اس پر غور کیا کہ پوری دنیا میں مسلمان دینی اور دُنیوی ہر حیثیت سے کیوں تباہ ہو رہے ہیں تو اس کے دو سبب معلوم ہوئے۔ ایک ان کا قرآن کو چھوڑ دینا' دوسرے ان کے آپس کے اختلافات اور خانہ جنگی۔ اس لیے

(۱) محترم ڈاکٹر صاحب کی مشہور تالیف ''علامہ اقبال اور ہم'' میں ایک مستقل باب ''اقبال اور قرآن'' کے عنوان سے شامل ہے جس میں علامہ نے قرآن حکیم کے بارے میں جن جذبات و احساسات کا اظہار کیا ہے اس سے متعلق اکثر اردو اور فارسی کے اشعار شامل ہیں۔

میں وہیں سے یہ عزم لے کر آیا ہوں کہ اپنی باقی زندگی اس کام میں صرف کروں کہ قرآن کریم کو لفظاً اور معناً عام کیا جائے۔ بچوں کے لیے لفظی تعلیم کے مکاتب ہر بستی بستی میں قائم کیے جائیں' بڑوں کو عوامی درسِ قرآن کی صورت میں اس کے معانی سے روشناس کرایا جائے اور قرآنی تعلیمات پر عمل کے لیے آمادہ کیا جائے اور مسلمانوں کے باہمی جنگ و جدال کو کسی قیمت پر برداشت نہ کیا جائے۔''

میں حیران ہوتا ہوں کہ حضرت شیخ الہندؒ نے ۱۹۲۰ء میں یہ لفظ ''عوامی'' استعمال فرمایا جبکہ عوام و خواص میں سے کسی کی زبان پر یہ لفظ نہیں آیا تھا' جیسا کہ ''عوامی'' کا لفظ ہمارے دور میں عام ہو گیا ہے۔ یہ بھی ان کی دور بینی اور دور اندیشی کی دلیل ہے۔ نابغہ (Genius) اسی شخص کو کہتے ہیں جو بہت بعد کے حالات کو دیکھ رہا ہو۔

مولانا مفتی محمد شفیع رحمہ اللہ نے حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ کی اس بات پر بڑا خوبصورت اور بڑا موزوں تبصرہ کیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں:

''آج بھی مسلمان جن بلاؤں میں مبتلا اور جن حوادث و آفات سے دوچار ہیں' اگر بصیرت سے کام لیا جائے تو ان کے سب سے بڑے سبب یہی دو ثابت ہوں گے' قرآن کو چھوڑنا اور آپس میں لڑنا۔ غور کیا جائے تو یہ آپس کی لڑائی بھی قرآن کو چھوڑنے ہی کا لازمی نتیجہ ہے۔ قرآن پر کسی درجے میں بھی عمل ہوتا تو خانہ جنگی یہاں تک نہ پہنچتی''۔

حضرت شیخ الہندؒ اور مفتی محمد شفیعؒ کے خیالات و آراء سے مجھے واقعتاً بڑی تقویت ملی کہ میں نے اپنے غور و فکر اور سوچ بچار کے نتیجے میں دعوت رجوع الی القرآن کا جو کام شروع کر رکھا ہے اس کی تائید ان دو حضرات کی آراء سے حاصل ہو گئی۔ فللّٰہ الحمد والمنّۃ۔

علماء کرام کے خدشات اور ان کا اصل سبب

ایک طرف تو صورتِ حال یہ تھی' دوسری طرف مجھے شروع ہی سے ایک دوسرے تجربے سے مسلسل سابقہ پیش آتا رہا۔ میں نے اس کام کا آغاز اسی شہر لاہور سے کیا تھا اور میں بحمد اللہ اسی کام میں مسلسل لگا ہوا ہوں اور اپنی زندگی اسی کام کے لیے وقف کر رکھی ہے۔ تجربہ یہ ہوا کہ جیسے جیسے یہ کام اللہ تعالیٰ کی تائید و نصرت سے آگے بڑھنا شروع ہوا تو چند علماء کی طرف سے کچھ مخالفت بھی شروع ہو گئی۔ ان کی جانب سے کچھ اندیشوں' کچھ خطروں کا اظہار ہونے لگا کہ یہ دعوت ہے کیا؟ کہیں قرآن کا نام لے کر کوئی نیا فتنہ تو نہیں اٹھ رہا؟ میں حیران ہوتا تھا کہ

اس کا سبب کیا ہے؟ پھر یہ کہ مخالفت صرف ایسے علماء کی طرف سے نہیں تھی کہ جن کے بارے میں لوگوں کی رائے اچھی نہ ہو' بلکہ وہ ثقہ علماء بھی جن کا میرے اپنے دل میں بڑا احترام ہے اور جن کے ساتھ میرا حسنِ عقیدت کا معاملہ ہے' تشویش میں مبتلا نظر آئے۔ میں نے محسوس کیا کہ سب کے سب اس سے الرجک (allergic) ہیں اور قرآن کے نام کی دعوت سے بہت گھبراتے ہیں۔ انہیں کچھ اندیشہ ہوتا ہے کہ قرآن کے نام پر اٹھنے والی دعوت کے پس پردہ کہیں انکارِ سنت اور انکارِ حدیث کا معاملہ نہ ہو۔ چنانچہ اس طرح کا کچھ تجربہ مسلسل ہوا۔

یہ بات میرے لیے ایک پریشانی کا موجب تو رہی لیکن میں بحمد اللہ کام میں لگا رہا۔ اس لیے کہ مجھے اللہ تعالیٰ نے مزاج کچھ ایسا دیا ہے' اور بچپن ہی سے میرا طرزِ عمل یہ رہا ہے کہ جو بات حق معلوم ہو اُس پر ڈٹے رہو۔ میری عمر چوبیس برس کی تھی جب میں نے جماعت اسلامی کے سالانہ اجتماع منعقدہ ماچھی گوٹھ میں کھڑے ہو کر مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی مرحوم سے جماعت کے انقلابی طریقہ کار کو چھوڑ کر انتخابی طریق کار اختیار کرنے کی پالیسی سے ڈٹ کر اختلاف کیا تھا۔ مولانا مرحوم میرے والد کی عمر کے تھے' پھر میرے محسن بھی تھے کہ ان کی تصانیف کے مطالعہ سے مجھے دین کا صحیح مفہوم اور ایک مسلمان کی دینی ذمہ داریوں کا شعور حاصل ہوا تھا' جس پر محکم یقین مطالعۂ قرآن سے حاصل ہوا۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے مزاج ایسا دیا ہے کہ جو بات سمجھ میں آتی ہے کہ درست ہے اس کا برملا اظہار کیا جائے۔ لہٰذا مولانا مودودی مرحوم کی انتخابی سیاست کے موقف پر میں نے جماعت اسلامی کا رکن رہتے ہوئے اپنا اختلافی موقف دلائل کے ساتھ تحریری شکل میں بھی پیش کیا اور ماچھی گوٹھ میں اسٹیج پر کھڑے ہو کر بھی[1]۔ اگر کوئی دلیل سے میری رائے اور میرے موقف کو غلط ثابت کر دے تب تو میں فوراً ہتھیار ڈالنے پر آمادہ ہوتا ہوں اور اپنی غلطی تسلیم کرنے میں کوئی باک محسوس نہیں کرتا' لیکن اگر کوئی اسے دلیل سے غلط ثابت نہیں کرتا تو مجھے اس کی قطعی پرواہ نہیں ہوتی کہ میری بات کی کون مخالفت کر رہا ہے۔ اللہ کا فضل ہے کہ اس نے مجھے یہ مزاج دیا ہے۔

اس اعتبار سے میرا جو مزاج ہے اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ میں مسلسل یہ سوچتا تو ضرور رہا کہ آخر علماء کرام کو یہ الرجی کیوں ہے' وہ کیوں بدظن ہیں؟ قرآن کی طرف دعوت پر کیوں ان کے کان کھڑے ہو جاتے ہیں اور وہ اندیشے اور خدشات محسوس کرنے لگتے ہیں؟ لیکن چونکہ کوئی ٹھوس

(۱) یہ بیان ''تحریک جماعت اسلامی۔ ایک تحقیقی مطالعہ'' کے نام سے مطبوعہ موجود ہے۔

بات سامنے نہیں آئی تو میں اپنی دھن میں لگا رہا اور میں نے اپنے کام میں قطعاً کوئی ڈھیل نہیں آنے دی۔ لیکن کچھ عرصہ پہلے مجھے اس معمے کا حل مل گیا اور علماءِ کرام کے طرزِ عمل اور رویہ کا سبب میری سمجھ میں آ گیا۔ ہمارے علماء کی طرف سے' بالخصوص ان کی طرف سے جن کا ہمارے قدیم دینی حلقوں سے تعلق ہے' جن اندیشوں اور خدشات کا اظہار ہوتا ہے' اصل میں اس کا سبب ان کا ایک طویل تجربہ ہے۔ وہ تجربہ یہ ہے کہ ماضی بعید و قریب میں مسلمانوں میں جتنی بھی گمراہ تحریکیں اٹھیں وہ سب قرآن کا نام لے کر اٹھیں۔ مثلاً چکڑالویت اٹھی قرآن کے نام پر۔ اسی طرح پرویزیت اٹھی قرآن کے نام پر۔ اور تو اور قادیانیت بھی قرآن کے نام پر ہی اٹھی تھی۔ مرزا غلام احمد قادیانی نے اپنے کام کی ابتداء قرآن کی عظمت کے بیان سے کی تھی۔ ان گمراہ تحریکوں کی تکنیک اور طریق کار (methodology) مَیں آگے چل کر قدرے تفصیل سے ذکر کروں گا۔

ان سب سے پہلے سرسید احمد خان نے قرآن کے نام پر بہت سی گمراہیوں کا آغاز کیا۔ تو معلوم ہوا کہ جسدِ ملّی پر پے بہ پے اتنے چرکے لگے ہیں اور علماء کو اُن تحریکات سے ایسے غلط تجربات ہوئے ہیں کہ وہ اس معاملے میں بہت حساس ہو گئے ہیں۔ جیسے ہمارے یہاں کہاوت ہے کہ ''دودھ کا جلا چھاچھ کو بھی پھونک پھونک کر پیتا ہے''۔ یا ایک دوسری کہاوت ہے کہ ''سانپ کا ڈسا ہوا رسّی سے بھی ڈرتا ہے''۔ چنانچہ ہمارے دینی حلقوں کو قرآن کے نام پر اٹھنے والی کسی بھی دعوت اور تحریک کے بارے میں فوراً ایک خطرہ' ایک اندیشہ اور ایک سوءِ ظن لاحق ہو جاتا ہے اور ان کی جانب سے خدشات کا برملا اظہار ہونے لگتا ہے جو مخالفت کا رنگ اختیار کر لیتا ہے۔

علمائے کرام کے بارے میں مَیں یہ بات صاف صاف عرض کرتا ہوں کہ ان حضرات کا احترام ملحوظ رکھنے اور ان سے حسنِ عقیدت رکھنے کے باوصف میں ان کے بارے میں کسی غلو اور افراط و تفریط میں مبتلا نہیں ہوں۔ ہمارے یہاں جو علماء پائے جاتے ہیں ان میں علمائے حق بھی ہیں اور علمائے سوء بھی۔ علمائے سوء سے کوئی زمانہ کبھی خالی نہیں رہا۔ علمائے سوء اُس زمانے میں بھی سرکار دربار سے بھی متعلق رہے اور عوام الناس سے بھی جو زمانہ کئی اعتبارات سے ہمارے دور سے کہیں بہتر تھا۔ دنیا داری اور اصحابِ اختیار و اقتدار کی خوشنودی کے حصول کا معاملہ بہر حال ہر دور میں رہا ہے۔ امام دارالہجرت امام مالکؒ کی جب مشکیں کس کر' منہ پر سیاہی مَل کر گدھے پر سوار کر کے مدینہ کی گلیوں میں گھمایا گیا تھا' جب امام اعظم امام ابوحنیفہؒ کو جیل میں

ڈالا گیا تھا‘ جب امام شافعیؒ کے لیے بار بار شہر بدر ہونے کے احکام جاری ہوتے رہتے تھے‘ جب امام احمد بن حنبلؒ کو قید و بند کی صعوبتیں جھیلنی پڑیں اور وہ مار سہنی پڑی کہ اگر ہاتھی کو بھی اس طرح مارا جائے تو وہ بلبلا اٹھے‘ جب امام ابن تیمیہؒ کو جیل میں ڈالا گیا اور وہیں انہوں نے اپنی جان جان آفریں کے سپرد کی‘ جب مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندیؒ کو قید کیا گیا‘ اور جب چند خوانین سرحد نے بیعت قبول کرنے کے باوصف بھی سید احمد بریلویؒ سے غداری کی تو کیا آپ کے خیال میں ان تمام افعال کی پشت پر علمائے سوء کے فتاویٰ موجود نہیں تھے جو وقت کے صاحبانِ اقتدار و اختیار کی خوشنودی کے لیے دیے گئے تھے؟ دنیا دار اور فتویٰ فروش علمائے سوء ہر دَور میں موجود رہے ہیں۔ ہمارا زمانہ تو ظاہر بات ہے کہ فتنہ کے اعتبار سے اپنی انتہا کو پہنچا ہوا ہے۔ علماءِ سو کے بارے میں نبی اکرمﷺ نے اُمت کو پیشگی متنبہ فرما دیا تھا۔ حضرت علیؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہﷺ نے فرمایا:

((يُوْشِكُ اَنْ يَّاْتِيَ عَلَى النَّاسِ زَمَانٌ لَا يَبْقٰى مِنَ الْاِسْلَامِ اِلَّا اسْمُهٗ ' وَلَا يَبْقٰى مِنَ الْقُرْآنِ اِلَّا رَسْمُهٗ' مَسَاجِدُهُمْ عَامِرَةٌ وَهِيَ خَرَابٌ مِنَ الْهُدٰى' عُلَمَاؤُهُمْ شَرٌّ مَنْ تَحْتَ اَدِيْمِ السَّمَاءِ ' مِنْ عِنْدِهِمْ تَخْرُجُ الْفِتْنَةُ وَفِيْهِمْ تَعُوْدُ)) (۱)

’’اندیشہ ہے کہ لوگوں کو ایک ایسے زمانے سے سابقہ پیش آئے گا کہ اسلام میں سے سوائے اس کے نام کے کچھ نہ بچے گا (اسلام پر عمل ختم ہو جائے گا‘ صرف اس کا نام باقی رہ جائے گا) اور قرآن میں سے سوائے اس کے رسم الخط کے کچھ نہ بچے گا (قرآن پر عمل ترک ہو جائے گا اور اس کے الفاظ کی محض تلاوت باقی رہ جائے گی)۔ مسلمانوں کی مسجدیں بظاہر آباد ہوں گی لیکن ہدایت سے خالی ہو جائیں گی۔ ان کے علماء آسمان کی چھت کے نیچے کے بدترین انسان ہوں گے۔ سارے فتنے ان ہی میں سے برآمد ہوں گے اور ان ہی میں لوٹ جائیں گے۔‘‘

نبی اکرمﷺ نے جہاں یہ انتباہ فرمایا وہاں یہ بشارت بھی دی کہ علمائے حقانی سے کوئی زمانہ خالی نہیں رہے گا۔ یہ ضمانت دی ہے محمدٌ رسول اللہﷺ نے کہ: ((لَا تَزَالُ طَائِفَةٌ مِّنْ اُمَّتِیْ ظَاهِرِيْنَ عَلَى الْحَقِّ)) (۲) ’’میری اُمت میں ہمیشہ ایک گروہ حق پر ثابت قدم رہے

(۱) رواہ البیهقی فی شعب الایمان۔ بحوالہ مشکاۃ المصابیح‘ کتاب العلم‘ الفصل الثالث۔

(۲) صحیح مسلم‘ کتاب الامارۃ‘ باب قوله لا تزال طائفة من امتی ظاهرین علی الحق......

گا‘‘۔ ظاہر بات ہے کہ علمائے حق کے بغیر دین کا کوئی تصور ہی نہیں‘ لہٰذا ہر دَور‘ ہر زمان‘ ہر مکان میں علمائے حقانی بھی لازماً موجود رہیں گے۔ پس یہ دونوں چیزیں اپنی جگہ پر ہیں۔ جہاں تک علمائے سوء کا معاملہ ہے‘ ان کی باتوں کی طرف توجہ دینے کی ضرورت نہیں ہے‘ لیکن اگر علمائے حق کی طرف سے تشویش کا اظہار ہو‘ اگر انہیں بھی خطرات و خدشات اور اندیشے محسوس ہوں تو یقیناً قابل غور مسئلہ ہے۔ ان علماءِ حق کی تشویش اگر وہ شخص نظر انداز کر دے گا جو خادم دین‘ خادم قرآن اور خادم ملت ہو تو وہ اپنے ہی پاؤں پر کلہاڑی مارے گا‘ کسی اور کا نقصان نہیں کرے گا۔ اگر کوئی شخص یہ چاہتا ہے کہ اپنے دس بیس یا سو پچاس ہم خیال پیدا کر کے دنیا سے چلا جائے تو یہ ہر وہ شخص کر سکتا ہے جس میں ذرا سی ذہانت اور صلاحیت ہو۔ کچھ نہ کچھ لوگ اسے لازماً مل جائیں گے جو اُس کے حواری بن جائیں گے۔ لیکن اگر کسی شخص کے پیش نظر یہ ہے کہ دین کی ایک ہمہ گیر دعوت اٹھا کر اقامت دین اور اسلامی انقلاب کے لیے جدوجہد کرے تو میں یہ سمجھتا ہوں کہ کوئی کودن اور احمق شخص ہی ہوگا جو یہ سمجھتا اور توقع رکھتا ہو کہ علمائے حق کی اشیر باد کے بغیر‘ علمائے حقانی کی تائید و تعاون کے بغیر اور اصحابِ علم و فضل کی دعاؤں کے بغیر کوئی ایسی تحریک پروان چڑھ سکے گی اور نتیجہ خیز ہو سکے گی۔ ایسی دعوت و تحریک کے داعی کے لیے‘ اگر وہ مخلص ہے‘ ان علمائے حقانی کا اعتماد حاصل کرنا لازم ہے۔ میں اس مسئلہ پر مسلسل غور کرتا رہا کہ آخر کیا بات ہے کہ جن حضراتِ گرامی کو میں علمائے حق گردانتا ہوں‘ جن سے حسنِ عقیدت رکھتا ہوں مجھے ان کا تعاون حاصل نہیں ہو رہا۔ بلکہ کبھی دبی دبی زبان سے اور کبھی برملا ان کی طرف سے اختلاف کا اظہار ہو رہا ہے۔ بالآخر اللہ تعالیٰ نے میری رہنمائی فرمائی اور یہ عقدہ کھل گیا کہ ان علمائے حقانی کے خدشات کا سبب وہ گمراہ کن نظریات اور تحریکیں ہیں جو اِس برعظیم پاک و ہند میں قریباً ایک صدی کے دوران وقتاً فوقتاً قرآن کے نام پر اٹھتی رہی ہیں۔ میں ان کی طرف ابتدا میں اشارہ کر چکا ہوں‘ اب میں قدرے تفصیل سے ان کے متعلق کچھ باتیں آپ کے سامنے رکھتا ہوں۔

۱۸۵۷ء کے بعد جب مسلمانوں کی نام نہاد حکومت بالکل ختم ہوگئی اور برعظیم پاک و ہند پر سیاسی اعتبار سے حکومت برطانیہ کا تسلط و استیلاء کامل طور پر ہو گیا تو غلامی کا ایک نیا دَور شروع ہوا۔ ۱۹۴۷ء تک یہ نوے سال کا دَور ہے۔ اس دَور میں قرآن کے حوالے سے جو سب سے پہلی زوردار آواز اٹھی وہ سرسید احمد خان کی ہے۔ انہوں نے پندرہ پاروں کی تفسیر بھی لکھی۔

انہوں نے قرآن کی تفسیر میں طرح طرح کے فتنے اٹھا دیے۔ مثلاً جنات کا انکار، فرشتوں کا انکار، وحی کا قریباً انکار۔ انہوں نے ان سب کی ایسی توجیہہ و تاویل کی جو سراسر قرآن کے خلاف تھی، ظاہر بات ہے کہ کھلم کھلا انکار تو کوئی نہیں کر سکتا تھا۔ انہوں نے جنات کا برملا انکار نہیں کیا، لیکن یہ کہا کہ قرآن نے مشتعل مزاج اور اُجڈ قسم کے لوگوں کو ''جن'' سے تعبیر کیا ہے، وہ کوئی علیحدہ مخلوق نہیں ہے۔ فرشتوں کا بھی برملا انکار تو نہیں کیا، لیکن کہا کہ قوانینِ فطرت میں جو قوتیں (Forces of the Nature) کارفرما ہیں ان کو فرشتے کہا گیا ہے، ان کا کوئی علیحدہ وجود نہیں، وہ کوئی علیحدہ مخلوق نہیں۔ معجزات کی یہ تاویل کی گئی کہ یہ طبیعیات کے عجیب وغریب اور غیر معمولی مظاہر (Physical Phenomena) تھے، ان کو خواہ مخواہ معجزات سمجھ لیا گیا ہے۔ مثلاً حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنی قوم کو لے کر سمندر سے نکل گئے اور فرعون کا لشکر غرق ہو گیا تو یہ مدّ و جزر کا کرشمہ تھا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام جزر کی کیفیت میں بنی اسرائیل کے ساتھ سمندر عبور کر گئے، لیکن جب فرعون اپنے لشکر کو لے کر سمندر میں اترا تو سمندر مدّ پر آ گیا اور آلِ فرعون اس کی لہروں کی نذر ہو گئے۔ گویا اپنے دَور کی سب سے زیادہ ترقی یافتہ مصری قوم مدّ و جزر سے ناواقف تھی۔ سرسید احمد خان نے ایسی گمراہ کن تاویلات کی ہیں، اگرچہ کھلم کھلا انکار کسی چیز کا نہیں کیا۔ ان کی پیدا کردہ گمراہیوں کی فہرست بڑی طویل ہے۔ میں نے اس موضوع پر ایک طویل مضمون لکھا تھا جو میری کتاب ''اسلام اور پاکستان'' میں شامل ہے۔ ڈاکٹر فضل الرحمٰن نے اپنی کتاب ''اسلام'' میں وحی کے بارے میں یہ گمراہ کن خیال ظاہر کیا تھا کہ قرآن سارے کا سارا بیک وقت خدا کا کلام بھی ہے اور کلامِ رسولؐ بھی، وحی ایک چشمہ کے مانند قلبِ محمدیؐ میں پھوٹی تھی۔ متذکرہ بالا مضمون میں مَیں نے لکھا تھا کہ اس گمراہی کا آغاز کرنے والے تو سرسید احمد خان ہیں، یہ گمراہی تو نمعلوم کتنی جگہ انڈے بچے دے چکی ہے۔ چنانچہ سرسید اس کے قائل نہیں تھے کہ جبریل امین علیہ السلام وحی لے کر نازل ہوتے تھے۔ اس طرح تو فرشتوں کا تشخص تسلیم کرنا پڑتا، جس کے وہ انکاری تھے۔ ان کا شعر ہے: ؎

ز جبریل امیں قرآں بہ پیغامے نمی خواہم — ہمہ گفتارِ معشوق است قرآنے کہ من دارم

''جو قرآن جبریل امین لے کر آئے مجھے وہ نہیں چاہیے۔ میرے پاس جو قرآن ہے وہ تو سارے کا سارا میرے محبوب (محمد مصطفیٰ ﷺ) کی گفتگو ہے۔''

تفسیر قرآن میں ان گمراہ کن تاویلات کے باوجود ایک اچھی بات سرسید احمد خاں کے

حق میں جاتی ہے کہ نہ تو انہوں نے کوئی دینی جماعت بنائی اور نہ ہی کسی دینی فرقے کا آغاز کیا۔ وہ اصل میں ایک سماجی مصلح (social reformer) اور مسلمانوں کے ایک قومی لیڈر کی حیثیت سے معروف ہوئے۔ چونکہ ان کا دینی معاملہ صرف نظریات کی حد تک رہا اور انہوں نے ان کی بنیاد پر کوئی تنظیم یا جماعت نہیں بنائی، لہٰذا انہوں نے ایک اجتماعی فتنے کی شکل اختیار نہیں کی۔ یہی وجہ ہے کہ علمائے کرام نے ان کا زیادہ نوٹس نہیں لیا۔ پھر مسلمانانِ ہند پر دوسرے اعتبارات سے ان کے احسانات بھی ہیں، لہٰذا ان کے معاملہ میں کسی حد تک نرمی کا معاملہ کیا جاتا رہا۔

لیکن اس کے پہلو بہ پہلو برعظیم پاک و ہند میں جو ایک بڑا فتنہ اٹھا اس کا بانی تھا مرزا غلام احمد قادیانی آنجہانی۔ اس نے اپنی تحریک کا آغاز کیا تو قرآن کے نام پر بات شروع کی۔ اُس کے ابتدائی دَور کے دو شعر ملاحظہ کیجیے، جن سے معلوم ہوگا کہ شروع شروع میں اس نے اپنا اعتماد پیدا کرنے کے لیے کس طرح خدمتِ قرآن کا لبادہ اوڑھا۔ اس کا ایک شعر ہے: ؎

جمال و حسن قرآں نورِ جانِ ہر مسلماں ہے
قمر ہے چاند اوروں کا، ہمارا چاند قرآں ہے!

دوسرا شعر ہے: ؎

اے بے خبر بخدمت قرآں کمر بہ بند
زاں پیشتر کہ بانگ بر آید فلاں نماند (۱)

''اے بے خبر مسلمان! قرآن کی خدمت کے لیے کمر کس کر تیار ہو جاؤ، اس سے پہلے کہ آواز لگائی جائے کہ فلاں شخص اس دنیا سے رخصت ہو گیا۔ (یعنی موت سے پہلے پہلے جو فرصت میسر ہے اسے قرآن کی خدمت کے لیے لگاؤ)''۔

اس سے اندازہ کیجیے کہ اس کی تکنیک کیا تھی۔ پھر اس نے آریہ سماجیوں اور عیسائی مشنریوں سے بڑے کامیاب مناظرے کیے۔ ان سب کا ذکر آپ کو اس کے ابتدائی لٹریچر میں مل جائے گا۔ لیکن اس شخص نے اپنا اعتماد پیدا کرنے کے بعد وہ گمراہی پھیلائی جو سرطان کی طرح جسدِ ملّی سے چمٹ گئی۔ جب لوگوں کا کثیر تعداد میں اس کی طرف رجوع ہوا اور عقیدت مندوں کی ایک معتدبہ تعداد اس کے گرد جمع ہو گئی تو اس کے دماغ کے اصل خنّاس نے ظہور شروع کیا۔ چنانچہ شیطان نے اس کی پیٹھ ٹھونکی اور سبز باغ دکھانے شروع کیے تو اس نے پے در پے دعووں کا آغاز کر دیا۔ کہیں مجدّد ہونے کا دعویٰ کیا تو کہیں مسیح موعود ہونے کا۔ پھر اس

(۱) دوسرا مصرعہ دراصل شیخ سعدیؒ کا ہے۔

سے آگے بڑھ کر ظلی اور بروزی نبی ہونے کا دعویٰ کیا اور بالآخر صاحبِ وحی نبی ہونے کا دعویٰ کر بیٹھا۔ بعض علمائے کرام اور اہل قلم نے اس کے لٹریچر سے اس کی گرگٹ کی طرح رنگ بدلنے والی تصویر پیش کی ہے۔ اس کی تحریروں کو پڑھ کر انسان حیران ہوتا ہے کہ ایسا شخص تو صحیح العقل انسان بھی تسلیم نہیں کیا جا سکتا، کجا یہ کہ اسے نبی مان لیا جائے۔ مزید حیرانی اس پر ہوتی ہے کہ بڑے بڑے پڑھے لکھے لوگ اس کے پیچھے لگ گئے اور اس پر بحیثیتِ نبی ایمان لے آئے۔ ان میں سے کوئی انٹرنیشنل کورٹ آف جسٹس کا جج رہا ہے اور کوئی نوبل پرائز یافتہ ہے۔ اس کی بڑی وجہ یہ سمجھ میں آتی ہے کہ چونکہ مرزا غلام احمد کو انگریزی سرکار کی سرپرستی حاصل ہو گئی تھی لہٰذا اس کے متبعین کو حکومت کی طرف سے بڑی مراعات ملیں، ان کو اعلیٰ تعلیم کے حصول کے مواقع حاصل ہوئے اور وہ سرکاری ملازمتوں اور منصبوں پر فائز ہوتے رہے۔ اس طرح مرزا غلام احمد قادیانی پر ایمان لانا دُنیوی ترقی اور انگریزی دورِ حکومت میں اثر و رسوخ نیز اعلیٰ ملازمتوں کے حصول کا زینہ بن گیا۔ بہرحال دعوتِ قرآن کا نام لے کر اٹھنے والا یہ دوسرا فتنہ تھا جس سے مسلمانوں کو بہت بڑا چرکہ لگا۔

پھر ہمارے دَور میں غلام احمد پرویز نے جو گمراہی پھیلائی اور جو مسلسل پھیل رہی ہے وہ تو بالکل سامنے کی بات ہے۔ چکڑالویت، پرویزیت اور دوسرے منکرین سنت کے جو مختلف shades ہیں، ان کا تو سارے کا سارا اوڑھنا بچھونا قرآن کا نام ہے۔ ''قرآنی نظامِ ربوبیت'' کے عنوان سے وہ نظریۂ اشتراکیت اور الحاد کے علمبردار ہیں۔ ان کے نزدیک نبی اکرم ﷺ صرف اپنے دَور کی حد تک واجب الاطاعت تھے (معاذ اللہ!) اور وہ بھی ''مرکزِ ملت'' کی حیثیت سے نہ کہ رسول کی حیثیت سے۔ رسول کی حیثیت سے تو بس ان کا کام قرآن کو پہنچانا اور حالات وظروف کے مطابق اس کی عملی تعبیر (interpretation) کرنا تھا۔ نبی اکرم ﷺ نے دنیا کو شریعت کا جو نظام دیا تھا، جس کا کامل ظہور خلافت راشدہ کے دورِ سعید میں ہوا، ان منکرین حدیث وسنت کے نزدیک وہ کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔ ان کا موقف یہ ہے کہ اپنے دور کا ''مرکز ملت'' قرآن سے اصول لے کر شریعت کا نظام رائج کرنے کا مطلقاً مختار ومجاز ہے۔ صلوٰۃ، زکوٰۃ، صوم اور حج کو وہ مستقل ارکانِ اسلام تسلیم نہیں کرتے، بلکہ ان کی رائے میں احوال وظروف کے مطابق ان میں تغیر وتبدل ہو سکتا ہے اور لازماً ہونا چاہیے۔ یہ گمراہ کن تحریک قرآن کے نام پر اٹھی اور اسی نام پر وہ ہمارے معاشرے میں گمراہی پھیلا رہی ہے۔

اس طرح ہمارے علمائے حق کو پے بہ پے یہ جو چرکے لگے ہیں اور تجربات ہوئے ہیں، ان کی وجہ سے وہ اس معاملے میں بہت ہی متردّد اور فکرمند ہو جاتے ہیں کہ کچھ لوگ قرآن کا نام لے کر آگے آ رہے ہیں۔ سورۃ البقرۃ کی آیت ۲۶ میں یہ الفاظ آئے ہیں: ﴿يُضِلُّ بِهٖ كَثِيْرًا ۙ وَّيَهْدِيْ بِهٖ كَثِيْرًا ۭ﴾ یعنی اس قرآن ہی کے ذریعے اللہ تعالیٰ بہت سوں کو گمراہ کرتا ہے اور اسی قرآن کے ذریعے بہت سوں کو ہدایت دیتا ہے۔ اصل میں فیصلہ کن چیز انسان کی اپنی باطنی کیفیت ہوتی ہے۔ اگر کسی شخص میں عجب ہے، تکبر ہے، استکبار ہے، شہرت و وجاہت طلبی ہے، کچھ بننے کی آرزو ہے، اپنی عقل وفہم پر اعتماد میں غلو ہے، اپنی بڑائی اور انفرادیت کے اظہار کی خواہش اور شوق ہے، وہ کسی پندار اور گھمنڈ میں مبتلا ہے تو اس کا چاہے صبح وشام قرآن مجید سے کتنا ہی اعتناء اور تعلق ہو، ایسا شخص آج نہیں تو کل خود بھی فتنے میں مبتلا ہوگا اور بہتوں کو فتنے میں مبتلا کرنے کا باعث بن جائے گا۔ لیکن اگر اس کی طبیعت میں خلوص واخلاص ہے، تواضع ہے، انکسار ہے اور وہ یہ سمجھتا ہے کہ میں قرآن کی جو خدمت کر رہا ہوں وہ صرف اللہ تعالیٰ ہی کی توفیق سے کر رہا ہوں، اس میں میرے کسی ذاتی کمال کو کوئی دخل نہیں ہے، تو ان شاء اللہ العزیز قرآن مجید اس پر اپنی ہدایت روشن کرتا چلا جائے گا۔

گمراہ فرقوں اور تحریکوں کا طریق واردات

اب اس ضمن میں ایک اہم بات جان لیجیے کہ ان تمام گمراہ فرقوں اور تحریکوں کا اصل طریقۂ واردات (methodology) کیا ہے۔ اور یہ سب میں مشترک وصف ہے۔ اس مسئلہ پر میں اپنے غور وفکر کے نتائج اور اپنے خیالات وضاحت سے آپ حضرات کے سامنے رکھنا چاہتا ہوں۔ ان کا طریق کار یہ ہوتا ہے کہ کسی ایک آدھ مسئلہ کو پکڑ کر، جو اُمت میں متفق علیہ اور مجمع علیہ رہا ہے، اس پر شکوک وشبہات پیدا کر دیتے ہیں۔ اُمت کے تمام فقہائے کرام، محدثین عظام، علمائے حقانی اور مفسرین کرام سب کے سب اس مسئلہ کو مانتے چلے آ رہے ہیں، لیکن اس ایک مسئلہ کو اٹھا کر وہ لوگوں کو اس مغالطہ میں مبتلا کر دیتے ہیں کہ یہ بات غلط ہے۔ اس ایک تیر سے کتنے شکار ہو گئے؟ اگر آپ نے ایک متفق علیہ مسئلہ کے بارے میں لوگوں کو بدظن کر دیا تو اس کے معنی یہ ہیں کہ آپ نے اپنے عقیدت مندوں کے ذہن وقلب میں یہ بات بٹھا دی کہ سارے فقہاء بے وقوف تھے، سارے محدثین ناسمجھ تھے، سارے مفسرین بے علم تھے، سارے علماءِ اُمت بے عقل تھے کہ اتنی سیدھی سی بات ان کی سمجھ میں نہیں آئی جو ہمارے ممدوح کی سمجھ

میں آئی ہے۔ یہ وہ چیز ہے جو عموماً ایسے لوگوں کو تمام اکابر اسلاف سے سوءِ ظن میں مبتلا کر دیتی ہے۔ اس کے بعد یہ لوگ اُس بے لنگر جہاز کے مانند ہیں جو لہروں کے رحم و کرم پر ہے' لہریں اس جہاز کو جدھر چاہیں لے جائیں۔ یا کٹی ہوئی پتنگ کے موافق ہیں جو ہوا کے رحم و کرم پر ہے' وہ اسے جدھر چاہے لے جائے۔

اب جیسے ہی اسلاف سے بدظنی پیدا ہوئی شیطان کو موقع مل گیا کہ وہ گمراہی پر گمراہی کا دروازہ کھولتا چلا جائے اور ''ظُلُمَاتٌ بَعْضُهَا فَوْقَ بَعْضٍ'' کا نقشہ جما دے۔ اس لیے کہ ان کے دلوں میں تو عظمت کا سکہ اپنے ممدوح کا بیٹھ جاتا ہے کہ جو بات خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم کی سمجھ میں نہیں آئی' امام ابوحنیفہؒ کے پلے نہیں پڑی' امام مالکؒ کے ذہن کی جہاں تک رسائی نہیں ہوئی' امام شافعیؒ جس کو سمجھنے سے قاصر رہے' امام احمد بن حنبلؒ جس کی تہہ تک نہ پہنچ پائے' مزید یہ کہ اُمت کے تمام قابل اعتماد مفسرین' چاہے وہ متقدمین میں سے ہوں یا متاخرین میں سے' جس بات کے فہم سے عاری رہے' تمام علمائے حقانی کی عقل جس بات کے سمجھنے سے عاجز رہی وہ آج ان کی سمجھ میں آئی ہے۔ وہ یہ سمجھنے لگ جاتے ہیں کہ قرنِ اوّل سے آج تک جس مسئلہ میں پوری اُمت کا تواتر کے ساتھ اجماع رہا ہے وہ غلط رہا ہے' اس مسئلہ کا صحیح عقدہ تو ہمارے ممدوح عالم دین اور مفسر قرآن پر منکشف ہوا ہے۔ عقیدت مند لوگ جب اجماعِ اُمت کے خلاف ایک مسئلہ میں اپنے ممدوح کی رائے کو مان لیں تو بہت آسان ہو گیا کہ وہ جو چاہے زہر گھول دے' جو کڑوی گولی چاہے اپنے عقیدت مندوں کے حلق سے اتروا دے۔ یہ ہے ان کا مشترک طریق کار (methodology)۔

ان لوگوں کو معتقدین کس طرح اور کہاں سے ملتے ہیں جو اس فتنہ کے فروغ کا ذریعہ بنتے ہیں' یہ بات بھی تجزیہ طلب ہے۔ عموماً وہ جدید تعلیم یافتہ لوگ جو دین کے نہ طالب علم ہوتے ہیں نہ انہوں نے خود دین کا بنیادی طور پر مطالعہ کیا ہوتا ہے' اس طرح کے فتنہ پردازوں کے حلقہ بگوش بن جاتے ہیں۔ دُنیوی تعلیم کے اعتبار سے وہ چاہے گریجویٹ ہوں یا ماسٹرز ڈگری رکھتے ہوں' علوم جدیدہ میں سے کسی علم میں پی ایچ ڈی ہوں' کوئی قانون میں بار ایٹ لاء ہو' کوئی ملکی آئین میں درجۂ تخصص رکھتا ہو' کسی نے سائنس اور انجینئرنگ کی اعلیٰ ترین ڈگریاں حاصل کی ہوں' لیکن دین کے بنیادی علم سے انہیں کوئی شغف نہیں ہوتا' اس کا کوئی فہم نہیں ہوتا' اس معاملہ میں بالکل کورے ہوتے ہیں' اِلّا ماشاء اللہ۔ زیادہ سے زیادہ تقلید آباء کے طور پر نماز

روزے سے کچھ تعلق ہو تو ہو۔ اس طبقے کے متعلق ایک بزرگ بجا طور پر ''پڑھے لکھے جاہل'' کی اصطلاح استعمال کیا کرتے ہیں۔ اس لیے کہ دین کے اعتبار سے تو یہ اَن پڑھ ہیں۔ اس طبقے میں بہت سے ایسے لوگ ہیں کہ انہیں ناظرہ قرآن تک پڑھنا نہیں آتا۔ یہ طبقہ ہے جس میں سے اکثر لوگ فتنہ اٹھانے والوں کے پھندے میں پھنس جاتے ہیں۔ انہیں نظر آتا ہے کہ یہ لوگ دین اور قرآن کے بڑے خادم ہیں' بڑے عالم ہیں' بڑے معقول لوگ ہیں' بڑے ذہین و فطین ہیں' ان کی ذہانت و فطانت کا دنیا میں لوہا مانا جا رہا ہے' لیکن چونکہ ان کا براہِ راست دین کا اپنا مطالعہ نہیں ہوتا لہٰذا جس شخص کو بھی انہوں نے اس طور سے مان لیا کہ دین کی فلاں اہم بات اس کی سمجھ میں آئی ہے جو آج تک کسی اور کی سمجھ میں نہیں آئی تھی تو پھر وہ شخص ایسے لوگوں کو جدھر چاہے لے جائے۔ پھر ایسے لوگ اندھے اور بہرے ہو کر اس کی پیروی کرتے ہیں۔ بغرضِ تفہیم میں چند مثالیں قدرے تفصیل سے پیش کرتا ہوں۔

سر سید احمد خان کا اس موقع پر میں تذکرہ نہیں کروں گا۔ وہ جن گمراہیوں کے بانی و مبانی تھے ان کو میں پہلے بیان کر چکا ہوں اور یہ بھی عرض کر چکا ہوں کہ ان کی ذات سے کوئی فرقہ' کوئی جماعت' کوئی تنظیم وجود میں نہیں آئی۔ انہوں نے سماجی طور پر مسلمانوں کی خدمت کو اپنا میدانِ عمل بنایا اور ہمیں اعتراف کرنا چاہیے کہ اس میدان میں انہوں نے مسلمانانِ پاک و ہند کی بڑی خدمات انجام دی ہیں۔ لہٰذا سر سید کی بات یہیں چھوڑ دیجیے۔

اب آپ دیکھئے مرزا غلام احمد قادیانی نے کیا کیا؟ اس نے جب ابتداءً قرآن کا نام لے کر اور آریہ سماجیوں اور عیسائیوں سے مناظرے کر کے اپنا ایک مقام بنا لیا اور معتدبہ افراد اُس کے حلقۂ ارادت و عقیدت سے وابستہ ہو گئے تو اس نے ایک مسئلہ اٹھایا۔ آپ کو معلوم ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام کا اپنے جسد خاکی کے ساتھ زندہ آسمان پر اٹھا لیا جانا اور پھر قیامت سے قبل ان کا بعینہٖ بنفس نفیس دوبارہ آسمان سے نازل ہونا' یہ وہ مسئلہ ہے جو اُمت کا متفق علیہ عقیدہ ہے اور سلف سے لے کر خلف تک اس پر پوری اُمت کا اجماع چلا آ رہا ہے۔ اس کا قرآن حکیم میں بھی ذکر ہے اور متعدد احادیثِ صحیحہ صراحت کے ساتھ اس مسئلہ پر موجود ہیں۔ تمام فقہاءِ اُمتؒ' تمام محدثین کرامؒ اور اُمت کے تمام قابل اعتماد مفکرین و مفسرین اس کو مانتے ہیں' لیکن غلام احمد قادیانی نے ''رفع و نزولِ مسیح'' کے انکار کا مسئلہ کھڑا کر دیا۔ چونکہ وہ دَور سائنسی عقلیت پرستی (Scientific Rationalism) کا دَور تھا اور سائنس بھی ابھی نیوٹن کے دور میں تھی' آئن سٹائن کا دَور شروع نہیں ہوا تھا' لہٰذا اُس زمانے میں یہ بات ایک انگریزی دان اور

عقلیت زدہ شخص کے لیے بڑی عجیب سی تھی کہ ایک زندہ انسان آسمان پر اٹھایا جا سکتا ہے اور پھر وہ صدیوں بعد آسمان سے نازل ہوگا۔

تعلیم یافتہ لوگوں کو تو مرزا قادیانی نے یہ عقلی مغالطہ دیا اور عوام کو اس دلیل سے فریب دیا کہ ہمارا عقیدہ ہے کہ محمد رسول اللہ ﷺ سید المرسلین اور افضل الرسل ہیں' تو یہ کیسے ممکن ہے کہ آنحضور ﷺ تو انتقال فرما جائیں اور آپؐ کا جسدِ اطہر لحد میں زیرِ زمین دفن ہو اور حضرت مسیحؑ اس خاکی جسم کے ساتھ آسمان پر زندہ ہوں! اس طرح تو حضرت مسیحؑ ہمارے رسولؐ سے افضل قرار پاتے ہیں۔ حضرت مسیحؑ کو اُن کے حواریوں نے صلیب سے اتار لیا تھا' وہ زندہ تھے۔ خفیہ طور پر ان کا علاج معالجہ ہوا۔ پھر وہ چھپتے چھپاتے بیت المقدس سے نکل گئے اور کشمیر میں آ کر آباد ہوئے' وہیں طبعی طور پر ان کی وفات ہوئی اور دفن ہوئے۔ ہمارے مولویوں نے اس بات کو نہیں سمجھا اور غلط تاویلات کرتے رہے۔ چنانچہ اس مسئلہ کو اُس نے خوب ہوا دی اور اس کے ذریعے سے اس نے اپنے معتقدین کو اسلاف سے کاٹ دیا۔ جب وہ لنگر کٹ گیا تو بے لنگر کا جہاز لہروں کے رحم و کرم پر ہے' وہ جس طرف چاہیں اسے لے جائیں۔ اس کے معتقدین نے سمجھ لیا کہ سب سے بڑھ کر عالم تو یہ ہے۔ اب اس نے بتدریج دعاوی شروع کیے۔ اس نے کہا کہ احادیث میں جس مسیح کے آنے کی خبر ہے وہ بذاتہٖ مسیح نہیں بلکہ مثیلِ مسیح ہے اور وہ مسیح موعود اور مثیلِ مسیح میں ہوں۔ نوبت بایں جا رسید کہ پھر وہ صاحبِ وحی نبی بن بیٹھا' ہزاروں ماننے والے اپنے گرد جمع کر لیے اور بہت سی خلقِ خدا کی گمراہی کا سبب بن گیا۔

غلام احمد پرویز نے بھی یہی طریق کار استعمال کیا۔ اس نے لونڈی غلاموں کا مسئلہ' یتیم پوتے کی وراثت' قتل مرتد اور تعددِ ازدواج جیسے مسائل کھڑے کر دیے۔ یہ وہ مسائل ہیں جو قرنِ اوّل سے تا امروز متفق علیہ رہے ہیں اور اہل سنت کے تمام فقہی مکاتب کا ان پر اجماع ہے۔ یتیم پوتے کی وراثت کا مسئلہ بڑا حساس (touchy) ہے' اس نے بڑے جذباتی اور جگرسوز (pathetic) انداز میں اپنے زورِ قلم سے یتیم پوتے کے لیے ہمدردیاں حاصل کیں۔ اس طرح قرآن کے نام پر ان تمام مجمع علیہ مسائل کے خلاف ایک محاذ بنا کر اس نے بہت سے لوگوں کو انکارِ حدیث و سنت کی ضلالت میں مبتلا کر دیا۔ حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ جو لوگ بھی شریعتِ اسلامی کی الف' با' تا بھی جانتے ہیں' وہ اس کی بنیادوں کو جانتے ہیں' اس کے دلائل سے واقف ہیں۔ لیکن ہمارے معاشرے کے ''پڑھے لکھے جاہل'' تو ایک کھلی چراگاہ کی مانند ہیں کہ کوئی بھی ذہین انسان اپنی انشاء پردازی اور اپنے خاص اسلوبِ نگارش کو کام میں لا کر

دھواں دار کتابیں لکھے اور اس طبقے میں سے کثیر تعداد میں لوگوں کو اپنا ہم خیال بنا کر ایک جمعیت فراہم کر لے۔ اب خود سوچیے کہ جو لوگ قائل ہو گئے ان کے اذہان پر کیا اثرات مرتب ہوئے! ہلکے سے ہلکے انداز میں یہ تأثرات بیان کیے جائیں تو وہ یہ ہوں گے کہ ہمارے ائمہ کرام' فقہائے عظام' لائق احترام محدثین اور مفسرین بڑے بھولے بھالے تھے کہ ان کی سمجھ میں یہ باتیں نہیں آئیں۔ ان کی حقیقت منکشف ہوئی ہے تو اس شخص پر ہوئی ہے! یہ ہے وہ طریق کار جس سے قرآن کے نام پر اٹھنے والی دعوتوں اور تحریکوں نے منفی انداز اختیار کیا' لوگوں کو اسلاف سے بدظن کر دیا اور ان کا حال کٹی ہوئی پتنگ کا سا ہو گیا کہ ہوا جدھر چاہے اس کو لے جائے۔

دورِ حاضر کے ایک مفسرِ قرآن کی لغزش

میرے لیے اس معاملے میں بہت بڑی تشویش والی بات ہو گئی تھی کہ ایک ایسے بزرگ نے بھی یہی روش اختیار کی جو خود مفسرِ قرآن ہیں۔ ان سے میرا طویل عرصے تک قریبی تعلق و رابطہ رہا ہے' میں نے ان کی خدمت بھی کی ہے اور اُن کے فکر کی بھی۔ میں نے ان کی کتابوں کو شائع بھی کیا ہے۔ ساری عمر قرآن کے پڑھنے پڑھانے میں بِتا کر آخر کار یہ ہوا کہ رجم کے متعلق انہوں نے یہ رائے دے دی کہ شادی شدہ اور غیر شادی شدہ زانی کے لیے اسلام میں حد علیحدہ علیحدہ نہیں ہے' بلکہ شادی شدہ زانی کے لیے بھی وہی سو کوڑے ہیں جو قرآن میں آئے ہیں۔ رجم کا معاملہ تو تعزیر سے متعلق ہے' کوئی شخص غنڈہ ہو' اوّل درجے کا بدمعاش ہو' جو معاشرے میں سانڈ بنا پھرتا ہو لیکن پکڑ میں نہ آ رہا ہو' ایسا شخص جب پکڑ میں آ جائے گا تو وہ رجم کر دیا جائے گا' ورنہ رجم باقاعدہ حد نہیں ہے' عام شادی شدہ زانی کی سزا وہی سو کوڑے ہیں جو قرآن میں ہے۔ اللہ تعالیٰ ان بزرگ کو معاف کرے اور انہیں توفیق دے کہ وہ اس موقف سے رجوع کریں اور توبہ کریں۔(۱)

آدمی کے سر پر جب ایک فلسفہ سوار ہو جاتا ہے تو وہ تمام احتیاطوں کو نظر انداز کر کے اپنی رائے کے حق میں ایسی باتیں کہہ جاتا ہے جس کی اس سے توقع نہیں ہوتی۔ چنانچہ حضرت ماعز اسلمی رضی اللہ عنہ جن کی توبہ کے متعلق نبی اکرم ﷺ کی صحیح روایت موجود ہے کہ اس نے وہ توبہ کی ہے

(۱) یہ بزرگ مولانا امین احسن اصلاحی مرحوم تھے۔ افسوس کہ وہ آخر دم تک اسی موقف پر جازم رہے اور اس سے رجوع نہیں کیا۔

کہ اگر ایک بڑے گروہ پر تقسیم کر دی جائے تو سب کے لیے کافی ہو جائے‘[۱] ان صحابی کے لیے ان بزرگ نے اپنی تحقیق کے نتیجے میں اپنی تفسیر میں ”نہایت بدخصلت غنڈا“ کا لفظ استعمال کیا (نقل کفر‘ کفر نباشد)‘ یہاں تک لکھ دیا کہ ”روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی ﷺ اور آپؐ کے صحابہؓ کسی غزوے کے لیے نکلتے تو یہ چپکے سے دبک کر بیٹھ رہتا اور مردوں کی عدم موجودگی سے فائدہ اٹھا کر شریف بہو بیٹیوں کا تعاقب کرتا۔ بعض روایات سے اس تعاقب کی نوعیت بھی واضح ہوتی ہے کہ اس طرح تعاقب کرتا جس طرح بکرا بکریوں کا کرتا ہے“۔ آگے اس سے بھی بڑھ کر ایک نہایت غیر شائستہ بات لکھی ہے۔ آگے اپنی تحقیق ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں: ”آنحضرت ﷺ کو اُس کی شرارتوں کی رپورٹ ملتی رہی‘ لیکن چونکہ کسی صریح قانون کی گرفت میں یہ نہیں آتا تھا اس وجہ سے آپؐ نے کوئی اقدام نہیں کیا۔ بالآخر یہ قانون کی گرفت میں آ گیا۔ آپؐ نے اس کو بلوا کر تیکھے انداز میں پوچھ گچھ کی۔ وہ تاڑ گیا کہ اب بات چھپانے سے نہیں چھپ سکتی اس وجہ سے اس نے اپنے جرم کا اقرار کر لیا۔ جب اقرار کر لیا تو آپؐ نے اس کے لیے رجم کا حکم دے دیا“۔[۲]

(۱) اہل سنت کے تمام مکاتب فکر کے نزدیک جن چھ کتب احادیث کو صحاحِ ستہ کہا جاتا ہے ان میں مسلم شریف کا شمار دوسرے نمبر پر ہوتا ہے۔ حضرت ماعز بن مالک اسلمی رضی اللہ عنہ کے متعلق رجم کے بعد نبی اکرم ﷺ کا یہ ارشاد مروی ہے: لَقَدْ تَابَ تَوْبَةً لَوْ قُسِمَتْ بَيْنَ اُمَّةٍ لَوَسِعَتْهُمْ مصنف عبدالرزاق میں حضرت ماعز اسلمیؓ کے بارے میں حضور ﷺ کے یہ الفاظ بھی آئے ہیں: اِنَّهُ الْآنَ لَفِيْ اَنْهَارِ الْجَنَّةِ يَنْغَمِسُ۔

(۲) ان بزرگ کی تحقیق کا تجزیہ کیجیے تو نتیجہ یہ نکلے گا کہ معاذ اللہ نبی اکرم ﷺ نے موجودہ دور کے تھانہ داروں کی طرح third degree method استعمال کر کے ان صحابی کو اقرارِ جرم پر مجبور کر دیا تھا۔ حالانکہ دنیا جانتی ہے کہ اس طور پر حاصل شدہ اقرار جرم کی قانوناً کوئی حیثیت نہیں ہوتی۔ اس طرح واضح ثبوت کے بغیر محض ”تیکھے انداز سے پوچھ گچھ“ کے نتیجہ میں مجبور کر کے اقرارِ جرم کرانے کا الزام معاذ اللہ اس ہستی ﷺ پر عائد ہوتا ہے جو نظامِ عدل وقسط قائم کرنے کے لیے مبعوث ہوئی تھی: ﴿وَاُمِرْتُ لِاَعْدِلَ بَيْنَكُمْ﴾۔ مزید برآں ایک نہایت قابل غور بات یہ ہے کہ ان محقق و مفسر قرآن نے متعدد مرتبہ لکھا ہے کہ ”روایات سے معلوم ہوتا ہے“ لیکن کسی ایک روایت کا بھی حوالہ نہیں دیا‘ جبکہ تحقیق کا حق اور انصاف کا تقاضا یہ تھا کہ ایک صحابی پر جب زبانِ طعن کھولی ہے تو اُن روایات کا حوالہ بھی دیا جاتا تاکہ تحقیق کی ◀

ان بزرگ کا ایک مستقل حلقہ ہے۔ ان کے معتقدین موجود ہیں جو انہی کی آنکھوں سے دیکھتے اور ان ہی کے کانوں سے سنتے ہیں‘ ان کی رائے پر اندھا اعتماد رکھتے ہیں۔ چنانچہ اسی حلقے سے ایک نوجوان ایسے نکلے کہ انہوں نے آگے بڑھ کر جو جسارت کی ہے وہ بھی مسلمانوں کے کلیجے کو چھلنی کر دینے والی ہے۔ وہ اُس غامدیہ خاتون کے بارے میں کہتے ہیں کہ (معاذ اللہ) ”وہ چکلا چلاتی تھی“ جن کے بارے میں احادیث صحیحہ میں تفصیلات ملتی ہیں کہ وہ خود چل کر رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور عرض کیا ”حضورؐ! مجھ سے وہ خطا سرزد ہوگئی ہے جس کی سزا رجم ہے‘ مجھے پاک کر دیجیے‘ میں نہیں چاہتی کہ مجھے اس کی سزا آخرت میں ملے‘ مجھے اس گناہ سے یہیں پاک کر دیجیے!“ رسول اللہ ﷺ نے ہر طرح انہیں ٹالا کہ کیا کہہ رہی ہو! کہیں پاگل تو نہیں ہوگئی ہو؟ انہوں نے کہا حضورؐ مجھے تو اس گناہ سے حمل ہے۔ حضور ﷺ نے فرمایا کہ ”حمل ہے تو قصور تمہارا ہے‘ اس ننھی جان کا کیا قصور ہے جو تمہارے پیٹ میں ہے۔ جاؤ وضع حمل کے بعد آنا“۔ وضع حمل کے بعد وہ اللہ کی بندی پھر آ گئی۔ آپ سوچئے کہ رجم کی سزا سے زیادہ سخت سزا واقعتاً اور کوئی نہیں۔ پتھر مار مار کر ہلاک کرنا‘ سنگسار کرنا۔ لیکن وہ اللہ کی بندی چل کر پھر آ رہی ہے کہ ”حضور بچے کی ولادت ہوگئی ہے‘ مجھے پاک کر دیجیے“۔ حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ ”ابھی اس کا وجود تیرے وجود کا محتاج ہے‘ یہ زندہ کیسے رہے گا؟ جاؤ اس کو دودھ پلاؤ“۔ وہ اللہ کی بندی چلی گئی اور تیسری مرتبہ حاضر ہوئی تو بچہ اس کی گود میں تھا اور روٹی کا ٹکڑا بچے کے ہاتھ میں تھا۔ وہ عرض کرتی ہے کہ ”حضور ﷺ دیکھئے یہ بچہ اب اس قابل ہوگیا ہے کہ اپنی غذا حاصل کر سکتا ہے‘ یہ میرے دودھ کا محتاج نہیں رہا‘ مجھے پاک کر دیجیے“۔ میں اندازہ نہیں کر سکتا کہ اس خاتون کے رجم کا حکم دیتے وقت کتنا بڑا پتھر اپنے دل پر رکھا ہوگا محمد رسول اللہ ﷺ نے‘ جن کی شان خود اللہ تعالیٰ نے رؤف ورحیم بیان فرمائی ہے! لیکن حضور ﷺ نے شریعت کا تقاضا پورا فرمایا اور اس خاتون کو رجم کرنے کا حکم صادر فرمایا۔ یہ خاتون جس کی توبہ

◀ جا سکتی کہ ان روایات کا کیا مقام ہے! اکثر معتبر کتب احادیث میں جو روایات ملتی ہیں ان سب کا حاصل یہ ہے کہ حضرت ماعز رضی اللہ عنہ نے بغیر کسی جبر واکراہ کے از خود اعتراف واقرارِ جرم کیا تھا۔ نبی اکرم ﷺ نے ان کو ٹالنا چاہا لیکن وہ مصر رہے کہ ان کو پاک کر دیا جائے۔ حضور ﷺ نے تحقیق فرمائی کہ یہ نشہ تو نہیں کرتے؟ ان پر دیوانگی کا تو دَورہ نہیں پڑتا؟ جب ایسی کوئی بات نہیں نکلی کہ ”شک“ کا فائدہ ان صحابی کو پہنچ سکتا تو آپؐ نے ان کے اصرار پر رجم کی حد جاری کرنے کا حکم صادر فرمایا۔

مثالی توبہ ہے‘[1] جس سے معلوم ہوتا ہے کہ خوفِ آخرت اس کے دل پر کس طرح نقش تھا‘ ان بزرگ کے حلقے کے ایک صاحب اپنے ممدوح کی وکالت میں اس حد تک پہنچ گئے کہ انہوں نے اس صحابیہ خاتون کے بارے میں انتہائی شرمناک الفاظ استعمال کیے۔ انہوں نے اس واقعہ سے متعلق صحیح احادیث کو یکسر مسترد کر دیا۔

شہر لاہور میں ایک اُبھرتا ہوا فتنہ

یہی صاحب جو اَب ان بزرگ کے حلقۂ ارادت میں شامل ہونے اور رجم کے معاملے میں ان کے سب سے بڑے ایڈووکیٹ ہونے کا ’’شرف‘‘ رکھتے ہیں‘ آج سے چند سال پہلے ایک بہت بڑا کارنامہ سرانجام دے چکے ہیں۔ وہ اپنے تئیں ائمہ اربعہ سے بھی خود کو بالاتر سمجھنے کے زعم میں مبتلا ہیں۔ انہوں نے قرآن کے قانونِ وراثت پر ایک مضمون لکھا تھا جو اُن کے رسالہ میں شائع ہوا تھا۔ اس میں انہوں نے دعویٰ کیا تھا کہ قرآن کا قانونِ وراثت کسی کی سمجھ میں آج تک نہیں آیا‘ خاص طور پر ’’کلالہ‘‘ کے معنی تو آج تک کوئی سمجھ ہی نہیں سکا۔ سورۃ النساء کی آیت ۱۲ کے آخر میں ’’کلالہ‘‘ کی وراثت کا حکم بیان ہوا ہے اور اس ضمن میں اسی سورۂ مبارکہ کی آخری آیت (۱۷۶) میں مزید وضاحت آئی ہے۔ آخر میں اس توضیح کا سبب بیان فرمایا گیا: ﴿یُبَیِّنُ اللّٰہُ لَکُمۡ اَنۡ تَضِلُّوۡا ؕ﴾ ’’اللہ (اس قانون کی) تمہارے لیے تبیین فرما رہا ہے‘ مبادا تم گمراہ ہو جاؤ‘‘۔ ان صاحب کا کہنا ہے کہ اس کے باوجود اُمت چودہ صدیوں تک گمراہ رہی‘ کسی کی سمجھ میں نہیں آیا کہ کلالہ کا قانون کیا ہے‘ اب میں اس کو بیان کر رہا ہوں۔ اب یہ نوجوان رجم کے معاملے میں ان بزرگ کے ہم نوا بھی ہو گئے اور ان کے حلقۂ معتقدین میں بھی شامل ہو گئے۔ تو یہ ایک فتنہ ہے جو اِس وقت اسی شہر لاہور میں جڑیں پکڑ رہا ہے۔ عموماً ہوتا یہ ہے کہ جب فتنہ کا آغاز ہو رہا ہوتا ہے تو توجہ نہیں ہوتی۔ جب وہ فتنہ اپنی جڑیں زمین میں اُتار لیتا ہے اور اس کی شاخیں پھیل جاتی ہیں‘ تب کچھ لوگ اپنی کلہاڑیاں اور تیشے لے کر آتے ہیں‘ لیکن اُس وقت کچھ پیش نہیں جاتی‘ کیونکہ وہ فتنہ ایک مضبوط تناور درخت بن چکا ہوتا ہے‘ اس کی شاخیں بہت دور تک پھیل چکی ہوتی ہیں اور اس کی جڑیں کافی مضبوط ہو چکی ہوتی ہیں۔ اسی لیے میں نے ضروری سمجھا کہ اس فتنہ کے متعلق آپ حضرات کو بروقت خبردار اور آگاہ

(۱) صحیح مسلم ہی میں غامدیہ خاتونؓ کے بارے میں آنحضور ﷺ کا یہ ارشاد مروی ہے:
((فَوَ الَّذِیۡ نَفۡسِیۡ بِیَدِہٖ لَقَدۡ تَابَتۡ تَوۡبَۃً لَوۡ تَابَھَا صَاحِبُ مَکۡسٍ لَغُفِرَ لَہٗ))

کر دوں۔ اس لیے کہ یہ کام بھی قرآن کے نام پر ہو رہا ہے اور اس کے لیے جو شور اور ہنگامہ ہے وہ بھی قرآن کے حوالے سے ہے۔ یہ ایک تازہ ترین مثال آ گئی ہے۔ اس کو یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ یہ ایک معمولی مسئلہ ہے‘ اس پر اتنی تشویش کی ضرورت کیا ہے![1]

مرزا غلام احمد قادیانی کے بارے میں عرض کیا جا چکا ہے کہ اُس نے پہلے ایک ہی مسئلہ ’’رفع ونزولِ مسیح‘‘ کا کھڑا کر کے اپنے معتقدین کو اس اجماعی مسئلے کے متعلق شک وشبہ میں مبتلا کر دیا تھا اور ان کو اپنے ماضی اور اسلاف سے کاٹ دیا تھا۔ اسی مسئلہ کو منوا کر وہ درجہ بدرجہ آگے بڑھا۔ پہلے مجدّد ہونے کا دعویٰ کیا۔ جن لوگوں نے یہ دعویٰ مان لیا تو پھر ان کے حلق سے مسیح موعود‘ مثیلِ مسیح اور بالآخر نبی ہونے کے دعاوی تسلیم کرا لیے۔ ورنہ غور کیجیے کہ ختم نبوت اور رفع ونزولِ مسیحؑ کے سوا وہ اکثر ان چیزوں کو مانتے ہیں جو ہمارے ہاں تسلیم شدہ ہیں۔ نماز‘ روزہ‘ زکوٰۃ اور حج کے وہ قائل ہیں‘ قرآن کو ماننے کے وہ مدعی ہیں‘ کعبہ شریف کو اُمت کا مرکز تسلیم کرنے کے وہ معترف ہیں‘ اپنی عبادات کے مقام کو مسجد سے موسوم کرنے پر وہ عامل ہیں۔ یہ تو ہم نے ختم نبوت کے انکار کی وجہ سے ان کی تکفیر کر کے ان کو ملت اسلامیہ سے کاٹا ہے‘ اور بعد ازاں ایک صدارتی آرڈیننس کی رو سے ان کے لیے اسلامی اصطلاحات کے استعمال کو بھی خلافِ قانون قرار دے دیا گیا ہے۔ لہٰذا جان لیجیے کہ فتنہ کسی ایک یا چند مجمع علیہ مسائل کے مقابلے میں نئی اور اچھوتی بات زوردار طریقے اور مغالطہ آمیز طرزِ استدلال سے پیش کرنے ہی سے شروع ہوتا ہے۔ اس کو ہمارے معاشرے کے تعلیم یافتہ ’’جہلاء‘‘ کے حلق سے اُتروا دیا جائے تو پھر ایک ایسی چراگاہ مل جاتی ہے اور ایک ایسا میدان حاصل ہو جاتا ہے کہ اس میں شکاری جس طرح چاہیں شکار کھیلیں۔

میں یہ بات کئی بار عرض کر چکا ہوں اور آج پھر اس کا اعادہ کر رہا ہوں کہ میں عالم دین ہونے کا ہرگز مدعی نہیں ہوں۔ میں قرآن حکیم کا ایک ادنیٰ طالب علم اور خادم ہوں۔ میں نے اُمت کے موجودہ زوال کے اسباب پر قرآن وسنت کی روشنی میں غور کیا تو جس تشخیص تک پہنچا وہ میں بیان کر چکا ہوں۔ مجھے اس کی تائید الحمد للہ حضرت شیخ الہندؒ سے ان کی عمر کے آخری دَور

(۱) واضح رہے کہ محترم ڈاکٹر صاحب کا یہ خطاب ۱۹۸۴ء کا ہے اور جس فتنہ پرور نوجوان کا ڈاکٹر صاحب نے ذکر کیا ہے یہ علامہ جاوید احمد غامدی ہیں‘ جو اَب اسلام کا ایک جدید روشن خیال‘ اعتدال پسند ایڈیشن پیش کر چکے ہیں۔

کےعزائم سے مل گئی اور میں اسی کام میں لگا ہوا ہوں۔ مجتہد ہونا تو بہت دُور کی بات ہے' فقہ کے
متعلق میرا مطالعہ محدود ہے۔ چنانچہ میں فقہی مسائل کے متعلق استفسارات کے جواب دینے
سے حتی الامکان اجتناب برتتا ہوں۔ میں نے اپنے رفقاء سے بھی کہہ رکھا ہے کہ جس فقہی
مسلک پر آپ مطمئن ہیں اس پر عمل کیجیے' کوئی مسئلہ پیدا ہو تو اپنے مسلک کے مستند علماء اور
دارالافتاء سے رجوع کیجیے —— پھر یہ کہ میری پختہ رائے ہے اور میں اس پر جازم ہوں کہ کسی
مسئلہ پر اسلاف کی متفقہ رائے سے اختلاف' خواہ وہ کسی ایک مسئلہ ہی میں کیوں نہ ہو' انتہائی
خطرناک ہے۔ اس طرح فتنوں کا آغاز ہوتا ہے۔ قادیانیت اور پرویزیت کے ناسور اسی طرح
پیدا ہوئے۔ غور کیجیے کہ آج کل کے ہم لوگ جس نوعیت کے ہیں' ہماری سیرت و کردار کے جو
معیارات ہیں' ان کے اعتبار سے کوئی مجتہدِ مطلق بن کر کھڑا ہو جائے اور خلفائے راشدین' ائمہ
اربعہ' تمام محدثین اور مفسرین کی متفق علیہ اور مجمع علیہ رائے کے خلاف اپنی رائے ظاہر کر دے تو
دینی اعتبار سے یہ کتنی خطرناک بات ہے! یہ تو تمام اسلاف کے فہم دین کے خلاف اظہارِ عدمِ
اعتماد ہے۔ رجم کا مسئلہ وہ ہے کہ جس سے خوارج اور چند معتزلہ کے سوا کسی نے اختلاف نہیں
کیا' اہل سنت کے تمام مسالک کے علاوہ سلفی مسالک کے ماننے والے بھی اس کو ''حد'' قرار
دیتے ہیں' امام ابن حزم ظاہری ؒ بھی اسی کے قائل ہیں۔ پھر اہل تشیع کے جتنے بھی
shades ہیں وہ سب کے سب اس پر متفق ہیں کہ رجم حد ہے۔ ایسے متفق علیہ مسئلہ کے خلاف
اپنا ''اجتہاد'' پیش کرنا —— یہ ہوتا ہے دراصل کسی فتنہ کے آغاز کا سبب!

ان بزرگ کے بارے میں تو میں یہ نہیں کہتا کہ ان کے پیش نظر کسی فتنہ کا آغاز ہے۔ وہ
عمر کے جس اسٹیج پر ہیں وہ طبعی عمر کی قریباً آخری اسٹیج کے زمرے میں آتی ہے۔ حسرت ہوتی
ہے تو اس بات پر کہ عمر کے آخری حصہ میں کوئی شخص ایسی کمائی لے کر اللہ تعالیٰ کے حضور میں
پہنچے۔ یہ معاملہ یقیناً حسرت ناک اور افسوس ناک ہے۔

فتنے سے بچاؤ کے لیے پانچ اصول

اب میں عرض کرنا چاہتا ہوں کہ اس دہری مشکل (dilemma) کا حل کیا ہے! ایک
طرف قرآن مجید اور سیرتِ مطہرہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ دین کا جو بھی نتیجہ خیز' پائیدار اور مستقل
کام ہو گا وہ قرآن کے ذریعے ہو گا۔ نبی اکرم ﷺ کا اساسی منہجِ انقلاب قرآن مجید تھا'
ازروئے الفاظِ قرآنی: ﴿كَمَآ اَرْسَلْنَا فِيْكُمْ رَسُوْلاً مِّنْكُمْ يَتْلُوْا عَلَيْكُمْ اٰيٰتِنَا وَيُزَكِّيْكُمْ

وَيُعَلِّمُكُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ...... ﴾ (البقرۃ:۱۵۱) ''جیسا کہ ہم نے تم میں ایک رسول بھیجا
تم ہی میں سے جو تمہیں ہماری آیات پڑھ کر سناتا ہے اور تمہیں پاک کرتا ہے اور تمہیں کتاب و
حکمت کی تعلیم دیتا ہے......'' آنحضور ﷺ نے دعوت و تبلیغ اور تزکیہ و تربیت کا کام کیا تو قرآن
کے ذریعے کیا' حکمت کی تعلیم دی تو قرآن کے ذریعے دی' صحابہ کرام ؓ کو بنیانِ مرصوص
بنایا تو قرآن کے ذریعے بنایا۔ اب اگر کوئی اس طرح کا کام کرنا چاہے گا تو قرآن مجید کے سوا
کوئی چارۂ کار نہیں۔ میں عرض کر چکا ہوں کہ پانچوں محاذوں کے لیے کارگر اور مؤثر تلوار ایک
ہی ہے اور وہ قرآن ہے۔ ماضی قریب کے ہمارے دو اکابر یعنی شیخ الہند ؒ اور علامہ اقبال
مرحوم اسی کے مؤید ہیں کہ اُمت کی اصلاح اور تجدید کا کام اگر ہو گا تو قرآن کے ذریعے ہو گا۔
جبکہ دوسری طرف قرآن کے نام پر اٹھنے والی تحریکوں کا یہ حشر ہے۔ اسی وجہ سے علمائے کرام
کے اندر ان کے بارے میں سوءِ ظن ہے اور وہ قرآن کے نام پر اٹھنے والی ہر دعوت اور تحریک
سے خطرہ محسوس کرتے ہیں' اندیشوں اور خدشات میں مبتلا ہو جاتے ہیں کہ ہو سکتا ہے کہ یہ شخص
بھی کوئی نیا فتنہ کھڑا کر دے۔ میں جب اس نتیجے پر پہنچا تو اُس وقت سے مجھے علماء کرام کے اس
موقف سے ایک ہمدردی پیدا ہو گئی۔ لیکن اس عقدے کا حل کیا ہے؟ اس حل کے ضمن میں میرے
سامنے ایک پانچ نکاتی پروگرام ہے۔ میں اس کو اِس اعتبار سے پیش کر رہا ہوں کہ لامحالہ کام تو
قرآن مجید ہی کے ذریعے کرنا ہو گا' البتہ فتنے سے بچنے کے لیے پانچ اصول ملحوظ رکھنے ہوں گے
اور پانچ اقدامات کرنے ہوں گے۔

(۱) اسلاف سے مضبوط تعلق: اسلاف کے ساتھ دلی محبت اور عقیدت و احترام کا ہمارا تعلق
کسی طور سے بھی کٹنے نہ پائے۔ اس کا اس درجہ اور اس حد تک اہتمام کیا جائے کہ اگر ہمارے
بزرگوں کی کتابوں میں کوئی ایسی چیز نظر آ بھی جائے جو ہمارے لیے بظاہر قابل اعتراض ہو تو
اوّلاً ہم اس کی بہتر سے بہتر تاویل کرنے کی کوشش کریں گے' اگر تاویل کی گنجائش موجود ہو۔
لیکن اگر یہ ممکن نہ ہو تو ہم یہ رائے قائم کریں گے کہ یہ قابل اعتراض بات ان کی کتاب میں کسی
اور نے شامل کر دی ہو گی۔ اس لیے کہ تاریخی طور پر یہ ثابت ہے کہ اعداء نے بڑے پیمانے پر
یہ کام کیے ہیں۔ اس مسئلہ پر پروفیسر یوسف سلیم چشتی صاحب نے بڑی تحقیق و تفتیش اور محنت و
کاوش سے ''تاریخ تصوف'' نامی کتاب لکھی تھی۔ اس کتاب کا ایک باب ایسا تھا جسے کوئی
سرکاری ادارہ شائع کرنے کی ہمت نہیں کر سکتا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے مجھے ہمت دی اور میں نے

اسے شائع کر دیا۔ اس باب کا عنوان ہے : ''اسلامی تصوف میں غیر اسلامی نظریات کی آمیزش''۔ میں آپ کو دعوت دوں گا کہ اس کا مطالعہ ضرور کریں۔ اس میں چشتی صاحب مرحوم نے سینکڑوں مثالیں جمع کر دی ہیں کہ باطل پرست فرقوں خاص طور پر باطنیہ فرقے کے لوگوں اور غالی قسم کے اہل تشیّع نے اہل سنت کے صحیح العقیدہ صوفیاء کرام کی کتابوں میں ایسی باتیں شامل کر دی ہیں جو اُن کے مسلّمہ صحیح عقیدے اور منشاء کے خلاف ہیں۔ معلوم ہوا کہ ایک سازش کے تحت ہمارے بہت سے بزرگوں کی کتابوں میں تدسیس وتحریف ہوئی ہے۔ لہٰذا اسلاف میں سے کسی معتبر ومعتمد عالم اور بزرگ کی کسی کتاب میں قرآن وسنت کے اعتبار سے کوئی قابل اعتراض بات نظر آئے گی تو اسے تدسیس وتحریف سمجھا جائے گا۔ کسی معتمد علیہ بزرگ کی توہین کرنا، ان کی تنقیص کرنا، ان کے احترام کو مجروح کرنا یہ ایک بہت بڑا فتنہ ہے۔

میں عرض کر چکا ہوں کہ اسلاف سے منقطع ہو کر انسان بے لنگر کا جہاز یا کٹی ہوئی پتنگ بن کر رہ جاتا ہے۔ چنانچہ جن لوگوں کا اسلاف کے ساتھ ادب، احترام، تعظیم، اعتماد اور محبت کا تعلق کمزور پڑ جاتا ہے یا منقطع ہو جاتا ہے وہ بڑی آسانی سے فتنوں کا شکار ہو جاتے ہیں۔ اس بات کو ہمیشہ ایک کسوٹی (criterion) کی حیثیت سے پیش نظر رکھیے اور جو شخص بھی دین کی کسی خدمت کا مدعی ہو، اُس کو پرکھنے، اس کے خلوص کو جانچنے کا ایک معیار اور اصول یہ بھی بنا لیجیے کہ اس کی صحبت میں بیٹھنے سے، اس کی باتیں سننے سے، اس کی کتابیں پڑھنے سے آیا اَسلاف کے ساتھ دل میں احترام، محبت اور حسنِ ظن پیدا ہوتا ہے یا اس کے برعکس سوءِ ظن کا معاملہ پیدا ہوتا ہے۔ یہ گویا اس بات کے لیے ایک اہم پہچان ہو گی کہ جو کام بھی خدمتِ دین یا قرآن کے نام پر اٹھایا گیا ہے آیا وہ صحیح رُخ پر جا رہا ہے یا غلط رُخ پر۔

(۲) فقہی معاملات میں اعتدال کی راہ: تقلیدِ جامد اور اجتہادِ مطلق کے درمیان ہمیں ایک معتدل راستہ اختیار کرنا ہو گا۔ تقلید جامد سے میری مراد یہ ہے کہ بس ایک فقہ کو اس طرح پکڑ کر بیٹھے رہیں کہ اس سے ذرا بھی اِدھر یا اُدھر نہ خود ہوں گے نہ کسی کا ہونا برداشت کریں گے۔ گویا انسان اس معاملہ میں اتنا زُود حس اور الرجک ہو جائے کہ کسی دوسرے فقہ کی کوئی بات سامنے آئے تو ''من دیگرم تو دیگری'' والا معاملہ ہو جائے۔ یہ درحقیقت وحدتِ اُمت کے لیے سخت نقصان دہ ہے۔ رہا عوام کا معاملہ تو ان کے بارے میں مَیں کہوں گا کہ اتباعِ رسول علیہ الصلوٰۃ والسلام کی نیت سے کسی ایک فقہ کو مستقلاً اختیار کر لیں تو مطلقاً کوئی حرج نہیں، بلکہ یہ ان کے لیے

بہتر ہے۔ وہ تو اپنے مسلک کے معتمد علماء سے جا کر فتویٰ لیں گے، انہیں کیا معلوم کہ اس معاملہ میں امام ابوحنیفہ، امام مالک، امام شافعی اور امام احمد بن حنبل ؒ کے دلائل کیا ہیں! اگر معلوم ہو بھی جائے تو ان میں اتنا فہم نہیں ہوتا کہ وہ موازنہ کر سکیں کہ کس کی دلیل قوی اور اقرب الی السنہ ہے۔ لہٰذا ان کے لیے عافیت اسی میں ہے کہ وہ ایک فقہ کی پیروی کریں۔ اس لیے کہ اہل سنت کے تمام فقہی مسالک ومکاتب کا ماٴخذ کتاب وسنت ہی ہے۔ جیسے میں نے ایمان کے ضمن میں عوام کے بارے میں عرض کیا تھا کہ کسی صاحب یقین وایمان کی صحبت بھی کفایت کر سکتی ہے، اسی طرح ان کے لیے کسی ایک فقہ کی پیروی کرنے میں مطلقاً کوئی حرج نہیں۔ البتہ ان پر یہ بات واضح کر دینی ضروری ہے کہ اہل سنت کے تمام مسالک مبنی بر کتاب وسنت ہیں، تاکہ دوسرے مسلک کے پیروکاروں کے متعلق ان کے دلوں میں غیریت کا احساس بالکل پیدا نہ ہو۔

رہا ان حضرات کا معاملہ جو دین کے خادم ہیں، جو میدان میں آکر دین کی خدمت کر رہے ہیں، جن کے سامنے اسلام کی نشأۃِ ثانیہ اور احیائے دین کی منزل ہے، انہیں تو یقیناً اس تقلیدِ جامد سے نکلنا پڑے گا۔ ان کو سمجھنا چاہیے کہ جب ہم اہل سنت کے تمام مسالک کو اپنا مشترکہ اثاثہ اور علمی ورثہ سمجھتے ہیں، ائمہ اربعہ کو اہل سنت کے امام مانتے ہیں اور امام بخاریؒ کی صحیح الجامع کو اصحّ الکُتبِ بعدَ کِتاب اللّٰہ تسلیم کرتے ہیں تو کم از کم ان پانچ دائروں کی حد تک تو اپنے قلب وذہن کو کشادہ اور وسیع کیا جائے۔

مولانا مفتی محمد شفیع ؒ کی تقریر کے حوالے سے، جو ''وحدتِ اُمت'' کے نام سے مطبوعہ موجود ہے، حضرت شیخ الہند ؒ کے قرآن کی تبلیغ ودعوت کے بارے میں عزائم کا ذکر کیا جا چکا ہے جن کا اظہار حضرت شیخ الہندؒ نے اسارتِ مالٹا سے واپسی کے بعد دارالعلوم دیو بند میں علماء کے ایک اجتماع میں کیا تھا۔ اسی کتاب میں بیہقیٔ وقت مولانا انور شاہ کاشمیری ؒ کا ایک ایسا واقعہ مفتی صاحبؒ نے بیان کیا ہے کہ اسے آبِ زر سے لکھا جائے تو بھی اس کی عظمت کا حق ادا نہیں ہوتا اور اس کو جس قدر عام کیا جائے اسی قدر اِن شاء اللہ ہمارے یہاں فقہی معاملات میں جو تشتّت وافتراق ہے، اس میں بڑی حد تک اعتدال آ سکتا ہے۔ مفتی صاحب راوی ہیں کہ حضرت انور شاہؒ ایک موقع پر بہت مغموم بیٹھے تھے۔ میں نے پوچھا: حضرت کیسا مزاج ہے؟ کہا: ''ہاں! ٹھیک ہی ہے، میاں، مزاج کیا پوچھتے ہو، عمر ضائع کر دی''۔ مفتی صاحبؒ کہتے ہیں کہ میں نے عرض کیا: حضرت! آپ کی ساری عمر علم کی خدمت میں، دین کی اشاعت میں گزری ہے۔

آپ کے شاگرد علماء ہیں، مشاہیر ہیں۔ اگر آپ کی عمر ضائع ہوئی تو کس کی عمر کام میں لگی؟ فرمایا:
''میں تمہیں صحیح کہتا ہوں کہ عمر ضائع کر دی!'' میں نے عرض کیا: حضرت بات کیا ہے؟ فرمایا:

''ہماری عمر کا، ہماری تقریروں کا، ہماری ساری کدوکاوش کا خلاصہ یہ رہا ہے کہ دوسرے مسلکوں پر حنفیت کی ترجیح قائم کر دیں، امام ابوحنیفہؒ کے مسائل کے دلائل تلاش کریں۔ یہ رہا ہے محور ہماری کوششوں کا، تقریروں کا اور علمی زندگی کا! اب غور کرتا ہوں تو دیکھتا ہوں کہ کس چیز میں عمر برباد کی؟ ابوحنیفہؒ ہماری ترجیح کے محتاج ہیں کہ ہم ان پر کوئی احسان کریں؟ ان کو اللہ تعالیٰ نے جو مقام دیا ہے وہ مقام لوگوں سے خود اپنا لوہا منوائے گا، وہ تو ہمارے محتاج نہیں۔

اور امام شافعیؒ امام احمد بن حنبلؒ اور دوسرے مسالک کے فقہاء جن کے مقابلے میں ہم یہ ترجیح قائم کرتے آئے ہیں، کیا حاصل ہے اس کا؟ اس کے سوا کچھ نہیں کہ ہم زیادہ سے زیادہ اپنے مسلک کو صواب محتمل الخطاً (درست مسلک جس میں خطا کا احتمال موجود ہے) ثابت کر دیں اور دوسرے کے مسلک کو خطأ محتمل الصواب (غلط مسلک جس کے حق ہونے کا احتمال موجود ہے) کہیں، اس سے آگے کوئی نتیجہ نہیں ان تمام بحثوں، تدقیقات اور تحقیقات کا جن میں ہم مصروف ہیں۔''

پھر فرمایا:

''ارے میاں! اس کا تو کہیں حشر میں بھی راز نہیں کھلے گا کہ کون سا مسلک صواب تھا اور کون سا خطا، اجتہادی مسائل صرف یہی نہیں کہ دنیا میں ان کا فیصلہ نہیں ہوسکتا، دنیا میں بھی ہم تمام تر تحقیق و کاوش کے بعد یہی کہہ سکتے ہیں کہ یہ بھی صحیح، یا یہ کہ یہ صحیح ہے، لیکن احتمال موجود ہے کہ یہ خطا ہو، اور وہ خطا ہے اس احتمال کے ساتھ کہ صواب ہو۔ دنیا میں تو یہ ہے ہی، قبر میں بھی منکر نکیر نہیں پوچھیں گے کہ رفع یدین حق تھا یا ترکِ رفع یدین حق تھا؟ آمین بالجہر حق تھی یا بالسّر حق تھی، برزخ میں بھی اس کے متعلق سوال نہیں کیا جائے گا اور قبر میں بھی یہ سوال نہیں ہوگا۔''

مفتی صاحب کہتے ہیں کہ حضرت شاہ صاحب ﷫ کے مزید الفاظ یہ تھے:

''اللہ تعالیٰ شافعیؒ کو رسوا کرے گا نہ ابوحنیفہؒ کو نہ مالکؒ کو اور نہ احمد بن حنبلؒ کو، جن کو اللہ تعالیٰ نے اپنے دین کے علم کا انعام دیا ہے، جن کے ساتھ اپنی مخلوق کے بہت بڑے حصے کو لگا دیا ہے، جنہوں نے نورِ ہدایت چار سو پھیلایا ہے، جن کی زندگیاں سنت کا نور پھیلانے میں گزریں، اللہ تعالیٰ ان میں سے کسی کو رسوا نہیں کرے گا کہ وہاں میدانِ

حشر میں کھڑا کر کے یہ معلوم کرے کہ ابوحنیفہؒ نے صحیح کہا تھا یا شافعیؒ نے غلط کہا تھا یا اس کے برعکس، یہ نہیں ہوگا۔''

وقت کی اہم اور شدید ترین ضرورت ہے کہ حضرت شیخ الہندؒ کا قول اور حضرت مولانا انور شاہ کاشمیریؒ کے ان اقوال کو کم از کم دیوبندی اور تھانوی حلقوں میں جس قدر ممکن ہو پہنچایا جائے، تاکہ جو اِن حلقوں کے متوسلین اور عقیدت مند ہیں ان کی تو آنکھیں کھلیں کہ ہمارے یہ دونہایت ہی قابلِ اعتماد متقی اور متدیّن اکابر اپنی عمر کے آخری دَور میں پہنچ کر اپنے تجربات کی روشنی میں کن نتائج تک پہنچے تھے! علمی اعتبار سے اور جہادِ حریت کے حوالے سے جہاں شیخ الہندؒ کا بلند ترین مقام سمجھا جاتا ہے وہاں حضرت انور شاہ صاحبؒ کے متعلق یہ کہا جاتا ہے کہ محدث اور فقیہہ ہونے کے اعتبار سے وہ چودھویں صدی کی شخصیت نہیں ہیں بلکہ وہ تو پرانے دَور کی علمی شخصیتوں کے ہم پلہ شخصیت ہیں۔ انہیں بیہقیٔ وقت کہا جاتا ہے۔ ان بزرگوں نے اپنی عمر کے آخری دور میں جو باتیں کہی ہیں، کاش ان کے متوسلین تو کم از کم ان پر غور کریں، سوچیں اور اپنے طرزِ عمل میں ان اکابر کی باتوں کے پیشِ نظر خوشگوار اور صحت مند تبدیلی لانے کی فکر کریں! ان اقوال کی شہادت دینے والے بزرگ مفتیٔ اعظم پاکستان مولانا مفتی محمد شفیع ﷫ ہیں، جن کے ثقہ راوی ہونے میں کوئی شک نہیں کیا جا سکتا۔

مولانا انور شاہ کاشمیریؒ کے خیالات کے پیشِ نظر تقلید جامد اور اجتہادِ مطلق کے مابین ایک معتدل راستہ نکالنا ہوگا، خاص طور پر اُن حضرات کو جو علمی میدان میں خدمتِ دین اور خدمتِ قرآن میں لگے ہوئے ہیں۔ میں اپنے بارے میں کہتا ہوں کہ میں نیم مقلد ہوں۔ یعنی میں مقلد ہوں پانچ کا، صرف ایک کا نہیں۔ چار تو اہل سنت کے متفق علیہ ائمہؒ ہیں، اور پانچویں امام بخاریؒ، جن کی کتاب کے متعلق سب مانتے ہیں کہ ''اصح الکتب بعد کتاب اللّٰہ''۔ میں ان پانچ کے دائرے کے اندر اندر رہنے میں اپنے لیے عافیت سمجھتا ہوں۔ اللہ کرے کہ مستقبل میں اللہ تعالیٰ کسی ایسی عظیم شخصیت کو کھڑا کر دے جس کے تقویٰ، تدین، فہم دین، اصابت رائے اور خلوص و اخلاص پر اُمت کے بڑے حصے بالخصوص علمائے حق کی اکثریت کا اجماع ہو جائے تو وہ تمام فقہی مسالک میں عمیق غور و فکر کے بعد پوری للّٰہیت اور خدا ترسی کے ساتھ اُمت کو ایک فقہی مسلک پر مجتمع کر دے۔ ایسی شخصیت کا یہ مقام ہوگا کہ وہ کسی مسئلہ کے متعلق دین کے دائرے کے اندر اجتہادِ مطلق کر سکے۔ اس دَور میں ہم جیسے کم علم اس طرح کی حرکت کریں گے تو دین کے خلاف بغاوت اور ایک بہت بڑے فتنے کا آغاز کرنے کا باعث بنیں گے۔ چنانچہ

عافیت اسی میں ہے کہ رہیں اس دائرے کے اندر‘ لیکن یہ نہیں کہ بس ایک ہی فقہ کا دائرہ ہو۔ عوام کا معاملہ اور ہے‘ وہ اپنے اپنے مسلک کے مطابق عمل کریں اور روزمرّہ کے مسائل میں اپنے مسلک کے معتمد علماء کی طرف رجوع کریں۔ جیسا کہ میں عرض کر چکا ہوں کہ یہی ہدایت میں نے تنظیم اسلامی کے رفقاء کو دی ہے۔ فقہی مسائل کے بارے میں مَیں اپنی رائے کے اظہار سے بھی حتی الامکان گریز کرتا ہوں۔ البتہ میرا ایک مزاج ہے اور میں اسے چھپانا نہیں چاہتا کہ میں مقلد محض نہیں ہوں‘ میں نیم مقلد ہوں۔ میں ان پانچوں ائمہ کا مقلد ہوں اور ان پانچوں کے دائروں سے باہر جانے کو میں غلط سمجھتا ہوں۔ یہ ہماری مشترک متاع ہے۔ ان دائروں کے اندر اندر جس کی رائے کو بھی اقرب الی السنۃ اور اقرب الی الصواب سمجھتا ہوں‘ اسے ترجیح دیتا ہوں۔

(۳) دعوت الی القرآن کے چند اصول: اس پروگرام کی تیسری شق دعوت رجوع الی القرآن سے متعلق ہے۔ میں نے اشارہ کیا تھا کہ جب میں نے اس دعوت کا آغاز کیا تھا تو چند اصول پلّے باندھ لیے تھے۔ کام کے ساتھ ساتھ بفضلہٖ تعالیٰ ان اصولوں پر وثوق حاصل ہوتا رہا اور اللہ کی توفیق سے چند اور اصول بھی سامنے آتے رہے‘ جن کو میں نے ہمیشہ پیشِ نظر رکھنے کی حتی الامکان کوشش کی ہے۔ وہ اہم اصول پیش کیے دیتا ہوں۔

دعوت رجوع الی القرآن کا ایک تعلق احکام سے ہے۔ اس ضمن میں میرا ایک مستقل اور اٹل موقف رہا ہے اور وہ بالکل منطقی ہے کہ اس کا سارا دار و مدار اور تعلق نبی اکرمﷺ کے عمل سے ہے۔ ظاہر بات ہے کہ جو لوگ آنحضورﷺ سے جتنے زیادہ قریب تھے‘ اسی نسبت سے سب سے زیادہ استفادہ انہوں نے کیا۔ یہ تھے حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم۔ نمبر دو پر تابعین ہیں جو صحابہ کرامؓ کے تربیت وصحبت یافتہ تھے اور نمبر تین پر آتے ہیں تبع تابعین۔ یعنی تابعین سے مستفیض و مستفید ہونے والے اور تربیت پانے والے حضرات رحمۃ اللہ علیہم اجمعین ___ اسی کی وضاحت ہے جو نبی اکرمﷺ کے ایک ارشاد میں ہمیں ان الفاظ میں ملتی ہے: ((خَیْرُ اُمَّتِیْ قَرْنِیْ ثُمَّ الَّذِیْنَ یَلُوْنَهُمْ ثُمَّ الَّذِیْنَ یَلُوْنَهُمْ))(۱) جو جتنا دُور تھا اس کا فاصلہ بڑھتا جا رہا ہے‘ جو جتنا قریب ہے وہ اتنا ہی قابل اعتماد ہے۔ اس نے اگر حضورﷺ کو نہیں دیکھا تو حضورﷺ کے

(۱) صحیح البخاری‘ کتاب المناقب‘ باب فضائل اصحاب النبی ﷺ۔ وصحیح مسلم‘ کتاب فضائل الصحابۃ‘ باب فضل الصحابۃ ثم الذین یلونھم......

تربیت یافتہ لوگوں کو دیکھا ہے‘ ان کی صحبت اٹھائی ہے۔ اگر ان کو نہیں دیکھا تو ان کے تربیت یافتہ لوگوں کو دیکھا ہے‘ ان سے فیض اور افادہ حاصل کیا ہے۔ تو اُمت کا یہ جو تواترِ عمل ہے یہ سنت کو معلوم کرنے کا سب سے بڑا ذریعہ ہے۔ لہٰذا احکامِ دین کا جہاں تک تعلق ہے‘ اس میں کوئی نئی بات کہنا فتنہ اور فساد کی اصل جڑ ہے۔ اس میں تو کوشش ہو کہ پیچھے سے پیچھے جاؤ‘ حتیٰ کہ پہنچ جاؤ محمد رسول اللہﷺ تک:

بمصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر بہ اُو نرسیدی تمام بولہبی ست!

جہاں تک دین پر عمل کا تعلق ہے تو میں عرض کر دوں کہ قرآن حکیم کی وہ آیات ایک پارے کے بقدر بھی نہیں بنیں گی جو عملی طور پر احکام دین سے متعلق ہیں‘ جن سے فقہی مسائل کا استنباط ہوتا ہے۔ اصل میں عمل کا سارا دار و مدار سنتِ رسولؐ پر ہے۔ قرآن مجید میں نماز کی کتنی تاکید ہے۔ اسے ہر وہ شخص جانتا ہے جس کا دین سے ذرا بھی تعلق ہے‘ بلکہ اس بات کو تو وہ بھی جانتے ہیں جن کا دین سے عملی تعلق منقطع ہے۔ لیکن نماز کی ہیئت اور ترتیب کہاں سے ملے گی؟ اوقات کہاں سے ملیں گے؟ قرآن میں اشارات ہیں‘ لیکن نماز سے متعلق پورا نظام سنتِ رسول علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام سے ملے گا۔ رسول اللہﷺ نے ارشاد فرمایا: ((صَلُّوْا کَمَا رَاَیْتُمُوْنِیْ اُصَلِّیْ))(۱) ''نماز پڑھو جس طرح مجھے پڑھتے دیکھتے ہو‘‘۔ چنانچہ جہاں تک احکامِ دین اور فقہی مسائل کا تعلق ہے وہ سنت میں ملیں گے۔ سنت ہی احکامِ قرآن کی عملی تفسیر ہے‘ اسی سے استنباط ہوگا‘ استشہاد ہوگا‘ حتیٰ کہ اجتہاد ہوگا۔ لہٰذا اس معاملہ میں پیچھے سے پیچھے جائیے‘ آگے مت جائیے! احکام کے بارے میں ائمہ مجتہدین اور محدثین کے دائرے سے باہر قدم نہ نکالیے۔

دوسرا یہ اصول میں نے گرہ میں باندھ رکھا ہے کہ قرآن اور احادیثِ صحیحہ میں جو معجزات‘ خرقِ عادت اور محیر العقول برکات و واقعات مذکور ہیں‘ ان سب پر ہمیں حرف بہ حرف (literally) ایمان لانا ہوگا۔ اس لیے کہ قرآن مجید اللہ تعالیٰ کا کلام ہے اور وہ جس ربّ العالمین اور خالقِ کائنات کا انسان سے تعارف کراتا ہے وہ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ کی شان کا بھی حامل ہے‘ وہ فَعَّالٌ لِّمَا یُرِیْدُ بھی ہے‘ اور صرف وہی اَلْمَلِکُ الْقُدُّوْسُ اور اَلْعَزِیْزُ الْحَکِیْمُ ہے۔ لہٰذا اس معاملہ میں مَیں کسی تأویل کا روادار نہیں۔ ان کو جوں کا توں قبول کرنا

(۱) صحیح البخاری‘ کتاب الاذان‘ باب الاذان للمسافر......

میں ایمان کا لازمی جزو سمجھتا ہوں۔

تیسری بات یہ کہ قرآن مجید میں جن انبیاء ورُسل علیہم السلام اور جن اقوام و ملل کا ذکر ہے وہ بطورِ تذکیر اور بطورِ عبرت ہے۔ قرآن تاریخ یا جغرافیہ کی کتاب نہیں ہے کہ جس میں تمام معلومات جمع کر دی گئی ہوں۔ اس ضمن میں میری رائے ہے کہ تمدن کی ترقی کے ساتھ علم، جستجو، تحقیق اور معلومات کا دائرہ وسیع سے وسیع تر ہوتا چلا آ رہا ہے اور ہوتا چلا جائے گا۔ لہٰذا اس معاملے میں اگر ہمارے متقدمین علماء، محققین اور مفسرین کی آراء موجودہ تحقیقات و معلومات اور فراہم شدہ data سے مطابقت نہ رکھتی ہوں تو یہ بالکل فطری بات ہے، اس سے متوحش اور تشویش میں مبتلا ہونے کی قطعی ضرورت نہیں ہے۔ ان شاء اللہ جوں جوں تحقیقات و معلومات کا دائرہ وسیع ہوگا اس کے نتیجہ میں قرآن مجید کی حقانیت مزید مبرہن ہوتی چلی جائے گی، قرآن میں جو اشارات ہیں وہ کھلتے چلے جائیں گے اور جو اجمال ہے وہ واضح ہوتا چلا جائے گا۔

اسی طرح قرآن حکیم سائنس کی کتاب بھی نہیں ہے۔ اصلاً یہ کتابِ ہدایت ہے، هُدًى لِّلنَّاسِ ہے، لیکن یہ خالقِ کائنات کا کلام ہے، لہٰذا اس میں سائنسی مظاہر (scientific phenomena) کی طرف جابجا اشارے کیے گئے ہیں۔ کوئی اشارہ جیالوجی سے متعلق ہے، کوئی چیز علم فلکیات کے میدان کی ہے، کوئی چیز بیالوجی سے تعلق رکھتی ہے تو کوئی چیز فزیالوجی اور کوئی ایمبریالوجی (جنینیات) کے دائرے کی ہے۔ آپ کو معلوم ہوگا کہ قرآنِ مجید میں علم الجنین کا کتنی بار حوالہ آیا ہے اور رحم مادر میں جنین کے مختلف مراحل بیان ہوئے ہیں کہ وہ پہلے نُطفه ہوتا ہے، پھر علقه بنتا ہے، پھر مُضغه کی صورت اختیار کرتا ہے، پھر عِظام (ہڈیوں) کا مرحلہ آتا ہے، پھر ان ہڈیوں پر لحم (گوشت) چڑھتا ہے، پھر وہ زندہ انسان کی صورت میں رحم مادر سے تولّد ہو جاتا ہے۔ الغرض جتنے بھی سائنٹیفک پہلو اور گوشے ہیں، ان سب کے متعلق قرآن مجید میں اشارات موجود ہیں۔ ان کے متعلق جدید تحقیقات کی روشنی میں اگر یہ رائے دی جائے کہ ہمارے متقدمین علماء و مفسرین ان امور کو سمجھ نہ پائے تو یہ کوئی اچنبھے اور حیرانی والی بات نہیں۔ ان کے زمانے میں سائنس کا علم جس سٹیج پر تھا ظاہر بات ہے کہ وہ اسی کے مطابق قرآن مجید کے اشارات کی توجیہہ و تاویل اور تشریح و توضیح کرتے رہے۔ ان کے دَور تک سائنسی معلومات کا دائرہ بہت محدود تھا۔ اس سے آگے وہ کیسے جاتے؟ کسی کے لیے بھی اپنے دور کی موجود معلومات کے دائرے سے آگے جانا ممکن نہیں تھا۔ چنانچہ سات آسمانوں کی انہوں

نے جو تعبیر کی، بُرجوں کی انہوں نے جو توجیہہ کی، ﴿کُلٌّ فِیۡ فَلَکٍ یَّسۡبَحُوۡنَ ﴾ (الانبیاء) کی جو تعبیر کی یا جو بھی انہوں نے ﴿سَخَّرَ لَکُمۡ مَّا فِی السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِی الۡاَرۡضِ جَمِیۡعًا مِّنۡہُ﴾ (الجاثیة: ۱۳) کا مفہوم سمجھا، ان سب کو انہوں نے اُس وقت کے فراہم شدہ data کی روشنی میں سمجھا اور بیان کیا۔ سائنس نے ہمارے دور میں جو ترقی کی ہے اور جدید تحقیقات کے نتیجے میں جو انکشافات کیے ہیں ان کی روشنی میں اب ان آیات کی جو تعبیر اور توجیہہ کی جائے گی، جو مفہوم بیان کیا جائے گا تو یہ بات غلط نہیں ہوگی اور نہ اس سے ہمارے متقدمین کی کوئی توہین یا تنقیص ہوگی۔ عین ممکن ہے کہ مستقبل میں چند ایسے حقائق سامنے آئیں جو موجودہ تحقیقات سے بھی آگے کے ہوں۔ اس طرح قرآن کے عجائبات بھی مزید واضح ہوتے رہیں گے۔

اسی طرح قرآن حکیم تخلیق کائنات کے جو اَدوار اور تخلیق آدم کے جو مدارج بیان کرتا ہے، پھر آفاق و انفس سے توحید باری تعالیٰ کے متعلق جو بدیہی اور فطری استدلال پیش کرتا ہے، ان سب کو جدید دور کے مسلّمہ انکشافات، تجربات اور سائنسی حقائق کی روشنی میں موجودہ تعلیم یافتہ طبقے کی تفہیم و تعلیم کے لیے جدید اصطلاحات کے حوالے سے بیان کرنا ہوگا۔ یہی ابلاغ کا تقاضا ہے، لہٰذا اس کو اختیار کرنا ضروری ہے۔

اسی طرح موجودہ دَور کے تمام مادہ پرستانہ نظریات، ملحدانہ افکار اور طاغوتی نظام ہائے زندگی کے مقابلے میں قرآن کی انقلابی دعوتِ توحید پر ایمان لانے اور پھر اس ایمان و ایقان کے انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی سے متعلق جو مقتضیات، مضمرات، مطالبات اور توحید کی جو فروع (corollaries) ہیں، اس کے جو صریحی و منطقی اور بدیہی نتائج ہیں، ان کو موجودہ دَور کی اصطلاحات کے حوالے سے پیش کرنا ضروری ہے۔ یعنی اوّلاً تمام بنی نوعِ انسان کی اللہ کے بندے اور آدم کی اولاد ہونے کے ناطے کامل مساوات۔ اللہ کے نزدیک اکرم و اشرف وہ ہے جو اللہ کا سب سے زیادہ تقویٰ اختیار کرنے والا ہو۔ از روئے الفاظِ قرآنی: ﴿اِنَّ اَکۡرَمَکُمۡ عِنۡدَ اللّٰہِ اَتۡقٰکُمۡ﴾ (الحجرات: ۱۳) ـــــ ثانیاً انسان کی ہر نوع کی حاکمیتِ مطلقہ کی نفی۔ یعنی ﴿اِنِ الۡحُکۡمُ اِلَّا لِلّٰہِ﴾ کا اثبات اور اس کی توضیح و تشریح اور حاکمیت کی جگہ خلافت کا تصور ـــــ ثالثاً ملکیت مطلقہ کی نفی اور ﴿لِلّٰہِ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِی الۡاَرۡضِ﴾ کی تشریح اور ملکیت مطلقہ کی جگہ امانت کا تصور۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے قرآن کی عظمت کے بارے میں جو ایک طویل حدیث آئی ہے اس

میں وارد جوالفاظ ہیں ((وَلَا يَشْبَعُ مِنْهُ الْعُلَمَاءُ وَلَا يَخْلَقُ عَنْ كَثْرَةِ الرَّدِّ وَلَا تَنْقَضِي عَجَائِبُهُ))[1] یعنی ''علماء کبھی اس کتاب سے سیر نہ ہو سکیں گے' نہ کثرت و تکرارِ تلاوت سے اس کے لطف میں کوئی کمی آئے گی اور نہ ہی اس کے عجائبات یعنی نئے نئے علوم و معارف کا خزانہ کبھی ختم ہو سکے گا''، تو میرے نزدیک اس کا حقیقی مفہوم یہی ہے کہ دنیا میں قرآن مجید' فرقان حمید ہی اس ہدایت کی حامل کتاب ہے جو ہر دور کے مشرکانہ' خدانا آشنا اور ملحدانہ نظام ہائے زندگی کے مقابلے میں انسان کی رہنمائی اور فلاح کے لیے توحید پر مبنی' ہر نوع کے استحصال' تعدّی اور استبداد سے پاک اجتماعی نظامِ عدل و قسط پیش کرتا ہے۔ اسی نظام کو بالفعل قائم کرنے کی جدوجہد ہی اقامتِ دین کی جدوجہد ہے۔ اور میری پختہ رائے ہے کہ جب تک موجودہ اصطلاحات کے حوالے سے دین حق کو دنیا کے سامنے پیش نہیں کیا جائے گا نہ دعوت و تبلیغ کا کماحقہ' حق ادا ہوگا' نہ ابطالِ باطل ہوگا نہ احقاقِ حق —— چنانچہ میں اپنی دعوت میں ان تمام امور کو ملحوظ رکھتا ہوں اور اِن شاء اللہ رکھوں گا۔ میرے نزدیک اسی طرزِ فکر و عمل کا نام ہے حکمتِ دین!

میں نے آج یہ باتیں آپ کے سامنے قدرے تفصیل سے مربوط طریقے سے بیان کی ہیں۔ تحدیثِ نعمت کے طور پر عرض کرتا ہوں کہ میں جو کچھ بھی اپنی استعداد و استطاعت کے مطابق کام کر رہا ہوں اور دن رات جس کام اور جس دعوت کی دُھن مجھ پر مسلط ہے وہ بحمد اللہ انہی اصولوں کے تحت ہے۔ اللہ تعالیٰ مجھے اپنے خزانۂ فضل سے مزید توفیق و ہمت دے کہ اُس کی کتابِ عزیز کی زیادہ سے زیادہ خدمت کر سکوں اور اس کے علوم و معارف کی توضیح و تشریح کی سعادت پا سکوں اور اسی حال میں آخرت کے لیے رختِ سفر باندھوں۔

(۴) علماء کرام سے ربط وضبط: چوتھا نکتہ یہ ہے کہ اس دورِ فتن میں ﴿ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ﴾(الروم: ٤١) کا نقشہ ہماری نگاہوں کے سامنے ہے اور ہم دیکھ رہے ہیں کہ خدانا آشنا اور ملحدانہ نظریات و افکار' تہذیب و تمدن اور نظام ہائے زندگی کے باعث پوری دنیا میں فساد رونما ہو چکا ہے' انسانیت تیزی کے ساتھ ہلاکت خیزی کی طرف چلی جا رہی ہے۔ اُمت مسلمہ جو امر بالمعروف' نہی عن المنکر' دعوت الی اللہ اور دعوت الی الخیر کے لیے برپا کی گئی تھی وہ خود خوابِ غفلت میں پڑی ہوئی ہے۔ لہٰذا اس دور میں کرنے کا اصل کام ہے نوعِ انسانی کو دعوتِ

(۱) سنن الترمذی' کتاب فضائل القرآن' باب ما جاء فی فضل القرآن۔

توحید و ایمان دینا اور توحید علمی و عملی کو بالفعل قائم کرنے کی جدوجہد کرنا۔ اسی کا نام تکبیر ربّ ہے' اسی کا نام اظہار دین الحق علی الدین کلہٖ ہے۔

اب جو بھی دعوت اور تحریک اس مقصد کو لے کر اٹھے اس کے سربراہ اور رفقاء کو اپنے اوپر لازم کر لینا چاہیے کہ وہ علماءِ حق سے ربط و ضبط رکھیں گے' اپنے اوقات و مصروفیات میں سے وقت نکال کر ان کی خدمت میں حاضری دیں گے اور ان سے رہنمائی حاصل کریں گے۔ معلوم کریں گے کہ ان کے مغالطے کیا ہیں اور ان کے خدشات کی نوعیت کیا ہے! بسا اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ انہیں کوئی غلط بات پہنچا دی جاتی ہے' ہمارے موقف کے متعلق انہیں مغالطے دے دیے جاتے ہیں اور وہ اپنی نیک نیتی سے راویوں پر اعتماد کر کے ان غلط خبروں کو درست مان لیتے ہیں۔ اس لیے کہ جو شخص خود نیک نیت ہوتا ہے وہ دوسروں کے ساتھ بھی حسنِ ظن کا معاملہ کرتا ہے۔

میں نے تنظیم اسلامی میں شمولیت کے لیے بیعت کا جو طریقہ اختیار کر رکھا ہے کچھ عرصہ قبل اس کے خلاف اخبارات میں تین علماء کا فتویٰ شائع ہوا تھا' جس میں بیعت کے طریقہ کار کو کسی دینی ہیئتِ اجتماعی کی تشکیل کے لیے غلط قرار دیا گیا تھا۔ اس ضمن میں جب میں نے ایک عالمِ دین سے رجوع کیا' ان کی خدمت میں حاضر ہوا تو انہوں نے بتایا کہ مجھے تو وہ بیان دکھایا ہی نہیں گیا' مجھے تو فلاں صاحب نے ٹیلی فون پر کچھ بتایا تھا' اس میں بیعت کا مسئلہ تھا ہی نہیں' انہوں نے مجھ سے پوچھا تھا کہ اس پر آپ کا نام بھی دے دیا جائے؟ انہوں نے جن صاحب کا نام لیا وہ بھی ایک بڑی مذہبی شخصیت ہیں' لہٰذا انہوں نے نیک نیتی سے سمجھا کہ اتنی بڑی شخصیت جو بات بتا رہی ہے وہ صحیح ہو گی' اس لیے انہوں نے اپنے نام کی شمولیت کی منظوری دے دی۔ چنانچہ ان کی خدمت میں حاضری کا یہ فائدہ ہوا کہ پھر ان بزرگ نے اپنا تردیدی بیان اخبارات کو جاری کرایا کہ ''میرے نزدیک دینی ہیئتِ اجتماعیہ کے لیے بیعت کا طریق کار اختیار کرنے میں شرعی نقطۂ نظر سے قطعاً کوئی قباحت نہیں ہے''۔ یہ بات ان بزرگ کی نیک نفسی اور خلوص کی دلیل ہے۔ اگر میں ان کی خدمت میں حاضر نہ ہوا ہوتا تو یہ غلط بات آگے بڑھتی اور اس کے نمعلوم کہاں کہاں اور کیا کیا اثرات مترتب ہوتے۔ لیکن ربط و ضبط کے ذریعہ سے مغالطّوں اور سوءِ ظن کو اگر بالکل نہیں تو بہت حد تک کم کیا جا سکتا ہے۔ میں ان صاحب کے پاس بھی گیا جنہوں نے ٹیلی فون پر ان عالمِ دین سے گفتگو کی تھی۔ ان سے تبادلۂ خیال کیا اور افہام و تفہیم کی کوشش بھی کی' جو اگرچہ نتیجہ خیز نہیں ہوئی لیکن بہرحال میں نے دلائل کے ساتھ اپنا نقطۂ نظر اُن کے سامنے رکھ دیا۔

(۵) علماءِ حق کا اعتماد حاصل کرنے کی کوشش: پانچویں اور آخری نکتے کے متعلق میں پوری دیانت داری سے عرض کرتا ہوں کہ میرا موقف یہ ہے کہ ہر وہ دعوت جو اقامت دین کو اپنا ہدف بنا کر کھڑی ہوئی ہو‘ اس کے لیے صرف وقتی تدبیر کے طور پر نہیں‘ بلکہ قلب کی گہرائیوں سے لازم ہے کہ علمائے حق کا اعتماد کرنے کے لیے بھرپور کوشش کرے۔ میں دعوے کے ساتھ یہ بات کہہ رہا ہوں کہ کوئی بھی شخص اُس وقت تک اُمت کے اندر دین کا کوئی مؤثر کام نہیں کر سکے گا جب تک وہ ان علماء کا اعتماد حاصل نہ کرے جن کے متعلق اسے یہ یقین ہو کہ ان میں للّٰہیت ہے‘ خلوص واخلاص ہے‘ تقویٰ ہے اور ان میں انانیت ونفسانیت نہیں ہے۔ چھوڑ دیجیے ان کو جو علمائے سوء ہیں‘ جن کو اپنی گدیوں کا خطرہ لاحق ہو جاتا ہے‘ جنہیں یہ اندیشہ ہر وقت پریشان کیے رکھتا ہے کہ ہمارے گلے کی بھیڑیں ٹوٹ کر کسی اور کے گلے میں شامل نہ ہو جائیں۔ جہاں تک ہمارے علمائے حقانی کے اندیشوں اور خدشات کا تعلق ہے‘ اس کے اسباب تفصیل سے بیان کیے جا چکے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ جب بھی ان کے سامنے ان کے پورے احترام وادب کو ملحوظ رکھتے ہوئے اپنا موقف پیش کیا جائے گا اور ان سے مستقل ومسلسل ربط وضبط قائم رکھا جائے گا تو ان شاء اللہ العزیز اُن کی تائید اور ان کی دعائیں ضرور حاصل ہوں گی۔

حرفِ آخر

آخر میں چند معروضات پیش خدمت ہیں۔ مرکزی انجمن خدام القرآن کے زیر اہتمام پہلی قرآن کانفرنس ۱۹۷۳ء میں منعقد ہوئی تھی۔ اُس وقت میں نے کہا تھا کہ ہمارے یہاں ”قران السعدین“ اُس ساعت اور گھڑی کو کہا جاتا ہے جب دو سعید چیزیں جمع ہو جائیں‘ لیکن یہاں تو بفضلہٖ ”قران السعداء“ ہو گیا ہے‘ اس اعتبار سے کہ اس پہلی کانفرنس میں عظیم شخصیتوں کے جانشین موجود تھے۔ وہاں ایک طرف مولانا عبدالرحمٰن اشرفی صاحب تشریف فرما تھے جو مفتی محمد حسن ؒ بانی جامعہ اشرفیہ کے صاحبزادے ہیں۔ دوسری طرف ہمارے سٹیج پر مولانا عبید اللہ انور صاحب تشریف فرما تھے جو مولانا احمد علی ؒ کے صاحبزادے اور جانشین ہیں۔ پھر اس میں مولانا محمد یوسف بنوری ؒ تشریف لائے تھے جو علمائے دارالعلوم دیوبند کی جانشینی کا اعزاز اور شرف رکھتے تھے۔ میری تو ہمیشہ سے یہ کوشش رہی ہے کہ جملہ مکاتب فکر کے علماء کو ایک سٹیج پر قرآن کا پیغام خلقِ خدا تک پہنچانے کے لیے جمع کیا جائے۔ چنانچہ ہماری قرآن کانفرنسوں میں جو اہم دینی وعلمی شخصیتیں شریک ہوتی رہی ہیں ان میں سے چند نام پیش

کرتا ہوں۔ مولانا شمس الحق افغانی‘ نامور عالم ومحدث حضرت مولانا محمد گوندلوی‘ مولانا مفتی محمد حسین نعیمی‘ مولانا مفتی تقی عثمانی (جسٹس شریعت کورٹ)‘ مولانا ابوبکر غزنوی‘ مولانا داؤد غزنوی‘ پروفیسر یوسف سلیم چشتی‘ مولانا محمد طاسین‘ ڈاکٹر جسٹس تنزیل الرحمٰن (چیئرمین اسلامی نظریاتی کونسل) اپنے ملک کے علماء کرام ودانشوروں کے علاوہ بھارت کے کئی نامور علمائے کرام اور اہل دانش وبینش حضرات قرآن کانفرنسوں میں شرکت کر کے اپنے بیش بہا خیالات سے حاضرین کو مستفیض فرما چکے ہیں۔ مولانا حامد میاں مدظلہ خلیفۂ مجاز حضرت مولانا حسین احمد مدنی ؒ اگرچہ خود تشریف نہیں لا سکے لیکن ہر کانفرنس کے لیے انہوں نے باہتمام اپنا وقیع مقالہ ارسال فرمایا۔ اس وقت جلدی میں جو نام نوکِ زبان پر آئے ان کو بیان کر دیا گیا ہے‘ ورنہ الحمدللہ ہر کانفرنس اس لحاظ سے بے مثال تھی کہ قرآن مجید کے پیغام کے لیے ہر مسلک کے علماء نے تعاون فرمایا۔ میرے ساتھی جانتے ہیں کہ رجم کے سلسلہ میں جن بزرگ کا ذکر ہوا ہے‘ اُس وقت میرا ان سے بڑے قرب کا معاملہ رہا تھا۔ تو اُس وقت انہوں نے میرے اس طرزِ عمل پر تنقید کرتے ہوئے کہا تھا کہ ”ان مولویوں کو سر پر بٹھا کر کیا لینا ہے؟ ان مولویوں کی تو ہمیں تردید کرنی ہے“۔ لیکن اللہ کا فضل یہ ہے کہ میرا مزاج یہ نہیں ہے۔ میں علماء کرام کی خدمت میں مؤدبانہ حاضر ہوا کرتا ہوں اور میں تو یہ سمجھا کرتا ہوں کہ میرے لیے تحفظ کی ایک چیز یہ ہے کہ میں عالمِ دین نہیں ہوں‘ محض قرآن مجید کا ایک طالب علم اور ادنیٰ خادم ہوں۔ ورنہ اگر کہیں مجھے بھی کوئی غرۂ علمی ہو گیا ہوتا‘ میں بھی کسی زعم میں مبتلا ہو گیا ہوتا تو اس عُجب کی وجہ سے میرے دماغ میں بھی خنّاس پیدا ہو گیا ہوتا جو میرے لیے آخرت میں ہلاکت کا سبب بن جاتا۔ میں صمیم قلب سے اللہ تعالیٰ سے کسی عُجب میں مبتلا ہونے سے پناہ کا طالب رہتا ہوں۔

”مسلمانوں پر قرآن مجید کے حقوق“ نامی کتابچہ میں نے ۱۹۶۶ء میں لکھا تھا۔ اس کا ایک نسخہ میں نے ۱۹۷۰ء میں مولانا محمد یوسف بنوریؒ کی خدمت میں پیش کیا تھا جبکہ وہ مسجد نبویؐ میں معتکف تھے۔ میں نے ان سے عرض کیا کہ اس کو بنظر غائر ملاحظہ فرما لیجیے‘ کیونکہ میں اسے بڑے پیمانے پر پھیلانے کا ارادہ رکھتا ہوں۔ مجھے آپ کی رہنمائی درکار ہے‘ اگر کوئی غلطی ہو تو نشان دہی فرما دیں‘ میں اس کو درست کر لوں گا۔ مولانا نے از راہِ شفقت اور از راہِ تعاون علی البر میری درخواست قبول فرما لی‘ اعتکاف کی حالت میں مسجد نبویؐ میں اسے پڑھا اور صرف ایک جملہ میں ترمیم فرما دی۔ میں تسلیم کرتا ہوں کہ اس ترمیم سے وہ جملہ مزید نکھر آیا‘ میرا جو مفہوم تھا

وہ اس ترمیم سے مزید واضح ہوگیا اور میرے جملے سے جس مغالطے کے پیدا ہونے کا امکان تھا بحمد اللہ مولانا نَوَّرَ اللّٰہُ مَرْقَدَہٗ کی ترمیم سے اس کا احتمال ختم ہوگیا۔ تو اللہ کے فضل و کرم سے میرا مزاج تو یہ ہے' اور آج سے نہیں ابتدا سے ہے۔ الحمد للہ میں عُجب اور تکبر سے بچنے کی شعوری طور پر اللہ تعالیٰ سے پناہ طلب کرتا رہتا ہوں۔ نبی اکرمﷺ نے تین مہلکات میں سے اس عُجب کو شدید ترین باعثِ ہلاکت قرار دیا ہے۔ آپ سے بھی درخواست ہے کہ میرے حق میں دعا کرتے رہیں کہ اللہ تعالیٰ اس سے مجھے بچائے رکھے۔

کل رمضان المبارک کی ۲۹ ویں شب کو جامع القرآن' قرآن اکیڈمی میں ہمارا دورۂ ترجمۂ قرآن ختم ہوا ہے۔ یہ کام اللہ تعالیٰ کی توفیق و نصرت ہی سے تکمیل کو پہنچا ہے۔ اس سے مجھے ایک امید پیدا ہوئی ہے کہ یہ کام ان شاء اللہ العزیز مقبول ہوگا اور دوسرے لوگ بھی اس کا اہتمام کریں گے۔ جیسے ہم نے ''قرآن کانفرنس'' کے سلسلہ کا آغاز کیا تو وہ اتنا عام ہوگیا کہ مختلف دینی حلقوں کی طرف سے قرآن کانفرنسوں کا سلسلہ شروع ہوگیا جو مسلسل جاری ہے۔ ہمیں اس پر خوشی ہے۔ ہم نے کچھ اور نئے کام شروع کیے تو اس نہج پر بھی کام شروع ہوگیا۔ اللہ سب کو توفیق دے اور سب کے کاموں میں برکت دے' ان کو دین کے لیے سازگار بنائے' ایک کام کے لیے بیسیوں ادارے ہوں' سینکڑوں اشخاص ہوں' لیکن آپس میں ٹکراؤ اور تصادم نہ ہو تو یہ بڑی نیک فال ہے۔ میری معلومات کی حد تک رمضان المبارک میں تراویح کے ساتھ دورۂ ترجمۂ قرآن پہلی مرتبہ پایۂ تکمیل تک پہنچا ہے۔ ہمارے یہاں تراویح تو ہر مسجد میں ہوتی ہے اور جن لوگوں کو توفیق ملتی ہے اور جن میں ذوق و شوق ہے وہ تراویح پڑھتے ہیں۔ اگر ہر چار رکعات تراویح سے قبل ان میں پڑھے جانے والے قرآن مجید کا حاضرین کو صرف ترجمہ سنا دیا جائے تو میرا اندازہ ہے کہ شرکاء چاہے عربی سے بالکل ہی ناواقف ہوں پڑھے جانے والے قرآن مجید کے کم از کم پچیس فیصد حصے کے مفہوم کو سمجھتے چلے جائیں گے۔ اس لیے کہ ترجمہ کے ذریعے قرآنی الفاظ کے ساتھ ذہنی ہم آہنگی قائم ہو جاتی ہے اور یہ ذہنی رابطہ معنی اور مفہوم کو سمجھنے میں مدد ہوتا ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ توفیق دے اور بڑی بڑی مساجد میں بڑے پیمانے پر ہمارے علماء کرام اس کام کی طرف توجہ دیں تو میرے نزدیک یہ بہت بڑا break through ہو جائے گا۔

ہمارے بعض احباب نے کل ختم قرآن کے موقع پر اپنے تأثرات کا اظہار فرمایا کہ یہ کام جتنا کٹھن نظر آ رہا تھا' اتنا کٹھن ثابت نہیں ہوا۔ سینکڑوں کی تعداد میں جن لوگوں نے شرکت

کی ہے' ان میں اکثر وہ حضرات بھی تھے جو رات دو بجے تک اس پروگرام میں شریک رہے اور دن کو انہوں نے اپنے معمولات کے مطابق کام بھی پورے کیے۔ اور الحمد للہ یہ نہیں ہوا کہ شروع شروع میں لوگ آ گئے ہوں' پھر جوش ٹھنڈا پڑ گیا ہو' بلکہ مسلسل حاضری بڑھتی چلی گئی۔ اللہ کرے ہمارے واجب الاحترام رجالِ دین کی توجہ اس طرف مبذول ہو جائے اور وہ اس کام کو شروع فرما دیں تو میرے نزدیک یہ بہت مفید کام ہوگا' خاص طور پر جاہلیت قدیمہ کے تمام مشرکانہ اوہام کی جڑیں کاٹ دے گا' شفاعتِ باطلہ کے جو عقائد ذہنوں میں بیٹھے ہوئے ہیں ان کو بیخ و بن سے اکھاڑ پھینکے گا' اوہام کا طومار ان شاء اللہ تراویح کے ساتھ لفظی ترجمہ کے ذریعہ چھٹتا چلا جائے گا اور توحید خالص نکھر کر اذہان میں جاگزیں ہوتی جائے گی۔

میں اللہ تعالیٰ کے حضور دعا کرتا ہوں' آپ بھی دعا فرمائیں کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے جو بھی اب تک خیر کی توفیق بخشی ہے وہ اسے شرفِ قبولیت بھی عطا فرمائے اور دوسرے لوگوں کو بھی ہمت دے کہ وہ میرے ساتھ جڑ کر اور میرے دست و بازو بن کر یہ کام کریں اور اس کے لیے ان کے دلوں کو انشراح عطا فرمائے۔ یہ نہیں تو ان کو توفیق عطا فرمائے کہ وہ صحیح نہج پر دین کا کام کریں۔ یہ صرف میرا کام نہیں ہے' یہ ہر مسلمان کا دینی فریضہ ہے کہ اللہ کے دین کی سربلندی اور سرفرازی کے لیے اپنا تن' من' دھن لگائے۔ اللہ تعالیٰ ایسے تمام لوگوں کی مساعی کو مشکور فرمائے۔ اگر ہمارے دلوں میں خلوص ہوا تو آج نہیں تو کل ہم جمع ہو جائیں گے۔ ہوسکتا ہے کہ مجھے کسی کے بارے میں اس وقت کوئی اندیشہ ہو' کسی کو میرے بارے میں خدشات ہوں' تو اپنی اپنی جگہ خلوص و اخلاص اور خشیتِ الٰہی کے ساتھ کام کریں گے تو ہم یہاں جمع نہ بھی ہو سکے تو دین کی جو بھی صحیح خدمت ہوگی اس کے اثرات ان شاء اللہ مستقبل میں ایک جگہ جمع ہو جائیں گے ــــــ اور آخرت میں تو ہم سب کو بالآخر جمع ہونا ہی ہے: ﴿اَللّٰهُ يَجْمَعُ بَيْنَنَا ۚ وَاِلَيْهِ الْمَصِيْرُ ﴾ (الشوریٰ)

اقول قولی هذا واستغفر اللّٰه لی ولکم ولسائر المسلمین والمسلمات oo

افکار و آراء

محترم ڈاکٹر اسرار احمد مدظلہ کی تقریر ''جہاد بالقرآن'' میثاق کے اگست و ستمبر ۱۹۸۴ء کے شماروں میں شائع ہوئی تھی۔ مؤخر الذکر شمارے میں ایک تقریر بعنوان ''قرآن کے نام پر اٹھنے والی تحریکات کے بارے میں علماء کے خدشات'' بھی شامل تھی۔ ستمبر کے شمارے میں ان تقاریر پر تبصرہ کرنے اور اپنی آراء اور مشورے ارسال کرنے کی علماء کرام اور اہل دانش و بنیش سے درخواست کی گئی تھی۔ تادمِ تحریر' اس ضمن میں جو تبصرے اور آراء موصول ہوئی ہیں' ان میں سے چند کسی تبصرے کے بغیر پیش خدمت ہیں۔

مکتوب جناب ڈاکٹر غلام محمد صاحب مدظلہ' کراچی

محترم المقام مولانا ڈاکٹر صاحب! زاد فضلہم' السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ'

میثاق بابت ذی الحجہ ۱۴۰۴ھ میں ''قرآن کے نام پر اٹھنے والی تحریک'' والی آپ کی قلمبند تقریر سے استفادہ کا موقع ملا' ان شاء اللہ یہ ''توضیح خدشات'' اس نوعیت کے شبہات کے ازالہ میں مؤثر ثابت ہوگی۔ اس شمارے کے اداریہ میں اس خطاب پر تبصرے کی اپیل پڑھ کر خیال آیا کہ بر بنائے تعلق خاطر جو باتیں قابل عرض محسوس ہوئیں گوش گزار کردوں۔ اس سلسلہ میں میری صرف دو معروضات ہیں:

ایک تو یہ کہ اس قسم کے اہم اور نازک موضوعات اگر خود آنجناب کے قلم سے تحریر ہو جایا کریں تو لفظی احتیاط اور پیرایۂ اظہار کی خوبی اور افزوں ہو سکے گی۔

دوسرے یہ کہ ''انانیت اور عجب'' سے اپنی ذات کی براءت کا اظہار محل نظر ہے۔ عبدیت کی شان تو یہی ہے کہ ''وَمَآ اُبَرِّئُ نَفْسِیْ'' کا اعتراف رہے۔ نجومِ ہدایت حضرات صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی حیات میں یہی وصف عیاں ہے۔ ''نافق حنظلۃ'' والا حضرت حنظلہ ؓ کا اضطراب ہو یا حضرت عمرؓ کا اپنے بارے میں یہ اظہار کہ ''لیتنی لم اکن شیئًا' لیتنی کنتُ نسیًا منسیًا'' وغیرہ سب یہی درس فراہم کرتا ہے۔ صوفیاء کرام نے اس حقیقت کو سمجھا۔ اسی لیے ان سے جب پوچھا گیا کہ اخلاص کی شناخت کیا ہے تو فرمایا کہ ''عدم رؤیۃ الاخلاص فی الاخلاص''. حضرت شیخ سعدی نے اپنے شیخ حضرت شہاب الدین

سہروردیؒ کی وصیت بھی اسی مفہوم کے ایک قطعہ میں منظوم کی ہے کہ ؎

مرا پیر دانائے روشن شہاب — دو اندر ز فرمود بر روئے آب!
یکے آں کہ بر خویش خوش بیں مباش — دگر آنکہ بر غیر بد بیں مباش!

اس سے زیادہ عرض غیر ضروری ہے۔ اور یہ جسارت بھی آں مخدوم کے ایماء اور فراخدلانہ تبصرہ طلبی کی بنا پر ہوئی۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کی لاج دونوں جہاں میں رکھے اور اپنی رضامندی کے کاموں پر استقامت کاملہ عطا فرمائے۔

عرض جسارت پر معافی اور امیدِ عفو کے ساتھ دعا کا ملتجی ہوں۔ والسلام مع الاکرام

(۲)

مکتوب جناب مولانا اخلاق حسین صاحب قاسمی مدظلہ' ادارہ رحیمیہ' دہلی

محترم جناب ڈاکٹر صاحب! سلام مسنون

تنظیم اسلامی کے دونوں پرچے برابر پہنچ رہے ہیں' شکریہ۔ تنظیم کا سارا لٹریچر خاکسار کے مطالعے میں رہتا ہے اور جامعہ رحیمیہ کے اساتذہ بھی اس سے استفادہ کرتے ہیں۔

درس تفسیر کے طلبہ کو بھی تاکید کی جاتی ہے کہ وہ اسے بغور مطالعہ میں رکھیں۔ بڑا استفادہ ہوتا ہے۔ تازہ میثاق میں علماء اور دینی مدارس سے یہ اپیل کی گئی ہے کہ وہ دعوتِ قرآنی کے نظام پر اپنی رائے دیں۔

آپ نے قرآن کریم کی بنیادی دعوت کو جس ترتیب اور تنظیم کے ساتھ پیش کیا ہے وہ وقت کی اہم ضرورت ہے۔

جن حضرات نے دعوتِ قرآنی کے ساتھ عقائد' کلام اور فقہ کے جزوی مسائل میں اپنا دامن الجھایا وہ اس دعوت کا حق ادا کرنے میں کما حقہ' کامیاب نہیں ہو سکے۔

دعوتِ قرآنی اور اجتہادی مسائل میں الجھنا دونوں چیزیں الگ الگ ہیں —— ضرورت اس امر کی ہے کہ کچھ اللہ کے بندے اپنی جدوجہد کو اسلام کی بنیادی دعوت تک محدود رکھیں اور اس اُمت کو خیر امت بنانے کے لیے ان کے فکر و عمل میں اسے بٹھائیں' جمائیں اور اس کے عملی تقاضوں کے لیے سرگرم عمل کریں۔

حضرت امام ولی اللہؒ نے دعوتِ قرآنی سے اپنی اصلاحی اور تجدیدی سرگرمیوں کا آغاز

کیا۔ اسی لیے شاہ صاحب کے ہاں اجتہادی مسائل کا درجہ ثانوی حیثیت رکھتا ہے اور فقہی مسائل میں شاہ صاحب کے ہاں توسع ملتا ہے۔

آپ نے شاہ صاحب کے طریق فکر کو اپنا کر صحیح راہ اختیار کی ہے۔ مخالفین نے شاہ صاحب کی راہ میں بھی اڑچنیں پیدا کیں اور انہیں اس راہ سے ہٹانے کے لیے سازشیں پھیلائیں، مگر شاہ صاحب اور ان کے جانشین اس راہ پر قائم رہے۔

شاہ صاحب کا اصلاحی جہاد جب قلمی جہاد سے جہاد بالسیف کی منزل میں داخل ہوا تو تحریک جہاد میں شاہ صاحب کی حکمت عملی قائم نہ رہی اور نتیجہ میں تحریک جہاد درمیان میں ٹھنڈی پڑ گئی۔

آپ نے قرآنی دعوت کو مرحلہ وار جس سائنٹفک طریقہ سے واضح کیا، وہ قابلِ تعریف ہے۔ اللہ کرے کہ آپ اس دائرے سے باہر نہ ہوں، مولانا ابوالاعلیٰ مودودی رحمۃ اللہ علیہ اپنی انتہا پسندانہ تنقیدوں میں نیک نیت تھے مگر مرحوم کے قلمی جہاد کا وہ حصہ لوگوں کے لیے تشویش کا سبب بن گیا اور ماضی کے حالات کے پیش نظر علماء حق کو بھی خوف زدہ کر دیا۔ اس سے مودودی صاحب کی جدوجہد کو فائدہ کم اور نقصان زیادہ پہنچا۔

تنقید اسی حد تک ٹھیک ہے جس حد تک قرآن حکیم کی دعوت کو فائدہ پہنچے، محض علم و تحقیق کا مظاہرہ دعوتِ حق کی راہ میں مشکلات پیدا کرتا ہے۔

دعوتِ حق کی سیدھی ٹکر اس نام نہاد مسلم طبقہ سے ہے جو اسلامی احکام کے اجراء کو اپنی تعیش پسندی کے لیے موت کا پیغام سمجھتا ہے۔

اسی طبقہ کی وسیع سازشوں اور فریب کاریوں سے پیچھا چھڑانا دعوتِ حق کے خدام کے لیے مشکل کام ہے پھر ہر طرف تیر چلانے اور سب کو للکارنے سے کیا فائدہ؟ آپ نے سلف صالحین اور معاصر علماء کے ساتھ احترام اور ادب کا اُسوہ اختیار کر کے اس نکتہ کو سمجھا ہے۔

اب ضرورت اس کی ہے کہ دعوتِ قرآنی کے خدوخال واضح کرنے اور اس کی بنیاد پر ایک تنظیم کی تشکیل کرنے کے ساتھ ہی اصلاحِ معاشرہ کا عملی پروگرام وضع کیا جائے۔ اور اصلاحِ معاشرہ کی جدوجہد مثبت طریقوں پر جاری کی جائے۔ منفی طریقوں سے امکان بھر بچنے کی کوشش کی جائے۔ انقلابِ قیادت جیسے نعروں کا پاکستان میں جو حشر ہوا وہ سبق آموز ہے۔

مولانا مودودیؒ ہر قدم پر یہ فرماتے رہے کہ دعوتِ حق کا کام کرنے والے حسب استطاعت مکلّف ہیں، مگر مرحوم نے مسلم معاشرہ کی صحیح کمزوریوں کا صحیح جائزہ لیے بغیر

استطاعت اور ماحول کے تقاضوں سے بے نیاز ہو کر بڑی لڑائی چھیڑ دی۔ مرحوم اپنی تاریخ ضرور بنا گئے مگر وہ دعوتِ حق کی تحریک کا کام کرنے والوں کے لیے مایوسیاں چھوڑ گئے۔

اب اقامت دین کی تحریک کی ناکامی —— اور وہ بھی ایک مسلم اسٹیٹ میں —— مخالفین کے لیے مثال بن گئی ہے۔

خمینی صاحب کی طرح یہ احمقانہ نعرہ کون لگائے کہ مسلمان کی منزل شہادت ہے، گردن کٹانا ہے، خون بہانا ہے اور بہشت میں گھر بنانا ہے۔ دعوت حق کو اس خون بہانے سے کچھ ملے یا نہ ملے، بس خون بہا دو۔

اسلام میں پہلی منزل ﴿وَ اَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ﴾ کی ہے اس کے بعد ﴿وَ قَاتَلُوْا وَ قُتِلُوْا﴾ کی ہے۔

جماعت کے تمام رفقاء کی خدمت میں سلام مسنون۔ کراچی کے دونوں واحدوں کو سلام پہنچا دیں۔ صاحبزادگان گرامی کی خدمت میں بھی اور بھائی جمیل الرحمٰن صاحب کی خدمت میں بھی۔

نومبر کے شروع میں لاہور آنے اور آپ کی ملاقات کا شرف حاصل کرنے کا ارادہ ہے۔

اور تعالیٰ خیر و عافیت رکھے، والسلام۔

(۳)

مولانا سید وصی مظہر صاحب ندوی

تنظیم اصلاح و خدمت حیدر آباد

مکری جناب بھائی جمیل صاحب! السلام علیکم ورحمۃ اللہ

کافی مدت کے بعد آپ کا خط ملا۔ ڈاکٹر صاحب کی سرگرمیوں اور دیگر حالات کا علم ہوا۔ ڈاکٹر صاحب اپنی صحت کا لحاظ کیے بغیر حد سے زیادہ مشقت کرتے ہیں، میرے خیال میں ان کو ڈاکٹر کے مشورے کے مطابق مکمل آرام کرنا چاہیے۔

''قرآن کے نام پر اٹھنے والی تحریکات'' میں بہت فکر انگیز باتیں کہی گئی ہیں۔ مولانا اصلاحی صاحب نے رجم کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے اس پر گرفت بالکل درست معلوم ہوتی ہے۔ مولانا اصلاحی صاحب نے ایک گناہ گار مگر تائب صحابی کے بارے میں جو زبان استعمال

کی ہے وہ یقیناً قابل اعتراض ہے۔ پھر روایات کے نام پر جو دعویٰ انہوں نے کیا ہے اس کو ثبوت کے ساتھ پیش کرنا ضروری تھا۔

جن نوجوان کی تحریروں پر ڈاکٹر صاحب نے اعتراض کیا ہے وہ میرے پاس موجود نہیں اس لیے ان کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔

ایک اصولی بات میں یہ ضرور کہوں گا کہ اصلاحی صاحب منزہ عن الخطاء نہیں اور نہ انبیاء و رسل کے سوا کوئی اور منزہ عن الخطا ہے۔ تاہم ایک یا چند غلطیوں کی وجہ سے کسی شخص کے پورے کارنامے کو مسترد کر دینا وہ انتہا پسندی ہے جس کے باعث ہمارے ہاں تحقیق اور فکر و نظر کی آزادی مفقود ہو کر رہ گئی ہے۔ والسلام!

(۴)

مولانا سید حامد میاں صاحب مدظلہ

مہتمم جامعہ مدنیہ لاہور

الحمد للّٰہ رب العالمین والصّلٰوۃ والسّلام علی سیّدنا محمد و آلہٖ واصحابہٖ اجمعین

میں نے ماہنامہ میثاق بابت ماہ ذی الحجہ ۱۴۰۴ھ ستمبر ۱۹۸۴ء شمارہ ۹۔ جلد ۳۳ میں جناب ڈاکٹر اسرار احمد صاحب مدظلہم کا خطاب جو ''قرآن کے نام پر اٹھنے والی تحریکات'' کے عنوان سے شائع ہوا ہے، پڑھا۔

جو کچھ انہوں نے علماء حق کے خدشات بیان فرمائے ہیں وہ درست ہیں۔ جب ڈاکٹر صاحب سمن آباد میں درس دیتے تھے تو میں نے اسی خیال سے ان سے عرض کیا تھا کہ درسِ قرآن پاک کے ساتھ درسِ حدیث بھی ضرور ہونا چاہیے اور واقعہ یہ ہے کہ اس سے بہت اعتدال رہتا ہے۔

قرآن پاک ذو وجوہ ہے۔ یہی حضرت علی نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہم سے فرمایا تھا (جب وہ خوارج سے گفتگو کرنے جا رہے تھے) کہ فقط قرآن پاک سے ہی مناظرہ میں استدلال نہ کریں بلکہ حدیث پاک سے بھی دلیل لیں۔

حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ محاصرہ میں تھے تو انہوں نے ایک باغی سے فرمایا کہ قرآن پڑھ کر سنا۔ اس نے قتال و جہاد کے مضمون پر مشتمل آیات پڑھنی شروع کیں۔ آپؓ نے ارشاد فرمایا

کہ یہ آیتیں تمہارے اور تمہارے ساتھیوں کے حق میں نازل نہیں ہوئیں، یہ میرے اور میرے ساتھی صحابہ کے حق میں اتری ہیں اسی پر محمول کی جا سکتی ہیں، آج کے تمہارے پیدا کردہ حالات پر نہیں۔

اسی دور میں حضرت علی رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے **اخطاؤا فی التاویل** یعنی قرآن پاک کی توجیہہ اور اس سے استدلال میں یہ لوگ غلطی میں مبتلا ہیں۔ یعنی حضرت عثمان و علی رضی اللہ عنہما کی بات ایک ہی تھی۔

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما خوارج سے لڑائیوں کے بعد فرمایا کرتے تھے کہ انہوں نے وہ آیتیں جو کفار کے بارے میں اتری ہیں، مسلمانوں پر منطبق کر دیں۔

اور ﴿**اِنِ الْحُکْمُ اِلَّا لِلّٰہِ**﴾ میں تو ان کا مغالطہ مشہور ہی ہے۔

میں ڈاکٹر صاحب سے عرض کروں گا کہ:

ترجمہ قرآن پاک میں جو امور ملحوظ رکھنے ضروری ہیں ان کی نشاندہی بھی فرماتے رہیں، ورنہ ڈپٹی نذیر صاحب اور جناب احمد رضا خاں صاحب کے ترجمے بھی تو موجود ہیں، جنہیں پڑھنے والا یہی سمجھے گا کہ یہ قرآن پاک میں آیا ہے، قرآن پاک کا ترجمہ یہی ہے۔ حالانکہ وہ سب سے کمزور قول پسند کر کے ترجمہ کر ڈالتے ہیں۔ اور اصلاحی صاحب اور ان کے نئے مؤید اور نہ جانے کون کون جو بالکل ہی آزاد ہو کر ترجمے کر رہے ہیں، تفسیریں لکھ رہے ہیں تو ضَلُّوا وَاَضَلُّوا کے مصداق بن رہے ہیں۔ اس قسم کے لوگوں کے پرویز کے اور سرسید کے پیشرو معتزلہ ہیں۔ جنہوں نے دوسری صدی میں یہ اصول ایجاد کیا کہ جو بات عقل میں آئے گی وہ ہی مانی جائے گی۔ لہٰذا قرآن پاک کی آیات کی وہ توجیہہ کی جائے گی جو عقلاً ان کے نزدیک درست قرار پائے گی اور حدیث وہ مانی جائے گی جسے ان کی سمجھ قبول کرے گی یا اس میں ان کی عقل کے مطابق توجیہہ ممکن ہوگی ورنہ حدیث ہی کا انکار کر دیا جائے گا۔

سرسید نے اسی اصول کو اپنایا اور معتزلہ کی دلیلیں استعمال کیں۔ تفسیر میں بھی اور حدیث میں بھی وہ جید علماء کے شاگرد تھے اور بڑی محنت سے پڑھے ہوئے تھے۔ انہوں نے بہت وقت لگا کر اور اپنی پوری ذہانت صرف کر کے یہ کام انجام دیا۔ مقالاتِ سرسید جو سترہ جلدوں میں ہیں، اسی قسم کی بحثوں کا ذخیرہ ہیں۔ چند سال قبل انکارِ مہدی پر ایک محققانہ مقالہ شائع ہوا تھا، وہ اسی ذخیرہ سے لیا گیا تھا۔ بلکہ محقق مضمون نگار نے اس کا کچھ حصہ چھوڑ دیا تھا۔ سرسید اس سے بھی زیادہ لکھ گئے ہیں۔

عقل کا استعمال فرض ہے مگر اصول اسلام جاننا اور ان سے نہ ٹکرانا بھی فرض اوّلین ہے۔

اس سے غفلت تباہی ہے۔ ع

لیکن کبھی کبھی اسے تنہا بھی چھوڑ دے!

اگرچہ حقیقت تو یہ ہے کہ اسی عقل کو اگر احکامِ اسلامی کے مدلّل کرنے کی طرف لگایا جائے تو یہ نظر آئے گا کہ احکامِ اسلامی ہی عقلاً درست ہیں۔ یہاں یہ بھی عرض کر دوں کہ اس گمراہی کی اصل صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو چھوڑنا ہے۔ اسی سے شیعہ پیدا ہوئے' اسی سے خوارج' جہمیہ اور **مرجئہ**' قدریہ وغیرہ۔ اور آج تک بھی جو فرقے پیدا ہو رہے ہیں یا بدعات سامنے آ رہی ہے وہ صحابہ کرام کی راہ سے ہٹنے کی وجہ سے ہیں۔ ارشادِ مبارک ((مَا اَنَا عَلَیْہِ وَاَصْحَابِیْ)) کس قدر معجزانہ ہے۔ اگر کسی کے دل میں صحابہ کرامؓ کی عظمت ہوگی تو وہ ان کی پیروی کرے گا اور جو ان کی پیروی کرے گا' نجات پا جائے گا۔

حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن صاحبؒ نے جو علماء کو جگہ جگہ عوام میں درسِ قرآن کریم کے اہتمام کی تجویز دی' اس پر عمل سے بہت فائدہ ہوا۔ اب بھی راولپنڈی' لاہور' رحیم یار خاں اور خانپور وغیرہ میں اس کے اہتمام کا سلسلہ جاری ہے۔ لیکن ہونا یہ چاہیے کہ جہاں بھی کوئی عالم ہے وہ عوامی درسِ قرآن اور درسِ حدیث دونوں کا اہتمام کرے۔

آٹھویں' دسویں' بارہویں جماعت کے لڑکوں کو اگر ائمہ مساجد روزانہ قرآن پاک کی چند آیات پڑھا دیا کریں تو یہ طبقہ رٹہ لگانے کا ایسا ماہر ہوتا ہے کہ وہ اگلے دن ان کو زبانی سنا دیا کرے گا۔ یہ میرا تجربہ ہے۔ اس طرح جو فائدہ ہوتا ہے وہ اندازہ سے باہر ہے۔ شاید حضرت شیخ الہندؒ کے ذہن مبارک میں اسی قسم کی کوئی سکیم ہو۔ اس طرح قرآن پاک کا ترجمہ یاد کر لینے کے بعد جو اس طالب علم کی ایمانی کیفیت ہوگی وہ ضرور انقلابی ہوگی اور مستحکم۔

چشتی صاحب مرحوم کی کتاب کے تذکرہ کے ذیل میں جو کتابوں میں تحریف کا ذکر آ گیا ہے اس کے بارے میں وضاحت فرما دی جائے کہ کتب حدیث وفقہ کی ہمیشہ شروع سے چھان بین ہوتی رہی ہے' وہ اس طرح کے تصرف سے منزہ ہیں۔ محدثین کے اصول بہت سخت اور پختہ ہیں۔ اسی طرح فقہاء کے بھی۔ مذہبی امور کے پرکھنے کا سلسلہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دور سے ہی شروع ہو گیا تھا بلکہ وہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ اس کے بانی ہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ گواہ طلب کرتے تھے کہ یہ حدیث جو تم بیان کر رہے ہو کسی اور کو بھی لاؤ جس نے یہ سنی ہو اور حضرت علی رضی اللہ عنہ سب سے قسم کھلواتے تھے' سوائے ابوبکر رضی اللہ عنہ کے' ان سے قسم کا مطالبہ نہیں کیا۔

حضرت مولانا انور شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے کلمات سے ایک عام آدمی یہ سمجھ سکتا ہے کہ

انہوں نے واقعی فضول کام میں زندگی گزاری اور ہم قرآن پاک کی خدمت کر رہے ہیں' تو ہم ان سے اچھے ہوئے۔ اس لیے یہ وضاحت فرمانی ضروری ہے کہ انہوں نے جو کیا وہ درست کیا۔ کیونکہ ایک مسلمان عالم جب کوئی مسلک اختیار کرتا ہے تو اسے قدرتی طور پر دلیل کی طلب ہوتی ہے کہ میں کس دلیل سے اس راہ پر چلوں اور کیوں اس مسئلہ پر عمل کروں تو وہ مطالعہ کرتا ہے۔ مطالعہ میں دوسرے ائمہ کرام کی دلیلیں بھی سامنے آتی ہیں تو ان میں موازنہ کا مطالعہ کرتا ہے جو کتابوں میں موجود ہوتا ہے۔ یہ اس کے مطالعہ کی بنیاد ہوتی ہے اور کتابیں اتنی زیادہ اور اتنی بڑی بڑی ہیں کہ ان کا احاطہ کرنے کے لیے انسانی زندگی ناکافی ہے۔

اور ایسا آدمی جو حدیث پڑھاتا ہو حدیث کے میدان میں داخل ہو جاتا ہے۔ اور اس میں سے کبھی اُسے نکلنا نہیں ہوتا۔ اسماء الرجال' حالاتِ صحابہ' تاریخ صحابہ' سیرت' جغرافیہ اور بہت سے علوم میں اسے گہرا مطالعہ کرنا اور یاد رکھنا پڑتا ہے' وہ بھی اصول کے تحت بے اصول نہیں' تب جا کر انور شاہ بنتا ہے۔ ان کا یہ فرمانا کہ ''کس چیز میں عمر برباد کی'' محض تواضعاً ہے ورنہ جس مسلک پر کوئی عالم باعمل ومتقی زندگی گزار رہا ہے اس کی دلیل اور اسے ترجیح دینا خود عین دین ہے اور فرض منصبی۔ اور یہ کہ ''صواب محتمل الخطا ہے یا خطا محتمل الصواب ہے''۔ ایک ابتدائی طالب علم بھی جانتا ہے مگر عالم سبق پڑھاتے وقت یہ کہہ کر جان چھڑا لے اور دلائل پر روشنی نہ ڈال سکے' یہ ممکن نہیں اور اگر ان کے فرمان کا مطلب وہی ہوتا ہے جو بظاہر ان کے الفاظ سے سمجھ میں آ رہا ہے تو مولانا محمد یوسف صاحب بنوریؒ شرح ترمذی نہ لکھتے نہ حدیث وغیرہ پڑھاتے وہ ان کے شاگرد تھے۔ اور حضرت شاہ صاحب کے داماد حضرت مولانا سید احمد رضا صاحب مدظلہم شرح بخاری نہ لکھتے۔ بس سب ایک ہی رخ اختیار کرتے۔

بات یہ ہے کہ جو بندہ اللہ کو پسند ہوتا ہے اس کا آخری دنوں میں یہی حال ہوتا ہے کہ وہ کہتا ہے کہ میں نے کچھ نہیں کیا عمر ضائع کر دی۔ حضرت اقدس مولانا مدنیؒ' مولانا انور شاہ کشمیریؒ' حضرت مولانا محمود حسنؒ اور ان کا کیا ذکر' حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ تک یہی فرماتے تھے کہ ہم نے جو نیکیاں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کی تھیں وہ قائم رہ جائیں بَرَدَ لَنَا اور جو کچھ آپ ﷺ کے دنیا سے رخصت ہونے کے بعد کیا ہے **وان کل عمل عملناہ بعدہ نجونا منہ کفافًا رَاسًا براس**۔ بخاری ص ۵۵۷' وہ برابر سرابر ہو کر نجات ہو جائے (تو میں اسے غنیمت سمجھوں گا)۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا جب وقت وفات آیا تو حضرت ابن عباسؓ سے تعریفی کلمات سن کر

فرمانے لگیں **وددتُ انی کنتُ نَسیًا مَنسیًا** (ان سے تعریفی باتیں سن کر) میرا جی چاہا کہ میں ایسی ہوتی کہ بھلا بھی دی گئی ہوتی۔

بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو یہ پسند ہے کہ اس کا بندہ اپنے اعمال کی قیمت خود نہ ڈالے۔ اس لیے آخر میں اللہ کے محبوب بندوں کی سچ مچ یہی حالت ہوجاتی ہے کہ وہ یہ بالیقین کہتے ہیں کہ میں نے کچھ نہیں کیا۔ حضرت سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ زخمی حالت میں ہیں۔ آخری وقت قریب آتا جارہا ہے۔ اس وقت ایک شخص نے تسلی کے لیے تعریفی کلمات کہے تو اس کے ہر ہر جملہ کا جواب عنایت فرمایا کہ یہ جو تم نے کہا ہے کہ میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ رہا اور آپؐ دنیا سے جب رخصت ہوئے تو مجھ سے راضی تھے تو یہ اللہ کا احسان ہے، جو اس نے مجھ پر فرمایا اور اسی طرح ''**ما ذکرتَ من صحبة ابی بکرؓ**'' جو تم نے ابوبکرؓ کے ساتھ رہنے کے بارے میں ذکر کیا کہ وہ مجھ سے خوش رہے اور جب انہوں نے وفات پائی تو وہ مجھ سے راضی تھے، یہ بھی ''**مَنٌّ مَنّ اللّٰه بِهٖ عَلَیَّ**'' اللہ کا احسان ہے جو اس نے مجھ پر فرمایا، یعنی جو اچھائیاں تھیں وہ محض احسانِ الٰہی تھا وہ میری قابلیت نہیں تھی۔

بس جس پاکیزہ بندہ کی یہ حالت وفات کے وقت ہوجائے تو سمجھنا چاہیے کہ وہ اللہ کا بہت ہی محبوب ہے۔ اللہ تعالیٰ یہ چاہتے ہیں کہ اس کی نیکیاں بالکل سلامت رہیں تو مولانا انور شاہ صاحبؒ کو ان کے استاذ محترم حضرت شیخ الہندؒ کی طرح ڈبل اجر ملے گا۔ ان شاء اللہ ایک اس کام کا جو انہوں نے زندگی بھر کیا دوسرے ان کی اگلی نیت کا۔ ہرگز کوئی کم عقلی کر کے اس خیال میں مبتلا نہ ہو کہ انہوں نے واقعی کچھ نہیں کیا تھا۔ اگر واقعی کچھ نہیں کیا تھا تو ڈاکٹر صاحب حضرت شیخ الہندؒ کو اس صدی کا مجدد اور مولانا انور شاہ صاحب کو قدماء کی نظیر کیسے فرماتے۔

رحمهم اللّٰه تعالیٰ رحمةً واسعةً والْحَقَنَا بهم

ڈاکٹر صاحب نے بہت عمدہ اور مفصل طرح سمجھا دیا ہے کہ آج کل فتنے کس طرح پیدا ہو رہے ہیں ان سے بچنا سب سے زیادہ ضروری ہے، کیونکہ ایمان سب سے بڑی دولت ہے اور اس کی حفاظت سب سے بڑا اور اوّلین فرض ہے۔

آخر میں یہ عرض کرنا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ چاروں ائمہ اور امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کی تقلید کا اگر کوئی سننے والا یہ مطلب لے کہ جس مسلک میں جو آسان چیز نظر آئے وہ اختیار کرے تو اسے تو ائمہ اربعہ کے علماء نے بالاتفاق ناجائز فرمایا ہے۔ ہاں اس کے برعکس عمل کرنا مستحب

ہے۔ معمولی سی مثال یہ ہے کہ شافعی مسلک یہ ہے کہ اگر کسی مرد کا ہاتھ ہتھیلی کی طرف سے بغیر کپڑا حائل ہوئے کسی عورت کے لگ جائے تو وضو ٹوٹ جائے گا۔ مثلاً اگر کوئی اپنی ماں کے پاؤں دبا رہا تھا اور دستانہ پہنے ہوئے نہ تھا یا والدہ کے پاؤں پر چادر نہ تھی، بلا حائل پاؤں چھو رہا تھا تو وہ جب نماز پڑھنے لگے تو وضو کرے، کیونکہ اس کا وضو ٹوٹ گیا۔ حنفی حضرات کہتے ہیں کہ ایک حنفی شخص کے لیے بھی مستحب ہے کہ وہ دوبارہ وضو کرلے۔

اسی طرح اگر کسی شافعی شخص کے خون نکل آیا تو شافعی مسلک میں خون نکلنے سے وضو نہیں ٹوٹتا، لیکن حنفی مسلک یہ ہے کہ وضو ٹوٹ جاتا ہے۔ ایسی صورت میں شافعی حضرات فرماتے ہیں کہ اس شافعی شخص کو دوبارہ وضو کرلینا چاہیے، یہ ان کے نزدیک مستحب ہے۔ کیونکہ احتیاط پر عمل ہو رہا ہے۔ اور دوسری صورت کہ ہر مسلک سے چن چن کر آسان مسائل لے لینا یہ اتباعِ ہواء قرار دیا گیا ہے، اس کا نام تلفیق ہے اور یہ حرام ہے۔

ہاں البتہ اگر کوئی غیر مقلد ہو اور وہ ان ائمہ کو مقتدا مان کر بلا خواہش نفس مسئلہ کو راجح سمجھتے ہوئے ایسا کرنے لگے تو شاید اس کے لیے مطلقاً غیر مقلد بنے رہنے سے بہتر ہوگا۔ کیونکہ آج کل کے علماء سے مسئلہ پوچھ کر عمل کرنے سے یہ بہت زیادہ افضل ہے کہ ائمہ کی تحقیق پر چلے۔ رحمہم اللہ۔

ایک صورت یہ بھی ہوتی ہے کہ مثلاً مسلک حنفی کا کوئی مسئلہ متقی علماء کی نظر میں قابل عمل نہیں رہا۔ اس دور میں اس پر عمل کرنے سے اور خرابیاں لازم آئیں گی تو ایسی صورت میں کسی بھی دوسرے امام کا مسلک لیا جاسکتا ہے، مگر وہ ادھورا نہیں لیا جائے گا مکمل لیا جائے گا۔ اور وہ تمام شرائط ملحوظ رکھی جائیں گی جو اس امام کے مسلک میں ہیں اور اس پر علماء کو جمع کر کے طے کر کے اعلان کر دیا جائے گا۔ جیسے حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے ''**الحيلة الناجزة للحليلة العاجزة**'' مرتب فرمائی ہے۔

میرے ذہن میں آج کل کے دور میں سورۃ الکہف کی ابتدائی دس آیات کا روزانہ صبح کو پڑھتے رہنے کا مشورہ آتا ہے، تاکہ یہ پڑھنے والا غلط راستے پر لگنے سے اور دجالوں کے شر سے محفوظ رہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو صراط مستقیم پر قائم رکھے۔ آمین!

(۵)

معاصر ہفت روزہ ''چٹان'' لاہور میں شائع شدہ ''گفتنی گفتنی'' کا ایک اقتباس

ڈاکٹر اسرار احمد صاحب ہمارے ملک کی معروف شخصیت ہیں۔ اس کے ساتھ ہی کہنا چاہیے کہ وہ متنازعہ شخصیت بھی ہیں اور یہ کوئی اچنبھے کی بات نہیں' زندہ اور متحرک دنیا میں ایسا ہونا لازمی امر ہے۔ ڈاکٹر صاحب اسلامی جمعیت طلبہ کے سٹیج سے اُبھر کر جماعت اسلامی میں آئے اور نہایت چھوٹی عمر میں جماعت میں اہم مقام حاصل کیا۔ حتیٰ کہ ایک سٹیج پر اجلاس ماچھی گوٹھ میں ایک بڑے قافلہ کے ساتھ جماعت سے الگ ہوئے۔ بلکہ کہنا چاہیے کہ اس اجلاس میں سب سے مؤثر مقالہ ڈاکٹر صاحب نے پڑھا جس میں مرکزی قیادت سے اپنے اختلاف کا ذکر کیا۔ جماعت سے علیحدگی کے بعد وہ ایک عرصہ تو اس کوشش میں رہے کہ جماعت سے الگ ہونے والے اکابر واصاغر کو ساتھ لے کر ایک نئی تنظیم کھڑی کریں [1] لیکن جب اس میں خاطر خواہ کامیابی نہ ہوئی تو انہوں نے مرکزی انجمن خدام القرآن کی بنیاد ڈالی جس نے کہنا چاہیے کہ رجوع اِلی القرآن کی خاصی تحریک پیدا کی اور کوئی ہزار اختلاف کرے' اسے تسلیم کرنا پڑے گا کہ درسِ قرآن وغیرہ کے حوالہ سے ڈاکٹر صاحب نے خاصی تعداد میں لوگوں کو متاثر کیا اور ملک کے مختلف شہروں میں بڑی تعداد میں ایسے لوگ موجود ہیں جو بڑے اشتیاق سے ان کے پروگراموں میں شریک ہوتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے گزشتہ رمضان کے دو جمعوں میں مسجد دارالسلام باغِ جناح (لارنس گارڈن) میں جو خطبے ارشاد فرمائے انہیں کیسٹ سے منتقل کر کے ان کے ماہنامہ ''میثاق'' کی اشاعت ستمبر ۱۹۸۴ء میں شائع ہوئے ہیں' ان خطبات کا عنوان ہے ''قرآن کے نام پر اٹھنے والی تحریکات اور ان کے بارے میں علماء کرام کے خدشات'' یہ طویل خطاب ڈاکٹر صاحب کے معرکۃ الآراء خطابات میں سے ایک ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے

(۱) معاصر محترم کو مغالطہ ہوا ہے۔ ڈاکٹر صاحب اس امر کے خواہشمند بھی تھے اور کوشاں بھی کہ جماعت اسلامی کے طریق کار اور پالیسی سے اختلاف کے باعث علیحدہ ہونے والے اکابر صحیح خطوط پر کوئی جماعت قائم کریں تاکہ موصوف اس میں بحیثیت ایک کارکن اپنے دینی فرائض بجا لائیں۔ جب قریباً پندرہ سولہ سال تک اس میں کامیابی نہیں ہوئی تو پھر ڈاکٹر صاحب نے ازخود تنظیم قائم کرنے کا فیصلہ کیا۔ (مرتب)

برعظیم ہند و پاکستان کے حوالہ سے قرآن کے نام پر اٹھنے والی تحریکات' اس عنوان سے کام کرنے والی شخصیات' ان کے متعلق علماء کرام کا ردّ عمل اور پھر ان تحریکات و شخصیات کے انجام پر بڑی تفصیل سے گفتگو کی ہے۔

اس ضمن میں سب سے پہلے سرسید احمد کا ذکر ہے' جنہوں نے قرآن عزیز کے ایک حصہ کی تفسیر لکھ کر بعض مسلمہ حقیقتوں کا انکار کیا تھا۔ علماء کرام کے ان سے اختلافات انہی وجوہ کی بنا پر تھے جنہیں یار لوگوں نے کئی رنگ دیے اور علماء کے ذمہ یہ بات لگائی کہ وہ جدید تعلیم کے خلاف ہیں۔ یہ تو اللہ کا شکر ہے کہ بعض حضرات کی سرسید احمد خان سے خط و کتابت چھپ گئی اور کچھ گرد وغبار چھٹ گیا' پھر یہ بھی خوبی کی بات ہے کہ سرسید احمد خان نے اس عنوان سے کوئی جماعت یا تحریک نہ اٹھائی' بلکہ کالج و یونیورسٹی کی تعمیر و ترقی میں لگے رہے اور بالآخر اس کے ایک کونہ میں ابدی نیند سو گئے۔ چند افراد کا ان کے افکار سے متاثر ہونا ایک الگ مسئلہ ہے ان کے بعد اہل قرآن کا عنوان قائم کر کے کئی ایک لوگ اٹھے۔ انہوں نے باقاعدہ تحریکیں کھڑی کیں' جن میں سے بھونڈی اور مکروہ شکل ہمارے دور کے پرویز صاحب کی ہے جو سول سروس کی ملازمت کرتے کرتے مفسر قرآن بن گئے اور ایک مستقل فرقہ کی بنیاد ڈالی۔ اب وہ نبی کریم ﷺ کو رسول تو مانتے ہیں مطاع نہیں مانتے اور آپ ؐ کے ارشادات کو عجمی سازش سے تعبیر کرتے ہیں۔

ڈاکٹر صاحب نے اپنے اس خطاب میں ایسی متفرق شخصیات اور ان کی تحریکوں کا ذکر کر کے علمائے حق کے خدشات کو کسی درجہ میں صحیح قرار دیا ہے اور اپنے بارے میں واضح کیا ہے کہ وہ قرآن کے خادم ہیں' انہیں علم و فضل کا کوئی دعویٰ نہیں اور یہ کہ وہ علمائے کرام سے کسب و استفادہ اور تعلق اپنے لیے ضروری جانتے ہیں۔ جس کی واضح مثال یہ ہے کہ ''قرآن مجید کے مسلمانوں پر حقوق'' نامی اپنے رسالہ کا ایک نسخہ مدینہ منورہ میں حضرت مولانا سید محمد یوسف بنوریؒ کی خدمت میں اس نقطہ نظر سے پیش کیا کہ حضرت مولانا اسے ملاحظہ فرما کر اگر کوئی چیز قابل اصلاح ہے تو اس کی اصلاح کر دیں۔ مولانا نے مسجد نبویؐ میں بحالت اعتکاف اسے پڑھا اور صرف ایک جملہ کی ترمیم فرمائی۔ ڈاکٹر صاحب تسلیم کرتے ہیں کہ مولانا کی اس ترمیم سے وہ جملہ مزید نکھر گیا اور میرا جو مفہوم تھا وہ اور واضح ہو گیا۔

ویسے انجمن خدام القرآن کے محاضرات میں سال بہ سال ہندوستان اور پاکستان کے جید علماء کرام کو بلانا بھی ان کی عادت ہے اور اپنے دعوتی افکار میں مختلف شہروں کے اہل علم کے

پاس وقت نکال کر جانا بھی ہمیں معلوم ہوا ہے۔

یہ روایات بہر حال اچھی ہیں اور توقع کی جاسکتی ہے کہ اس طرح ان کا ایک گونہ تعلق علماء حق سے رہے گا اور علماء کرام سے بھی درخواست ہے کہ وہ کوئی نقص یا کمی محسوس فرمائیں تو صاحب واقعہ سے رابطہ کر کے بات صاف کرنے کی کوشش کریں کہ اصل دین یہی ہے' محض سنی سنائی باتوں پر بدگمانی صحیح نہیں۔ اللہ تعالیٰ 'خدام القرآن' وہ جہاں بھی ہوں' انہیں اپنی تائید و نصرت سے نوازے!

(۶)

تنظیم اہلحدیث لاہور کا تبصرہ

جناب غلام احمد پرویز نے قرآن مجید کے نام پر ایک تحریک چلائی ہے' لیکن موصوف نے قرآن کے نام پر حدیث رسول ﷺ کا جھٹکا کرنے کا عمل بھی جاری رکھا ہے۔ اس کے برعکس ڈاکٹر صاحب موصوف نے بھی اپنی تنظیم کا ہدف ''قرآن حمید اور اس کی تعلیمات'' کی اشاعت کو بنایا ہے' لیکن درمیان سے احادیث کو اٹھا نہیں دیا۔ ہاں تدبر قرآن کے مؤلف کے چرکوں کا سلسلہ کچھ عرصہ سے جاری ہے۔ ہم دعا کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ڈاکٹر صاحب موصوف کو ان کی خراشوں سے محفوظ رکھے۔ حالیہ شمارہ میں سرسید' پرویز' مرزا اور مولانا اصلاحی صاحب وغیرہ کا تجزیہ بھی کیا ہے جو ہمارے لیے حوصلہ افزا ہے۔

''میثاق'' کے حالیہ دونوں شماروں میں ڈاکٹر موصوف کا ایک مقالہ ''جہاد بالقرآن'' شائع کیا گیا ہے جو نہایت اہم' معلوماتی اور بصیرت افروز ہے۔ یہ مقالہ انہوں نے انجمن خدام القرآن لاہور کے چھٹے سالانہ محاضرات قرآنی کے افتتاحی اجلاس میں ۲۵ مارچ کو پڑھا تھا جس کی صدارت علامہ سعید احمد اکبر آبادی زاداللہ تشریفاً وتکریماً نے کی تھی۔

اس کے علاوہ ڈاکٹر صاحب موصوف کے ٹیلی ویژن کے دروس بھی شائع ہو رہے ہیں جو خاصے اہم ہیں اور ان سے حالات اور وقت کے مناسب راہنمائی حاصل ہوتی ہے۔ ڈاکٹر صاحب موصوف نے خدمت قرآن کا جو سلسلہ شروع کیا ہے اس کو حدیث پاک سے آزاد نہیں رکھا اور قرآن کی جو تفسیر پیش فرما رہے ہیں' ان کی تفصیلی کڑیاں ہیں۔ اگر کچھ جھول محسوس ہوتا بھی ہے تو وہ موصوف کی باتوں کی جزوی حیثیت ہے۔ ایسا اختلاف اہل علم کے علمی

سفر میں آ ہی جاتا ہے۔

ماہنامہ میثاق کا مطالعہ قرآن حمید کے سمجھنے میں مدد دیتا ہے۔ اور احادیث پاک کی تعبیر اور توجیہہ کے لیے ایک نیا اسلوب بیان مہیا کرتا ہے جو فی الحال قابل برداشت ہے۔

بالخصوص عصر حاضر کے مسائل کو سمجھنے اور ان کو حل کرنے کے لیے ایک سلیقہ پیش کرتا ہے' جس کی حوصلہ افزائی کی جانی چاہیے۔ لیکن موصوف خاصے فطین اور ذہین ہیں اور نہایت برق رفتاری سے دوڑ رہے ہیں۔ اس لیے علماء حق کو ان پر کڑی نگاہ رکھنے کی ضرورت ہے۔ کیونکہ اب تک بیشتر ذہین اور شوخ ذہنوں کا انجام بالآخر خلافِ توقع برآمد ہوا ہے۔ اگر وقت پر ان کا احتساب جاری رہا تو امید ہے کہ یہ اکسیر' اکسیر ثابت ہوگی۔ ان شاءاللہ تعالیٰ!

۞۞۞

‘میثاق‘ ستمبر ۱۹۸۴ء میں شائع شدہ تقریر پر

مخلصانہ تنقیدوں اور خیر خواہانہ مشوروں

کے ضمن میں گزارشات

☆

اس سے قبل کہ میں مختلف مکاتیب و جرائد میں ظاہر شدہ آراء سے متعلق اپنی گزارشات کا آغاز کروں‘ ان تمام بزرگوں اور دوستوں کا تہہ دل سے بالکل یکساں طور پر شکریہ ادا کرتا ہوں جنہوں نے اپنے خطوط یا مضامین میں تحسین و تائید فرمائی یا تنقید و تبصرہ فرمایا اور مشوروں سے نوازا —— میں اللہ کو گواہ بنا کر عرض کرتا ہوں کہ مجھے تا حال کسی بھی تنقید سے قطعاً کوئی ملال نہیں ہوا۔ میرے سامنے بحمد اللہ نبی اکرم ﷺ کا فرمان مبارک ’’اَلدِّیْنُ النَّصِیْحَۃُ‘‘ ہر وقت رہتا ہے اور میں خود بھی حتی الامکان اس پر عمل کرنے کی کوشش کرتا ہوں اور دوسروں کی تنقیدوں کو بھی بالکلیہ اسی پر محمول کرتا ہوں۔ الا یہ کہ کسی کا بغض بالکل عریاں ہو کر سامنے آجائے —— اور الحمد للہ ثم الحمد للہ کہ میری زیر بحث تقریر پر جو تبصرے یا تنقیدیں ہوئی ہیں اُن سے مجموعی طور پر میری اس اُمید میں اضافہ ہوا ہے —— اور میری اس توقع کو تقویت حاصل ہوئی ہے کہ ان شاء اللہ العزیز میں اپنے بزرگوں کے خدشات رفع کرنے میں کامیاب ہو جاؤں گا اور اقامت دین کی جس سعی کا بیڑا میں نے اٹھایا ہے اس میں ان شاء اللہ مجھے علماءِ حق کی سرپرستی ضرور حاصل ہوگی۔ اور ان کی دُعائیں یقیناً میرے شامل حال ہوں گی۔ وَمَاذٰلِکَ عَلَی اللّٰہِ بعزیز!!

’’میثاق‘‘ نومبر ۱۹۸۴ء میں جو خطوط اس سلسلے میں شائع ہوئے ہیں ان میں اوّلین حضرت مولانا ڈاکٹر غلام محمد صاحب ہی کا ہے جو مولانا سید سلیمان ندویؒ کے خلیفۂ مجاز ہیں اور جن کا ذکر اوپر آچکا ہے۔ انہوں نے میرے درج ذیل جملوں پر گرفت فرمائی ہے:

’’میں نے جہاں تک اپنے مزاج اور اپنی طبیعت کو گہرائی میں جا کر ٹٹولا ہے (یعنی probe کیا ہے) تو میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ الحمد للہ ثم الحمد للہ مجھ میں انانیت اور عجب نہیں ہے اور میں شعوری طور پر اپنے رب سے پناہ طلب کرتا رہتا ہوں کہ وہ مجھے اس روگ سے محفوظ رکھے (اس لیے کہ) نبی اکرم ﷺ کے ارشاد کے مطابق عجب مہلکات میں سب سے زیادہ مہلک اور شدید مرض ہے۔‘‘

حضرت ڈاکٹر صاحب کی گرفت سر آنکھوں پر —— اور ان شاء اللہ اُن کی تلقین سے ضرور فائدہ اٹھاؤں گا۔ لیکن اس قدر عرض کرنے کی اجازت چاہتا ہوں کہ صحابہ کرامؓ سے جہاں وہ الفاظ منقول ہیں جو انہوں نے نقل فرمائے وہاں ایسے واقعات بھی ملتے ہیں کہ آنحضور ﷺ کے اس سوال کے جواب میں ’’کَیْفَ اَصْبَحْتَ‘‘ ایک صحابیؓ نے عرض کیا: **اَصْبَحْتُ مُؤْمِنًا حقًّا یَارَسُوْلَ اللّٰہِ!** اسی طرح شیخ سعدیؒ کے قطعے میں بھی معاملہ تقابل کا ہے —— اور الحمد للہ ثم الحمد للہ میرا حال یہی ہے کہ میں فی الجملہ کسی بھی انسان کے مقابلے میں اپنے آپ کو بہتر نہیں پاتا اور اپنے ساتھیوں میں سے بھی ہر ایک کو کسی نہ کسی پہلو سے اپنے سے بہتر محسوس کرتا ہوں۔ پھر میرے جملوں میں صرف حال کی کیفیت پر اطمینان کا اظہار ہے۔ اور وہ بھی اللہ تعالیٰ کے شکر کے ساتھ! مستقبل کے لیے تو ہر حال میں صرف اللہ تعالیٰ ہی کی حفاظت پر بھروسہ کیا جا سکتا ہے۔ اور الحمد للہ کہ میں نے بھی اُسی کا سہارا لیا ہے!

آنمخدوم کا یہ جملہ میرے لیے بہت حوصلہ افزائی کا موجب ہوا کہ:

’’ان شاء اللہ یہ توضیح خدشات‘ اس نوعیت کے شبہات کے ازالہ میں مؤثر ثابت ہوگی۔‘‘ **اَللّٰھُمَّ** آمین!

دوسرا خط حضرت مولانا اخلاق حسین قاسمی مدظلہ کا ہے۔ جو مدرسہ رحیمیہ بستی شاہ ولی اللہ دہلی‘ میں شیخ الحدیث ہیں۔ انہوں نے میری تقریر کے مشمولات کی جس طرح کھلے دل کے ساتھ تصویب فرمائی ہے اُس پر تو میں تہہ دل سے اُن کا ممنون ہوں ہی —— تحریک جماعت اسلامی اور مولانا ابوالاعلیٰ مودودی مرحوم کا ذکر انہوں نے جس معتدل اور متوازن انداز میں کیا ہے اُس سے بھی دل نے بہت اثر قبول کیا کہ علماءِ حق کی شان یہی ہونی چاہیے —— میرے علم کی حد تک دیوبندی مکتب فکر کے وہ واحد معروف عالم دین ہیں جو مولانا مودودی کے نام کے ساتھ رحمۃ اللہ علیہ کے الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ بہرحال ان کے اشارات میں اقامت دین کی

داعی جماعت کے لیے مختلف پہلوؤں سے جو رہنمائی مضمر ہے' مجھے اُس سے فی الجملہ اتفاق بھی ہے۔ اور اپنی امکانی حد تک میں اسی پر عمل پیرا ہونے کی کوشش بھی کر رہا ہوں۔ بایں ہمہ 'یاددہانی' بھی ان شاءاللہ مزید مفید ثابت ہوگی۔

مولانا سید وصی مظہر ندوی مدظلہ' مہتمم جامعہ اسلامیہ وسابق میئر حیدرآباد (سندھ) تنظیم اسلامی کے حلقہ مُستشارین میں بھی شامل ہیں اور انجمن خدام القرآن کے زیراہتمام سالانہ قرآن کانفرنسوں اور تنظیم اسلامی کی تربیت گاہوں میں حصہ لینے کی خاطر بار ہا لاہور تشریف بھی لائے ہیں۔ میں ان کا ممنون ہوں کہ انہوں نے میری گزارشات کو ''فکر انگیز'' قرار دیا۔ بسا اوقات ایک لفظ لمبی چوڑی بات سے زیادہ بامعنی ہو جاتا ہے۔ ساتھ ہی میں اللہ کا شکر ادا کرتا ہوں کہ انہوں نے مولانا امین احسن اصلاحی کی حدرجم کے بارے میں رائے پر میری ''گرفت'' کو بھی بالکل ''درست'' قرار دیا۔ اور اس طرح مولانا موصوف کے موقف سے اعلانِ براءت کر دیا۔

رہا اُن کا یہ فرمانا کہ ''تاہم ایک یا چند غلطیوں کی وجہ سے کسی شخص کے پورے کارنامے کو مسترد کر دینا وہ انتہا پسندی ہے جس کے باعث ہمارے ہاں تحقیق اور فکر ونظر کی آزادی مفقود ہو کر رہ گئی ہے''۔ تو گزارش ہے کہ الحمدللہ میں اس سے بری ہوں۔ میں نے اُن کے بارے میں زیادہ سے زیادہ جو بات کہی ہے وہ یہ ہے کہ ''کم از کم اس مسئلے میں وہ منکرین سنت کی صف میں جا کھڑے ہوئے ہیں!'' اور اللہ سے دُعا کی ہے کہ وہ انہیں اس گمراہی سے رجوع کی توفیق عطا فرمائے۔ میں ہمیشہ اس کا اعتراف کرتا رہا ہوں کہ میں نے اُن کے فکر قرآنی سے بہت استفادہ کیا ہے اور اپنی ایک طویل تحریر میں میں اپنے فہم قرآن کے چار منبعوں کی تفصیل درج کر چکا ہوں جن میں سے ایک فکر فراہی بروایت ووضاحت اصلاحی ہے۔ ادھر چند سالوں سے میں نے اس کا ذکر جان بوجھ کر ترک کر دیا ہے (جس پر مدیر 'طلوع اسلام' نے بجا طور پر گرفت بھی کی ہے کہ میں مولانا اصلاحی اور ان کے فکر کے ضمن میں اپنی خدمت کا ذکر تو کیا لیکن اُن سے استفادے کا ذکر تک نہیں کیا!) تو اس کا ایک سبب ہے اور وہ یہ کہ ۱۹۷۷-۷۸ء میں مولانا کا ایک خط بہت بڑی تعداد میں لاہور ہی نہیں پاکستان کے دوسرے شہروں میں بھی تقسیم کیا گیا تھا جس میں مولانا نے میرے بارے میں کچھ اس قسم کے الفاظ تحریر فرمائے تھے کہ ''یہ شخص میری شاگردی کا ڈھنڈورا پیٹتا پھرتا ہے' جبکہ یہ کبھی میرا شاگرد نہیں رہا!'' ورنہ واقعہ یہ

ہے کہ مولانا کی تفسیر سے میں اب بھی استفادہ کرتا ہوں اور مولانا کی دو کتابیں: ایک ''دعوت دین اور اس کا طریق کار'' اور دوسری ''مبادیٔ تدبرِ قرآن'' تا حال بھی میری محبوب ترین کتابوں میں سے ہیں۔ البتہ یہ واضح رہنا چاہیے کہ بعض اوقات ایک غلطی بھی ع ''یک لحظہ غافل گشتم وصد سالہ راہم دُور شد!'' کے مصداق بہت بڑی گمراہی کا دروازہ کھول دیتی ہے۔ اور قرآن مجید میں تو بعض بظاہر نہایت معمولی سی بے احتیاطیوں (جیسے نبی اکرم ﷺ کے سامنے اپنی آواز کو بلند کر دینا) پر بھی ''حبطِ اعمال'' کی وعید سنائی گئی ہے۔ لہٰذا اگر خدانخواستہ مولانا نے اپنے اس موقف سے رجوع نہ کیا تو واقعی اندیشہ ہے کہ ان کے شاگرد پنجابی کی ایک کہاوت ''گورو جنھاں دے ٹپدے' چیلے جان شڑھپ'' کے کامل مصداق نہ بن جائیں —— جیسے کہ اُن کا ایک 'نیم شاگرد' ''کڑوا کریلا اور پھر نیم چڑھا!'' کی کامل مثال بن کر سامنے آ بھی چکا ہے۔

مولانا سید حامد میاں مدظلہ' مہتمم شیخ الحدیث جامعہ مدنیہ لاہور وخلیفہ مجاز حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ بھی نہ صرف یہ کہ تنظیم اسلامی کے حلقہ مستشارین میں شامل ہیں بلکہ میں ذاتی طور پر اُن کا بہت ہی ممنونِ احسان ہوں۔ ان کے احسانات میں سے ایک یہ ہے کہ جب بھی اُن کی ملاقات کے لیے حاضری ہوئی' انہوں نے بڑی محبت وشفقت کے ساتھ وافر وقت مرحمت فرمایا اور دوسرا یہ کہ جب بھی اُن سے 'قرآن کانفرنس' یا کسی اور موقع کے لیے کسی مقالے یا تحریر کی درخواست کی' انہوں نے ہمیشہ اپنی گوناگوں مصروفیات کے باوجود وقت نکال کر فرمائش کی تکمیل فرمائی (اُن کا ایک اہم اور نہایت وقیع مقالہ حدرجم کے ضمن میں اوّلین روایات پر مشتمل ان شاءاللہ آئندہ ماہ کے حکمت قرآن میں شائع ہوگا۔) پھر اُن کا ایک تیسرا اور بہت بڑا احسان راقم پر یہ ہے کہ تنظیم اسلامی میں شمولیت کے لیے جب راقم نے بیعت جہاد کو اساس بنایا تو اُنہوں نے غلط اطلاع کی بنیاد پر جاری کردہ مخالفانہ بیان سے علی الاعلان رجوع فرمایا اور حقیقت حال کے واضح ہو جانے کے بعد اخباری اعلان کے ذریعے بھی —— اور نجی خطوط کے ذریعے بھی اُس کی تائید وتصویب فرمائی۔

اس موقع پر بھی انہوں نے نہایت مفصل تبصرہ فرما کر جو احسان فرمایا ہے اُس کا میرے اور میرے رفقاء کے دلوں پر بڑا اثر ہوا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ آنجناب نے حلقہ مُستشارین میں شمولیت کا حق ادا فرما دیا ہے۔

اُن کی تحریر کا ایک حصہ تو تائیدی ہے جس پر شکریہ ہی ادا کیا جا سکتا ہے۔ خصوصاً اُن کے یہ جملے تو راقم کے لیے بہت ہی موجب اطمینان ہیں کہ:

"ڈاکٹر صاحب نے بہت عمدہ اور مفصل طرح سمجھا دیا ہے کہ آج کل فتنے کس طرح پیدا ہو رہے ہیں۔ اُن سے بچنا سب سے زیادہ ضروری ہے' کیونکہ ایمان سب سے بڑی دولت ہے اور اس کی حفاظت سب سے بڑا اور اوّلین فرض ہے۔"

البتہ —— نہایت ادب کے ساتھ دو اُمور کے بارے میں کچھ عرض کرنا ضروری ہے:
ایک حضرت مولانا انور شاہ صاحب کشمیریؒ کے قول کی تاویل کے بارے میں' اور دوسرے تقلید' یا غیر تقلید یا نیم تقلید کے بارے میں۔

فقہ حنفی کے ماننے اور پیروی کرنے والوں کے لیے مختلف فیہ مسائل میں اپنے مسلک کے حق میں دلائل کا جاننا اور اپنے مدارس میں اُن کو شرح وبسط کے ساتھ بیان کرنا یقیناً ایک لازمی ولابدی امر ہے۔ اور کسی کے حاشیہ خیال میں بھی یہ بات نہیں آسکتی کہ یہ کام اصلاً غلط یا فضول ہے' اسی طرح حضرت کاشمیریؒ کے شدتِ احساس کو کسی درجے میں اس حقیقت پر محمول کرنا بھی غلطِ محض نہیں ہے کہ واقعتہً نیک و پارسا اور حقیقتاً مخلص و متقی لوگ اپنے بڑے بڑے کاموں کو بھی ہیچ سمجھتے ہیں (جیسے کہ خود آنحضورﷺ سے یہ دعا منقول ہے کہ "رَبِّ اَرِنِیُ فِی عَیُنِی صَغِیُرًا") لیکن حضرت کاشمیری کے قول کو بالکلیہ اس تواضع وانکسار پر محمول کرنا درست معلوم نہیں ہوتا۔ اس ضمن میں اصل کوتاہی بھائی جمیل الرحمٰن صاحب سے ہوئی ہے کہ انہوں نے مولانا موصوف کے قول کے آخری اور اہم ترین حصے کو نقل نہیں فرمایا جس سے آنجناب کے غم و اندوہ اور تاسف کا اصل سبب معلوم ہوتا ہے۔ وَھُوَ ھٰذا!

"تو جس چیز کو نہ دُنیا میں کہیں نکھرنا ہے نہ برزخ میں نہ محشر میں' اسی کے پیچھے پڑ کر ہم نے اپنی عمر ضائع کر دی' اپنی قوت صرف کر دی اور جو صحیح اسلام کی دعوت تھی' مجمع علیہ اور سبھی کے مابین جو مسائل متفقہ تھے اور دین کی جو ضروریات سبھی کے نزدیک اہم تھیں' جن کی دعوت انبیاء کرام علیہم السلام لے کر آئے تھے' جن کی دعوت کو عام کرنے کا ہمیں حکم دیا گیا تھا اور وہ منکرات جن کو مٹانے کی کوشش ہم پر فرض کی گئی تھی' آج یہ دعوت تو نہیں دی جا رہی۔ یہ ضروریاتِ دین تو لوگوں کی نگاہوں سے اوجھل ہو رہی ہیں اور اپنے واغیار ان کے چہرے کو مسخ کر رہے ہیں اور وہ منکرات جن کو مٹانے میں ہمیں لگے ہونا چاہیے تھا وہ پھیل رہے ہیں' گمراہی پھیل رہی ہے' الحاد آ رہا ہے' شرک و بت پرستی چل

رہی ہے' حرام و حلال کا امتیاز اٹھ رہا ہے' لیکن ہم لگے ہوتے ہیں ان فرعی وفروعی بحثوں میں!
حضرت شاہ صاحب نے فرمایا "یوں غمگین بیٹھا ہوں اور محسوس کر رہا ہوں کہ عمر ضائع کر دی۔"

معلوم ہوا کہ یہاں اصل معاملہ 'تقابل' کا ہے کہ کون سے کام اہم تر تھے جن کی جانب ہم اپنی اس مخصوص علمی مصروفیت و مشغولیت کے باعث توجہ نہ کر سکے! اور مقابلہ بھی صحیح اور غلط کا نہیں بلکہ ایک جانب صحیح اور اہم لیکن نسبتاً ثانوی اور دوسری جانب بدرجہا اہم تر اور حد درجہ ضروری اور اوّلین اہمیت کے حامل کاموں کے مابین ہے!

چنانچہ بعینہ یہی بات تھی جس کی جانب علماء کرام کی توجہ راقم الحروف نے اپنے اُس جوابی خط کے آخر میں مبذول کرائی تھی جو راقم نے مولانا اللہ بخش ملکانوی کے خطوط اور معاصر "الخیر' ملتان میں شائع شدہ مضمون کے جواب میں لکھا تھا اور جو میثاق کی ستمبر ۱۹۸۴ء ہی کی اشاعت میں شامل تھا کہ خدارا! حالات کا کھلی آنکھوں کے ساتھ مشاہدہ کیجیے اور صورتِ حال کی نزاکت کا کما حقہ' ادراک فرمائیے۔ غور کرنے کی بات ہے کہ حضرت شاہ صاحبؒ کے یہ احساسات تو آج سے لگ بھگ نصف صدی قبل کے ہوں گے۔ اُس کے بعد تو وقت کے دریا میں اور بھی بہت سا پانی گزر چکا ہے اور حالات پہلے سے کہیں بڑھ کر دگرگوں ہو گئے ہیں۔ چنانچہ مغربی تہذیب کا جو سیلاب اس وقت معاشرے میں نہایت تیزی اور تندی سے بڑھ رہا ہے اُس کا تو عشر عشیر بھی اس وقت نہ تھا اور اس کی فحاشیت اور اباحیت پرستی کی راہ کی سب سے بڑی رکاوٹ یعنی حدیث اور سنت رسولؐ اور اتباع صحابہؓ وسلف صالحین کے خلاف بغاوت یعنی فتنۂ انکار حدیث وسنت جدید تعلیم یافتہ طبقے کی اکثریت میں سرایت کر چکا ہے۔ ایک جانب الحاد اور مادہ پرستی پہلے کے مقابلے میں کہیں زیادہ ترقی کر چکی ہے تو دوسری جانب بدعات اور خرافات نے باضابطہ فلسفوں اور اداروں کی صورت اختیار کر لی ہے۔ منکرات وفواحش کے وہ وہ دروازے بلکہ شاہ درے کھل چکے ہیں جن کا اُس وقت کوئی تصور تک نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اس لیے کہ اُس وقت تک سینما یا تھیٹر جانے والے صرف نچلے طبقے کے لوگ یا آوارہ نوجوان ہوتے تھے اور عام گھروں کے اندر صرف گانوں کی آواز بذریعہ ریڈیو پہنچی تھی۔ جبکہ آج ٹی وی اور وی سی آر نے ہر گھر کو سینما بنا دیا ہے۔ ملکی سطح پر ایک جانب داخلی صورت حال دگرگوں ہے کہ اسلام کے نام پر وجود میں آنے والے ملک میں نسلی' لسانی اور صوبائی عصبیتیں پروان چڑھ رہی

ہیں بلکہ بعض علاقوں میں تو نہایت خوفناک صورت اختیار کر چکی ہیں۔ دوسری جانب گردو پیش کے حالات اس سے بھی زیادہ تشویشناک ہیں۔ چنانچہ شمال مغربی سمت سے الحاد و مادّہ پرستی کی بدترین صورت یعنی کمیونزم جس نے اس صدی کے اوائل میں اس خطے کو ہضم کیا تھا جس میں ایک زمانے میں قال اللّٰہ اور قال الرسولؐ کی صدائیں شاید دنیا بھر کے مقابلے میں کہیں زیادہ بلند ہوتی تھیں اور اب اُسی صدی کے اواخر میں ہماری آنکھوں کے سامنے پونے دو کروڑ افراد پر مشتمل پوری افغان قوم کو ایک مہیب اژدھے کے مانند آہستہ آہستہ نگل رہا ہے۔ حتیٰ کہ اب وہ سیلاب وطن عزیز کے عین دروازوں پر دستک دے رہا ہے۔ ادھر جنوب مشرق میں ہندو امپیریلزم کا عفریت ایک نئے جوش اور جذبے کے ساتھ چنگھاڑتا ہوا اُٹھ رہا ہے۔ ان حالات میں واقعہ یہ ہے کہ اگر حسب سابق یہاں صرف اسلام کا نام سیاسی اور گروہی مقاصد کے لیے استعمال کیا جاتا رہا اور ایک حقیقی اور واقعی اسلامی دعوت و تحریک خالصتہً منہاج نبوت پر نہ اٹھی اور اس کے ذریعے مستقبل قریب میں بلکہ آئندہ چند سالوں کے اندر اندر ایک ہمہ گیر اسلامی انقلاب پاکستان میں نہ آیا اور حقیقی اور واقعی اسلام کی برکات سے عوام الناس کو متمتع ہونے کا موقع نہ ملا تو پاکستان کا نام تو نسیًا منسیاً ہوگا ہی ——— دینی درسگاہیں اور روحانی خانقاہیں بھی محفوظ نہ رہیں گی۔ اور معاملہ بالکل وہی ہوگا کہ ع ''تمہاری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں!'' **اعاذ نا اللّٰہ من ذٰلک**

ان حالات میں ہمیں اپنی 'ترجیحات' پر نظر ثانی کرنے کی ضرورت ہے۔ کاش کہ پاکستان کے تمام علمائے دین بالعموم اور حلقۂ دیوبند کے متوسلین بالخصوص اُس درد بھری صدا پر کان دَھر سکیں جو حضرت شاہ صاحبؒ کے محولہ بالا جملوں سے اُبھر کر سامنے آتی ہے۔ اور اگر وہ خود اپنے علمی و تدریسی مشاغل سے فرصت نہ پائیں کہ خود دعوت و تنظیم کے کھکھیڑ میں پڑ سکیں یا درسگاہوں اور خانقاہوں کا پاک و صاف ماحول انہیں اجازت نہ دے کہ وہ گندگی اور تعفن بھرے معاشرے کی صفائی کے لیے کمربستہ ہوں تو کم از کم ان لوگوں کی سرپرستی تو فرمائیں جو اس کام کے لیے کمر ہمت کس لیں اور ان کی کوتاہیوں سے چشم پوشی اور دوسرے اور تیسرے درجے کے اختلافی امور سے صرفِ نظر کرتے ہوئے خود اُن کی اصلاح پر کمربستہ ہوں۔

چنانچہ یہ ہے وہ پس منظر جس میں 'تقلید' یا 'عدم تقلید' یا اس عاجز کی اختیار کردہ اصطلاح ''نیم تقلید'' کے مسئلے پر غور ہونا چاہیے۔ اس ضمن میں نہایت تفصیلی گفتگو معاصر 'الخیر' ملتان کے مدیر جناب مولانا محمد ازہر صاحب اور ایک مضمون نگار مولانا عبدالقیوم حقانی صاحب نے کی

ہے۔ چنانچہ راقم بھی تفصیلی گزارشات ان ہی کی خدمت میں پیش کرے گا۔

جہاں تک حضرت مولانا سید حامد میاں مدظلہ کا تعلق ہے اوّلاً تو راقم اُن کا حد درجہ شکرگزار ہے کہ انہوں نے راقم کے نظریۂ نیم تقلید کی بکراہت ہی سہی، کسی نہ کسی درجے میں تصویب فرما دی ہے، بدیں الفاظ:

> ''ہاں البتہ اگر کوئی غیر مقلد ہو اور وہ ان ائمہ کو مقتدا مان کر بلا خواہش نفس مسئلہ کو راجح سمجھتے ہوئے ایسا کرنے لگے تو شاید اُس کے لیے مطلقاً غیر مقلد بنے رہنے سے بہتر ہوگا۔ کیونکہ آج کل کے علماء سے مسئلہ پوچھ کر عمل کرنے سے یہ بہت زیادہ افضل ہے کہ ائمہ کی تحقیق پر چلے۔ رحمھم اللہ۔''

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مولانا کا ہاتھ حالات حاضرہ کی نبض پر ہے اور یہ اس لیے ہے کہ وہ صرف 'عالم دین' اور 'شیخ طریقت' ہی نہیں ہیں بلکہ ملکی سیاست کے میدان میں بھی فعال و سرگرم ہیں۔ فقہی مسلک کے معاملے میں مولانا کے مزاج کے اس ''توسع'' کا ایک اندازہ اُس وقت بھی ہوا تھا، جب تنظیم اسلامی میں شمولیت کی 'بیعت جہاد' کے ضمن میں اُن سے مولانا محمد منظور نعمانی مدظلہ کے خلف الرشید مولانا عتیق الرحمٰن سنبھلی نے جو آج کل لندن میں مقیم ہیں وضاحت طلب فرمائی تھی تو مولانا نے اپنے جوابی گرامی نامے میں کچھ اس قسم کے الفاظ سے کہ ''ہمیں یہ ملحوظ رکھنا چاہیے کہ جماعت اسلامی میں جو شخص بھی شامل ہوا وہ تقلید کے ضمن میں تو کچھ نہ کچھ ضرور ہی نرم پڑ گیا'' راقم کے معاملے میں 'نرمی' اختیار کرنے کا مشورہ دیا تھا۔

ثانیاً —— میں مولانا کو اپنی اور اپنے رفقاء کی جانب سے یہ اطمینان دلاتا ہوں کہ ہم دین میں اپنے لیے آسانیوں کی تلاش کے قائل نہیں ہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی تائید اور توفیق کے بھروسے پر فی الجملہ رخصت کی بجائے 'عزیمت' کی راہ پر چلنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ چنانچہ فقہی مسائل میں بھی اگر کوئی 'توسع' ہوا تو وہ ان شاء اللہ العزیز ''ہر مسلک میں سے چن چن کر آسان مسائل لے لینے'' کی بنا پر نہیں ہوگا، بلکہ اس معاملے میں حتی الامکان اسی طرزِ عمل کو اختیار کرنے کی کوشش کی جائے گی جسے مولانا نے اپنی تحریر میں دو مقامات پر ''مستحب'' سے تعبیر فرمایا ہے!

البتہ موقع کی مناسبت سے ایک بات نہایت ادب کے ساتھ مولانا ممدوح اور ان کی وساطت سے جملہ علمائے دین بالخصوص متوسلین حلقۂ دیوبند سے عرض کرنے کی اجازت چاہتا ہوں اور وہ یہ کہ دین کے علم و عمل کے اس عالمگیر زوال، اور فتنہ و فساد اور حرص و ہوا کے ہمہ گیر غلبے کے پیش نظر کیا حکمت دعوت و اصلاح اور خود مصلحت دینی اس کی متقاضی نہیں ہے کہ

رجالِ دین خود کمالِ حزم و اختیار کے ساتھ اُسی طرزِ عمل پر کاربند رہتے ہوئے جس کا ذکر اوپر ہو چکا ہے‘ عوام کے لیے ﴿یُرِیْدُ اللّٰہُ بِکُمُ الْیُسْرَ وَلاَ یُرِیْدُ بِکُمُ الْعُسْرَ﴾ کی قرآنی رہنمائی اور ﴿یَسِّرُوْا وَلاَ تُعَسِّرُوْا﴾ کے فرمانِ نبویؐ کی روشنی میں زیادہ سے زیادہ آسانیاں پیدا کریں اور اس کے لیے ائمہ اربعہ کے دائرے کے اندر اندر زیادہ سے زیادہ توسع پیدا کریں۔ گزشتہ سال مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کے سالانہ محاضرات قرآنی میں حصہ لینے کے لیے بھارت سے مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہ‘ کے رفیق کار اور معتمد خصوصی مولانا عبدالکریم پاریکھ صاحب لاہور تشریف لائے تھے۔ تو اس موقع پر انہوں نے بھی اس ضرورت کا شدت کے ساتھ اظہار فرمایا تھا۔ اس لیے کہ وہ بھی بفضلہٖ تعالیٰ دعوت و اصلاح کے میدان میں بہت سرگرم ہیں اور اس بنا پر انہیں حالات اور ان سے پیدا شدہ ’ضروریات‘ کا براہِ راست احساس ہوا ہے۔ یہاں یہ عرض کر دینے میں بھی کوئی حرج نہیں ہے کہ عوام الناس بالخصوص نیم تعلیم یافتہ‘ لوگوں میں یہ تاثر عام ہے کہ مولویوں کے پاس اپنے لیے آسانیاں پیدا کرنے کے لیے تو مفصل ’کتاب الحیل‘ موجود ہے‘ لیکن دوسرے کو وہ ہمیشہ سخت سے سخت فتویٰ دیتے ہیں! میری ناچیز رائے میں ضرورت اس امر کی ہے کہ اس تاثر کو بالکل برعکس کر دیا جائے اور لوگوں میں یہ تاثر عام ہو جائے کہ رجال دین اپنے اوپر تو بہت سختی کرتے ہیں لیکن دوسروں کے لیے زیادہ سے زیادہ نرمی اور آسانی پیدا کرتے ہیں۔ اور اغلباً صوفیائے کرام کی کامیابی کا راز اسی میں مضمر تھا! کاش کہ جس طرح حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ نے جرأت رندانہ سے کام لیتے ہوئے ’’**الحیلة الناجزة فی الحلیلة العاجزة**‘‘ کی صورت پیدا فرمائی اور اس پر علماء کرام کی جانب سے عمومی تصویب بھی حاصل فرمائی اس طرح اکابر علماء میں سے کوئی اور باہمت اور مجددانہ مزاج کی حامل شخصیت اس معاملے میں مزید اقدام کے بارے میں غور کر سکے! یہ واضح رہے کہ ہمارے نزدیک یہ کام ہے صرف علماء کرام اور اُن میں سے بھی علم و فہم‘ تقویٰ و تدین اور زہد و ورع کے جملہ اعتبارات سے مسلم مرتبے کی حامل شخصیت کا!

’’میثاق‘‘ نومبر ۱۹۸۴ء میں شائع شدہ باقی چار خطوط میں سے ایک یعنی مولانا حافظ قاری محمد سعید الرحمٰن علوی (سابق مدیر ہفت روزہ ’خدام الدین‘ لاہور) کے خط میں تو جواب طلب بات کوئی نہیں ہے‘ البتہ کراچی سے اصحاب ثلاثہ جناب خسروی صاحب‘ مولانا محمد عبدالبر صاحب اور جناب ایس بی علی صاحب کے خطوط میں بعض اُمور وضاحت طلب ہیں جن پر

ان شاء اللہ آئندہ کسی صحبت میں گفتگو ہو گی۔ سردست قارئین ’’میثاق‘‘ کی اطلاع کے لیے اتنا عرض ہے کہ اپنے گزشتہ دورۂ کراچی کے موقع پر میں جناب خسروی صاحب کے در دولت پر حاضری دے کر بالمشافہ گفتگو کر چکا ہوں۔ اور الحمد للہ کہ اپنی تحریر میں وہ جس قدر تیکھے نظر آتے ہیں حقیقتاً اُتنے نہیں ہیں! آئندہ سفر کراچی میں ان شاء اللہ مولانا عبدالبر صاحب سے بھی ملاقات کا ارادہ ہے اور اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے اُمیدِ واثق ہے کہ ان سے ملاقات بھی بہت مفید ثابت ہو گی۔

لگے ہاتھوں اس کا بھی تذکرہ ہو جائے تو غالباً کوئی حرج نہ ہو گا کہ راقم نے بحمد اللہ اپنے طے شدہ لائحہ عمل کے مطابق علماء کرام سے ملاقاتوں کے لیے کسی نہ کسی طرح وقت نکال کر حاضری دینے کا سلسلہ عملاً شروع کر لیا ہے۔ چنانچہ گزشتہ دورۂ کراچی کے موقع پر ایک نہایت مفصل اور حد درجہ مفید ملاقات حضرت مولانا مفتی ولی حسن صاحب ٹونکی مدظلہ‘ سے ہوئی اور راقم ان کا بے حد ممنون ہے کہ انہوں نے بغیر کسی تکلف کے اپنے جملہ شکوک و شبہات پیش فرمائے اور الحمد للہ کہ راقم کی وضاحتوں پر اظہارِ اطمینان فرمایا۔ اسی طرح اپنے دورۂ ’سوات‘ دیر اور باجوڑ کے موقع پر راقم لگ بھگ پچاس ساٹھ میل کا اضافی فاصلہ طے کر کے تبرکاً حضرت شیخ الہندؒ کے خادم و رفیق زنداں حضرت مولانا عزیر گل مدظلہ کی زیارت کے لیے حاضر ہوا۔ اور اُن سے خصوصاً مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم اور ان کی مجوزہ امامتِ ہند کے سلسلے میں مفید گفتگو ہوئی۔ مزید برآں میرے حالیہ دورۂ کوئٹہ کے دوران ایک تو وہاں کے رفقاء نے از خود علماء کرام کے ساتھ ایک خصوصی نشست کا اہتمام کیا تھا۔ اس پر مستزاد مولانا منیر الدین مدظلہ‘ صدر مجلس تحفظِ ختم نبوت‘ بلوچستان کے ساتھ خالص تنہائی میں نہایت مفید ملاقاتیں ہوئیں۔

ماہنامہ اور ہفت روزہ جرائد میں سے راقم کے علم کی حد تک تا حال دو ہفت روزہ رسالوں یعنی معاصر ’چٹان‘ لاہور اور معاصر ’تنظیم اہلحدیث‘ نے تائیدی و تصویبی شذرات لکھے ہیں جو قارئین کی دلچسپی کے لیے اس اشاعت میں شامل کیے جا رہے ہیں۔ ان میں سے مولانا عزیز زبیدی مدظلہ کا شذرہ میرے لیے خصوصی اہمیت کا حامل ہے‘ اس لیے کہ میری معلومات کے مطابق وہ بھی جماعت اسلامی کے ’سابقین‘ میں سے ہیں۔ البتہ دو ماہناموں یعنی ’طلوع اسلام‘ لاہور اور ’الخیر‘ ملتان نے تنقیدی مقالات شائع کیے ہیں۔

ان میں سے جہاں تک طلوعِ اسلام کا تعلق ہے اُس کی ایک گرفت یقیناً درست ہے' جس کا ذکر بھی پہلے ہو چکا ہے اور اُس کے ضمن میں راقم اپنی وضاحت بھی پیش کر چکا ہے' باقی 'طلوعِ اسلام' کے اور ہمارے مابین نظریاتی اختلاف کی خلیج اتنی وسیع ہے کہ اس ضمن میں کچھ عرض کرنے کا نہ کوئی فائدہ ہے نہ ضرورت! فقط آیۂ قرآنی ﴿لَكُمۡ دِيۡنُكُمۡ وَلِيَ دِيۡنِ۝﴾ کا حوالہ کافی ہے۔ البتہ ''الخیر'' کی خدمت میں کچھ معروضات پیش کرنی ضروری ہیں۔

ان میں اوّلاً تو ایک نیاز مندانہ گلہ مدیرِ 'الخیر' سے ہے کہ ان کے پرچے کے جولائی ۱۹۸۴ء کے شمارے میں ایک تحریر مولانا اللہ بخش ایاز ملکانوی کی شائع ہوئی تھی جس کے جواب کی نقل الخیر کو بھی ارسال کر دی گئی تھی۔ ہمیں توقع تھی کہ نومبر کے پرچے میں ہمارا وہ جواب ضرور شائع ہوگا لیکن ہمیں مایوسی ہوئی —— غالباً عام صحافت کے اصولوں میں بھی یہ امر مسلم ہے کہ اپنے جن قارئین کے ذہنوں میں 'الخیر' نے اپنے اُس مضمون کے ذریعے کچھ سوالات پیدا کر دیے تھے ان کے جوابات بھی اُن قارئین تک پہنچانا 'الخیر' کی ذمہ داری ہے۔ (یا پھر دوسری ممکن صورت یہ ہو سکتی ہے کہ اپنے قارئین کی فہرست 'الخیر' ہمیں فراہم کر دے تا کہ ہم خود ان تک اپنا جواب پہنچا دیں!)

ثانیاً —— ایک ہدیۂ تشکر پیش کرنا ہے 'الخیر' کے مضمون نگار مولانا عبد القیوم حقانی کی خدمت میں کہ انہوں نے الخیر میں اپنی تیز و تند تنقید چھپوانے کے ساتھ راقم کے نام ایک ذاتی خط لکھنے کی تکلیف بھی گوارا کی جس میں وہ رقم طراز ہیں:

''محترم جناب ڈاکٹر اسرار احمد صاحب زید مجدکم۔ سلام مسنون!

اُمید ہے کہ مزاج بخیر ہوں گے۔ ستمبر کے ماہنامہ میثاق کے شمارے میں آپ کے خطاب سے متعلق دینی اور شرعی نقطۂ نظر سے جو تبصرہ ضروری سمجھا اسے ۱۰۸ صفحات میں ماہنامہ 'الخیر' ملتان کے تازہ شمارے میں شائع کرا دیا ہے۔ انہوں نے آپ کے پاس وہ شمارہ بھیج دیا ہے۔ کسی ذاتی عناد یا بغض سے قطعِ نظر' خالص احساسِ ذمہ داری اور عند اللہ مسئولیت کے پیشِ نظر یہ قدم ضروری سمجھا۔ ورنہ میں اپنے زمانہ شعور سے تا حال آپ کے لٹریچر کو باقاعدگی سے پڑھتا رہا۔ آپ ہماری معروضات پر ٹھنڈے دل اور گہری سوچ کے ساتھ غور فرمائیں تو مسئلہ واضح ہو جائے گا۔ باری تعالیٰ ہم سب کو ہدایت کے راستے پر چلائے۔ والسلام۔''

واقعہ یہ ہے کہ اگرچہ ویسے تو راقم نے جس وادی میں قدم رکھا ہے اُس کے پیشِ نظر راقم

ہر وقت ''غیروں'' کی جانب سے کسی بھی قسم کے ''ناوکِ دشنام'' کے ساتھ ساتھ اپنوں کی جانب سے بھی ہر نوع کے ''طرزِ ملامت''(۱) کے لیے ذہناً اور قلباً تیار رہتا ہے اور اُس کے دل پر اگر کبھی کسی کی جانب سے ملال کا اثر ہوتا بھی ہے تو محض عارضی طور پر —— تاہم مولانا حقانی کے اس خط نے تو اُس کا بھی کلیتاً سدِ باب کر دیا' جس کے لیے میں اُن کا ممنون ہوں!

'الخیر' میں شائع شدہ دونوں تحریروں کے مشترک نفسِ مضمون کے بارے میں کچھ عرض کرنے سے قبل ایک حسنِ اتفاق (یا سوءِ اتفاق) کا ذکر قارئین کی دلچسپی کا موجب ہوگا۔ وہ یہ کہ ایک روز فجر کی جماعت کے فوراً بعد میرے ایک رفیق کار نے مجھے بیک وقت 'طلوعِ اسلام' اور 'الخیر' کے شمارے دیے۔ میں نے جو اُن کے مضامین کو سرسری طور پر دیکھا تو ایک عجیب فوری تضاد contrast نظر آیا کہ 'طلوعِ اسلام' کے مدیر کو میری پوری تقریر میں از اوّل تا آخر نری اَسلاف پرستی ہی اَسلاف پرستی نظر آئی اور 'الخیر' کے دونوں مضمون نگاروں کو اسلاف سے بغاوت ہی بغاوت نظر آئی۔ گویا معاملہ وہی ہوا کہ ؎

زاہد تنگ نظر نے مجھے کافر جانا
اور کافر یہ سمجھتا ہے مسلمان ہوں میں!

پرچے میں ترتیب کے اعتبار سے تو اگرچہ مدیرِ 'الخیر' مولانا محمد ازہر صاحب کی تحریر پہلے ہے اور مولانا حقانی صاحب کی بعد میں' لیکن جیسا کہ خود مولانا محمد ازہر صاحب نے وضاحت فرما دی ہے مولانا حقانی کی تحریر 'الخیر' کی اکتوبر کی اشاعت سے بھی قبل ان کے پاس پہنچ گئی تھی— مزید برآں دونوں تحریروں کے بالاستیعاب مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان میں اصل کی حیثیت مولانا حقانی ہی کی تحریر کو حاصل ہے۔ لہٰذا ہم بھی اصلاً اُسی کے بارے میں عرض کریں گے۔

مولانا حقانی کی پوری تحریر کو بار بار پڑھنے کے بعد راقم پوری دیانت کے ساتھ عرض کرتا ہے کہ وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ اس کی اساس چند مغالطوں پر ہے۔ واضح رہے کہ ان مغالطوں کی

(۱) فیض کا شعر ہے ؎

چھوڑا نہیں غیروں نے کوئی ناوکِ دشنام
چھوٹی نہیں اپنوں سے کوئی طرزِ ملامت!

(پ۔ن) عجب اتفاق ہے کہ جس وقت راقم نے فیض کا یہ شعر اس مقام پر درج کیا اگلے روز کے اخبارات سے معلوم ہوا کہ عین اُسی وقت اُس کا جسدِ خاکی لحد میں اُتارا جا رہا تھا۔

وجہ راقم کے نزدیک مولانا حقانی کا 'قصورِ فہم' ہرگز نہیں ہے بلکہ کچھ خود راقم کی اپنی کج مج بیانی اور کچھ اس تقریر کے مرتب کی تقصیر ہے (جس کی ایک مثال کا ذکر اوپر بھی ہو چکا ہے' یعنی یہ کہ مولانا انور شاہ کاشمیریؒ کے قول کا اہم ترین حصہ نقل ہونے سے رہ گیا۔) ان دو کے علاوہ ایک سبب اور بھی ہے جس کا ذکر بعد میں آ جائے گا۔ بنابریں راقم کسی لفظی نزاع میں الجھنے یا لفظ بلفظ بحث میں وقت ضائع کرنے کی بجائے مناسب سمجھتا ہے کہ ان مغالطوں کو دُور کرنے کی کوشش کرے جس سے ان شاء اللہ نہایت آسانی کے ساتھ مسئلہ حل ہو جائے گا۔ اور اگر اُس کا کوئی حصہ حل طلب باقی رہ گیا تب بھی اُس کے حل کی راہ لازماً آسان ہو جائے گی۔ اس ضمن میں راقم مولانا حقانی اور مولانا محمد از ہر دونوں حضرات سے بھی درخواست کرتا ہے کہ براہ کرم اس بحث میں نہ الجھئے کہ تمہاری شائع شدہ تقریر کا مطلب تو وہی نکلتا تھا جو ہم نے نکالا تھا۔ اس لیے بھی کہ میں خود اپنی اور بھائی جمیل الرحمٰن صاحب کی 'تقصیر' تو پہلے ہی تسلیم کر چکا ہوں۔ اور اس لیے بھی کہ کم از کم بقیدِ حیات لوگوں کے بارے میں تو یہ حق مسلمہ طور پر تسلیم کیا جاتا ہے کہ اپنے قول کی تاویل کا حق انہیں حاصل رہتا ہے! (چنانچہ ''تاویلُ القولِ بما لا یَرْضٰی بِہِ القائل'' کو سب ہی غلط سمجھتے ہیں!) اور آئندہ گفتگو کی اساس کسی شخص کے قول کی اُس تاویل کو بنایا جانا چاہیے جو وہ خود کر دے۔

ان مغالطوں میں اوّلین اور اہم ترین یہ ہے کہ میں تمام فقہی مسالک کو ختم کر کے ''ایک فقہی مسلک پر مجتمع'' کرنے اور ''مستقبل کی کسی شخصیت کو اجتہادِ مطلق کی دعوت'' کا علمبردار ہوں۔ لہٰذا میں سب سے پہلے اسی غلط فہمی کو رفع کر دینا چاہتا ہوں' اس لیے کہ میرے نزدیک دونوں بزرگوں کی برہمی کا اصل سبب یہی ہے۔

اصل میں یہی وہ غلط فہمی ہے جس کے بارے میں میں نے اوپر عرض کیا تھا کہ اس کا ایک خاص سبب ہے' وہ یہ کہ لاہور میں میری تقریریں 'مسلسل' ہوتی ہیں اور بعض مسائل جن پر سابق تقریر میں مفصل بحث ہو چکی ہوتی ہے اگلی تقریر میں اُس کا صرف ایک سرسری سا ذکر ہوتا ہے اور میں یہ فرض کر لیتا ہوں کہ اس کے ضمن میں میرا پورا موقف سامعین کے علم میں موجود ہے۔ اب ظاہر ہے کہ جس کے سامنے میری وہی تقریر ہوگی اُس کا اس اجمال کے باعث 'مغالطے' میں مبتلا ہو جانا بالکل قرین قیاس ہے۔

یہ بات تو میری اس تقریر سے بھی سب پر واضح ہو گئی ہوگی کہ اس کے پس منظر میں مولانا

امین احسن اصلاحی صاحب کی وہ رائے ہے جو انہوں نے اپنی تفسیر 'تدبر قرآن' کی جلد چہارم میں حدرجم کے بارے میں ظاہر فرمائی ہے اور جو راقم کے اُن سے آخری اور قطعی 'انقطاع' تعلق کا سبب بنی۔ چونکہ راقم کا ایک نہایت طویل مدت تک (لگ بھگ ثلث صدی) مولانا موصوف کے ساتھ نہایت قریبی اور گہرا تعلق رہا ہے اور ان کے اور راقم کے بہت سے احباب اور محبین و متعلقین مشترک ہیں۔ پھر یہ کہ ہم دونوں ایک ہی شہر میں مقیم ہیں اور ہمارے مابین ''مکانی'' فصل و بعد بھی زیادہ نہیں ہے' لہٰذا ہمارے بعض مستقل سامعین بھی مشترک ہیں۔ یہ وجہ ہے کہ گزشتہ دنوں اس مسئلے پر بہت سے لوگوں سے بہت گرما گرم گفتگوؤں کا سلسلہ چلا۔ جس میں اُن کے حامیوں کی جانب سے بار بار ایک دلیل نما سوال یہ کیا گیا کہ ''کیا تمہارے خیال میں اب کسی نئے مجتہد کے پیدا ہونے کا کوئی امکان نہیں ہے؟'' اصل میں اِس سوال کے جواب میں میں عرض کرتا رہا کہ ''اس کے امکان کو میں قطعاً تو ردّ نہیں کرتا' لیکن ایسی کسی شخصیت کے لیے لازم ہو گا کہ نہ صرف علم و فضل بلکہ تقویٰ و تدین اور خلوص وللّٰہیت میں بھی اپنے دور کے عوام و خواص دونوں سے اپنا لوہا منوا لے۔''(۱)

یہی بات میری ایک تقریر میں (جو ایک مقامی ہوٹل میں مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کے زیر اہتمام منعقد ہوئی تھی) اس طور سے آ گئی کہ ''میں اس امکان کو خارج از بحث تو قرار نہیں دیتا کہ ہو سکتا ہے کہ اللہ مستقبل میں کسی ایسی شخصیت کو اُٹھا دے جو فقہی اختلافات کو بالکل ختم کر کے اُمت کو کسی ایک ہی مسلک پر جمع کر دے' لیکن بحالاتِ موجودہ یہ ایک اَن ہونی سی بات ہے اور فی الوقت ہمیں یہی چاہیے کہ سلف صالحین کی پیروی کرتے ہوئے صرف اس قدر کریں کہ جملہ فقہی مسالک کے لیے اپنے سینوں اور دلوں میں وسعت پیدا کر لیں تاکہ ایسا نہ ہو کہ ہم محض فقہی مسلک کے اختلاف کی بنا پر من دیگرم تو دیگری کا سا انداز اختیار کر لیں اور دین کے احیاء و اقامت کی جدوجہد میں شانہ بشانہ شریک نہ ہو سکیں!''

پھر یہی بات مسجد دارالسلام والی تقریر میں مختصراً اُس طرح آ گئی جیسے 'میثاق' میں چھپی

---

(۱) حسن اتفاق سے اس 'امکان' کی تصویب مولانا عبدالحیٔ لکھنویؒ کے اس قول سے بھی ہو گئی جو 'الخیر' کے صفحہ ۲۴ پر درج ہے۔ یعنی ''جو یہ دعویٰ کرے کہ ائمہ اربعہ کے بعد کوئی مجتہد نہیں ہو سکتا تو یہ غلط ہے۔ البتہ اگر یہ کہے کہ ائمہ اربعہ کے بعد کوئی ایسا مجتہد نہیں ہوا جس کے دعوائے اجتہاد کو جمہور نے مانا ہو تو یہ مسلمہ ہے۔'' (بحوالہ: شریعت و طریقت)

ہے۔ بہر حال میں واضح الفاظ میں صراحت کرتا ہوں کہ میرے اس قول سے مراد صرف اس درجے میں امکان کو تسلیم کرنا ہے جس درجے میں ہم عموماً بفرضِ محال کسی بات کا ذکر کرتے ہیں۔ میں اس سے قطعی اعلانِ براءت کرتا ہوں کہ میں اس کا داعی یا مبلغ یا کسی درجے میں بھی مجوز و محرک ہوں! اللہ کا شکر ہے کہ دونوں بزرگوں میں سے کسی نے مجھ پر خود اس کے 'مدعی' ہونے کا الزام عائد نہیں کیا۔ تاہم میں واضح کیے دیتا ہوں کہ اپنے بارے میں کسی ایسے گمان سے پہلے میں اسے پسند کروں گا کہ زندہ آگ میں جلا دیا جاؤں' **واللّٰہ علٰی ما اقول وکیل!**

میری زیر بحث تقریر کا بھی اصل رُخ تقلید کی جانب ہے۔ اور میرے کم از کم لاہور کے جملہ 'سامعین' تو اس سے بخوبی آگاہ ہیں کہ گزشتہ تقریباً چھ ماہ سے میں نے سب سے زیادہ زور ان ہی نکات پر دیا ہے جو 'الخیر' کے صفحہ ۳۹۔۴۰ پر حضرت مولانا مفتی محمد شفیعؒ کی تحریر سے نقل ہوئے ہیں۔ اور جو نہایت خوبصورت الفاظ میں علامہ اقبال مرحوم نے بھی اپنی مشہور مثنوی ''اسرار و رموز'' میں ''رموز خودی'' کے ذیل میں ''در معنی این کہ در زمانہ انحطاط' تقلید از اجتہاد اولیٰ تر است!'' کے عنوان سے نظم کیے ہیں:

راہِ آبا رو کہ این جمعیت است   معنی تقلید ضبط ملت است
اجتہاد اندر زمانِ انحطاط   قوم را برہم ہمی پیچید بساط
ز اجتہادِ عالمانِ کم نظر   اقتدا بر رفتگاں محفوظ تر
عقل آبایت ہوس فرسودہ نیست   کارِ پاکاں از غرض آلودہ نیست
فکر شاں ریسد ہمے باریک تر   ورعِ شاں با مصطفیٰؐ نزدیک تر (۱)

اجتہاد کے ضمن میں بھی الحمدللہ میرا ذہن بالکل صاف ہے اور مجھے اپنے موقف اور ان بزرگوں کی تصریحات کے مابین کوئی تباین' تو کیا بُعد بھی نظر نہیں آیا جن کے حوالے 'الخیر' کے زیر نظر شمارے میں درج کیے گئے ہیں۔ تاہم میں مختصراً اپنا موقف اپنے ہی الفاظ میں بیان کیے دیتا ہوں:

اُن تمام مسائل کے ضمن میں جو ائمہ مجتہدین (یعنی ائمہ اربعہ) کے زمانے میں پیدا ہو چکے تھے اور اُن پر انہوں نے پوری طرح غور و فکر کر کے اپنے فیصلے ثبت فرما دیے ہیں' اُن

(۱) عجب حسن اتفاق ہے کہ آج ۲۲ نومبر ۱۹۸۴ء کی صبح یہ تحریر سپردِ قلم کر رہا ہوں۔ اور گزشتہ شب یعنی ۲۱ نومبر کی رات کو میں نے جناح ہال لاہور میں ایک اجتماع عام میں یہ اشعار بھی پڑھ کر سنائے' اور اجتہاد کے بارے میں بھی وہ رائے ظاہر کی جو آگے آ رہی ہے۔

میں سے (ا) جن مسائل میں ائمہ اربعہ کا اتفاق ہوا اُن کے ضمن میں تو میں اجتہادِ مطلق' تو کجا مجرد جنسِ اجتہاد کے باقی رہنے کا بھی قائل نہیں۔ البتہ (ب) جن میں اُن کے مابین اختلاف رائے ہوا اُن کے ضمن میں 'اجتہاد' کو اس میں دائر سمجھتا ہوں کہ اُن میں سے کسی کے موقف کو ترجیح دیتے ہوئے اختیار کر لیا جائے' لیکن اُن کے دائرے سے باہر نکلنے کو کسی طرح صحیح نہیں سمجھتا۔

جنسِ اجتہاد یا نفسِ اجتہاد کے بقا و تسلسل کا معاملہ میرے نزدیک اُن مسائل میں ہے جو سائنسی ترقی اور عمرانی ارتقا کے نتیجے میں بالکل نئی صورتِ معاملہ کی حیثیت سے پیدا ہوئے ہیں۔

دوسرا اہم مغالطہ دونوں حضرات کو یہ ہوا ہے کہ میں ''پانچ کے دائرے میں نیم تقلیدی مسلک کا ایک اور دائرہ'' بنانے کا داعی ہوں۔ اگر میرے الفاظ سے ایسا متبادر ہوا ہے تو میں اُس سے بھی علی رؤس الاشہاد رجوع کرتا ہوں۔ اس ضمن میں اصل معاملہ یہ ہے کہ میں صرف ایک بات کا داعی ہوں اور ایک کا مستدعی!

داعی میں صرف اس بات کا ہوں کہ مختلف فقہی مسالک کے ماننے والے اُن پر عمل پیرا ہوتے ہوئے اپنے سینوں اور دلوں میں 'وسعت' پیدا کریں اور ایسا نہ ہو کہ ''**قولنا صوابٌ لٰکن محتملُ الخطأ وَ قولُ غَیرنا خَطَأٌ محتملُ الصوابِ**'' صرف کہنے اور لکھنے میں آئے اور عملی صورت یہ ہو کہ فقہی اختلافات کی بنا پر ہمارے دلوں میں بعد پیدا ہو جائے اور ہم مل جل کر شانہ بشانہ منکرات' فواحش کے خلاف جہاد' امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی سعی' اور غلبہ و اقامت دین کی جدوجہد میں شریک نہ ہو سکیں۔ میری تقریر میں سارا زور اصلاً اسی پر ہے' اور بادنیٰ غور و تامل یہ حقیقت سامنے آ جاتی ہے کہ اسی 'وسعتِ قلب' فقہی رواداری' سے حدیث نبویؐ: ((**اِختِلَافُ اُمَّتِیْ رَحْمَۃٌ**)) (الخیر' ص ۳۸) اور مولانا حقانی کے اپنے الفاظ ''تمام ائمہ کے مسالک برحق ہیں اور اختلافِ ائمہ رحمت ہے'' (الخیر' ص ۳۹) کی عملی تعبیر سامنے آ سکتی ہے۔ یہاں طویل اقتباس طوالت کا موجب ہو گا لیکن مجھے یقین ہے کہ اگر میری ان تصریحات کی روشنی میں میری مطبوعہ تقریر کے صفحہ ۴۷ کے وسط سے صفحہ ۵۰ کے وسط تک کے حصہ کو دوبارہ پڑھا جائے اور اس میں مولانا انور شاہ کاشمیریؒ کے اقتباس کا وہ حصہ بھی شامل کر لیں جو زیر نظر تحریر میں پہلے دیا جا چکا ہے تو ان شاء اللہ العزیز یہ مغالطہ رفع ہو جائے گا اور میرا اصل مافی الضمیر واضح ہو جائے گا۔

اہل سنت کے متفق علیہ چار فقہی مسالک اور ان کے بانی ائمہ کرام رحمہم اللہ پر' میں امام

بخاریؒ کا اضافہ اصلاً تو اس بنا پر کرتا رہا ہوں کہ میرے نزدیک 'حقیقتِ ایمان' کے ضمن میں جامع اور صحیح ترین تعبیر امام ابوحنیفہؒ اور امام بخاریؒ دونوں کی تعبیرات کی جمع و تطبیق ہی سے وجود میں آتی ہے۔ ورنہ میرا ذاتی گمان بھی یہی تھا (اگرچہ اپنی کم علمی کی بنا پر اس پر جازم نہیں تھا) کہ امام بخاریؒ کا کوئی مسئلہ' ائمہ اربعہ کے دائرے سے باہر نہیں ہوگا۔ اور الحمد للہ کہ حضرت مولانا مفتی ولی حسن صاحب ٹونکی نے اپنی محولہ بالا ملاقات میں پورے جزم کے ساتھ اور احصاء اور استقصاء کے انداز میں فرمایا کہ واقعتہً ایسا ہی ہے' جس سے مزید انشراح ہوا۔ البتہ چونکہ مسالک اربعہ کے پیروؤں میں سے تو ہمارے یہاں شاید احناف کے سوا شاذ ہی کسی اور مسلک کے لوگ موجود ہوں' لیکن اہل سنت کا ایک اور گروہ برصغیر پاک و ہند میں معتد بہ تعداد میں موجود ہے جو غیر مقلد' یا اہل حدیث یا سلفی المسلک الغرض مختلف ناموں سے موسوم ہے۔ اور اس میں ہرگز کوئی شک نہیں کہ گزشتہ ڈیڑھ سو سالوں کے دوران ان حضرات نے مشرکانہ اوہام' ہندوانہ رسومات اور بدعاتِ سیّئہ کے خلاف نہایت مؤثر جہاد کیا ہے اور مؤقر خدمات انجام دی ہیں[1]۔ اور اگرچہ یہ واقعہ ہے کہ یہ صرف ایک مسلک ہے کوئی معین 'مذہب' نہیں

(۱) اور یہ بھی ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ تحریک شہیدینؒ کی سرحد میں ظاہری ناکامی کے بعد اُس کے ''باقیات الصالحات'' کے ذریعے دین حق کی جو خدمت برصغیر پاک و ہند میں سرانجام پائی اُس میں خواہ تعداد کی کثرت اور اثرات کی وسعت کے اعتبار سے 'حنفی المسلک' علماء و اکابر کا پلڑا بھاری نظر آئے' حقیقت کے اعتبار سے 'سلفی المسلک' اشخاص' اداروں اور جماعتوں کا حصہ بھی کسی سے کم نہیں ہے۔ اور جہادِ حریت و استخلاصِ وطن ہو یا سعی غلبہ و اقامت دین دونوں میدانوں میں ان دو مسلکوں کے پیرو شانہ بشانہ شریک رہے ہیں۔ چنانچہ ۱۹۲۰ء کے اجلاس جمعیت علماء ہند منعقدہ دہلی میں جہاں دہلی' دیوبند' اجمیر' بدایون اور فرنگی محل کے 'حنفی' علماء شریک تھے وہاں اہل حدیث علماء بھی موجود تھے۔ چنانچہ مولانا محمد داؤد غزنویؒ کی شرکت تو تعین کے ساتھ ثابت ہے۔ اور اس ضمن میں 'آخری بات' یہ ہے کہ اس اجلاس میں حضرت شیخ الہندؒ جیسے 'کٹر حنفی' کے ایما پر مولانا احمد سعید دہلویؒ اور مفتی کفایت اللہؒ ایسے حنفی علماء و مفتی حضرات نے مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم ایسے آزاد شخص کا نام 'بیعت و امامتِ ہند' کے لیے پیش فرمایا تھا۔ اس سلسلے میں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ جماعت مجاہدین کے آخری شخص جو چند ہی سال قبل فوت ہوئے یعنی صوفی عبداللہ صاحب جنہوں نے ماموں کانجن میں عظیم الشان دینی مدرسہ قائم فرمایا' مسلکاً اہل حدیث تھے۔

ہے اور اصولی طور پر اس میں کسی معین مجتہد کی تقلید خارج از بحث ہے۔ تاہم اکثر و بیشتر مسائل میں یہ حضرات امام بخاریؒ کے اجتہادات ہی کا اتباع کرتے ہیں (چنانچہ کچھ حضرات انہیں طنزاً ''مقلدین بخاریؒ'' کے نام سے بھی موسوم کرتے ہیں!) اور جیسا کہ میں نے اپنی زیر بحث تقریر میں عرض کیا تھا کہ امام بخاریؒ وہ شخصیت ہیں جن کے مرتب کردہ مجموعہ احادیث کو جملہ اہل سنت ''اَصحُّ الکُتُب بَعْدَ کتاب اللّٰہ'' تسلیم کرتے ہیں۔ مزید برآں اکابر علماء احناف نے اُن کی فقاہت کو خراجِ تحسین ادا کیا ہے۔ (مجھے خود بھی جامعہ مدنیہ لاہور میں ایک تقریب ختم بخاری میں شرکت کی سعادت حاصل ہوئی تھی جس میں مولانا سید محمد یوسف بنوریؒ نے امام بخاریؒ کی فقاہت کو نہایت شاندار الفاظ میں خراجِ تحسین ادا فرمایا تھا۔) لہٰذا میں نے اپنی ذات کی حد تک 'نیم تقلید' کا جو دائرہ بنایا ہے اُس میں ائمہ اربعہؒ کے ساتھ ساتھ امام بخاریؒ کو بھی شامل کیا ہے۔

اور یہی میری علماء کرام سے وہ استدعا ہے جس کا میں نے اوپر ذکر کیا تھا' یعنی میں اپنی ذات کی حد تک اس اجازت کا طلب گار ہوں کہ اپنی 'تقلید' کو ان 'ائمہ خمسہ' کے دائرے تک وسعت دے دوں اور میں تسلیم کرتا ہوں کہ اس کا اصل سبب میری ایک ذاتی مشکل اور الجھن ہے جس کا ہمدردانہ احساس' مجھے اندیشہ ہے کہ' حضرات علماء نہیں کر سکیں گے۔ معاملہ یہ ہے کہ میں نے کسی دینی مدرسے میں تعلیم حاصل نہیں کی ہے' اگر ایسا ہوتا تو یقیناً جس فقہی مسلک کا وہ مدرسہ ہوتا میرے دل و دماغ بھی اسی پر جازم اور راسخ ہو جاتے اور یہ مسئلہ ہی پیدا نہ ہوتا۔ میری مشکل یہ ہے کہ میں تو سکولوں اور کالجوں کا پڑھا ہوا ہوں۔ اس کے باوصف یہ اللہ ہی کا فضل و کرم ہے کہ اُس نے دین کی جانب رغبت عطا فرمائی اور اُس کے لیے تن من دھن حتیٰ کہ اولاد و احفاد تک کو 'وقف' کرنے کا داعیہ عطا فرما دیا۔ پھر یہ بھی سراسر اُسی کا فضل و کرم کہ اُس نے شیعیت اور اس کی جملہ شاخوں یا shades کے باطل ہونے اور مسلک اہل سنت والجماعت کے حق ہونے پر ایسا انشراحِ صدر عطا فرما دیا کہ جس میں شک وشبہ کا کوئی شائبہ تک موجود نہیں۔ اب جہاں تک اہل سنت کا تعلق ہے' جو بات علماء کرام اصولی طور پر تسلیم کرتے ہیں وہ میرا واقعی اور حقیقی حال بن چکا ہے' یعنی یہ کہ اس وسیع دائرے میں شامل جملہ ائمہ فقہ اور محدثین کرام کی علمی کاوشوں کو میں اہل سنت کا مشترک علمی اثاثہ اور ورثہ (heritage) سمجھتا ہوں۔ اور بعض مسائل میں اللہ گواہ ہے کہ کسی سہولت یا آسانی کی خاطر نہیں بلکہ محض اطمینانِ قلب کے لیے

سکہ بند حنفی موقف اور ''مُفتیٰ بہٖ'' قول کو چھوڑ کر کسی ایسی رائے پر عمل کرنے پر 'مجبور' ہو جاتا ہوں جو ہوتی بہرصورت ان پانچ مسلکوں کے دائرے کے اندر اندر ہے۔

مثال کے طور پر 'فاتحہ خلف الامام' کا مسئلہ ہے۔ ظاہر ہے کہ اس میں کسی آسانی یا سہولت کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ میرا دل کسی طرح نہیں مانتا کہ میں امام کے پیچھے سری رکعتوں میں بھی بالکل خاموش کھڑا رہوں، جبکہ ائمہ اربعہ میں سے بھی بعض —— اور خود امام ابوحنیفہؒ کے اجل تلامذہ میں سے امام محمدؒ کی رائے یہ ہے کہ سری رکعتوں میں مقتدی بھی سورۃ الفاتحہ پڑھ سکتا ہے! اس کے بالکل برعکس معاملہ مزارعت کا ہے کہ اس کے ضمن میں میں اپنے دل اور دماغ کے ہاتھوں بالکل مجبور ہوں کہ صاحبینؒ اور امام بخاریؒ اور امام احمد بن حنبلؒ کی آراء کے مقابلے میں اصلاً امام ابوحنیفہؒ اور امام مالکؒ اور تبعاً امام شافعیؒ کی آراء کی صحت کا اقرار ہی نہیں اعلان بھی کروں۔ یہی وجہ ہے کہ میں نے مولانا محمد طاسین مدظلہ کا اس موضوع پر مقالہ پندرہ اقساط میں ماہنامہ حکمت قرآن میں شائع کیا۔ بہرحال یہ ہے میری وہ مشکل جس کی بنا پر میں علماء کرام سے صرف اپنی ذات کی حد تک اس 'توسع' کی اجازت کا طلب گار رہوں۔ ورنہ اللہ گواہ ہے کہ کسی نئے مسلک کے آغاز یا نئی فقہ کی تدوین کا ارادہ تو کجا کوئی امکان بھی میرے حاشیۂ خیال تک میں موجود نہیں۔ (بلکہ یہ واقعہ عرض کر ہی دوں کہ جب مولانا اصلاحی صاحب کے اُن ''نیم شاگرد'' جن کا ذکر پہلے آ چکا ہے اور ایک دوسرے موقع پر اُن کے بھی ایک ''نیم شاگرد'' نے میری اس بات کے جواب میں کہ ''اگر حدِ رجم'' کے بارے میں مولانا اصلاحی کے موقف کو تسلیم کر لیا جائے تو معاملہ صرف حدِ رجم ہی تک محدود نہیں رہتا بلکہ ایک پورا نیا 'دین' وجود میں لانا ہوگا'' یہ کہا کہ ''ہاں یہ بالکل صحیح ہے لیکن پورا نیا دین نہیں بلکہ نئی فقہ!!'' تو واقعہ یہ ہے کہ مجھ پر کپکپی طاری ہو گئی تھی!) یہاں تک کہ جو لوگ مجھ سے بیعت جہاد کے تعلق میں منسلک ہوتے ہیں ان کے ضمن میں بھی میں نے پوری وضاحت کے ساتھ اعلان کیا ہوا ہے کہ فقہی مسلک اور تزکیہ و سلوک دونوں کے اعتبار سے وہ بالکل آزاد ہیں، جس فقہی مسلک کی چاہیں پیروی کریں اور جس سلسلے میں چاہیں اور جس بزرگ سے چاہیں 'بیعت ارشاد' میں منسلک ہو جائیں۔ میری ''اطاعت فی المعروف' کے پابند وہ صرف دعوت و اقامت دین کی جدوجہد کے ضمن میں ہیں!

الغرض راقم کی دعوت، جس کا وہ داعی ہے، وہ ہے جو اوپر بیان ہو چکی اور اپنی ذات کی حد تک میری استدعا، جس کے لیے میں علماء کرام سے 'مستدعی' ہوں یہ ہے جو ابھی بیان ہوئی۔

اس کے سوا اللہ گواہ ہے کہ نہ کوئی دعویٰ ہے نہ اِدّعاء۔ اور یہ بات میں آج کے دن تک کے لیے تو اللہ تعالیٰ کے شکر کے ساتھ پورے جزم و انشراح کے ساتھ کہہ سکتا ہوں۔ آئندہ کے لیے صرف اُسی کی حفاظت و صیانت پر بھروسہ اور تکیہ ہے۔

متذکرہ بالا دو غلط فہمیوں کی بنا پر جو صدمہ بجا طور پر ہر دو حضرات کو پہنچا اُس کے زیر اثر جو تلخ باتیں ان حضرات کے قلم سے صادر ہو گئیں، اُن پر گفتگو کو میں لا حاصل ہی نہیں مضر سمجھتا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ اگر یہ دو مغالطے رفع ہو گئے تو ان شاء اللہ ساری برہمی از خود ختم ہو جائے گی۔

البتہ ایک بات ایسی ہے کہ جس پر ان شاء اللہ کسی آئندہ صحبت میں تفصیلی گفتگو ہو گی۔ اور وہ ہے مولانا مودودی مرحوم اور تحریک جماعت اسلامی کے بارے میں میری رائے اور اُن کے ساتھ میرے تعلق کی نوعیت —— اس پر چونکہ جناب خسروی صاحب اور بعض دوسرے مکتوب نگاروں نے بھی خاصی 'طبع آزمائی' فرمائی ہے، لہٰذا اس ضمن میں تفصیلی وضاحت میرے ذمہ ہے۔

آخر میں دست بدعا ہوں:

اَللّٰھُمَّ اغْفِرْلَنَا وَلِاِخْوَانِنَا الَّذِیْنَ سَبَقُوْنَا بِالْاِیْمَانِ وَلَا تَجْعَلْ فِیْ قُلُوْبِنَا غِلًّا لِّلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا رَبَّنَا اِنَّکَ رَءُ وْفٌ رَّحِیْمٌ رَبَّنَا وَفِّقْنَا لِمَا تُحِبُّ وَتَرْضٰی وَاَعِذْنَا مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا وَمِنْ سَیِّئَاتِ اَعْمَالِنَا وَاَجِرْنَا مِنْ خِزْیِ الدُّنْیَا وَعَذَابِ الْاٰخِرَۃِ —— اٰمِیْن یَا رَبَّ الْعٰلَمِیْنَ!!

تذکرہ وتبصرہ

’میثاق‘ بابت ستمبر ۱۹۸۴ء میں ’’قرآن حکیم کے نام پر اٹھنے والی تحریکوں کے بارے میں علماء کرام کے خدشات‘‘ کے موضوع پر راقم الحروف کے خطاب کی اشاعت کے بعد تبصروں‘ تنقیدوں اور مشوروں کا جو سلسلہ ذاتی خطوط اور دینی جرائد میں شائع شدہ مضامین کی صورت میں شروع ہوا تھا‘ وہ تاحال جاری ہے۔

گزشتہ شمارے میں ہم نے بعض خطوط میں جو اہم نکات اٹھائے گئے تھے اُن کے ضمن میں بھی اپنی گزارشات پیش کر دی تھیں۔ اور خصوصاً معاصر ’الخیر‘ ملتان میں شائع شدہ دو اہم تحریروں کے مشترک نکات کے ضمن میں مفصل وضاحت پیش کر دی تھی۔ خاص طور پر تقلید جامد‘ اور اجتہاد مطلق‘ کے بین بین ’’نیم تقلید‘‘ کی جو اصطلاح راقم نے وضع کی تھی اُس کے ضمن میں کچھ راقم کے عجز بیان‘ کچھ اختصار اور کچھ بعض دوسرے اسباب سے جو مغالطے پیدا ہو گئے تھے اُن کے ازالے کی ہر ممکن کوشش کی تھی۔

حسن اتفاق سے مولانا اخلاق حسین قاسمی مدظلہٗ گزشتہ ماہ بنفس نفیس پاکستان تشریف لے آئے اور انہوں نے ’میثاق‘ میں نہ صرف اپنا مکتوب اور اس پر راقم کا شکریہ ملاحظہ فرما لیا بلکہ متذکرہ بالا موضوع پر ’الخیر‘ کے مضامین بھی پڑھ لیے اور راقم کی وضاحت بھی ملاحظہ فرمالی۔ اس پر اُن کا یہ قول فیصل راقم کے لیے بہت ہی حوصلہ افزائی کا موجب ہوا ہے‘ اللہ تعالیٰ انہیں جزائے خیر عطا فرمائے:

> ’’ڈاکٹر صاحب نے اس نزاعی خطاب میں تفصیلی طور پر نہ سہی‘ اجمالی طور پر جس آرزو کا اظہار کیا ہے اُس سے بعض علماء کرام کو شکایت پیدا ہوئی۔ ڈاکٹر صاحب موصوف نے ’میثاق‘ نومبر کے پرچے میں اس غلط فہمی کو دُور کرتے ہوئے جو کچھ لکھا ہے وہ علماءِ حق کو مطمئن کرنے کے لیے کافی ہے۔ مجھے امید ہے کہ تقلید اور نیم تقلید جیسے جزوی مسائل کو دعوتِ قرآنی کے بنیادی مشن کے مقابلے میں اہمیت نہیں دی جائے گی۔
>
> پاکستان کے اندر اس وقت جزوی مسائل میں مختلف مکاتب فکر کے علماء جس طرح آپس میں گتھم گتھا ہیں اور مخالف شریعت عناصر اس کو ہوا دے کر علماء دین کا مذاق اڑوا رہے ہیں اور اس حرب عقائد سے وہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ ملک میں شرعی نظام قائم کرنے کا مطلب اس ’’لڑاکو‘‘ طبقے کے ہاتھ میں ملک کی باگ ڈور دینا ہے۔ اس کا تقاضا ہے کہ ڈاکٹر صاحب کے فقہی موقف کی حوصلہ افزائی کی جائے۔ موصوف کا مقصد یہی ہے کہ جزوی اور فروعی اختلافات کی شدت اور ہنگامہ آرائی کم سے کم ہو جائے اور ملت کی پوری طاقت وتوجہ دین برحق کی اصولی دعوت پر مرکوز ہو جائے۔‘‘

حضرت مولانا اخلاق حسین قاسمی مدظلہٗ امام الہند حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے والد ماجد کے نام نامی سے معنون مدرسے کے مہتمم اور صدر مدرس ہیں جو نئی دہلی میں واقع مشہور قبرستانِ ’’مہندیاں‘‘ میں واقع ہے‘ جہاں نہ صرف شاہ ولی اللہؒ اور ان کے تمام جلیل القدر فرزند بلکہ اس عظیم خانوادے کی اور بھی متعدد عظیم ہستیاں محو استراحت ہیں[1] راقم کے نزدیک اسی تعلق اور نسبت کا پرتو کامل ہے جو مولانا قاسمی مدظلہٗ کی مندرجہ بالا سطروں میں جھلک رہا ہے آخر کیسے ممکن تھا کہ ’’الانصاف فی بیان سبب الاختلاف‘‘ ایسی عظیم کتاب کے عظیم مصنف کے ساتھ اس قدر قریبی تعلق بھی اپنے اثرات نہ پیدا کرتا۔

بہرحال ہمیں قوی امید ہے کہ نہ صرف معاصر ’الخیر‘ کے مدیر گرامی مولانا محمد ازہر اور موقر مضمون نگار مولانا عبدالقیوم حقانی بلکہ وہ تمام علماء کرام جن کی نگاہوں سے ہماری یہ گزارشات گزری ہوں گی ہماری وضاحتوں سے پوری طرح مطمئن ہو گئے ہوں گے!

گزشتہ ماہ کی گزارشات کے اختتام پر عرض کیا گیا تھا کہ ’’البتہ ایک بات ایسی ہے کہ جس پر آئندہ کسی صحبت میں تفصیلی گفتگو ہو گی۔ اور وہ ہے ’’مولانا مودودی مرحوم اور تحریک جماعت اسلامی کے بارے میں میری رائے اور اُن کے ساتھ میرے تعلق کی نوعیت‘‘—— اس

---

(۱) الحمد للہ کہ اپریل ۱۹۸۴ء میں راقم الحروف کو دہلی میں نہ صرف یہ کہ مدرسہ حسین بخش کی اُس تاریخی جامع مسجد میں خطاب جمعہ کا موقع ملا‘ جہاں کبھی سحبان الہند مولانا احمد سعید دہلویؒ وعظ فرمایا کرتے تھے اور اب مولانا قاسمی مدظلہٗ خطابت کے فرائض سرانجام دیتے ہیں بلکہ مدرسہ رحیمیہ کی زیارت اور اس کے ساتھ خانوادۂ ولی اللہیؒ کے قبرستان میں حاضری کی سعادت بھی حاصل ہوئی!

سلسلے میں ارادہ تو یہی تھا کہ اسی شمارے میں یہ قرض ادا ہو جائے لیکن ایک طرف تو یکم دسمبر ۱۹۸۴ء سے لاہور میں تنظیم اسلامی کے زیر اہتمام ایک چالیس روزہ تربیتی پروگرام جاری ہے جس میں راقم کی بھی شدید مصروفیت رہی' دوسری طرف یہ موضوع ایسا ہے کہ جس کے ضمن میں اختصار غلط فہمیوں کا باعث بن سکتا ہے' اور ضرورت ہے کہ بات مفصل اور پوری طرح کھل کر کی جائے تا کہ اس مسئلے میں راقم کے طرزِ فکر میں اگر کوئی غلطی ہو تو وہ بھی پوری وضاحت کے ساتھ ان علماء کرام کے سامنے آجائے جنہیں راقم کے کام سے فی الجملہ دلچسپی اور ہمدردی ہے تا کہ وہ اس غلطی کے ازالے میں میری مدد کر سکیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس معاملے میں میں از خود بھی تفصیل کے ساتھ لکھنے کی ضرورت محسوس کر رہا تھا۔ چنانچہ ۱۹۸۲ء میں میں نے ''مولانا مودودی مرحوم اور میں'' کے عنوان سے ایک سلسلۂ مضامین شروع کیا تھا لیکن افسوس کہ اُن ہی اسباب کی بنا جن کی تفصیل گزشتہ شمارے میں عرض کی جا چکی ہے وہ سلسلہ جاری نہ رہ سکا۔ بہر حال اب ان شاء اللہ راقم اپنی پہلی فرصت میں نہ صرف اُس کی تکمیل کی کوشش کرے گا' بلکہ مولانا مرحوم کے 'فکر' اور زندگی کے مختلف ادوار میں اُن کے اختیار کردہ 'طریق کار' کے بارے میں اپنی رائے تفصیلاً پیش کرے گا۔ اللہ سے دُعا ہے کہ وہ راقم کو اس ارادے کی تکمیل کی توفیق عطا فرمائے!

نومبر ۱۹۸۴ء کے میثاق میں ''مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم''، جمعیت علماء ہند اور حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسنؒ کے عنوان سے میری ایک تحریر پر کہروڑ پکا ضلع ملتان سے ایک عالم دین مولانا اللہ بخش ایاز ملکانوی کے دو خطوط اور اُن کا وہ ملخص جو معاصر 'الخیر' ملتان میں شائع ہوا تھا' راقم کے تفصیلی جواب کے ساتھ ہدیۂ ناظرین کیا گیا تھا۔ اس پر ایک تو تفصیلی گرفت حضرت مولانا اخلاق حسین قاسمی مدظلہ' نے فرمائی ہے جو اس پرچے میں شائع کی جا رہی ہے۔ اُس کے ضمن میں ہماری گزارشات ان شاء اللہ آئندہ شمارے میں پیش کی جائیں گی۔

البتہ اُسی سلسلہ میں کچھ اختصار اور کچھ روا روی میں نکلے ہوئے چند الفاظ سے ایک وسیع حلقے میں جو بدگمانی پیدا ہوئی ہے اُس کا ازالہ فوری طور پر ضروری ہے۔ وہ بدگمانی راقم کے ان الفاظ سے پیدا ہوئی ہے:

''(۲) پھر کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ حضرت شیخ الہندؒ طبقہ علماء کی وہ آخری شخصیت تھے جنہوں نے جو کام بھی کیا' اپنے بل بوتے پر کیا۔ جس کا اصل نقشہ کار بھی ان ہی کے

ذہن کی پیداوار تھا اور اس پر عملی جدوجہد کی قیادت و رہنمائی بھی خود ان ہی کے ہاتھ میں تھی۔ ان کے بعد سے برصغیر میں قومی اور عوامی سطح پر علماء کرام کی مختلف تنظیموں کی حیثیت عظیم تر اور سیکولر مزاج سیاسی تحریکوں کے ضمیموں کی رہی ہے۔ چنانچہ حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ جیسی عظیم شخصیت کی قیادت کے باوصف جمعیت العلماء ہند کی حیثیت کانگریس کے ضمیمے سے زیادہ نہ تھی۔ اسی طرح مولانا شبیر احمد عثمانیؒ ایسی نابغہ شخصیت کی قیادت کے باوصف جمعیت علماء اسلام کی حیثیت مسلم لیگ کے ضمیمے سے زیادہ نہ تھی۔ اور یہی صورت حال آج تک جاری ہے کہ اس وقت بھی حلقۂ دیوبند کے سیاسی اور عوامی مزاج کے حامل علماء کرام اپنی تمام تر جلالت شان اور مرتبہ و مقام کے باوصف یا موجودہ فوجی آمریت کا ضمیمہ ہیں یا ایم آر ڈی کا۔ اور یا پھر جماعت اسلامی کے مانند ''نیم دروں نیم بروں'' بلکہ صحیح تر الفاظ میں 'نہ ادھر نہ ادھر' کا مصداق بن کر رہ گئے ہیں اور کم و بیش یہی حال بریلوی مکتبہ فکر اور اہل حدیث حضرات کی قیادت کا ہے۔''

ان الفاظ پر مولانا شبیر احمد عثمانیؒ کے عقیدت مند اور اُن کے سیاسی موقف کے حامی حضرات کی جانب سے تو کوئی ردِّ عمل راقم کے علم میں نہیں آیا البتہ مولانا سید حسین احمد مدنیؒ کے حلقۂ ارادت و عقیدت سے وابستہ اور اُن کی سیاسی حکمت عملی سے اتفاق رکھنے والے حضرات کی جانب سے شدید ردِ عمل ظاہر ہوا ہے۔ چنانچہ اس ضمن میں متعدد حضرات نے مولانا سید حامد میاں مدظلہ کے نام شکایتی خطوط تحریر فرمائے ہیں کہ ''آپ ڈاکٹر اسرار احمد کے سرپرست اور اُس کی قائم کردہ 'تنظیم اسلامی' کے مستشارین میں سے ہیں اور اس نے مولانا حسین احمد مدنیؒ اور جمعیت علماء ہند کو ''کانگرس کا ضمیمہ'' قرار دیا ہے۔ جبکہ آپ نہ صرف یہ کہ ذہناً اور قلباً ''مدنی'' ہیں بلکہ مولانا حسین احمد مدنیؒ کے خلیفہ مجاز بھی ہیں!''(۱) چنانچہ مولانا نے کمالِ شفقت کے ساتھ بعض خطوط بھی راقم کے حوالے کر دیے اور یہ ہدایت بھی فرما دی کہ اس ضمن میں مناسب وضاحت راقم الحروف خود ہی کر دے!

اس سلسلے میں گزارش ہے کہ:

(۱) راقم کے نزدیک مولانا سید حسین احمد مدنیؒ اور مولانا شبیر احمد عثمانیؒ دونوں ہی (بقول مولانا اخلاق حسین قاسمی مدظلہ') ''حضرت شیخ الہندؒ کی جماعت'' سے تعلق رکھتے ہیں۔ اور دونوں کا خلوص و اخلاص' تقویٰ و تدین اور للّٰہیت' و فی اللّٰہیت' ہر شک و شبہ سے بالا'

---

(۱) یہ ترجمانی ہے' اقتباس نہیں' گویا روایت بالمعنیٰ ہے باللفظ نہیں!

اور دونوں کا علم وفضل کے اعتبار سے مقام ومرتبہ ہر معیار اور پیمانے سے نہایت اعلیٰ وارفع ہے۔

(۲) جہاں تک سیاسی حکمت علمی کا تعلق ہے اُس کے اعتبار سے راقم کو مولانا شبیر احمد عثمانیؒ کے موقف سے اتفاق اور حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ کے موقف سے اختلاف ہے۔ راقم کے نزدیک مولانا مدنیؒ نے اپنی خودنوشت سوانح ''نقش حیات'' میں اپنے سیاسی موقف کے بارے میں جو یہ فرمایا ہے کہ یہ تحریک شہیدینؒ کا تسلسل ہے تو یہ بات صد فی صد درست ہے' لیکن ایک پوری صدی گزر جانے کے باعث حالات میں مختلف اعتبارات سے جو تبدیلی آ گئی تھی اُس کے پیش نظر اس میں تبدیلی کی ضرورت تھی' جس کے آثار حضرت شیخ الہندؒ کے خطبہ صدارت' اجلاس جمعیت علماء ہند' نومبر ۱۹۲۰ء میں موجود ہیں۔ اور راقم کی رائے یہ ہے کہ اگر حضرت شیخ الہندؒ کو اللہ مزید زندگی عطا فرماتا تو اُن کی سیاسی حکمت علمی میں وہ تبدیلی لازماً آتی اور اس صورت میں برصغیر پاک وہند میں مسلمانوں کی ملی نشاۃ ثانیہ کے' قائد اعظم' لازماً وہی ہوتے۔ لیکن 'ماشاء اللّٰہ کان و ما لم یشاء لم یکن!''

(۳) بایں ہمہ مولانا مدنیؒ کے خلوص واخلاص اور علم وفضل بلکہ 'مجاہدانہ کردار' کی عظمت کا جو نقش راقم کے دل پر قائم ہے سیاسی حکمت عملی کے ضمن میں اس اختلاف رائے کا اُس پر ہرگز کوئی اثر نہیں ہے۔ اور اگرچہ سیاسی موقف کے ضمن میں اتفاق اور خصوصاً حضرت شیخ الہندؒ کے ترجمہ قرآن پر جو حواشی مولانا شبیر احمد عثمانیؒ نے تحریر فرمائے' اُن سے پورے ثلث صدی کے مسلسل استفادے کی بنا پر اُن کی ذات سے ایک خصوصی 'احسان مندی' کا تعلق راقم کو اضافی طور پر حاصل ہے۔ تاہم جہاں تک میرے دل کا تعلق ہے اُس پر مولانا مدنیؒ کے 'عظمت کردار' کا نقش مقابلتاً بہت زیادہ گہرا ہے۔ گویا اگر میں یہ کہوں کہ میں ذہناً 'عثمانی' لیکن قلباً 'مدنی' ہوں تو یہ کیفیت واقعی کی غلط تعبیر نہ ہوگی۔ (اس ضمن میں میں اس وقت کچھ زیادہ عرض نہیں کرنا چاہتا اس لیے کہ ہوسکتا ہے کہ بعض ناقدین اسے وقتی سخن سازی سے تعبیر فرمائیں۔ ان شاء اللہ جلد ہی میں میثاق میں شائع شدہ اپنی بیس سال کی تحریروں کے متعلقہ اقتباسات پیش کر دوں گا)

(۴) راقم نے ان دونوں بزرگوں اور ان کی جمعیتوں کے ضمن میں ''ضمیمہ'' کا لفظ ان کی شخصیتوں' یا اُن کی نیتوں' یا اُن کے اپنے نقشہ ہائے کار کے اعتبار سے نہیں بلکہ برصغیر کی

سیاسی صورت حال کے واقعی اور معروضی مطالعے اور نتائج کار کے اعتبار سے استعمال کیا ہے۔ یعنی اس واقعہ کے اظہار اور اس حقیقت کی تعبیر کے لیے کہ سیاسی میدان میں برصغیر کے مسلمانوں پر علماء کرام کی گرفت کمزور ہوتی چلی گئی۔ اور بالخصوص جہادِ حریت اور تحریک استخلاصِ وطن کے میدان میں حضرت شیخ الہندؒ کے براہ راست جانشین یعنی حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ اور اُن کی زیر قیادت جمعیت علماء ہند' کا اثر ورسوخ دن بدن کمزور سے کمزور تر ہوتا چلا گیا تا آنکہ واقعات ونتائج کے اعتبار سے اُن کی حیثیت کانگریس کے ''ضمیمے'' سے زیادہ نہ رہی —— واضح رہے کہ اس پہلو سے اگرچہ کہا جا سکتا ہے کہ مولانا شبیر احمد عثمانیؒ کی حکمت عملی بالفعل کامیاب رہی' لیکن چونکہ مسلم لیگ کی قیادت میں اُن کا مقام بھی ثانوی وضمنی تھا' لہٰذا راقم نے خود انہیں اور ان کی جمعیت علماء اسلام کو بھی مسلم لیگ کا ''ضمیمہ'' ہی قرار دیا ہے۔

بہر حال یہ معاملہ واقعات اور نتائج کے اعتبار سے ہے نہ کہ ان کی 'ذوات' اور 'نیات' کے اعتبار سے!

اُمید ہے کہ ہماری اس وضاحت سے وہ بدگمانی رفع ہو جائے گی جو اُس حلقے میں پیدا ہو گئی ہے جس سے راقم کو نہایت گہرا قلبی تعلق ہے' **واللّٰہ علی ما اقول شہید**[1]

حال ہی میں ماہنامہ 'بینات' کراچی کے ادارتی صفحات میں ایک مفصل تبصرہ تحریر فرمانا شروع کیا ہے مدیر گرامی مولانا محمد یوسف لدھیانوی صاحب نے' اس کی تا حال پہلی قسط شائع ہوئی ہے اور اندازہ ہوتا ہے کہ مضمون طویل ہوگا۔ لہٰذا اس کے ضمن میں بہتر یہی ہے کہ مضمون پورا شائع ہو جائے تب ہی اپنی گزارشات پیش کی جائیں۔

(۱) اس ضمن میں تفاصیل تو ان شاء اللہ بعد میں آ ہی جائیں گی۔ ایک واقعہ کا اظہار موقع کی مناسبت سے مفید رہے گا اور وہ یہ کہ پروفیسر یوسف سلیم چشتی مرحوم ومغفور نے جو ایک طویل تحریر ''مولانا مدنیؒ کی شان میں بے ادبی اور گستاخیوں پر توبہ نامہ'' کے طور پر تحریر کی تھی وہ سال بھر سے زیادہ عرصہ تک خدام الدین کے دفتر میں پڑی رہی اور اسے شائع کرنے کی ادارہ خدام الدین کو ہمت نہ ہوئی یا اس وقت کے حالات کے پیش نظر اسے مناسب نہ سمجھا گیا۔ لیکن اسے شائع کیا پوری آب وتاب کے ساتھ راقم الحروف نے 'میثاق' میں جہاں سے بعد میں نقل کیا 'انوارِ مدینہ' نے!

سردست مولانا موصوف کی خدمت میں صرف اس قدر عرض ہے کہ وہ یہ ہرگز خیال نہ فرمائیں کہ ان کے بعض 'تیکھے' جملوں کے باوصف ہمیں اُن سے اس تبصرے پر کوئی ملال ہوا ہے یا ہوگا، ہمیں یقین ہے کہ وہ یہ کام للہ وفی اللہ اور خالصۃً ہماری خیرخواہی کے جذبے سے کر رہے ہیں اور ان شاء اللہ جیسے انہوں نے راقم کی زبان کی ایک غلطی پکڑی ہے (جس پر راقم ان کا ممنون ہے) اُس طرح راقم کی سوچ میں بھی جس کجی کی نشان دہی وہ کریں گے اُس سے ہم حتی المقدور استفادہ کریں گے۔ اور کوئی جوابی وضاحت پیش کریں گے تو وہ بھی بغرضِ اصلاح ہی ہوگی۔

اطلاع متعلقہ

حلقہ مستشارین تنظیم اسلامی

(۱) الحمد للہ کہ مولانا اخلاق حسین قاسمی مہتمم وشیخ التفسیر، جامعہ رحیمیہ، مرکز حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ، خواجہ میر درد روڈ، نئی دہلی (بھارت) نے تنظیم اسلامی کے حلقہ مستشارین میں باضابطہ شمولیت قبول فرمالی ہے!

(۲) مولانا سید وصی مظہر ندوی، مہتمم جامعہ اسلامیہ ٹھنڈی سڑک، حیدرآباد (سندھ) کو ان کے ایسی تنظیم کے ساتھ وابستگی اختیار کرلینے کی بنا پر جس کے روح رواں اور ناظم 'رجم' کو اسلامی حد تسلیم نہیں کرتے، بصد رنج و افسوس تنظیم اسلامی کے حلقہ مستشارین کی رکنیت کی ذمہ داری سے سبکدوش کردیا گیا ہے۔

المعلن: (چودھری) غلام محمد، قیم تنظیم اسلامی، پاکستان

باب ہفتم

'جماعت شیخ الہندؒ'

مولانا ابوالکلام آزاد

اور

ڈاکٹر اسرار احمد

کے بارے میں

مولانا اخلاق حسین قاسمی مدظلہٗ

مہتمم وشیخ التفسیر' جامعہ رحیمیہ' دہلی

کے فرمودات

اور ان کے بارے میں

توضیحی گزارشات

ڈاکٹر اسرار احمد کی اپیل
اور علمائے دیوبند

ازقلم: **مولانا اخلاق حسین قاسمی مدظلّہ**

(''میثاق'' جنوری ۱۹۸۵ء)

مولانا اخلاق حسین قاسمی مدظلّہ

کے فرمودات کے بارے میں گزارشات

ازقلم: **ڈاکٹر اسرار احمد**

(''میثاق'' فروری ۱۹۸۵ء)

مولانا محمد منظور نعمانی مدظلّہ کی تالیف:

''مولانا مودودی کے ساتھ میری رفاقت کی سرگزشت

اور اب میرا موقف'' — کا پہلا باب

'تحریک خلافت اور اس کے اثرات'

(''میثاق'' فروری ۱۹۸۵ء)

اخلاق حسین قاسمی دہلوی، مہتمم جامعہ رحیمیہ

ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کی اپیل

اور — علمائے دیوبند

ہندوستان میں دعوت قرآنی کی بنیاد حضرت امام شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے ڈالی اور ان کے صاحبزادگان نے اسے پروان چڑھایا۔

قرآن کریم نے اس دعوت کو جہادِ کبیر قرار دیا ہے:

﴿وَ جَاهِدْهُمْ بِهٖ جِهَادًا كَبِيْرًا۝﴾

قرآن کریم جس فطری اور وجدانی اسلوب میں اسلام کی دعوت دیتا ہے وہ بقول شاہ ولی اللہ انسان کی فطرتِ سلیم کو اپیل کرتی ہے اور عقل سلیم کی پیاس بجھاتی ہے۔

شاہ ولی اللہ کے بعد شاہ صاحب کی جماعت نے اس دعوت کے سلسلہ کو جاری رکھا۔

مولانا عبیداللہ سندھی نے دعوتِ قرآنی کو جاری رکھنے کے لیے باقاعدہ تنظیم بنائی، مولانا ابوالکلام آزاد نے اپنی جادو بھری تحریر وتقریر سے دعوت بالقرآن کو رواج دیا۔

مولانا احمد سعید صاحب دہلویؒ اور مولانا احمد علی صاحب لاہوریؒ نے قرآن کریم کی تعلیمات اور اس کے پیغام کی ترویج و اشاعت کو اپنی تبلیغی اور واعظانہ سرگرمیوں میں پوری اہمیت دی۔ کیونکہ اس جماعت کے شیخ مولانا محمود حسن صاحب شیخ الہندؒ نے مالٹا کی اسارت سے واپس آ کر اپنی جماعت کو براہِ راست قرآن کریم سے وابستہ ہونے کی ہدایت فرمائی تھی اور امام شاہ ولی اللہؒ کے خصوصی مشن کو آگے بڑھانے کی طرف متوجہ کیا تھا۔

علمائے دیوبند کے فیض یافتہ عالم

مولانا ابوالاعلیٰ صاحب مودودیؒ نے بھی اقامت دین کی خاص جدوجہد میں قرآن کریم کو اہمیت دی۔

قرآنِ کریم کی دعوت ایک اصولی دعوت ہے اور اس دعوت کی اہمیت یہ ہے کہ اُمت کے تمام فرقے ہر قسم کے فقہی اور اعتقادی اختلافات کے باوجود اس مشن پر متحد ہو کر اور کندھے

سے کندھا ملا کر جدوجہد کر سکتے ہیں۔

دعوت قرآنی کی تحریک کو چلانے والے قائدین اور کارکنوں کا یہ فرض ہوتا ہے کہ وہ اس اصولی دعوت کے اہم تقاضوں کو مدنظر رکھیں اور خاص طور پر اس تقاضے کو پورا کریں کہ اعتقادی اور فقہی جزوی اختلافات کی بحث کو اس تحریک کے دائرہ میں داخل نہ ہونے دیں۔

شاہ ولی اللہؒ کے ہاں فقہی اختلافات میں جو توسع نظر آتا ہے اور جس توسع پر خاص کر حضرت شاہ اسماعیل شہیدؒ نے زور دیا ہے، اس کا مقصد یہی ہے۔

شاہ ولی اللہؒ سے پہلے حضرت مجدد صاحبؒ کی تحریک ترویج سنت اور تردید بدعات کے اندر بھی فقہی اختلافات میں یہی وسعت فکر ونظر ملتا ہے۔

حضرت مجدد صاحب ایک مکتوب میں فرماتے ہیں:

''باوجود التزام ایں مذہب مرا با امام شافعیؒ گویا محبت ذاتی است و بزرگ مے دانم لہٰذا در بعض اعمال نافلہ تقلید مذہب او مے نمایم'' (مکتوب ۵۵، دفتر دوم، ص ۱۴)

''باوجود اس کے کہ میں حنفی مسلک کی پابندی کرتا ہوں مجھے امام شافعیؒ سے ذاتی محبت ہے اور میں انہیں بزرگ مانتا ہوں اور اسی لیے بعض عبادات میں ان کے مسلک کی پیروی کرتا ہوں۔''

صاحب اتحاف نے لکھا ہے کہ شیخ عبد الحق صاحب محدث دہلویؒ اور حضرت مجدد صاحبؒ کے درمیان اختلافات کی ایک بڑی وجہ یہ تھی کہ محدث صاحب کو فقہی مذہب میں بے حد تشدد تھا اور مجدد صاحب مطلق اتباع سنت اور بدعات کی تردید پر زور دیتے تھے (ص ۱۶۲)

☆☆☆

پاکستانی اہل علم میں ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے دین برحق کے غلبہ اور اقامت کے لیے قرآن کریم کی اصولی دعوت کا مشن اختیار کیا ہے۔

ڈاکٹر صاحب کو نہ عالم ہونے کا دعویٰ ہے اور نہ فقیہہ ومتکلم اور شیخ طریقت کا ادعا ہے۔

خدا تعالیٰ نے موصوف کو اپنے مقدس کلام کا بڑا اچھا فہم عطا کیا ہے اور اس کلام عظیم کے اصولی پیغام کو جدید استدلالی اسلوب میں پیش کرنے کی صلاحیت سے نوازا ہے۔

ڈاکٹر صاحب جدید تعلیم یافتہ آدمی ہیں اور موصوف نے قرآن کریم کا گہرا مطالعہ کیا ہے اور وہ اس تحریک میں اپنا تن من دھن سب کچھ لگا چکے ہیں۔

ڈاکٹر صاحب کے سامنے اقامت دین کی تحریک کے تمام دور موجود ہیں اور جماعت

اسلامی کی تحریک میں شامل رہ کر تمام اتار چڑھاؤ سے موصوف آگاہ ہوئے ہیں۔

ڈاکٹر صاحب نے دعوت قرآنی اور اقامت حق کی دعوت سے فقہی اختلافات کو دور رکھا ہے۔ وہ اہل علم کو فقہی اور اجتہادی مسائل میں وسعت فکر ونظر کی دعوت ضرور دیتے ہیں' معتدل راستہ اختیار کرنے کی اپیل کرتے ہیں جو آج کے حالات کا شدید تقاضا ہے۔ لیکن عوام کو وہ یہی مشورہ دیتے ہیں کہ اتباع سنت کی نیت سے ان کے لیے عافیت اسی میں ہے کہ وہ ایک فقہ کی پیروی کریں (میثاق' نومبر' ص ۴۷)

لیکن ایک تقریر میں ڈاکٹر صاحب نے ضمناً اجتہادی اور فقہی بحث میں ضرورت سے زیادہ دلچسپی کا مظاہرہ کیا اور اپنے فقہی مسلک کے بارے میں اپنے لیے نیم مقلد کی تعبیر اختیار کی اور مستقبل کے لیے یہ آرزو کی کہ فقہی اختلافات میں اتحادِ عمل کی کوئی سبیل نکل آئے۔

میرے خیال میں ڈاکٹر صاحب سے سہو ہوا۔ موصوف جس احتیاط کے ساتھ کام کر رہے ہیں وہ احتیاط اس تقریر میں قائم نہ رہ سکی۔

موصوف کو اچھی طرح معلوم ہے اور ذاتی طور پر تجربہ ہے کہ مولانا مودودی صاحب نے تحریک اقامت دین کے امیر وقائد کی حیثیت سے فقہی مسائل میں اِدھر اُدھر ہاتھ مار کر تحریک کو نقصان پہنچایا۔

وہ یقیناً صاحب علم آدمی تھے فقہی مسائل میں بھی اچھی بصیرت کے حامل تھے' مگر ایک اصولی اور بنیادی تحریک کے داعی کے لیے فقہی مسائل کے اختلافات میں پڑنا اور ہر مسئلہ میں اپنی منفرد راہ دکھانا کسی طرح مناسب نہیں تھا۔

ڈاکٹر صاحب نے اس نزاعی خطاب میں تفصیلی طور پر نہ سہی اجمالی طور پر جس آرزو کا اظہار کیا ہے' اس سے بعض علماء کو شکایت پیدا ہوئی۔

ڈاکٹر صاحب موصوف نے میثاق نومبر کے پرچہ میں اس غلط فہمی کو دور کرتے ہوئے جو کچھ لکھا ہے وہ علماءِ حق کو مطمئن کرنے کے لیے کافی ہے۔

مجھے امید ہے کہ تقلید اور نیم تقلید جیسے جزوی مسائل کو دعوتِ قرآنی کے بنیادی مشن کے مقابلہ میں اہمیت نہیں دی جائے گی۔

پاکستان کے اندر اس وقت جزوی مسائل میں مختلف مکاتب فکر کے علماء جس طرح آپس میں گتھم گتھا ہیں اور مخالف شریعت عناصر اس کو ہوا دے کر علمائے دین کا مذاق اڑا رہے ہیں اور اس حربِ عقائد سے وہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ ملک میں شرعی نظام قائم کرنے کا مطلب اس

لڑاکو طبقہ کے ہاتھ میں ملک کی باگ ڈور دینا ہے۔ اس کا تقاضا ہے کہ ڈاکٹر صاحب کے فقہی موقف کی حوصلہ افزائی کی جائے۔ موصوف کا مقصد یہی ہے کہ جزوی اور فروعی اختلافات کی شدت اور ہنگامہ آرائی کم سے کم ہو جائے' اور ملت کی پوری طاقت وتوجہ دین برحق کی اصولی دعوت پر مرکوز ہو جائے۔

البتہ اس بحث کے ساتھ ڈاکٹر صاحب نے ایک دوسرے بڑے جھگڑے کو چھیڑ دیا ہے اور امامت اور امارت کا مسئلہ کھڑا کر دیا ہے۔

اور ساتھ ہی اس کا جوڑ مولانا ابوالکلام آزادؒ کی امامت کے بارے میں حضرت شیخ الہندؒ کی تجویز سے لگا دیا ہے' گویا ڈاکٹر صاحب نے بھڑوں کے چھتے کو چھیڑ دیا ہے۔

اس بحث کو چھیڑتے ہوئے ڈاکٹر صاحب جذبات میں آ گئے اور موصوف کو اتنا خیال نہ رہا کہ جس ہستی (مولانا آزاد) کی امامت کے مسئلہ کو وہ سند کے طور پر علمائے دیوبند کے سامنے پیش کر رہے ہیں' اس دانش مند ہستی نے امامت کی تجویز کو حالات کے پیش نظر کس طرح لپیٹ کر رکھ دیا اور ساری زندگی مولانا مرحوم اسے زبان وقلم پر نہ لائے۔

امامت کی تجویز کی مخالفت گھر میں ہوئی ان رفقاء کی طرف سے ہوئی جو مولانا آزاد کی رفاقت میں کام کر رہے تھے۔ مگر مولانا نے حالات کے تیور دیکھ کر ہمیشہ کے لیے خاموشی اختیار کر لی' کوئی شکوہ وشکایت زبان پر نہیں لائے۔

مسلم جماعتوں کے تبصرہ میں ڈاکٹر صاحب نے غصہ سے کام لیا ہے' تحمل سے کام نہیں لیا۔

موصوف کے نزدیک حضرت شیخ الہندؒ اپنے دَور کے مجدد تھے' شیخ الہند نے اپنے بعد اپنے شاگردوں کی ایسی جماعت چھوڑی جو علم وفضل اور تقویٰ وجہاد میں نابغہ روزگار تھی۔ لیکن اس کے ساتھ ڈاکٹر صاحب کے خیال میں شیخ الہند کے شاگردوں نے سیکولر جماعتوں کا ضمیمہ بن کر آزادیٔ ہند کی لڑائی میں حصہ لیا۔

حالانکہ تاریخ کا ایماندارانہ مطالعہ یہ بتاتا ہے کہ مشترک جدوجہد کا منصوبہ شیخ الہند اسارت مالٹا سے اپنے ساتھ لائے تھے۔

ترکی قائدین نے شیخ کو یہ مشورہ دیا کہ ہندوستانی مسلمان تنہا جدوجہد کر کے انگریزوں کو ہندوستان سے نہیں نکال سکتے' جیسا کہ اب تک وہ ناکام رہے ہیں۔

اسی تجویز کے مطابق شیخ الہندؒ کے مایہ ناز شاگرد مولانا حسین احمد مدنیؒ' مولانا محمد انور شاہ صاحب کشمیریؒ' مفتی محمد کفایت اللہ' مولانا ابوالمحاسن سجاد بہاریؒ مولانا احمد علی لاہوریؒ نے

جمعیت علمائے ہند کے پلیٹ فارم سے آزادی کی جنگ میں قائدانہ طور پر حصہ لیا۔ تابعانہ اور ضمیمہ بن کر حصہ لینا ان حضرات کی خودداری اور علم وفضل کی توہین تھا، مکمل آزادی کی تجویز سب سے پہلے جمعیت علمائے ہند نے منظور کی۔ آزادی کی تحریکات میں ہر قسم کی قربانیوں کا حصہ اپنی تعداد کے لحاظ سے مسلمانوں کا زیادہ نکلتا ہے۔

مشترک جدوجہد کے ساتھ ساتھ ہندوستان میں ملت اسلامیہ کے تشخص کی حفاظت کے محاذ پر جماعت شیخ الہند نے بھرپور جدوجہد جاری رکھی۔ مولانا حسین احمد مدنیؒ نے ۱۹۴۵ء کے اجلاس جمعیت علمائے ہند منعقدہ لاہور کے خطبہ میں صاف صاف اعلان کیا کہ مشترک جدوجہد سے حاصل ہونے والی آزادی اور جمہوری حکومت ہماری آخری منزل نہیں، بلکہ اس آزادی سے آخری منزل (اسلامی نظامِ حیات کا قیام) ہمارے لیے آسان ہوجائے گی۔

اس خطبہ میں مولانا مدنی نے اسلامی نظامِ حیات کے بنیادی اصولوں کی مکمل وضاحت فرمائی۔

یہ دَور جدوجہد آزادی کے شباب کا دَور تھا اور شیخ الہند کی جماعت لگی لپٹی اور گول مول بات کہنے کے بجائے اپنا مدعیٰ صاف صاف پیش کررہی تھی۔

جماعت شیخ الہند نے اسی دَور میں مخالف اسلام تحریکوں کا مردانہ وار مقابلہ کیا۔ انگریز حکومت کے کارندوں نے جماعت شیخ الہند کو بدنام کرنے میں کوئی کسر نہ کی۔ سیاسی اتحاد کو مغربی تصور کے مطابق نیشنل ازم کے مترادف قرار دیا گیا۔ اور متحدہ قومیت کے لفظ سے فائدہ اٹھایا گیا، لیکن بہت جلد دنیا نے دیکھا کہ آزادی کے بعد مصائب ومشکلات میں گھری ہوئی ملت اسلامیہ ہند کے ملی اور ثقافتی تحفظ کی جدوجہد میں جماعت شیخ الہند مصروف جہاد ہے جبکہ بڑے بڑے بہادر قائدین اور اسلام پسند رہنمایانِ کرام ہجرت کے نام پر ہندوستان چھوڑ چکے تھے۔

تقسیم ہند کے بعد اصل نصب العین کے لیے جدوجہد کرنے کا منصوبہ خطرہ میں پڑ گیا اور اقامت دین کے لیے براہِ راست جدوجہد کے بجائے مسلمانوں کے وجود کی حفاظت کا اہم مسئلہ سامنے آگیا۔

جمعیت علمائے ہند کے مشہور رہنما مولانا ابوالمحاسن سجاد بہاریؒ نے تحریک آزادی کے دَور میں حکومت الٰہیہ کے نام سے ایک منصوبہ تیار کیا تھا اور یہ الہلال اور البلاغ کے پیغام کی صدائے بازگشت تھی۔ مولانا کی اس موضوع پر سب سے پہلی کتاب ہے۔

اس منصوبہ کے مطابق ہندوستان کے بعض حصوں، بہار اڑیسہ وغیرہ میں امارتِ شرعیہ قائم کردی گئی تھی، جو آج تک قائم ہے۔

یہ امارتِ شرعیہ ایک نمونہ تھا اس اصل نصب العین کا، جس کا اعلان مولانا حسین احمد مدنیؒ نے ۱۹۴۵ء کے خطبہ جمعیت علماء میں کیا تھا اور جماعت شیخ الہند کا حقیقی نصب العین تھا۔

آزادی کے بعد جماعت شیخ الہند کے یہی مردمجاہد تھے جو بڑھاپے اور بیماری کی حالت میں شہرشہر اور گاؤں گاؤں پھر کر مسلمانوں کو تسلی دے رہے تھے، اور ہندوفرقہ پرستی کا مقابلہ کررہے تھے۔

جبکہ پاکستان کے مذہبی قائدین پاکستان میں حکومت الٰہیہ کے قیام کی قیمت پر ہندوستان کے مسلمانوں کو گیتا کی حکومت کے تحت ذمی بناکر رکھنے کی تجویزیں پیش کررہے تھے۔

مسلمانوں کی جان و مال پر قیامت ٹوٹ رہی تھی اور کاغذی حکومت الٰہیہ کے علم بردار اس جلتی آگ پر تیل چھڑکنے کی سعادت حاصل کررہے تھے۔

اصل نصب العین کی طرف جماعت شیخ الہندؒ نے آگ اور خون کی اس بارش میں بھی اقدام کرنے سے غفلت اختیار نہیں کی۔ نعرہ بازی کی بجائے ٹھوس اقدام کیا اور دینی تعلیمی تحریک کے نام سے ملک بھر میں اسلامی دعوت وتبلیغ اور تعلیم وتربیت کے ہزاروں مراکز قائم کردیے۔

اور مولانا محمد الیاس صاحب کی تحریک تبلیغ نے نہایت خاموشی کے ساتھ کونہ کونہ پہنچ کر مسلمانوں کے اندر ایمانی حوصلہ پیدا کیا۔ اس جدوجہد میں جماعت شیخ الہند کو دوطرفہ جہاد کرنا پڑا۔ ایک طرف ہندوفرقہ پرستی اور دوسری طرف داراشکوہی ذہنیت کے حامل اور انتہا پسند نیشنلسٹ مسلمان۔

مسلمانوں کے اس طبقہ نے جماعت شیخ الہندؒ کے اکابر پر یہ الزام تراشی شروع کی کہ ان ملاؤں نے مسٹر جناح کی دوقومی تھیوری کی حوصلہ افزائی کی ہے اور درپردہ پاکستان کے قیام کی تحریک کو سہارا دیا ہے۔

مرحوم انیس الرحمان بہاری ایڈیٹر ''نئی زندگی'' اس تحریک کے قائد تھے۔ اس تحریک کو اندر سے کانگرس کے بعض سینئر مسلمان لیڈر ہوا دے رہے تھے مگر مولانا ابوالکلام آزاد کی بھاری بھرکم شخصیت کے مقابلے میں وہ کھل کر سامنے آنے کی جرأت نہیں رکھتے تھے۔

مولانا ابوالکلام آزادؒ کے کانگرس اور حکومت کے اندر رہنے سے مذہب پسند مسلم قیادت کو جو ٹھوس فائدہ پہنچا، وہ ناقابل بیان ہے۔

شروع ہی میں اگر یہ انتہا پسند نیشنلسٹ غالب آجاتے تو واقعی ہندوستان میں اسلامی تہذیب وثقافت کو زندہ رہنے میں بڑی مشکلات پیش آتیں۔ ایک طرف ہندوفرقہ پرستی کے حملے ہوتے اور دوسری طرف سے اندر کے منافقین اسلامی قدروں کو نقصان پہنچانے کی سازشیں کرتے رہتے۔

مولانا مدنیؒ نے آزادی کے بعد سرکاری خطاب اور اعزاز قبول کرنے سے انکار کر دیا' مولانا کے بھائی اور بھتیجے سعودی عرب میں اعلیٰ عہدوں پر فائز تھے ان کے اصرار کے باوجود مولاناؒ نے مدینہ منورہ میں قیام کرنے پر ہندوستان کے مظلوم مسلمانوں کے ساتھ رہنا پسند فرمایا۔

مولانا مدنیؒ تصوف وطریقت میں مولانا تھانویؒ کے مقابلہ میں بہت نرمی اختیار کرتے تھے مگر آزادی کے بعد مولانا کے رویہ میں سختی آ گئی تھی اور مولانا شرعی داڑھی کے بغیر کسی کو بیعت نہیں فرماتے تھے' جبکہ اس ماحول میں مسلمان کی شکل وصورت میں چلنا پھرنا بڑی ہمت کا کام تھا اور لوگ شکل وصورت بدل بدل کر ہندوستان سے باہر جا رہے تھے۔ یہ انفرادی تشخص کی اہمیت اور حفاظت کے اظہار کی خاطر تھا۔

آزادی کے بعد سالہا سال تک مسلمانوں کی حفاظت اور دین حق کی تبلیغ ودعوت کا سارا بوجھ جماعت شیخ الہندؒ نے اٹھایا۔

اور آہستہ آہستہ ملک کی فضا کو اس قابل بنایا کہ دوسری مسلم جماعتیں بھی مسلمانوں کے اندر کام کرنے کے لائق ہو سکیں۔

جماعت اسلامی ہند ان بدلے ہوئے حالات میں بھی مشترک تعاون اور سیاسی انتخابات میں حصہ لینے کو طاغوت پرستی کہتی رہی' جبکہ مولانا حفظ الرحمٰن صاحب اسی انتخاب والیکشن کے ذریعہ ہندو پارلیمنٹ میں جا کر مسلمانوں کی مشکلات اور ہندو فرقہ پرستی پر پوری جرأتِ حق کے ساتھ اظہارِ خیال کرتے رہے اور ہندوستان کے ضمیر کو جھنجھوڑتے رہے' اور بالآخر جماعت اسلامی کے اسلام پسند رہنماؤں کو یہ تسلیم کرنا پڑا کہ ہندوستان کے لیے سیکولر طرز حکومت اکثریت کے ہندو راشٹر سے بہتر ہے۔

ڈاکٹر صاحب پاکستان کی مسلم جماعتوں کے بارے میں جو تبصرہ کرنا چاہیں شوق سے کریں' لیکن شیخ الہندؒ جو موصوف کے نزدیک مجدد وقت تھے ان کی جماعت کے بارے میں تاریخ کا سنجیدہ مطالعہ فرما کر اظہار خیال فرمائیں تو بہتر ہے۔

ڈاکٹر صاحب نے اس تقریر میں تبلیغی جماعت کی سرگرمیوں کو بھی صرف افراد کی اصلاح تک محدود کہہ کر اس کی اہمیت کو تسلیم کرنے سے گریز کیا ہے' لیکن کیا ایک صالح معاشرہ صالح افراد کے بغیر وجود میں آ سکتا ہے؟ یہ غلبۂ دین کی پہلی منزل ہے۔

اسی طرح علمائے مدارس کی تعلیمی سرگرمیوں کا معاملہ ہے' اس حلقہ کی جدوجہد ایک صالح معاشرہ کے لیے دین کے معلم' امام' قاضی اور داعی تیار کرنا ہے۔

پھر کیا یہ جدوجہد غلبۂ دین کی جدوجہد سے بے تعلق چیز ہے؟ ہاں' یہ امر ضروری ہے کہ اصحاب تبلیغ ہوں یا اربابِ مدارس' اپنے اپنے دائرہ کار کے بارے میں اس خوش فہمی کا شکار نہ ہوں کہ ان کے دائرہ کار میں حق کا انحصار ہے اور جو اللہ کے بندے اسلام کو بطور ایک مکمل نظام ہدایت کے پیش کرنے اور بطور دین کامل کے اس کے ایک ایک پہلو کو عصر حاضر کے استدلال کے مطابق نمایاں کرنے اور جدید جاہلیت کی گمراہیوں پر ضرب کاری لگانے کی جدوجہد میں مصروف ہیں ان سے دُور رہیں' بلکہ ان سے بدگمان ہوں۔

اس رَوش سے نہ صرف اسلامی جدوجہد کو نقصان پہنچے گا بلکہ تبلیغ و مدارس کے حلقوں پر تخریب کاری کا الزام آئے گا۔

ڈاکٹر صاحب قبلہ نے علماء کے بارے میں لکھا ہے:

''اور علماء کی حیثیت زندگی کی اصل منجدھار سے ہٹی ہوئی ایک پتلی سی دھار کی ہوتی چلی گئی' تا آنکہ اب وہ اپنے محدود دائرہ اثر کے جزیروں میں محصور ہو کر رہ گئے ہیں اور یہ جزیرے بھی دن بدن —— نَاْتِی الْاَرْضَ نَنْقُصُهَا —— کے مصداق روز بروز مختصر سے مختصر تر ہوتے چلے جا رہے ہیں۔'' (ص ٦٦)

بڑے ادب سے ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں گزارش ہے کہ علماء کی اگر یہ حالت ہے تو یہ طنز وتعریض کی بات نہیں' بلکہ رنج وملال کی بات ہے اور اس کے محرکات میں ایک بڑا محرک مذہبی قیادت کا زوال ہے جس کی زد میں خود ڈاکٹر صاحب کی تحریک بھی ہے۔

اور یہ خوش فہمی مولانا مودودی صاحب کو بھی تھی کہ قوم کا مکھن ان کے ساتھ ہے۔ لیکن جب مرحوم اپنی قائدانہ جدوجہد اور دینی اور علمی کدوکاوش کا ثمرہ حاصل کرنے کی غرض سے عملی سیاست کے میدان میں کود دے' تو عبرتناک شکست کے سوا انہیں کچھ حاصل نہ ہوا' جو طبقہ ان پر نوٹ نچھاور کرتا تھا اس نے ووٹ دینے سے انکار کر دیا۔

اور ایک بے عمل معاشرہ پر دین کے غالب کرنے کا جو تجربہ کیا گیا تھا وہ ناکام ہو گیا۔ مرحوم جب تک کتابوں اور کاغذوں پر اللہ کے دین کو غالب کرتے رہے لوگ خوش ہوتے رہے اور جب ان کی زندگیوں پر دین کو غالب کرنے نکلے —— اور اجتماعی وسائل اور مادی ذرائع پر خدا کے نیک بندوں کو بٹھانے کے لیے —— اُمت مسلمہ سے ووٹ مانگے تو مرحوم نے کوفہ کے امام مسلم کی طرح اپنے آپ کو تنہا پایا' سوائے چند رفقاء باوفا کے۔ مجھے امید ہے کہ جس طرح ڈاکٹر صاحب نے تقلید کے مسئلہ کی وضاحت کر کے علماء کرام کو مطمئن کرنے کی سنجیدہ

کوشش کی ہے' اسی طرح موصوف امامت اور امارت کے مسئلہ کو دعوتِ دین کی تحریک کے لیے بنیادی مسئلہ نہیں بنائیں گے۔

ظاہر ہے کہ جو اللہ کا بندہ خدا تعالیٰ کی توفیق سے باقاعدہ اس جدوجہد میں شامل ہو گا وہ ڈاکٹر صاحب کے ہاتھ پر رفاقت وتعاون کے عہد و پیمان میں کوئی تامل نہیں کرے گا۔ ڈاکٹر صاحب نے اس احقر کو تنظیم اسلامی کے حلقہ مستشارین میں شامل فرمایا ہے حالانکہ یہ احقر اس قابل نہیں ہے۔ پھر پاک و ہند کے درمیان ایک دیوار حائل ہے' جس کو بڑی مشکل سے عبور کر کے ڈاکٹر صاحب سے ملاقات کا شرف حاصل ہوتا ہے۔ بہرحال ڈاکٹر صاحب جس انقلابی دعوت کو لے کر اُٹھے ہیں اس کے بارے میں اسلام کے لیے بننے والے دیش میں یہ توقع بے جا نہیں کہ وہ تحریک اگر اربابِ اقتدار کے جبر و جور سے محفوظ رہی تو ان شاء اللہ کامیاب ہو گی' اور ہمارا اس تحریک سے تعلق رضائے الٰہی کا سبب بنے گا۔ ان شاء اللہ!

''دعوتِ رجوع الی القرآن''

''حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کی جماعت''

اور

''مسئلہ امامت و امارت''

مولانا اخلاق حسین قاسمی مدظلہ' کے فرمودات پر چند گزارشات

از: اسرار احمد

مولانا اخلاق حسین قاسمی مدظلہ ''مہتمم و شیخ التفسیر جامعہ رحیمیہ'' مرکز حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ' خواجہ میر درد روڈ' دہلی (بھارت) سے راقم الحروف کا تعارف کچھ اتنا پرانا نہیں' زیادہ سے زیادہ ڈیڑھ دو برس کا ہے۔

اُن سے اولین تعارف اُن کی بیش بہا تالیف ''محاسن موضح القرآن'' اور اُس کے پاکستانی ناشر برادرم قاری سعید الرحمٰن علوی کی وساطت سے ہوا۔ اسی کی اساس پر راقم نے انہیں گزشتہ سال کے ''محاضراتِ قرآنی'' میں شرکت کی دعوت ارسال کر دی۔ اُن کا کرم کہ انہوں نے بلا پس و پیش اور بغیر تکلف و تصنع دعوت قبول فرمالی اور تشریف لے آئے۔

اس طرح متعدد بالمشافہ ملاقاتوں کا موقع بھی ملا۔ اور محاضرات کی متعدد نشستوں میں ان کی کئی تقاریر بھی سننے میں آئیں۔ اُن کے علم و فضل کا اندازہ تو ظاہر ہے کہ کوئی اُن سے اعلیٰ پایہ کا عالم و فاضل ہی لگا سکتا ہے' مجھ ایسے عامی و اُمی شخص کے دل نے تو اُن کے جذبہ و خلوص' سادگی و اخلاص اور بالخصوص طبیعت کے تواضع اور مزاج کے اعتدال سے بہت اثر قبول کیا۔ اس طرح گویا فوراً ہی ''دل را بہ دل رہیست!'' والا معاملہ بن گیا۔

''محاضرات'' کے ایک ہی ماہ بعد میرا بھارت جانا ہو گیا۔ اصل سفر تو حیدر آباد دکن کا تھا

لیکن آتے جاتے دہلی میں بھی دو مرتبہ مختصر قیام رہا۔ اور دونوں ہی بار مولانا سے ملاقات ہوئی۔ مولانا کی محبت بھری دعوت پر ایک جمعہ میں جامع مسجد مدرسہ حسین بخش، چتلی قبر، میں جمعہ سے قبل خطاب کا موقع ملا (جہاں اب مولانا جمعہ پڑھاتے ہیں، اور بھائی جمیل الرحمٰن صاحب سے معلوم ہوا کہ اسی مسجد میں ایک طویل عرصہ تک رئیس الواعظین سحبان الہند مولانا احمد سعید دہلویؒ وعظ فرماتے رہے ہیں) اور اُن ہی کی وساطت سے قبرستانِ مہندیان اور جامعہ رحیمیہ میں بھی حاضری کا موقع ملا۔

راقم کو مولانا کی عمر کا صحیح اندازہ تو نہیں، البتہ گمانِ غالب ہے کہ لازماً ساٹھ سے متجاوز ہو گی لیکن اُن کی جواں ہمتی کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ اُس کے بعد سے اب تک اُن کے پاکستان کے دو مزید چکر لگ چکے ہیں جن سے بحمد اللہ ربط و تعلق کے مزید استوار ہونے میں بہت مدد ملی ــــ جس کا ایک اہم مظہر قارئین ''میثاق'' کے علم میں گزشتہ شمارے سے آ چکا ہے، یعنی یہ کہ مولانا نے ''تنظیم اسلامی'' کے ''حلقہ مستشارین'' میں شرکت قبول فرما لی۔ **فجزاہُ اللّٰہ عنّی و عن جمیع رفقائی أحسن الجزاء!**

====================

مولانا کی جو تحریر گزشتہ اشاعت میں ''ڈاکٹر اسرار احمد کی اپیل اور علمائے دیوبند'' کے عنوان سے شائع ہوئی ہے اُس کے ضمن میں:

اولاً ــــ تو راقم کو مولانا کا تہہ دل سے شکریہ ادا کرنا ہے کہ انہوں نے راقم کا اس درجہ اعزاز و اکرام فرمایا کہ اُسے بھی برصغیر کی ''دعوتِ رجوع الی القرآن'' کے اُس ''**سلسلة الذهب**'' میں منسلک کر دیا جس کا سرآغاز تو تھے امام الہند حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ اور اُن کے جلیل القدر فرزند (رحمہم اللہ) ــــ درمیانی کڑی کی حیثیت حاصل ہے حضرت شیخ الہندؒ کو۔ اور پھر ان کی ذاتِ مجمع الصفات سے جو متعدد لڑیاں شروع ہوئیں اُن میں سے ایک مشتمل ہے مولانا عبید اللہ سندھی مرحوم و مغفور اور مولانا احمد علی لاہوریؒ پر، تو دوسری میں شامل ہیں مولانا ابو الکلام آزاد مرحوم اور مولانا ابو الاعلیٰ مودودی مرحوم[1]۔

اس ضمن میں مولانا کے شکریے کے ساتھ راقم یہ عرض کیے بغیر نہیں رہ سکتا کہ اگرچہ مولانا

(۱) مولانا مودودی مرحوم کے ضمن میں ''علمائے دیوبند کے فیض یافتہ عالم'' کے جو الفاظ مولانا نے استعمال فرمائے ہیں، وہ بہت معنی خیز ہیں۔ اسی طرح مولانا شبیر احمد عثمانیؒ کا ذکر اگر سہواً چھوٹ گیا ہے تب تو خیر، لیکن اگر جان بوجھ کر ہے تو یہ بھی ایک اہم معاملہ ہے! بہرحال ان دونوں باتوں کے ضمن میں ان شاء اللہ راقم آئندہ کچھ عرض کرے گا!

کی یہ ''سند'' راقم کے لیے تا زیست متاعِ بے بہا کا درجہ رکھے گی، تاہم راقم نہ اس سے قبل اس زعم میں مبتلا تھا نہ ان شاء اللہ مولانا کے اس اعزاز و اکرام سے اس مغالطے میں مبتلا ہو گا کہ راقم ان عظیم ہستیوں کا کسی بھی درجے میں ہمسر یا ہم پلہ ہے۔ اللہ گواہ ہے کہ راقم کا معاملہ ان حضرات کے ساتھ وہی ہے جو اس شعر میں بیان ہوا کہ ؎

اُحِبُّ الصالحین و لستُ منهم
لعل اللّٰه یرزقنی صلاحًا!

اس سلسلے میں راقم الحروف کے لیے مولانا نے جن جذبات و خیالات کا اظہار فرمایا ہے ان میں سے صد فی صد درست بات تو صرف یہ ہے کہ:

''ڈاکٹر صاحب کو نہ عالم ہونے کا دعویٰ ہے اور نہ فقیہہ و متکلم اور شیخ طریقت ہونے کا ادّعا''

مندرجہ ذیل باتیں بھی بحمد اللہ بہت حد تک واقعیت پر مبنی ہیں:

''ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے دین برحق کے غلبہ اور اقامت کے لیے قرآن کریم کی اصولی دعوت کا مشن اختیار کیا ہے ــــ اور وہ اس تحریک میں اپنا تن من دھن سب کچھ لگا چکے ہیں ــــ''

البتہ یہ الفاظ ہمت افزائی کے جذبہ کی بنا پر مبالغہ کی صورت اختیار کر گئے ہیں کہ:

''ڈاکٹر صاحب جدید تعلیم یافتہ آدمی ہیں اور موصوف نے قرآن کریم کا گہرا مطالعہ کیا ہے...... خدا تعالیٰ نے موصوف کو اپنے مقدس کلام کا بڑا اچھا فہم عطا فرمایا ہے اور اس کلام عظیم کے اصولی پیغام کو جدید استدلالی اسلوب میں پیش کرنے کی صلاحیت سے نوازا ہے۔''

بہرحال راقم اس ہمت افزائی پر مولانا کا شکریہ ادا کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہے کہ وہ اپنے کمال فضل و کرم سے اُسے فی الواقع ان الفاظ کا مصداق بنا دے۔ **وما ذٰلک علیه بعزیز!**

مسالک فقہیہ کے ضمن میں راقم کی تقریر مطبوعہ ''میثاق'' ستمبر ۱۹۸۴ء میں تقلید اور عدمِ تقلید یا اجتہاد مطلق کے مابین ''نیم تقلید'' کا جو تصور سامنے آیا تھا اُس پر ابتداءً مولانا بھی بہت برہم تھے، لیکن جب راقم نے ان کے سامنے اپنی وہ وضاحت پیش کی جو ''میثاق'' کے دسمبر کے شمارے میں شائع ہو چکی ہے (مولانا کی دہلی واپس روانگی تک پرچہ طبع نہ ہوا تھا لیکن راقم نے ان کی خدمت میں کچھ کتابت شدہ صفحات کی فوٹو سٹیٹ نقل اور کچھ اصل مسودہ پیش کر دیا

تھا) تو انہوں نے اطمینان کا اظہار فرمایا۔

مولانا کی برہمی کے آثار ان کی زیر تبصرہ تحریر میں بھی موجود ہیں:

''ڈاکٹر صاحب نے دعوتِ قرآنی اور اقامت حق کی دعوت سے فقہی اختلافات کو دُور رکھا ہے۔ وہ اہل علم کو فقہی اور اجتہادی مسائل میں وسعت فکر ونظر کی دعوت ضرور دیتے ہیں اور معتدل راستہ اختیار کرنے کی اپیل کرتے ہیں جو آج کے حالات کا شدید تقاضا ہے۔ لیکن عوام کو وہ یہی مشورہ دیتے ہیں کہ اتباع سنت کی نیت سے اُن کے لیے عافیت اسی میں ہے کہ وہ ایک فقہ کی پیروی کریں۔

لیکن ایک تقریر میں ڈاکٹر صاحب نے ضمناً اجتہادی اور فقہی بحث میں ضرورت سے زیادہ دلچسپی کا مظاہرہ کیا اور اپنے فقہی مسلک کے بارے میں اپنے لیے ''نیم مقلد'' کی تعبیر اختیار کی اور مستقبل کے لیے یہ آرزو (ظاہر) کی کہ فقہی اختلافات میں اتحادِ عمل کی کوئی سبیل نکل آئے۔

میرے خیال میں ڈاکٹر صاحب کو سہو ہوا' موصوف جس احتیاط کے ساتھ کام کر رہے ہیں وہ احتیاط اس تقریر میں قائم نہ رہ سکی!''

تاہم راقم کی توضیحات ملاحظہ فرمانے کے بعد مولانا نے جس فراخدالی کے ساتھ تسلیم فرمایا کہ:

''ڈاکٹر صاحب موصوف نے میثاق نومبر (مراد ہے دسمبر) کے پرچے میں اس غلط فہمی کو دُور کرتے ہوئے جو کچھ لکھا ہے وہ علماء حق کو مطمئن کرنے کے لیے کافی ہے —— اس کا تقاضا ہے کہ ڈاکٹر صاحب کے فقہی موقف کی حوصلہ افزائی کی جائے!''

اُس سے جہاں اُن کے وسعتِ ظرف کا اندازہ ہوتا ہے وہاں یہ حقیقت بھی سامنے آتی ہے کہ ع ''گاہ مری نگاہ تیز چیر گئی دلِ وجود!'' کے مصداق ان کی نگاہ جزوی اور فروعی مسائل میں الجھ کر رہ جانے کی بجائے دین وملت کے اصل مسئلہ پر مرکوز ہے! **فللّٰہ الحَمد!**

''فقہی اختلافات میں توسع'' کے ضمن میں مولانا نے شاہ ولی اللہ دہلوی اور شاہ اسمٰعیل شہیدؒ کا جو ذکر فرمایا ہے وہ اپنی جگہ پر راقم کے لیے خصوصی دلچسپی کا باعث ہے' حضرت مجدد الف ثانیؒ کا حوالہ ہے کہ:

''حضرت مجدد صاحبؒ ایک مکتوب میں فرماتے ہیں: ''باوجودِ التزام ایں مذہب مرا با امام شافعیؒ گویا محبت ذاتی است و بزرگ مے دانم' لہٰذا در بعض اعمالِ نافلہ تقلید مذہب او می نمایم'' (مکتوب ۵۵' دفتر دوم) یعنی ''باوجود اس کے کہ میں حنفی مسلک کی پابندی کرتا ہوں مجھے امام شافعیؒ سے ذاتی محبت ہے اور میں انہیں بزرگ مانتا ہوں اور اسی لیے بعض (نفلی) عبادات میں ان کے مسلک کی پیروی کرتا ہوں۔''

''صاحب اتحاف نے لکھا ہے کہ شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ اور حضرت مجدد صاحبؒ کے درمیان اختلاف کی ایک بڑی وجہ یہ تھی کہ محدث صاحب کو فقہی مذہب میں بے حد تشدد تھا اور مجدد صاحب مطلق اتباع سنت اور بدعات کی تردید پر زور دیتے تھے (ص ۱۶۲)''

مولانا قاسمی مدظلہ کی تحریر کا اہم ترین حصہ وہ ہے جو ''حضرت شیخ الہندؒ کی جماعت'' اور ''مسئلہ امامت وامارت'' سے متعلق ہے۔ ان مسائل کے ضمن میں بھی مولانا کے انداز میں ایک محبت آمیز برہمی نمایاں ہے۔ اور فی الوقت راقم الحروف نے اسی مسئلے پر اظہار خیال کے لیے قلم اٹھایا ہے۔

اس ضمن میں مولانا کی ناراضگی کی اصل بنیاد تو وہی ''ضمیمہ'' والا لفظ ہے' جس کے بارے میں ضروری وضاحت گزشتہ شمارے میں پیش کی جا چکی ہے' بالمشافہ ملاقات میں مولانا کا انداز تحریر کے مقابلے میں کہیں زیادہ غضبناک تھا لیکن الحمد للہ کہ جب راقم نے اپنی وہ گزارشات زبانی پیش کیں جو گزشتہ ماہ کے ''تذکرہ وتبصرہ'' میں درج ہو چکی ہیں تو مولانا نے اطمینان کا اظہار فرمایا اور یہ ہدایت فرمائی کہ اسے ''میثاق'' میں شائع کر دیا جائے۔ اس طرح ایک خاص لفظ کی حد تک تو معاملہ ختم ہو گیا' البتہ اس تحریر میں شامل متعدد باتیں ایسی ہیں جن کے بارے میں راقم اپنے خیالات وضاحت کے ساتھ پیش کرنا چاہتا ہے۔ تاکہ اگر وہ درست ہوں تو مولانا اور دوسرے اصحاب علم وفضل ان کی تائید فرمائیں ورنہ میری اصلاح فرما کر عنداللہ ماجور ہوں۔

اس ضمن میں سب سے پہلے راقم مولانا کی تحریر کے اُس حصے کے ''اول وآخر'' کے بارے میں کچھ عرض کرنا چاہتا ہے جو اس موضوع سے متعلق ہے۔ مولانا نے ابتدا ان الفاظ سے فرمائی ہے:

''البتہ اس بحث کے ساتھ ساتھ ڈاکٹر صاحب نے ایک دوسرے بڑے جھگڑے کو چھیڑ دیا ہے اور امامت وامارت کا مسئلہ کھڑا کر دیا ہے۔ اور ساتھ ہی اس کا جوڑ مولانا ابوالکلام آزادؒ کی امارت کے بارے میں حضرت شیخ الہندؒ کی تجویز سے لگا دیا ہے۔ گویا ڈاکٹر صاحب نے بِھڑوں کے چھتے کو چھیڑ دیا ہے!''

اور اختتام ان الفاظ پر فرمایا:

''مجھے امید ہے کہ جس طرح ڈاکٹر صاحب نے تقلید کے مسئلہ کی وضاحت کر کے علماء کرام کو مطمئن کرنے کی سنجیدہ کوشش کی ہے اسی طرح موصوف امامت کے مسئلہ کو دین کی تحریک کے لیے بنیادی مسئلہ نہیں بنائیں گے!''

اس سلسلے میں راقم کی گزارش صرف یہ ہے کہ ان شاء اللہ العزیز ایسا ھی ھو گا۔ اس لیے کہ ہمارے نزدیک نہ یہ کوئی اساسی اور بنیادی مسئلہ ہے' نہ ہی برصغیر کے دونوں ملکوں یعنی پاکستان اور بھارت تو کجا' کسی چھوٹے سے چھوٹے مسلمان ملک کے علماء کرام کا کسی شخص واحد کی امامت و امارت پر متفق ہو جانے کا کوئی امکان حال چھوڑ مستقبل میں بھی دُور دُور تک موجود ہے! اور واقعہ یہ ہے کہ راقم نے اس مسئلہ کو ہرگز کسی ارادے یا منصوبے کے تحت نہیں چھیڑا بلکہ یہ از خود (اور چونکہ ہم ''از خود'' کچھ ہونے کے ہرگز قائل نہیں ہیں' بلکہ ہمارا ایمان ہے کہ جو کچھ ہوتا ہے مشیت ایزدی سے ہوتا ہے' لہٰذا) گویا ''من جانب اللہ'' چھڑ گیا۔

راقم کو اواخر ۱۹۷۴ء میں رمضان مبارک کے عشرہ اخیرہ کے وہ کیف آور لمحات اور ان کی سرور آمیز کیفیات اچھی طرح یاد ہیں جب راقم مسجد خضراء' سمن آباد میں اعتکاف میں تھا اور اسی دوران میں راقم کے قلم سے وہ تحریر نکلی جو ''میثاق'' بابت اکتوبر' نومبر ۱۹۷۴ء میں بڑے سائز کے ۴۸ صفحات پر پھیلی ہوئی ہے۔ جس میں راقم نے نہ صرف یہ کہ امت مسلمہ کی چودہ سو سالہ تاریخ کا ایک مختصر جائزہ پیش کیا ہے اور عروج و زوال کے ادوار کا تجزیہ کیا ہے بلکہ موجودہ ''ہمہ گیر احیائی عمل'' کا جائزہ بھی لیا ہے اور اُس کے مختلف ''محاذوں'' کی تفصیل بھی بیان کی ہے۔ اسی کے ضمن میں راقم کے قلم سے مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم کی بیعت امامت کی تجویز کے بارے میں پروفیسر یوسف سلیم چشتی مرحوم سے سنا ہوا ایک واقعہ اور اُس موقع پر مولانا معین الدین اجمیریؒ کی زبان سے نکلا ہوا ایک جملہ ٹپک گیا' جس پر صرف سَن کی غلطی کی آڑ لے کر ایک نہایت جارحانہ تردیدی خط لکھ دیا ڈاکٹر احمد حسین کمال صاحب نے' جس پر میرے لیے مزید تحقیق و تفتیش لازم ہو گئی اور اس طرح الحمد للہ کہ برصغیر پاک و ہند میں ''تاریخ دعوت و عزیمت'' کا ایک اہم لیکن گمشدہ باب روشنی میں آ گیا۔

اس تحقیق و تفتیش کے دوران جو ''انکشافات'' مجھ پر ہوئے ان میں سے اہم ترین حضرت مولانا محمود حسن دیوبندیؒ المعروف بہ ''شیخ الہند'' کی عظمت شان اور جلالت قدر کے بارے میں تھا۔ جن سے اس وقت تک میں اصلاً تو ان کے ترجمۂ قرآن کے حوالے ہی سے واقف تھا

اور اس کی بنا پر میرے دل میں ان کے لیے ایک گونہ محبت و عقیدت بھی موجود تھی۔ مزید برآں اُن کی ذاتی عظمت' ان کے تقویٰ و تدیّن' اُن کے اخلاص و للّٰہیت' ان کا علم و فضل' ان کے مجاہدانہ کردار' ان کی عالی ہمتی اور جہاد حریت اور تحریک استخلاصِ وطن میں ان کے مقام و مرتبہ کا تو کسی قدر اندازہ تھا لیکن ان کی وسعت نظر' ان کی عالی ظرفی' ان کی معاملہ فہمی' ان کی انسان شناسی' ان کی وسعت قلب' اور سب سے بڑھ کر ان کی عاجزی و انکساری کا کوئی اندازہ راقم کو نہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی ذاتی عظمت کے اس پہلو کے ''یکبارگی'' انکشاف سے راقم پر ایک مبہوتیت سی طاری ہو گئی۔ چنانچہ اس موقع پر جو تحریر راقم کے قلم سے نکلی اُس میں ایک والہانہ آمد کی کیفیت بدرجۂ اتم موجود ہے!

وہ دن اور آج کا دن! —— راقم کی پختہ رائے ہے کہ چودہویں صدی ہجری کے مجدد حضرت شیخ الہندؒ تھے! اس لیے کہ ان کی سی ''جامعیت کبریٰ'' کی حامل کوئی دوسری شخصیت اس پوری صدی میں کم از کم مجھے نظر نہیں آتی۔

میری متذکرہ بالا تحریر اولاً ''میثاق'' بابت ستمبر و اکتوبر ۱۹۷۵ء میں شائع ہوئی تھی اور اس سے وہ بحث ختم ہو گئی تھی جو اس پوری تحقیق و تفتیش کا سبب بنی تھی' چنانچہ اس کے بعد پورے آٹھ سال اس مسئلے پر ''میثاق'' کے صفحات میں کوئی بات نہیں آئی۔ لیکن ۸۲۔۱۹۸۳ء میں میرے جو ''طوفانی دورے'' پاکستان کے طول و عرض میں ہوئے اور ان کے دوران حلقۂ دیوبند کے علماء کرام کی ایک بڑی تعداد سے ملاقات اور گفت و شنید کا موقع ملا تو یہ افسوسناک انکشاف ہوا کہ دیوبندی علماء کی نوجوان نسل کی عظیم اکثریت تو حضرت شیخ الہندؒ کے صرف نام سے واقف ہے' ان کی عظمت سے بالکل واقف نہیں' بزرگ حضرات کی اکثریت بھی اپنے اکابر میں سے بعض دوسری عظیم شخصیتوں کو جو مقام دیتی ہے وہ حضرت شیخ الہندؒ کو نہیں دیتی۔ اور خاص طور پر مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم کی بیعت امامت کی تجویز کی ناکامی اور اس کے اسباب تو دُور رہے اس واقعہ کا علم تک کسی کو نہیں ہے! تب خیال ہوا کہ اس تحریر کو دوبارہ شائع کر دیا جائے' چنانچہ اسے ''قند مکرر'' کے طور پر ''میثاق'' کی جنوری ۱۹۸۴ء کی اشاعت میں شائع کر دیا گیا۔

اس پر کہروڑ پکا ''ضلع ملتان'' کے ایک عالم دین مولانا اللہ بخش ایاز ملکانوی نے دو خطوط تو راقم کو لکھے اور ایک مضمون معاصر 'الخیر' ملتان میں شائع کرایا جس میں اس تحریر کی

اشاعت ـــــ اور تکرار کے پس پردہ جس محرک کا سراغ لگایا وہ ان ہی کے الفاظ میں یہ ہے:

"مگر ڈاکٹر اسرار احمد اس سے کچھ اور مفہوم اخذ کرنا چاہتے ہیں۔ ان کے مطابق شیخ الہندؒ کے ارادت مند، عقیدت کیش جانشینوں کو اپنے شیخ کی طرح وسعت قلبی اور اعلیٰ ظرفی کا ثبوت دیتے ہوئے اس دور میں ایک مثال قائم کرنی چاہیے اور "سکہ بند حنفیت"، زہد و تقویٰ کی اجارہ داری اور روایتی، مدرسی علم کا ادعا آڑے نہیں آنا چاہیے۔

آج شیخ الہندؒ کے جانشین اتباع شیخ میں کس کو "امیر الپاکستان" تسلیم کرلیں، اس کی وضاحت امیر تنظیم اسلامی نے نہیں فرمائی مگر ان کے پر پیچ، پُر اسرار اور دبے دبے لفظوں میں جس شخصیت کے بارے میں وسعت قلبی اور اعلیٰ ظرفی اختیار کیے جانے کا مطالبہ چھلک رہا ہے، وہ چشم بد دور "حضرت اقدس ڈاکٹر صاحب" ہی کی ذاتِ گرامی قدر معلوم ہوتی ہے۔ مگر غالباً انہوں نے از راہِ کسر نفسی اپنے نام کی صراحت نہیں فرمائی۔ باقی

ع یہی کہتے ہیں وہ اور کیا کہنے کو ہے!

اور ـــــ ع ہے تجھ میں مکر جانے کی ہمت تو مکر جا!"

اس کے جواب میں جو کچھ میں نے انہیں تحریر کیا تھا اُس کے بعض ضروری حصے بھی فوری مراجعت کے لیے پیش خدمت ہیں:

"البتہ اس کے بین السطور میں آپ نے میری جس "نیت" یا "خواہش" کا سراغ لگایا ہے، میں اس کی بالکلیہ نہ تردید کرتا ہوں نہ توثیق۔ من وجہ اقرار ہے ـــــ اور ـــــ من وجہ انکار!

ایک شاعر کے قول "ہم اقراری مجرم ہیں" کے مصداق مجھے برملا اعتراف ہے کہ مجھے اللہ تعالیٰ نے جس کام کے لیے اپنی زندگی وقف کر دینے کی توفیق عطا فرمائی ہے اور جس کے لیے میں نے اپنے پیشہ طب کو بھی خیر باد کہا ہے، وہ وہی ہے جس کی بیسویں صدی عیسوی میں پہلی بار نہایت زور دار دعوت دی تھی مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم نے "الہلال" اور "البلاغ" کے ذریعے۔ اور جس کے لیے انہوں نے عملی جدوجہد کا آغاز بھی "حزب اللہ" کے قیام کی صورت میں کر دیا تھا۔ لیکن جسے وہ بعض داخلی عوامل اور خارجی موانع کے باعث جلد ہی بددل ہو کر چھوڑ بیٹھے۔" ("میثاق"، نومبر ۱۹۸۴ء، ص ۶۰)

"...... بہر حال میرے نزدیک مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم کے اس انتقال موقف سے جو جگہ خالی ہوئی تھی اسی کو پُر کرنے کے لیے اٹھے تھے مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی مرحوم۔ چنانچہ یہ محض "اتفاق" نہیں ہے کہ مولانا مودودی مرحوم کی پہلی تصنیف تھی

"**الجهاد في الاسلام**" جو گویا نہایت بسیط اور مدلل صدائے بازگشت تھی "الہلال" اور "البلاغ" کی دعوتِ جہاد فی سبیل اللہ کی۔ اور مولانا آزاد مرحوم کی تفسیر اور مولانا مودودی مرحوم کے ماہنامے دونوں کا نام ایک ہی ہے یعنی "**ترجمان القرآن**"۔

مولانا مودودی مرحوم کے بعض نظریات سے شدید اختلاف کے باوجود میری رائے ہے کہ انہوں نے اصلاً اس دعوت کے تسلسل کو قائم رکھا جس کے داعی اول مولانا آزاد تھے اور اس سلسلے میں یقیناً قابل لحاظ پیش رفت بھی کی۔ لیکن افسوس کہ جس طرح ان کے پیش رو اپنے رُخ کی تبدیلی کے بعد کلیۃً وقف ہو کر رہ گئے تھے ہندوستان کی قومی سیاست کے، اسی طرح مولانا مودودی اور ان کی قائم کردہ جماعت اسلامی بھی آزادیٔ ہند اور قیامِ پاکستان کے بعد "پاکستانی قومی سیاست" کی نذر ہو گئے ـــــ اور اس طرح خالص اقامت دین و غلبۂ دین کی جدوجہد اور اسلام کی انقلابی دعوت کا تسلسل پھر ٹوٹ کر رہ گیا ـــــ چنانچہ اسی کے احیاء کے لیے سر دھڑ کی بازی لگا دینے کا عزم مصمم کیا ہے ان سطور کے حقیر و عاجز راقم نے۔ اور اس کام میں وہ اپنے آپ کو محتاج پاتا ہے جملہ علمائے دین، بالخصوص حلقۂ دیوبند کے وابستگان کی اعانت اور سرپرستی کا۔ چنانچہ یہ ہے میری اصل خواہش یا تمنا، جسے آپ نے میری تحریر کے بین السطور پڑھا ہے، اور اس حد تک میں "اقراری مجرم" ہوں۔ لیکن اگر آپ اسے تعبیر کرتے ہیں "امام الپاکستان" بننے کی خواہش اور منصب کی تمنا سے تو یہ میرے نزدیک ع "جو چاہے آپ کا حسن کرشمہ ساز کرے" کے مصداق خالصتاً آپ کے اپنے ذہن کی تخلیق و اختراع ہے جس سے میں اظہار براءت کرتا ہوں اور آپ سے بھی عرض کرتا ہوں کہ "**اِجْتَنِبُوْا كَثِيْرًا مِّنَ الظَّنِّ اِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ اِثْمٌ**" کی قرآنی ہدایت کو پیش نظر رکھیں اور اس سوءِ ظن سے اجتناب فرمائیں۔

الحمد للہ کہ مجھ پر یہ حقیقت پوری طرح منکشف ہے کہ کسی ایک انسانی زندگی کے مختصر سے عرصہ میں کسی خطۂ زمین میں دعوت اسلامی کے آغاز سے اقامت و غلبہ دین کی آخری منزل تک کے جملہ مراحل یا بالفاظِ دیگر اسلامی انقلاب کی تکمیل کا واقعہ تو پوری انسانی تاریخ میں ایک ہی بار ہوا ہے۔ یعنی سید الاولین والآخرین اور امام الانبیاء والمرسلین ﷺ کے دست مبارک سے۔ اور آپؐ ہی کے مقصد بعثت کی آخری تکمیل (بقول امام الہند حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ) (**ازالۃ الخفاء**) کے طور پر یہ کام ایک بار پھر ہوگا اور عالمی سطح پر ہوگا۔ لیکن اس کے لیے آپؐ کے غلاموں کو کئی نسلوں تک مسلسل جدوجہد کرنی

ہو گی اور ایک ایک نسل کے دوران اس عمل کو ایک ایک درجہ آگے بڑھا دینا بھی اُمت کے لیے بہت بڑی کامیابی ہے اور جو خوش قسمت افراد اس کے لیے اپنی زندگیاں وقف کر دیں ان کے لیے بہت بڑی سعادت ہو گی۔ اور اس ضمن میں اپنی تمام تر ناکامیوں کے باوصف جو خدمت انجام دی تھی مولانا آزاد نے۔ اسی کے چراغ سے روشن ہوا جماعت اسلامی کا دیا' اور اب اس کی بھی ناکامی کے بعد ان شاء اللہ اسی کی خاکستر سے نئی چنگاریاں روشن ہوں گی اور میں اپنی تمام تر بے بضاعتی کے باوجود ''خواہشمند'' ہوں ؎

اُحِبُّ الصَّالحینَ و لستُ منهم   لعل الله یرزقنی صلاحًا

کے مصداق اسی فہرست میں اپنا نام درج کرانے کا۔ لیکن ہرگز مبتلا نہیں ہوں اس خبط و حماقت میں کہ یہ عظیم کام میری امامت میں سرانجام پائے گا اور میں نہ صرف یہ کہ مجددین کی فہرست میں جگہ پا جاؤں گا بلکہ بقول مولانا مودودی ''مجدد کامل'' کے مقام پر فائز ہو جاؤں گا!'' (''میثاق'' نومبر ۱۹۸۴ء ص ۶۲۔۶۳)

البتہ جہاں تک حضرت شیخ الہندؒ کے تلامذہ کا تعلق ہے تو اگرچہ میں مجموعی اعتبار سے بھی ان سب کی عظمت اور جلالت شان کا تہہ دل سے قائل و معترف ہوں' اور ان میں سے ایک ایک کے اپنے اپنے مقام پر علم و فضل' تقویٰ و تدین' خلوص و اخلاص اور عظمت کردار کا نقش میرے دل پر قائم ہے۔ بلکہ میں نے کہیں پہلے بھی یہ لکھا ہے اور اب پھر اعادہ کر رہا ہوں کہ میرے نزدیک جس طرح امام الہند حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی جامعیت کبریٰ کی مظہر ہیں ان کی تصانیف و تالیفات' اسی طرح حضرت شیخ الہندؒ کی ''جامعیت کبریٰ'' کے مظہر اتم ہیں ان کے تلامذہ بحیثیت مجموعی۔ تاہم راقم اپنے اس واقعی احساس کے اظہار پر اپنے آپ کو مجبور پاتا ہے کہ انفرادی طور پر ان عظیم شخصیتوں میں سے کوئی ایک بھی اُن کی سی ''جامعیت'' کی حامل نظر نہیں آتی' اس ضمن میں بھی راقم اپنی آج سے دس سال قبل کی تحریر کا اقتباس پیش کر رہا ہے' اس لیے کہ آج بھی اُس کی رائے یہی ہے:

''اور اس پس منظر میں' ہمیں معاف فرمایا جائے اگر ہم اپنے آپ کو اپنے اس احساس کے اظہار پر مجبور پائیں' کہ اُن کے جانشینوں میں سے مختلف حضرات ان کی ہمہ گیر شخصیت کے مختلف پہلوؤں کے وارث تو ضرور بنے' لیکن کوئی بھی ان کی جامعیت کا وارث نہ بن سکا۔ گویا ؎

نہ اٹھا پھر کوئی رومیؔ عجم کے لالہ زاروں سے   وہی آب و گلِ ایراں وہی تبریز ہے ساقی!

اور صورتِ حال بالکل اس شعر کے مصداق ہو گئی کہ ؎

اڑائے کچھ ورق لالے نے' کچھ نرگس نے' کچھ گل نے
چمن میں ہر طرف بکھری ہوئی ہے داستاں میری!

خصوصاً وہ حضرات جو سیاست یا جہادِ حریت' یا تحریک استخلاصِ وطن کے میدان میں ان کے جانشین بنے' انہوں نے تو اپنے گرد تقلید جامد کا لبادہ اس قدر کس کر لپیٹا کہ دنیا اِدھر سے اُدھر ہو گئی لیکن انہوں نے اپنے موقف میں ترمیم کی کوئی ضرورت محسوس نہ کی۔'' (تحریر ۱۹۷۵ء۔ ''میثاق'' جنوری ۱۹۸۴ء ص ۶۱)

اس ضمن میں مولانا اخلاق حسین قاسمی مدظلہ کی تحریر کے پیش نظر راقم اپنی اس رائے کے اظہار کی بھی ادب کے ساتھ اجازت چاہتا ہے کہ حضرت شیخ الہندؒ کے تلامذہ یا حضرت کے شاگردوں کی اصطلاح تو درست ہے' لیکن ''شیخ الہندؒ کی جماعت'' یا ''جماعت شیخ الہند'' کی اصطلاح جو مولانا نے اپنی اس تحریر میں گیارہ بار استعمال کی ہے' واقعہ کے خلاف ہے۔ اور راقم کا شدید احساس ہے کہ اصل میں یہی وہ کمی ہے جو اس حلقے میں رہی جس کے باعث ان نابغۂ روزگار ہستیوں سے جو برکاتِ عظیمہ ملت اسلامیہ ہندیہ کے حق میں ظہور پذیر ہو سکتی تھیں وہ بتمام و کمال نہ ہو پائیں جس کے نتیجے میں ان کی حیثیت قومی اور سیاسی سطح پر مآلِ کار اور نتائج واقعی کے اعتبار سے عظیم تر اور سیکولر مزاج سیاسی تحریکوں کے ''ضمیموں'' کی ہو گئی۔ چنانچہ اسی پس منظر میں اصل عظمت ابھر کر سامنے آتی ہے حضرت شیخ الہندؒ کی اس خواہش کی کہ کسی کو امام الہندؒ مان کر اُس کے ہاتھ پر بیعت کر لی جائے تاکہ ایسا نہ ہو کہ ان کی جامع و مجمع ذات کے اٹھتے ہی وہ انجمن منتشر ہو جائے جو انہوں نے عمر بھر کی کمر توڑ دینے والی مشقت سے سجائی تھی — اور اسی سے سمجھ میں آتا ہے اس مسئلے میں حضرتؒ کے انہماک کی شدت کا سبب کہ بقول مولانا سعید الرحمٰن علوی (سابق مدیر ''خدام الدین'' لاہور) کہ:

''شیخ الہندؒ نے شدید علالت کے دوران جمعیت علماء ہند کے دوسرے جلسہ ۱۹ تا ۲۱ نومبر ۱۹۲۰ء بمقام دہلی کی صدارت بھی فرمائی تھی اور خطبہ صدارت بھی ارشاد فرمایا تھا۔ بقول مولانا محمد میاں ''بیماری و نقاہت کے سبب تھوڑی دیر بھی اسٹیج پر بیٹھنا دشوار تھا'' لیکن اس اجلاس کے اہم ترین ایجنڈا یعنی امیر الہند کے انتخاب کے سلسلے میں ان کے احساسات یہ تھے ''میری چارپائی اٹھا کر جلسہ گاہ میں لے جائی جائے۔ اور یہ کام کر لیا

جائے۔ پہلا شخص جو بیعت کرے گا وہ میں ہوں گا۔" (میثاق' اکتوبر ۱۹۸۳ء' بحوالہ تاریخ امارت' ص۵۲)

"ما شاء اللّٰهُ کانَ و ما لم یشاء لم یکن" اور "ان کلمة 'لو' تفتحُ عملَ الشیطان" کے پیش نظر قلم اور زبان پر گرہ لگ جاتی ہے ورنہ دل کی گہرائیوں سے تو ہوک سی اُٹھتی ہے کہ کاش! حضرت شیخ الہندؒ کے تلامذہ اس مرحلہ پر یا حضرت کی وفات کے فوراً بعد اگر مولانا آزاد مرحوم پر دل نہیں ٹھکتا تھا تو اپنے میں سے کسی اور کے ہاتھ پر "اطاعت فی المعروف" کی بیعت کر لیتے تو بعد میں صرف مزاج اور افتادِ طبع اور رائے اور خیال کے اختلاف نے جو گل کھلائے وہ نہ کھلتے اور یہ حضرات ایک بنیان مرصوص کی مانند "آمُرُکُمْ بِخَمْسٍ: بِالْجَمَاعَةِ وَالسَّمْعِ وَالطَّاعَةِ وَالْهِجْرَةِ وَالْجِهَادِ فِی سَبِیْلِ اللّٰهِ" پر باحسن وجوہ عمل پیرا ہو سکتے۔

کہا جا سکتا ہے کہ حضرت شیخ الہندؒ کی زندگی میں ان کی "جماعت" کون سی "بیعت" پر قائم تھی جو عندالوفات یا بعدالوفات اس معاملے کی اس قدر اہمیت ہوگئی؟؟ تو اس کا جواب مسکت تو یہ قاعدہ کلیہ ہے کہ "کسی شئے کا عدم ثبوت اُس کے وجود کے عدم کو مستلزم نہیں ہے!" ویسے راقم کے نزدیک اس کی اصل وجہ وہی ہے جو نبی اکرم ﷺ کے اس طرزِ عمل کی تھی کہ مکہ میں پورے دس برس تک جو لوگ ایمان لائے اُن سے آپ نے کوئی بیعت نہیں لی لیکن مدینہ والوں سے آپؐ نے ایک چھوڑ دو دو بیعتیں لیں۔ اس کا سبب جو بادنیٰ تامل سمجھ میں آجاتا ہے' یہ ہے کہ مکہ میں آنحضور ﷺ بنفس نفیس موجود تھے اور جملہ اہل ایمان آپؐ کی اطاعت کرتے ہی تھے لہٰذا "قیام جماعت" یا "نظم سمع و طاعت" کے لیے کسی رسمی بیعت کی چنداں ضرورت نہ تھی' لیکن مدینہ والوں کا معاملہ مختلف تھا۔ وہاں کے لیے آنحضور ﷺ نے بیعت عقبہ ثانیہ کے موقع پر بارہ نقیب نامزد فرمائے تھے اور آپؐ کی عدم موجودگی میں وہاں کے مسلمانوں کو ان ہی کی اطاعت کرنی تھی۔ چنانچہ آپؐ نے ان سے ان جامع الفاظ میں بیعت لی جو حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے متفق علیہ روایت میں منقول ہیں:

((بَایَعْنَا رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ عَلَی السَّمْعِ وَالطَّاعَةِ فِی الْعُسْرِ وَالْیُسْرِ وَالْمَنْشَطِ وَالْمَکْرَہِ وَعَلٰی اَثَرَةٍ عَلَیْنَا وَعَلٰی اَنْ لاَّ نُنَازِعَ الْاَمْرَ اَهْلَهٗ وَعَلٰی اَنْ نَقُوْلَ بِالْحَقِّ اَیْنَمَا کُنَّا لَا نَخَافُ فِی اللّٰهِ لَوْمَةَ لَائِمٍ)) (متفق علیه)

"ہم نے بیعت کی رسول اللہ ﷺ سے سننے اور ماننے کی' تنگی میں بھی اور کشادگی میں

بھی اور طبیعت کی آمادگی کی کیفیت میں بھی اور ناگواری کے احساس کے باوصف بھی اور اس پر بھی کہ ہم پر خواہ کسی کو بھی ترجیح دی جائے' اور اس پر بھی کہ ہم اصحاب امر سے جھگڑیں گے نہیں البتہ حق بات ضرور کہیں گے خواہ کہیں بھی ہوں' اللہ کے معاملے میں کسی بھی ملامت کرنے والے کی ملامت کی پرواہ نہیں کریں گے۔"

بعینہٖ یہ معاملہ یہاں تھا کہ جب تک حضرت شیخ الہندؒ موجود تھے رسمی بیعت کے بغیر بھی کام چل سکتا تھا۔ اگرچہ واقعات یہ ہیں کہ مولانا ابوالکلام آزاد نے ۱۹۱۲ء میں "الہلال" جاری کرنے کے ایک ہی سال بعد یعنی ۱۹۱۳ء میں بعض حضرات سے بیعت لی اور اس طرح "حزب اللہ" وجود میں آگئی۔ لیکن ۱۹۱۵ء میں انہوں نے حضرت شیخ الہندؒ کو آمادہ کر لیا اور خود اپنے متوسلین سمیت ان کے ہاتھ پر بیعت کر لی۔ اس کے بعد ایک اختلافِ رائے پیش آگیا' مولانا آزاد کی رائے تھی کہ حضرتؒ ہندوستان ہی میں مقیم رہ کر تحریک چلائیں' لیکن بعض دوسرے اصحاب الرائے نے مشورہ دیا کہ حجاز تشریف لے جائیں اور وہاں مرکز بنائیں' مولانا آزاد کا فرمانا ہے کہ "افسوس کہ حضرتؒ نے دوسری رائے کو اختیار فرمایا!" بہرحال حجاز سے حضرتؒ کی گرفتاری عمل میں آگئی اور وہاں سے واپسی اس وقت ہوئی جبکہ شمع حیاتِ دنیوی گُل ہوا چاہتی تھی' چنانچہ یہ ہے وہ مرحلہ جس پر حضرتؒ کی شدید خواہش تھی کہ مولانا آزاد کے ہاتھ پر بیعت ہو جائے لیکن افسوس کہ بوجوہ ان کی یہ خواہش پوری نہ ہو سکی!

مولانا قاسمی مدظلہٗ کی تحریر سے مترشح ہوتا ہے کہ وہ صرف "جمعیت علماء ہند" ہی کو "حضرت شیخ الہند کی جماعت" قرار دیتے ہیں۔ راقم کے نزدیک یہ رائے دو اعتبارات سے محل نظر ہے:

ایک یہ کہ "جمعیت علماء ہند" کو "جماعت" قرار دینا ہی صحیح نہیں ہے' اسے زیادہ سے زیادہ "علماء ہند کا ایک مشترکہ پلیٹ فارم" قرار دیا جا سکتا ہے۔ سنن دارمیؒ کی مرفوع روایت میں یہ الفاظ مبارکہ موجود ہیں کہ "لاَ جَمَاعَةَ اِلاَّ بِالْاِمَارَةِ" لہٰذا چونکہ جمعیت علماء ہند—— "جماعت" نہ تھی اسی لیے اُس میں صدارت تھی "امارت" نہ تھی![1]

ثانیاً—— اگر "جماعت شیخ الہند" کے الفاظ وسیع تر معنی میں لیے جائیں تو اس کے اہم ترین "ارکان" میں سرفہرست نام آئیں گے مولانا عبیداللہ سندھی اور مولانا ابوالکلام آزاد کے'

(۱) اس موضوع پر بعض دلچسپ حقائق مولانا نعمانی کی اس تحریر میں مذکور ہیں جو اس شمارے میں شائع کی جا رہی ہے۔

پھر نام ہوں گے مولانا شبیر احمد عثمانی اور مولانا حسین احمد مدنیؒ کے، پھر نام آئیں گے ایک جانب کثیر تعداد میں علماء کرام کے، جن میں سرفہرست ہوں گے مولانا انور شاہ کاشمیریؒ، مولانا احمد سعید دہلویؒ، مفتی کفایت اللہؒ اور مولانا ابوالمحاسن سجاد بہاریؒ اور دوسری جانب ایک بڑی تعداد میں غیر علماء کے، جن میں سرفہرست ہوں گے حکیم اجمل خان اور ڈاکٹر انصاری وغیرہم۔

بلکہ یہ فہرست نامکمل رہے گی حضرت مولانا محمد الیاسؒ کے نام نامی اور اسم گرامی کے بغیر، اس لیے کہ اُن سے بھی یہ قول منقول ہے کہ: ''میں بھی حضرت شیخ الہندؒ کی جماعت ہی کا آدمی ہوں''۔ جس کے راوی ہیں مولانا افتخار احمد فریدی مراد آبادی مدظلہ۔ اگرچہ اس میں ہرگز کوئی شک نہیں کہ حضرت شیخ الہندؒ کے انتقال کے کچھ عرصے بعد ''جمعیت علماء ہند'' کے پلیٹ فارم پر مولانا مدنیؒ کی شخصیت اپنے جذبہ و جوش، محنت و مشقت، تواضع و ایثار اور مجاہدانہ سیرت و کردار کی بنا پر کلیۃً چھا گئی تھی۔ چنانچہ بقیہ حضرات میں سے جو بھی اپنے مزاج اور افتاد یا پالیسی اور حکمت عملی کے اعتبار سے ان سے ہم آہنگی اختیار نہ کر سکا وہ نہایت خاموشی اور حلم و وقار کے ساتھ ابتداءً غیر فعال اور رفتہ رفتہ غیر متعلق ہوتا چلا گیا اور اس طرح جہاد حریت اور تحریک استخلاصِ وطن کے میدان میں حضرت شیخ الہندؒ کے مسلمہ جانشین کی حیثیت حاصل ہوگئی مولانا مدنیؒ اور ان کی زیر قیادت جمعیت علماء ہند کو۔

مولانا آزاد مرحوم ۱۹۲۰ء کے بعد بھی اگرچہ جمعیت علماء ہند کے جلسوں میں شرکت فرماتے رہے، لیکن اصلاً انہوں نے کچھ علماء کے رویے سے بددل ہو کر [1] اور کچھ اس شعر کے

(۱) اس ضمن میں مولانا قاسمی مدظلہ نے مولانا آزاد کے حلم و وقار اور عالی ظرفی کا تذکرہ جن الفاظ میں کیا ہے وہ تو راقم کے نزدیک بہت قیمتی ہیں، یعنی:

> ''جس ہستی (مولانا آزاد) کی امامت کے مسئلے کو وہ (یعنی راقم الحروف) سند کے طور پر علماء دیوبند کے سامنے پیش کر رہے ہیں اُس دانش مند ہستی نے امامت کی تجویز کو حالات کے پیش نظر کس طرح لپیٹ کر رکھ دیا اور ساری زندگی مولانا مرحوم اسے زبان و قلم پر نہ لائے۔ امامت کی تجویز کی مخالفت گھر میں ہوئی۔ ان رفقاء سے ہوئی جو مولانا آزاد کی رفاقت میں کام کر رہے تھے مگر مولانا نے حالات کے تیور دیکھ کر ہمیشہ کے لیے خاموشی اختیار کر لی اور کبھی شکوہ و شکایت زبان پر نہ لائے!''

تاہم یہ عرض کرنے کو ضرور جی چاہتا ہے کہ اس کا مطلب یہ تو نہیں ہونا چاہیے کہ کوئی اور بھی اس اہم واقعہ کا ذکر نہ کرے اور اسلامیانِ ہند کی بیسویں صدی عیسوی کی تاریخ کے اس اہم باب کو ہمیشہ کے لیے پردۂ اخفاء ہی میں رہنے دیا جائے۔

مصداق کہ ؎

کچھ اور چاہیے وسعت میرے بیاں کے لیے
سفینہ چاہیے اس بحر بیکراں کے لیے!

اپنی طبیعت کی جولانیوں کے لیے انڈین نیشنل کانگریس ہی کے پلیٹ فارم کو مستقلاً اختیار کر لیا۔ تاہم چونکہ سیاسی میدان میں کانگریس اور جمعیت کی حکمت عملی ایک ہی رہی، لہٰذا ان دونوں بزرگوں کے مابین تازیست کوئی تصادم تو درکنار کوئی اختلاف رائے بھی سامنے نہیں آیا۔

''جماعت شیخ الہند'' کے ان متذکرہ بالا اساطین میں سے مولانا عبید اللہ سندھی مرحوم کے تفصیلی ذکر کی یہاں چنداں ضرورت نہیں ہے۔ اس لیے بھی کہ وہ ہندوستان سے باہر چلے گئے تھے اور ان کی واپسی کم و بیش رُبع صدی کے بعد ہوئی، اور اس لیے بھی کہ وہ ایک متنازعہ شخصیت ہیں اور ان کی زندگی کے آخری دَور کے نظریات و خیالات کے بارے میں متضاد آراء ملتی ہیں (البتہ قارئین میثاق کی دلچسپی کے اعتبار سے ان کے ایک قول کے نقل کرنے میں کوئی حرج محسوس نہیں ہوتا جس کے سامع و راوی حاجی عبد الواحد صاحب بحمد اللہ تا حال بقید حیات ہیں، ان کا کہنا ہے کہ وطن واپسی پر جب مولانا سندھی لاہور تشریف لائے اور انہوں نے اپنے شاگرد رشید یعنی حضرت مولانا احمد علی لاہوریؒ کے مشاغل کا مشاہدہ و مطالعہ کیا تو نہایت برہمی کے انداز میں فرمایا ''میں نے اسے اس کام کے لیے تو تیار نہیں کیا تھا!!'')۔ بہرحال اس میں ہرگز کوئی شک نہیں کہ مولانا عبید اللہ سندھی مرحوم حضرت شیخ الہندؒ ہی کی جماعت کے اہم فرد تھے اور مولانا احمد علی لاہوریؒ کا سلسلہ بھی یقیناً حضرت شیخ الہند ہی کے سلسلے کی ایک کڑی ہے۔

مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم کا معاملہ البتہ نہایت اہم بھی ہے اور بہت پیچیدہ بھی — لہٰذا قدرے طوالت طلب ہے!

سب کو معلوم ہے کہ مولانا نہ حضرت شیخ الہندؒ کے تلامذہ میں سے تھے نہ ہی باضابطہ مستند عالم دین تھے۔ تقویٰ کا علم تو اللہ ہی کو ہو سکتا ہے، تدین کے اعتبار سے وہ کسی طرح علماء کرام کے معیار پر پورے نہیں اترتے تھے اور خود ان کا قول ہے کہ ''ہم گلیم زُہد اور ردائے رندی کو بیک وقت اوڑھنے کے جرم کے مرتکب ہیں!'' مزید برآں وہ پختہ مقلد اور پکے حنفی بھی نہ تھے، بلکہ (حضرت مولانا عزیز گل مدظلہ سے ایک حالیہ ملاقات میں شنیدہ جملے کے مطابق) واقعتاً ''آزاد''

تھے! اور ''دینی فکر'' کے اعتبار سے ان کا سب سے قریبی اور مضبوط ترین تعلق امام ابن تیمیہؒ سے تھا (بلکہ برصغیر کے مسلمانوں کا امام ابن تیمیہؒ سے تعارف اصلاً اُن ہی کے ذریعے ہوا!)

دوسری طرف یہ بھی سب ہی جانتے ہیں کہ ذہانت اور فطانت کے اعتبار سے ان کا مقام بہت بلند تھا اور وہ واقعتاً ''ابوالکلام'' تھے، اسی طرح ادب و انشاء اور صحافت کے میدان کے بھی وہ عظیم شہسوار تھے، عربی اور فارسی پر تو انہیں عبور حاصل تھا ہی، متعدد یورپین زبانوں پر بھی دسترس رکھتے تھے، اور بالکل نوجوانی کی عمر میں وہ اچانک اس طرح اُبھر کر سامنے آئے تھے کہ وقت کی بڑی بڑی ہستیاں اور عظیم شخصیتیں حیران ہو کر رہ گئی تھیں۔

لیکن ان کی اصل اہمیت اس اعتبار سے تھی کہ انہوں نے مسلمانانِ ہند کی ایک بہت بڑی تعداد کو خوابِ غفلت سے بیدار کر دیا اور ان کے سامنے نہ صرف یہ کہ ''اعلاءِ کلمۃ اللہ'' یا ''قیامِ حکومت الٰہیہ'' کا نصب العین رکھ دیا بلکہ اس کے لیے صحیح طریق کار کی بھی نشاندہی فرمادی اور امام مالکؒ کا یہ قول یاد دلا کر کہ ''لا یصلح آخرُ ھٰذہِ الامّۃِ الّا بما صلح بہٖ اوّلھا'' واضح کر دیا کہ اس مقصد کے لیے پیش قدمی صرف اور صرف نبویؐ منہجِ عمل پر ممکن ہے! جس کے تین لازمی اجزاء ہیں: (۱) دعوت و تبلیغ اور تطہیر افکار و تعمیر سیرت — بذریعہ قرآن (۲) بجوائے حدیث نبویؐ: ((آمُرُکُمْ بِخَمْسٍ: بِالْجَمَاعَةِ وَالسَّمْعِ وَالطَّاعَةِ وَالْهِجْرَةِ وَالْجِهَادِ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ)) تنظیم اور شیرازہ بندی — بذریعہ بیعت (۳) جذبہ و جوشِ جہاد اور ذوق و شوقِ شہادت!

اہم ترین بات یہ کہ ذہانت و فطانت کی بہتات کے ساتھ ساتھ مولانا میں ہمت و عزیمت کی فراوانی کا عالم یہ تھا کہ ۱۹۱۲ء میں چوبیس برس کی عمر میں ''الہلال'' جاری کیا، جس نے ایک سال کی مختصر مدت کے اندر اندر برصغیر کے طول و عرض میں تہلکہ مچا دیا، اور پھر اگلے ہی سال یعنی ۱۹۱۳ء میں ''بیعت'' کی اساس پر بالفعل ''حزب اللہ'' قائم فرمادی۔

مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم کی شخصیت کا یہی پہلو ہے جس نے شیخ وقت اور استاذ العلماء حضرت شیخ الہندؒ کو ان کا گرویدہ بنا دیا، اور گرویدہ بھی اتنا کہ حضرت شیخ کے یہ الفاظ تو مشہور و معروف ہیں ہی کہ ''اس نوجوان نے ہمیں ہمارا بھولا ہوا سبق یاد دلا دیا ہے!'' (ان الفاظ کی توثیق راقم الحروف نے ذاتی طور پر حضرت مولانا محمد یوسف بنوریؒ سے بھی حاصل کر لی تھی!) مولانا سعید احمد اکبر آبادی مدظلہٗ کی روایت کے مطابق ۱۹۱۵ء میں حادثۂ کانپور کے بعد حالات

کو سنبھالنے کے لیے جب یوپی کے لیفٹیننٹ گورنر دارالعلوم دیوبند آئے اور اُن کے ایما پر مہتمم صاحب نے مولانا ابوالکلام آزاد کے داخلے پر پابندی لگا دی تو احتجاجاً حضرت شیخ الہندؒ نے بھی شرکت سے انکار فرما دیا — اور لوگوں کو سمجھانے بجھانے پر کہ حضرت! آپ اس نوجوان کو اتنی اہمیت کیوں دیتے ہیں؟'' حضرت شیخ الہندؒ نے جواباً یہ شعر پڑھا:

کامل اس طبقہ زہاد سے اٹھا نہ کوئی
کچھ ہوئے تو یہی رندانِ قدح خوار ہوئے!

۱۹۱۵ء میں مولانا نے خود — (گویا اپنی ''حزب اللہ'' سمیت!) حضرت شیخ الہندؒ کے دست حق پرست پر ''بیعت'' کی، اس کے فوراً بعد حضرتؒ کی حجاز روانگی ہوگئی۔ جہاں سے اسیری اور پھر اسیری سے رہائی کے بعد ۸/جون ۱۹۲۰ء کو واپسی ہوئی، اور ۳۰/نومبر ۱۹۲۰ء کو انتقال ہوگیا۔

حضرت شیخ الہندؒ کی حیاتِ دنیوی کے آخری پونے چھ ماہ جہاں اس اعتبار سے ''تاریخ دعوت و عزیمت'' کے ایک نہایت درخشاں باب کی حیثیت رکھتے ہیں کہ پیری اور ضعیف العمری کی درماندگی و نقاہت اور عوارض و امراض کے غلبہ و شدت کے باوصف وعلی الرغم ان کا جذبۂ جہاد اور جوشِ عمل پورے عروج پر تھا اور دینِ حق اور اُمتِ محمد (علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام) کے لیے ان کی دردمندی پورے شباب پر تھی، وہاں اس اعتبار سے بھی بہت اہمیت کا حامل ہے (اور اس پہلو پر افسوس ہے کہ کم ہی توجہ دی گئی ہے) کہ اسی کے دوران ان کے عمر بھر کے غور و فکر، مطالعہ و مشاہدہ، اور تجربات کا خلاصہ و نچوڑ اور بالخصوص اسارتِ مالٹا کی تنہائیوں کے سوچ بچار اور غور و خوض کا حاصل و لب لباب سامنے آتا ہے۔

چنانچہ یہی ہیں وہ ایام جن کے دوران حضرتؒ کی زبانِ حقیقت ترجمان سے وہ حکیمانہ جملے ادا ہوئے کہ:

> ''میں نے جہاں تک جیل کی تنہائیوں میں اس پر غور کیا کہ پوری دنیا میں مسلمان دینی اور دنیوی ہر حیثیت سے کیوں تباہ ہو رہے ہیں تو اس کے دو سبب معلوم ہوئے۔ ایک ان کا قرآن چھوڑ دینا، دوسرے آپس کے اختلافات اور خانہ جنگی، اس لیے میں وہیں سے یہ عزم لے کر آیا ہوں کہ اپنی باقی زندگی اس کام میں صرف کروں کہ قرآن کریم کو لفظاً و معناً عام کیا جائے۔ بچوں کے لیے لفظی تعلیم کے مکاتب بستی بستی میں قائم کیے جائیں۔ بڑوں کو عوامی درس قرآن کی صورت میں اس کے معانی سے روشناس کرایا جائے اور مسلمانوں کے باہمی جنگ و جدال کو کسی قیمت پر برداشت نہ کیا

جائے۔'' (ماخوذ از ''وحدتِ امت'' تالیف مولانا مفتی محمد شفیع ؒ)

غور کا مقام ہے کہ کیا یہ صدائے بازگشت نہیں ہے اُسی نعرۂ حق کی جو مولانا ابوالکلام آزاد نے ۱۹۱۵ء میں ''البلاغ'' کے پہلے شمارے (مورخہ ۱۲ر نومبر) میں ان الفاظ میں لگایا تھا:

''اگر ایک شخص مسلمانوں کی تمام موجودہ تباہ حالیوں اور بدبختیوں کی علت حقیقی دریافت کرنا چاہے اور ساتھ ہی یہ شرط بھی لگا دے کہ صرف ایک ہی علت اُصلی ایسی بیان کی جائے جو تمام علل واسباب پر حاوی اور جامع ہو تو اس کو بتایا جا سکتا ہے کہ علماء حق و مرشدین صادقین کا فقدان اور علماء سوء و مفسدین و دجالین کی کثرت۔ رَبَّنَآ اِنَّآ اَطَعْنَا سَادَتَنَا وَ كُبَرَآءَ نَا فَاَضَلُّوْنَا السَّبِيْلَاْ۔

اور پھر اگر وہ پوچھے کہ ایک ہی جملے میں اس کا علاج کیا ہے؟ تو اس کو امام مالکؒ کے الفاظ میں جواب ملنا چاہیے کہ ''لَا يَصْلُحُ اٰخِرُ هٰذِهِ الْاُمَّةِ اِلَّا بِمَا صَلَحَ بِهٖ اَوَّلُهَا'' یعنی امت مرحومہ کے آخری عہد کی اصلاح کبھی نہ ہو سکے گی' تاوقتیکہ وہی طریق اختیار نہ کیا جائے جس سے اس کے ابتدائی عہد نے اصلاح پائی تھی اور وہ اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ قرآن حکیم کے اصلی و حقیقی معارف کی تبلیغ کرنے والے مرشدین صادقین پیدا کیے جائیں۔''

پھر انہی ایام میں حضرتؒ نے سفر فرمایا علی گڑھ کا' جہاں سنگ بنیاد رکھا ''جامعہ ملیہ'' کا' اور وہاں ارشاد فرمائے یہ تاریخی جملے:

''اے نونہالانِ وطن جب میں نے دیکھا کہ میرے اس درد کے غم خوار' جس سے میری ہڈیاں پگھلی جا رہی ہیں' مدرسوں اور خانقاہوں میں کم اور اسکولوں اور کالجوں میں زیادہ ہیں تو میں نے اور چند مخلص احباب نے ایک قدم علی گڑھ کی جانب بڑھایا اور اس طرح ہم نے دو تاریخی مقاموں' دیوبند اور علی گڑھ کا رشتہ جوڑا!'' (''میثاق'' جنوری ۱۹۸۴ء' ص ۶۲۔ بحوالہ ''بیس بڑے مسلمان'')

غور کرنا چاہیے کہ یہ حضرت شیخ کا واقعی احساس تھا یا تصنع و تکلف پر مبنی دلجوئی اور مدارات کا معاملہ؟

پھر اسی سلسلۂ واقعات کا نقطۂ عروج ہے حضرتؒ کے ایما پر جمعیت علماء ہند کے اجلاس میں مفتی کفایت اللہ دہلویؒ کی تجویز اور مولانا احمد سعید دہلویؒ کی تائید کے ساتھ پیش ہونے والا ''امارت و امامت'' اور مولانا ابوالکلام آزاد کے ہاتھ پر ''بیعت'' کا معاملہ۔

غور طلب بات ہے کہ کیا امامت ہند کے لیے حضرت شیخ کی نگہ انتخاب کا مولانا آزاد کی ذات پر ٹک جانا محض رواروی کا معاملہ تھا؟ اور کیا اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ مسلم انڈیا کے مستقبل کے ضمن میں اُس مرحلے پر حضرت شیخ کی نگاہیں مولانا آزاد ہی کی قیادت و رہنمائی پر مرتکز ہو گئی تھیں؟ چشم تصور سے دیکھئے کہ کیا اُس مجمع میں بیہقیِ وقت مولانا انور شاہ کاشمیریؒ ایسے محدث و فقیہہ' علامۃ الہند مولانا معین الدین اجمیریؒ ایسی جامع معقول و منقول شخصیت اور خود تجویز امامت کے مجوز مفتی اعظم مولانا کفایت اللہ دہلویؒ ایسے فقیہہ و مفتی موجود نہ تھے جو مولانا آزاد کے مقابلے میں علم و فضل کے کوہ ہمالیہ کی حیثیت تو رکھتے ہی تھے عمر میں بھی اُن سے بارہ بارہ تیرہ تیرہ برس بڑے تھے۔ پھر کیا اسی اجتماع میں مولانا شبیر احمد عثمانیؒ ایسی شخصیت موجود نہ تھی جنہیں حضرت شیخ کا اس درجہ اعتماد حاصل تھا کہ اُن کے نمائندے کی حیثیت سے ان کی جانب سے خطبہ صدارت انہوں نے ہی پڑھا تھا اور جنہیں حضرت شیخ الہندؒ کے مزاج اور طرزِ فکر سے اس درجہ ہم آہنگی حاصل تھی کہ ترکِ موالات کے ضمن میں فتویٰ کی عبارت حضرت شیخ الہندؒ کو ان ہی کی پسند آئی تھی۔ پھر خواہ اس اجتماع سے غیر حاضر ہی سہی لیکن ہندوستان میں اُس وقت موجود نہ تھے؟ مولانا سید حسین احمد مدنیؒ جو علم و فضل اور تقویٰ و تدین کا پہاڑ تو تھے ہی' پورے ساڑھے چار سال حضرت شیخ کے شب و روز کے رفیق و خادم بھی رہے تھے؟ (واضح رہے کہ عمر میں مولانا آزاد سے مولانا عثمانیؒ تین برس اور مولانا مدنیؒ نو/دس برس بڑے تھے)۔ پھر اگر ان سب کی موجودگی میں حضرت شیخ کی نگاہِ انتخاب مولانا آزاد مرحوم پر ٹک گئی تو کیا اس سے یہ نتیجہ نکالنا غلط ہو گا کہ

اگر ''حضرت شیخ الہندؒ کی جماعت'' کسی حقیقت واقعہ کا نام ہے تو ۱۹۲۰ء میں اُس کا عظیم ترین مظہر مولانا

(۱) اس ضمن میں راقم کو شدت کے ساتھ احساس ہوتا ہے کہ مولانا آزاد سے اس درجہ محبت و وقعت اور ان کی جانب اتنی عنایت و التفات کی بنا پر حضرت شیخ کے بہت سے معتقدین و متوسلین کے احساسات و جذبات کی کیفیت اور خاص اس معاملے میں حضرت شیخ کے بارے میں ان کی سوچ کا رُخ کیا ہو گا۔ اس کا اندازہ حضرت یعقوب علیہ السلام کی حضرت یوسف علیہ السلام سے والہانہ محبت کی مثال سے لگایا جا سکتا ہے جس کے ضمن میں قرآن مجید میں آنجنابؑ کے فرزندوں کا یہ قول نقل ہوا ہے: ﴿اِنَّ اَبَانَا لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ﴾ اور خود آنجنابؑ کا یہ قول نقل ہوا ہے: ﴿لَوْ لَا اَنْ تُفَنِّدُوْنِ﴾

ابوالکلام آزاد کی ذات تھی![1]

اور اگر یہ صحیح ہے کہ یہ ۱۹۱۲ء تا ۱۹۲۰ء والے مولانا ابوالکلام آزاد ہی کی شخصیت کا معنوی تسلسل تھا جو ۳۲۔۱۹۳۳ء میں مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کی صورت میں سامنے آیا اور یہ ''الہلال'' اور ''البلاغ'' ہی کے پیغام کی صدائے بازگشت تھی جو ماہنامہ ''ترجمان القرآن'' کے ذریعے دوبارہ لوگوں کے کانوں تک پہنچی اور یہ ''حزب اللہ'' ہی کی بدلی ہوئی صورت تھی جو ۱۹۴۱ء میں جماعت اسلامی کی شکل میں سامنے آئی تو کیا یہ نتیجہ نکالنا غلط ہوگا کہ:

> مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودی مرحوم بھی حضرت شیخ الہندؒ ھی کی جماعت کے ایک فرد تھے اور ان کا ترتیب دیا ھوا قافلۂ غلبه و اقامتِ دین بھی "جماعت شیخ الہندؒ" ھی کی ایک شاخ تھا!

اور چونکہ راقم الحروف کو حق الیقین کے درجہ میں وثوق حاصل ہے کہ ابوالکلام آزاد مرحوم اور ابوالاعلیٰ مرحوم کی دعوت' اور ''حزب اللّٰہ'' اور ''جماعت اسلامی'' کی تنظیمی ہیئتیں ایک ہی سلسلہ کی کڑیاں ہیں' لہٰذا راقم کو نہایت پسند بھی آئے اور حد درجہ معنی خیز بھی نظر آئے مولانا اخلاق حسین قاسمی مدظلہٗ کے مولانا مودودی کے بارے میں ''علماء دیوبند کے فیض یافته عالم'' کے الفاظ!

جہاں تک مولانا آزاد مرحوم کی حیاتِ دنیوی کے ۱۹۲۰ء تا ۱۹۵۸ء کے دَور کا تعلق ہے مجھے اصلاً اُس سے نہ دلچسپی ہے نہ بحث۔ اور اپنی بیس سالہ پبلک لائف کے دوران میں نے اس کے بارے میں نفیاً یا اثباتاً بہت ہی کم کہا یا لکھا ہے۔ تاہم ریکارڈ درست رکھنے کے لیے عرض ہے کہ میرے نزدیک اس مسئلے کے تین گوشے ہیں: ایک ذاتی سیرت وکردار —— اور اس کا بھی ایک گوشہ ہے بنیادی انسانی کیریکٹر کا اور دوسرا گوشہ ہے تقویٰ و تدین کا! —— دوسرے نظریات وخیالات اور تیسرے سیاسی حکمت عملی۔

جہاں تک سیاسی حکمت عملی کا تعلق ہے وہ مولانا آزاد کی بھی وہی تھی جو مولانا حسین احمد مدنیؒ کی زیر قیادت جمعیت علماء ہند کی رہی' لہٰذا اُس کے ضمن میں تو بات یکجا ہوگی۔

جہاں تک بنیادی انسانی اخلاقیات اور اساسی سیرت وکردار کا تعلق ہے' پوری دنیا اُن کے کیریکٹر کا لوہا مانتی ہے اور سوائے اس کے کہ کانگریس اور مسلم لیگ کی سیاسی کشمکش اور رسہ کشی کی شدت کے دَور میں بعض رکیک باتیں بھی ان کے بارے میں کہی گئیں' جو ایک خاص دَور کی

شدتِ جذبات کا مظہر تھیں' اُن کی ذہانت وفطانت' فہم وبصیرت اور وسعت فکر ونظر کے ساتھ ساتھ ان کی پامردگی وبلند حوصلگی' جرأت وشجاعت اور ثبات واستقامت اور ان سب پر مستزاد اُن کی ذاتی شرافت ومروّت' عالی ظرفی' وضع داری اور وسعتِ قلب کے بارے میں دو رائیں ممکن نہیں' اس معاملے میں مولانا قاسمی مدظلہٗ نے خاص مسئلہ امامت وامارت کے ضمن میں ان کی جس وسعت ظرف کا ذکر کیا ہے اس کا حوالہ پہلے آچکا ہے۔

البتہ ان کے تقویٰ وتدین اور بعض نظریات وخیالات کے بارے میں متضاد آراء موجود ہیں۔ تاہم راقم کے نزدیک ان کی ذات کی حد تک تو کف لسان اور ''اُذْکُرُوْا مَوْتَاکُمْ بِالْخَیْرِ'' پر عمل اولیٰ وانسب ہے ہی' ان کے خیالات کے بارے میں بھی خود یہ رائے رکھنے کے باوجود کہ کچھ اپنی فلسفیانہ افتادِ طبع اور کچھ گاندھی جی کے قرب کے باعث وہ ان کے مرشد راجہ رام موہن رائے کے ایجاد کردہ ''نظریۂ وحدت ادیان'' سے کسی قدر متاثر ہو گئے تھے' راقم کا طرز عمل یہی ہے کہ کبھی اس کا ذکر ہوتا بھی ہے تو نہایت اجمال واختصار سے' اور

> راقم کے نزدیک اصل اهمیت اسلام کی اس اصولی و انقلابی دعوت کی هے جس کے برصغیر پاك و هند میں اس صدی کے داعئ اول کی حیثیت عطا فرمائی اللّٰه تعالیٰ نے مولانا ابو الکلام آزاد مرحوم کو۔

ذٰلِکَ فَضْلُ اللّٰہِ یُؤْتِیْہِ مَنْ یَّشَآءُ

یہی معاملہ راقم کا مولانا مودودی مرحوم کے ساتھ بھی ہے۔ کہ جہاں تک ان کے شخصی محامد ومحاسن یا کوتاہیوں اور تقصیروں کا معاملہ ہے وہ ان کی ذات سے متعلق تھا اور خصوصاً ان کی وفات کے بعد ان کے ''معائب'' کے بارے میں گفتگو لا حاصل ہی نہیں' مضرت بخش بھی ہوسکتی ہے' البتہ جہاں تک ان کے نظریات وخیالات کا تعلق ہے ان میں سے جو چیزیں قابل گرفت نظر آئیں ان پر تنقید وتبصرہ نہ صرف یہ کہ نامناسب نہیں' بلکہ لازمی اور ضروری ہے۔ چنانچہ خود راقم کو ان کے بعض نظریات سے شدید اختلاف ہے (جیسے ان کا نظریۂ حکمت عملی اور تاریخ اسلام کے صدر اول کے دور فتن کے حالات وواقعات کے ضمن میں ان کا تجزیہ اور بعض جلیل القدر صحابہ کرامؓ پر ان کی ناروا تنقید والزام تراشی۔ اسی طرح تصوف سے ان کا بُعد اور اس کی کلی نفی وتردید وغیرہ) اور ان پر راقم نے مختلف مواقع پر لکھا بھی ہے اور اپنی تقاریر میں

تفصیلی کلام بھی کیا ہے۔ اسی طرح راقم الحروف کو ان کی بعد از تقسیم ہند سیاسی حکمت عملی سے جو شدید اختلاف ہے وہ صرف قارئین ''میثاق'' کے حلقے ہی میں نہیں بلکہ اُس سے کہیں زیادہ وسیع حلقے میں معروف و مشہور ہے، تاہم ان کے ضمن میں بھی:

> راقم کے نزدیک اصل اہمیت اس اصولی دعوت و تحریک کی ہے جس کے وہ ۱۹۳۹ء تا ۱۹۴۷ء داعی و قائد رہے اور جو اصلاً تسلسل ہے مولانا ابو الکلام آزاد مرحوم ہی کی ۱۹۱۲ء تا ۱۹۲۰ء کی دعوت و تحریک کا۔ اور جس کی امانت کا بارِ گراں اب راقم الحروف اپنے ضعیف و ناتواں شانوں پر محسوس کرتا ہے۔ اور اس اصولی دعوت و تحریک کی حد تک چونکہ مولانا آزاد کو سند حاصل تھی حضرت شیخ الہندؒ کی، لہٰذا راقم اپنے آپ کو ان دو "واسطوں" سے اصلاً منسلک سمجھتا ہے شیخ الہندؒ حضرت مولانا محمود حسن رحمة اللّٰہ علیہ کے ساتھ!

جہاں تک مولانا حسین احمد مدنیؒ کی زیر قیادت جمعیت علماء ہند اور کانگریس میں شمولیت کی بنا پر مولانا آزاد مرحوم کی سیاسی حکمت عملی کا تعلق ہے، مجھے اس میں ہرگز کوئی اشتباہ نہیں ہے کہ وہ اصلاً حضرت شیخ الہندؒ ہی کی اختیار کردہ تھی۔ اور مجھے مولانا قاسمی مدظلہٗ کے ان الفاظ سے ہرگز کوئی اختلاف نہیں کہ ''مشترکہ جدوجہد کا منصوبہ شیخ الہندؒ اسارتِ مالٹا سے اپنے ساتھ لائے تھے'' بلکہ مولانا کی تحریر سے میرے علم میں یہ اضافہ ہوا ہے کہ ''ترکی قائدین نے شیخ کو یہ مشورہ دیا تھا کہ ہندوستانی مسلمان تنہا جدوجہد کر کے انگریزوں کو ہندوستان سے نہیں نکال سکتے۔ جیسا کہ وہ اب تک ناکام رہے ہیں''(۱) بلکہ اس ضمن میں مَیں مولانا مدنیؒ کے اس موقف کو صد فی صد درست سمجھتا ہوں جو انہوں نے اپنی خودنوشت سوانح ''نقشِ حیات'' میں پیش فرمایا ہے کہ

(۱) ان ہی دنوں ''بیس بڑے مسلمان'' نامی کتاب کی ورق گردانی کرتے ہوئے یہ بات بھی نظر سے گزری، اور مجھے اعتراف ہے کہ یہ بھی میرے علم میں اضافہ کا موجب بنی ہے کہ امیر حبیب اللہ خان والیٔ افغانستان نے بھی بعینہٖ یہی مشورہ مولانا عبید اللہ سندھی مرحوم کو دیا تھا۔

انگریز کی غلامی سے گلوخلاصی کے لیے ہندوؤں اور مسلمانوں کی مشترکہ جدوجہد کا راستہ تیرہویں صدی کے مجدد، مجاہد کبیر حضرت سید احمد بریلویؒ کا اختیار کردہ تھا(۱) اور اس مسئلے میں جو شدید اور جارحانہ تنقیدیں مولانا مودودی مرحوم نے جمعیت علماء ہند اور عرفِ عام کے مطابق ''نیشنلسٹ علماء'' پر کیں انہیں مَیں انتہا پسندی کا مظہر سمجھتا ہوں اور میرے نزدیک ایک دفاعی حربے کے طور پر ''متحدہ قومیت'' کے تصور کو عارضی طور پر اختیار کر لینا ہرگز نہ کفر تھا نہ شرک، جیسا کہ مولانا مودودی نے اپنی انتہا پسندی کی بنیاد پر اور اپنی انشاء پردازانہ مہارت کے ذریعے اُسے بنا دیا تھا!

اس موضوع پر بھی راقم کی ۱۹۷۴ء کی تحریر کا ایک اقتباس طوالت کے خوف کے علی الرغم ضروری محسوس ہوتا ہے۔ یورپی استعمار سے خلاصی حاصل کرنے کے لیے جو تحریکیں موجودہ صدی کے وسط میں مختلف مسلمان ممالک میں چلیں ان کے تذکرہ میں راقم نے لکھا تھا (''میثاق''، اکتوبر، نومبر ۱۹۷۴ء، حال مشمولہ کتاب ''سرافگندیم''):

> ''اس ضمن میں ایک اور حقیقت بھی پیش نظر رکھنی چاہیے کہ اگرچہ مختلف مسلمان ممالک میں حصول آزادی کی تحریکوں کی تقویت کے لیے جن علاقائی یا نسلی عصبیتوں کو استعمال (invoke) کیا گیا، انہیں بھی خالص اصولی اور نظری اعتبار سے اسلام کے نظامِ فکر

(۱) اس ضمن میں بھی راقم کی زندگی کا ایک اہم واقعہ ضبطِ تحریر میں آ جائے تو اچھا ہے۔ اور وہ یہ کہ ۵۶-۱۹۵۵ء میں جب ''نقش حیات'' شائع ہوئی تو مولانا مودودی مرحوم نے اس پر شدید تنقید ''ترجمان القرآن'' میں شائع کی۔ راقم اس وقت جماعت اسلامی کا فعال رکن ہی نہیں جماعت منٹگمری (حال ساہیوال) کا امیر بھی تھا۔ لیکن اس پر یہ اللہ کا بڑا فضل و احسان ہے کہ وہ اندھا بہرا مقلد کبھی بھی نہیں رہا۔ چنانچہ راقم نے بعمر (۲۳، ۲۴ سال) جامعہ رشیدیہ حاضر ہو کر اصل کتاب حاصل کی اور اس کا مطالعہ کیا، اور جب یہ حقیقت سامنے آئی کہ حضرت مدنیؒ کا موقف یہ ہے کہ ہم نے جو سیاسی لائحہ عمل اختیار کیا تھا وہ ہمارے اپنے اجتہاد پر مبنی نہیں تھا بلکہ یہ تو حضرت سید صاحبؒ کا اختیار کردہ تھا جسے ہم نے جاری رکھا ہے تو میں نے جماعت اسلامی ساہیوال کے اجتماع ارکان میں برملا یہ الفاظ کہے کہ ''اس معاملے میں مولانا مودودی سے علمی خیانت کا ارتکاب ہوا ہے، اس لیے کہ دیانتداری کا تقاضا ہے کہ یا تو مولانا مدنیؒ کی اس بات اور اس کے لیے جو حوالے انہوں نے پیش کیے ہیں ان کو چیلنج کیا جائے، ورنہ اب اگر تنقید کرنی ہے تو حضرت سید احمد بریلویؒ پر کریں۔ یہ علمی بددیانتی ہے کہ تنقید میں ان کا ذکر تک نہ کیا جائے، اور ساری جرح مولانا مدنیؒ پر کی جائے!''

کے ساتھ سوائے تباین وتضاد کے کوئی نسبت حاصل نہیں ہے۔ لیکن عالم واقعہ میں اس کے سوا کوئی چارہ کار موجود نہیں تھا۔ اس لیے کہ اسلام کے ساتھ مسلمانوں کا ذہنی وقلبی رشتہ اتنا قوی نہ رہا تھا کہ اسے کسی جاندار اور فعال تحریک کی اساس بنایا جا سکتا اور حصول استقلال کے لیے جس مؤثر مزاحمت (effective resistance) کی ضرورت ہوتی ہے‘ اس کی بنیاد خیالی یا جذباتی نہیں بلکہ حقیقی اور واقعی اساسات (concrete foundation) ہی پر رکھی جا سکتی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اگر ترک نیشنلزم کا جذبہ فوری طور پر بیدار نہ ہو گیا ہوتا تو شاید آج ترکی کا نام ونشان بھی صفحۂ ارضی پر موجود نہ ہوتا۔ اسی طرح اسلام سے جتنا کچھ حقیقی اور واقعی تعلق اس وقت مسلمانانِ عرب کو ہے وہ کسے معلوم نہیں۔ اندریں حالات عرب نیشنلزم ہی یورپی سامراج کے چنگل سے نکلنے کی جدوجہد کے لیے واحد موجود (The only available) بنیاد بن سکتا تھا اور ایک وقتی ضرورت اور دفاعی تدبیر کی حد تک اس میں کوئی قباحت بھی نہیں ہے بشرطیکہ اسے نظامِ فکر کی مستقل اساس کے طور پر قبول نہ کر لیا جائے اور حصول آزادی کے عبوری مقصد کی تکمیل کے بعد صحیح اسلامی فکر اور وحدت ملی کے شعور واحساس کو اجاگر کیا جائے۔

چنانچہ جمعیت علماء ہند کی سیاسی جدوجہد اسی اصول پر مبنی تھی بلکہ مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی خودنوشت سوانح ”نقش حیات“ میں تو ثابت کیا ہے کہ خود مجاہد کبیر حضرت سید احمد بریلوی رحمۃ اللہ علیہ مسلمانانِ پنجاب کو ”سکھا شاہی“ سے نجات دلانے کے بعد اسی اساس پر انگریزوں کے خلاف تحریک چلانے کا ارادہ رکھتے تھے“۔ (”میثاق“ اکتوبر‘ نومبر ۱۹۷۴ء)

البتہ راقم کے نزدیک جیسے جیسے حالات نے کروٹ لی اور صورتِ حال تبدیل ہوئی‘ قطع نظر اس کے کہ وہ ہندوؤں کی قدیم متعصب ذہنیت کا نتیجہ تھی‘ یا مسلمانوں کی ”ہزار سالہ“ غلامی سے پیدا شدہ انتقامی جذبہ کا شاخسانہ تھی‘ یا انگریزی سیاست اور اس کی شاطرانہ چال کی پیدا کردہ تھی‘ بہرحال اس پالیسی پر اس نظر ثانی کی ضرورت تھی جس کی جانب اشارہ حضرت شیخ الہندؒ کے خطبۂ صدارت ۱۹۲۰ء میں موجود ہے۔ یعنی

”مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ اب تک بہت جگہ عمل اس کے خلاف ہو رہا ہے۔ مذہبی معاملات میں تو بہت لوگ اتفاق ظاہر کرنے کے لیے اپنے مذہب کی حد سے گزر جاتے ہیں‘ لیکن محکموں اور ابوابِ معاش میں ایک دوسرے کی ایذا رسانی کے درپے رہتے ہیں۔ میں اس وقت جمہور سے خطاب نہیں کر رہا ہوں بلکہ میری گزارش دونوں قوموں کے زعماء (لیڈروں) سے ہے کہ ان کو جلسوں میں ہاتھ اٹھانے والوں کی

اکثریت اور ریزولیشنوں کی تائید سے دھوکہ نہ کھانا چاہیے کہ یہ طریقہ سطحی لوگوں کا ہے اور ان کو ہندوؤں اور مسلمانوں کے نجی معاملات اور سرکاری محکموں میں متعصّبانہ رقابتوں کا اندازہ کرنا چاہیے۔“ (ماخوذ از ”بیس بڑے مسلمان“)

اس ضمن میں بھی راقم اب کچھ کہنے کی بجائے اپنی ۱۹۶۷ء کی ایک تحریر کا اقتباس پیش کرنا مناسب سمجھتا ہے تاکہ اسے کسی وقتی سخن سازی سے تعبیر نہ کیا جائے:

”بدقسمتی سے اس موقع پر مسلمانانِ ہند کے مذہبی طبقوں اور خصوصاً تحریک شہیدینؒ اور جماعت مجاہدینؒ کے معنوی وروحانی وارثوں نے حالات کے رخ کو سمجھنے میں سخت غلطی کی اور وہ ہندوستان کی پوری مسلمان قوم کے سوادِ اعظم کے احساسات کا صحیح اندازہ کرنے میں بری طرح ناکام رہے!! اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ اس کا اصل سبب کیا تھا؟ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس کا اصل سبب وہ حد سے بڑھی ہوئی انگریز دشمنی ہو جو ان کے لائے ہوئے زندقہ والحاد اور مشرق وسطیٰ کے مسلمانوں پر ان کے بے پناہ مظالم سے پیدا ہوئی تھی۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس کا اصل سبب ان حضرات کی ضرورت سے زیادہ خود اعتمادی ہو جس کی بنا پر وہ یہ سمجھتے تھے کہ انگریز سے نبٹ لینے کے بعد ابنائے وطن کے مقابلے میں اپنے دین اور اپنے تہذیب وتمدن اور فی الجملہ اپنے قومی تشخص کا تحفظ کچھ مشکل نہ ہو گا۔ بہرحال ہوا یہ کہ ان حضرات نے اپنے لیے یہ راہ متعین کی کہ پہلے ہندوؤں کے ساتھ مل کر غیر ملکی حکمرانوں سے گلوخلاصی کرا لی جائے۔ ہندو مسلم معاملات اس کے بعد طے ہوتے رہیں گے۔ جبکہ بحیثیت مجموعی ہندوستان کے مسلمانوں نے اپنے لیے یہ لائحہ عمل طے کیا کہ وہ پہلے ہی سے تحفظات کے حصول کی جدوجہد کریں گے۔ اور اس امر کی سعی کریں گے کہ وطن اس طور سے آزاد ہو کہ اس میں ان کے جملہ حقوق اور فی الجملہ ان کے قومی تشخص کے تحفظ کی مکمل ضمانت حاصل ہو جائے۔

اس طرح ہندوستان کی مسلمان قوم کے سوادِ اعظم اور اس کے مذہبی طبقات کے مابین بُعد مزید بڑھ گیا‘ بلکہ آزادی کی جدوجہد میں یہ دونوں علیحدہ علیحدہ راہوں پر گامزن ہو گئے۔ اس صورت حال کا سب سے اہم نتیجہ جس کی جانب بہت کم لوگوں کی نگاہ گئی ہے‘ یہ نکلا کہ ہندوستان کے مسلمانوں کی قومی تحریک قوم کے بہترین افراد سے محروم ہو گئی۔ اب تک قوم کی پوری سیاسی ودینی قیادت جس طبقے کے ہاتھ میں رہی تھی اور جس میں ایک سے ایک بڑھ کر مخلص وبے نفس‘ محنتی وسخت کوش‘ آزمودہ وتجربہ کار اور ہر اعتبار سے منجھا ہوا اور سرد وگرم چشیدہ سیاسی کارکن موجود تھا وہ قوم سے بے تعلق ہو کر رہ گیا —— اور

کون کہہ سکتا ہے کہ آج خصوصاً پاکستان میں ہماری قومی زندگی جس شدید قحط الرجال سے دوچار ہے اس کا اصل سبب یہی نہیں ہے!" (شائع شدہ "میثاق" مئی ۱۹۶۷ء مشمولہ "اسلام اور پاکستان" ص: ۹۸)

چنانچہ راقم کے نزدیک اس صدی کے پانچویں دَہے تک حالات کی تبدیلی کے پیش نظر "حضرت شیخ الہندؒ کی جماعت" کے لیے صحیح تر طرزِ عمل وہ تھا جو حضرت شیخ ہی کے ایک دوسرے شاگرد و رفیق مولانا شبیر احمد عثمانیؒ نے اختیار کیا' اور جیسا کہ راقم اس سے قبل عرض کر چکا ہے' اب تو حسرت کے ساتھ یہی کہا جا سکتا ہے کہ اگر وہ پالیسی جمعیت علماء ہند نے مجموعی طور پر اختیار کر لی ہوتی تو برصغیر کی تاریخ کا رخ ہی اور ہوتا' اور آج ہم حیرانی و سرگشتگی کے "صحرائے تیہہ" میں نہ گھوم رہے ہوتے!!

اگرچہ اس اختلاف رائے کی بنا پر حضرت مدنیؒ اور ان کے جلیل القدر رفقاء پر سب وشتم یا ان کے خلوص واخلاص پر شک وشبہ یا ان کی شان میں گستاخی کو میں گناہ عظیم تصور کرتا ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ میں نے "میثاق" میں پروفیسر یوسف سلیم چشتی مرحوم ومغفور کا وہ "توبہ نامہ" بھی پوری آب وتاب کے ساتھ شائع کیا تھا جو انہوں نے اپنی اُن گستاخیوں کے ضمن میں حضرت مولانا احمد علی لاہوریؒ کی تاکید پر تحریر کیا تھا جو تحریک پاکستان کے عروج کے دَور میں حضرت مدنیؒ کی شان میں ان سے سرزد ہوئی تھیں۔ اور خود راقم نے جب ۱۹۷۰ء میں تھانوی حلقے کے ایک بزرگ عالم دین کی زبان سے مولانا مدنیؒ اور ان کے رفقاء کے بارے میں "کانگرسی مولوی" کی پھبتی سنی تو جو جذباتی ردِّعمل قلب کی گہرائیوں سے اُبھرا تھا اُسے شائع کر دیا تھا "میثاق" جون' جولائی ۱۹۷۰ء میں بایں الفاظ:

"ان حضرات پر "کانگریسی مولوی" کی پھبتی سن کر خدا جانتا ہے کہ دل خون کے آنسو رونے لگتا ہے۔ اس لیے کہ اس کی اولین زد مولانا حسین احمد مدنیؒ ایسے اکابر ملت' مجاہدین حریت اور زعمائے دین پر پڑتی ہے جن کے سیاسی موقف سے چاہے کسی کو کتنا ہی اختلاف ہو' اس میں کوئی شک نہیں کہ ان کے علم وفضل' تقویٰ وتدین' خلوص وبے نفسی' عزم وہمت' جانفشانی وتندہی' قربانی وایثار اور حلم وتواضع کی کوئی دوسری مثال مسلم ہند کی ماضی قریب کی تاریخ پیش نہیں کر سکتی۔

مولانا مدنیؒ کی زیارت کا شرف ہماری گناہ گار آنکھوں کو تو حاصل نہیں ہوا لیکن ان کی اُس "کرامت" کا مشاہدہ ہم نے بچشم سر کیا ہے کہ کتنے ہی مخلص اور متدین لوگوں کی

آنکھوں سے ان کا نام سنتے ہی آنسوؤں کا دریا بہہ نکلتا ہے۔ اور حلقۂ دیوبند کے مدارس کی وہ زیرتعلیم نوجوان نسل جس نے مولانا کو نہ دیکھا نہ سنا' ان کی توہین پر مرنے مارنے پر آمادہ ہو جاتی ہے۔"

"اس سلسلے میں ایک واقعہ بھی ایک مرتبہ مولانا اصلاحی نے سنایا کہ: جن دنوں کانگریس اور مسلم لیگ کی کش مکش زوروں پر تھی اور مولانا مدنیؒ اور ان کے رفقاء تنقید واستہزاء کا ہدف بنے ہوئے تھے' ایک روز خبر آئی کہ کچھ لیگی نوجوانوں نے مولانا کے ساتھ نہایت توہین وتذلیل کا معاملہ کیا۔ ان دنوں دارالاسلام سرنا' پٹھان کوٹ میں عام معمول یہ تھا کہ شام کے وقت ہم سب لوگ اکٹھے سیر کے لیے نہر پر جایا کرتے تھے (گویا یہ ان دنوں کی مرکز جماعت اسلامی کی شام کی نشست تھی! مدیر) وہاں مولانا مودودی سمیت کچھ لوگوں نے اس خبر پر خوش گپی کے انداز میں تبصرے کرنے شروع کیے' لیکن میں خاموش رہا۔ کچھ دیر بعد مولانا مودودی نے مجھ سے بھی کچھ کہنے کی فرمائش کی تو میں نے کہا: "میں اور کچھ تو نہیں جانتا لیکن یہ ضرور جانتا ہوں کہ جس قوم نے مولانا مدنیؒ ایسے شخص کی توہین کی ہے اس پر یقیناً کوئی بہت بڑی آفت آنے والی ہے" اس پر پوری مجلس پر خاموشی سی طاری ہو گئی۔ تھوڑی دیر کے بعد مولانا مودودی نے کہا کہ "مولانا آخر جو لوگ قوم کے احساسات وجذبات کا بالکل لحاظ نہ کریں ان کے ساتھ قوم کبھی گستاخی بھی کر گزرے تو کون سی بڑی بات ہے!" اس پر میں نے مزید تو کچھ نہ کہا لیکن اپنے فقرے کو دہرا دیا: "میں اور تو کچھ نہیں جانتا صرف یہ جانتا ہوں کہ جس قوم نے مولانا مدنیؒ ایسے شخص کی توہین کی ہے اس پر یقیناً کوئی بڑی آفت آنے والی ہے!"

"ذاتی تقویٰ وتدین کے علاوہ اب تو ایسے لوگوں کی کمی نہیں جو ان حضرات کے سیاسی موقف کے بارے میں اپنی رائے پر نظر ثانی کرنے پر مجبور ہو گئے ہیں۔ خود مولانا احتشام الحق تھانوی نے آج سے تقریباً تین (۱) سال قبل جامعہ اشرفیہ لاہور میں جمعہ کے اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے کچھ ایسے الفاظ کہے تھے کہ: "اب جو حالات پیش آ رہے ہیں ان کو دیکھ کر تو یہ خیال ہوتا ہے کہ تحریک پاکستان کے بارے میں ان حضرات کی رائے زیادہ درست تھی جو یہ کہتے تھے کہ پاکستان میں فروغِ اسلام کو نہیں' فرقِ باطلہ اور الحاد واباحیت کو حاصل ہو گا!" لیکن بات یہاں تک نہ پہنچے تو بھی کم از کم اتنا تو ہونا چاہیے کہ اس وقت ضدم ضدا میں جو زیادتیاں ایک دوسرے پر ہو گئی تھیں' اب کم از کم ان کا اعادہ تو نہ ہو۔

---

(۱) واضح رہے کہ یہ تحریر ۱۹۷۰ء کی ہے۔

ہم خود اپنا یہ ذاتی احساس بھی اس مقام پر بیان کیے بغیر نہیں رہ سکتے کہ بقیہ تمام معاملات اور قیل وقال ایک طرف کم ازکم ہندوستان کے مسلمانوں کے مسئلہ کے اعتبار سے تو کبھی کبھی شدت کے ساتھ محسوس ہونے لگتا ہے کہ جن لوگوں نے یہ کہا تھا کہ ''پاکستان کی اسکیم سے ہندوستان کے مسلمانوں کی قوت جو پہلے ہی تہائی ہے وہ تو تین حصوں میں بٹ کر مزید کم ہوجائے گی اور ہندوؤں کی طاقت بالکل یکجا اور مجتمع رہے گی' ان کا خیال کس قدر درست تھا۔

اس لیے کہ واقعہ یہ ہے کہ جب بھی ہندوستان سے مسلمانوں کے کسی تازہ قتل عام کی خبر آتی ہے دوسرے لاکھوں اور کروڑوں حساس مسلمانوں کی طرح راقم الحروف کے دل پر بھی چھریاں چل جاتی ہیں۔ اور نہ صرف یہ کہ یہاں کا سکھ چین کاٹ کھانے کو دوڑنے لگتا ہے' بلکہ سیدنا مسیحؑ کی تمثیل کے عین مطابق هر کھانا هندوستان کے مظلوم مسلمانوں کا گوشت اور هر مشروب ان کا خون نظر آنے لگتا هے۔

ہمیں دوسروں سے تو کوئی گلہ نہیں لیکن حیرت ناک افسوس ہوتا ہے حلقۂ دیوبند ہی کے ان اکابر پر جو نہ صرف درس وافتاء بلکہ تلقین وارشاد کی مسندوں پر رونق افروز ہوتے ہوئے بھی ایسے کٹھور دل واقع ہوئے ہیں کہ کچھ سیاسی یا روپہلی مصلحتوں کی بنا پر اب بھی ان خادمانِ دین وملت پر ''کانگریسی مولوی'' ایسی تحقیر آمیز پھبتی کسنے سے باز نہیں رہتے۔'' (''میثاق'' جون' جولائی ۱۹۷۰ء)

یہ اقتباسات ہماری آج سے لگ بھگ پندرہ برس قبل کی تحریروں کے ہیں اور ان کی طوالت کے باوجود ہم نے انہیں یہاں اس لیے نقل کر دیا ہے کہ یہ گمان نہ کیا جائے کہ یہ کوئی وقتی ''سخن سازی'' والا معاملہ ہے۔ ان سے یہ بات بلا شائبہ وشک وشبہ ثابت ہو جاتی ہے کہ مولانا مدنیؒ اور ان کے رفقاء گرامی کی سیاسی حکمت عملی سے اختلاف کے باوصف ہمارے دل میں ان کے خلوص واخلاص اور ان کی سیرت وکردار کی عظمت کے بارے میں نہ صرف یہ کہ کوئی شک نہیں رہا بلکہ مثبت طور پر ان کی علوّ ہمت اور مجاہدانہ کردار کی عظمت کا نقش قائم رہا ہے۔

بایں ہمہ راقم کو اعتراف ہے کہ مولانا اخلاق حسین قاسمی مدظلہ نے مولانا آزاد مرحوم' حضرت مدنیؒ اور مولانا حفظ الرحمٰن کی موجودہ بھارت میں اسلام اور مسلمانوں کی جن خدمات جلیلہ کا ذکر فرمایا ہے اس سے راقم کے دل میں ان حضرات کی قدر و وقعت اور محبت وعقیدت میں مزید اضافہ ہوا ہے جس کے لیے راقم مولانا کا ممنون ہے!

تاہم جیسا کہ راقم پہلے عرض کر چکا ہے ''جماعت شیخ الہندؒ'' کے اس مختصر ''تذکرے'' یا صحیح تر الفاظ میں ''اشاریئے'' میں مولانا شبیر احمد عثمانیؒ کا نام اگر سہواً رہ گیا ہے تب تو خیر' ورنہ راقم اپنا احتجاج ثبت (register) کرانا ضروری سمجھتا ہے۔ اس لیے کہ وہ بلاشبہ دارالعلوم دیوبند کے مایہ ناز فرزند اور حضرت شیخ الہندؒ کے منظورِ نظر تلامذہ اور معتمد ساتھیوں میں سے تھے۔

۱۹۰۸ء میں مولانا شبیر احمد عثمانیؒ دارالعلوم کے دورۂ حدیث کے امتحان میں اول آئے اور ۱۹۰۹ء ہی میں فتح پوری مسجد دہلی کے عربی مدرسے کی صدر مدرسی کے عہدے پر فائز ہوگئے۔ اُس زمانے میں دیوبند میں حضرت شیخ الہندؒ کی زیرِ ہدایت مولانا عبید اللہ سندھی مرحوم ومغفور نے ''جمعیت الانصار'' قائم کی ہوئی تھی' مولانا شبیر احمد عثمانیؒ نے اُس میں بھرپور حصہ لیا اور اس کے سالانہ جلسوں میں نہایت وقیع علمی مقالات پیش کیے۔ ۱۹۱۱ء سے مولانا نے اپنی مادرِ علمی دارالعلوم دیوبند ہی میں تدریس کی ذمہ داری سنبھال لی۔ اور اس کے ساتھ ہی گویا حضرت شیخ الہندؒ کے معتمد رفیق کار کی حیثیت بھی اختیار کر لی۔ چنانچہ اکثر وبیشتر دوروں اور سفروں میں وہ ہی حضرت شیخ کی رفاقت اور تقاریر کے ضمن میں نیابت ونمائندگی کی ذمہ داری ادا کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ جب ۱۹۱۹ء میں ''جمعیت علماء ہند'' کی تأسیس ہوئی تو اس کی ورکنگ کمیٹی اور مجلس منتظمہ کے لیے علامہ عثمانیؒ بھی منتخب کیے گئے۔ جامعہ ملیّہ کے افتتاح کے موقع پر حضرت شیخ الہندؒ سخت بیمار تھے۔ چنانچہ مولانا عثمانیؒ ہی نے ان کے نمائندے کی حیثیت سے خطبۂ صدارت تحریر بھی کیا اور پڑھا بھی۔ پھر جیسا کہ اس سے قبل بھی اشارہ کیا جا چکا ہے کہ ''ترکِ موالات'' کے ضمن میں جب حضرت شیخ الہندؒ نے یہ فرماتے ہوئے کہ ''مجھ میں انگریزوں کی نفرت کا جذبہ شدت لیے ہوئے ہے' مجھے اپنے نفس پر اطمینان نہیں ہے کہ حدود کی رعایت ہو سکے گی۔ اور حق تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ ''لَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰى اَنْ لَّا تَعْدِلُوْا'' (سوانح قاسمی بحوالہ معاصر ''الخیر'' بابت فروری ۱۹۸۵ء) اپنے تین شاگردوں یعنی: مفتی کفایت اللہ' سید حسین احمد مدنیؒ اور مولانا شبیر احمد عثمانیؒ کو فتویٰ لکھنے کا حکم دیا اور امتثالِ امر میں ان تینوں حضرات نے اپنے اپنے انداز میں فتویٰ تحریر کیا تو جس کی تحریر حضرت شیخ کو سب سے زیادہ پسند آئی وہ علامہ عثمانیؒ ہی کی تھی۔ چنانچہ حضرت شیخ کے نمائندے کی حیثیت سے یہ ''خطبہ'' مولانا عثمانیؒ ہی نے جمعیت علماءِ ہند کے اجلاس ۱۹۲۰ء میں پڑھ کر سنایا۔ اور راقم کے نزدیک تو ان سب چیزوں سے بھی کہیں بڑھ کر ہے یہ حقیقت کہ حضرت شیخ الہندؒ کے ''ترجمہ قرآن'' کے حاشیہ پر ''فوائد عثمانیؒ'' کی اشاعت نے ابدالآباد تک کے لیے حضرت شیخ کے نام نامی اور اسم گرامی کے ساتھ مولانا عثمانیؒ

کے نام کو لازم وملزوم کے درجے میں چسپاں کر دیا ہے۔

ان تفسیری فوائد کے بارے میں، جو بلا شبہ اپنی جگہ مکمل تفسیر کا درجہ رکھتے ہیں، خود حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ کے خیالات ملاحظہ ہوں:

''اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل وکرم سے علامہ زمان، محقق دوران حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی زید مجدہم کو دنیائے اسلام کا درخشندہ آفتاب بنایا ہے۔ مولانا نے موصوف کی بے مثل ذکاوت، بے مثل تقریر، بے مثل تحریر، عجیب وغریب حافظہ، عجیب تبحر وغیرہ کمالات علمیہ ایسے نہیں ہیں کہ کوئی شخص مصنف مزاج اس میں تامل کر سکے۔ قدرت قدیمہ نے مولانا شبیر احمد صاحب موصوف کی توجہ تکمیل فوائد اور ازالہ مغلقات کی طرف منعطف فرما کر تمام عالم اسلامی اور بالخصوص اہل ہند کے لیے عدیم النظیر حجت بالغہ قائم کر دی ہے۔ یقیناً مولانا نے بہت سی ضخیم تفسیروں سے مستغنی کر کے سمندر کو کوزے میں بھر دیا ہے۔'' (قرآن حکیم تفسیر عثمانی۔ مدینہ بجنور، بھارت)

اس پر مستزاد ہے علوم حدیث وفقہ اور علم الکلام میں ان کا مقام ومرتبہ، چنانچہ صحیح مسلمؒ کی شرح ''فتح الملہم'' کے بارے میں بیہقی وقت مولانا سید محمد انور شاہ کاشمیری کا فرمانا ہے کہ:

''یقیناً اپنے زمانہ کے علامہ مولانا مولوی شبیر احمد صاحب عثمانی دیوبندی کہ اس زمانہ کے محدث ومفسر ومتکلم ہیں اور احقر کے علم میں کوئی شخص اس کتاب (مسلم) کی خدمت ان سے زیادہ بہتر اور برتر نہ کر سکا۔ اس کی خدمت (شرح) کی طرف متوجہ ہو کر انہوں نے اہل علم کی گردنوں پر احسان کیا ہے۔''

اور بحیثیت ''متکلم اسلام'' مولانا عثمانیؒ کا درجہ کیا تھا اس کے ضمن میں کفایت کرے گی مولانا محمد منظور نعمانی مدظلہٗ کی یہ شہادت کہ:

''جن حضرات کو حضرت موصوف سے علمی استفادے کا موقعہ ہوا ہوگا، انہیں اس میں شک نہیں ہو سکتا کہ ذہانت وذکاوت، فکر کی دقت ومتانت اور دماغ کے سلجھاؤ میں وہ آپ ہی اپنی نظیر تھے۔ اسی طرح اپنے مدعا کو بہترین اسلوب اور نہایت دلنشین انداز میں بیان کرنے اور دقیق سے دقیق علمی حقیقتوں کو آسان کر کے سمجھا دینے کا جو خاص ملکہ اللہ تعالیٰ نے حضرت موصوف کو عطا فرمایا تھا، وہ ان کے لیے ان کے ربّ کا خاص عطیہ تھا۔

ایک مبصر ناقد نے مولانا کی بعض تقریریں سن کر ایک زمانہ میں کہا تھا اور بالکل صحیح کہا تھا کہ جب مولانا غیبی حقیقتوں کو دلیلوں اور مثالوں سے سمجھانے اور منوانے کی کوشش کرتے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ غیب اب شاید غیب نہیں رہے گا بلکہ شہود بن کر

سامنے آجائے گا۔'' (الفرقان لکھنؤ، بھارت، دسمبر ۱۹۴۹ء)

تو اس سب کے باوصف کیا صرف اس لیے کہ مولانا شبیر احمد عثمانی مولانا سید حسین احمد مدنیؒ کی سیاسی حکمت عملی سے کلیۃً اتفاق نہ کر سکے اور اگرچہ وہ ۱۹۴۶ء تک جمعیت علماء ہند کی مجلس عاملہ کے رکن رہے، لیکن اسی اختلافِ رائے (اور ہو سکتا ہے کہ اس میں مزاج وافتادِ طبع کے فرق یا بعض ذاتی نوع کی شکایتوں کو بھی دخل حاصل ہو) کی بنا پر ۱۹۲۸ء میں دارالعلوم دیوبند سے تعلق منقطع کر کے ڈابھیل چلے گئے۔ اور بالآخر اپنے سیاسی موقف کی وضاحت اور اس کے لیے بالفعل کام کرنے کے لیے ۱۹۴۵ء میں ''جمعیت علماء اسلام'' کا ایک جداگانہ پلیٹ فارم اختیار کرنے پر مجبور ہو گئے۔ ان کے نامِ نامی کو ''جماعت شیخ الہندؒ'' سے خارج کر دینا قرین انصاف ہوگا؟

بہرحال راقم الحروف کا تو حضرت شیخ الہندؒ کی شخصیت سے ابتدائی تعارف ہی تفسیری فوائد کی وساطت سے علامہ عثمانیؒ ہی کے ذریعے سے ہوا تھا اور راقم اپنی گردن پر ایک احسان عظیم سمجھتا ہے شیخ الہندؒ مولانا محمود حسن دیوبندی اور شیخ الاسلام مولانا شبیر احمد عثمانیؒ کا کہ علامہ اقبال مرحوم کے اشعار سے ایک مبہم سے جذبہ ملّی اور ''میلان الی القرآن'' کے حصول، اور ابتداءً مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی مرحوم اور مولانا امین احسن اصلاحی کی تصانیف اور بعد ازاں مولانا مودودی کی ''تفہیم القرآن'' اور مولانا اصلاحی کی ''تدبر قرآن'' کے ذریعے معانی قرآن کے ساتھ ابتدائی تعارف کے بعد جب راقم نے بھی آزادانہ طور پر علم وحکمت قرآن کے بحر ذخار میں غوطہ زنی شروع کی تو اس پورے عرصے میں میرا ''عروۃ وثقیٰ'' ترجمہ شیخ الہندؒ اور حواشی شیخ الاسلام ہی رہے ہیں۔ جنہوں نے مجھے بفضلہٖ تعالیٰ نئی نکتہ طرازیوں اور دور دراز کی تاویلوں سے حفاظت میں رکھا ہے۔

اور اس اعتبار سے بھی میں اپنے آپ کو بواسطہ شیخ الاسلام مولانا شبیر احمد عثمانیؒ منسلک اور متوسل سمجھتا ہوں شیخ الہندؒ حضرت مولانا محمود حسن دیوبندیؒ سے!

اس موضوع پر اس قدر طولِ کلام سے راقم الحروف نے اس لیے کام لیا ہے کہ جیسا کہ مولانا اخلاق حسین قاسمی مدظلہٗ نے بھی فرمایا، اور راقم بھی عرض کر چکا ہے، راقم کو یقین ہے کہ چودھویں صدی ہجری کے مجدد تھے حضرت شیخ الہندؒ! اور ان کی جامعیت کبریٰ کے مظہر اتم ہیں

ان کے تلامذہ بحیثیت مجموعی! اور اگرچہ ان میں سے کوئی بھی ان کی سی جامعیت کا مظہر تو نہ تھا تاہم ان میں سے ہر ایک نے برصغیر پاک و ہند کی ماضی قریب کی تاریخ پر نہایت گہرا اثر ڈالا ہے۔ اور پاکستان اور ہندوستان کے موجودہ مسلمان معاشرے میں مختلف عنوانات کے ذیل میں اور مختلف تحریکوں اور تنظیموں میں منقسم صورت میں جو بظاہر ایک دوسرے سے بہت مختلف بلکہ متضاد نظر آتی ہیں درحقیقت اثرات پھیلے ہوئے ہیں حضرت شیخ الہندؒ ہی کی عظیم ذاتِ جامع الصفات کے، بالکل اُس شان سے جو علامہ اقبال کے ان اشعار میں سامنے آتی ہے کہ: ؎

اڑا لی قمریوں نے طوطیوں نے عندلیبوں نے
چمن والوں نے مل کر لوٹ لی طرز فغاں میری!
اڑائے کچھ ورق لالے نے کچھ نرگس نے کچھ گل نے
چمن میں ہر طرف بکھری ہوئی ہے داستاں میری!

اور اب اصل ضرورت اس امر کی ہے کہ اس ظاہری افتراق و انتشار میں تالیف و اجتماع کی صورت پیدا کی جائے اور ان بکھرے ہوئے اثرات کو از سرِ نو سمیٹ کر تعمیرِ نو کی سعی کی جائے!! اس شان کے ساتھ کہ ؎

دھرتی کے کونوں کھدروں میں
پھر اپنے لہو کی کھاد بھرو!
پھر مٹی سینچو اشکوں سے
پھر اگلی رُت کی فکر کرو!!

اور اسی کے لیے کمر ہمت کَسی ہے حضرت شیخ الہندؒ کے اس ادنیٰ عقیدت مند، اور ان کے علم و فضل اور جذبہ و جوش عمل کے اس ادنیٰ خوشہ چیں نے، بفحوائے ؎

اخلاصِ عمل مانگ نیا گانِ کُہن سے
شاہاں چہ عجب گر بنوازند گدارا!

چنانچہ راقم اللہ کو گواہ بنا کر عرض کرتا ہے کہ راقم کے دل میں بلا تکلف و تصنع از خود محبت و عقیدت پیدا ہو جاتی ہے ہر اُس شخص سے جس کا ادنیٰ سے ادنیٰ تعلق رہا ہو حضرت شیخ الہندؒ سے۔ یا جسے ادنیٰ سے ادنیٰ نسبت حاصل ہو اُن کی ذات گرامی سے! اور راقم ہاتھ باندھ کر عرض کرتا ہے جملہ متوسلان حضرت شیخ الہندؒ کی خدمت میں کہ خدارا! وقت کی پکار کو کھلے اور متوجہ

کانوں اور کشادہ و ''حاضر'' دلوں سے سنیں، بفحوائے الفاظِ قرآنی:

اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَذِکْرٰی لِمَنْ کَانَ لَهٗ قَلْبٌ اَوْ اَلْقَی السَّمْعَ وَ هُوَ شَهِیْدٌ ○

رہا مولانا اخلاق حسین قاسمی مدظلہٗ کی تحریر کے آخری حصے میں وارد شدہ پند و نصائح کا معاملہ تو ان کے ضمن میں گزارش ہے کہ راقم نے جب مولانا اللہ بخش ایاز ملکانوی صاحب کے نام خط میں یہ لکھا:

''کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ علی گڑھ اور دیوبند کے مابین جس خلیج کو ابتدا ہی میں پاٹ دینے کی کوشش کی تھی حضرت شیخ الہندؒ نے، وہ اس کے بعد روز بروز وسیع سے وسیع تر ہوتی چلی گئی اور مسلمانانِ برصغیر کی ملّی اور قومی زندگی کا اصل دھارا علی گڑھ کے زیر اثر آتا چلا گیا۔ اور علماء کی حیثیت زندگی کی اصل منجدھار سے ہٹی ہوئی ایک پتلی سی دھار کی ہوتی چلی گئی، تا آنکہ اب وہ اپنے محدود دائرہ اثر کے جزیروں میں محصور ہو کر رہ گئے ہیں۔ اور یہ جزیرے بھی دن بدن ''نَاْتِی الْاَرْضَ نَنْقُصُهَا مِنْ اَطْرَافِهَا'' کے مصداق روز بروز مختصر سے مختصر ہوتے چلے جا رہے ہیں؟''

''پھر کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ علماء کرام جمعہ و جماعت، درس و خطابت، افتاء و ارشاد ایسی اہم خدماتِ جلیلہ اور قال اللہ اور قال الرسول ﷺ کی صداؤں اور دینی علوم کو زندہ رکھنے کے عظیم کارنامے، اور دینِ حق اور شریعتِ حقہ کے خلاف اٹھنے والی تحریکوں کے خلاف مساعی وعظیمہ کے باوصف غلبہ و اقامتِ دین کے مثبت مقصد کی جانب کوئی قابل لحاظ اور موثر اجتماعی تحریک نہیں چلا پا رہے؟ علماء دیوبند کے ایک حلقے سے تبلیغ دین کے عنوان سے جو عظیم حرکت شروع ہوئی، اس میں شک نہیں کہ وسعت کے اعتبار سے اس کی کوئی نظیر حال میں تو کیا ماضی میں بھی نہیں ملتی۔ لیکن کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ وہ بھی انفرادی اصلاح کے مرحلے سے آگے بڑھ کر کسی خطۂ ارضی پر دینِ حق کے واقعی قیام و نفاذ کے لیے کوئی راست اقدام کرنے کے بارے میں سوچنے پر بھی آمادہ نہیں!''

تو اس سے مقصود نہ کسی کی دل آزاری تھی، نہ توہین و تنقیص اور نہ طنز و تعریض، بلکہ صرف اور صرف صورتِ واقعہ کا ''کما ھِیَ'' بیان و اظہار تھا، تاکہ سینوں میں درد اور دلوں میں سوز و گداز پیدا ہو۔ ورنہ واقعہ یہ ہے کہ راقم کے قلب کی گہرائیوں میں حد درجہ قدر و وقعت اور کمال محبت و عقیدت موجود ہے ان علماء کرام کے لیے بھی جو شب و روز قال اللہ تعالیٰ اور قال الرسول ﷺ میں مصروف و مشغول رہتے ہیں یا جمعہ و جماعت اور وعظ و خطابت کے فرائض سرانجام دیتے

ہیں اور ان مربی اور مزکی حضرات کے لیے بھی جو لوگوں کے نفوس کے تزکیے، قلوب کی تنویر اور روح کے تجلیے میں منہمک رہتے ہیں۔ رہی جماعت تبلیغی، تو یہ تو راقم عرض کر ہی چکا ہے کہ اُسے بھی راقم حضرت شیخ الہندؒ کی جماعت کی ایک شاخ سمجھتا ہے، مزید برآں راقم کے قلب و ذہن میں اس کے نقل وحرکت کی وسعت اور اس کے اصحابِ عزم و ہمت کے خلوص و اخلاص کے احساس وشعور کی کوئی کمی نہیں۔ اور آخری بات یہ کہ راقم اللہ کے فضل و کرم کے پورے احساس و ادراک اور اس پر اُس (تعالیٰ) کی حمد وشکر کے ساتھ اپنا یہ ''مشاہدہ'' عرض کر رہا ہے کہ متعدد گوشوں اور مختلف واسطوں سے یہ اطلاعات مل رہی ہیں کہ اب اس حلقے میں بھی جہاد وقتال کی باتیں ہو رہی ہیں اور آخری منزل مقصود کے طور پر غلبہ و اقامت دین ہی کا ذکر ہو رہا ہے۔ راقم کے لیے یہ اطلاعات حد درجہ حوصلہ افزا اور اُمید بخش ہیں اور ان سے راقم کی اس توقع کو بہت تقویت حاصل ہوئی ہے کہ ان شاء اللہ خدمت دین کے یہ قافلے جلد ایک دوسرے سے متحد اور ایک ہی عظیم تر تنظیم وتشکیل میں ضم و مدغم ہو جائیں گے اور پھر اللہ نے چاہا تو وہ دن دُور نہیں رہے گا جب:

آسماں ہو گا سحر کے نور سے آئینہ پوش — اور ظلمت رات کی سیماب پا ہو جائے گی
آ ملیں گے سینہ چاکانِ چمن سے سینہ چاک — بزم گل کی ہم نفس باد صبا ہو جائے گی
پھر دلوں کو یاد آ جائے گا پیغام سجود — پھر جبیں خاکِ حرم سے آشنا ہو جائے گی
آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پہ آ سکتا نہیں — محو حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائے گی
شب گریزاں ہو گی آخر جلوۂ خورشید سے — یہ چمن معمور ہو گا نغمۂ توحید سے!

یعنی: وَيَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهُ لِلّٰهِ وَمَا ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ بِعَزِيْزٍ

پس نوشت

راقم الحروف اپنی اس تحریر کو مکمل کر کے حیدر آباد سندھ اور کراچی کے آٹھ روزہ دورے پر روانہ ہو گیا تھا۔ اُمید تھی کہ واپسی تک پرچہ کم از کم پریس میں جا چکا ہو گا لیکن خوشنویس صاحب کی علالت کے باعث پرچے کی تکمیل میں تاخیر ہو گئی۔ اس اثنا میں ایک مکتوب مولانا اخلاق حسین قاسمی مدظلہٗ کا دہلی سے موصول ہوا جس میں انہوں نے اپنی اُس تحریر کے بارے میں ہندوستان کے علماء کا ایک مجموعی تاثر اور بالخصوص مولانا افتخار احمد فریدی مدظلہٗ کے خط کا

اقتباس درج فرمایا ہے جس کے بارے میں تفصیلی گفتگو راقم نے اپنی مندرجہ بالا تحریر میں کی ہے۔ مولانا تحریر فرماتے ہیں:

گرامی قدر ڈاکٹر صاحب

سلام مسنون

ماہ جنوری کا میثاق ملا، بندہ کا مضمون ہندوستان کے علماء کو پسند آیا، اسی کے ساتھ آپ کی وسیع النظری اور اخلاص کی لوگوں نے تعریف کی کہ آپ نے مجھ ناچیز کی تنقید اور اختلافِ رائے کو گوارا فرمایا۔ مراد آباد کے مولانا افتخار فریدی صاحب کے پاس میثاق آتا ہے۔ موصوف نے لکھا ہے:

''حق تعالیٰ ڈاکٹر صاحب سے قرآن حکیم کی خدمت لے رہے ہیں۔ ان کے لیے آپ کی (مجھ ناچیز کی) رفاقت بہت مناسب ہے۔ میدان میں کام کرنے والوں کی اس طرح نگرانی کرنا تریاق کے حکم میں ہے۔''

اگر گنجائش ہو تو ۵ عدد پرچے ڈاک سے مجھے ارسال کر دیں تاکہ میں ہندوستان سے نکلنے والے جماعتی رسائل کو بغرض اشاعت ارسال کر دوں۔ چند کاپیاں اپنے مضمون کی فوٹو اسٹیٹ کرا کر بھیج رہا ہوں، لیکن پورا پرچہ جو اثر کرے گا وہ صرف میرے مضمون سے نہیں ہو گا۔

تمام رفقاء کرام کی خدمت میں سلام مسنون۔

اخلاق حسین قاسمی

۲۲؍جنوری ۱۹۸۵ء

راقم کو امید واثق ہے کہ مولانا موصوف اور حضراتِ علماء کرام میری ان گزارشات پر خوشدلی اور وسعتِ قلب کے ساتھ غور فرمائیں گے اور اپنی آراء سے نوازیں گے۔

خاکسار اسرار احمد عفی عنہ

مولانا محمد منظور نعمانی مدظلہٗ

مدیر الفرقان' لکھنؤ' کی تالیف

''مولانا مودودی کے ساتھ میری رفاقت کی سرگذشت اور اب میرا موقف''

کا پہلا باب

تحریک خلافت اور اس کے اثرات

مولانا محمد منظور نعمانی مدظلہٗ کی یہ تحریر راقم الحروف کی نگاہ سے اس وقت بھی گزری تھی جب یہ اوّلاً (لگ بھگ پانچ سال قبل) ''الفرقان'' میں شائع ہوئی۔ بعد ازاں جب یہ کتابی شکل میں شائع ہوئی تب بھی دیکھنے کا اتفاق ہوا تھا۔ اس ماہ جب راقم اپنی تحریر ''**حضرت شیخ الہند کی جماعت**'' کا مسودہ کاتب صاحب کے حوالے کر کے کراچی گیا تو وہاں اتفاقاً پھر مولانا کی تالیف دیکھنے میں آئی اور محسوس ہوا کہ اس کا پہلا باب برصغیر پاک و ہند کے مسلمانوں کی تاریخ کے اُسی دَور کے سیاسی و معاشرتی اور دینی و مذہبی پس منظر کو نکھار کر سامنے لاتا ہے جس کے بعض اعاظم رجال کا میری تحریر میں ذکر آیا ہے۔ چنانچہ اس کی اشاعت ان شاء اللہ قارئین ''میثاق'' کی دلچسپی کا موجب بھی ہو گی' اور خود میری تحریر میں اپنی کج مج بیانی کے باعث جو ابہام یا خلا رہ گیا ہے اسے بھی پُر کر دے گی۔ **اسرار احمد**

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

یورپ کی پہلی جنگ عظیم جو ۱۹۱۴ء سے شروع ہو کر ۱۹۱۸ء پر ختم ہوئی تھی' یاد ہے کہ اس کے خاتمہ تک ملک کی فضا ایسی تھی کہ عام آدمی یہ تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ کوئی دن ایسا بھی آئے گا کہ یہاں انگریزوں کی حکومت نہیں رہے گی' یا اس کے خلاف کوئی تحریک ہی اُٹھ سکے گی۔ پھر اس جنگ ہی کے نتیجہ میں وہ حالات پیدا ہوئے جو ہندوستان میں ''تحریک خلافت'' برپا ہونے کا سبب بنے' جس نے چند ہی مہینوں میں ہندوستان میں اور خاص کر ہندوستانی مسلمانوں میں وہ انقلاب برپا کر دیا جس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ خلافت کی تحریک اور آزادیٔ ہند کی تحریک دونوں ساتھ چل رہی تھیں' قیادت بھی دونوں کی مشترک تھی' مولانا محمد علی' شوکت علی

جس طرح تحریک خلافت کے قائد و علمبردار تھے اسی طرح تحریک آزادی کے بھی' اور گاندھی جی جس طرح تحریک آزادیٔ ہند کے لیڈر تھے اسی طرح تحریک خلافت کے بھی۔ پروگرام بھی دونوں تحریکوں کا ایک ہی تھا' جس کا اہم نکتہ تھا: انگریزی سرکار اور اس سے تعلق رکھنے والے اداروں سے عدم تعاون اور تاامکان انگریزی مصنوعات کا بھی بائیکاٹ۔ ہندو اور مسلمان دونوں پورے اشتراک بلکہ اتحاد کے ساتھ تحریک چلا رہے تھے' لیکن مسلمانوں کے جذباتی مزاج بے پناہ جوش و خروش اور مسئلہ خلافت کی خاص مذہبی نوعیت نے تحریک پر اسلامی رنگ غالب کر دیا تھا۔ ''اللہ اکبر'' ہندوؤں اور مسلمانوں کا مشترک نعرہ تھا۔ حد یہ تھی کہ بہت سے ہندو لیڈر جس طرح آزادیٔ ہند کے موضوع پر تقریر کرتے تھے اسی طرح خلافت کے مسئلہ پر بھی (جو مسلمانوں کا خالص مذہبی مسئلہ تھا) بالکل مسلمانوں کے انداز میں (بلکہ ایک حد تک مولویانہ انداز میں) تقریریں کرتے تھے۔ ہمارے ضلع مراد آباد میں میرے وطن سنبھل سے بالکل قریب ایک چھوٹا سا قصبہ سرسی ہے وہاں کے ماسٹر چندو لال (جنہوں نے تحریک ہی کی وجہ سے اسکول کی ملازمت سے استعفیٰ دے دیا تھا) بڑے اچھے مقرر تھے' ان کی تقریروں میں رسول اللہ ﷺ کا ارشاد: ((اَخرِجُوا الْیَھُوْدَ وَالنَّصَارٰی مِنْ جَزِیْرَۃِ الْعَرَبِ))[1] بالکل صحیح الفاظ میں اور صحیح اعراب کے ساتھ ان کی زبان سے بار بار سننا اچھی طرح یاد ہے۔ الغرض اس وقت ہندوستان میں انگریزی حکومت کے خلاف جو تحریک مشترکہ طور پر چل رہی تھی' اس پر اسلامی رنگ ایسا غالب تھا جس کا وہ لوگ تصور بھی نہیں کر سکتے جنہوں نے وہ منظر اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھا۔

جو دو' تین سال ''تحریک خلافت'' کے خاص عروج و شباب کے تھے' قریباً (۲۳-۲۲-۱۹۲۱ء) اُس زمانہ میں میرا قیام ایک طالب علم کی حیثیت سے ضلع اعظم گڑھ کے مشہور قصبہ مئو میں تھا۔ میرے خاص استاذ و مربی حضرت مولانا کریم بخش سنبھلیؒ (جن سے کچھ قرابت کا بھی تعلق تھا' مئو کی مشہور دینی درس گاہ ''دارالعلوم'' میں صدر مدرس اور شیخ الحدیث

(۱) یہ رسول اللہ ﷺ کی ایک وصیت کے الفاظ ہیں' مطلب یہ ہے کہ یہودیوں اور عیسائیوں کو جزیرۃ العرب سے باہر کر دیا جائے' اس کے حدود میں ان کو رہنے بسنے کی اجازت نہ دی جائے۔ خلافت کی تحریک جن بنیادوں پر برپا ہوئی تھی ان میں سے ایک رسول اللہ ﷺ کی یہ وصیت بھی تھی۔ تحریک خلافت کے سلسلہ کی تقریروں میں یہ حدیث اس کثرت سے دہرائی جاتی تھی کہ عوام بلکہ بہت سے ہندو بھائیوں کی زبان پر بھی چڑھ گئی تھی۔

تھے) مجھے تعلیم وتربیت کے لیے ان کے سپرد کر دیا گیا تھا' اس وجہ سے اس زمانہ میں میرا قیام مئو
میں تھا۔ یوں تو ملک کے سب ہی حصوں میں تحریک خلافت کا زور شور تھا لیکن مئو کا جو حال تھا وہ
شاید ہی ہندوستان کے کسی دوسرے بڑے یا چھوٹے شہر کا رہا ہو۔ معلوم ہوتا تھا کہ یہاں
اسلامی حکومت قائم ہوگئی ہے۔ چونکہ تحریک کے پروگرام میں سرکاری عدالتوں کا بائیکاٹ بھی
شامل تھا' اس لیے خلافت کمیٹی نے اپنی عدالتیں بھی قائم کی تھیں۔ یاد آتا ہے کہ مئو کے معمر
بزرگ شاہی جامع مسجد کے امام مولانا بشیر اللہ صاحب اور دارالعلوم دیوبند کے فاضل مولانا محمد
ضمیر صاحب اور مولانا عبداللہ شائق مرحوم جو ایک بہت تیز اور ذی استعداد اہل حدیث عالم
تھے' اس عدالت کے قاضی (جج) تھے۔ ہر قسم کے مقدمات اور نزاعات' مسلمانوں کے بھی اور
غیر مسلموں کے بھی اسی عدالت میں آتے تھے اور ان کے فیصلے کیے جاتے تھے اور فریقین بلا
چوں و چرا اِن فیصلوں کو مانتے تھے۔ مسلمانوں میں بعض آوارہ مزاج لوگ تاڑی پیتے تھے (جو
ایک طرح کی شراب ہے) خلافت کے رضا کار جو پولیس والی خدمات بھی انجام دیتے تھے' ان
کو پکڑ لاتے اور عدالت کے حکم سے ان کو کوڑے لگائے جاتے اور کوئی سرکشی اور سرتابی کا
مظاہرہ نہیں کرتا تھا۔ مئو میں سرکاری تھانہ اور اس طرح کے دوسرے سرکاری ادارے اور محکمے
موجود تھے لیکن اس عرصہ میں ان لوگوں کے لیے گویا کوئی کام نہیں تھا۔ عوام کے اخلاق و کردار
پر بھی غیر معمولی اثر پڑا تھا۔ جرائم اور لڑائی جھگڑے بڑی حد تک ختم ہو گئے تھے' کم از کم مئو کا تو
یہی حال تھا کہ وہ حقیقی معنی میں دارالامن بلکہ ایک طرح کا ''دارالاسلام'' بن گیا تھا۔

یہ فضا جیسا کہ عرض کیا گیا تقریباً دو' تین سال قائم رہی۔ اس کے بعد جب ۱۹۲۳ء میں
مصطفیٰ کمال پاشا نے الغاءِ خلافت کا فیصلہ کر دیا تو تحریک کی بنیاد ہی ختم ہوگئی۔ اسی زمانے میں
ملک میں بھی کچھ ایسے حالات پیدا ہوئے جن کے نتیجہ میں اس فضا کا خاتمہ ہو گیا' لیکن اس
''تحریک خلافت'' نے بعض بہت غیر معمولی اثرات چھوڑے' ان میں سے ایک یہ کہ عوام تک
کے قلوب میں انگریزی حکومت کی مخالفت بلکہ دشمنی رچ بس گئی اور اس کا خوف دلوں سے
بالکل نکل گیا۔ اور ہم جیسے لوگ بھی ''اپنی حکومت'' اور کم از کم اس فضا کا خواب دیکھنے لگے جو
تحریک خلافت میں قائم ہوگئی تھی اور راقم سطور نے مئو میں دیکھی تھی۔

دارالعلوم دیوبند کی طالب علمی اور اس کے بعد جمعیت العلماء سے وابستگی

جیسا کہ اوپر عرض کیا' یہ میری طالب علمی کا زمانہ تھا اس کے بعد تعلیم کے آخری دَور میں

دو سال میرا قیام دارالعلوم دیوبند رہا (واضح رہے کہ یہ اب سے قریباً ۶۰ سال پہلے کا
''دارالعلوم دیوبند'' تھا' جب کہ حضرت شیخ الہند کی وفات پر ۳/۴ سال ہی گزرے تھے۔)
تحریک خلافت نے جو جذبات پیدا کیے تھے' یہاں کی فضا نے ان کی آبیاری کی' اور ان کو اور
مشتعل اور مستحکم کیا۔ ''خلافت تحریک'' ختم ہو چکی تھی' ان جذبات کو کسی درجہ میں غذا دینے والی
مسلمانوں کی جماعت ''جمعیت العلماء ہند'' ہی میدان میں رہ گئی تھی اور ''دارالعلوم'' میں تعلیم
پائے ہوئے ہم جیسے لوگ اپنے اکابر کے تعلق سے اس کو اپنی جماعت سمجھتے اور اس سے اپنا رشتہ
جوڑتے تھے۔ راقم سطور کی بھی اسی سے وابستگی رہی۔

اُس وقت کی جمعیت العلماء

اس وقت وہ حقیقی معنی میں جمعیت العلماء تھی' یعنی صرف علماء ہی اس کے ارکان اور عہدہ
دار ہو سکتے تھے' سیاسی پارٹیوں کی طرح کی عام ممبر سازی اور الیکشن کا طریقہ اس وقت تک نہیں
اپنایا گیا تھا۔

اگرچہ ہماری جماعت دیوبند کے علاوہ دوسرے طبقوں اور حلقوں کے علماء کرام' مثلاً
مولانا ابوالکلام آزاد' حضرات علماء اہلحدیث' علماء فرنگی محل' علماء بدایوں مولانا آزاد سبحانی' مولانا
نثار احمد کانپوری' مولانا فاخر الہ آبادی (مولانا احمد رضا خاں صاحب بریلوی[1] کے خلفاء میں
سے) مولانا مختار احمد میرٹھی۔ ان کے بھائی مولانا نذیر احمد خجندی' مولانا عبدالعلیم میرٹھی
(پاکستان کے مولانا نورانی میاں کے والد ماجد مرحوم) وغیرہ بھی اس وقت اچھی خاصی تعداد
میں ''جمعیت'' میں شامل تھے اور وہ حضرات جمعیت کے ذمہ دارانہ عہدوں پر تھے لیکن ارکان
اور کارکنوں میں غالب اکثریت جماعت دیوبند ہی کے علماء کی تھی۔ اسی دَور کا یہ لطیفہ مشہور ہے
کہ کسی موقع پر مولانا عبدالماجد بدایونی مرحوم نے (جو مسلکاً بدایونی حنفی تھے) مولانا ابوالکلام
آزاد سے (جو سلفی المسلک تھے) بطور شکایت کے کہا کہ ہماری 'جمعیت'' کا نام تو ''جمعیت
العلماء ہند'' ہے لیکن واقعہ میں یہ جمعیت العلمائے دیوبند بنتی جا رہی ہے' تو مولانا آزاد نے
اپنے خاص انداز میں فرمایا کہ میرے بھائی! ہندوستان میں جب بھی جمعیت العلماء بنے گی تو

(۱) مولانا احمد رضا خان صاحب بریلوی' تحریک خلافت کے سخت مخالف تھے انہوں نے اس سلسلہ
میں حسب عادت متعدد رسالے بھی لکھے تھے لیکن مولانا مختار احمد میرٹھی وغیرہ ان کے بعض
خلفاء نے اس مسئلہ میں ان سے گویا بغاوت کر دی تھی۔ نعمانی

اس کی ہیئت ترکیبی یہی ہوگی' کیونکہ علماء تیار کرنے کا کام یہاں دیوبند ہی نے کیا ہے تو جب
علماء کو جمع کیا جائے گا تو انہیں کی تعداد زیادہ ہوگی۔ اگر ہم نے آپ نے یہ کام کیا ہوتا تو ہماری
تعداد زیادہ ہوتی۔

آزادی کی جدوجہد میں کانگرس کے ساتھ اشتراکِ عمل

ملک کی آزادی کی جدوجہد میں ''انڈین نیشنل کانگرس'' کے ساتھ اشتراک عمل کا جو
اصول تحریک خلافت کے دور میں اپنایا گیا تھا ''جمعیت العلماء'' بعد میں بھی اس پر برابر قائم
رہی اور آزادی حاصل کرنے کے لیے اس نے اس کو ضروری اور ناگزیر سمجھا۔ لیکن

آزادی کے بارے میں جمعیت کا خاص تصور

یہاں یہ بات خاص طور سے قابل ذکر ہے کہ ملک کی آزادی کے بارے میں ''جمعیت
العلماء'' کا ایک خاص تصور تھا جو اس دَور کے ''جمعیت'' کے اجلاسوں کے خطباتِ صدارت
کے اوراق میں محفوظ ہے اور آج بھی دیکھا جا سکتا ہے (خاص کر حضرت مولانا محمد سجاد نائب
امیر شریعت بہار کے اجلاس مرادآباد کے خطبۂ صدارت میں اور حضرت مولانا سید سلیمان ندوی
کے اجلاس کلکتہ کے خطبۂ صدارت' اور حضرت مولانا محمد انور شاہؒ کے اجلاس پشاور کے خطبہ
صدارت میں) اور جمعیت کے اجلاسوں کی تجاویز میں۔ مجھے یاد ہے کہ اُس زمانے کے جمعیت
العلماء کے دستور میں **مقصد و نصب العین** کے تحت غالباً پہلی ہی دفعہ کے الفاظ یہ تھے
''شرعی نصب العین کے مطابق ہندوستان کی مکمل آزادی''۔

بہرحال ملک کی آزادی کے بارے میں جمعیت العلماء کا ایک خاص تصور تھا' اور اسی
تصور کی بنا پر اس کے اکابر و رہنما آزادی کی جدوجہد کو اپنے لیے جہاد فی سبیل اللہ سمجھتے تھے اور
اسی نیت سے اس کے راستہ میں قربانیاں دیتے تھے۔

شدھی سنگٹھن کی تحریک کا دَور

تحریک خلافت کے اضمحلال اور پھر خاتمہ کے بعد کئی برس تک بعض ایسے اسباب کی وجہ
سے جن کی تفصیل کا یہ موقع نہیں' انگریزی حکومت کے خلاف جدوجہد کا محاذ ٹھنڈا رہا تھا۔ اُس
زمانہ میں آریہ سماجیوں کی اٹھائی ہوئی **شدھی سنگٹھن** تحریک کے نتیجہ میں ہندو مسلم اتحاد بھی درہم
برہم ہو گیا اور دین کی فکر رکھنے والے مسلمانوں کو دین کی حفاظت کے لیے اس تحریک کے جوابی

اقدامات کی طرف متوجہ ہونا پڑا۔ اس دَور میں جمعیت العلماء کی بھی مساعی زیادہ تر اسی شعبہ کی
طرف مصروف رہیں۔ اسی زمانہ میں ''جمعیت العلماء'' نے اپنا اخبار ''الجمعیۃ'' نکالنے کا فیصلہ کیا۔
مولانا مودودی اس کے ایڈیٹر تھے اور وہ ان کی نوجوانی کا زمانہ تھا۔ یہ عاجز سب سے پہلے ''الجمعیۃ''
ہی کے ذریعہ ان کے نام سے آشنا ہوا۔ جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے' اس زمانہ میں انگریزی حکومت
کے خلاف جدوجہد کا محاذ ٹھنڈا تھا' کانگرس کی طرف سے بھی کوئی تحریک جاری نہیں تھی۔

۱۹۳۰ء سے جنگ آزادی کا پھر آغاز

۱۹۳۰ء میں کانگرس نے انگریزی حکومت کے خلاف پھر آزادی کی جنگ شروع کی۔
جمعیت العلماء نے بھی اپنے امروہہ کے اجلاس میں اس جنگ میں کانگرس کے ساتھ اشتراک
عمل کا فیصلہ کیا اور وہ پھر کانگرس کے ساتھ جنگ کے میدان میں آگئی۔

اس دَور میں میرا حال اور مشاغل

عرض کیا جا چکا ہے کہ راقم سطور بھی جمعیت العلماء سے وابستہ تھا۔ میری یہ وابستگی اگرچہ
ذہنی اور فکری لحاظ سے بہت عمیق اور راسخ تھی اور میں ملک کی آزادی کے سلسلہ میں اس کی
جدوجہد اور قربانیوں کو پورے یقین و اطمینان کے ساتھ ''فی سبیل اللہ'' ہی جانتا اور سمجھتا تھا'
لیکن یہ واقعہ ہے کہ اس کی اس سیاسی جدوجہد میں میرا عملی حصہ بس برائے نام ہی رہا۔ اس دَور
میں تعلیم و تدریس میرا خاص مشغلہ تھا' اس کے علاوہ آریہ سماجیوں کی برپا کی ہوئی ''شدھی'' کی
تحریک نے (جس کا ذکر اوپر آ چکا ہے) اس زمانہ میں آریہ سماج اور مسلمانوں کے درمیان
مناظرہ' مباحثہ کا میدان گرم کر دیا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے مجھے اس میدان میں اسلام کی وکالت و
حمایت کی کچھ صلاحیت عطا فرمائی تھی اس لیے میں اس میں بھی حصہ لیتا تھا۔ قادیانی فتنہ اور
قادیانی مبلغین کی سرگرمیاں بھی اس زمانہ میں عروج پر تھیں' اللہ تعالیٰ نے ان کے مقابلے اور
ان کے فتنہ سے امت کی حفاظت کی خدمت کی توفیق بھی اس عاجز کو عطا فرمائی تھی۔

نیز قریباً اسی زمانہ میں یہ واقعہ پیش آیا کہ نجد کی ''وہابی حکومت'' کے اس وقت کے فرمانروا
سلطان عبدالعزیز بن سعود نے شریف حسین کو (جس نے جنگ عظیم کے دوران انگریزوں کی
مدد سے سلطنت عثمانیہ ترکی اور خلیفۃ المسلمین سے بغاوت کر کے حجاز مقدس پر اپنی حکومت قائم
کر لی تھی) حرمین شریفین اور پورے علاقہ حجاز سے بے دخل کر کے وہاں اپنا اقتدار قائم کر لیا اور
اپنے مسلک کے مطابق حکومتی طاقت سے وہاں دینی اصلاحات نافذ کیں' اس سلسلہ میں انہوں

نے وہ قبے بھی تڑوا ڈالے جو مکہ مکرمہ کے قبرستان جنّۃ المعلاۃ اور مدینہ منورہ کی جنّۃ البقیع میں (رسول اللہ ﷺ کی ہدایت کی صریح خلاف ورزی کرتے ہوئے) بعض اہل بیت اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی قبور پر کسی زمانہ میں بنا لیے گئے تھے۔ اس واقعہ پر ہندوستان کے مختلف طبقوں کے قبوریین ومبتدعین اور شیعہ حضرات نے متحدہ محاذ بنا کر ''وہابیوں'' اور ''وہابیت'' کے خلاف زبان وقلم کی ایک طوفانی جنگ برپا کر دی اور یہاں حملوں کا خاص نشانہ شاہ اسمٰعیل شہید اور ان کی دعوتِ توحید وسنت کی علمبردار جماعت دیوبند کے اکابر کو بنایا گیا اور تکفیر وتفریق اور فساد انگیزی کا وہ فتنہ جو مولانا احمد رضا خان بریلوی نے برپا کیا تھا اور جو تحریک خلافت میں بالکل دفن ہو گیا تھا پھر زندہ ہو کر کھڑا ہو گیا اور اس میدان میں بھی یہاں مناظروں، مباحثوں کا بازار گرم ہو گیا۔ راقم سطور نے اللہ کی توفیق سے اس میدان میں بھی مسلک حق واہل حق کی حمایت و وکالت میں حصہ لیا۔ الغرض ایک طویل زمانہ تک تعلیم وتدریس کے ساتھ اسلام کی وکالت اور دین حق واہل حق پر ہونے والے حملوں کی مدافعت بھی اس عاجز کا خاص مشغلہ رہا۔ اللہ تعالیٰ اپنے کرم سے اس کو بھی قبول فرمائے اور اس سلسلہ کی تقصیرات معاف فرمادے۔

مولانا مودودی کے رسالہ ترجمان القرآن کا آغاز

غالباً ۱۹۳۲ء شروع ہو چکا تھا۔ حضرت مولانا عبدالشکور صاحب فاروقی لکھنوی نے ایک ادارہ لکھنؤ میں ''دارالمبلغین'' کے نام سے قائم کیا جس کا مقصد یہ تھا کہ ''دارالعلوم دیوبند'' جیسے بڑے دینی مدارس کے باصلاحیت فارغ التحصیل فضلاء کو وقت کے تقاضوں کے مطابق اسلام کی دعوت وتبلیغ اور بیرونی حملوں اور اندرونی فتنوں سے اس کی حفاظت ومدافعت اور اس کے لیے تحریر وتقریر اور مناظرہ مباحثہ کی تربیت دی جائے۔ مولانا مرحوم نے اس ادارہ کی خدمت کے لیے اس عاجز کو بھی طلب فرمایا اور اسی سلسلہ میں اس دَور میں چند مہینے میرا قیام لکھنؤ میں رہا۔ اس وقت مولانا کا ماہنامہ ''النجم لکھنؤ'' جاری تھا، اس کے دفتر میں حیدرآباد سے ایک نیا رسالہ ''ترجمان القرآن'' آنا شروع ہوا۔ جس پر ایڈیٹر کی حیثیت سے مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کا نام ہوتا تھا۔ مولانا لکھنوی مرحوم کے صاحبزادے مولوی عبدالمومن فاروقی مرحوم نے جو خود نوجوان صاحب قلم تھے، اس کا ایک شمارہ دیکھنے کے لیے مجھے دیا، میں نے محسوس کیا کہ اس کے ایڈیٹر مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کو اللہ تعالیٰ نے دینی مسائل وحقائق کو عصر حاضر کے تقاضوں کے مطابق سمجھانے کی غیر معمولی صلاحیت اور قدرت عطا فرمائی ہے اور اسلام کے

بارے میں مستشرقین کی کتابوں اور مغربی علوم وافکار کے پیدا کیے ہوئے شکوک وشبہات جڑ سے اکھاڑ کے دلوں میں اطمینان ویقین پیدا کرنے میں ان کو خاص کمال حاصل ہے۔ اُس کے بعد سے میں ''ترجمان القرآن'' کے ہر شمارہ کا منتظر رہنے لگا، جب وہ آتا تو مولوی عبدالمومن مرحوم مجھے پہنچاتے اور میں بڑے شوق اور اہتمام سے اس کا مطالعہ کرتا۔

بریلی سے الفرقان کا اجرا

لکھنؤ میں اپنے قیام ہی کے زمانے میں، میں نے ''الفرقان'' جاری کرنے کا فیصلہ کیا اور محرم ۱۳۵۳ھ (مارچ ۱۹۳۴ء) سے بریلی سے اس کا اجرا ہوا، اور اب ''ترجمان القرآن'' اس کے تبادلہ میں میرے پاس براہ راست آنے لگا۔ وہ مجھے اتنا عزیز تھا اور میں اس کا ایسا عاشق تھا کہ اس سے پہلے پورے ایک سال کے شمارے جو میں نے لکھنؤ میں دیکھے تھے اور اب میرے پاس نہیں تھے وہ بھی میں نے دفتر ''ترجمان القرآن'' حیدرآباد سے بقیمت منگوا لیے اور اس کا پورا فائل اپنے پاس رکھنا ضروری سمجھا ـــــ واقعہ یہ ہے کہ ترجمان القرآن کے مطالعہ سے میرے قلب میں مولانا مودودی کی وقعت اور محبت میں برابر اضافہ ہوتا رہا۔ میں ان کو اس دَور میں ''متکلم اسلام'' لکھتا تھا اور نجی طور پر بھی اور ''الفرقان'' کے ذریعہ بھی ''ترجمان القرآن'' کے مطالعہ اور خریداری کی لوگوں کو ترغیب ودعوت دیتا تھا۔

ترجمان القرآن خالص علمی ودینی رسالہ

اس وقت ''ترجمان القرآن'' خالص دینی اور علمی رسالہ تھا جس میں ملک کی سیاسی تحریکات اور پولیٹیکل معاملات کا کوئی تذکرہ نہیں ہوتا تھا۔ برطانوی حکومت جو اس وقت دنیا کی سب سے بڑی ''طاغوتی حکومت'' تھی اور ہندوستان پر اور عالم اسلام کے بہت بڑے حصہ پر براہ راست یا بالواسطہ مسلط تھی اس کے خلاف بھی کبھی کچھ نہیں لکھا جاتا تھا۔ ''حکومت الٰہیہ'' ''اقامت دین'' ''اسلامی نظام'' یا ان مقاصد کے لیے کسی جماعت کی تنظیم وتشکیل کا بھی کوئی ذکر اس کے صفحات میں نہیں ہوتا تھا۔ یہ سب چیزیں اس دَور میں اُس کے دائرہ بحث سے بالکل خارج تھیں۔

ترجمان القرآن میں سیاسی مضامین کا آغاز

''ترجمان القرآن'' کے اجرا کے چوتھے سال ۱۹۳۶ء میں انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء کی بنیاد پر ہندوستان میں پہلا جنرل الیکشن ہوا۔ اُس دَور میں جداگانہ انتخاب کا طریقہ رائج تھا،

مسلمان نمائندوں کو مسلمان ہی منتخب کرتے تھے اور ہندو نمائندوں کو صرف ہندو۔ اس الیکشن کے نتیجہ میں ملک کے سات صوبوں میں کانگرس کو قطعی اکثریت حاصل ہوگئی' اور ان صوبوں میں بلا شرکت غیرے کانگرسی گورنمنٹیں قائم ہوگئیں۔ ان سات صوبوں میں غالب مسلم اکثریت کا ایک صوبہ سرحد بھی تھا۔ دوسرے صوبوں میں بعض دوسری مقامی سیاسی پارٹیوں کی مشترکہ گورنمنٹیں بن گئیں۔ یہ صوبائی گورنمنٹیں قانونی حیثیت سے زیر سایہ برطانیہ ہونے کے باوجود بڑی حد تک خود مختار تھیں۔

اس مرحلہ پر ہم جیسوں کے لیے دو حقیقتیں کھل کر بالکل سامنے آ گئیں۔ ایک یہ کہ انگریزی اقتدار سے ملک کے بالکل آزاد ہو جانے کی منزل اب زیادہ دور نہیں ہے۔ دوسرے یہ کہ انڈین نیشنل کانگرس کی قیادت میں آزادی کی تحریک جس طرح چل رہی ہے' اس کے نتیجے میں جو آزادی حاصل ہوگی اور جو جمہوری قومی حکومت قائم ہوگی وہ ہم مسلمانوں کی آرزوؤں اور امنگوں کے مطابق نہ ہوگی' بلکہ خاص کر اقلیتی صوبوں میں ان کی تہذیب اور ان کے ملّی تشخص کے لیے نئے نئے خطرات پیدا ہو جائیں گے۔

۱۹۳۶ء کے الیکشن کے بعد ملکی سیاست پر مولانا مودودی کے مضامین

مولانا مودودی نے اس وقت ترجمان القرآن میں اس موضوع پر لکھنا شروع کیا' یہ واقعہ ہے کہ وہ قلم کے بادشاہ ہیں' ان کے یہ مضامین قوت استدلال کے لحاظ سے بہت ہی محکم اور بڑے موَثر تھے۔ راقم سطور بھی ان سے غیر معمولی طور پر متاثر ہوا' دوسرے بہت سے اخبارات و جرائد نے بھی ان کو اپنے صفحات میں شائع کیا' یہاں تک کہ ''جمعیت العلماء'' کے اخبار ''الجمعیۃ'' میں بھی اس کی پہلی دو یا تین قسطیں شائع ہوئیں (حالانکہ ان کی زد اس وقت کے جمعیت کے سیاسی مسلک پر پڑتی تھی) ''الفرقان'' میں بھی یہ مضامین نقل ہوتے رہے اور راقم الحروف خود بھی ان کی تائید میں برابر لکھتا رہا۔

مولانا مودودی سے ذاتی ربط و تعلق

اسی زمانہ میں مولانا مودودی صاحب سے تعلقات بڑھے اور خط و کتابت کا سلسلہ شروع ہوا۔ اسی سلسلۂ مضامین میں ایک مرحلہ پر مولانا مودودی نے مسلمانوں کے سامنے احیاءِ دین اور اعلاء کلمۃ اللہ کو اصل نصب العین بنا کر خالص دینی بنیاد پر اس طرح کی ایک جماعت کی تنظیم اور اصلاحی دعوتی کام کی اسکیم پیش کی جس طرح کسی دَور میں مولانا آزاد مرحوم

نے ''الہلال'' کے ذریعہ ''حزب اللہ'' کے نام سے ایک جماعت کی تنظیم شروع کی تھی۔ مجھے یاد آتا ہے کہ انہوں نے اپنے اس مضمون میں حوالہ کے ساتھ ''الہلال'' کے اقتباسات بھی نقل کیے تھے۔ اس عاجز کو ان کی اس مثبت اسکیم سے بھی اس وقت پورا اتفاق تھا۔

پھر ایک مرحلہ آیا جب ہمارے درمیان خط و کتابت سے یہ طے ہوا کہ ''ترجمان القرآن'' اور ''الفرقان'' کے ذریعہ ہندوستان کے مستقبل کے بارے میں مسلمانوں سے جو کچھ کہا جا رہا ہے اور جو دعوت دی جا رہی ہے' اس کو ایک تحریک بنا کر آگے بڑھانے کے لیے عملی جدوجہد کا کوئی لائحہ اور منصوبہ بنایا جائے۔ مولانا مودودی نے مجھے ایک خط میں لکھا کہ اب میں اس کا عزم کر چکا ہوں اور چونکہ اس کام کے لیے ریاستی علاقہ (حیدر آباد) بالکل مناسب نہیں ہے اس لیے میں پنجاب کے ایک مقام کو اپنی سکونت اور اس کام کے مرکز کے لیے تجویز کر چکا ہوں' اور وہاں منتقل ہونے کی تیاریوں میں مصروف ہوں۔ پھر ایک وقت انہوں نے مجھے اطلاع دی کہ میں فلاں تاریخ کو دہلی پہنچ رہا ہوں' میرا قیام محلّہ چوڑی والان ''شمسی کاٹج'' میں ہوگا (یہ مولانا کا سسرالی مکان تھا) آپ اس تاریخ پر دہلی آ جائیں تو آئندہ کام کے بارے میں تفصیلی باتیں ہو جائیں گی۔

مودودی صاحب سے پہلی ملاقات

ابھی تک سارا تعلق غائبانہ تھا' ملاقات کی کبھی نوبت نہیں آئی تھی۔ میں نے ان سے ملاقات اور مستقبل کے منصوبے اور کام کے بارے میں گفتگو کرنے کے لیے دہلی کا سفر کیا۔ میں یہ بات سن چکا تھا کہ مولانا مودودی صاحب کے ایمان افروز مضامین سے ان کے طرز زندگی کے بارے میں جو اندازہ کوئی لگا سکتا ہے ان کی زندگی اس سے بہت مختلف ہے' یعنی جس اسلامی زندگی کے وہ پرزور داعی ہیں خود ان کی وہ زندگی نہیں ہے۔ جن صاحب نے مجھے یہ بات بتلائی تھی وہ مولانا کے ملنے والوں میں سے تھے اور ''ترجمان القرآن'' کے مضامین سے متاثر اور ان کے قدردان تھے' انہوں نے بتلایا تھا کہ مودودی صاحب ''محلوق اللحیۃ'' رہتے ہیں۔ مجھے

(۱) جہاں تک مجھے یاد ہے یہ واقعہ ۱۹۳۷ء کا ہے جب کہ ترجمان القرآن میں ۴/۵ برس سے مولانا کے وہ ایمان افروز مضامین شائع ہو رہے تھے جنہوں نے ہم جیسوں کو ان کا گرویدہ و عاشق بنا دیا تھا' اور میرا تصور ان کے بارے میں وہی تھا جو دین کے کسی داعی کے بارے میں ہونا چاہیے۔

یاد ہے کہ یہ سن کر مجھے حیرت واستعجاب کے ساتھ بڑا رنج وافسوس اور بڑی مایوسی ہوئی تھی [۱]۔ لیکن دہلی کی اس ملاقات سے چند ہی روز پہلے حیدر آباد ہی سے ایک بڑے قابل اعتماد ذریعہ سے مجھے معلوم ہو گیا تھا کہ اب ان کی زندگی کے طرز میں ہم جیسوں کے لیے خوشگوار تبدیلی شروع ہو گئی ہے (ایک محترم بزرگ نے لکھا تھا کہ اب مودودی صاحب کے چہرہ پر ایمان کی کھیتی اُگنا شروع ہو گئی ہے) مجھے اس اطلاع سے بڑی خوشی ہوئی تھی' بہر حال میں مولانا سے ملنے کے لیے دہلی پہنچا۔ چوڑی والان میں ''شمسی کاٹج'' پہنچ کر ملاقات کی۔ واقعہ یہ ہے کہ اس وقت پہلی دفعہ مولانا کو دیکھ کر طبیعت کو ایک دھچکا سا لگا' کیونکہ اب بھی مولانا کی ہیئت اس سے بہت مختلف تھی جو ہونی چاہیے تھی اور جس کی توقع پیدا ہو گئی تھی۔ وہ اس وقت محلوق اللحیة تو نہیں تھے لیکن اس لحاظ سے ان میں بس برائے نام ہی تبدیلی آئی تھی۔ مگر چونکہ مولانا کے مضامین سے میں بہت متاثر تھا اور ان کے ساتھ ایک خاص قلبی تعلق پیدا ہو گیا تھا اس لیے دل کو سمجھایا کہ عملی زندگی کی اصلاح کا ابھی آغاز ہوا ہے' ان شاء اللہ آئندہ یہ حالت نہیں رہے گی اور ان کی زندگی اور تحریر میں جو مطابقت ہونی چاہیے وہ ان شاء اللہ ہو جائے گی۔ آئندہ کام کے بارے میں اس ملاقات میں کسی قدر تفصیلی گفتگو ہوئی۔

❁❁❁

ڈاکٹر اسرار احمد کی تالیف 'تحریک جماعت اسلامی'

کے اس تعارفی اشتہار کا عکس جو آج سے بیس سال قبل ماہنامہ 'میثاق' میں شائع ہوا تھا۔ واضح رہے کہ یہ کتاب اولاً ۱۹۶۶ء میں ڈاکٹر صاحب کے ذاتی اشاعتی ادارے 'دارالاشاعت الاسلامیہ' کے تحت شائع ہوئی تھی۔

باب ہشتم

جماعت شیخ الہندؒ

سے میرا قلبی تعلق

مولانا سید محمد یوسف بنوریؒ

سے میرے روابط'

علماءِ کرام کے بارے میں میرا طرزِ عمل

❁

اور

مدیر ''الخیر'' ملتان' مدیر ''بیّنات'' کراچی

اور مفتی جمیل احمد تھانوی مدظلہ

کی خدمت میں چند

گزارشات

❁ اشعارِ اقبال

❁ **جماعت شیخ الہندؒ سے میرا تعلق**

مولانا محمد یوسف بنوریؒ سے میرے روابط
اور مدیر ''بینات'' کراچی کے فرمودات کے ضمن میں کچھ گزارشات
(''میثاق'' مارچ ۱۹۸۵ء)

❁ **علماءِ کرام کے بارے میں میرا طرزِ عمل**

صاحب ''تدبر قرآن'' سے بعض فقہی مسائل
بالخصوص ''حدرجم'' کے ضمن میں میرا شدید اختلاف
اور اس کے بارے میں میرا رویہ'

❁ **'الخیر' اور 'بیّنات' سے بحث کا خاتمہ**

❁ **مفتی جمیل احمد تھانوی مدظلہ کی مخالفانہ مہم کے ضمن میں وضاحت**

(''میثاق'' ستمبر ۱۹۸۵ء)

اور

ع ''سن تو سہی جہاں میں ہے تیرا فسانہ کیا؟''

مفتی جمیل احمد تھانوی مدظلہ کی تحریر پر ''حساس'' کی تنقید
شائع شدہ ہفت روزہ ''حرمت'' اسلام آباد

وَ اللّٰهُ مُتِمُّ نُوْرِهٖ وَ لَوْ كَرِهَ الْكٰفِرُوْنَ

آسماں ہو گا سحر کے نور سے آئینہ پوش
اور ظلمت رات کی سیماب پا ہو جائے گی
اس قدر ہو گی ترنم آفریں باد بہار
نکہت خوابیدہ غنچے کی نوا ہو جائے گی
آ ملیں گے سینہ چاکانِ چمن سے سینہ چاک
بزمِ گل کی ہم نفس بادِ صبا ہو جائے گی!
شبنم افشانی مری پیدا کرے گی سوز و ساز
اس چمن کی ہر کلی درد آشنا ہو جائے گی!
پھر دلوں کو یاد آ جائے گا پیغامِ سجود
پھر جبیں خاکِ حرم سے آشنا ہو جائے گی!
آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے، لب پہ آ سکتا نہیں
محو حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائے گی!
شب گریزاں ہو گی آخر جلوۂ خورشید سے
یہ چمن معمور ہو گا نغمہ توحید سے!!

یعنی: وَ يَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ

بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم

’’جماعت شیخ الہند‘‘ سے میرا قلبی تعلق

مولانا سید محمد یوسف بنوری سے میرے روابط

اور مدیر ’’بیّنات‘‘ کراچی کے فرمودات کے ضمن میں کچھ گزارشات!

گزشتہ ماہ کے طویل ’’تذکرہ وتبصرہ‘‘ کے آخری حصے کی تحریر کے وقت راقم الحروف پر ایک عجیب ’’سُکر‘‘ کی سی کیفیت طاری ہوگئی تھی۔ چنانچہ حسب ذیل الفاظ بھی اسی کیفیت میں سپرد قلم ہوگئے تھے۔[1]

> ’’چنانچہ راقم خدا کو گواہ بنا کر عرض کرتا ہے کہ راقم کے دل میں بلاتکلف وتصنع ازخود محبت وعقیدت پیدا ہو جاتی ہے ہر اُس شخص سے جس کا ادنیٰ سے ادنیٰ تعلق رہا ہو حضرت شیخ الہندؒ سے —— یا جسے ادنیٰ سے ادنیٰ نسبت حاصل ہو ان کی ذاتِ گرامی سے اور راقم ہاتھ باندھ کر عرض کرتا ہے جملہ متوسلانِ حضرت شیخ الہندؒ کی خدمت میں کہ خدارا! وقت کی پکار کو کھلے اور متوجہ کانوں اور ’’کشادہ‘‘ و ’’حاضر‘‘ دلوں سے سنیں۔ بفحوائے الفاظ قرآنی:
> ﴿اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَذِکْرٰی لِمَنْ کَانَ لَهٗ قَلْبٌ اَوْ اَلْقَی السَّمْعَ وَ هُوَ شَهِیْدٌ۝﴾‘‘

بعد میں محسوس ہوا کہ یہ فی الحقیقت ’’مستی‘‘ کی کیفیت میں نکلی ہوئی نہایت ہی ’’سچی بات‘‘ ہے[2]! چنانچہ بعد میں ماضی کے جھروکوں میں مزید جھانکا —— اور اپنے ذہن وشعور کی تحتانی سطحوں میں مزید کھود کرید کی تو اندازہ ہوا کہ اگرچہ راقم ابتداءً ایک مبہم سے جذبۂ ملّی اور

---

(۱) اسی کیفیت میں علامہ اقبال مرحوم کے اُن اشعار کی جانب بھی ذہن اچانک منتقل ہو گیا تھا جو گزشتہ ماہ بھی شامل اشاعت تھے اور اس ماہ پھر نمایاں طور پر شائع کیے جا رہے ہیں۔ ورنہ راقم کے قارئین اور سامعین کے علم میں ہے کہ علامہ کے یہ اشعار اس سے قبل کبھی بھی راقم کی تحریر یا تقریر میں نہیں آئے۔ بعد میں کئی دن یہ اشعار راقم کے ذہن پر سوار رہے اور تنہائی میں بے اختیار زبان پر جاری ہوتے رہے اور دل کی گہرائیوں سے علامہ کے لیے دعائیں نکلتی رہیں!

(۲) ؎ نکل جاتی ہے جس کے منہ سے سچی بات مستی میں
فقیہ مصلحت بیں سے وہ رند بادہ خوار اچھا!

بعد میں جدید تہذیبی وعمرانی نظریات اور سائنس وٹیکنالوجی کے پیدا شدہ مسائل ومعاملات کے ضمن میں ''فکرِ قرآنی'' کے سلسلے میں شدید زیر بارِ احسان اور مرہونِ منت ہے علامہ اقبال مرحوم ومغفور کا۔ اور ''تدبر قرآن'' کے سائنٹفک طریق کے ضمن میں خوشہ چین ہے علامہ حمید الدین فراہیؒ اور مولانا امین احسن اصلاحی کا۔ تاہم راقم کا قلبی جھکاؤ اور لگاؤ رہا ہے ان ہی شخصیتوں کی جانب جن کا کوئی نہ کوئی تعلق ہے حضرت شیخ الہندؒ سے۔

حضرت شیخ الہندؒ کی ذاتِ جامع الصفات سے علم وعمل کے جو چشمے جاری ہوئے ان کا ایک اجمالی ذکر گزشتہ صحبت میں ہو چکا ہے۔ اس سلسلے میں ذرا سے تامل سے جو حقائق سامنے آتے ہیں وہ یہ ہیں:

حضرت شیخ الہندؒ کے نام نامی سے سب سے زیادہ نمایاں طور پر ''معنون'' سلسلہ تو وہ ہے جو حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ کی ذات سے چلا۔ جبکہ راقم کے نزدیک حضرتؒ کی حیاتِ مستعار کے آخری دَور کی کیفیات کے اعتبار سے سب سے زیادہ ''مستند'' سلسلہ وہ ہے جس کی پہلی کڑی تھے مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم' دوسری کڑی تھے مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی مرحوم اور تیسری کڑی ہے ''بزعمِ خویش'' ان سطور کا حقیر وعاجز راقم!

مزید برآں ایک سلسلہ وہ ہے جس کی پہلی کڑی تھے مولانا عبید اللہ سندھی مرحوم ومغفور' جن پر آخری عمر میں ''انقلابیت'' کچھ زیادہ ہی طاری ہوگئی تھی۔ چنانچہ ان کے عزیز وشاگرد حضرت مولانا احمد علی لاہوریؒ ان کے راستے سے ذرا ہٹ کر پوری طرح ضم اور مدغم ہو گئے متذکرہ بالا ''سلسلہ اولیٰ'' ہی میں۔ جبکہ ایک سلسلہ وہ ہے جو اس کے بالکل برعکس اس ''سلسلہ اولیٰ'' سے قومی اور ملّی سیاست کے ضمن میں اختلاف رائے کی بنا پر منقطع ہوکر جا ملا مسلمانانِ ہند کی قومی تحریک' یعنی تحریک پاکستان کے ساتھ جسے حلقہ دیوبند ہی کی ایک دوسری عظیم شخصیت یعنی حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کی حمایت وتائید حاصل تھی۔ اس سلسلے کی اولین کڑی تھی مولانا شبیر احمد عثمانیؒ کی شخصیت اور ان کے جانشین کی حیثیت حاصل ہوئی مفتی محمد شفیعؒ کو۔

انگریزی مثل "Last but not the least" کے مصداق ذکر میں آخری اور پانچواں' لیکن خالص علمی اعتبار سے اولین اور اہم ترین سلسلہ وہ ہے جس کی پہلی کڑی تھے مولانا سید انور شاہ کاشمیریؒ۔ اور دوسری اہم ترین کڑی تھے مولانا سید محمد یوسف بنوریؒ۔

ان ''سلاسلِ خمسہ'' کی اولین شخصیتوں کی زیارت کی سعادت تو راقم کو بُعدِ زمانی ومکانی کے باعث حاصل نہیں ہوسکی' لیکن دوسری اور تیسری کڑیوں کی حیثیت رکھنے والے حضرات میں سے اکثر سے نیازمندی اور حصولِ فیضِ صحبت کے مواقع میسر آئے۔ اور بعض دوسرے علماءِ کرام کے علمی تبحر اور خلوص واخلاص کے پوری طرح قائل ومعترف ہونے کے باوجود قلبی میلان صرف ان ہی حضرات کی جانب رہا۔

لاہور میں راقم کی نیازمندی اور گاہ بگاہ حاضری کا سلسلہ اگرچہ بعض دوسرے حضرات کے یہاں بھی ہے لیکن سب سے زیادہ ربط وتعلق مولانا حسین احمد مدنیؒ کے خلیفہ مجاز اور جامعہ مدنیہ کے مہتمم اور شیخ الحدیث مولانا سید حامد میاں مدظلہٗ سے ہے' جو تنظیم اسلامی کے حلقہ مستشارین میں بھی شامل ہیں۔

دہلی کے مولانا اخلاق حسین قاسمی مدظلہٗ بھی جو حال ہی میں تنظیم کے حلقہ مستشارین میں شامل ہوئے ہیں' جمعیت علماء ہند ہی کے پرانے متوسلین میں سے ہیں اگرچہ فی الوقت ان کا کسی قدر اختلاف مولانا اسعد مدنی خلف الرشید مولانا حسین احمد مدنیؒ سے ہے!

حضرت لاہوریؒ کی تو صرف ایک بار زیارت کا شرف راقم الحروف کو حاصل ہوا تھا۔ لیکن لاہور میں دوسرے نمبر پر راقم کی حاضری کا معاملہ ان کے جانشین مولانا عبید اللہ انور مدظلہٗ ہی کی خدمت میں ہوتا رہا۔ چنانچہ کئی سال وہ قرآن کانفرنسوں میں بھی تشریف لاتے رہے اور ہمارے بعض دوسرے اجتماعات میں بھی شرکت فرماتے رہے۔ ایک تقریر جواب ''شہید مظلومؓ'' کے عنوان سے کتابچے کی صورت میں طبع ہوتی ہے' راقم نے اُن ہی کی مسجد میں اُن ہی کی زیرِ صدارت کی۔ اور ۱۹۷۴ء میں جس ''قرآنی تربیت گاہ'' کے اختتام پر راقم نے ''تنظیم اسلامی'' کے قیام کا اعلان کیا اس کی افتتاحی تقریب کے مہمان خصوصی بھی وہی تھے اور انہوں نے نہایت شاندار بلکہ ''شرمسار کن'' الفاظ میں راقم الحروف کو خراجِ تحسین ادا کیا تھا۔ اگرچہ اِدھر کچھ عرصہ سے وہ بعض نامعلوم اسباب کی بنا پر راقم اور اس کے زیر اہتمام منعقد ہونے والے اجتماعات سے پہلو تہی فرمانے لگے ہیں اور راقم یہ دعویٰ نہیں کرسکتا کہ اسے اب بھی ان کی سرپرستی حاصل ہے۔

مولانا سندھی مرحوم کے شاگردوں' شارحوں اور راویوں میں سے پروفیسر محمد سرور مرحوم سے راقم کو بھی اُنس تھا اور وہ بھی راقم سے بہت دلچسپی رکھتے تھے' حتیٰ کہ عمر کے آخری دَور میں اگرچہ تقدیر انہیں کھینچ کر اسلام آباد ایک سرکاری ادارے میں لے گئی' لیکن خود ان کی شدید

خواہش ''قرآن اکیڈمی'' ہی میں ڈیرہ لگا لینے کی تھی (ان کی نمازِ جنازہ پڑھانے کا موقع بھی راقم کو حاصل ہوا)۔ دوسری طرف مولانا سندھیؒ کے دو متدین ''دیوانوں'' یعنی شیخ بشیر احمد لدھیانوی مرحوم اور محمد مقبول عالم مرحوم سے بھی راقم کا خاصا ربط ضبط رہا۔ چنانچہ ان کے مضامین بھی ''میثاق'' میں شائع ہوتے رہے اور ان کے حوالے سے مولانا سندھیؒ کے فکر کا تعارف بھی ایک مضمون میں پروفیسر یوسف سلیم چشتی مرحوم نے کرایا[(۱)]۔

ادھر مولانا شبیر احمد عثمانیؒ کی زیارت تو راقم کو نصیب نہ ہوئی لیکن راقم کے لیے یہ خیال بہت غنیمت ہے کہ راقم کا ایک غائبانہ اور معنوی تعلق ان سے اس طرح بنتا ہے کہ جب وہ تحریک پاکستان کے عروج کے زمانے میں ہندوستان کے طول وعرض میں دورے کر رہے تھے اس وقت راقم الحروف بھی تحریک پاکستان کے ایک ننھے کارکن کی حیثیت سے (بطور جنرل سیکرٹری حصار ڈسٹرک مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن) ضلع حصار کے قصبات ہانسی' سرسہ وغیرہ کے ہائی اسکولوں کے طلبہ کو آمادۂ عمل کرنے کے لیے سفر کیا کرتا تھا۔ باقی مولاناؒ کا جو معنوی فیض صحبت راقم کو ان کے ''حواشی ترجمہ قرآن'' کے ذریعے حاصل رہا ہے' اس کا تفصیلی ذکر گزشتہ اشاعت میں آ ہی چکا ہے۔

البتہ مولانا مفتی محمد شفیعؒ کی خدمت میں حاضری کے راقم کو ۶۵-۱۹۶۴ء میں وافر مواقع ملے۔ خصوصاً ان چھ ماہ کے دوران جبکہ راقم کی رہائش بھی کورنگی میں ''دارالعلوم'' کے نہایت قریب تھی اور رمضان المبارک میں اعتکاف بھی راقم نے دارالعلوم ہی کی مسجد میں کیا تھا' جس کے دوران حضرت مفتی صاحبؒ کے خویش کلاں مولانا نور احمد صاحب سے بہت قرب رہا تھا۔
حضرت مفتی صاحبؒ کے صاحبزادوں میں سے مولانا رفیع عثمانیؒ اور مولانا تقی عثمانیؒ

(۱) مولانا سندھی مرحوم اور حضرت لاہوریؒ کے ساتھ راقم کے ایک اور تعلق کا راز بھی آج فاش ہو جائے تو بہتر ہے۔ اور وہ یہ کہ حاجی عبدالواحد صاحب ایم اے' جو ایک سال مکہ مکرمہ میں مقیم رہ کر مولانا سندھیؒ سے کسب فیض کرتے رہے' بعد ازاں حضرت لاہوریؒ سے بیعت ارشاد میں منسلک ہوئے (مزید براں ایک طویل سفر میں مولانا محمد منظور نعمانی مدظلہٗ اور مولانا علی میاں مدظلہٗ کے ہم رکاب رہے جس کا مقصد وحید اعلاء کلمۃ اللہ کی تحریک کے لیے کسی ''داعی'' کی تلاش تھا۔ بعد ازاں کچھ عرصہ ندوۃ العلماء میں مقیم رہ کر عربی کی تحصیل کرتے رہے) پہلے شخص ہیں جنہوں نے راقم الحروف سے اس وقت ''بیعت جہاد'' کی' جبکہ خود راقم کو ابھی اس کا خیال بھی نہیں تھا۔ اور انہوں نے زبردستی راقم کا ہاتھ کھینچ کر بیعت کی تھی!

سے بھی ان دنوں کافی ملاقاتیں رہیں۔ مولانا تقی عثمانی صاحبؒ سے بعد میں بھی متعدد بار ملنا ہوا۔ ایک ملاقات میں انہوں نے پروفیسر یوسف سلیم چشتی مرحوم کی بعض تحریروں کی ''میثاق'' میں اشاعت پر احتجاج کیا۔ اور حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کا ایک رسالہ دکھایا جو انہوں نے حضرت مولانا احمد علی لاہوریؒ کے تفسیری حواشی پر تنقید و اصلاح کے ضمن میں ''التقصیر فی التفسیر'' کے عنوان سے تحریر فرمایا تھا۔ ایک بار میری درخواست پر انہوں نے مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کے زیر اہتمام ''قرآن کانفرنس'' منعقدہ کراچی کے ایک اجلاس کی صدارت بھی فرمائی۔[(۱)]

حضرت شیخ الہند سے معنوی تعلق ہی کا یہ فیض بھی ہے کہ دیوبند میں قائم ''شیخ الہندؒ اکیڈمی'' کے ڈائریکٹر مولانا سعید احمد اکبر آبادی مدظلہٗ کی بھی خصوصی شفقت و عنایت گزشتہ دو تین سالوں کے دوران راقم الحروف کو حاصل ہو گئی ہے۔

مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا ابوالاعلیٰ مودودی سے راقم الحروف کی نسبت کا ذکر تحصیل حاصل ہے! اور خواہ اسے ''یہ دعویٰ بہت بڑا ہے' پھر ایسا دعویٰ نہ کیجیے گا!'' (حالیؔ) کا مصداق کامل ہی قرار دیا جائے راقم کا موقف یہی ہے کہ اُس کی دعوت و تحریک ''الہلال'' اور ''البلاغ'' اور ''ترجمان القرآن'' اور ''الجہاد فی الاسلام'' ہی کی صدائے بازگشت ہے اور اس کی قائم کردہ ''تنظیم اسلامی'' ——— ''حزب اللہ'' اور ''جماعت اسلامی'' ہی کے سلسلے کی کڑی ہے۔

حضرت شیخ الہندؒ کی ذات سے شروع ہونے والے ''سلسلہ خامسہ'' کے ساتھ اپنے ربط و تعلق کا ذکر راقم کو ذرا تفصیل سے کرنا ہے' اس لیے کہ اس کے موجودہ ''آرگن'' ماہنامہ

(۱) تاہم چند دن ہوئے تنظیم اسلامی کے ایک نوجوان رفیق نے ان کے والد ماجد کے استفتاء پر مولانا تقی عثمانی صاحب کے دستخط سے جاری شدہ تحریر دکھائی جس میں کہا گیا ہے کہ چونکہ راقم الحروف باضابطہ عالم دین نہیں ہے لہٰذا نہ میری تنظیم میں شمولیت درست ہے نہ میرے دروس میں شرکت (اس کے بارے میں راقم اپنی گزارشات آگے عرض کرے گا) ساتھ یہ بھی درج تھا کہ انہوں نے (یعنی مولانا تقی عثمانی صاحب نے) نہ میری تقریریں سنی ہیں نہ تحریریں پڑھی ہیں۔ اس پر کسی قدر تعجب ہوا کہ اگر وہ ''میثاق'' نہیں دیکھتے تھے تو چشتی صاحب کی تحریریں ان کے علم میں کیسے آئیں؟ اور کم از کم میری وہ تقریر تو انہوں نے از ابتدا تا انتہا سنی تھی جو میں نے ''قرآن کانفرنس'' کے متذکرہ بالا اجلاس میں ان ہی کے زیر صدارت ''مقامِ صحابہ رضی اللہ عنہم'' کے موضوع پر کی تھی اور جو اختصار کے باوصف خاصی طویل تھی۔ اس کی اس کے سوا اور کیا تاویل کی جائے کہ کچھ عرصہ گزر جانے کے باعث یہ واقعات مولانا کے حافظے سے محو ہو گئے! ——— واللہ اعلم!

''بیّنات'' کے دو حالیہ شماروں کے ادارتی صفحات راقم کے تذکرے میں صرف ہوئے ہیں۔

اس سے قبل راقم ''اکابر دیو بند'' رحمہم اللہ کے ساتھ اپنے ایک اور تعلق کے اظہار کی اجازت چاہتا ہے۔ اور وہ ہے ''زمینی نسبت''، یعنی یہ کہ راقم کے آباء واجداد کا تعلق بھی یو پی کے مشہور دوآبہ کی اسی سرزمین سے ہے جس میں سہارنپور، دیو بند، کاندھلہ، گنگوہ، نانوتہ، بڈھانہ، جھنجھانہ، کیرانہ، تھانہ بھون اور پھلت ایسے قصبات واقع ہوئے ہیں، جنہوں نے مسلم انڈیا کے ابتدائی دور میں تو شیخ عبدالقدوس گنگوہی ایسی عظیم شخصیت پیدا کی تھی۔ پھر شاہ ولی اللہ دہلویؒ کا خاندان عطا کیا (یہ حضرات اصلاً قصبہ پھلت کے تھے) بعد ازاں مجاہد کبیر سید احمد بریلویؒ کو کثیر ترین تعداد میں جہاد و قتال کے ساتھ (Comrades at arms) مہیا کیے۔ اور پھر جملہ اکابرین دیو بند کا تحفہ مسلمانانِ ہند کو دیا۔

ان قصبات میں ''شیوخ'' کی ایک برادری آباد ہے جن میں سے کچھ تو اپنے ناموں کے ساتھ ''قریشی'' کا عمومی لاحقہ لگاتے ہیں اور کچھ تعین کے ساتھ صدیقی، فاروقی یا عثمانی لکھتے ہیں۔ ان کے رشتے ناطے آپس میں بھی بہت ہیں اور ہندی نومسلم خاندانوں کے ساتھ بھی، اس طرح ان میں باہر سے آنے والے قدیم الاسلام اور مقامی آبادی میں سے ایمان لانے والے حدیث العہد مسلمان باہم گڈمڈ ہیں۔ راقم کا ددھیال اسی علاقے کے قصبہ حسین پور سے تعلق رکھتا ہے اور ننھیال قصبہ بَنَت سے! میری والدہ صاحبہ تو تعین کے ساتھ صدیقی ہیں۔ ان کے مورثِ اعلیٰ شیخ حبان المصری الیمنی الصدیقی تھے جن کی سترہویں پشت میں شیخ محمد طاہر ہندوستان آئے تھے (اس خاندان کے بعض حضرات جیسے مولانا محمد حسین فقیر اور ان کے صاحبزادگان مولانا محمد ابراہیمؒ اور مولانا محمد اسحٰق قبرستان مہندیاں دہلی میں حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی رحمہ اللہ اور ان کے ابناء و احفاد کے قریب محو استراحت ہیں) میرے پڑدادا حافظ نور اللہ صاحب حسین پور میں ''پکی حویلی والے'' مشہور تھے۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد وہ انگریزی حکومت کے زیر عتاب آئے اور ان کی جائیداد ضبط کر لی گئی۔ مجبوراً انہوں نے نقل مکانی کی اور دریائے جمنا عبور کر کے مشرقی پنجاب کے ضلع حصار آ گئے اور سرکاری ملازمت شروع کر دی۔ میرے دادا حاجی محمد یحییٰ بھی وہیں سرکاری ملازمت میں رہے۔ والد مرحوم شیخ مختار احمد کے ساتھ ہم سب لوگ ۱۹۴۷ء کے قتل عام اور جبری تبادلۂ آبادی کے ضمن میں واقعتاً آگ اور خون کے دریا عبور کر کے پاکستان آئے (حصار سے سلیمانکی ہیڈ ورکس کا ایک سو ستر میل کا فاصلہ ہم لوگوں نے ایک پیدل قافلے کے ساتھ بیس دنوں میں طے کیا، اور راستے میں جو مصیبتیں

اٹھائیں ان کے بیان کے لیے ایک دفتر درکار ہے)۔ الغرض ؏ ''کعبے سے ان بتوں کو بھی نسبت ہے دُور کی!'' کے مصداق یہ بھی میری اکابرین دیو بند کے ساتھ ایک نسبت کی اساس ہے۔

مولانا سید انور شاہ کشمیریؒ کے تلمیذ رشید مولانا سید یوسف بنوریؒ کے تذکرے سے قبل چند الفاظ حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کے بارے میں بھی ضروری ہیں۔ مبادا کوئی غلط فہمی راہ پالے۔ مولانا تھانویؒ کو بھی اگرچہ حضرت شیخ الہندؒ سے ایک نسبت تلمذ حاصل تھی، تاہم ان کا شمار حضرت شیخ الہندؒ کے تلامذہ یا متوسلین میں درست نہیں، بلکہ وہ ہر اعتبار سے ایک متوازی شخصیت ہیں اور ان کی عظمت خالص ذاتی ہے۔ چنانچہ عمر کے اعتبار سے بھی وہ حضرت شیخ الہندؒ سے صرف بارہ سال چھوٹے، اور ان کے اکثر تلامذہ سے پندرہ پندرہ بیس بیس سال بڑے تھے۔ پھر ان کا مزاج بھی خالص علمی و اصلاحی تھا۔ چنانچہ ان کی اصل توجہات یا تصنیف و تالیف پر مرتکز رہیں یا تزکیہ و سلوک پر، سیاسیات پر وہ نگاہ رکھتے تھے اور آزادانہ رائے کے حامل بھی تھے۔ لیکن اس سے انہیں کوئی عملی دلچسپی نہ تھی۔ چنانچہ جہاد حریت اور تحریک استخلاص وطن میں بھی ان کا کوئی قابل ذکر حصہ نہیں ہے۔ لیکن دوسری طرف یہ واقعہ ہے کہ موجودہ پورے حلقہ دیو بند پر اُن ہی کے علم اور تصوف کی چھاپ سب سے بڑھ کر ہے اور پاکستان میں اکثر و بیشتر عظیم الشان دینی درسگاہیں ان ہی کے خلفاء اور متوسلین نے قائم کی ہیں۔ الغرض ان کی ذات سے جو ''خیر کثیر'' برصغیر پاک و ہند میں پھیلا، وہ اظہر من الشّمس ہے تاہم راقم کے نزدیک ان کا شمار ''حضرت شیخ الہندؒ کی جماعت'' میں نہیں ہے، یہی وجہ ہے کہ گزشتہ شمارہ میں ان کا کوئی ذکر نہیں آیا تھا۔

==========================

بیہقی وقت مولانا سید انور شاہ کاشمیریؒ کے شاگردِ رشید مولانا سید محمد یوسف بنوریؒ کا مزاج بھی بالکل غیر سیاسی اور خالص علمی بلکہ تعلیمی و تدریسی تھا! اہل علم کے حلقے میں تو وہ یقیناً بہت پہلے نمایاں اور معروف ہو گئے ہوں گے —— لیکن عوامی سطح پر ان کی شہرت ۱۹۷۴ء کی تحریکِ ختم نبوت سے پہلے زیادہ تر صرف کراچی اور اس کے گرد و نواح تک محدود تھی، البتہ ۱۹۷۴ء کی تحریک کے دوران وہ دفعتاً ملک گیر شہرت کے حامل ہو گئے —— راقم کو ان سے جو ذہنی و قلبی تعلق رہا اس کی اجمالی داستان الحمد للہ کہ ان کی وفات پر سپرد قلم ہو گئی تھی اور 'میثاق' کی نومبر ۱۹۷۷ء کی اشاعت میں شائع ہو گئی تھی جو ذیل میں نقل کی جا رہی ہے! (اگر راقم آج یہ باتیں لکھتا تو شاید بعض حضرات اسے 'سخن سازی' قرار دیتے!)

مَوْتُ الْعَالِمِ مَوْتُ الْعَالَم

آہ مولانا محمد یوسف بنّوری رحمۃ اللہ علیہ

اس دارِفانی میں جو بھی آیا ہے اسے ایک نہ ایک دن کوچ کرنا ہی ہے‘ لیکن کچھ لوگوں کے انتقال سے ایک دَم ایک مہیب خلاء پیدا ہوتا محسوس ہوتا ہے اور ایک بار تو دنیا واقعتاً اندھیری ہو جاتی ہے۔ مولانا محمد یوسف بنوریؒ کی وفاتِ حسرت آیات یقیناً اسی زمرے میں ہے! اور اس سے پورے عالم اسلام اور بالخصوص پاکستان کے دینی و علمی حلقے میں جو خلاء پیدا ہوا ہے‘ اس کے پُر ہونے کی کوئی صورت بظاہر احوال تو دُور دُور تک نظر نہیں آتی۔

راقم الحروف ۱۹۶۰ء میں لگ بھگ چھ ماہ اور پھر ۱۹۶۲ء تا ۱۹۶۵ء تقریباً چار سال کراچی میں مقیم رہا‘ اور اس دوران میں اکثر جمعے جامع مسجد نیوٹاؤن ہی میں ادا ہوئے اور اس طرح مولانا کے اقتداء کی سعادت بھی نصیب ہوتی رہی اور مدرسہ اسلامیہ نیوٹاؤن کے تعمیر و ترقی کے مراحل بھی ”وَ اِذْ یَرْفَعُ اِبْرٰھٖمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَیْتِ“ کے مانند نگاہوں سے گزرتے رہے‘ جس سے مولانا کی عظمت کا نقش دل پر قائم ہوتا چلا گیا۔ محبّ مکرم ڈاکٹر مسعود الدین عثمانی (کیماڑی‘ کراچی[1]) ان دنوں مولانا سے باقاعدہ دورۂ حدیث میں شامل ہو کر استفادہ کر رہے تھے اور ساتھ ہی کچھ علاج معالجے کی خدمت بھی بجا لاتے تھے۔ اس دوران میں ان کے ساتھ مولانا سے چند بار ملاقات کا شرف بھی حاصل ہوا‘ لیکن زیادہ تر رسمی اور سرسری انداز میں۔[2]

اکتوبر‘ نومبر ۱۹۷۰ء کے دوران رمضان مبارک کا پورا مہینہ راقم کو مدینہ منورہ میں

(۱) واضح رہے کہ یہ تحریر ۱۹۷۷ء کی ہے۔ بعد میں ڈاکٹر صاحب نے جو انداز اختیار کیا اس کے باعث اب راقم کا کوئی ربط وضبط ان سے نہیں ہے!

(۲) تاہم ان سرسری ملاقاتوں میں بھی مولاناؒ سے جو قربِ ذہنی و قلبی پیدا ہو گیا تھا اس کا مظہر ہے کہ جب راقم نے ۱۹۶۶ء میں ”میثاق“ کی ادارت سنبھالی تو مولانا کی ایک تحریر مئی ۱۹۶۷ء کے شمارے میں شائع کی۔ اور ”حرمت صحابہؓ“ کے عنوان سے ایک طویل مضمون اپریل و مئی ۱۹۷۰ء کے مشترک شمارے میں شائع کیا۔ حضرت مولاناؒ کی یہ دونوں تحریریں نہایت اہم ہیں۔ اور ان شاءاللہ ”میثاق“ کی قریبی اشاعتوں میں دوبارہ شائع کی جائیں گی۔

بسر کرنے کی سعادت ملی تھی۔ آخری عشرے میں مولانا بنوریؒ بھی تشریف لے آئے تھے اور مسجد نبوی میں معتکف تھے۔ لہٰذا وہاں چند تفصیلی ملاقاتوں کا موقع میسر آیا۔ راقم نے اپنا کتابچہ ”مسلمانوں پر قرآن مجید کے حقوق“ مولانا کی خدمت میں اس درخواست کے ساتھ پیش کیا کہ اسے ایک نظر دیکھ لیں۔ اور کوئی غلطی ہو تو متنبہ فرما دیں تاکہ اصلاح کر لی جائے۔ مولانا نے اسے بالاستیعاب دیکھا اور ایک مقام پر عبارت میں اصلاح فرمائی (جو اگلے ایڈیشن میں کر دی گئی)۔[1]

عید الفطر کے روز ایک عجیب واقعہ پیش آیا۔ راقم مولانا کی خدمت میں غالباً بخاری حضرات کی رباط میں حاضر ہوا۔ راقم کی اس درخواست پر کہ اسے کچھ علیحدگی میں عرض کرنا ہے‘ مولانا نے فوراً تخلیہ کا اہتمام فرمایا۔ تب راقم نے عرض کیا کہ ”مجھے تشویش لاحق ہے کہ مسجد نبویؐ میں تو دل بھی لگتا ہے اور انشراحِ صدر و انبساط کی کیفیت بھی نصیب ہوتی ہے‘ لیکن مسجد حرام میں قطعاً دل نہیں لگتا!“ یہ سنتے ہی مولانا پر رقت طاری ہو گئی اور ان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور انہوں نے فرمایا: ”ڈاکٹر صاحب! آپ پہلے شخص ہیں جنہوں نے اپنی دینی و روحانی الجھن کا ذکر کیا ہے ورنہ ہمارے پاس جو بھی آتا ہے دنیوی معاملات ہی کا رونا رونے آتا ہے!“ راقم مولانا کے اس شدتِ احساس سے حد درجہ متاثر ہوا اور یہ واقعہ راقم اور مولانا کے مابین ایک قریبی قلبی تعلق کی تمہید بن گیا۔

(۱) راقم کی اصل عبارت یوں تھی:

”لیکن پڑھے لکھے لوگ جنہوں نے تعلیم پر زندگیوں کا اچھا بھلا عرصہ صرف کر دیا ہو اور دنیا کے بہت سے علوم وفنون حاصل کیے ہوں‘ مادری ہی نہیں غیر ملکی زبانیں بھی سیکھی ہوں‘ اگر قرآن مجید کو بغیر سمجھے پڑھیں تو ان کی یہ تلاوت نہ صرف یہ کہ بے کار اور لا حاصل ہو گی‘ بلکہ عین ممکن ہے کہ وہ قرآن کی تحقیر و توہین اور تمسخر و استہزاء کے مجرم گردانے جائیں۔“

جسے مولانا نے بدل کر یوں کرا دیا:

”.........اگر قرآن مجید کو بغیر سمجھے پڑھیں تو عین ممکن ہے کہ وہ قرآن کی تحقیر و توہین اور تمسخر و استہزاء کے مجرم گردانے جائیں اور اس اعراض عن القرآن کی سزا تلاوت کے ثواب سے بڑھ جائے۔“

اس طرح الحمدللہ کہ میری مراد بھی اور زیادہ واضح ہو گئی اور محض لفظی بے احتیاطی کے باعث منکرین حدیث سے جو مشابہت پیدا ہو رہی تھی اس کا بھی ازالہ ہو گیا!

۱۹۷۲ء کے دوران راقم ہر ماہ کراچی جاتا رہا اور گاہے گاہے مولانا کی زیارت سے مشرف بھی ہوتا رہا۔ اسی زمانے میں ایک بار مولانا نے اپنے دورۂ حدیث کے طلبہ سے خطاب کا موقع بھی عنایت فرمایا اور اگرچہ راقم مولانا کی موجودگی اور ان کے رعبِ علمی کے باعث کچھ کھل کر بات نہ کر سکا اور اس نے اعتراف بھی کیا کہ: میری حالت اس وقت وہی ہے جس کا نقشہ قرآن مجید کے ان الفاظ میں کھینچا گیا ہے کہ: ''یَضِیْقُ صَدْرِیْ وَ لَا یَنْطَلِقُ لِسَانِیْ'' تاہم راقم نے جس طرح بھی بن پڑا ''اسلام کی نشاۃ ثانیہ'' کے موضوع پر گفتگو کی، جس کی مولانا نے کھلے دل کے ساتھ تصویب فرمائی۔ انہی دنوں مولانا نے یہ محبت آمیز پیشکش بھی فرمائی کہ ''جب بھی کراچی آنا ہو، مدرسے ہی میں قیام کیا کرو، تمہارے لیے ایک بالکل علیحدہ کمرہ مخصوص کر دیا جائے گا''۔ راقم کے لیے مولانا کی اس مشفقانہ پیشکش سے فائدہ اٹھانا تو بوجوہ ممکن نہ ہو سکا تاہم دل پر ان کی ان شفقتوں کا بے حد اثر ہوا اور قلب میں مولانا کی عظمت اور عقیدت کے ساتھ ساتھ محبت بھی جاگزیں ہو گئی۔

وسط دسمبر ۱۹۷۳ء میں پہلی سالانہ قرآن کانفرنس منعقد ہوئی تو راقم نے مولانا کو اس میں شرکت کی دعوت دی جسے انہوں نے کمال شفقت سے قبول فرما لیا۔ چنانچہ حسب وعدہ تشریف لائے[1] اور دو دن راقم کے غریب خانے ہی پر رونق افروز رہے۔ اس دوران ان کی سادگی اور بے تکلفی کا جو تجربہ ہوا، اس سے بھی دل بہت متاثر ہوا۔ اور ان کا یہ طرزِ عمل تو بہت ہی ''غیر معمولی'' نظر آیا کہ انہوں نے نہ صرف یہ کہ آمد و رفت کا کرایہ وصول کرنے سے انکار کر دیا بلکہ جب انجمن خدام القرآن کی کچھ مطبوعات ان کی خدمت میں پیش کی گئیں تو ان کی قیمت بھی

(۱) راقم الحروف کو ۱۶؍دسمبر ۱۹۷۳ء کی اس شام کی کیفیات ابھی تک اچھی طرح یاد ہیں۔ جب مولانا نے ''مقام رسالت'' پر اپنی عالمانہ اور جذبہ انگیز تقریر فرمائی تھی۔ جناح ہال نہ صرف یہ کہ خود پوری طرح کھچا کھچ بھرا ہوا تھا بلکہ اس کی تمام گیلریاں بھی انسانوں سے پُر تھیں۔ راقم نے مولاناؒ کی تقریر کے بعد عرض کیا تھا کہ: ''میں پورے وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ علامہ اقبال مرحوم کا یہ شعر آج پوری طرح سمجھ میں آیا ہے کہ ؎

بمصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر باو نہ رسیدی تمام بولہبی است!!

اہالیان لاہور میں سے اکثر کے لیے مولاناؒ سے یہ پہلے تعارف کا موقع تھا۔ اور اکثر و بیشتر لوگوں کے چہروں پر ایک خوشگوار حیرانی کا تاثر نمایاں تھا!

باصرار ادا فرمائی۔[1]

۱۹۷۵ء میں تنظیم اسلامی کا قیام عمل میں آیا تو راقم نے مولانا کو اس کے ''حلقہ مستشارین'' میں شرکت کی دعوت دی تو فرمایا ''ڈاکٹر صاحب! آپ مجھے بے حد عزیز ہیں، آپ کو پوری آزادی ہے کہ جب چاہیں آئیں اور جو مشورہ چاہیں طلب کریں، میں کبھی دریغ نہ کروں گا، لیکن کوئی باضابطہ ذمہ داری قبول کرنے سے میں اپنی صحت کی کیفیت اور مصروفیت کی شدت کے باعث معذور ہوں''۔ اس کے بعد ایک اور بات بھی ارشاد فرمائی جو راقم دسمبر ۱۹۷۶ء کے ''میثاق'' میں نقل کر چکا ہے اور اس وقت اس کے اعادے کی نہ ضرورت ہے، نہ افادیت![2]

اس کے بعد افسوس ہے کہ مولانا سے صرف چند سرسری ملاقاتیں ہی ہو سکیں، جن میں سے ایک میں مولانا نے دسمبر ۱۹۷۶ء کے متذکرہ بالا مضمون کا ذکر تحسین آمیز انداز میں کیا اور اپنی دو تازہ عربی تالیفات بھی عنایت فرمائیں، جن میں سے ایک میں بعض وہی موضوعات زیر بحث آئے تھے جن پر راقم نے اپنی مذکورہ تحریر میں اظہارِ رائے کیا تھا۔ غالباً اسی موقع پر راقم نے مولانا سے دریافت کیا کہ کیا یہ درست ہے کہ حضرت شیخ الہندؒ نے مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم کے بارے میں فرمایا تھا کہ ''اس نوجوان نے ہمیں ہمارا بھولا ہوا سبق یاد دلا دیا؟'' تو مولانا نے اس کی توثیق فرمائی اور مزید ارشاد فرمایا کہ: ''اس سے ایک طرف تو حضرت شیخ الہندؒ کے تواضع و انکسار کا اندازہ ہوتا ہے اور دوسری طرف چھوٹوں کی قدر دانی اور حوصلہ افزائی کا۔''

راقم الحروف کے لیے یہ بات تا زندگی رنج و غم کا باعث رہے گی کہ ماہنامہ ''بیّنات'' کا

(۱) ۱۹۷۴ء کی تحریک ختم نبوت اور اس کی نہایت شاندار کامیابی کے ضمن میں ایک طویل اداریہ راقم نے اکتوبر، نومبر ۱۹۷۴ء کے ''میثاق'' میں شائع کیا تھا جس میں اس کی کامیابی کا ایک اہم سبب حضرت مولاناؒ کی قیادت و سیادت کو قرار دیا تھا۔ راقم کا احساس ہے کہ یہ پورا اداریہ موجودہ حالات کے اعتبار سے بھی بہت اہم ہے۔

(۲) حضرت مولاناؒ کی بقیہ بات یہ تھی: ''...... ویسے یہ بات بھی ہے کہ آپ مولانا فراہیؒ اور مولانا اصلاحی کو بہت اہمیت دیتے ہیں اور ہم ان کے معلم اول امام ابن تیمیہؒ کو علم کا بحر ذخار ماننے کے باوجود اہمیت نہیں دیتے تو ان لوگوں کی تو حیثیت ہی کیا ہے!'' ـــــ راقم نے اس وقت اس کا ذکر مناسب نہیں سمجھا تھا، لیکن واقعہ یہ ہے کہ اس وقت مولانا اصلاحی صاحب کے ساتھ راقم کا ربط و تعلق کم ہوتے ہوتے معدوم کے درجے میں آ چکا تھا۔ چنانچہ دسمبر ۱۹۷۶ء کے ''میثاق'' میں راقم نے مولانا سے اپنے تعلقات کے انقطاع کا اعلان بھی کر دیا تھا۔

جو غالباً آخری شمارہ مولانا کے اداریے کے ساتھ شائع ہوا ہے' اس میں مولانا نے راقم کی ایک تحریر کے بعض مقامات پر گرفت فرمائی اور راقم سوچتا ہی رہ گیا کہ حاضرِ خدمت ہو کر بالمشافہ وضاحت پیش کرے یا تفصیلی خط لکھے کہ خبر آ گئی کہ مولانا نے راولپنڈی میں داعیٔ اجل کو لبیک کہہ دیا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔ ویسے جن حضرات سے بھی مولانا کی اس گرفت کے بارے میں بات ہوئی وہ گواہی دیں گے کہ راقم کو اس سے ہرگز کوئی تشویش نہیں ہوئی۔ اس لیے کہ جہاں تک ''گرفت'' کا تعلق ہے' اس کے بارے میں تو راقم کو یقین تھا کہ اس کی بنیاد غلط فہمی پر ہے اور جیسے ہی راقم وضاحت پیش کرے گا' مولانا یقیناً تسلیم فرما لیں گے' اور جہاں تک محبت وشفقت کا تعلق ہے تو وہ مولانا کی اس تحریر سے بھی ٹپک رہی تھی۔ یہاں تک کہ اپنے لیے مولانا کے قلم سے ''آں محترم'' کے الفاظ دیکھ کر تو اپنے آپ میں ایک شرمندگی کا سا احساس بھی ہوا۔ البتہ حسرت ہے تو صرف اس کی کہ کاش مولانا سے ملاقات ہو جاتی' اور راقم خود ان ہی کو گواہ بناتا کہ:

☆ راقم کو نہ مفسر بننے کا کوئی شوق ہے![(۱)]

☆ نہ ہی وہ جہنم سے نجات پا جانے کو ادنیٰ درجہ کی کامیابی متصور کرتا ہے۔

☆ نہ اس کا کسی بھی درجہ میں کوئی تعلق ''خارجیت'' سے ہے' اس لیے کہ وہ گناہِ کبیرہ کے مرتکب کو ہرگز کافر نہیں سمجھتا' اور اس دنیا میں کسی کے ایمان کے فیصلے کا دارومدار عمل پر نہیں صرف ''قول'' پر سمجھتا ہے![(۲)]

(۱) چنانچہ واقعہ ہے کہ راقم نے بیسیوں مرتبہ اس فرمائش کے جواب میں کہ آپ بھی تفسیر لکھیں یہی عرض کیا کہ نہ تو راقم اس کا اہل ہے اور نہ ہی اس کی ضرورت محسوس کرتا ہے' اس لیے کہ بحمد اللہ اردو زبان میں درجن بھر کے لگ بھگ عمدہ تفاسیر موجود ہیں۔ میں تو اس کوشش میں ہوں کہ ان کے پڑھنے والے زیادہ سے زیادہ تعداد میں پیدا ہو جائیں! بلکہ ایک مرتبہ تو ایک کرم فرما مُصر ہوئے کہ اچھا صرف قرآن مجید کا ترجمہ کر دو' میں اسے فوراً شائع کر دوں گا۔ اور اس خدمت کے عوض انہوں نے ایک خطیر رقم کا لالچ بھی دیا' اور میری حوصلہ افزائی کے لیے یہ بھی کہا کہ اس میں محنت کچھ درکار نہیں' دو چار ترجمے سامنے رکھ کر ترجمہ کر دیں' صرف آپ کا نام درکار ہے' ان شاء اللہ بہت نسخے فروخت ہوں گے۔ جس پر راقم نے دل میں لاحول پڑھی اور ان سے مناسب الفاظ میں معذرت کر دی۔

(۲) اس مسئلے پر راقم ان شاء اللہ آئندہ تفصیلی گفتگو کرے گا۔

ہو سکتا ہے کہ بعض حضرات ''غلط فہمی'' کے لفظ سے مغالطے کا شکار ہو جائیں' اس میں ہرگز کوئی دخل مولانا کے سوءِ فہم کو حاصل نہیں۔ یہ تو ثابت ہی ہے کہ مولانا نے راقم کی متعلقہ تحریر ''انجمن خدام القرآن'' کے طبع کردہ کتابچے ''راہِ نجات: سورۃ **العصر** کی روشنی میں'' نہیں پڑھی بلکہ ''ادارہ اشاعت علوم اسلامیہ' چہلیک' ملتان'' کے ماہانہ سلسلۂ مطبوعات کے شمارہ نمبر ۱۴۴ میں ''انسان کا اصل سرمایہ'' کے عنوان سے مطبوعہ رسالے میں پڑھی' جس میں نہ صرف یہ کہ اس کا اول وآخر غائب ہے بلکہ راقم کا نام بھی ''ڈاکٹر اسرار محمد خاں'' درج کیا گیا ہے۔ ثانیاً اندازہ ہوتا ہے کہ کسی نے اس تحریر کے بعض مقامات نشان زد کر کے مولانا کے سامنے رکھ دیے اور مولانا نے اس پر رائے رقم فرما دی۔ و **اللہ اعلم!!**

بہرحال راقم الحروف کے نزدیک مولانا کے ساتھ کم وبیش سات سالہ تعلقات کی انتہائی خوشگوار یادوں کے آخر میں اگر ایک ذرا سی تلخ یاد بھی شامل ہو گئی تب بھی کوئی مضائقہ نہیں۔ اس لیے کہ اس تلخی میں بھی محبت وشفقت کی چاشنی بدرجۂ اتم موجود ہے۔

مولانا کو ہماری دعاؤں کی ہرگز کوئی حاجت نہیں لیکن ان کے لیے دعا خود ہمارے لیے یقیناً اجر وثواب کا ذریعہ ہے۔

اَللّٰھُمَّ اغْفِرْ لَہٗ وَارْحَمْہُ وَاَدْخِلْہُ فِیْ اَعْلٰی عِلِّیِّیْنَ – بِرَحْمَتِکَ یَا اَرْحَمَ الرّٰحِمِیْنَ!

☆☆☆

یہ ایک امرِ مسلّم ہے کہ اللہ والوں کا اصل ترکہ' اور عظیم ترین صدقۂ جاریہ صالح اولاد ہوتی ہے' راقم کا حضرت مولانا بنوریؒ کے صاحبزادے مولانا محمد بنوری سے مولاناؒ کی وفات کے بعد بہت ہی کم ملنا ہوا' لیکن چونکہ انہوں نے مولاناؒ کی مجھ پر شفقت وعنایت کا مشاہدہ کیا ہوا ہے' لہٰذا وہ میرا بہت لحاظ کرتے ہیں۔ پھر داماد بھی بیٹوں ہی کے حکم میں ہوتے ہیں' چنانچہ مولاناؒ کے خویش کلاں مولانا محمد طاسین مدظلہٗ کی راقم پر عنایتوں اور شفقتوں کا حال تو سب کے علم میں ہے ہی' شاید بعض حضرات کے علم میں یہ نہ ہو کہ وہ ''تنظیم اسلامی'' کے حلقۂ مستشارین میں بھی باضابطہ شامل ہیں۔

مولانا بنوریؒ کا دوسرا عظیم صدقۂ جاریہ ''**جامعۃ العلوم الاسلامیہ**'' ہے جس کی ایک ایک اینٹ پر مولانا کے عزمِ مصمم اور محنت ومشقت کے نقوش اسی شان کے ساتھ ثبت ہیں جو نعیم

صدیقی صاحب کے ان اشعار میں سامنے آتی ہے ؎

ہیں بالاکوٹ کی مٹی کے ذرے ہماری آرزوؤں کے مزارات
ہیں ہر ذرے کی پیشانی پہ منقوش ہمارے عزم کے خونیں نشانات

اس جامعہ کا ماہانہ مجلّہ ''بیّنات'' بھی مولاناؒ ہی کا صدقۂ جاریہ ہے' جس کے ''بصائر و عبر'' کے صفحات سالہا سال تک ان ہی کے رشحاتِ قلم سے مزین ہوتے رہے—— اور جس کی ادارت ان کی وفات کے بعد مولانا محمد یوسف لدھیانوی کے سپرد ہوئی' جو مولاناؒ کو اپنا ''شیخ اور مربی'' بھی قرار دیتے ہیں اور ان کے ساتھ ہم نامی کی اضافی نسبت بھی رکھتے ہیں۔

مولانا لدھیانوی کے قلم پر راقم الحروف کا تذکرہ پہلی بار آج سے پورے اٹھارہ برس قبل راقم کی تالیف ''تحریک جماعت اسلامی'' پر تبصرے کے ضمن میں آیا تھا جو فروری ۱۹۶۷ء کے ''بیّنات'' میں شائع ہوا تھا اور جس کے کل چار میں سے تین صفحات مولانا نے جنوری ۱۹۸۵ء کے ''بصائر و عبر'' میں بطور اقتباس شائع کیے ہیں —— ان میں راقم کے بارے میں یہ الفاظ تو شامل ہیں کہ ''ہماری رائے میں (جو اگر غلط ہو تو حق تعالیٰ ہمیں معاف فرمائیں) مصنف نے جماعت کی ''بنائے فساد'' کی تشخیص صحیح فرمائی ہے ......'' اور ''...... جس کی شکایت بڑے دردمند دل سے آج ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کو کرنا پڑی ہے'' لیکن نہ معلوم کیوں ان جملوں کے نقل سے مولانا نے احتراز فرمایا ہے کہ ''تاہم ڈاکٹر صاحب کی کتاب کا تو ایک ایک جملہ ان کے اخلاص اور خیر خواہی کی شہادت دیتا ہے!'' اور ''ہم مصنف سلّمہٗ کے قلم کی داد دیے بغیر نہیں رہ سکتے کہ انہوں نے پیچیدہ مسائل و مراحل میں بھی متانت' رزانت اور سنجیدگی کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔''

تاہم یہ تو غیر اہم بات ہے۔ راقم کے نزدیک اس تبصرے میں شامل اہم تر امور یہ ہیں کہ: (۱) ۱۹۶۷ء تک مولانا لدھیانوی مولانا مودودی مرحوم کی نیک نیتی کی کرامت کے قائل تھے اور (۲) مولانا مودودی سے مولانا لدھیانوی کو اصل شکایت یہ تھی کہ انہوں نے ''اپنے نظریات اور افکار کے گرد ''انا أعلم'' کا حصار کھینچ لیا!''۔ مولانا کی مکمل عبارت یوں ہے:

''اس لیے ہمیں اس پر قطعاً تعجب نہیں' کہ مولانا کی تحریک میں غلطیاں کیوں پیدا ہوتی گئیں۔ بلکہ حیرت اور تعجب اس بات پر ہے کہ اتنی کم غلطیاں ہی کیوں پیدا ہوئیں' اور وہ اپنے خود رو مطالعہ کے نتیجے میں' اہل حق سے نسبتاً قریب کیسے رہ گئے۔ دوسرے لوگ نہ معلوم

اس کی کیا توجیہہ کریں' لیکن مجھے تو یہ مولانا کی نیک نیتی کی کرامت معلوم ہوتی ہے۔

اور عجلت پسندانہ بے اصولی میں مزید اضافہ اس وقت ہوا' جبکہ مولانا نے اپنے نظریات و افکار کے گرد ''انا أعلم'' کا حصار کھینچ لیا' ان کی کسی غلطی پر جب کبھی تنبیہہ کی جاتی تو انہوں نے اس کی پرواہ کیے بغیر کہ یہ تنبیہہ کتنے بڑے فاضل' فقیہہ اور خدا ترس کی جانب سے کی گئی ہے' اسے ''لائق توجہ نہیں'' کہہ کر دل و دماغ کے تمام راستے بند کر لیے۔

اور نہ جب وہ غیر تربیت یافتہ ذہن کے باوصف اسلامی تحریک کی سربراہی کر رہے تھے' اگر اس دوران بھی وہ اہل صلاح و تقویٰ اور اصحاب علم و فضل کی ہدایت پر کان دھرتے تو کوئی وجہ نہ تھی کہ جماعت بالآخر اس سطح پر آ جاتی جس کی شکایت بڑے دردمند دل سے آج ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کو کرنا پڑی ہے۔'' (ماہنامہ ''بیّنات'' شوال ۱۳۸۶ھ)

ہمیں مولانا لدھیانوی کی ان آراء سے کامل اتفاق ہے—— بلکہ ہم انہیں اس وسعت قلب پر داد دیے بغیر نہیں رہ سکتے' لیکن ساتھ ہی اپنے آپ کو یہ عرض کرنے پر مجبور پاتے ہیں کہ کاش! مولانا اسی وسعت قلب کا مظاہرہ اس خاکسار کے حق میں بھی کر سکتے جسے ''اَنا أعلم'' تو کجا ''عالم'' ہونے کا بھی دعویٰ نہیں اور جو علماء کرام کی خدمت میں حاضری اور ان سے استفادے کو اپنی سعادت سمجھتا ہے۔ بہرحال اس موضوع پر کسی قدر گفتگو آگے ہوگی۔

مولانا لدھیانوی کے قلم پر راقم کا دوسری بار ذکر آج سے تین سال قبل خواتین کے مسئلے پر راقم کے ایک اخباری انٹرویو پر مغرب زدہ خواتین کے احتجاجی جلوس پر تبصرے کے ضمن میں آیا تھا۔ اور اس میں الحمدللہ کہ ملک بھر کے تمام دینی جرائد کے ساتھ ساتھ مولانا لدھیانوی نے بھی راقم کے موقف کی پوری تائید و تحسین فرمائی تھی اور ایک نہایت عمدہ تحریر اسلام میں عورت کے مقام اور مرتبہ کے موضوع پر سپرد قلم کی تھی (مولانا تقی عثمانی صاحب کا اداریہ بھی اس موضوع پر بہت زوردار تھا اور انہوں نے بھی راقم کی قرآنی حقائق کی تعبیر کی توثیق و تحسین فراخدلانہ انداز میں فرمائی تھی)۔

اس کے بعد نہ معلوم کیوں مولانا لدھیانوی کے قلم نے راقم کے خلاف مخالفانہ انداز اختیار فرما لیا۔ یہ معاملہ اگر اس طرح ہوتا کہ مولانا نے راقم کی علمی و فکری لغزشوں پر پے بہ پے ٹوکا ہوتا' اور اس کی اختیار کردہ دینی تعبیرات کی غلطیوں پر تنبیہہ کی ہوتی' جس پر راقم نے مسلسل

ضد اور ہٹ دھرمی کی روش اختیار کی ہوتی اور اس کے نتیجے میں مولانا کے طرزِ عمل میں وہ تبدیلی رونما ہوتی تو ہمیں شکایت کا کوئی حق نہ ہوتا۔ لیکن صورتِ واقعہ اس کے بالکل برعکس ہے کہ آج تک مولانا نے راقم کی کسی علمی یا فکری غلطی کی نشاندہی نہیں فرمائی (صرف ایک بار مجلس احرار اسلام اور ۱۹۵۳ء کی ختم نبوت کی تحریک کے بارے میں راقم کے بعض غیر محتاط الفاظ پر گرفت فرمائی تھی جس کی پوری وضاحت راقم نے تحریراً بھی کر دی تھی اور حاضرِ خدمت ہو کر بالمشافہ بھی کر دی تھی، جس پر انہوں نے اطمینان کا اظہار فرما دیا تھا!) لیکن جنوری اور فروری ۱۹۸۵ء کے شماروں میں ''اندیشہ ہائے دور و دراز'' کے پیشِ نظر راقم کو جو مشورہ دیا اس کا حاصل یہ بنتا ہے کہ راقم اپنی جملہ سرگرمیوں اور دینی خدمات کی بساط لپیٹ کر رکھ دے۔ ہم مولانا کے اس مشورہ کو بھی ان کے خلوص و اخلاص ہی پر محمول کر کے سکوت اختیار کرتے اگر انہوں نے بعض صریح زیادتیاں اپنی اس تحریر میں نہ کی ہوتیں۔

ان میں سب سے بڑی زیادتی تو یہ ہے کہ مولانا نے راقم کے کتابچے ''راہِ نجات: سورۃ العصر کی روشنی میں'' پر حضرت مولانا محمد یوسف بنوریؒ کا تنقیدی و تنبیہی تبصرہ تو پورے کا پورا نقل کر دیا ہے لیکن اس پر جو وضاحت راقم نے ''میثاق'' میں شائع کی تھی (جو اوپر درج کی جا چکی ہے) اس کا تذکرہ تک نہیں کیا۔ اس ضمن میں یہ بات تو ہرگز قرین قیاس نہیں ہے کہ اس وقت بھی راقم کی وضاحت مولانا لدھیانوی ایسے بیدار و ہوشیار اور محنتی شخص کی نظر سے نہ گزری ہو۔ البتہ یہ عین ممکن ہے، اور ہم یہی حسن ظن رکھتے ہیں کہ اس وقت وہ ان کی یادداشت میں محفوظ نہ رہی ہو، اگرچہ یہ بات بھی ان کے منصب کے شایانِ شان نہیں' گویا معاملہ وہی ہے کہ:

ان کنت لا تعلم فھذا مصیبۃٌ
و ان کنت تعلم فالمصیبۃُ اعظم

بہرحال اب جبکہ حضرت مولانا بنوریؒ کا رقم کردہ وہ شذرہ ''بیّنات'' ایسے وقیع مجلّے میں دوبارہ شائع ہو گیا ہے تو اپنی سابقہ وضاحت پر مستزاد عرض ہے کہ:

(۱) اس معاملہ کا تعلق اصلاً تو اس حقیقت سے ہے کہ فقہ و قانون اور قضاء و افتاء کی زبان اور دعوت و تبلیغ، وعظ و نصیحت اور اخلاقی تلقین کے لیے ترغیب و ترہیب کی زبان میں زمین و آسمان کا فرق ہوتا ہے اور اصلاً اسی فرق کو ملحوظ نہ رکھنے کا نتیجہ ہے کہ مخالفین نے شاہ

اسمٰعیل شہیدؒ اور مولانا اشرف علی تھانویؒ کی بعض عبارتوں پر طوفان کھڑے کر دیے۔ جس کا تلخ ترین تجربہ پورے حلقۂ دیوبند کو ہے' —— بلکہ اگر اس فرق کو ملحوظ نہ رکھا جائے تو خود قرآن حکیم اور فرموداتِ نبی کریم ﷺ پر ''تضاد'' کا الزام عائد ہوتا ہے۔ مثلاً قرآن اخلاقی و روحانی سطح پر عفو و درگزر کی تلقین کرتا ہے' لیکن قانونی و دنیوی نظام کی مصلحتوں کے پیشِ نظر قصاص کی اہمیت اجاگر کرتا ہے۔ اسی طرح ایک مقام پر تلقین کرتا ہے کہ ضرورت سے زائد جو کچھ ہو اللہ کی راہ میں دے دو ﴿یَسْئَلُوْنَکَ مَاذَا یُنْفِقُوْنَ قُلِ الْعَفْوَ﴾ اور دوسری طرف وراثت کا تفصیلی قانون بھی بیان کرتا ہے اور زکوٰۃ کی تلقین بھی کرتا ہے جس کے نصاب اور مقادیر کا معاملہ سنت رسولؐ نے معین فرما دیا ہے! (معلوم رہے کہ اسی اخلاقی اور قانونی تعلیمات میں فرق نہ کرنے کا نتیجہ ہے کہ اشتراکی اس آیۂ مبارکہ کو اپنی تائید کے لیے استعمال کرتے ہیں!)

(۲) ثانیاً اس کا تعلق ''ایمان'' کی تعریف سے ہے جس میں امت کی دو عظیم ترین ہستیاں بظاہر متضاد موقف رکھتی ہیں۔ چنانچہ فقیہہ اعظم امام ابوحنیفہؒ کا مشہور موقف یہ ہے کہ ''اَلْاِیْمَانُ قَوْلٌ لَا یَزِیْدُ وَلَا یَنْقُصُ!'' جبکہ محدثِ اعظم امام بخاریؒ کا قول ہے کہ ''اَلْاِیْمَانُ قَوْلٌ وَعَمَلٌ وَیَزِیْدُ وَیَنْقُصُ!'' —— ان بظاہر متضاد اقوال کے مابین تطبیق کی حسین ترین صورت یہ ہے کہ پہلی تعبیر اس فقہی اور قانونی ایمان کی ہے جو اس دنیا میں معتبر ہے اور جس کی بنا پر کسی شخص کے مسلمان ہونے یا نہ ہونے کا فیصلہ ہوتا ہے' جبکہ دوسری تعبیر اس حقیقی ایمان کی ہے جو آخرت میں معتبر ہوگا' اور دونوں ہی تعبیریں اپنی اپنی جگہ صد فی صد درست ہیں —— چنانچہ اس حقیقت کو پیشِ نظر نہ رکھنے کے باعث خطرناک ٹھوکریں کھائیں ایک جانب خوارج' معتزلہ اور اہل تشیع نے اور دوسری جانب ''مُرجئہ'' نے۔

اور یہی حقیقت ہے جس سے وہ ظاہری تضاد رفع ہوتا ہے جو ایمان کے مسئلے میں قرآن حکیم کی بعض آیات میں سامنے آتا ہے' مثلاً سورۃ النساء (آیت ۹۴) میں ارشاد ہوتا ہے کہ ''جب تم جہاد کے لیے نکلو تو تحقیق کر لیا کرو اور جو شخص تم پر سلام (سلامتی یا اسلام) پیش کرے اس سے یہ مت کہا کرو کہ تم مؤمن نہیں ہو!'' اور سورۃ الحجرات (آیت ۱۴) میں بعض بدوؤں کے دعوئ ایمان کو رد کرتے ہوئے ارشاد ہوتا ہے: ''تم ہرگز ایمان نہیں لائے ہو بلکہ یوں کہو کہ

ہم اسلام لے آئے ہیں یا ہم نے اطاعت قبول کر لی ہے''۔ یہاں ظاہر ہے کہ پہلی آیت میں لفظ ''مؤمن'' قانونی اور شرعی وفقہی مفہوم میں استعمال ہوا ہے جس کے لیے دوسری آیت میں ''اسلام' کی اصطلاح اختیار فرمائی گئی ہے اور ''ایمان'' کا لفظ حقیقت اور قلبی ایمان کے لیے مختص کر دیا گیا ہے (یہی وجہ ہے کہ اسی آیت میں مزید وضاحت فرمائی گئی ان الفاظ میں کہ ''ابھی تک ایمان تمہارے دلوں میں داخل نہیں ہوا''۔ اسی بات کو آنحضورﷺ نے حدیث معاذ بن جبلؓ میں اس طرح واضح فرمایا کہ کلمۂ شہادت' اقامت صلوٰۃ اور ایتاءِ زکوٰۃ کے ذکر کے بعد فرمایا: ((فَاِذَا فَعَلُوْا ذَالِکَ فَقَدِ اعْتَصَمُوْا وَ عَصَمُوْا دِمَاءَ ھُمْ وَ اَمْوَالَھُمْ اِلَّا بِحَقِّھَا وَ حِسَابُھُمْ عَلَی اللّٰہِ عَزَّ وَجَلَّ)) یعنی جب وہ یہ تین شرطیں پوری کر دیں تو ان کی جانیں اور مال محفوظ ہو جائیں گے (یعنی ان کا اسلام قبول کر لیا جائے گا) باقی رہا نیتوں کا معاملہ تو اس کا حساب اللہ کے ذمہ ہے (یعنی یہ معاملہ دنیا میں زیر بحث نہیں آئے گا اور اس کی بنیاد پر کوئی قانونی فیصلے یا اقدامات نہیں ہوں گے)۔

اس بنیادی حقیقت کو پیش نظر نہ رکھا جائے تو اگرچہ بہت سی احادیث میں ''ایمان'' اور ''اسلام'' کو جداگانہ حقیقتوں کی حیثیت سے بیان کیا گیا ہے تاہم انسان بہت سی احادیث نبویہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے بارے میں بھی تضاد کے سوءِ ظن میں مبتلا ہو سکتا ہے' مثلاً ایک جانب ''ترہیب'' اور تنبیہہ وتہدید کے انداز میں فرمایا جاتا ہے کہ ''خدا کی قسم وہ مؤمن نہیں' خدا کی قسم وہ مؤمن نہیں' خدا کی قسم وہ مؤمن نہیں''۔ پوچھا گیا' کون؟ تو ارشاد فرمایا: ''جس کی ایذا رسانیوں سے اس کا پڑوسی چین میں نہ ہو''۔ اور دوسری جانب ''ترغیب'' اور دلدہی اور حوصلہ افزائی کے انداز میں فرمایا جاتا ہے کہ ''اگر تمہیں کوئی اچھا کام کر کے خوشی ہو اور برا کام کر کے افسوس ہو تو تم مؤمن ہو!''

بہرحال جیسے کہ پہلے نقل ہو چکا ہے راقم کا موقف یہ ہے کہ:

میں اس دنیا میں کسی کے دعوائے اسلام و ایمان کی قبولیت کا دارومدار صرف اس کے قول کو قرار دیتا ہوں۔ عمل کی بنیاد پر کسی کے دعوائے اسلام وایمان کو رد کر دینا درست نہیں سمجھتا' چنانچہ میرے نزدیک گناہِ کبیرہ کے مرتکب کی بھی تکفیر نہیں کی جا سکتی۔ تکفیر کی صرف ایک صورت درست ہے اور وہ یہ ہے کہ کوئی بھی شخص اسلام کی کسی بنیادی بات (مثلاً ختم نبوت) کا انکار کر دے یا اس کی ایسی تعبیر کرے جو انکار کو مستلزم ہو! —— رہا آخرت کا معاملہ تو وہ اللہ کے حوالے ہے' وہ ''عَلِیْمٌ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ'' ہے۔ چنانچہ اپنے

علم کامل کی اساس پر فیصلہ کرے گا۔ البتہ اصولاً یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہاں صرف وہی ایمان معتبر ہوگا جو کسی نہ کسی درجے میں 'تصدیقٌ بالقلب'' یعنی دلی یقین کے ساتھ ہو اور اس مرتبہ پر اعمال صالحہ بھی ایمان کے ذیل ہی میں آ جاتے ہیں!!

جیسے کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے' راقم کو یقین ہے کہ اگر وہ یہ وضاحتیں مولانا بنوریؒ کی خدمت میں پیش کرتا تو وہ یقیناً قبول فرما لیتے۔ بلکہ راقم اپنا یہ کتابچہ بھی ان کی خدمت میں پیش کر دیتا کہ اس میں جہاں جہاں کسی لفظی بے احتیاطی کے باعث کوئی مخالف مفہوم متبادر ہوتا ہو تو اصلاح فرما دیجیے۔ اور راقم کو یقین ہے کہ مولانا کی اصلاح سے میرا مفہوم زیادہ نکھرتا (جس کی مثال ''قرآن مجید کے حقوق'' نامی کتابچے کے ضمن میں پہلے گزر چکی ہے)۔ بہرحال اب بھی اگر مولانا لدھیانوی اس کتابچے کے بالاستیعاب مطالعہ کی تکلیف گوارا فرما کر ایسے مقامات کی نشاندہی فرمائیں تو وہ ان شاء اللہ راقم کو کسی ضد میں مبتلا نہ پائیں گے۔

سورۃ العصر کے بارے میں راقم نے جو یہ لکھا کہ ''یہاں کامیابی کی فرسٹ یا سیکنڈ ڈویژن کا تذکرہ نہیں بلکہ صرف آخری درجے میں پاس ہونے کی شرح کا بیان ہو رہا ہے'' تو اس میں صرف اس سورۂ مبارکہ کے اسلوب کی جانب اشارہ ہے کہ اس میں اصل زور ہے ﴿اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ﴾ پر جس سے نجات کا ذکر ایک استثناء کے طور پر ہے' بمقابلہ سورۃ التین کے' کہ اس میں اصل زور ہے ﴿لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْٓ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ﴾ پر' اور ثانیاً آخر میں ذکر صرف نجات کا نہیں بلکہ مثبت طور پر ﴿فَلَھُمْ اَجْرٌ غَیْرُ مَمْنُوْنٍ﴾ کی نوید جاں فزا ہے۔ گویا سورۃ العصر پر رنگ غالب ہے ''انذار'' کا اور سورۃ التین پر رنگ غالب ہے ''تبشیر'' کا (مزید تشریح کے لیے ملاحظہ ہو ''راہِ نجات'' کے نسخہ کلاں کے صفحات ۸ تا ۱۰) ——

اسی طرح ہر شخص جانتا ہے کہ کسی شے کا اپنی جگہ حقیر یا وقیع ہونا اور ہے اور کسی دوسری چیز کے مقابلے میں کم تر یا برتر ہونا اور! چنانچہ لاکھ اپنی جگہ بہت ہے لیکن کروڑ کے مقابلے میں بہت کم! اسی طرح محض جہنم سے چھٹکارا پا جانا بھی اگرچہ اپنی جگہ بہت بڑی کامیابی ہے' لیکن جنت کے اعلیٰ مقامات کے مقابلے میں تو خود اس کے ادنیٰ درجات بھی کم تر ہوں گے (جس کی نسبت و تناسب کا ایک اندازہ ہو سکتا ہے حضورﷺ کے ان الفاظ مبارکہ سے کہ: ایک کم تر درجہ کا جنتی اپنے سے اوپر والے درجہ کے جنتی کو اس طرح دیکھے گا جیسے تم زمین پر بیٹھ کر آسمان کے ستاروں کو دیکھتے ہو۔ (او کما قال ﷺ) کجا محض جہنم سے چھٹکارا پا جانا!! یہ تقریر چونکہ راقم نے

ایچی سن کالج کے طلبہ کے سامنے کی تھی' لہٰذا اس میں ان کے ذہن کو پیش نظر رکھا گیا ہے۔ ایک طالب علم کے نزدیک محض تھرڈ ڈویژن میں پاس ہو جانا بھی کتنی بڑی کامیابی ہے یہ اس سے پوچھئے جو فیل ہو گیا ہو۔

رہی یہ بات کہ ''عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ —— کی فہرست اتنی طویل ہے کہ اسلام کی کوئی بات باقی نہیں رہی جو اس میں نہ آئی ہو!'' تو یہ بعینہٖ وہی بات ہے جو خود راقم نے ''نجات کی راہ'' کے نسخۂ کلاں کے صفحات ۲۸ تا ۳۱ تک لکھی ہے جس کے دو مختصر حصے درج ذیل ہیں:

''واقعہ یہ ہے کہ قرآن حکیم صلاح و فلاح کے جس راستے کی جانب رہنمائی کرتا ہے یہ چار چیزیں (یعنی ایمان' عمل صالح' تواصی بالحق اور تواصی بالصبر) اس کے لیے بمنزلہ اساس کے ہیں۔ پھر جس طرح ایمان کے ابتدائی مراحل سے لے کر صدیقیت کے مقام تک بے شمار مدارج ہیں (اسی طرح) عمل صالح موٹے موٹے اعمال سے شروع ہو کر ایک گھنے اور پاٹ دار درخت کی طرح انسانی زندگی کے جملہ اطراف حتیٰ کہ اس کے بعید ترین گوشوں (remote corners) تک پر محیط ہو جاتا ہے۔''

''لیکن اگر کسی انسان کی شخصیت کو کوئی اخلاقی یا روحانی بیماری گھن کی طرح کھا نہ چکی ہو تو لازم ہے کہ ایمان کا تخم جب اس کی کشت قلب میں جم کر پھوٹے تو اس سے عمل صالح اور تواصی بالحق کی متناسب اور متوازن شاخیں نمودار ہوں۔''

مولانا لدھیانوی کی دوسری زیادتی ان کا استہزائیہ انداز ہے جو کسی اخبار کے فکاہی کالموں یا ادبی جرائد کے مزاج سے تو مناسبت رکھ سکتا ہے' دینی جرائد اور ان کے بھی ادارتی صفحات کے شایانِ شان ہرگز نہیں ع ''ایں حال نیست صوفیٔ عالی مقام را''۔ چنانچہ انہوں نے اپنی طویل تحریر کا اختتام تو ان الفاظ سے کیا ہے کہ ''آخر میں یہ گزارش کرنا بھی ضروری ہے کہ میں نے جو کچھ لکھا ہے محض خیر خواہی کے جذبہ سے لکھا ہے' ڈاکٹر صاحب کی شان کے خلاف کوئی بات نکل گئی تو اس پر پیشگی (؟) معذرت کا طالب ہوں''۔ لیکن خود اس جملے میں ''شان'' کے لفظ کی استہزائی شان سے قطع نظر پوری تحریر میں جا بجا طعن وطنز کا انداز موجود ہے —— مثلاً:

(۱) ''انہوں نے ''تنظیم اسلامی'' کے نام سے اپنے مداحوں کی ایک جماعت بنا رکھی ہے۔''

(۲) ''موصوف کو شکایت ہے کہ علماء کرام نہ صرف یہ کہ ان کے مبارک سلسلہ سے تعاون نہیں کر رہے بلکہ......''

(۳) ''جبکہ ٹیلیویژن پر ان کے ''الھدیٰ'' کا غلغلہ بلند ہے۔ سینکڑوں نہیں ہزاروں پڑھے لکھے لوگ ان کے حلقہ ارادت میں شامل ہونے کو سعادت سمجھ رہے ہیں۔''

(۴) ''ڈاکٹر صاحب تو اپنی فتوحات پر نازاں ہیں اور............''

(۵) ''اس جہاد کے لیے انہوں نے ''تنظیم اسلامی'' تشکیل دے کر سفر قیادت کا آغاز کر دیا ہے اور اس پر مستزاد یہ کہ چشم بد دور انہوں نے مرزا غلام احمد قادیانی کی طرح ''سلسلہ بیعت'' بھی جاری فرما دیا ہے (جسے ''سلسلہ عالیہ احمدیہ'' کے مقابلے میں ''سلسلہ عالیہ اسراریہ'' کہنا موزوں ہوگا'' (اس پر حاشیہ میں ایک وضاحتی نوٹ ہے: ''تشبیہہ نفس بیعت میں ہے گو نوعیت کا اختلاف ہو'')

اس ضمن میں راقم نہایت ادب کے ساتھ مندرجہ ذیل گزارشات کی اجازت چاہتا ہے:

(۱) یہ انداز نگارش خواہ اپنی جگہ ادبیت کا شاہکار قرار پائے' دینی جرائد خصوصاً ''بیّنات'' اور اس کے بھی ''ادارتی صفحات'' کے شایانِ شان نہیں ہے۔

(۲) سورۃ الحجرات کی آیت ۱۱ میں انہی امور سے منع فرمایا گیا ہے —— یعنی:

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا يَسْخَرْ قَوْمٌ مِّنْ قَوْمٍ عَسٰٓى اَنْ يَّكُوْنُوْا خَيْرًا مِّنْهُمْ وَلَا نِسَآءٌ مِّنْ نِّسَآءٍ عَسٰٓى اَنْ يَّكُنَّ خَيْرًا مِّنْهُنَّ ۚ وَلَا تَلْمِزُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَلَا تَنَابَزُوْا بِالْاَلْقَابِ ۭ بِئْسَ الِاسْمُ الْفُسُوْقُ بَعْدَ الْاِيْمَانِ ۚ وَمَنْ لَّمْ يَتُبْ فَاُولٰۤئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿۱۱﴾﴾

''اے ایمان والو! نہ مذاق اڑائیں تم میں سے کچھ لوگ دوسرے لوگوں کا' ہوسکتا ہے کہ وہ ان سے بہتر ہوں اور نہ بعض عورتیں دوسری عورتوں کا' ہوسکتا ہے کہ وہ ان سے بہتر ہوں۔ اور نہ عیب چینی کرو ایک دوسرے کی' اور نہ برے نام رکھو ایک دوسرے کے۔ ایمان کے بعد برا نام بھی بہت برا ہے۔ اور جو لوگ باز نہ آئیں تو (اللہ کے نزدیک) وہی ظالم ہیں۔''

(۳) زبان اور قلم راقم کے پاس بھی ہیں' اور خواہ یہ مولانا لدھیانوی کی زبان و قلم کے مقابلے میں نہایت حقیر اور بے بضاعت ہوں تاہم کسی نہ کسی درجہ میں ترکی بہ ترکی جواب دیا جا سکتا ہے۔ خصوصاً جبکہ اس سے نفس کو بھی لذت حاصل ہوتی ہے۔ پھر ماہانہ جرائد بھی راقم کے پاس ایک چھوڑ دو دو ہیں' اور خواہ ڈائجسٹوں کے مقابلے میں ان کا حلقہ اشاعت

بہت محدود ہو' دینی جرائد کے اعتبار سے ہرگز کم نہیں ہے۔ لیکن ایک خاص سبب سے راقم یہ صورت اختیار نہیں کر سکتا۔ گویا بقول شاعر ؎

ہے کچھ ایسی ہی بات جو چپ ہوں
ورنہ کیا بات کہ نہیں آتی!

(۴) اور وہ ''خاص سبب'' یہ ہے کہ راقم کی حیثیت اس وقت ''سائل'' کی ہے۔ اس نے جس دینی خدمت کا بیڑا اٹھایا ہے وہ آیۂ مبارکہ: ﴿وَمَنْ جَاهَدَ فَاِنَّمَا يُجَاهِدُ لِنَفْسِهٖ﴾ (العنکبوت: ۶) کے مطابق سراسر اپنے ہی ''بھلے'' اور اپنے ہی فائدے کے لیے اٹھایا ہے' اس میں جب وہ تعاون کا طلب گار ہوتا ہے تو ظاہر ہے کہ یہ ع ''مانگنے والا گدا ہے' صدقہ مانگے یا خراج!'' کے مصداق ایک طرح کا ''سوال'' ہی ہے۔

یہ بھی واضح رہے کہ راقم ابھی تو صرف حلقۂ دیوبند' خصوصاً متوسلین شیخ الہندؒ ہی کے در پر سوالی بن کر حاضر ہوا ہے کہ بزرگ اس کی سرپرستی فرمائیں اور جوان اس کا ساتھ دیں ___ راقم کا ارادہ ہے کہ وقت آنے پر' اور اسے اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے واثق امید ہے کہ ان شاء اللہ وہ دن ضرور آئے گا جب وہ آگے بڑھ کر دوسرے مسلکوں کے علماء کرام کی خدمت میں بھی سوالی بن کر حاضر ہوگا۔ اس لیے کہ حضرت شیخ الہندؒ کے زمانے میں جمعیت علماء ہند' جملہ مسالک کے علماء کا مشترک پلیٹ فارم تھی اور جس طرح آنحضورﷺ نے حجۃ الوداع کے موقع پر ''نَسِیء'' کا رواج منسوخ فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا تھا کہ: ((اِسْتَدَارَ الزَّمَانُ كَهَيْئَتِهٖ يَوْمَ خَلَقَ اللّٰهُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ)) راقم کے نزدیک قدرتِ خداوندی سے یہ ہرگز بعید نہیں کہ برصغیر پاک و ہند میں بھی ساٹھ پینسٹھ سال پہلے کی فضا پھر لوٹ آئے ___ اس ضمن میں مولانا لدھیانوی ہی نے ۱۹۵۳ء کی تحریک ختم نبوت کا ایک سبق آموز واقعہ سنایا تھا کہ مولانا محمد علی جالندھریؒ جب بریلوی مکتبِ فکر کے علماء کا تعاون حاصل کرنے کی غرض سے مولانا سید ابوالحسنات قادریؒ کے ہاں گئے اور انہوں نے سخت غیظ و غضب کے عالم میں گفتگو تک سے انکار کر دیا تو مولانا جالندھریؒ نے اٹھتے اٹھتے یہ جملہ کہا: ''حضرت ہم اپنے کسی کام کے لیے حاضر نہیں ہوئے تھے' آپ ہی کے نانا (ﷺ) کے ناموس کی حفاظت کے ضمن میں تعاون درکار تھا!'' تو مولانا قادریؒ کا رنگ ایک دم تبدیل ہو گیا اور انہوں نے پوری توجہ سے بات سنی اور تحریک میں شمولیت اختیار کر لی۔

تو راقم بھی بحمد اللہ اپنی کسی ذاتی غرض سے نہیں بلکہ اللہ اور اس کے رسولﷺ کے دین

حق کے غلبہ و اقامت کے لیے کھڑا ہوا ہے اور اس کے ضمن میں وہ اگر سرپرستی اور تعاون کا سوال کر رہا ہے تو اس کی حیثیت بھی ایک ''سائل'' کی ہے۔ لہٰذا مولانا لدھیانوی ایسے حضرات کو اگر ابھی کچھ شکوک و شبہات ہیں تو بیشک سوالی کو خالی ہاتھ لوٹا دیں لیکن کم از کم ''قَوْلٌ مَّعْرُوْفٌ وَّ مَغْفِرَةٌ'' ___ ''وَ اَمَّا السَّآئِلَ فَلَا تَنْهَرْ'' اور ''فَقُلْ لَّهُمْ قَوْلًا مَّيْسُوْرًا'' کی قرآنی ہدایات کو تو پیش نظر رکھیں۔

اس گلہ اور شکوہ سے قطع نظر ___ مولانا لدھیانوی نے ''قرآن حکیم کے نام پر اُٹھنے والی تحریکات اور ان کے بارے میں علماء کرام کے خدشات'' پر تبصرہ کے ضمن میں راقم کی تشخیص کو ''سطحی'' قرار دیتے ہوئے جو اصل تشخیص خود کی ہے وہ مختصر الفاظ میں تو یہ ہے کہ:

''ان تحریکات کے قائد و بانی' علم و عمل اور صلاح و تقویٰ کے اس معیار پر پورے نہیں اترتے تھے' جو کسی دینی تحریک کے قائد و بانی کے لیے ناگزیر ہے۔''

اور مزید شرح ان الفاظ میں فرمائی ہے کہ:

''پس جو شخص کہ علمی رسوخ میں لائق اعتماد نہ ہو' جس کا عملی معیار مستند نہ ہو' جس نے اہل قلوب اور اربابِ باطن کی صحبت میں رہ کر اپنے اخلاق کا تزکیہ اور اپنی باطنی کیفیات کی تصحیح نہ کی ہو' اس کے بارے میں کیسے باور کر لیا جائے کہ وہ کسی دینی تحریک کی قیادت کرتے ہوئے نیابت نبوت کے حقوق ٹھیک ٹھیک ادا کر سکے گا' اور وہ کسی افراط و تفریط' خود رائی و کجروی کا شکار نہیں ہوگا ___ ایک ایسا شخص جس نے علوم نبوت کو کسی ماہر سے نہیں سیکھا' جس نے کسی مردِ کامل کی صحبت میں رہ کر اپنا تزکیہ باطن نہیں کرایا' جس نے لائق اعتماد مشائخ سے حکمت دین کا درس نہیں لیا' جس نے کتاب و سنت کے اسرار و حقائق کو کسی جاننے والے سے نہیں سمجھا' جس نے اپنے علم و عمل' عقائد و نظریات اور سیرت و اخلاق کو اُسوۂ نبویؐ میں ڈھالنے کی محنت و ریاضت نہیں کی' اور جس کا فہم دین جنگل کی خود رو گھاس ہے' وہ دینی قیادت کا منصب سنبھالتا ہے............''

بنابریں ان کی ''تجویز'' یہ ہے کہ:

''میرے نزدیک ڈاکٹر صاحب کی سب سے بڑی خیر خواہی یہ ہے کہ ان سے عرض کیا جائے کہ آپ ایک نئی جماعت بنا کر اور بیعت کی نئی طرح ڈال کر امت کو کسی نئی آزمائش میں مبتلا نہ کریں۔ یہ امت نئی نئی اصطلاحات اور دین کے نام پر وجود میں

آنے والی نئی نئی تنظیموں کے چرکوں سے پہلے ہی چور چور ہے۔ خدارا اس پر رحم کیا جائے'
اس کو کسی نئی تنظیم' نئی بیعت اور نئی اصطلاحات کی آزمائش سے معاف رکھا جائے۔''

گویا ان کا راقم کو مخلصانہ مشورہ یہ ہے کہ راقم اس پورے کام کی بساط لپیٹ کر رکھ دے جس کے لیے اس نے عمرِعزیز کے پورے بیس سال تو اس کیفیت کے ساتھ کھپائے ہیں کہ ؎

واپس نہیں پھیرا کوئی فرمان جنوں کا — تنہا نہیں لوٹی کبھی آواز جرس کی
خیریتِ جاں' راحتِ تن' صحتِ داماں — سب بھول گئیں مصلحتیں اہلِ ہوس کی!

اس سے پہلے بھی کم وبیش پندرہ سال اسی کیفیت میں گزرے تھے کہ ''دعوت وتحریک اسلامی'' ہی اس کی زندگی میں اہم ترین اور مقدم ترین شے تھی!!

راقم خدا کو گواہ بنا کر عرض کرتا ہے کہ اسے مولانا لدھیانوی کے خلوص و اخلاص پر ہرگز کوئی شبہ نہیں ہے۔ اسی طرح اسے مولانا تقی عثمانی صاحب کے متذکرۃ الصدر فتویٰ کے بھی مبنی بر اخلاص ہونے میں کوئی شک نہیں —— اور راقم کے علم میں ہے کہ دوسرے بہت سے مخلص علماء کرام کو بھی راقم سے اسی بنا پر اندیشے اور خدشے لاحق ہیں (چنانچہ کراچی کے مولانا عبدالبر سکھر گاہی صاحب بھی راقم کے پاس ان ہی دلائل پر مشتمل طویل خط کے ساتھ تشریف لائے تھے!) یہی وجہ ہے کہ راقم اس مسئلہ پر کھل کر بات کرنا چاہتا ہے۔

اس دلیل کا لب لباب یہ ہے کہ خدمت دین کا بیڑا اٹھانے والوں کو دو شرطوں پر پورا اترنا چاہیے: ایک یہ کہ وہ باضابطہ اور مستند عالم دین ہوں' اور دوسرے یہ کہ متقی اور مزکی ہوں! —— ان میں سے دوسری چیز تو کسی ناپ تول میں آنے والی نہیں ہے اور اس کا علم سوائے اللہ کے اور کسی کو نہیں ہوسکتا' لہٰذا آخری تجزیے میں شرطِ واحد یہ رہ جاتی ہے کہ علم دین کا حصول مروجہ معیارات کے مطابق کیا ہو —— اور مسلّمۃ المقام علماء سے سندِفراغت حاصل کی ہو۔

اس پر سب سے پہلی گزارش تو راقم کی یہ ہے کہ کسی ایک ہی ایسے بڑے فتنے کا نام بتا دیا جائے جس کا آغاز کرنے والے مستند عالم دین اور مسلّم حیثیت کے مالک علماء کرام کے فیض یافتہ نہ ہوں۔ چنانچہ کیا مسلم انڈیا کی تاریخ کے سب سے بڑے فتنے یعنی ''دین الٰہی'' کے مصنف ابوالفضل اور فیضی مسلم عالم دین نہ تھے؟ اسی طرح عہد حاضر کے عظیم فتنوں کے بانیوں میں سے کیا سرسید احمد خان مرحوم وقت کے اعلیٰ ترین معیارات کے مطابق عالم دین اور بہترین علماء کے فیض یافتہ نہ تھے؟ کیا حکیم نورالدین بھیروی نے وقت کے چوٹی کے علماء سے کسبِ علم نہیں

کیا تھا (اور واضح رہے کہ غلام احمد قادیانی کی گمراہی میں اصل دخل اسی شخص کو حاصل تھا!) کیا مولوی عبداللہ چکڑالوی اور علامہ اسلم جیراج پوری علماء میں سے نہ تھے؟ (غلام احمد پرویز کا ذکر چھوڑ دیجیے کہ وہ ان ہی اصحاب ثلاثہ یعنی سرسید' علامہ جیراجپوری اور مولوی چکڑالوی کا خوشہ چین ہے' خود کچھ نہیں!) مزید قریب آکر دیکھئے! کیا مولانا امین احسن اصلاحی مدرسۃ الاصلاح اعظم گڑھ کے سند یافتہ فارغ التحصیل اور پھر علامہ فراہیؒ ایسے محقق قرآن اور محدث مبارکپوریؒ ایسے عالم وشارح حدیث نبویؐ کے فیض یافتہ نہیں ہیں؟ اس سے بھی زیادہ قریب کی مثال درکار ہو تو کیا ڈاکٹر مسعود الدین عثمانی باضابطہ سند یافتہ ''فاضل علوم دینیہ'' اور خود حضرت مولانا بنوریؒ کے فیض یافتہ نہیں ہیں؟

واقعہ یہ ہے کہ ہدایت و ضلالت کا دارومدار ''علم'' پر نہیں ہے بلکہ صرف اور صرف دو چیزوں پر ہے: ایک انسان کی اپنی نیت و ارادہ اور دوسرے اللہ کی توفیق وتیسیر!! —— اگر انسان کے اپنے دل میں کجی اور نیت میں فتور ہو اور اللہ تعالیٰ بھی اپنی سنت کے مطابق کہ ''فَلَمَّا زَاغُوْٓا اَزَاغَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ'' اس سے توفیق خیر سلب فرما لے تو ایسا انسان جتنا بڑا عالم وفاضل ہو گا اتنا ہی بڑا فتنہ اٹھائے گا —— بلکہ بڑے بڑے فتنے تو بڑے علماء وفضلاء ہی اُٹھا سکتے ہیں غریب عامی واُمی انسان فتنہ اٹھانا چاہے گا بھی تو کوئی بڑا فتنہ کیسے اٹھائے گا۔ یہی بات علماء کرام مولانا رومؒ کے اسی شعر کے حوالے سے بیان کیا کرتے ہیں کہ ؎

علم را بر دِل زنی یارے بود — علم را برتن زنی مارے بود!

اور یہی بات آنحضور ﷺ کے اس قول میں وارد ہوئی ہے کہ ''ایک زمانہ آئے گا کہ مسلمانوں کی مسجدیں آباد تو بہت ہوں گی لیکن ہدایت سے خالی ہوں گی' آسمان تلے کی بدترین مخلوق (نام نہاد) علماء ہوں گے' فتنے ان ہی کے اندر سے اٹھیں گے اور ان ہی میں لوٹ جائیں گے!'' (او کما قال ﷺ)

اس ضمن میں ۵۲-۱۹۵۱ء کا ایک واقعہ یاد آیا۔ راقم اس وقت اسلامی جمعیت طلبہ کا رکن اور میڈیکل کا طالب علم تھا۔ برادرم خرم جاہ مراد نے جو اس وقت جماعت اسلامی کے صف دوم کے رہنماؤں میں بہت نمایاں ہیں' راقم سے ایک ''آٹوگراف'' کی فرمائش کی تو راقم نے یہ الفاظ لکھے:

''کبھی کبھی میرا دل ان لوگوں کے تصور سے کانپ اٹھتا ہے جو کبھی تحریک اسلامی کی اولین صفوں میں تھے لیکن اب اسی نسبت سے دور جا چکے ہیں۔ میں خود ''اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ هَدَانَا لِهٰذَا ۗ وَ مَا كُنَّا لِنَهْتَدِیَ لَوْ لَاۤ اَنْ هَدَانَا اللّٰهُ'' کے بعد ''رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوْبَنَا بَعْدَ اِذْ هَدَیْتَنَا وَ هَبْ لَنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً ۚ اِنَّكَ اَنْتَ الْوَهَّابُ'' کا سہارا

لیا کرتا ہوں —— اور اسی کا مشورہ اپنے عزیز ترین دوستوں کو دیا کرتا ہوں۔''

یہ آج سے ثلث صدی قبل کی بات ہے —— راقم کو یقین ہے کہ یہ انہی مبارک دعاؤں کا ثمرہ ہے کہ راقم نے چوبیس برس کی عمر میں مولانا مودودی مرحوم ایسی عظیم شخصیت سے صرف اختلاف ہی نہیں کیا' ماچھی گوٹھ کے عظیم اجتماع میں ان کے رُو در رُو اپنی دانست کے مطابق ''احقاقِ حق'' اور ''ابطالِ باطل'' کی سعی کی۔ اور وہ کتاب تالیف کی جس پر خراجِ تحسین خود مولانا لدھیانوی نے ادا فرمایا تھا اور جس پر مولانا عتیق الرحمٰن سنبھلی نے لکھا تھا:

''میں نے آپ کی کتاب آتے ہی پڑھ ڈالی —— میرے لیے سب سے زیادہ تعجب کی بات یہ ہے کہ جس شخص کے ذہن وفکر پر کوئی دوسرے اثرات نہیں تھے' جس کا تمام دینی شعور جماعت اسلامی ہی کی گود میں پلا بڑھا اور تمام تربیت اسی کے سانچے میں ہوئی' اس کا ذہن اس قابل ہوا کیسے کہ جماعت کی پالیسی سے اتنی جلدی بے اطمینانی محسوس کرنے لگے! میرے خیال میں شاید اس کی دوسری مثال جماعت میں موجود نہیں ہے......'' (طبع شدہ ''میثاق'' و شمولہ کتاب 'سرافگندیم' صفحہ ۱۳۳)

پھر یقیناً یہ بھی ان ہی دعاؤں کا ثمرہ ہے کہ ابتدا میں مولانا امین احسن اصلاحی صاحب سے حد درجہ متاثر بلکہ مرعوب ہونے کے باوجود' اور ان کے ساتھ طویل ترین اور قریب ترین تعلقات کے باوصف راقم نے اولاً تصوف کے ضمن میں ان کی رائے سے اختلاف کیا' اور ان کی برہمی کے باوجود عین اس دور میں جبکہ ''میثاق'' ان کے ''زیر سرپرستی'' شائع ہوتا تھا' تصوف کی حمایت میں مضامین شائع کیے —— اور بالآخر رجم کے مسئلے پر ان کے ساتھ آخری تعلق کا تسمہ بھی توڑ ڈالا۔ (اس ''وصل و فصل'' کی پوری داستان' راقم ''میثاق'' دسمبر ۱۹۷۶ء میں شائع کر چکا ہے)۔

الغرض مولانا لدھیانوی اور جملہ علمائے حقانی کے کرنے کا ''اصل کام'' یہ ہے کہ خود انہیں اللہ تعالیٰ نے جو خیر کثیر عطا فرمایا ہے اس پر اُس (اللہ تعالیٰ) کا شکر بجا لائیں اور راقم کے حق میں دعا فرمائیں کہ اللہ تعالیٰ اسے شیطان اور نفس کے فتنوں سے اپنی حفاظت میں رکھے —— اور اگر اپنے وقت اور صلاحیت کا ایک حصہ اس کام کے لیے بھی وقف کر دیں کہ مجھ پر' میری سرگرمیوں پر' اور میری تحریروں پر نظر رکھیں اور جہاں کجی نظر آئے' تعین کے ساتھ متنبہ فرما دیں تو اسے تو راقم ان کا اپنے اوپر ذاتی احسان سمجھے گا! (چنانچہ یہی فلسفہ ہے تنظیم اسلامی کے ''حلقہ مستشارین'' کا' جس میں شمولیت کی دعوت راقم نے حضرت مولانا بنوریؒ کو دی تھی' لیکن انہوں نے کچھ اپنی مصروفیات اور کچھ مولانا اصلاحی سے راقم کے قرب کے باعث قبول نہ کی تھی!)

اس ضمن میں ایک واقعہ اور یاد آیا۔ چند سال قبل کی بات ہے کہ مشفق مکرم سردار اجمل خان لغاری (رحیم آباد' ضلع رحیم یار خان) کی موجودگی میں مولانا مفتی رشید احمد لدھیانوی مدظلہ' نے راقم کے بارے میں کچھ تنقیدی کلمات ارشاد فرمائے' جس پر لغاری صاحب نے ان سے سوال کیا کہ کیا آپ کی اس سے کبھی ملاقات ہوئی؟ یا کیا آپ نے کبھی اس کی تقریر سنی؟ یا کیا آپ نے کبھی اس کی کوئی تحریر پڑھی؟ —— اور جب تینوں سوالوں کا جواب نفی میں ملا' تو انہوں نے باصرار عرض کیا کہ میرے ساتھ ابھی لاہور چلیے' میں اس سے آپ کی ملاقات کراتا ہوں! جس پر حضرت مفتی صاحب نے حامی بھر لی۔ چنانچہ یہ حضرات لاہور تشریف لے آئے' اور گلبرگ میں لغاری صاحب کے بھانجے کے مکان پر مقیم ہوئے۔ لغاری صاحب نے فون پر راقم کو حکم دیا کہ فوراً آؤ' چنانچہ راقم حاضر ہو گیا۔ گفتگو کا آغاز ہوا تو قبلہ مفتی صاحب نے فرمایا: ''ہم کسی ایسے شخص کو درسِ قرآن کی اجازت کیسے دے سکتے ہیں جس نے نہ باقاعدہ علم حاصل کیا' نہ علمائے حقانی اور اہل اللہ کی صحبت اٹھائی؟'' اس پر راقم نے قدرے توقف کے بعد عرض کیا: ''حضرت! اوّل تو یہ آپ کی اجازت پر منحصر نہیں' دوسرے فرض کیجیے میں آپ کے حکم کی تعمیل میں درس بند کر دوں تو غلام احمد پرویز تو نہیں کرے گا! تو بتائیے کہ اس سے دین کا نفع ہو گا یا نقصان؟'' الحمدللہ کہ راقم کی اس دلیل کو مفتی صاحب نے کھلے دل سے قبول فرما لیا اور صرف اس قدر اضافہ فرمایا کہ ''لیکن یہ لازم ہے کہ علماء کے ساتھ ربط ضبط رکھا جائے''۔ جس پر میں نے عرض کیا کہ ''میں نہ صرف یہ کہ اس کے لیے انتہائی دلی آمادگی اور رغبت کے ساتھ تیار ہوں بلکہ پہلے سے اس پر عمل پیرا ہوں''[۱]۔ امید ہے کہ مولانا لدھیانوی اور ان کی طرز پر سوچنے والے علماء کرام معاملہ زیر بحث کے اس پہلو پر بھی سنجیدگی سے غور فرمائیں گے۔

جہاں تک ''تقلید'' یا عدمِ تقلید'' یا ''نیم تقلید'' کی بحث کا تعلق ہے' اس پر اصل مقدمہ تو مولانا عبدالقیوم حقانی (اکوڑہ خٹک) اور مولانا محمد ازہر (مدیر ''الخیر'' ملتان) نے قائم فرمایا تھا'

---

(۱) چنانچہ راقم اپنے اسی طرزِ عمل کے لیے استشہاداً پیش کرتا ہے ''قرآن کانفرنسوں'' اور محاضراتِ قرآنی میں علماء کرام کی شرکت اور شمولیت کو۔ اور خود ان کی خدمت میں حاضری کو —— جس پر مولانا لدھیانوی نے یہ معارضہ کر دیا کہ اس سے یہ کہاں لازم آیا کہ تم ''مستند'' ہو گئے؟ اس پر اس کے سوا اور کیا عرض کیا جا سکتا ہے کہ ع ''خامہ انگشت بدنداں ہے اسے کیا لکھیے!''

اور راقم اپنی امکانی حد تک اس کے ضمن میں اپنی وضاحت پیش کر چکا ہے۔ راقم مولانا لدھیانوی کا ممنون اور شکر گزار ہے انہوں نے میری ابتدائی تحریر —— اور بعد کی وضاحت دونوں کو پیش نظر رکھ کر میری وضاحت کو قبول فرماتے ہوئے یہ جملے تحریر فرمائے ہیں:

(۱) ''امید ہے کہ موصوف کی یہ توضیحات ان کے ناقدین کے لیے بڑی حد تک اطمینان اور تسلی کا موجب ہوں گی۔'' (۱) (''بیّنات'' فروری ۱۹۸۵ء' صفحہ ۷)

(۲) ''ڈاکٹر صاحب کا یہ ارشاد بھی بالکل بجا ہے کہ: ''جنس اجتہاد یا نفس اجتہاد کے بقا و تسلسل کا معاملہ میرے نزدیک ان مسائل میں ہے جو سائنسی ترقی اور عمرانی ارتقاء کے نتیجے میں بالکل نئ صورتِ معاملہ کی حیثیت سے پیدا ہوئے ہیں ——!''

البتہ اس معاملے میں جس حزم و احتیاط کی ضرورت ہے اس کے ضمن میں نہایت عمدہ باتیں مولانا نے ارشاد فرمائی ہیں جو اپنی جگہ سب صد فی صد درست ہیں لیکن راقم سے ہرگز متعلق نہیں' اس لیے کہ وہ اپنے بارے میں اہلیت اجتہاد کا مدعی ہی نہیں ہے۔

اس ضمن میں مسالک اربعہ میں سے کسی کو ''اختیار'' کرنے پر ''اجتہاد'' کے لفظ کا اطلاق زیادتی ہے۔ اور مولانا لدھیانوی نے تو نہیں' البتہ مولانا محمد ازہر صاحب نے ستم بالائے ستم کا معاملہ اس طرح کیا ہے کہ اسی کو مبنیٰ اور مدار بنا کر ایک مکمل مضمون سپردِ قلم کر دیا ہے جو ''الخیر'' کے فروری کے شمارے میں شائع ہوا ہے جس میں اجتہاد کی جملہ شرائط کو بالوضاحت بیان فرمایا ہے (ساتھ ہی راقم کو ایک ذاتی خط بھی تحریر فرمایا ہے جس کے لیے راقم ان کا ممنون ہے)۔ راقم کا سوال ان سے صرف یہ ہے کہ آیا ائمہ اربعہ بھی ان کے معیار اجتہاد پر پورے اترتے تھے یا نہیں؟ اور اگر پورے اترتے ہیں تو ان کے فیصلے گویا اجتہاد کی جملہ شرائط کی چھلنیوں میں سے چھن کر آئے ہیں اور انہوں نے اجتہاد کے تمام کڑے امتحانات پاس کر لیے ہیں' اب ان میں سے کسی کے اختیار کرنے کے لیے از سر نو ان تمام شرائط کو پورا کرنا اور ان تمام امتحانات میں سے گزرنا کس دلیل سے لازم ٹھہرتا ہے؟

ایک دوسری زیادتی اس بحث کے ضمن میں مولانا لدھیانوی نے یہ کی ہے کہ راقم کو بالجزم ''اہلحدیث'' قرار دے دیا ہے' حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ راقم اگر سکہ بند ''حنفی'' نہیں تو

---

(۱) یاد ہوگا کہ بالکل اسی کے لگ بھگ الفاظ مولانا اخلاق حسین قاسمی مدظلہ نے تحریر فرمائے تھے کہ: 'ڈاکٹر صاحب نے اس غلط فہمی کو دور کرتے ہوئے جو کچھ لکھا ہے وہ علماءِ حق کو مطمئن کرنے کے لیے کافی ہے'' اور ''اس کا تقاضا ہے کہ ڈاکٹر صاحب کے فقہی موقف کی حوصلہ افزائی کی جائے!''

معروف اور متداول معنوں میں ''اہلحدیث'' بھی ہرگز نہیں ہے۔ چنانچہ یہ واقعہ ہے کہ سکہ بند اہلحدیث راقم کو اہلحدیث تسلیم نہیں کرتے (ابھی حال ہی میں فاتحہ خلف الامام ہی کے مسئلے میں راقم کے موقف پر نہایت جارحانہ تنقید اپنے ہفت روزہ پرچے کی کئی اشاعتوں میں مولانا عبدالقادر روپڑی صاحب نے کی ہے!) گویا راقم کا معاملہ وہی ہے کہ ؎

زاہد تنگ نظر نے مجھے کافر جانا　　اور کافر یہ سمجھتا ہے مسلمان ہوں میں!

اس ضمن میں غالبًا مولانا لدھیانوی کی توجہ ''میثاق'' دسمبر ۱۹۸۴ء کے شمارے میں شائع شدہ مولانا سید حامد میاں مدظلہ کے ان الفاظ پر نہیں ہوئی کہ:

''ہاں البتہ اگر کوئی غیر مقلد ہو اور وہ ان ائمہ کو مقتدا مان کر بلا خواہش نفس مسئلہ کو راجح سمجھتے ہوئے ایسا کرنے لگے (یعنی راقم کے الفاظ میں ''نیم مقلد'' بن جائے) تو شاید اس کے لیے مطلقاً غیر مقلد بنے رہنے سے بہتر ہوگا......''

مزارعت کے ضمن میں میری رائے پر جو اشکال مولانا لدھیانوی کو ہوا ہے وہ اسی پر تھوڑا سا مزید غور فرما لیتے تو یہ بات واضح ہو جاتی کہ راقم سکہ بند اہلحدیث نہیں ہے! اس مسئلے میں مزید زیادتی مولانا لدھیانوی نے یہ کی ہے کہ راقم کی رائے کو مولانا طاسین مدظلہ کے مقالے سے تاثر کا نتیجہ قرار دیا ہے۔ حالانکہ اگرچہ اس میں کوئی شک نہیں کہ راقم مولانا کے مقالے کا حد درجہ مداح ہے' یہی وجہ ہے کہ اس نے اسے ''حکمت قرآن'' کی پندرہ اشاعتوں میں قسط وار شائع کیا ہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ راقم کی رائے اس سے بہت پہلے کی ہے —— اور مولانا کے مقالے سے اسے صرف مزید تقویت حاصل ہوئی ہے۔ پھر نہ معلوم کیوں مولانا لدھیانوی نے اس کے ضمن میں صرف فقہ حنفی کے ''مفتیٰ بہ'' قول کا ذکر کیا اور امام ابوحنیفہؒ اور امام مالکؒ کا تذکرہ نہیں کیا۔ حالانکہ میں نے اپنی رائے کے لیے باضابطہ ان کا حوالہ دیا تھا۔ یہاں یہ تذکرہ بھی ہو جائے تو نامناسب نہ ہوگا کہ مزارعت کے باب میں میری سب سے زیادہ زور و شور کے ساتھ مخالفت اہلحدیث حضرات ہی کی جانب سے ہوئی۔ چنانچہ حافظ احسان الٰہی ظہیر صاحب نے اس پر میرے خلاف ایک غیظ و غضب سے مملو تقریر اجتماعِ جمعہ میں کی۔ اسی طرح مولانا عبدالغفار حسن مدظلہ اور ان کے صاحبزادے برادرم صہیب حسن سلّمہ نے بھی اظہارِ ناپسندیدگی کیا' لیکن میں نے ان سب حضرات کو مولانا طاسین صاحب کے مکمل مقالے کی فوٹو اسٹیٹ کاپیاں پیش کر کے عرض کیا کہ اس پر علمی تنقید فرمائیے میں شائع کروں گا جس کا آج تک کسی جانب سے کوئی جواب نہیں ملا!!

مولانا لدھیانوی کو ایک اور بہت بڑا مغالطہ یہ لاحق ہوا ہے کہ شاید میرے ''جہاد بالقرآن'' کا ہدف صرف ''فرقہ واریت'' ہے' اور مغالطہ در مغالطہ یہ کہ فرقہ واریت سے میری مراد مسالک فقہیہ ہیں! راقم پہلی بات کے ضمن میں وضاحت اور دوسری سے کامل اعلان براءت کرتا ہے۔ راقم کے نزدیک مسلمانوں میں حقیقی فرقے تو دو ہی ہیں: ایک سنی اور دوسرے شیعہ' اور ان کے مابین اختلاف صرف فقہ کا نہیں بلکہ بنیادی عقائد اور اصولوں کا ہے۔ دوسری جانب صورت واقعہ یہ ہے کہ ہمارے ملک میں (اور اسی طرح ہندوستان میں) اصل محاذ آرائی اور ''فرقہ واریت'' دیوبندیوں اور بریلویوں کے مابین ہے جو ایک ہی فقہ کی پیروی کرتے ہیں! راقم مولانا لدھیانوی سے اس بات پر شدید احتجاج کیے بغیر نہیں رہ سکتا کہ انہوں نے اسے اتنا کودن سمجھا کہ یہ فیصلہ صادر فرما دیا کہ: ''اس ''فرقہ واریت'' سے ان کی مراد ائمہ مجتہدین کا فقہی اختلاف اور اس سے پیدا ہونے والے مذاہب یا مسالک ہیں!'' مولانا اگر ذرا غور فرمائیں تو اس ضمن میں میری تقریر یا جو اقتباس انہوں نے ''بیّنات'' بابت فروری ۱۹۸۵ء کے صفحہ ۳ پر دیا ہے' اسی میں اس کی کامل تردید موجود ہے۔

رہا جہاد بالقرآن کے ''اہداف'' کا معاملہ تو مولانا نے راقم کی جس تقریر پر اظہارِ رائے کے لیے دو اقساط پر مشتمل مفصل تحریر سپردِ قلم کی ہے اسی میں راقم نے پانچ ''محاذ'' گنوائے ہیں:
(۱) جاہلیت قدیمہ: جس میں مشرکانہ اوہام' بدعات اور شفاعت باطلہ کے تصورات شامل ہیں
(۲) جاہلیت جدیدہ یعنی الحاد اور مادہ پرستی اور فحاشی و اباحیت (۳) بے یقینی اور تذبذب
(۴) فرقہ واریت اور (۵) نفس پرستی اور شیطان کی وسوسہ اندازی —— راقم کے نزدیک ان پانچوں محاذوں پر جہاد قرآن کی سیف قاطع سے ہوگا' بقول علامہ اقبال مرحوم ؎

خوشتر آں باشد مسلمانش کُنی   کشتۂ شمشیر قرآنش کُنی!

لیکن چونکہ قرآن کے نام پر اُٹھنے والے بہت سے گروہ ''ضَلُّوْا و اَضَلُّوْا'' کا مصداق بن گئے' لہٰذا راقم نے پانچ احتیاطوں کا ذکر بھی کیا یعنی:

(۱) اسلاف کے ساتھ دلی محبت اور عقیدت واحترام کا رشتہ کسی صورت ٹوٹنے نہ پائے۔

(۲) تقلید جامد اور اجتہادِ مطلق کے مابین معتدل راہ اختیار کی جائے (یہ ہے وہ مسئلہ جس پر ''الخیر'' میں بحث چھڑی تھی اور راقم نے وہ وضاحتیں کی تھیں جنہیں مولانا اخلاق حسین قاسمی اور مولانا لدھیانوی نے تو تسلی بخش قرار دیا ہے' لیکن مولانا محمد ازہر مطمئن نہیں ہوئے)۔

(۳) تمسک بالقرآن کے ضمن میں: (i) آیاتِ احکام کی وہی تعبیر صحیح قرار دی جائے جو سنت رسول' سنت خلفاء راشدینؓ' اجماع صحابہؓ اور سلف صالحین خصوصاً ائمہ اربعہ کے اجتہادات کے دائرے کے اندر اندر ہو۔ (ii) البتہ تاریخی اور سائنسی مباحث میں جدید انکشافات کو مدنظر رکھا جائے تو کوئی حرج نہیں ہے!

(۴) علماء حقانی کے ساتھ ربط وضبط اور ان کی خدمت میں طالب علمانہ حاضری —— اور

(۵) علماء حق کا اعتماد حاصل کرنے کی پوری کوشش!!

مولانا لدھیانوی اگر تنقید کا حق ادا کرنا چاہتے ہیں تو ان جملہ نکات کو پیش نظر رکھ کر تنقید فرمائیں۔ راقم اور اس کے ساتھی ان شاء اللہ العزیز حتی الامکان استفادہ کریں گے۔

آخر میں ایک غیر اہم سی بات جسے مولانا لدھیانوی کی تعبیر نے بہت اہم بنا دیا ہے۔ اور وہ یہ کہ راقم کا اپنے آپ کو اور اپنے بعض رفقاء کو ''اُمی نبی کا اُمی اُمتی'' لکھنا نہ کسی مبالغہ آمیز انکسار پر مبنی تھا نہ کسی ارادی ''مدح خود'' پر۔ بلکہ صرف اس اعتراف کے طور پر تھا کہ راقم باضابطہ فارغ التحصیل عالم دین نہیں ہے۔ اور راقم اس اعتراف کو ''عصمت بی بی است از بے چادری'' کے مصداق اپنے حق میں حفاظت کا ایک ذریعہ اور گویا ایک ''ڈھال'' سمجھتا ہے۔ (تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو ''میثاق'' ستمبر ۱۹۸۴ء صفحہ ۵۸)۔ لیکن اس کے بارے میں مولانا لدھیانوی کا یہ خیال ہے کہ اس میں ''آنحضرت ﷺ کے حق میں سوءِ ادب کا پہلو نکلتا ہے'' —— تو اگرچہ راقم مولانا کی اس رائے سے متفق نہیں ہے تاہم اس کے امکان کو پیش نظر رکھتے ہوئے راقم عہد کرتا ہے کہ آئندہ یہ الفاظ کبھی استعمال نہ کرے گا! ؎

ادب گاہیست زیر آسماں از عرش نازک تر
نفس گم کردہ می آید جنیدؒ و بایزیدؒ ایں جا

اَللّٰھُمَّ اِنِّیۤ اعوذبك مِن الشَّكّ و الشرك. واعوذ بك من النفاق والرياء. واعوذ بك من همزات الشياطين واعوذ بك ربّ اَن يحضرون. واعوذ بك من شرور نفسى ومن سيات اعمالى. و اعوذبك من خزى الدنيا و عذاب الآخرة ——— اَللّٰھُمَّ اهدنى ورُفقائىِ كُلَّهم فى جمعية خدام القرآن والتنظيم الاسلامى. اَللّٰھُمَّ اغفر لنا وارحمنا ووفّقنا لما تحبّ وترضٰى. اَللّٰھُمَّ وفقنا ان نجاهد فى سبيلك باموالنا وانفسنا. اَللّٰھُمَّ ارزقنا شهادةً فى سبيلك' آمين. يا ارحم الرّاحمين!!

(''تذکرہ وتبصرہ'' ماہنامہ ''میثاق'' لاہور' مارچ ۱۹۸۵ء)

تذکرہ و تبصرہ

قارئینِ ''میثاق'' اس حقیقت سے بخوبی واقف ہیں کہ راقم الحروف نے اپنی زندگی کو غلبہ و اقامت دین کی جس جدوجہد کے لیے وقف کیا ہے اس کے ضمن میں اسے علماء کرام کی سرپرستی اور تعاون کی ضرورت کا شدت کے ساتھ احساس ہے۔ اور اس سلسلے میں یوں تو اگرچہ وہ اہل علم کے تمام سلسلوں اور خانوادوں کے دَر کا سوالی ہے اور سب ہی کی خدمت میں کشکول بدست حاضری اُس کے پروگرام میں شامل ہے' تاہم ابتداءً اُسے سب سے زیادہ توقع علماء کرام کے ان حلقوں سے ہے جن کا براہِ راست یا بالواسطہ تعلق حضرت شیخ الہندؒ سے ہے کہ اُن سے منسلک بزرگ اور معمر علماء اُس کی سرپرستی فرمائیں گے اور غلطیوں پر متنبہ فرمائیں گے اور صحیح باتوں کی تائید و توثیق کریں گے ورنہ کم از کم دعاءِ خیر سے ضرور نوازیں گے اور نوجوان علماء اُس کے ساتھ عملی تعاون کے لیے پیش قدمی کریں گے اور اس کے دست و بازو بنیں گے ـــــ لیکن افسوس کہ گزشتہ سال کے دوران اس ضمن میں جو تحریریں راقم کے قلم سے نکل کر ''میثاق'' میں شائع ہوئیں' ان کے حوالے سے بعض ضمنی اور فروعی مباحث کا سلسلہ اس قدر طول اختیار کر گیا کہ کم از کم وقتی طور پر اصل مقصد غتربود ہو گیا اور بظاہر احوال صورت یہ بن گئی کہ ؎

خدایا جذبہ دل کی مگر تاثیر الٹی ہے ۔۔۔ کہ جتنا کھینچتا ہوں اور کھنچتا جائے ہے مجھ سے!

اس ضمن میں اس امر کا فیصلہ تو مستقبل کرے گا کہ اس صورت حال کے پیدا ہونے میں کس قدر دخل راقم کے قصورِ فہم یا عجز بیان کو حاصل ہے اور کس قدر علماء حق کے بار بار کے تلخ تجربات کی بنا پر ضرورت سے زیادہ حساس بلکہ متوحش ہونے کو اور کس قدر بعض علماء سوء کی ریشہ دوانیوں کو ــــــ بہرحال راقم اس معاملے میں ہرگز مایوس یا بددل نہیں ہے اور اگرچہ اُس کے بہت سے رفقاء نے اسے پورے شدومد کے ساتھ مشورہ دیا ہے کہ اس سعیٔ لاحاصل میں وقت ضائع مت کرو بلکہ بعض اکابر جو خود علماء ہی کے حلقے سے تعلق رکھتے ہیں' ان کی بھی یہ رائے سامنے آئی ہے کہ اپنے کام سے کام رکھو اور علماء سے نہ کوئی معارضہ کرو نہ تعارض یا تعرض۔ تاہم راقم کا فیصلہ یہی ہے کہ اس سلسلے میں اس کی کوششیں بھرپور طور پر جاری رہیں گی۔ اور اسے اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم اور اپنے خلوص و اخلاص کی بنا پر یقین ہے کہ وہ علماءِ حق کا اعتماد حاصل کرنے میں ضرور کامیاب ہو گا۔ ان شاء اللہ العزیز!

اس ضمن میں اس امر کی صراحت ضروری ہے کہ اس میں راقم نہ کسی تکلف یا تصنع سے کام لے رہا ہے نہ ہی کوئی وقتی مصلحت اس کی داعی بنی ہے' بلکہ الحمدللہ ثم الحمدللہ کہ یہ راقم کے مزاج اور افتادِ طبع کا جزو لاینفک ہے۔

راقم نے بارہا ذکر کیا ہے کہ بالکل نوعمری میں جبکہ راقم ابھی ہائی اسکول کا طالب علم تھا اُس کا حال یہ تھا کہ اگرچہ اس کا فکری و جذباتی تانا بانا کل کا کل علامہ اقبال مرحوم کی ملّی شاعری سے بنا تھا اور اسی بنا پر اس کی عملی وابستگی تحریک پاکستان کے ساتھ تھی' لیکن اس کے ساتھ ساتھ اس نے نہ صرف یہ کہ مولانا مودودی مرحوم کے بہت سے کتابچے پڑھے تھے اور مسلم لیگ اور مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن کے حلقوں میں وہ ان کی جانب سے مدافعت کیا کرتا تھا' بلکہ لیگی حلقوں کی اس وقت کی مبغوض ترین شخصیت یعنی مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم کی بعض کتابیں (جن کے نام غالباً مضامین الہلال اور مقالاتِ ابوالکلام تھے) میں نے ماسٹر غلام محمد بھٹی مرحوم سے لے کر کچھ سمجھ کر اور کچھ بے سمجھے بوجھے پڑھی تھیں۔

پھر جماعت اسلامی کی تحریک کے ساتھ دس سالہ شدید فعال وابستگی کے دوران بھی اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے راقم ''حُبّک الشیٔ یُعمیکَ وَ یُصِمّ'' کا مصداق نہیں بنا۔ چنانچہ ۱۹۵۳ء کی تحریک ختم نبوت کے ضمن میں راقم کی رائے یہ بنی تھی جس کا اس نے برملا اظہار بھی کیا تھا کہ اس معاملے میں جماعت نے شدید بے اصولے پن کا مظاہرہ کیا ہے' پھر جب بعض فقہی مسائل میں مولانا مودودی مرحوم اور مولانا ظفر احمد عثمانی تھانویؒ کے مابین قلمی مناظرہ ہوا تو اُس کے ضمن میں بھی راقم نے برملا کہا کہ مولانا کو کھلی شکست ہوئی ہے۔ پھر جب مولانا نے حضرت مدنیؒ کی خودنوشت سوانح حیات (نقش حیات) پر تنقید کی' تو راقم نے اصل کتاب جامعہ رشیدیہ ساہیوال سے حاصل کر کے پڑھی اور جماعت اسلامی کے اجتماعِ ارکان میں برملا کہا کہ اس معاملے میں مولانا سے علمی خیانت کا صدور ہوا ہے! پھر جب راقم کی رائے یہ بنی کہ جماعت اسلامی اپنے اصل انقلابی طریق کار سے منحرف ہو کر غلط رُخ پر چل نکلی ہے تو سب جانتے ہیں کہ راقم نے کس جرأت کے ساتھ اس کا اظہار کیا' یہاں تک کہ ماچھی گوٹھ میں خود مولانا مودودی مرحوم کے بالمقابل اپنی رائے کو پیش کرنے کی بھرپور کوشش کی۔ یہ دوسری بات ہے کہ اس وقت اُس کی بات نقار خانے میں طوطی کی صدا بن کر رہ گئی!

اس سلسلہ کا ایک واقعہ یاد آیا۔ یہ ۵۳-۱۹۵۲ء کی بات ہے۔ راقم میڈیکل کالج کا طالب علم تھا اور اسلامی جمعیت طلبہ کا ناظم اعلیٰ ــــــ راقم کے دو کلاس فیلو جن میں سے ایک

حیدر شاہ صاحب پاکستان کی موجود الوقت معروف اور مقتدر دینی شخصیت پیر کرم شاہ صاحب کے حقیقی برادرِ خورد تھے اور دوسرے محبوب شاہ صاحب اُن کے چچازاد بھائی' —— یہ دونوں حضرات جماعت اسلامی کے شدید ترین مخالف تھے بلکہ ''نقل کفر کفر نباشد' کے مصداق نقل کر رہا ہوں کہ وہ ''ایک مودودی' سو یہودی'' کا نعرہ لگایا کرتے تھے۔ تو میں نے ایک بار اُن سے عرض کیا تھا کہ ''شاہ صاحب' ہم مولانا مودودی کے پیچھے اندھے بہرے ہو کر نہیں چل رہے ہیں بلکہ الحمد للہ کہ کھلی آنکھوں اور بیدار ذہن وقلب کے ساتھ چل رہے ہیں' اگر کبھی محسوس ہوا کہ وہ غلط راہ پر چل نکلے ہیں تو ان شاء اللہ اُن سے اختلاف کرنے والا پہلا شخص میں ہوں گا!'' اس کے بعد میں نے بار ہا اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا ہے کہ اُس (اللہ تعالیٰ) نے میرے اس قول کی لاج رکھی اور مجھے کسی ''ذہنی غلامی'' میں مبتلا ہونے سے بچا لیا ؎

ایں سعادت بزور بازو نیست
تا نہ بخشد خدائے بخشندہ!

جماعت سے علیحدگی کے بعد ایک عرصہ تک جماعت کے سابقین ہی کے ''صحرائے تیہہ'' میں بھٹکتے رہنے اور بالآخر اُن سے مایوس ہونے کے بعد راقم نے جیسے ہی اپنی ذاتی سوچ اور خود اپنی افتادِ طبع کے مطابق آزادانہ کام کی داغ بیل ڈالی تو اُس کے مزاج کے اُس جزو لازم کا ظہور شروع ہو گیا۔ اور اگرچہ راقم کے اُس وقت کے ''سرپرست'' مولانا امین احسن اصلاحی کو یہ چیز شدید ناگوار تھی تاہم راقم نے علماء کرام سے ربط وضبط بڑھانا شروع کر دیا۔ چنانچہ اُس کی قائم کردہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کے زیر اہتمام جو پہلی سالانہ قرآن کانفرنس دسمبر ۱۹۷۳ء میں منعقد ہوئی اُس کی ''شان'' کا کچھ اندازہ اُس اشتہار سے ہو سکتا ہے جو اس کے لیے اخبارات میں شائع کرایا گیا تھا۔ جس کا عکس اگلے صفحات میں شائع کیا جا رہا ہے! (راقم ان دنوں اپنے بعض پرانے کاغذات کو دیکھ رہا تھا کہ اچانک ایک لفافے سے اُس اشتہار کا پوزیٹو برآمد ہو گیا۔ اصل میں ہم اخبار کے لیے اشتہار کی کتابت خود اپنے اہتمام میں کراتے ہیں اور پھر اُس کے پوزیٹو بنوا کر اخبارات کو دیتے ہیں۔ غالباً اُس وقت کچھ زائد کاپیاں بن گئی ہوں گی جن میں سے دو میرے کاغذات میں محفوظ رہ گئیں)۔ اس کانفرنس کے پانچ اجلاس ہوئے تھے جن کے جملہ مقررین اور مقالہ نگار حضرات کے نام تو اشتہار میں نہیں آ سکتے تھے۔ صدر حضرات کے اسماء گرامی حسب ذیل ہیں:

(۱) مولانا عبید اللہ انورؒ (۲) مولانا سید محمد یوسف بنوریؒ

(۲) پروفیسر یوسف سلیم چشتی مرحوم (۴) علامہ علاؤ الدین صدیقی مرحوم
(۵) مولانا امین احسن اصلاحی

إِنَّ اللّٰهَ يَرْفَعُ بِهٰذَا الْكِتَابِ اَقْوَامًا وَّيَضَعُ بِهٖ اٰخَرِيْنَ (حدیث نبویؐ)

خوار از مہجوری قرآں شدی ۔ شکوہ سنج گردش دوراں شدی ٭ اے چو شبنم بر زمیں افتندۂ ۔ در بغل داری کتاب زندۂ

تفصیلی پروگرام ٭

پہلی سالانہ سہ روزہ

قرآن کانفرنس

بمقام ٹاؤن ہال ۔ لاہور

۱۴، ۱۵، ۱۶ دسمبر ۱۹۷۳ء

• جمعہ ۱۴ دسمبر

اجلاس اول: ۹ بجے صبح تا ۱ بجے دوپہر، بعنوان ''عظمتِ قرآن'' زیر صدارت حضرت مولانا عبید اللہ انور

اجلاس دوم: ۵ بجے شام تا ۹ بجے رات • ''قرآن اور سنتِ رسولؐ'' • حضرت مولانا محمد یوسف بنوری

• ہفتہ ۱۵ دسمبر

اجلاس اول: ۹ بجے صبح تا ایک بجے بعد دوپہر • ''قرآن حکیم اور علامہ اقبالؒ'' • پروفیسر یوسف سلیم چشتی

اجلاس دوم: ۵ بجے شام تا ۹ بجے رات • ''قرآن اور علم جدید'' • علامہ علاؤ الدین صدیقی

• اتوار ۱۶ دسمبر

آخری اجلاس: ۹ بجے صبح تا ایک بجے بعد دوپہر ''تدبر قرآن اور مولانا فراہیؒ'' اور ''اسلام کی نشأۃ ثانیہ اور قرآن حکیم'' • مولانا امین احسن اصلاحی

زیر اہتمام

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

۱۴ افغانی روڈ، سمن آباد، لاہور

فون: ۴۲۲۵۱

ان میں سے چار اس دنیا سے رخصت ہو چکے ہیں' اللہ اُن کو جنت الفردوس میں جگہ دے اور مراتب عالیہ سے نوازے' اور خصوصاً جو تعاون اُن حضرات نے مجھ ایسے بے بضاعت اور حقیر انسان سے کیا تھا اُس کا اجرِ عظیم عطا فرمائے! پانچویں بزرگ بحمد اللہ بقید حیات ہیں۔ اللہ تعالیٰ انہیں صحت و عافیت سے رکھے اور اپنی علمی غلطیوں خصوصاً حد رجم سے متعلق اپنی انتہائی گمراہ کن رائے سے رجوع کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین! ان کے ساتھ اپنے ''وصل و فصل'' کی طویل داستان راقم نے دسمبر ۱۹۷۶ء کے ''میثاق'' میں شائع کر دی تھی جو بعد ازاں میری بعض دوسری تحریروں کے ساتھ یکجا صورت میں ''حکمت قرآن'' کی خصوصی اشاعت بابت جولائی اگست ۱۹۸۲ء میں دوبارہ شائع ہوئی۔ اس میں' میں نے صراحت کر دی تھی کہ ان کے ساتھ تعلق کی گرم جوشی میں ابتدائی کمی میرے اسی رجحان طبع کی بنا پر ہوئی تھی کہ میں صرف ان ہی کا ہو کر کیوں نہیں رہتا اور دوسرے علماء خصوصاً قائلین تصوف سے کیوں ربط و ضبط بڑھا رہا ہوں۔ چنانچہ ایک موقع پر تو انہوں نے حسب عادت طیش میں آ کر یہاں تک فرما دیا تھا کہ ''ان علماء کو سر پر بٹھا کر کیا لینا ہے؟ ان ہی کی تو ہمیں تردید کرنی ہے!'' جس پر میں بھونچکا سا ہو کر رہ گیا تھا۔

بہر حال اس وقت یہ ساری تفصیل اس لیے نوک قلم پر آ گئی کہ ہوسکتا ہے کہ بعض حضرات خود اپنی ذہنیت پر قیاس کرتے ہوئے یہ خیال فرمائیں کہ علماء کرام سے رابطے کی یہ پوری کوشش محض کسی ''وقتی حکمت عملی'' کا مظہر ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اس معاملے میں' میں پورے انشراح صدر کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ ''و ما انا من المتكلفين'' اور جس طرح کسی شاعر نے کہا تھا کہ ع ''مرا مزاج لڑکپن سے عاشقانہ ہے!'' اسی طرح میں بھی یہ بات پورے انشراح صدر کے ساتھ لیکن ''وَ لَا فَخر'' کی قید کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ میرا مزاج ہمیشہ سے یہ رہا ہے کہ

اُحِبُّ الصّالحینَ وَ لَستُ مِنهُم لَعَلَّ اللّٰہ یَرزُقنِی صَلَاحًا!

(۲)

میرے اس ذاتی رجحانِ طبع کو تقویت پہنچانے میں جماعت اسلامی ہی کے ''سابقین'' کے حلقے کے ایک بزرگ کی مساعی کو جو دخل حاصل ہے میں محسوس کرتا ہوں کہ اُس کا تذکرہ اور ان کا شکریہ مجھ پر واجب ہے! اور وہ ہیں ''جماعت شیخ الہند'' کے حلقوں کی ایک جانی پہچانی شخصیت یعنی رحیم آباد (ضلع رحیم یار خاں) کے سردار محمد اجمل خاں لغاری۔ ان کا تذکرہ راقم کی اوّلین تالیف ''جماعت اسلامی: ایک تحقیقی مطالعہ'' میں بھی ہے اور ''میثاق'' کے آج سے چھ

سات سال قبل کے بہت سے شماروں میں بھی۔ واقعہ یہ ہے کہ جماعت اسلامی سے علیحدگی کے بعد کسی ''تشکیل نو'' کی سعی کے ضمن میں راقم کے سب سے زیادہ سفر اولاً لائل پور (حال فیصل آباد) کے ہوئے تھے اور بعد ازاں رحیم آباد ضلع رحیم یار خاں کے! ''تنظیم اسلامی'' کے قیام کے ضمن میں اوّلین قرارداد بھی راقم نے رحیم آباد ہی میں سردار صاحب سے طویل بحث و تمحیص کے بعد مرتب کی تھی اور وہ ''میثاق'' (بابت اگست' ستمبر ۱۹۶۷ء) میں ''قرارداد رحیم آباد'' ہی کے نام سے شائع ہوئی تھی۔ میرا ان سے ۱۹۵۵ء سے نہایت گہرا نیازمندانہ تعلق قائم ہوا تھا جو آج سے چند سال قبل تک نہایت گرمجوشی کے ساتھ برقرار رہا' میں انہیں اپنا بزرگ سمجھتا ہوں' اس لیے بھی کہ وہ عمر میں مجھ سے لگ بھگ بیس سال بڑے ہیں اور اس لیے بھی کہ وہ میری طرح جماعت اسلامی کے ''سابقین'' ہی میں سے نہیں ہیں بلکہ اُس کے ''سابقون الاولون'' میں سے بھی ہیں۔ اس لیے کہ سابق ریاست بہاولپور میں جماعت سے منسلک ہونے والے پہلے شخص تو تھے مولانا عبدالحق جامعیؒ اور اُن کے پہلے ''شکار'' تھے سردار صاحب[1] —— اور اس کے بعد پوری ریاست میں جماعت کی دعوت کی توسیع میں سب سے بڑھ کر حصہ ان ہی کا ہے —— تاہم وہ ازراہِ شفقت و مروّت مجھے خطاب میں برابر ہی کا درجہ دیتے ہیں۔ میرے علم کی حد تک غیر عالم لوگوں میں سے جو لوگ جماعت میں شامل ہوئے اُن میں یہ واحد شخص ہیں جن کو جماعت میں شمولیت سے قبل بھی علماء کرام سے حسن ظن اور تعلق خاطر تھا۔ پھر جماعت کے ساتھ بھرپور اور فعال وابستگی کے دوران بھی علماء کے ساتھ رابطہ برقرار رہا' اور جماعت سے مایوسی اور علیحدگی کے بعد سے تو اُن کا کل ربط و ضبط حلقۂ دیوبند کے علماء کرام ہی سے ہے! اور انہیں جو حسن ظن اور مخلصانہ و مربیانہ تعلق خاطر مجھ سے ہے اُس کی بنا پر ان کی بھرپور کوشش رہی ہے کہ میرا رابطہ بھی علماء حقانی کے ساتھ پختہ اور گہری بنیادوں پر قائم ہو۔

میرے اور اُن کے مابین تعلق میں کچھ عرصہ سے کچھ جمود بھی طاری تھا اور کسی قدر سرد مہری بھی دَر آئی تھی' جس کا سبب سوائے میری حد سے بڑھی ہوئی مصروفیت کے اور کچھ نہ تھا۔ یہ سراسر ان کا بزرگانہ کرم ہے کہ خود انہوں نے پہل کر کے اس جمود کو توڑا اور حسب ذیل گرامی نامہ ارسال فرمایا جو چونکہ از اول تا آخر اس وقت کے زیر بحث موضوع ہی سے متعلق ہے' لہٰذا ہدیۂ قارئین کیا جا رہا ہے:

---

(۱) بعد میں معلوم ہوا کہ صورتِ واقعہ اس کے برعکس تھی' یعنی جماعت سے اولاً منسلک ہونے والے تھے سردار صاحب موصوف اور ان کی دعوت پر لبیک کہی تھی مولانا عبدالحق جامعیؒ نے۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

رحیم آباد ۲۱/ اگست ۱۹۸۵ء

بخدمت مکرم ومحترم برادرم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب! زادلُطفہٗ!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ!

آپ صادق آباد تشریف لاتے ہیں۔ ملاقات کا موقع دیتے ہیں۔ ہم دعا کرتے ہیں۔ عرصہ ہوا نہ آپ آئے، نہ ہم نکل سکے۔ نہ ہی آپ نے نامہ و پیام سے یاد کیا۔ تاہم دعا کرتے ہیں۔ میثاق، بیّنات، الخیر، الحق، تدبر، البلاغ وغیرہ بالاستیعاب پڑھتا ہوں! ملاقات کے وقت آپ کو عزیز جان کر آپ سے باتیں کر لیتا ہوں۔ پڑھ کر تبصرہ کرنے کا حق محفوظ رکھتا ہوں۔ اور حق یہ ہے کہ تبصرہ کے لائق نہیں ہوں۔

میری عین تمنا رہی ہے کہ آپ کے برخوردارانہ تعلقات راسخ العلم علماء اور برحق مشائخ عظام سے ایسے وابستہ ہوں کہ ان کی رہنمائی اور اشیر باد سے ''اسلامی انقلاب'' کی پُر پیچ اور کٹھن راہیں، آپ پر کشادہ ہوتی چلی جائیں۔ آپ اپنی سمجھ کے مطابق اس کا اہتمام کرتے ہیں۔ لیکن دعوت وعزیمت کے داعی کے لیے یہ اہتمام ناکافی ہے۔ آپ محض صحافی، ایڈیٹر، مضمون نگار یا کسی عام ادارہ کے سربراہ نہیں ہیں۔ آپ کے دعوے بلند ہیں۔ ایسے بلند دعویٰ کا اولین تقاضا تھا جو آپ کی خدمت میں شروع سے پیش کرتا چلا آیا تھا، اور اُسی تقاضے کی طرف آپ کی توجہ اس عریضہ میں مبذول کرا رہا ہوں۔

میں فقط خوش اعتقادی کی وجہ سے یہ مشورہ نہیں دیتا رہا اور نہ دے رہا ہوں، اور نہ میں ایسے ویسے ہر عالم یا ہر شیخ سے متاثر ہوتا ہوں، میں ایمانداری سے اور خلوص سے سمجھتا ہوں کہ اس گئے گزرے وقت میں بھی کچھ لوگ بیٹھے ہیں جن کی راہ نمائی کی آپ کو ایسی ہی حاجت ہے جیسی ایک پیاسے کو پانی کی ضرورت ہوتی ہے۔ آپ میں جس ''اسلامی انقلاب'' کی تڑپ ہے اُس کا قبلہ تبھی درست ہوسکتا ہے جب آپ کے سوز و ساز اور پیچ وتاب کی باگیں ان لوگوں سے مطلق آزاد نہ ہوں۔

والسلام

عبدہٗ محمد اجمل لغاری''

اس کا راقم نے جو جواب ارسال کیا وہ درج ذیل ہے:

بسم اللہ الرحمن الرحیم

لاہور۔ ۴/ اگست ۱۹۸۵ء

برادرم مکرم ومعظم دامت فیوضکم

وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

ایک طویل عرصے بعد آپ کا ''بدست خویش'' اور ''بقلم خود'' گرامی نامہ پا کر بہت خوشی ہوئی۔ اِدھر میرا یہ حال تو آپ کے علم میں ہے ہی کہ میں خط لکھنے کا بہت چور ہوں۔ یہاں تک کہ طویل سفر کر کے حاضر خدمت ہو جانا، میرے نزدیک خط لکھنے کے مقابلے میں آسان ہے، اور جیسا کہ آپ نے خود تحریر فرمایا ہے۔ میرا جب بھی اُدھر گزر ہوتا ہے، آپ کی خدمت میں حاضری پروگرام میں لازماً شامل ہوتی ہے۔ البتہ اِدھر خاصے عرصے سے اُدھر کا چکر ہی نہیں لگا۔

علماءِ حق کی خدمت میں حاضری کو میں اپنی ایک ضرورت اور اپنے لیے یقیناً موجب سعادت سمجھتا ہوں، اور اس ضمن میں یقین کیجیے کہ جان بوجھ کر کوتاہی نہیں کرتا۔ ضرورت سے زیادہ مشغولیت اور مصروفیت آڑے آ جائے تو دوسری بات ہے۔ مجھے اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے اس امر کا حق الیقین حاصل ہے کہ میں اور میری بساط تو ہے ہی کیا، کوئی بڑی سے بڑی اسلامی تحریک بھی علماء حق کی سرپرستی اور تعاون کے بغیر کامیاب نہیں ہوسکتی۔ بلکہ زیادہ سے زیادہ ایک نیا فرقہ جنم دے سکتی ہے۔ اس لیے میں اپنی امکانی حد تک اس کے لیے کوشاں ہوں کہ علماء ربانیین میں سے بزرگوں کی اشیر واد اور دعائیں حاصل کروں اور نوجوانوں کا عملی تعاون! اور اگرچہ مجھے اس میں تاحال کوئی کامیابی حاصل نہیں ہوسکی، تاہم میں مایوس نہیں ہوں، اور مجھے یقین ہے کہ میں جلد اُن کا اعتماد حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاؤں گا۔ ان شاء اللہ العزیز، اس ضمن میں، میں نے آپ کی رائے اور مشورے کو پہلے بھی کبھی نظر انداز نہیں کیا اور اب بھی بسر وچشم حاضر ہوں۔ آپ جدھر رہنمائی فرمائیں سر کے بل حاضری دوں گا، اور اس سلسلے میں اگر آپ کی معیت بھی حاصل ہو تو کیا ہی کہنے۔ فقط والسلام مع الاکرام

خاکسار اسرار احمد''

بہرحال اس خالص نصح و اخلاص پر مبنی مشورے پر راقم بموجب فرمان نبویؐ ’’من لم یشکر الناس لا یشکر اللّٰہ‘‘ سردار صاحب کا علیٰ رؤس الاشہاد شکریہ ادا کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہے کہ وہ راقم کو سردار صاحب کے مشورے پر عمل کی وافر توفیق عطا فرمائے!

(۳)

ویسے پیش نظر تحریر کے آغاز میں غالبؔ کے ایک شعر کے حوالے سے جو مایوس کن صورت بیان ہوئی ہے وہ صرف وقتی اور عارضی سی کیفیت ہے جو صرف اس لیے پیدا ہو گئی کہ اتفاقاً جولائی و اگست ۱۹۸۵ء کے دوران متعدد دینی جرائد میں راقم پر تنقیدی مضامین شائع ہو گئے — ورنہ واقعہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے راقم الحروف کو اس معاملے میں سورۂ مریم میں وارد شدہ حضرت زکریا علیہ السلام کے اس قول کے مصداق کہ: ﴿وَ لَمْ اَكُنْۢ بِدُعَآئِكَ رَبِّ شَقِيًّا﴾ بالکل محروم نہیں رکھا ہے اور اس کی حالیہ مساعی کے بھی نہایت مثبت نتائج ظاہر ہوئے ہیں۔ چنانچہ بہت سے بزرگ اور مسلّمہ دینی و علمی مرتبہ کے حامل علماء کرام کی سرپرستی راقم کو حاصل ہے۔ جن میں ایسے بزرگوں کی تعداد تو اگرچہ بہت محدود ہے جنہوں نے تنظیم اسلامی کے حلقۂ مستشارین میں باضابطہ شمولیت بھی اختیار فرما لی ہے، تاہم ایک معتد بہ تعداد ایسے حضرات کی ہے جو بوجوہ ’’بے ہمہ اور باہمہ‘‘ رہنے کو ترجیح دیتے ہیں، بایں ہمہ کسی ضابطے کے تعلق کے بغیر راقم اور اس کی تنظیم و تحریک کی ’’مربیانہ نگرانی‘‘ کا فرض سرانجام دے رہے ہیں۔ دوسری طرف حال ہی میں ایسے متعدد نوجوان علماء نے تنظیم اسلامی میں باقاعدہ شمولیت اختیار کی ہے جو ملک کی مؤقر جامعات سے فارغ التحصیل ہیں اور مختلف مقامات پر مساجد جامع میں خطابت و امامت کے فرائض سرانجام دے رہے ہیں۔ ان میں نمایاں ترین مثال مولانا سعید الرحمٰن علوی کی ہے جن کے خاندانی اور دینی و تعلیمی پس منظر، فراغت کے بعد سے اب تک کی دینی خدمات اور دینی جماعتوں اور تحریکوں سے عملی تعلق کی تفصیل اور راقم الحروف کے ساتھ ابتدائی تعارف سے لے کر تنظیم میں باضابطہ شمولیت تک کی مفصل روداد پر مشتمل ایک طویل تحریر اسی شمارے میں شائع ہو رہی ہے جو انہوں نے راقم کی فرمائش پر سپرد قلم کی ہے! یہ تحریر اگرچہ قدرے زیادہ طویل ہو گئی ہے تاہم اس کے ابتدائی اور طویل ترین حصے میں ایک خاص مکتب فکر کے اعاظم رجال کا تذکرہ اور ایک خاص خطے کے دینی اور روحانی سلسلوں کا جو تعارف آ گیا ہے وہ بہت مفید ہے، اور اس سے خود راقم کی معلومات میں بہت

اضافہ ہوا ہے، بنا بریں اُسے من و عن شائع کیا جا رہا ہے!

سعید الرحمٰن علوی صاحب کے معاملے کو راقم نے خصوصی اہمیت اس لیے دی ہے کہ تعلیمی، دینی اور سیاسی پس منظر کے اعتبار سے میرے اور ان کے مابین بعد المشرقین پایا جاتا ہے۔ چنانچہ ایک جانب اسکول و کالج کی تعلیم اور دوسری جانب حفظ قرآن اور درس نظامی کے فرق کو نظر انداز کر دیا جائے تب بھی کہاں اولاً تحریک پاکستان اور ثانیاً جماعت اسلامی سے ذہنی اور قلبی بلکہ فعال عملی تعلق اور کہاں ابتداءً مجلس احرار اسلام اور بعد ازاں جمعیت علماء اسلام سے والہانہ وابستگی۔ اسی طرح کہاں ان کا بقول خود ’’متعصب حنفی‘‘ ہونے کا معاملہ اور کہاں راقم کا یہ موقف کہ نہ وہ سکہ بند حنفی ہے نہ عرف عام کے مطابق اہلحدیث، بلکہ بقول مولانا سعید احمد اکبر آبادیؒ مسلک ولی اللّٰہی سے منسلک ہے! گویا اسے ہر اعتبار سے احتجاج ضدین سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔

لیکن راقم کے نزدیک یہ ایک نہایت نیک فال اور اعلیٰ مثال ہے جو ان شاء اللہ العزیز ’’قران السعدین‘‘ کی تمہید بنے گی۔ اس لیے کہ اگر احیاء و اقامت دین کے بلند و بالا اور اعلیٰ و ارفع نصب العین کے لیے مختلف فقہی مسالک اور روحانی سلاسل سے منسلک اور ماضی کی شخصیات اور تحریکات کے ضمن میں کسی قدر مختلف نقطۂ نظر رکھنے والے لوگ اُس شان کے ساتھ جمع ہوں جس کا نقشہ قرآن حکیم کے حسب ذیل الفاظ میں سامنے آتا ہے:

﴿تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍۭ بَيْنَنَا وَ بَيْنَكُمْ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَ لَا نُشْرِكَ بِهٖ شَيْــًٔا وَّ لَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ﴾ (آل عمران: ٦٤)

تو امید کی جا سکتی ہے کہ مختلف مسالک اور مکتبہ ہائے فکر و نظر سے تعلق رکھنے والے لوگوں کے مابین فاصلوں میں کمی آئے گی اور ذہنی و قلبی قرب پیدا ہو گا۔ اس لیے کہ ہمارے یہاں اجنبیت کے حجابات اور فکری و جذباتی بعد اور ’’من دیگرم تُو دیگری‘‘ کی کیفیت کے تشویشناک اور مایوس کن حد تک بڑھ جانے کا اصل سبب یہ ہے کہ ہر گروہ اور ہر طبقہ ع ’’اپنے ہی حسن کا دیوانہ بنا پھرتا ہوں‘‘ کے مصداق اپنے ہی حلقے کے بزرگوں کی محبت و عقیدت سے سرشار، اپنے ہی مسلک کی مطبوعات و جرائد کے پڑھنے پڑھانے اور اپنے ہی مخصوص فکر کے تانے بانے میں ایسا گم رہتا ہے کہ دوسروں سے تعارف اور واقفیت کی نوبت ہی کبھی نہیں آتی۔ نتیجتاً ’’كُلُّ حِزْبٍۭ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُوْنَ‘‘ کی کیفیت کی شدت اور اس کی گہرائی و گیرائی ہی میں اضافہ ہوتا

چلا جاتا ہے! اسی صورتِ حال میں تبدیلی کی ایک کوشش تھی جو راقم الحروف گزشتہ تیرہ سالوں سے کرتا چلا آ رہا ہے‘ یعنی قرآن کانفرنسوں اور قرآنی محاضرات کے پلیٹ فارم پر مختلف مسالک اور مکاتبِ فکر کے اصحابِ علم وفضل کو جمع کیا جائے تاکہ ذہنی اور قلبی فاصلے کم ہوں اور ایک دوسرے کو قریب سے دیکھنے اور سننے کے مواقع میسر ہوں۔ اور راقم کو اللہ کے اُس خصوصی فضل وکرم سے امید واثق ہے جو اُس (اللہ تعالیٰ) کے اس حقیر اور عاجز و ناتواں بندے کے شاملِ حال ہے کہ ان شاء اللہ العزیز اس کی قائم کردہ تنظیم کے ذریعے مختلف ذہنی وفکری پس منظر کے حامل‘ مختلف مسالک فقہ سے وابستہ اور ماضی کی مختلف سیاسی تنظیموں اور تحریکوں سے تعلق رکھنے والے لیکن دین کا درد رکھنے اور اُس کی غربت پر کڑھنے والے اور اُس کی نصرت واقامت کے لیے تن من دھن لگا دینے کا عزم رکھنے والے لوگ ایک مضبوط تنظیمی سلسلے اور محکم جماعتی رشتے کے ''بنیان مرصوص'' میں ضم ہو کر ''حزبُ اللّٰہ'' کی صورت اختیار کر لیں گے! و ما ذٰلک علی اللّٰہ بعزیز!!

یہاں ضمنی طور پر یہ بھی وضاحت ہو جائے تو مناسب ہے کہ اس کا امکان اگر کوئی ہے تو صرف اس صورت میں کہ تنظیم کی اساس شخصی بیعت پر ہو نہ کہ کسی دستوری یا جمہوری ڈھانچے پر۔ اس لیے کہ مؤخر الذکر صورت میں تنظیمی فیصلوں اور مناصب کی تفویض کے جملہ معاملات ''ووٹوں کی گنتی'' کی بنیاد پر طے ہوتے ہیں‘ لہٰذا منطقی طور پر لازمی ہے کہ ''ووٹ'' کا حق صرف اُن لوگوں کے پاس ہو جن کے کسی خاص مکتبۂ فکر اور نقطۂ نظر سے کامل ہم آہنگی اور اصول اور کلیات ہی نہیں فروعات اور جزئیات تک کے بارے میں ذہن ومزاج کے ایک مخصوص رُخ پر ڈھل چکنے اور ایک خاص رنگ میں رنگے جانے کے بارے میں پورا اطمینان حاصل کر لیا گیا ہو۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ فکر ونظر میں کسی وسعت کے پیدا ہونے کا امکان ہی باقی نہیں رہتا‘ بلکہ اُس خاص ذہن ومزاج ہی کے پختہ سے پختہ تر اور شدید سے شدید تر ہونے کا عمل جاری رہتا ہے جس سے لامحالہ تنگ نظری‘ گروہ پرستی اور تحزب وتعصب میں اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے۔ جبکہ شخصی بیعت کی بنیاد پر قائم ہونے والی تنظیم میں باہمی مشاورت کی فضا تو بتمام وکمال برقرار رہتی ہے یا رہ سکتی ہے‘ لیکن فیصلوں کا دارومدار ع ''بندوں کو گنا کرتے ہیں تولا نہیں کرتے!'' اور ع ''کہ از مغز دو صد خر فکر انسانے نمی آید!'' کے مصداق ووٹوں کی گنتی پر نہیں بلکہ ''صاحبِ امر'' کی صوابدید پر ہوتا ہے۔ بنا بریں مختلف المزاج‘ مختلف المسلک‘ مختلف المشرب اور مختلف الرائے لوگوں کے جمع ہونے میں قطعاً کوئی قباحت نہیں ہے۔ اس لیے کہ یہاں تنظیم میں

شمولیت کا فیصلہ صرف اس ایک امر پر مبنی ہوتا ہے کہ آیا کسی کو ایک شخص معین کے افکار ونظریات سے بحیثیت مجموعی اتفاق اور اُس کے خلوص واخلاص پر فی الجملہ اعتماد ہے یا نہیں! اگر ہے تو اس سے بیعت جہاد وسمع وطاعت فی المعروف کے رشتے میں منسلک ہو جائے۔ پھر ''اِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَ الْفُؤَادَ كُلُّ اُولٰٓئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُوْلًا'' کے مطابق کھلے کانوں اور کھلی آنکھوں کے ساتھ اور عقل وفہم کی جملہ صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے اُس کا ساتھ دے۔ کوئی غلطی نظر آئے تو تنقید کرے‘ غلط رجحانات نظر آئیں تو پیشگی متنبہ کرے‘ کسی معاملے میں رائے کا اختلاف ہو تو برملا اظہار کرے اور اس میں کسی کی شخصی عقیدت یا اُس کے ذاتی رعب یا ملامت کے خوف کو آڑے نہ آنے دے۔ لیکن جب تک وہ ''بحیثیت مجموعی اتفاق'' اور ''فی الجملہ اعتماد'' کی کیفیت برقرار رہے ''اطاعت فی المعروف'' کے دائرے سے باہر نہ نکلے۔ البتہ جب اُن دونوں میں سے کوئی ایک بات بھی برقرار نہ رہے تو بیعت فسخ کرنے کا اعلان کرے اور علیحدگی اختیار کر لے!! اور ''هَلْ لَّنَا مِنَ الْاَمْرِ مِنْ شَیْءٍ'' کی قسم کے قضیے کھڑے کر کے نہ اپنا وقت ضائع کرے نہ دوسروں کا۔

اس ضمن میں واقعہ یہ ہے کہ اُس حدیث نبوی علیٰ صاحبہ الصلوٰۃ والسلام کے الفاظ مبارکہ کی عظمت‘ جامعیت‘ ہیبت وجلالت اور محکمیت ومشیدیت کا جو انکشاف راقم الحروف کے شعور و ادراک پر ہوا ہے اور جو نقش اُس کے قلب پر قائم ہوا ہے اس کے بیان سے وہ از بس قاصر ہے‘ اس لیے کہ اس ایک مختصر حدیث میں ''اسلامی انقلابی پارٹی'' یا ''حزب اللہ'' کا پورا دستور موجود ہے۔ یہ حدیث بخاریؒ ومسلمؒ دونوں نے حضرت عبادہ بن صامت ؓ سے روایت کی ہے جس میں انہوں نے بیعت عقبہ ثانیہ کے الفاظ نقل فرمائے ہیں (حدیث میں الفاظ کی نسبت حضرت عبادہ بن صامتؓ کی جانب ہے‘ لیکن ظاہر ہے کہ یہ تلقین خود نبی اکرم ﷺ ہی نے فرمائی ہوگی!)

بَايَعْنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ عَلَى السَّمْعِ وَالطَّاعَةِ فِى الْعُسْرِ وَالْيُسْرِ وَالْمَنْشَطِ وَالْمَكْرَهِ وَعَلٰى اَثَرَةٍ عَلَيْنَا وَعَلٰى اَنْ لَّا نُنَازِعَ الْاَمْرَ اَهْلَهٗ وَعَلٰى اَنْ نَقُوْلَ بِالْحَقِّ اَيْنَمَا كُنَّا لَا نَخَافُ فِى اللّٰهِ لَوْمَةَ لَائِمٍ

''ہم نے نبی اکرم ﷺ سے بیعت کی تھی کہ آپ کا ہر حکم سنیں گے اور اس کی اطاعت کریں گے خواہ ہم پر تنگی ہو خواہ آسانی‘ اور خواہ ہمارے دل آمادہ ہوں خواہ اپنی طبیعتوں پر جبر کرنا پڑے‘ اور خواہ دوسروں کو (مناصب اور ذمہ داریوں وغیرہ کی تفویض میں) ہم پر ترجیح دی جائے‘ اور یہ کہ ہم امراء سے نظم کے معاملے میں رسہ کشی نہیں کریں گے۔

البتہ ہم حق بات ضرور کہیں گے خواہ کہیں بھی موقع پیش آئے اور اللہ (اور اس کے دین) کے معاملے میں کسی ملامت کرنے والے کی ملامت کی پرواہ نہیں کریں گے۔''

اس وقت ظاہر ہے کہ راقم کو نہ ''بیعت'' کے مسئلے پر مفصل گفتگو کرنی ہے نہ خود اس حدیث کی تفصیلی تشریح، بلکہ یہ بات صرف بر سبیل تذکرہ قلم پر آ گئی کہ یہی وہ واحد نظام ہے جس میں ع ''ہر گلے را رنگ و بوئے دیگر است'' کے کیفیت کے حامل لوگ جمع ہو سکتے ہیں اور راقم اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتا ہے کہ اُس (اللہ تعالیٰ) نے اُس کی اِس جانب رہنمائی فرمائی اور ایک سنت کو زندہ کرنے کی سعادت بخشی۔ اور وہ اپنے اس صدمہ اور رنج وغم کا اظہار کیے بغیر نہیں رہ سکتا کہ جہاں ہماری نئی تعلیم یافتہ نسل کا حال یہ ہے کہ ؎

میں نے دیکھا ہے کہ فیشن میں اُلجھ کر اکثر　　تم نے اسلاف کی عزت کے کفن بیچ دیے
نئی تہذیب کی بے روح بہاروں کے عوض　　اپنی تہذیب کے شاداب چمن بیچ دیے

وہاں ''حامیانِ دین'' اور ''خادمانِ شرعِ متین'' کی بھی اکثریت کا یہ حال ہے کہ اپنی اپنی تنظیموں اور جماعتوں کو اس ''بیعت سمع وطاعت فی المعروف'' کی اساس پر استوار کرنے کی بجائے مغرب سے درآمد شدہ طریقوں کو اختیار کیے ہوئے ہیں۔ چنانچہ تشتت وانتشار اور تقسیم در تقسیم کا جو عمل عام غیر مذہبی سیاسی جماعتوں میں نظر آتا ہے بعینہٖ وہی ان کے یہاں بھی موجود ہے۔ **فاعتبروا یا اولی الابصار!!**

(۴)

راقم یہ عرض کر چکا ہے کہ غلبہ و اقامت دین کی جدوجہد میں تعاون اور سرپرستی کی درخواست کے ضمن میں اس کے ذہن میں اولیت ان حلقوں کو حاصل ہے جن کا (راقم کے فہم کے مطابق) براہِ راست یا بالواسطہ تعلق حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندیؒ کی جماعت سے ہے، البتہ اس سلسلے میں وہ ان شاء اللہ العزیز برصغیر پاک و ہند کے علم وفضل کے جملہ سلسلوں اور خانوادوں کے دروازوں پر دستک دے گا۔ اس سلسلے میں اس کے نزدیک دوسرے نمبر پر وہ سلسلے اور خانوادے ہیں جو ۱۹۲۰ء میں جمعیت علماء ہند کے اجلاس دہلی کے پلیٹ فارم پر حضرت شیخ الہندؒ کی زیرِ صدارت جمع تھے یا بعد میں کم از کم تحریک خلافت میں شریک تھے۔ ان میں سے تین سلسلوں کے ساتھ راقم کے ربط وتعلق کا تذکرہ اس مقام پر بے محل نہ ہوگا۔

اہل حدیث حضرات میں سے اس اجلاس میں مولانا سید محمد داؤد غزنویؒ بنفس نفیس شریک تھے۔ ان سے راقم کا تعلق ۵۶-۱۹۵۵ء میں بالکل اتفاقاً قائم ہوا اور پھر ان کے انتقال تک قائم رہا۔ اس سلسلے کا ایک دلچسپ واقعہ یہ ہے کہ ۱۹۶۲ء میں جب راقم کو پہلی بار والدین کی معیت میں حج بیت اللہ کی سعادت حاصل ہوئی تو اسی سال رابطہ عالم اسلامی کا تاسیسی اجلاس ہوا جس کے لیے پاکستان سے دو علماء مدعو کیے گئے تھے۔ ایک مولانا مودودی مرحوم ومغفور اور دوسرے مولانا داؤد غزنویؒ۔ میری ملاقات حرم شریف میں اتفاقاً مولانا غزنویؒ سے ہوئی تو انہوں نے فرمایا کہ تم رابطے کے تاسیسی اجلاس میں میرے سیکریٹری کی حیثیت سے شرکت کرو۔ میرے لیے تو یہ ایک نعمت غیر مترقبہ تھی۔ اس طرح میں اس اجلاس کا مستقل شریک اور نتیجتاً بہت سے رازہائے درون پردہ کا عینی شاہد ہوں۔ تاہم یہ موقع ع ''مصلحت نیست کہ از پردہ بروں آید راز!'' کے مصداق ان امور پر بحث کا نہیں ہے (مولانا داؤد غزنویؒ سے اپنے تعلق کی تفصیلی داستان میں نے مولانا محی الدین سلفی مرحوم کے اصرار پر ''الاعتصام'' کے لیے سپرد قلم کی تھی جو بعد میں مولانا سید ابوبکر غزنوی مرحوم نے اپنی تالیف ''سیدی وابی'' میں بھی شامل کی تھی۔ ان شاء اللہ ''میثاق'' کی کسی قریبی اشاعت میں اسے ہدیۂ قارئین کروں گا۔ اس لیے کہ اس میں بعض سبق آموز باتیں شامل ہیں)۔

برصغیر پاک و ہند کے مشہور ومعروف خیر آبادی مکتب فکر کے گل سرسبد مولانا معین الدین اجمیریؒ بھی اس اجلاس میں شریک تھے، اور ان ہی کے ایک نہایت محکم لیکن خالص فنی اعتراض کی بنا پر اس اجلاس عام میں مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم کی امامت ہند کا مسئلہ کھٹائی میں پڑا تھا۔ ان کے شاگرد رشید اور اس سلسلہ علیہ کے ''خاتم'' مولانا منتخب الحق قادری ہیں جن سے میرا رشتہ تلمذ ۶۵-۱۹۶۴ء میں قائم ہوا تھا جبکہ میں کراچی یونیورسٹی سے ایم اے (اسلامیات) کر رہا تھا۔ ان کے برادر نسبتی تھے مولانا افتخار احمد بلخی مرحوم جو ہماری ہی طرح جماعت اسلامی کے ''سابقین'' میں سے تھے اور ان کا رشتۂ تلمذ بھی مولانا معین الدینؒ سے تو تھا ہی، غالباً مولانا منتخب الحق سے بھی تھا۔ مجھ پر وہ حد درجہ شفیق تھے اور انہوں نے ہی زبردستی مجھے ایم اے میں داخلہ لے کر دیا تھا (وہ خود بھی شعبہ اسلامیات میں لیکچرار تھے)۔ ادھر مولانا معین الدینؒ کے بھتیجے ہیں مولانا حکیم محمد نصیر الدین ندوی مدظلہٗ مالک نظامی دواخانہ، شاہراہ لیاقت، کراچی۔ قارئین ''میثاق'' میں سے بہت سے حضرات کے علم میں ہوگا کہ جب راقم مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم کی امامت ہند کے ضمن میں ایک قول جو اس نے پروفیسر یوسف سلیم چشتی مرحوم سے سنا تھا

''میثاق'' میں نقل کر کے مخمصے میں پھنس گیا تھا تو اس سے نکلنے میں جہاں اولاً ملک نصر اللہ خاں عزیز مرحوم اور ثانیاً مولانا منتخب الحق قادری مدظلہٗ نے مدد فرمائی تھی وہاں اصل فیصلہ کن مواد حکیم صاحب موصوف ہی سے حاصل ہوا تھا۔ میرا ان سے نیاز مندانہ تعلق تو اسی وقت سے ہے لیکن گزشتہ چار پانچ ماہ کے دوران اس نے بڑھ کر نہایت مضبوط قلبی رشتے کی صورت اختیار کر لی ہے۔ دو ماہ قبل انہوں نے بایں پیری وضعیف العمری (ان کا سن غالباً ۷۵ سے بھی متجاوز ہے' اگرچہ دیکھنے میں اتنا محسوس نہیں ہوتا!) میری ''شام الھدیٰ'' کراچی کی ڈھائی تین گھنٹے کی تقریر جم کر سنی' اور بعد ازاں اسے بہت سراہا۔ اور اب شاذ ہی ہوتا ہے کہ میرا کراچی جانا ہو اور ان کی معیت میں کم از کم ایک مرتبہ کسی نہ کسی مقام پر دعوت طعام میں شرکت نہ ہو۔ جس میں بعض اوقات استاذی المکرّم مولانا منتخب الحق مدظلہٗ بھی موجود ہوتے ہیں۔ اسی دوران ان میں اس سلسلے کی ایک اور اہم شخصیت سے بھی تعلق قائم ہوا ہے اور وہ ہیں مولانا معین الدین اجمیریؒ کے استاذ گرامی مولانا حکیم برکات احمد ٹونکیؒ کے پوتے مولانا حکیم محمود احمد صاحب برکاتی۔ اور قارئین ''میثاق'' کے لیے یہ اطلاع یقیناً موجب مسرت ہو گی کہ ان شاء اللہ العزیز اکتوبر ۱۹۸۵ء کے اواخر میں غالباً ۲۵ تا ۲۷ ر قرآن اکیڈمی لاہور میں ایک خاص اجتماع خیر آبادی مکتب فکر ہی کے موضوع پر منعقد ہو گا جس میں شرکت کا حکیم محمد نصیر الدین صاحب ندوی اور حکیم محمود احمد صاحب برکاتی نے تو حتمی وعدہ کر لیا ہے' مولانا منتخب الحق قادری مدظلہٗ نے بھی کوشش کا وعدہ کیا ہے[1]! (یادش بخیر پروفیسر یوسف سلیم چشتیؒ نے اس مکتب فکر کی بعض امہاتِ کتب کا درس مولانا منتخب الحق صاحب سے لیا تھا اور وہ ان کے لیے نہایت شاندار الفاظ استعمال کرنے کے ساتھ ساتھ یہ فرمایا کرتے تھے کہ ''میں نے یہ علم ان کی جوتیاں سیدھی کر کے حاصل کیا ہے'')۔

برصغیر پاک و ہند کی بیسویں صدی عیسوی کی عظیم دینی شخصیات میں ایک مولانا عبدالعلیم صدیقی میرٹھیؒ (والد ماجد مولانا شاہ احمد صاحب نورانی) بھی تھے جنہوں نے تبلیغ اسلام کے لیے متعدد بار پوری دنیا کا دورہ کیا اور جن کی تبلیغ سے بالخصوص جزائر غرب الہند میں اسلام کو بہت فروغ حاصل ہوا۔ راقم کو یہ تو معلوم نہیں ہے کہ وہ ۱۹۲۰ء کے جمعیت العلماء ہند کے

(۱) الحمد للہ کہ مارچ ۱۹۸۶ء میں خیر آبادی مکتب فکر کے موضوع پر یہ اجلاسِ عام قرآن اکیڈمی میں پوری آب و تاب کے ساتھ منعقد ہوا اور اس میں استاذی مولانا منتخب الحق قادری مدظلہٗ نے بھی تمام تر ضعف وعلالت کے باوجود شرکت کی جس کے لیے راقم خاص طور پر حکیم نصیر الدین صاحب ندوی کا ممنونِ احسان ہے۔

اجلاس میں شریک تھے یا نہیں' اس لیے کہ اس اجلاس کا کھلم کھلا بائیکاٹ خانوادہ مولانا احمد رضا خاں بریلوی نے کیا تھا اور مولانا میرٹھی کو خرقۂ خلافت وہیں سے عطا ہوا تھا۔ تاہم مولانا محمد منظور نعمانی مدظلہٗ کی تالیف (جس کا حوالہ ''میثاق'' کی کسی گزشتہ اشاعت میں آ چکا ہے) سے معلوم ہوا کہ تحریک خلافت میں انہوں نے بھرپور حصہ لیا تھا۔ حالانکہ خانوادۂ بریلی نے اس سے بھی لاتعلقی کا فتویٰ دیا تھا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ روحانی تعلق کے باوصف مولانا میرٹھی آزاد ذہن وفکر کے انسان تھے۔ بہرحال ان کا تذکرہ اس وقت اس لیے ہوا کہ ان کے دامادِ کلاں ڈاکٹر فضل الرحمٰن انصاریؒ بھی میری طالب علمی کے زمانے میں کراچی یونیورسٹی کے شعبہ معارف اسلامیہ سے وابستہ تھے۔ اس طرح میرا تلمذ کا رشتہ ان سے بھی قائم ہوا۔ کراچی کے گزشتہ تین چار دوروں کے دوران ان کے داماد ڈاکٹر عمران حسین صاحب سے ملاقاتیں ہوئیں۔ یہ ویسٹ انڈیز ہی کے رہنے والے ہیں' اردو سمجھتے اچھی طرح ہیں لیکن بولتے دقت سے ہیں۔ نہایت سلیم الفطرت اور ذہین وفہیم نوجوان ہیں۔ چند ماہ سے وہ میرے دروسِ قرآن اور خطاباتِ عام میں جس التزام اور پابندی سے شرکت کر رہے ہیں اس کا میرے دل پر بہت اثر ہے۔ اس بار بہت اصرار سے وہ مجھے اپنے مکان پر لے گئے' جہاں ان کی خوش دامن یعنی مولانا عبدالعلیم میرٹھیؒ کی سب سے بڑی صاحبزادی صاحبہ کی خدمت میں بھی سلام نیاز پیش کرنے کی سعادت حاصل ہوئی اور مولانا میرٹھیؒ کی نواسی اور استاذی ڈاکٹر انصاریؒ کی صاحبزادی کی نہایت پرتکلف مہمان نوازی سے بھی (اپنے معالجین کی ہدایات کے بالکل برعکس) بھرپور طور پر لطف اندوز ہونے کا موقع ملا۔

الغرض! راقم کسی ایک کنوئیں کا مینڈک ہے نہ کسی ایک گھر کا ملازم' بلکہ ع ''ہر ملک ملکِ ماست کہ ملکِ خدائے ماست'' کے انداز میں اور فرمانِ نبویؐ ''اَلْحِكْمَةُ ضَالَّةُ الْمُؤْمِنِ هُوَ اَحَقُّ بِهَا حَيْثُ وَجَدَهَا'' کے بموجب راقم حق وصداقت کا جویا اور علم وحکمت کا متلاشی ہے اور اسے معلوم ہے کہ یہ چیزیں ہمارے یہاں ؎

اڑائے کچھ ورق لالہ نے کچھ نرگس نے کچھ گل نے
چمن میں ہر طرف بکھری ہوئی ہے داستاں میری

اور ؎

اڑا لی طوطیوں نے قمریوں نے عندلیبوں نے
چمن والوں نے مل کر لوٹ لی طرزِ فغاں میری

کے مصداق مختلف حلقوں اور گروہوں میں منقسم و منتشر ہو گئی ہیں اور اب انہیں پھر ع ''کرتا ہوں جمع پھر جگر لخت لخت کو!'' کے انداز اور ع ''ڈھونڈ اب ان کو چراغ رُخ زیبا لے کر!'' کی شان کے ساتھ جمع کرنا ہوگا۔ اسی طرح غلبہ و اقامت دین کی جدوجہد کسی ایک گروہ کے بس کا روگ نہیں ہے۔ اس کے لیے امت کے زیادہ سے زیادہ مکاتب فکر کو اسی طرح ایک پلیٹ فارم پر جمع کرنا ہوگا جس طرح وہ ۱۹۲۰ء میں دہلی میں جمع تھے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ کوئی ازمنہ قدیمہ کی بات نہیں ہے۔ کل پینسٹھ سال پہلے کا واقعہ ہے ——— تو پھر مایوسی کیوں! ——— اور بد دلی کس بنا پر؟؟

(۵)

راقم کو اس دوران میں امید کی دو کرنیں اور بھی نظر آئی ہیں جن سے اس کا حوصلہ بڑھا ہے اور راقم اس کیفیت میں اپنے رفقاء و احباب اور جملہ قارئین ''میثاق'' کو بھی شامل کرنا ضروری سمجھتا ہے۔

ایک ایبٹ آباد میں مولانا غلام النصیر چلاسی مدظلہٗ سے ملاقات جس کے دوران ہم دونوں نے بالکل وہ کیفیت محسوس کی کہ ؎

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اس نے کہا
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

مولانا علاقہ کوہستان کے' جو پاکستان کے ''شمالی علاقہ جات'' میں محل وقوع سمیت ہر اعتبار سے نہایت مرکزی اہمیت کا حامل ہے' ایک نہایت مقبول اور مقتدر دینی اور روحانی رہنما ہیں۔ نسلی اور لسانی اعتبار سے ''شین'' ہیں' اردو لکھنا پڑھنا دقت کے ساتھ ہے' البتہ اپنی مادری زبان اور پشتو کے علاوہ عربی اور فارسی دونوں پر یکساں قدرت رکھتے ہیں۔ اور ان چاروں زبانوں میں ان کی ۳۵ ہزار اشعار سے زائد پر مشتمل کتابیں طبع ہو چکی ہیں۔ میں نے لاہور میں تنظیم کے رفقاء کے اجتماع میں اپنا جو تاثر بیان کیا تھا' سر دست صرف اسی کے نقل پر اکتفا کرتا ہوں اور وہ یہ کہ ''میں نے آج تک کسی دینی شخصیت کو اپنے مزاج اور خیالات و نظریات کے جملہ پہلوؤں سے اس درجہ ہم آہنگ نہیں پایا جتنا مولانا غلام النصیر چلاسی کو!'' (میرے اس تاثر کی بنا پر میرے چند قریبی رفقاء نے جا کر ان سے ملاقات کی اور میرے اس احساس کی حرف بحرف توثیق کی!)۔ خود انہوں نے راقم کے بارے میں اپنا جو تاثر بیان فرمایا ہے وہ راقم کے لیے

حد درجہ شرمندگی بلکہ شرمساری کا موجب ہے۔ لیکن جبکہ راقم کو بہت سے دینی حلقوں کی جانب سے ''دھتکارا'' جا رہا ہے جس سے اس کے رفقاء بد دلی محسوس کر رہے ہیں میری رائے میں ایک ہمت افزا قول کا نقل کر دینا مفید ہوگا۔ اور وہ یہ کہ ''آپ کو دیکھ کر میرا یقین نبی اکرم ﷺ کی اس حدیث پر مزید گہرا ہو گیا ہے کہ میری امت میں ہمیشہ کم از کم ایک گروہ ضرور حق پر قائم رہے گا!'' اللہ تعالیٰ انہیں اس حسن ظن اور ہمت افزائی پر اجر عظیم عطا فرمائے اور مجھے اور میرے ساتھیوں کو ان کی ان نیک توقعات پر کسی ادنیٰ سے ادنیٰ درجے ہی میں سہی' پورا اترنے کی توفیق عطا فرمائے۔ **و ما ذٰلک علی اللّٰہ بعزیز!**

میں نے ان کی خدمت میں اپنی جملہ مطبوعات کا جو سیٹ ارسال کیا' اس پر ان کا جو والا نامہ موصول ہوا' وہ من و عن درج ذیل ہے:

بسم اللہ الرحمن الرحیم

۱۰/ اگست ۱۹۸۵ء

محترم و مکرم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

آپ کے ارسال کردہ تمام کتب اور خط موصول ہوئے۔ فرصت کے اوقات میں آپ کے چند رسائل کا اجمالی جائزہ لیا' جس سے آپ کی تنظیم کا عزم مصمم کا بخوبی علم ہوا۔ آپ کے کتب و رسائل جو مجھے موصول ہو چکے ہیں لوگوں میں تقسیم کر دوں گا تاکہ عامۃ الناس استفادہ کر سکیں۔ میں چند اپنی کتب آپ کو مطالعہ کے لیے پیش کرنا چاہتا تھا جو کہ دستیاب نہ ہو سکیں۔ ''تحائف قدسیہ'' اور ''ینابیع الحکمت'' بڑی ضخیم کتب تھیں' ابتداءً مطالعہ کے لیے بہتر تھیں۔ فی الحال جو کتابیں دستیاب ہیں ارسال خدمت ہیں جن کے بالترتیب مطالعہ سے آپ ہمارے عزائم کی کیفیت سے آگاہ ہوں گے۔ سب سے پہلے ''خیابانِ چلاسی'' کا مکمل مطالعہ کریں۔ پھر ''معدنِ توحید'' ''گنجینۂ معرفت'' اور ''گلدستہ عشاق''۔ دوسری کتب دستیاب ہونے پر یا دوسری ملاقات میں آپ کو دیں گے۔ چند حروفِ پریشاں بطور تحفہ درویشاں آپ کی خدمت میں بھیج رہے ہیں۔

بہ مطلب می رسی اسرارِ احمد
اگر محکم بگیری تارِ احمد

مرادِ احقر از محکم گرفتن
بود اخلاص در ہر کارِ احمد

صداقت حل ہر یک مشکلے ہست
ہمی دانست یارِ غارِ احمد

دِگر عرض اینکہ از گفتار بگذر
بہ میدان آ بہ آن کردارِ احمد

امید ماست باشی ابر نیساں
بہ کم مدت پئے گلزارِ احمد

خدایا آور آں ساعت کہ بینیم
دوبارہ گرم تر بازارِ احمد

بہ سعی ایں رجالِ پاک فطرت
بہ ہر جا تازہ کن آثارِ احمد

چلاسی را سر و مال است حاضر
برائے یاریٔ ہر یارِ احمد

فقط والسلام
منجانب: غلام النصیر چلاسی

ایک دوسری امید کی کرن اسلام آباد سے ایک ریٹائرڈ فوجی افسر (میجر) صاحب کی صورت میں نظر آئی جو اسلام آباد کی ایک مسجد میں روزانہ درسِ قرآن دیتے ہیں اور اپنی زندگی کو اسی کام کے لیے وقف کرنے کا فیصلہ کر چکے ہیں۔ بالکل راقم کے ہم عمر اور راقم ہی کی طرح ''عالم'' نہیں بلکہ ''عامی'' انسان ہونے کے ناطے مجھے اپنے اور ان کے درمیان ''کند ہم جنس ......'' کی کیفیت کا شدت سے احساس ہوا اور اسی بنا پر شدید کشش محسوس ہوئی۔ چنانچہ راقم نے ان کے ایک درسِ قرآن میں بھی جزوی شرکت کی اور محسوس کیا کہ ان کا درس ''تذکیر بالقرآن'' کا نہایت عمدہ نمونہ اور ''از دل خیزد بر دل ریزد'' کی نہایت اعلیٰ مثال ہے۔ مزاج کی جامعیت' کا حال بھی یہ ہے کہ ذہناً جماعت اسلامی کے بہت قریب ہیں۔ عملاً تبلیغی جماعت کے ساتھ طویل عرصہ فعال انداز میں لگایا ہے اور ان کے چوٹی کے اصحابِ مشورہ میں سے رہے

ہیں اور ادھر راقم کے ساتھ بھی کم از کم اتنا اُنس ضرور ہے کہ ایک روز کھانے پر مدعو فرمایا' جس میں مولانا ظفر احمد انصاری اور جسٹس ریٹائرڈ محمد افضل چیمہ سمیت متعدد اہم شخصیات سے ملاقات کی سعادت نصیب ہوئی۔ حال ہی میں تنظیم اسلامی کا جو علاقائی اجتماع راولپنڈی میں ۵ تا ۸/ اگست منعقد ہوا اس کے دوران ان کی شدید خواہش تھی کہ میں ان کے یہاں قیام کروں اور ایک رات کے لیے میں وہاں گیا بھی' لیکن بعد میں بعض رفقاء کے چہروں پر بددلی کے آثار دیکھ کر میں نے اپنی طبیعت کی خرابی کے علی الرغم میجر صاحب کے آراستہ پیراستہ گھر کی سہولتوں کو خیرباد کہا اور اپنے ساتھیوں ہی کے ساتھ آڈیرا لگایا۔ میجر صاحب کا اسم گرامی ہے میجر محمد امین منہاس اور ان کا درس اسلام آباد کے سیکٹر F6 میں واقع جامع مسجد مؤتمر عالم اسلامی میں روزانہ بعد نماز مغرب ہوتا ہے۔ میجر صاحب کے قول کے مطابق ان کے پاس راقم کے دروس وخطابات کے تین صد سے زیادہ کیسٹ موجود ہیں' اور ان سب پر مستزاد اس اجتماع کے موقع پر انہوں نے لگ بھگ پانچ ہزار روپے کے کیسٹ مزید خرید فرمائے ہیں۔

(۶)

اس تحریر کے ابتدائی حصہ میں ۱۹۷۳ء کی پہلی سالانہ قرآن کانفرنس کے ضمن میں مولانا امین احسن اصلاحی صاحب کا ذکر بھی آیا تھا اور حدّ رجم کے بارے میں ان کی ''انتہائی گمراہ کن'' رائے کا بھی۔ اس ضمن میں میرے رویے کے بارے میں بعض احباب اور بزرگوں کے ذہنوں میں کچھ اشکال ہے جسے میں اس موقع پر رفع کر دینا چاہتا ہوں (چنانچہ مولانا سید وصی مظہر ندوی صاحب نے بھی اپنے ایک خط میں اس سلسلے میں ایک شبہ کا اظہار کیا تھا اور حال ہی میں مولانا عبد الغفار حسن مدظلہٗ نے بھی الحمد للہ کہ کوئی شبہ وارد کرنے یا فیصلہ صادر کرنے کی بجائے ''استفسار'' کیا ہے اور وضاحت طلب فرمائی ہے) شبہ یہ ہے کہ مولانا اصلاحی کے بارے میں میری رائے میں شدت پیدا ہونے کے اصل اسباب کوئی اور ہیں اور حدرجم کے بارے میں ان کی رائے کو میں نے صرف بہانہ بنایا ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ اگرچہ میں ''میثاق'' کے اول یوم اشاعت سے اس کا خریدار ہی نہیں' اس کے ''معاونین'' اور ''سرپرستوں'' میں شامل تھا' تاہم اس میں شائع ہونے والی تفسیر کو کبھی شاذ ہی پڑھتا تھا (اس لیے کہ اس طرح بالاقساط شائع ہونے میں تسلسل قائم نہیں رہتا)۔ بہرحال جب ۱۹۶۶ء میں' میں لاہور منتقل ہوا اور میں نے ''میثاق'' کی ادارت بھی سنبھال لی اور

’’دارالاشاعت الاسلامیہ‘‘ بھی قائم کیا تو اس وقت تک ’’تدبر قرآن‘‘ کی جلد اول تسوید و تبییض کے جملہ مراحل طے کر کے مولانا کے ایک دوست کے پاس ’’رہن‘‘ تھی (اس لیے کہ مولانا نے اپنی کسی ضرورت کی بنا پر ان سے پانچ ہزار روپے قرض لیے تھے‘ اور جب وہ قرض واپس نہ کر سکے تو انہوں نے تفسیر کا مسودہ اٹھا کر ان کے حوالہ کر دیا کہ یہ ’’متاعِ فقیر‘‘ حاضر ہے۔ ادھر وہ صاحب مسلکاً مولانا سے اختلاف رکھتے تھے‘ لہٰذا تفسیر کو شائع بھی نہیں کر رہے تھے!) بہر حال میں نے اسے ان سے واگزار کرایا اور شائع کر دیا۔ جسے اس وقت مولانا نے اپنی ذات پر میرا ’’احسان عظیم‘‘ قرار دیا۔ اس کے بعد دوسری اور پھر تیسری جلد کی بالاقساط اشاعت ’’میثاق‘‘ میں ہوتی رہی۔ چنانچہ جلد دوم کی کتابی صورت میں اشاعت بھی ’’دارالاشاعت‘‘ کے زیر اہتمام ہوئی۔ البتہ تیسری جلد کی کتابی صورت میں اشاعت سے پہلے ’’مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور‘‘ کا قیام عمل میں آ گیا اور میں نے ’دارالاشاعت‘‘ کو بند کر دیا اور جملہ اشاعتی سلسلہ انجمن کو منتقل کر دیا۔ چنانچہ تیسری جلد مکتبہ انجمن کے زیر اہتمام طبع ہوئی۔ مزید یہ کہ اس وقت تک مولانا کے پاس جلد چہارم کا مسودہ بھی تیار ہو چکا تھا۔ چنانچہ جلد چہارم میں شامل سورتوں میں سے سوائے ایک یعنی سورۂ کہف کی تفسیر کے اور کسی کی ’’میثاق‘‘ میں اشاعت کی نوبت ہی نہیں آئی۔ یہ براہِ راست کتابی صورت ہی میں منصۂ شہود پر آئی —— اور اس میں سورۃ النور کی تفسیر شامل ہے۔ جس کی پہلی تین آیات ہی کے ضمن میں حدرجم سے متعلق مولانا کی رائے پہلی بار سامنے آئی۔

ادھر راقم کا حال یہ رہا کہ ’’میثاق‘‘ میں تفسیر کا مطالعہ اس نے نہ کبھی اشاعت سے پہلے کیا نہ بعد میں‘ اس کے مطالعہ تدبر قرآن کا سلسلہ اس درس کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا جو اس نے مسجد خضراء سمن آباد میں اپنے مرتب کردہ منتخب نصاب کا دوبار درس دے چکنے کے بعد مصحف کی ابتدا سے تسلسل کے ساتھ شروع کیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اگرچہ ’’تدبر قرآن‘‘ کی جلد چہارم ۱۹۷۶ء کے دوران کسی وقت شائع ہو گئی تھی‘ لیکن راقم کے علم میں حدرجم کے ضمن میں مولانا کی رائے مئی ۱۹۷۸ء میں آئی۔ اس لیے کہ **الحمد للہ** اس کی وہ ذاتی ڈائری محفوظ ہے جس میں درج ہے کہ سورۃ النور کی آیات ۱ تا ۳ کا درس راقم نے مسجد خضراء میں جمعہ ۵ مئی ۱۹۷۸ء کو دیا تھا۔ چنانچہ راقم کو اب تک یاد ہے کہ راقم نے لاہور میں اپنے درس قرآن کی دس بارہ سالہ تاریخ کے دوران پہلی بار نام لے کر ایک جانب مولانا اصلاحی پر شدید تنقید کی‘ اور ان کے

مقابلے میں نام لے کر مولانا مودودی کی رائے کی بھرپور تحسین کی اور اسی وقت فیصلہ کر لیا کہ اس جلد کی اشاعت پہلی بار تو میری لاعلمی میں ہو گئی ہے جس میں جو حصہ بھی میرا ہے اس پر اللہ تعالیٰ سے معافی کا خواستگار ہوں لیکن دوبارہ کم از کم یہ جلد میرے یا انجمن کے اہتمام میں شائع نہیں ہو گی۔ یہی وجہ ہے کہ چونکہ اس وقت تک اس کتاب کی ایک مارکیٹ بن چکی تھی چنانچہ جلد اول دوسری بار انجمن کے زیر اہتمام تین ہزار کی تعداد میں شائع ہوئی تھی اور جلد دوم اور غالباً جلد سوم کے بھی دوسرے ایڈیشن طبع ہو چکے تھے۔ چنانچہ جلد چہارم جیسے ہی بازار میں آئی ہاتھوں ہاتھ لی گئی اور فوراً ختم ہو گئی‘ اور جلد ہی اس کے طبع ثانی کا شدید تقاضا پیدا ہو گیا۔ لیکن راقم نے کسی صورت اسے دوبارہ شائع نہیں کیا (یہ دوبارہ شائع ہوئی تو ۱۹۸۲ء میں‘ گویا پورے چھ سال بعد‘ اور وہ بھی ’’فاران فاؤنڈیشن‘‘ کے زیر اہتمام!)۔

ساتھ ہی یہ بھی نوٹ کرایا جائے کہ مولانا سے میں نے ملاقات کا سلسلہ مارچ ۱۹۷۶ء میں منقطع کر دیا تھا۔ اس کا مفصل پس منظر میں نے دسمبر ۱۹۷۶ء کے ’’میثاق‘‘ میں درج کر دیا تھا (جو دوبارہ ’’حکمت قرآن‘‘ کے جولائی‘ اگست ۱۹۸۲ء کے شمارے میں شائع ہوا) وصل و فصل کی اس طویل داستان کا اختتام راقم نے ان الفاظ پر کیا تھا:

> ’’اسی پس منظر میں راقم نے مارچ ۱۹۷۶ء میں تیسری سالانہ قرآن کانفرنس میں شرکت کی دعوت مولانا کو دی اور حسب سابق اسے بھی مولانا نے منظور فرما لیا۔ لیکن بعد میں اپنے بعض دوستوں اور شاگردوں کے اصرار پر شرکت سے انکار کر دیا۔ یہ گویا ان دوطرفہ تعلقات کے ضمن میں اونٹ کی کمر پر آخری تنکا ثابت ہوا‘ اور راقم نے فیصلہ کر لیا کہ آئندہ مولانا کی خدمت میں حاضری کا سلسلہ بھی بند کر دیا جائے تاکہ وہ بار بار اس طرح کی پریشان کن صورتِ حال سے دوچار نہ ہوں‘ اور اس طرح ربع صدی پر پھیلے ہوئے وہ تعلقات اختتام پذیر ہو گئے جو پورے بیس سال نہایت گرم جوشی کے ساتھ قائم رہے اور بعد ازاں ع ’’کھنڈر بتا رہے ہیں عمارت عظیم تھی‘‘ کے مصداق پورے پانچ سال میں رفتہ رفتہ کم ہو کر اس حد کو پہنچے کہ اب آٹھ ماہ سے صورت وہی پیدا ہو چکی ہے کہ ؎
>
> بس اتنا سا تعلق اب ان سے رہ گیا ہے
> وہ مجھ کو جانتے ہیں‘ میں ان کو جانتا ہوں!‘‘

آج بھی ہر شخص اس پوری داستان کو حرفاً حرفاً پڑھ کر فیصلہ کر سکتا ہے کہ ’’انقطاعِ تعلق‘‘

کے شدید ترین فیصلہ کے باوصف اس وقت تک میری مولانا کے بارے میں رائے میں ہرگز کوئی شدت موجود نہ تھی اور میں نے وہ پوری داستان مولانا کے ادب اور مقام و مرتبہ کو ملحوظ رکھتے ہوئے سپردِ قلم کی تھی (جس پر مجھے باضابطہ سند ہی نہیں باقاعدہ داد سردار محمد اجمل خاں لغاری نے دی تھی)۔ میری رائے میں ''شدت'' جو بھی پیدا ہوئی وہ کل کی کل مولانا کی اس رائے اور اس سے بڑھ کر ان کے اس طرزِ استدلال اور اندازِ تحریر پر مبنی ہے جو انہوں نے حد رجم کے ضمن میں اختیار کیا ہے اور جسے میں ''انکارِ سنت'' سے کم تر کوئی نام دینے کو ہرگز تیار نہیں! یہی وجہ ہے کہ ''حکمت قرآن'' کے محولہ بالا شمارے کے آخر میں ''پس نوشت'' کے عنوان سے جو جلی حاشیے کے ساتھ چوکھٹا شائع کیا تھا وہ حسب ذیل ہے:

> مولانا امین احسن اصلاحی سے ''وصل و فصل'' کی داستان کے آخر میں عرض کیا گیا تھا کہ: ''مولانا کے ساتھ تعلق کا جو تسمہ اب لگا رہ گیا ہے وہ صرف مصنف اور ناشر کے تعلق کی نوعیت کا ہے اور وہ بھی راقم اور مولانا کے مابین نہیں بلکہ انجمن خدام القرآن اور مولانا کے مابین ہے''
>
> قارئین کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ اب یہ تعلق بھی ختم ہو چکا ہے۔ اور انجمن نے اپنی ادا کردہ رقم واپس لے کر مولانا کو ان کی جملہ تصانیف کے حقوقِ اشاعت واپس لوٹا دیے ہیں۔
>
> سبب اس کا یہ ہوا کہ ''تدبر قرآن'' کی جلد چہارم میں سورۃ النور کی تفسیر کے ضمن میں مولانا نے حدّ رجم کے بارے میں جو رائے ظاہر کی ہے اُس نے کم از کم اس مسئلے میں انہیں اہل سنت کی صفوں سے نکال کر منکرین حدیث کی صف میں لا کھڑا کیا ہے جس وقت یہ جلد چھپی، راقم نے ابھی اسے پڑھا نہیں تھا۔ بعد میں جب یہ بات راقم کے علم میں آئی تو سخت صدمہ ہوا کہ اس رائے کی اشاعت میں راقم الحروف اور اُس کی قائم کردہ ''انجمن خدام القرآن'' بھی شریک ہے۔ تاہم جو تیر کمان سے نکل چکا تھا اُس پر تو اب سوائے استغفار کے اور کچھ نہ کیا جا سکتا تھا۔ البتہ اس جلد کی دوبارہ اشاعت پر طبیعت کسی طور سے آمادہ نہ ہوئی۔ ادھر یہ بھی کسی طرح مناسب نہ تھا کہ ایک مصنف کی تصنیف کی اشاعت صرف اس لیے رُک جائے کہ وہ اُس کے حقوقِ اشاعت کسی ادارے کے ہاتھ فروخت کر چکا ہے۔ بنابریں تفسیر ''تدبر قرآن'' کی بقیہ چار جلدوں کے ناشر برادرم ماجد خاور صاحب نے جیسے ہی مولانا کی جملہ تصانیف کے حقوقِ اشاعت کی واپسی کے سلسلہ میں گفتگو کی، راقم نے فوری آمادگی کا اظہار کر دیا اور الحمدللہ

> کہ خاور صاحب کی مساعی جمیلہ اور مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کی مجلس منتظمہ کی منظوری سے یہ معاملہ بغیر کسی تلخی کے باحسن وجوہ طے پا گیا۔ الغرض مولانا سے اب یہ رشتہ بھی بالکلیہ منقطع ہو گیا ہے! اسرار احمد

(۷)

''تفسیر تدبر قرآن'' کے ضمن میں ایک واقعہ اور بھی ہے جو میرے بہت سے بزرگوں اور احباب و رفقاء کے علم میں ہے۔ لیکن آج میں اسے بھی برملا ریکارڈ پر لے آنا چاہتا ہوں، اور وہ یہ کہ بالکل آغاز میں جب میں نے ''میثاق'' کی ادارت سنبھالی ہی تھی اس میں سورۃ النساء کی تفسیر شائع ہونی شروع ہوئی۔ اتفاقاً اس کی بھی بالکل ابتدائی آیات کے ضمن میں مولانا نے ایک بات سلف کے مجمع علیہ موقف سے ہٹ کر کہی جس سے منکرین سنت اور متجددین کے طبقے کو تقویت حاصل ہوتی تھی (اور وہ یہ کہ سورۃ النساء کی آیت ۳ میں وارد شدہ لفظ ''النساء'' کو عموم پر برقرار رکھنے کی بجائے ''امہاتِ یتامٰی'' کے مفہوم میں خاص قرار دے دیا تھا) حسب عادت میں نے اسے پڑھا بھی نہیں تھا۔ لیکن منٹگمری میں میرے ایک عمر کے اعتبار سے بزرگ ویسے بے تکلفی کے اعتبار سے مشفق دوست مولانا برکات احمد خاں نامی تھے جن کا تعلق ٹونک[1] ہی سے تھا (جہاں کے مشہور عالم دین مولانا حکیم برکات احمد صاحب ٹونکیؒ استاذِ گرامی مولانا معین الدین اجمیریؒ تھے) انہوں نے فرمایا کہ یہ تفسیر تو سلف کی رائے کے خلاف ہے۔ میں نے عرض کیا کہ آپ تفصیلی خط لکھ دیں میں مولانا اصلاحی صاحب کی خدمت میں پہنچا دوں گا۔ اس خط کو پڑھ کر مولانا نے مجھ سے سوال کیا کہ ''یہ صاحب کون ہیں؟'' میں نے عرض کیا کہ ایک جید عالم دین ہیں، کبھی نواب صاحب ٹونک کے مصاحب خاص اور ناک کے بال تھے، اب صرف ایک ہائی سکول میں عربی ٹیچر ہیں''۔ اس پر مولانا نے ان کا خط پھینک دیا اور فرمایا کہ ''اگر کوئی بڑا شخص لکھے گا تو میں غور کروں گا، ہرا یرے غیرے کا جواب دینے کا وقت میرے پاس نہیں ہے!'' ان ہی دنوں میرا جانا کراچی ہو گیا اور وہاں حضرت مولانا مفتی محمد شفیعؒ کی خدمت میں بھی حاضری ہوئی تو خیال آیا کہ کچھ ہی عرصہ قبل حضرت مفتی صاحب، مولانا اصلاحی، حکیم عبدالرحیم اشرف اور جناب کوثر نیازی نے مل جل کر ایک ''مجلس اصلاح و دعوت'' تشکیل

(۱) مولانا برکات احمد خاں مرحوم مولانا مفتی ولی حسن ٹونکی کے قریبی اعزہ میں سے تھے اور ان سے ملاقات پر معلوم ہوا کہ ان کے علم میں یہ سارا واقعہ موجود ہے۔

دی تھی۔ گویا مفتی صاحب کے اس وقت قریبی مراسم مولانا اصلاحی سے ہیں تو کیوں نہ ان سے درخواست کروں۔ جب میں نے حضرت مفتی صاحب کے سامنے اصلاحی صاحب کی رائے بیان کی تو انہوں نے فرمایا: ''یہ تو بڑی گمراہی ہے!'' اس پر میں نے عرض کیا کہ ''حضرت آج کل آپ کے ان سے قریبی مراسم ہیں اگر آپ متنبہ فرمائیں تو شاید اصلاح ہو جائے۔ اس لیے کہ ابھی تفسیر صرف ''میثاق'' میں شائع ہوئی ہے۔ کتابی صورت میں نہیں آئی!'' اس پر مفتی صاحب نے اپنی علالت اور مصروفیات کا عذر پیش کیا تو میں نے اپنی روایتی بے تکلفی کے ساتھ عرض کیا: ''حضرت! جب کوئی فتنہ شروع ہوتا ہے تو اس وقت اس کی سرکوبی کے لیے آپ حضرات کے پاس وقت نہیں ہوتا' اور جب وہ جڑ پکڑ جاتا ہے اور تناور درخت کی شکل اختیار کر لیتا ہے تو آپ لوگ تیشے اور کلہاڑیاں لے کر آتے ہیں اور پھر آپ کے کیے کچھ نہیں ہوتا!'' اس پر مفتی صاحب نے وعدہ فرمایا' لیکن افسوس کہ کم از کم تین بار کی یاد دہانی کے باوجود وہ اپنا وعدہ پورا نہ کر سکے۔ میں اس وقت بھی شدید متردد تھا کہ جلد دوم شائع کروں یا نہ کروں' لیکن مفتی صاحب کے اس واقعہ کے بعد میں نے غلط یا صحیح یہی گمان کیا کہ میں اب بریٔ الذمہ ہوں۔ اللہ کے یہاں جواب دہی علماء کرام کے ذمے ہوگی۔ چنانچہ میں نے جلد دوم شائع کر دی۔ بہر حال راقم کا مزاج جو بھی ہے اس کی ایک جھلک اس واقعہ میں بھی نظر آ سکتی ہے۔

(۸)

جولائی اور اگست ۱۹۸۵ء کے دوران ''بیّنات'' کراچی' ''الخیر'' ملتان اور ''تعلیم القرآن'' راولپنڈی میں جو مضامین راقم کے بارے میں شائع ہوئے ہیں ان پر راقم کا پہلا تاثر تو یہ تھا کہ ع ''اک بندۂ عاصی کی اور اتنی مداراتیں''۔ اور دوسرا وہ جو غالبؔ کے شعر کی صورت میں اس تحریر کے آغاز میں درج ہو چکا ہے۔ تاہم راقم کا فیصلہ یہ ہے کہ وہ ان مباحث میں مزید وقت ضائع نہیں کرے گا۔ ان تحریروں میں اکثر و بیشتر باتیں وہی پرانی دہرائی گئی ہیں جو اس سے پہلے زیر بحث آ چکی ہیں اور راقم ان کے ضمن میں اپنا موقف شرح و بسط کے ساتھ بیان کر چکا ہے۔ اب تو دونوں جانب سے دعا یہ ہونی چاہیے کہ ؎

یا رب وہ نہ سمجھے ہیں نہ سمجھیں گے مری بات
دل اور دے ان کو جو نہ دے مجھ کو زباں اور!

چنانچہ

❁ اپنے عالم یا عامی ہونے کے بارے میں' میں تفصیلاً عرض کر چکا ہوں۔ یہاں تک کہ میں تو ''عصمت بی بی است بے چادری'' کے مصداق اپنی کم علمی اور ہیچ مدانی کے اعتراف کو اپنے لیے حفاظت اور عافیت کا حصار سمجھتا ہوں (ویسے اس ضمن میں مولانا غلام النصیر چلاسی دامت فیوضہم کا ایک جملہ افادۂ عام کے لیے نقل کیے دیتا ہوں کہ جب میں نے ان سے عرض کیا کہ میں عالم نہیں ہوں تو انہوں نے فرمایا: ''اصل علم توحید ہے۔ جسے یہ حاصل ہے اسے کل علم حاصل ہے''۔ **واللہ اعلم!**

❁ اسی طرح تقلید یا عدم تقلید یا نیم تقلید یا ''مسلک اعتدال'' یا مسلک ولی اللّٰہی کے ضمن میں بھی میں اپنی بات بیان کر چکا ہوں۔ اور زیر تذکرہ مضامین میں اس ضمن میں بھی کوئی نئی بات سامنے نہیں آئی۔

البتہ صرف ایک وضاحت اور ایک احتجاج ریکارڈ پر لے آنا ضروری سمجھتا ہوں:

❁ وضاحت اس کی کہ میں نے اگر حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کو ''جماعت شیخ الہندؒ'' سے خارج قرار دے کر انہیں ایک ''متوازی شخصیت'' قرار دیا تھا تو اس میں خدا شاہد ہے کہ ان کی کوئی توہین یا تنقیص مقصود نہیں تھی بلکہ میرے نزدیک وہ عمر اور رتبے ہر اعتبار سے حضرت شیخ الہندؒ کے جملہ شاگردوں کے مقابلے میں امتیازی شان رکھتے ہیں۔ البتہ سیاسیات اور اجتماعیات میں ان کا ایک اپنا مستقل اور جداگانہ مسلک تھا جس سے کوئی بھی شخص انکار نہیں کر سکتا۔ ویسے ذاتی حیثیت میں میرے نزدیک ان کا مقام حضرت شیخ الہندؒ سے نیچے اور ان کے باقی تمام شاگردوں سے بلند تر ہے۔

❁ احتجاج اس پر کہ بیعت ایسے اہم دینی وعلمی مسئلے پر کیا ''البینات'' اور ''الخیر'' جیسے وقیع اور موقر علمی جرائد کے پاس بھی صرف ایک مجھ جیسے غیر عالم اور ہر اعتبار سے عامی انسان عبدالمجیب صاحب ہی کی تحریر ''حرفِ آخر'' کا درجہ رکھتی ہے؟ یہ تحریر جو ملک کے ہفتہ وار جرائد کے لیے تو موزوں ہو سکتی تھی۔ چنانچہ ''تکبیر'' میں بھی چھپ چکی تھی اور ''حرمت'' میں بھی۔ کیا اس کی ان علمی اور دینی جرائد میں اشاعت کچھ لوگوں کے نزدیک ''ڈوبتے کو تنکے کا سہارا'' کا مصداق قرار نہ پائے گی۔ اور کیا اس سے ان جرائد کے مدیران گرامی نے ان اداروں کے مؤسسین حضرت مولانا محمد یوسف بنوریؒ اور حضرت مولانا خیر محمد جالندھری کے مقام اور مرتبے کو نقصان نہیں پہنچایا۔ میری درخواست ہے کہ اس خالص دینی اور علمی موضوع پر کوئی مسلّمہ علمی حیثیت والی شخصیت

کلام کرے تا کہ ہمیں بھی روشنی حاصل ہو سکے۔ اس لیے کہ اب یہ مسئلہ زندہ ہو چکا ہے' اور ملک کے طول وعرض میں زیر بحث ہے اور اس سے نہ ''صَرفِ نظر'' ممکن ہے نہ ''غضِ بصر''۔ اور ظاہر ہے کہ میرے اسلامی جمعیت طلبہ کے زمانے کے برادرِ خورد عزیزم عبدالمجیب سلمہٗ کا نہ یہ مقام ہے کہ وہ اس پر قلم اٹھائیں نہ یہ حیثیت ہے کہ ان کے جواب میں وقت ضائع کیا جائے۔

رہ گیا محترم مفتی جمیل احمد صاحب تھانوی کا مضمون' تو ایک شدید مخمصے میں مبتلا ہوں کہ کیا کہوں کیا نہ کہوں۔ ایک جانب ان کا مقام و مرتبہ اور ان کا ادب و احترام ہے جو زبان کھولنے میں مانع ہے' دوسری جانب ان کی تحریر ہے جو سراسر غلط مفروضات اور احتیاطاً عرض ہے کہ جھوٹی اطلاعات پر مبنی ہے۔ وہ مولانا اشرف علی تھانوی کے داماد کی حیثیت رکھتے ہیں (اس لیے کہ اگرچہ مولانا تھانویؒ تو لاولد ہی فوت ہوئے تاہم ان کی دوسری اہلیہ کی اپنے سابقہ شوہر سے ایک صاحبزادی تھیں' یعنی مولانا تھانویؒ کی ربیبہ جو مفتی صاحب کے گھر میں ہیں) اور غالباً اس وقت حلقہ دیوبند کے معمر ترین مفتیوں میں سے ہیں! انہیں تو اپنی عمر کی بنا پر ''مرفوع القلم'' قرار دیا جا سکتا ہے۔ لیکن حیرت ہوتی ہے ان حضرات پر جو ان کی تحریریں شائع کر کے نقصان مایہ اور شماتت ہمسایہ کا سامان فراہم کر رہے ہیں۔ بہرحال میں ان کے مضمون کے بھی صرف مغالطّوں کو دور کرنے کے لیے وضاحت کیے دیتا ہوں کہ:

۞ میں نے کبھی نکاح کے خطبہ مسنونہ کو ''جنتر منتر'' نہیں کہا' البتہ اسے جیسے بالعموم پڑھا جاتا ہے اسے ضرور جنتر منتر پڑھنے سے تشبیہ دی ہے۔

۞ میں نے خود بلا مبالغہ سینکڑوں نکاح پڑھائے ہیں (اور دوسرے نکاح خوانوں کے برعکس آج تک ایک پیسہ نہ بطور فیس لیا ہے نہ بطور ہدیہ) اور سب میں نکاح کا وہی خطبہ مسنونہ پڑھا ہے جو جملہ علماء پڑھتے ہیں۔ البتہ خطبہ سے قبل یا بعد خطبہ میں شامل آیاتِ مبارکہ اور احادیث شریفہ کا کبھی صرف ترجمہ بیان کر دیتا ہوں کبھی قدرے مزید وضاحت بھی' تا کہ خطبہ کا اصل مقصد کسی درجے میں حاصل ہو سکے۔

۞ میں نے کبھی یہ نہیں کہا کہ نکاح صرف مسجد میں ہو سکتا ہے کہیں اور ہو ہی نہیں سکتا! البتہ یہ ضرور کہا ہے کہ ترمذی شریف کی روایت کی رو سے یہ کم از کم افضل ضرور ہے کہ عقد نکاح

کی محفل مسجد میں منعقد ہو۔

۞ میں نے کبھی یہ نہیں کہا کہ لڑکی والوں کی طرف سے دعوت حرام ہے۔ البتہ یہ ضرور کہا ہے کہ اس کا ثبوت کوئی نہیں ہے۔ اور خود اپنے اوپر پابندی عائد کی ہے کہ میں نہ کبھی ایسے نکاح میں شریک ہوں گا جو مسجد میں نہ ہو ـــــ نہ لڑکی والوں کی جانب سے کسی دعوت طعام میں شریک ہوں گا (اس میں سے مؤخر الذکر پابندی کا اپنے اوپر عائد کر لینا حضرت مولانا احمد علی لاہوریؒ سے ثابت ہے)۔

۞ جہیز کی رسم کو البتہ میں قطعاً غیر اسلامی قرار دیتا ہوں اور اس ضمن میں حضرت فاطمہ ؓ کی شادی سے ثبوت لانے والوں کی عقلوں پر ماتم کرتا ہوں کہ وہ یہ نہیں دیکھتے کہ اس شادی میں آنحضورﷺ کی حیثیت دوہری تھی: ایک طرف آپؐ دلہن کے والد ماجد تھے اور دوسری جانب دولہا کے ولی۔ پھر یہ صراحت بھی بعض روایات میں ملتی ہے کہ جو چند ضرورت کی چیزیں آنحضورﷺ نے اس وقت فراہم فرمائی تھیں وہ مہر کی اس رقم کے ایک حصے سے تیار کی گئی تھیں جو حضرت علیؓ نے ادا کیا تھا۔ مزید برآں ذرا غور کیا جانا چاہیے کہ آنحضورﷺ کی دو بیٹیاں حضرت عثمانؓ کے نکاح میں آئیں ان کے جہیز کا ذکر بھی کہیں ملتا ہے؟ اور خود آنحضورﷺ کے حجلۂ عروسی میں آنے کی متعدد ازواجِ مطہرات ؓ کو سعادت حاصل ہوئی وہ کون سا جہیز لے کر تشریف لائی تھیں؟

۞ یہ ایک سراسر بہتان ہے کہ میں عیسائیوں کی نقل کرتے ہوئے دلہنوں کو بھی بے پردہ محفل نکاح میں لانا چاہتا ہوں۔ دوسروں کو تجدید ایمان اور تجدید نکاح کی تلقین کرنے والوں کو چاہیے کہ وہ اس صریح بہتان طرازی پر خود ان امور کا اہتمام فرمائیں۔ اس ملک میں پردہ کے ضمن میں کیا راقم ہی تجدد پسندوں کے نزدیک سب سے زیادہ مبغوض اور مغرب پرست بیگمات کے نزدیک سب سے زیادہ قابل نفرت انسان نہیں ہے؟ راقم نے کراچی کی ایک مسجد میں جہاں اپنی ایک عزیزہ کے نکاح کے موقع پر صدرِ مملکت جناب ضیاء الحق صاحب پہلی صف میں تشریف فرما تھے۔ تقریر قبل از خطبہ نکاح میں برملا سوال کیا تھا کہ جو لوگ پردہ کے قائل نہیں ہیں اور مرد اور عورت کے شانہ بشانہ ہونے کے فلسفے کے سب سے بڑے داعی ہیں وہ مجھے جواب دیں کہ اس محفل میں لڑکی کیوں موجود نہیں ہے؟ یہ اس کی زندگی بھر کا معاملہ ہے جو یہاں طے ہو رہا ہے اور ایک اتنا بڑا

معاہدہ ہے جس کی کوئی نظیر بین الانسانی معاہدات میں پیش نہیں کی جا سکتی۔ پھر ایسا کیوں ہے کہ یہاں معاہدے کا صرف ایک فریق (دولہا) اصالتاً حاضر ہے' اور دوسرا فریق یعنی (دلہن) صرف وکالتاً حاضر ہے؟

خاص اس معاملے میں تو میں یہ عرض کیے بغیر نہیں رہ سکتا کہ حضرت مفتی صاحب قبلہ کو مجھ سے تو معافی مانگنے کی ضرورت نہیں' وہ صرف اشارہ کر دیں میں خود ان کی قدم بوسی کو حاضر ہو جاؤں گا' لیکن اللہ تعالیٰ سے ضرور استغفار کریں اور معافی کے خواستگار ہوں۔

- اسی طرح آج تک جتنے نکاح میرے اہتمام میں مسجد میں ہوئے ان میں سے کسی میں فوٹوگرافی نہیں ہوئی' اور نہ ہی خواتین مسجد میں آئی ہیں۔ قرآن اکیڈمی کی جامع مسجد کے ساتھ ایک ہال تعمیر کیا گیا ہے جو مسجد کے حکم میں نہیں ہے۔ اس کے نیچے تین رہائشی کوارٹر ہیں اور اوپر بھی طلبہ کی رہائش گاہیں ہیں۔ خواتین صرف اس ہال میں آتی ہیں۔ اسی طرح مسجد دارالسلام باغ جناح کے ساتھ ہی ایک لائبریری بھی ہے' خواتین کا اہتمام اس کے برآمدے میں ہوتا ہے یا اس سے متصل لان میں ہوتا ہے جو مسجد میں شامل نہیں ہے (اور یہ کام مفتی صاحب برا نہ مانیں' سالہا سال سے کراچی کی مسجد خضراء میں جہاں کے امام و خطیب تھانوی سلسلہ ہی کے ایک اہم بزرگ مولانا شمس الحسن تھانوی مدظلہٗ ہیں' وہاں بھی ہوتا ہے کہ مسجد سے متصل گھاس کے پلاٹ میں شامیانے لگ جاتے ہیں اور خواتین وہاں جمع ہوتی ہیں)۔

بہر حال راقم اس ضمن میں تھانوی سلسلہ سے منسلک جملہ بزرگ اور نوجوان حضرات سے اپیل کرتا ہے کہ وہ حضرت مفتی صاحب کو سمجھائیں کہ وہ بزرگوں کی عزت کو اس طرح چوراہے میں لا کر رسوا کرنے سے باز رہیں۔ (''میثاق'' ستمبر ۱۹۸۵ء)

☆☆☆

''سن تو سہی جہاں میں ہے تیرا فسانہ کیا؟''

شادی بیاہ کے سلسلے کی ایک اصلاحی تحریک
اور اس پر مفتی جمیل احمد صاحب کی تنقید کا جائزہ

''حسّاس''

کے قلم سے ــــــ بشکریہ ''حرمت'' اسلام آباد

۱۸۵۷ء کا حادثہ اس قدر سنگین تھا کہ الامان' ہندوستان میں مسلمانوں کی حکومت بالکلیہ ختم ہو گئی اور وہ غلام بن کر رہ گئے اور ان پر انگریزوں کا تسلط ہو گیا۔

دارالعلوم دیوبند اور اس جیسے دوسرے مدارس کا قیام بلاشبہ اللہ تعالیٰ کی ایک بڑی نعمت تھی۔ مدارس عربیہ کی اس تحریک کے بانی مولانا محمد قاسم نانوتوی جیسے درویش خدامست تھے جو شاہ ولی اللہ قدس سرہٗ کے خاندان کے فیض یافتہ اور اس خاندان کے اساتذہ کے علوم و معارف کے وارث تھے۔ اتفاق یہ ہے کہ جناب سر سید احمد خان اور مولانا نانوتوی دونوں نے ہی مولانا مملوک علی نانوتوی سے کسب فیض کیا' لیکن دونوں کی عملی راہیں جدا تھیں۔ مولانا قاسم نانوتوی اپنے رفقاء سمیت جہاد ۱۸۵۷ء میں باقاعدہ حصہ لے کر حکومت کو بچانے کی فکر کر چکے تھے اور اس میں ناکامی پر انہوں نے ان مدارس کی طرف توجہ دی جن کا مقصد مسلمانوں کی روایات' تہذیب و تمدن اور ان کے علوم و فنون کی حفاظت تھی۔ ساتھ ہی وہ مسلمانوں کو جنگ آزادی کے لیے تیار کرنا چاہتے تھے' جیسا کہ آپ کے سب سے محبوب شاگرد مولانا محمود حسن (شیخ الہندؒ) کے تاثرات اور ان کی جدوجہد سے ثابت ہے۔ لیکن سر سید احمد خاں مرحوم بدیسی حکومت سے تعاون کا رویہ اختیار کرنے میں عافیت سمجھتے تھے۔ گویا دونوں حضرات کے مسلک میں بُعد المشرقین تھا۔ لیکن اس کے باوجود شخصی احترام تھا۔ جس کا اندازہ مولانا محمد قاسم نانوتوی کے

خطوط اور سرسید احمد خان کے تعزیتی نوٹ سے ہوسکتا ہے۔

مولانا نانوتوی' ان کے احباب یا اخلاف کو کسی بھی دَور میں کالجی تعلیم سے نفرت نہیں رہی' نہ انہوں نے اس کے خلاف کبھی محاذ آرائی کی' بلکہ مولانا کے ایک قریبی عزیز سب سے پہلے وہاں کے ذمہ دار حضرات کی خواہش پر وہاں دینیات کے مدرس بن کر گئے اور پھر ہمیشہ ہی مختلف دائروں میں تعلقات قائم رہے۔ مولانا محمود حسن اور صاحبزادہ آفتاب احمد کے دَور میں تعلقات عروج پر تھے اور معلوم ہوتا تھا کہ دونوں دھارے آپس میں مل جائیں گے۔ اگر ایسا ہوجاتا تو ملت کی قسمت بدل جاتی' لیکن علی گڑھ کے بعض عزیزوں کے منفی رویہ نے صورتِ حال سنبھلنے نہ دی۔ اور شاید اسی کا ردّعمل تھا کہ مولانا محمود حسن کی مالٹا کے قید خانہ سے واپسی پر علی گڑھ میں انہی کے ہاتھوں جامعہ ملیّہ کی بنیاد رکھی گئی جو بعد میں بوجوہ دہلی منتقل ہوگیا۔ اور آج ہندوستان کے باوقار تعلیمی اداروں میں اس کا شمار ہوتا ہے۔

مولانا اشرف علی تھانویؒ کے خلفاء میں سے مولانا خیر محمد جالندھری جنہوں نے جالندھر میں مدرسہ خیر المدارس کی داغ بیل ڈالی' کے مزاج میں بھی یہی رنگ غالب تھا۔ وہ واقعتاً ایسے بزرگ تھے جنہوں نے ہمیشہ جوڑنے کی فکر کی' حتیٰ کہ اسی فکر میں وہ دنیا سے رخصت ہوئے۔

مرحوم ایوب خان کے بعد جب ملک میں سیاسی جھگڑے بڑے اور جمعیۃ علماء اسلام کے بالمقابل مرکزی جمعیت علماء اسلام کے نام سے ایک نئی جماعت کا اہتمام ہوا تو مولانا مرحوم نے اس تلخی کو ختم کرنے کے لیے بڑی جدوجہد کی۔ اور یہی صدمہ انہیں دنیا سے لے جانے کا باعث بنا۔

ان کا خلوص' تدبر اور متوازن اندازِ فکر ہی تھا جس نے تقسیم ملک کے بعد ملتان میں خیر المدارس کی نشأۃ ثانیہ کا اہتمام کیا اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ مدرسہ ملک کی مثالی درسگاہ بن گیا۔ ان کے سانحۂ ارتحال کے بعد ان کے منجھلے صاحبزادے مولانا محمد شریف نے بڑی ہمت و استقامت سے اس درسگاہ کا نظام سنبھالا اور جب وہ مکہ معظّمہ کی مقدس وادی میں اپنے اللہ کے حضور پہنچ گئے تو مدرسہ میں بھونچال آ گیا۔ بعض حضرات نے مدرسہ میں شب خون مار کر اس پر بیرونی قیادت مسلط کرنے کی کوشش کی اور لاہور سے ایک منتظم کو امپورٹ کرنا چاہا' لیکن ایسا نہ ہوسکا۔ اور مدرسہ کے بہی خواہوں نے مولانا کے نبیرہ اور مولانا محمد شریف کے صاحبزادے مولانا محمد حنیف کو اس کی صلاحیتوں کی بنا پر ادارہ کا نگران و مہتمم بنا دیا۔

مولانا محمد حنیف کے دَور میں مدرسہ سے ایک ماہنامہ مجلّہ کا اہتمام بنام ''الخیر'' کیا گیا۔ اس ذمہ دار اور متوازن ادارہ کی نسبت و حوالہ سے اہل ملک نے اس کا خیر مقدم کیا اور توقع رکھی

کہ یہ مجلّہ ملک میں صحت مند صحافت کے فروغ میں موثر کردار ادا کرے گا۔

اپنے مخصوص مزاج کے تحت واقعہ یہ ہے کہ رسالہ کی ابتدا خوب تھی' لیکن اب چند ماہ سے ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کی انجمن خدام القرآن اور تنظیم اسلامی کے خلاف جس انداز سے ایک مہم شروع کی گئی ہے اسے دیکھ کر بے حد افسوس ہوتا ہے اور رہ رہ کر خیال آتا ہے کہ اس کی وجہ کیا ہے؟ شاید یہ سوچا گیا ہو کہ اس طرح رسالہ کی اشاعت خوب ہوگی اور ممکن ہے ایسا ہو بھی جائے' لیکن آخر ہم سب نے اپنے کیے دھرے کا حساب بھی تو دینا ہے۔ اس کا اگر ہم سب کو احساس ہو جائے تو ہم بہت سے منفی کاموں میں اپنی صلاحیتیں کھپانے کے بجائے مثبت کاموں میں لگ جائیں۔

مئی ۱۹۸۵ء کا رسالہ ہمارے سامنے ہے اسی حلقہ کی ایک بڑی درسگاہ **جامعہ اشرفیہ** لاہور کے مفتی مولانا مفتی جمیل احمد تھانوی کا ایک مضمون شائع ہوا جس سے از حد کوفت ہوئی اور ہم یہ سطور لکھنے پر مجبور ہوگئے۔ اس جامعہ کے بانی مولانا مفتی محمد حسن حضرت تھانویؒ کے بڑے خلفاء میں سے ایک تھے۔ جنہوں نے تقسیم ملک سے قبل امرتسر میں اس مدرسہ کی داغ بیل ڈالی۔ تقسیم کے بعد نیلا گنبد لاہور کی ایک متروکہ عمارت میں اس کی نشاۃِ ثانیہ ہوئی اور پھر مسلم لیگی حکومت کے تعاون کے سبب فیروز پور روڈ پر لب نہر ایک وسیع قطعۂ اراضی پر اس جامعہ کی شاندار عمارت بنی۔ حضرت مفتی جمیل احمد صاحب یہیں کام کرتے ہیں۔ حضرت تھانوی سے روحانی ہی نہیں خاندانی نسبت بھی ہے۔ حضرت مرحوم کی چھوٹی اہلیہ محترمہ آپ کے پاس ہی لاہور میں مقیم ہیں اور انہی کی سرپرستی میں موصوف کے صاحبزادگان نے دینی کتب کی خرید و فروخت کا ایک ادارہ بھی بنا رکھا ہے۔

اپنی عمر اور تجربہ کے اعتبار سے حضرت مفتی صاحب پاکستان کے معمر ترین مفتی ہیں۔ عمر کے تقاضوں کا انسان کے مزاج پر لازمی اثر پڑتا ہے۔ شدتِ زبان و بیان شاید اسی سبب سے ہیں۔ ویسے موصوف ایک عرصہ سے فتویٰ پر دستخط نہیں فرماتے۔ اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ کسی فتویٰ پر عدالت میں حاضری دینا پڑی' جس کے بعد یہ احتیاط برتی گئی۔

''الخیر'' مئی ۱۹۸۵ء میں موصوف کے نام سے ایک مضمون چھپا۔ عنوان ہے:

——— نیا فرقہ' نئی تحریک ———

ڈاکٹر اسرار کا اصلاح کے نام سے فساد

ڈاکٹر صاحب نے شادی بیاہ کے سلسلہ میں ایک اصلاحی تحریک شروع کی' جس کی

ابتدا سرگودھا سے ہوئی۔ آپ کے بھائی کا نکاح تھا۔ مسجد ہری پورہ پھاٹک میں نکاح ہوا۔ اس موقعہ پر دوسرے حضرات کے علاوہ معروف عالم دین اور شیخ طریقت مولانا مفتی محمد شفیع سرگودھوی کے دونوں ہونہار اور صاحب علم وفضل صاحبزادے مفتی احمد سعید اور قاری عبدالسمیع موجود تھے۔ انہوں نے اس موقع پر ڈاکٹر صاحب کو مبارک باد دی اور فرمایا کہ یہ کام ہمارے کرنے کا تھا، لیکن اللہ تعالیٰ نے اس کی توفیق آپ کو دی۔

اس اصلاحی تحریک کے خلاف مفتی جمیل احمد صاحب کا مضمون بصورت پمفلٹ چھپا اور تقسیم ہوا۔ اور اب وہی مضمون غالباً کسی قدر اضافہ کے ساتھ ''الخیر'' میں شائع ہوا۔

اس مضمون کو پڑھ کر سخت رنج ہوا۔ ایک شخص خدمت قرآن میں مشغول ہے۔ ہر جگہ وہ علماء کے دروازوں پر جاتا ہے، ان سے اصلاح ورہنمائی کی درخواست کرتا ہے، فقہی مسائل میں الجھنے سے گریز کرتا ہے، کسی قسم کی فرقہ بندی کا دشمن ہے۔ اس کی حوصلہ افزائی، رہنمائی اور ہمدردی کے بجائے اس طرح کا منفی رویہ، طعن وتعریض اور مفروضات کی بنا پر غم وغصہ نہایت درجہ رنج دہ ہے۔

مضمون کی تمہید میں مفتی صاحب قبلہ نے ''کالجی تعلیم'' کو لتاڑا اور باور کرایا کہ اس ماحول کے لوگ آگے چل کر امت میں فساد کا باعث بنتے ہیں۔ اس ضمن میں انہوں نے ماضی قریب کی بعض علمی تحریکات اور اداروں کا نہایت درجہ طعن کے انداز میں ذکر کیا جو سنجیدہ اور ثقہ علماء کے شایانِ شان نہیں۔ اس ضمن میں موصوف نے ندوی اور جامعی تک کو نہ بخشا۔ حالانکہ ندوہ وہ عظیم الشان علمی تحریک ہے جس کے بانیوں میں وقت کے اکابر علماء وصلحاء شامل تھے۔ حضرت تھانوی کے خادم اور سیرت النبی ﷺ کے مصنف سید سلیمان ندوی مرحوم طویل عرصہ اس کے کرتا دھرتا رہے۔ اسی طرح مولانا حکیم عبدالحی صاحب نزہتہ الخواطر ان کے بڑے فرزند ڈاکٹر سید عبدالعلی اور چھوٹے فرزند مولانا سید ابوالحسن علی ندوی (عالم اسلام کے مشہور سکالر اور داعی اسلام) وقتاً فوقتاً کارمختار رہ چکے ہیں۔ علی میاں اب بھی اس کے حقیقی نگران اور منتظم ہیں۔ اسی طرح جامعہ ملیہ کے بانی اصولی طور پر مولانا محمود حسن شیخ الہندؒ ہیں اور ہمیشہ ہی اس ادارہ کو ثقہ قسم کے لوگوں کی سرپرستی حاصل رہی، افسوس کہ مفتی صاحب نے کسی چیز کا لحاظ نہ فرمایا۔ پھر حیرت ہے کہ انہوں نے ڈاکٹر صاحب کی تنظیم اسلامی کو جماعت اسلامی کا چربہ کیسے قرار دیا۔ حالانکہ ایک اہم موقعہ پر ڈاکٹر صاحب نے کم عمری کے باوجود جماعت اسلامی کے اندازِ فکر پر شدید علمی تنقید کی اور اس سے علیحدگی اختیار کر لی۔

موصوف نے ڈاکٹر صاحب اور تنظیم کے متعلق فرمایا کہ ''یہ لوگ بانگ دُہل چلاّ رہے ہیں کہ صرف ہم ہی ہم اسلامی ہیں اور سارے صحیح ادارے اور سارے مسلمان غیر اسلامی ہیں'' انا للّٰہ و انا الیہ راجعون۔ نہ معلوم محترم مفتی صاحب نے کس تحریر یا تقریر سے یہ نتیجہ نکالا، اے کاش دوسروں پر اس طرح کے الزام سے متعلق محاسبۂ آخرت ہمارے سامنے رہتا۔

آج کل شادیاں جس انداز سے ہوتی ہیں وہ کسی سے مخفی نہیں۔ ہندوانہ رسومات عام ہیں۔ نکاح کے دن یا آدھ ایک دن قبل مسجد سے رجسٹرار کو بلایا جاتا ہے۔ وہ غریب رجسٹر بغل میں دبائے بے کسی کے انداز میں آتا اور فارم پُر کرتا ہے۔ نکاح کے وقت سے بہت دیر پہلے ہی اسے بلا کر پابند کر لیا جاتا ہے۔ وہ غریب اس محفل عیش وطرب میں ایک بے کس وفقیر بے نوا کے سے انداز میں گھنٹوں اپنی قسمت کو کوستا رہتا ہے۔ خطبۂ نکاح جس میں صرف ۴، ۵ منٹ صَرف ہوتے ہیں اس کے دوران بھی بدتمیزی کے دسیوں اسباب موجود ہوتے ہیں۔ سگریٹ کا دھواں، موسیقی کی دُھنیں، بڑوں کے قہقہے اور بچوں کا ہنگامہ سبھی کچھ ہوتا ہے، لیکن کسی کو توفیق نہیں ہوتی کہ اس طوفانِ بدتمیزی کو روکے۔ ڈوم اور مراثی جو کچھ کرتے ہیں وہ ایک مستقل تکلیف دہ امر ہے، مولوی ایسے موقعہ پر غریب کچھ نہیں کر سکتا۔ اس کے پریشان کن معاشی حالات اسے اجازت ہی نہیں دیتے ورنہ تو سو پچاس روپے فیس نکاح سے بھی محروم ہو جائے۔

اس پس منظر میں اگر کوئی شخص ترغیب دے کر اللہ کی مخلوق کو مسجد میں لے آتا ہے اور انہیں سمجھاتا ہے کہ اس موقعہ پر خطبہ میں پڑھی جانے والی آیات خاص اس مقصد کے لیے ہدایت ورہنمائی کا ذریعہ ہیں ان کا مفہوم ومقصد سمجھو، محض انہیں تبرک کے طور پر نہ دہراؤ تو آپ اس پر پل پڑتے ہیں کہ دیکھا اس نے خطبہ کو ''جنتر منتر'' کہہ دیا ہے، حالانکہ وہ غریب محض اس روش پر تنقید کر رہا ہے اور لوگوں کو معقولیت کا راستہ دکھانے کی فکر میں ہے۔ وہ لوگوں کو سمجھانا چاہتا ہے کہ نکاح کا معاہدہ عبادت ہے اس کا مفہوم سمجھو اور قباحتوں سے بچو، لیکن آپ اس کی حوصلہ افزائی کرنے کے بجائے اس کے پیچھے پڑ جائیں اور اس طرح کہ گویا کسی غیر مسلم نے اسلامی ریاست پر حملہ کر دیا ہے یا کسی نے اسلامی شریعت کی کسی مسلّم حقیقت سے انکار کر دیا ہے۔

ڈاکٹر صاحب نے مسجد میں نکاح کو فرض و واجب نہیں کہا۔ ہاں مسجد کی اہمیت کے پیشِ نظر اس کی ترغیب ضرور دی کہ مسجد میں نکاح ہو تو نورٌ علیٰ نور ہے۔ ان کا مقصد یہ ہے کہ شادی ہالوں، ہوٹلوں وغیرہ میں جو قباحتیں ہیں ان کے بجائے اللہ کے گھر میں اللہ کے بندوں کا اکٹھ اور اجتماع اور اس کا اہتمام نفع کا باعث ہوگا۔

مفتی صاحب موصوف نے جمع وتفریق کا سلسلہ شروع کر کے ثواب وگناہ کے درجات گنوانے شروع کر دیے اس تکلف کی ضرورت نہیں نکاح چھوڑ نماز' درس وتدریس اور حلقہ ذکر کے دوران بھی اگر کوئی مسجد کا ادب ملحوظ نہ رکھے گا تو اس پر بھی گناہ لازم آئے گا' گناہ تو ہر حال میں گناہ ہے۔

اے کاش! کہ حضرت مفتی صاحب مساجد کے معاملے میں بے اعتدالی کے دُور کرنے کی غرض سے کوئی اصلاحی چیز تحریر فرماتے تا کہ اہل ثروت کو معلوم ہوسکتا کہ سود سے لے کر زکوٰۃ تک کا پیسہ مسجد پر لگانا اور اس کی ظاہری خوبصورتی کا تو اہتمام کرنا لیکن نماز کا اہتمام نہ کرنا کتنا برا عمل ہے۔

اور سچی بات تو یہ ہے کہ جو شخص نکاح کو اور اس کی مجلس کو قباحتوں سے بچانے کی غرض سے مسجد میں لے آیا ہے وہ مسجد کے آداب کا حاضرین کو کیوں نہ بتاتا ہوگا' وہ تو ہر حال میں مسجد کے تقدس کا لحاظ کرتا ہوگا۔ لیکن افسوس کہ مفروضوں کی بنیاد پر ایک چنگے بھلے عمل خیر کی تائید و تحسین کے بجائے ایسا رویہ اختیار کیا گیا۔

ڈاکٹر صاحب نے لکھا تھا کہ عیسائیوں میں اپنے مذہب کا احترام نہیں اور مذہبی روایات یکسر ختم ہیں اس کے باوجود کلیسا اور پادری کا احترام ہے کہ ایسی تقریبات کلیسا میں ہوتی ہیں' اور پادری کا حد درجہ احترام کیا جاتا ہے۔ اس پر مفتی صاحب نے ''اندرونی راز'' کی سرخی سجا کر مسجد میں نکاح کو کلیسا سے تشبیہہ دے ڈالی۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ۔ سوال یہ ہے کہ نیکی کا عمل مسجد میں ہو اور مولوی باوقار طریق سے آئے' یہ اچھا ہے یا یہ اچھا کہ نکاح ہوٹل میں ہو اور مولوی بے کسی کا تماشہ بنے؟

مفتی صاحب ارشاد فرماتے ہیں کہ ڈاکٹر صاحب مسلمان کنواری بچیوں کو بے حجاب کرنے کی دھن میں کلیسا والی بنانا چاہتے ہیں ''فیا حسرتا'' اے کاش مفتی صاحب محسوس فرماتے کہ خواتین کی بے راہ روی اور بے حجابی پر سب سے زیادہ احتجاج ڈاکٹر صاحب نے کیا جس کی انہیں بھاری قیمت ادا کرنا پڑی۔ اس کے برعکس حضرت مفتی صاحب کا پورا قبیلہ مسلسل آٹھ برس سے موجودہ حکمرانوں کی مدح وتوصیف میں مشغول ہے جبکہ اسلامی روایات کا جتنا تمسخر اس دَور میں ہوا' کبھی نہیں ہوا۔

افسوس کہ حضرت مفتی صاحب نے مفروضات کی آڑ میں طعن وتشنیع کا باب کھولا۔ اگر مسجد سے ملحقہ ہال جو مسجد کا حصہ نہیں یا ہو تو اس میں عورتیں شرعی حدود کا لحاظ کر کے جمع ہوں' خطبہ نکاح ہو اور وہیں سے بچی کو رخصت کر دیا جائے تو شرعاً اس میں کیا قباحت ہے؟

یہ ارشاد کہ عورتیں مسجد میں باتیں کریں گی' چغلی' غیبت اور تفاخر کریں گی' بن سنور کر

جائیں گی' بچوں کو ساتھ لے جائیں گی جبکہ بچوں کو مسجد سے دور رکھنا لازم ہے اور ممکن ہے کہ حیض ونفاس میں مبتلا ہوں' فوٹو کا اہتمام ہو کہ کالجی مولوی اسے برا نہیں سمجھتے (اور اہل دین؟) شور وشغب ہوگا۔ مسجد میں بچوں کے پیشاب کا خطرہ ہے' مرد بھی آج کل پیشاب کر کے بغیر طہارت پتلون پہن لیتے ہیں' تو بقول مفتی صاحب یہ سب کام مسجد کے احترام کے منافی ہیں۔ اس میں کسی کافر کو شبہ نہیں' لیکن ہم عرض کریں گے کہ مفروضات کے سہارے اچھے کاموں اور اچھی اصلاحی تحریکوں کے متعلق نفرت پیدا کرنا تو اچھا نہیں' آپ کیوں نہیں خیال فرماتے کہ شادی بیاہ کو رسومات اور فضولیات سے بچانے کی جدوجہد کرنے والا مسجد کا لحاظ نہیں کرے گا اور ان باتوں سے متعلق عوام کو آگاہ نہیں کرے گا؟ اگر مفروضات کا ہی سہارا لیا جائے تو زندگی کا نظام معطل ہو کر رہ جائے۔

آج کل لڑکیوں والے بالخصوص متوسط طبقہ کے لوگ جس قسم کی الجھنوں کا شکار ہیں ان کا اندازہ حضرت مفتی صاحب جیسے اہل ثروت علماء کو نہیں ہوسکتا اور نہ ہی اس طبقہ کو جس کی ترجمانی حضرت مفتی صاحب جیسے حضرات فرما رہے ہیں۔ غربت کے سبب رشتہ کا معاملہ الجھ کر رہ جاتا ہے۔ پھر جہیز اور بے ہنگم دعوتوں کا چکر ان غریبوں کا کچومر نکال دیتا ہے۔ اس پس منظر میں ڈاکٹر صاحب نے لڑکی والوں کے سلسلہ میں جو دعوت کی بات کہی ہے اور کہا کہ یہ لازم و ضروری ہوتا یا مستحب ہی ہوتا تو حدیث میں کہیں اس کا ذکر ہوتا تو اس میں کیا غلط بات کہی؟

یہ صحیح ہے کہ ڈاکٹر صاحب حدیث نہیں پڑھاتے لیکن آپ نے جو حدیث کے حوالے دیے خود ہی فرمائیں کہ وہ مناسب حال ہیں؟

ارشاد نبوی کہ ''ہدیہ دیا کرو اس سے محبت بڑھے گی'' سر آنکھوں پر' لیکن غریب لڑکی والوں کی دعوت کا لزوم اس میں کہاں ہے؟ دوسری حدیث کہ ''جو بغیر عذر دعوت میں شریک نہ ہوگا وہ اللہ اور اس کے رسول کا نافرمان ہے'' بالکل بجا' لیکن لڑکی والوں کو دبوچنے کے لیے اس حدیث کا حوالہ کیوں؟ اس میں ایسی کون سی علامت یا اشارہ ہے؟

رہ گیا سیدتنا فاطمہ رضی اللہ عنہا کی شادی کا قصہ' کہ اس موقعہ پر کھجوروں کا طباق منگوایا گیا اور وہ تقسیم ہوا یا لوٹا گیا تو اللہ کے لیے بتائیں کہ مروّجہ دعوت سے اس کا کیا تعلق؟ کھجور یا چھوہارے بالعموم دولہا والوں کی طرف سے ہوتے ہیں۔ حضور علیہ السلام سیدنا علی رضی اللہ عنہ کے مربی وسرپرست بھی تھے۔ اور تاریخ خمیس کا جو حوالہ آپ نے دیا اس میں اس کی صراحت نہیں کہ وہ سیدنا علی رضی اللہ عنہ

لائے یا ان کا اہتمام حضور ﷺ نے کیا۔ آج بھی اگر ۱۰' ۲۰ روپے کے چھوہاروں کا اہتمام لڑکی والے ہی کر لیں تو اس پر اعتراض نہیں' اعتراض اس کمرتوڑ دعوت پر ہے جس کا ثبوت آپ کے پاس بھی نہیں۔ حضرت مفتی صاحب نے بدعت کی بحث کو بلا وجہ الجھایا' سب کو معلوم ہے کہ تمدنی ضروریات اور اس نوع کی اشیاء بدعت نہیں۔ بدعت وہی ہے جو دین میں اضافہ ہو۔ باقی برات کی لغوی بحث کا اہتمام کر کے یہ فرمانا کہ چونکہ پہلے سواریاں نہ ہوتی تھیں اس لیے جہیز وغیرہ لانے کی غرض سے برات کا اہتمام ہوا کہ ڈاکو لوٹ کر نہ لے جائیں' جواب سواری اور امن کے سبب گھٹ جائے تو حرج نہیں لیکن گواہ تو بقول مفتی صاحب ضروری ہیں' تو سوال یہ ہے کہ گواہوں کا انکار کس نے کیا' اعتراض ہے تو اس برات کی فوجِ ظفر موج پر' جس کا آج کل رواج ہے۔ کم از کم دو چار بسیں اور ۱۰' ۲۰ کاریں تو معمولی بات ہے۔ اے کاش آپ کبھی تنہائی میں غور فرماتے تو آپ کو اندازہ ہوتا کہ یہ کس طرح کے بوجھ ہیں اور غریب لڑکی والے کتنے پریشان ہوتے ہیں' احساس ہو جائے تو آپ بھی یہی فرمائیں جو ڈاکٹر صاحب کہتے ہیں۔ اعلان نکاح کا ارشاد تو بہرحال حدیث میں ہے اس میں وسیع پیمانے پر تبلیغ کے نقطہ نظر سے ڈاکٹر صاحب نے اخباری اعلان مناسب سمجھا۔ لیکن انہیں اس پر اصرار نہیں کہ ہر شخص ایسا ہی کرے۔

مقصد اعلان ہے چاہے اس کی کوئی شکل ہو' لیکن اعتراض برائے اعتراض کے طور پر حضرت مفتی صاحب اس کو لے کر بیٹھ گئے کہ پندرہ سو سال میں مسلمانوں نے کون سا اخبار میں اعلان کیا؟ **فیا للعجب!** معلوم ہوتا ہے کہ اندرونی احساس ہے جو موصوف کو قدم قدم پر اعتراض پر اُبھارتا ہے۔ اس ضمن میں موصوف کو یہ اعتراض ہے کہ ابھی تو قصد نکاح ہے اسے آپ اعلان نکاح کیوں کہہ رہے ہیں؟ بزرگانہ غضب ہے ہم کیا عرض کریں؟

دعوتِ ولیمہ کے ضمن میں ڈاکٹر صاحب نے حضور نبی اکرم ﷺ کا ارشاد نقل کیا جس کا مفہوم ہے:

''دعوتِ ولیمہ اس حیثیت سے کہ اس میں اغنیاء اور صاحب حیثیت لوگوں کا خیال ہوتا ہے اور فقراء لوٹا دیے جاتے ہیں' بری ہے۔''

مفتی صاحب فرماتے ہیں کہ دعوت بری نہیں اس کا طعام برا ہے' چلیں قبلہ ایسے ہی سہی' فرمایا کہ جو آپ نے فرمایا اور جو ڈاکٹر صاحب نے کہا انجام کے اعتبار سے اس میں کیا فرق ہے؟

آج جو ولیمہ کی دعوتیں ہوتی ہیں ان میں سینکڑوں نہیں ہزاروں کو بلایا جاتا ہے' احباب و اعزہ سبھی ہوتے ہیں۔ اب بالعموم ہوٹلوں وغیرہ میں اہتمام ہونے لگا ہے۔ لاکھوں کے بل

اُٹھتے ہیں' وقت کی پابندی نام کو نہیں۔ ۲' ۳ گھنٹے کی تاخیر معمولی بات ہے۔ پھر وہاں کوئی محتاج راہ پائے تو بہ؟ وہاں تو غریب ڈرائیور تک کا گزر نہیں۔ وہ بے کسی کی تصویر ہوتا ہے اور صاحب گل چھرے اڑانے میں مصروف! ایسے مواقع پر افراتفری' بدنظمی اور کھڑا ہو کر کھانے کے سبب بے پناہ کھانا ضائع ہوتا ہے۔ پیٹ بھرے لوگ بھوکے گدھوں کی طرح ٹوٹ پڑتے ہیں۔ بیرا سٹینڈ تک نہیں پہنچ پاتا کہ یار لوگ پرات الٹ لیتے ہیں۔ کھانے کی جو درگت بنتی اور بے احتیاطی ہوتی ہے اس پر غضب الٰہی کا ڈر لگتا ہے۔ لیکن کوئی فقیر و محتاج صدا لگا دے تو سب غیظ و غضب کا شکار ہو کر اسے دھکے دے کر باہر نکالنے کی فکر میں لگ جاتے ہیں۔

حضور علیہ السلام اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی مقدس جماعت میں ایسا نہ تھا' وہاں غرباء اور مساکین سے ابتدا ہوتی' لیکن ہمارے یہاں جاگیرداری سسٹم نے اخلاق و شرافت کے سانچے توڑ دیے۔ عام غرباء کیا اعزہ میں سے غرباء کی فکر نہیں ہوتی۔ مخصوص نوع کے مذہبی اداروں سے متعلق مخصوص حضرات کی البتہ ہر جگہ آؤ بھگت ہوتی ہے اور وہ بھی اسی ماحول میں رچ بس کر اسی طرح شریک محفل ہو جاتے ہیں' نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ایسے حضرات کو اہل ثروت کے اعمال بد کی سرپرستی کرنا پڑتی ہے جس سے مذہبی اقدار کا جنازہ نکل جاتا ہے۔

کتنی صحیح بات فرمائی حضرت مولانا تھانوی نے' ایک شخص نے لکھا کہ آپ کہتے ہیں نکاح سنت ہے لیکن جو خوشدامن اور بہو شادی سے قبل ایک دوسرے کے لیے بے پناہ محبت و احترام کا اظہار کرتی ہیں وہ شادی کے ایک ہفتہ بعد آپس میں اس طرح گتھم گتھا ہوتی ہیں کہ خاوند پناہ گیر بن کر رہ جاتا ہے؟ مولانا نے فرمایا: نکاح تو سنت ہے لیکن چندمنٹ کے خطبے سے قبل اور بعد جو خرافات اور رسومات ہوتی ہیں اور جن بدعات کا ارتکاب ہوتا ہے وہ اس برکت کو کہاں باقی رہنے دیتی ہیں؟

تو آج کل جو معاشرتی جھگڑے اور فسادات ہیں ان کا سبب یہی ہے کہ برائے نام خطبۂ نکاح کے سوا باقی کچھ نہیں ہوتا اور خوب خوب خرافات' اسراف و تبذیر اور ایسی باتیں ہوتی ہیں' ان کی اصلاح ہم سب کا اجتماعی فریضہ ہے نہ کہ ایسی جدوجہد کرنے والے پر پھبتی کسنا۔

رَبُّ العِزّت ہم سب کو اپنی رحمتوں سے نواز کر اصلاحِ اعمال کی توفیق دے اور ایک دوسرے کے ساتھ دینی معاملات میں جذبۂ تعاون سے نوازے۔

(''میثاق'' ستمبر ۱۹۸۵ء)

ایک اہم شہادت

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نَحمَدُہٗ وَ نُصَلِّی عَلٰی رَسُوْلِہِ الْکَرِیْم

مجھے یہ بات نہایت ہی وثوق اور کلی اعتماد کے ساتھ یاد ہے کہ ۱۹۴۸ء میں جب کہ پاکستان کو قائم ہوئے ایک سال گزر رہا تھا حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی رحمۃ اللہ علیہ جامعہ اسلامیہ ڈابھیل ضلع سورت (بمبئی) تشریف لائے۔ میں اس وقت جامعہ اسلامیہ میں مدرس تھا۔ ایک مجلس میں بعض حضرات نے (اس بنا پر کہ حضرت مدنی ؒ کا تعلق کانگریس سے تھا اور کانگریس کی سیاست پاکستان کی حامی نہ تھی اور تحریک پاکستان کی مخالف تھی)' حضرت مدنی ؒ سے پاکستان کے متعلق سوال کیا کہ اب حضرت کی اس کے بارے میں کیا رائے ہے؟ حضرت اقدس ؒ نے اس سوال کے جواب میں جو کلمات فرمائے وہ مجھے آج تک یاد ہیں' فرمایا: ''بھائی! یہ ممکن ہے کہ اگر کسی جگہ مسجد کی تعمیر کرنے کی گفتگو ہو تو اختلاف کیا جا سکتا ہے کہ اس جگہ مسجد تعمیر کی جائے یا نہ کی جائے۔ لیکن جب مسجد بن گئی تو اب کوئی گنجائش اس اختلاف کی نہیں رہ سکتی کہ اس مسجد کو باقی رکھا جائے یا منہدم کیا جائے''۔ سبحان اللہ! حضرت کے ان الفاظ نے اس حقیقت کو واضح کر دیا کہ قیامِ پاکستان سے قبل اگر کسی عالم اور بزرگ کو اختلاف تھا تو وہ ایک نظری اور اجتہادی اختلاف تھا کہ انگریز کی غلامی سے آزادی کس طرح ممکن ہے۔ لیکن قیام پاکستان کے بعد کسی بھی عالم اور بزرگ نے خواہ اس کا تعلق کانگریس سے تھا' کبھی پاکستان کی مخالفت نہیں کی۔ اس مجلس میں حضرت مولانا احمد بزرگ ؒ مولانا مفتی اسماعیل ؒ و دیگر اکابر علماء موجود تھے۔

محمد مالک کاندھلوی

شیخ الحدیث جامعہ اشرفیہ لاہور

پس نوشت

ماہنامہ ''حکمت قرآن'' جولائی ۱۹۸۲ء

مولانا امین احسن اصلاحی سے ''وصل و فصل'' کی داستان کے آخر میں عرض کیا گیا تھا کہ: ''مولانا کے ساتھ تعلق کا جو تسمہ اب لگا رہ گیا ہے وہ صرف مصنف اور ناشر کے تعلق کی نوعیت کا ہے اور وہ بھی راقم اور مولانا کے مابین نہیں بلکہ انجمن خدام القرآن اور مولانا کے مابین ہے۔''

قارئین کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ اب یہ تعلق بھی ختم ہو چکا ہے۔ اور انجمن نے اپنی ادا کردہ رقم واپس لے کر مولانا کو ان کی جملہ تصانیف کے حقوق اشاعت واپس لوٹا دیے ہیں۔

سبب اس کا یہ ہوا کہ ''تدبر قرآن'' کی جلد چہارم میں سورۃ النور کی تفسیر کے ضمن میں مولانا نے حدّ رجم کے بارے میں جو رائے ظاہر کی ہے اُس نے کم از کم اس مسئلے میں انہیں اہل سنت کی صفوں سے نکال کر منکرین حدیث کی صف میں لا کھڑا کیا ہے۔ جس وقت یہ جلد چھپی' راقم نے ابھی اسے پڑھا نہیں تھا۔ بعد میں جب یہ بات راقم کے علم میں آئی تو سخت صدمہ ہوا کہ اس رائے کی اشاعت میں راقم الحروف اور اس کی قائم کردہ ''انجمن خدام القرآن'' بھی شریک ہے۔ تاہم جو تیر کمان سے نکل چکا تھا اس پر تو اب سوائے استغفار کے اور کچھ نہ کیا جا سکتا تھا' البتہ اس جلد کی دوبارہ اشاعت پر طبیعت کسی طور سے آمادہ نہ ہوئی —— ادھر یہ بھی کسی طرح مناسب نہ تھا کہ ایک مصنف کی تصنیف کی اشاعت صرف اس لیے رُک جائے کہ وہ اس کے حقوق اشاعت کسی ادارے کے ہاتھ فروخت کر چکا ہے —— بنا بریں تفسیر ''تدبر قرآن'' کی بقیہ چار جلدوں کے ناشر برادرم ماجد خاور صاحب نے جیسے ہی مولانا کی جملہ تصانیف کے حقوق اشاعت کی واپسی کے سلسلہ میں گفتگو کی' راقم نے فوری آمادگی کا اظہار کر دیا اور الحمد للہ کہ خاور صاحب کی مساعیٔ جمیلہ اور مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کی مجلس منتظمہ کی منظوری سے یہ معاملہ بغیر کسی تلخی کے باحسن وجوہ طے پا گیا۔ الغرض مولانا سے اب یہ رشتہ بھی بالکلیہ منقطع ہو گیا ہے۔

اسرار احمد

باب نہم

موجودہ مسلم معاشرے میں

قدیم اور جدید کی کشمکش

☆

دین میں 'عقل' اور 'نقل' کا مقام

اور

تجدد واباحیت کے علمبرداروں

کے بارے میں میرا موقف

۞

(۱)

خطاب جمعۃ المبارک

۲۴/اگست ۱۹۸۴ء

شائع شدہ 'میثاق' نومبر ۱۹۸۴ء

(۲)

قتل خطا میں

عورت کی نصف دیت کا مسئلہ

شائع شدہ روزنامہ 'نوائے وقت'

و

'میثاق' دسمبر ۱۹۸۴ء

(۱)

خطبۂ مسنونہ کے بعد

حضرات! گزشتہ جمعہ میں' میں نے اپنے ان بعض مشاہدات کا ذکر کیا تھا جو ایک طویل سفر سے واپسی پر مجھے وطن عزیز میں ہوئے تھے اور ان کے بارے میں اپنے تاثرات اور اپنے احساسات قدرے تفصیل سے آپ کے سامنے رکھے تھے۔ انہی میں ایک مسئلہ قصاص و دیت کے مسودہ قانون سے متعلق ہے جس کے بارے میں ایک controversy ہمارے ملک میں عرصۂ دراز سے چل رہی تھی۔ واپسی پر معلوم ہوا کہ اس دوران اس controversy میں بہت شدت پیدا ہوئی۔ خاص نقطہ نظر کے حق میں خواتین کی بعض تنظیموں کی طرف سے احتجاجی جلوس نکالے گئے اور جلسے کیے گئے۔ اخبارات میں کثرت سے مضامین' بیانات اور مراسلات شائع ہوئے۔ جواباً دوسرے نقطہ نظر کی جانب سے بھی جلسے ہوئے اور اخبارات اور خاص طور پر دینی رسائل میں اپنی رائے کا اسلامی نقطہ نظر سے مدلل اظہار رائے کیا گیا۔ اس سے پہلے قانونِ شہادت کی ایک شق کے بارے میں بحث و تمحیص اور مخالفانہ آرا کا ہمارے ملک میں' ہمارے معاشرے میں ''روشن خیال'' خواتین کی طرف سے اخباری بیانات' مراسلات' مضامین کے اظہار اور احتجاجی جلسوں' جلوسوں اور مظاہروں کا سلسلہ چلتا رہا تھا۔ اس کے ضمن میں بہت سے احباب کے ذہن میں ایک سوال پیدا ہوا ہوگا۔ اور بعض حضرات نے مختلف مواقع پر مجھ سے اس کے بارے میں استفسار بھی کیا۔ وہ استفسار یہ تھا کہ میں ان موضوعات و معاملات میں کیوں خاموش رہا ہوں اور میں نے ان مسائل پر اپنی کسی تفصیلی رائے کا اظہار کیوں نہیں کیا! حالانکہ ایک خاص اعتبار سے لوگوں کو توقع تھی کہ شاید ان معاملات میں سب سے زیادہ شد و مد کے ساتھ میری طرف سے اظہار خیال ہوگا۔ چونکہ ایسے معاملات میں نقطہ نظر کا جو بنیادی اختلاف کارفرما ہے وہ مردوں اور عورتوں کے مابین کامل مساوات کا نظریہ ہے جو مغرب کی جدید فکر' فلسفہ اور تہذیب و تمدن کے رگ و پے میں سرایت کیے ہوئے ہے اور اسی نظریے سے مرعوب و مسحور ہمارے معاشرے میں ایک فعال طبقہ ایسا ہے جو اگرچہ عددی اعتبار سے یقیناً ایک چھوٹی اقلیت ہے' لیکن فعال اقلیت ہے۔ وہ مساواتِ مرد و زن کے نظریے پر پورا ایمان رکھتی ہے اور وہی اقلیت ہے جو ایسے تمام مسائل میں جہاں ان کے نظریے کے مطابق عورت کا

درجہ کسی نوعیت سے مرد کی برابری کا نہ ہو' سراپا احتجاج بن جاتی ہے' پھر اسی اقلیت کے زیادہ تر افراد چونکہ یا تو حکومت کے اعلیٰ ترین مناصب پر فائز ہیں یا بڑی بڑی صنعتوں اور بڑے بڑے تجارتی اداروں سے تعلق رکھتے ہیں۔ لہٰذا اس طبقے کے احتجاج' خاص طور پر اس کی خواتین کے احتجاج' مخالفانہ بیانات' مراسلات اور مضامین کو ہمارے ذرائع ابلاغ بڑی نمایاں حیثیت سے coverage دیتے ہیں۔ ان کی تشہیر کرتے ہیں۔ چنانچہ ایسے موضوعات معاشرے میں ایک شدید ردّ و قدح اور بحث و مباحثے کا باعث بن جایا کرتے ہیں۔

آپ حضرات کو یاد ہوگا کہ یہ مساواتِ مرد و زن کا جو اصل مسئلہ ہے' اصل controversy ہے' جو اصل بنیاد ہے اس کے ضمن میں آج سے قریباً دو سال قبل جو سب سے بڑی controversy زور شور سے اٹھی تھی وہ میرے ہی حوالے سے شروع ہوئی تھی۔ یعنی ستر و حجاب اور عورت کے جداگانہ دائرہ کار کا مسئلہ۔ اگرچہ وہ مسئلہ میں نے اپنے کسی شعوری ارادے سے' اپنے کسی فیصلے سے یا اپنی کسی سوچی سمجھی اسکیم کے تحت شروع نہیں کیا تھا بلکہ ایک نیم دوستانہ اور ایک نیم صحافیانہ گفتگو تھی جس کی رپورٹنگ ہوئی اور اس کے حوالے سے اس وقت ہمارے ملک میں ایک طوفان کھڑا ہو گیا تھا۔ تاہم جب یہ مسئلہ چھڑ گیا اور سوال اُٹھ کھڑا ہوا تو اس مسئلہ پر میں اسلام کا جو نقطہ نظر سمجھتا ہوں اور ہمارے دین کی جو تعلیمات ہیں' میں نے اُن کو بھرپور انداز اور پوری قوت کے ساتھ پیش کیا تھا[۱]۔ چنانچہ مساواتِ مرد و زن کے مسئلے کے بارے میں controversy کا وہ جو دَور تھا اس میں ''روشن خیال'' طبقے کے نزدیک نمایاں ترین اور متنازعہ ترین شخص مَیں بن گیا تھا۔

لیکن جب اُسی مساواتِ مرد و زن کے مسئلہ کا ان دو اعتبارات سے یعنی قانون شہادت کی ایک شق اور مسودۂ قانون قصاص و دیت کے حوالے سے مزید ظہور ہوا تو اس پر مَیں خاموش رہا۔ یقیناً یہ ایک سوال ہے جو بہت سے لوگوں کے ذہنوں میں پیدا ہوا ہوگا اور بعض حضرات نے' جیسا کہ میں نے ابھی عرض کیا' اس کے بارے میں مجھ سے باضابطہ استفسار بھی کیا۔ میری اس خاموشی کا جو سبب ہے پہلے میں اُسے بیان کر دینا چاہتا ہوں۔ پھر قصاص و دیت کے مسئلہ پر اپنی رائے پیش کر دوں گا جو ان شاء اللہ کتاب و سنت پر مبنی ہوگی۔ اصل سبب یہ ہے کہ میری

(۱) محترم ڈاکٹر صاحب کا اس موضوع پر مبسوط و مدلل خطاب ''اسلام میں عورت کا مقام'' کے عنوان سے مطبوعہ شکل میں موجود ہے۔ (مرتب)

تشخیص یہ ہے کہ ہمارے اس معاشرے میں‘ جس کے مختلف اجزائے ترکیبی ہیں‘ جن کا ایک اجمالی ذکر میں آگے چل کر آج کی گفتگو میں کروں گا ان شاء اللہ۔ میری تشخیص یہ ہے کہ بحیثیت مجموعی اس معاشرے میں مسلمان جینے اور مسلمان مرنے کا داعیہ اور ارادہ مضمحل ہو چکا ہے۔ اصل شے یہ ہے کہ کسی فرد میں‘ کسی قوم میں یہ عزم پیدا ہو جائے کہ اُسے مسلمان جینا ہے‘ مسلمان مرنا ہے۔ جب یہ کیفیت پیدا ہو جائے گی تو اب خودؔ اس کی طرف سے یہ بات ایک بالکل معروضی انداز میں پوچھی جائے گی‘ تلاش کی جائے گی کہ اسلام کیا کہتا ہے! میں مسلمان رہنا چاہتا ہوں‘ مسلمان مرنا چاہتا ہوں‘ لہٰذا مجھے معلوم ہونا چاہیے کہ اسلام کیا ہے! اللہ کا حکم کیا ہے! اس کے رسولﷺ کا حکم کیا ہے! ہمارے ائمہ عظام جنہوں نے اسلام کو سمجھنے میں اپنی پوری پوری زندگیاں کھپا دی ہیں‘ انہوں نے فلاں مسئلہ میں کیا رائے ظاہر کی ہے! اس وقت ایسے شخص کا رویہ ہوگا اتباع کا —— اس کے اندر جذبہ ہوگا اطاعت کا‘ ایسا شخص کسی مسئلہ کے بارے میں سوال کرے گا تو اس لیے کہ اس کے اپنے اندر ایک داعیہ پیدا ہو چکا ہے کہ اُسے معلوم ہو کہ اللہ کا حکم کیا ہے! تاکہ وہ اس پر چلے۔ اُسے معلوم ہو کہ رسول اللہﷺ کی سنت کیا ہے! تاکہ وہ اس کے مطابق اپنی زندگی کا رُخ تبدیل کرے۔ اُسے معلوم ہو کہ اہل علم کا کیا کہنا ہے! تاکہ وہ اس کے مطابق عمل کرے۔ یہ رویہ اُس وقت پیدا ہوتا ہے جب کہ انفرادی یا اجتماعی سطح پر یہ ارادہ وجود میں آ چکا ہو۔ لیکن اگر یہ ارادہ موجود نہ ہو تو مختلف مسائل کے بارے میں یہ ساری بحثیں کہ قرآن کیا کہتا ہے! رسول کی سنت کیا ہے! امام ابوحنیفہ کا قول کیا ہے! امام شافعی کی رائے کیا ہے! اور امام مالک اور امام احمد بن حنبل (رحمہم اللہ) کا موقف کیا ہے! خلفائے اربعہؓ کا تعامل کیا ہے! تابعین و تبع تابعین کا مسلک کیا ہے! محض علمی بن کر رہ جاتی ہیں۔ یہ علمی controversy ہے جس کی عملی اعتبار سے کوئی افادیت نہیں ہے۔

اگر میری یہ تشخیص اور میری یہ رائے صحیح ہو کہ ہمارے معاشرے میں مسلمان جینے اور مسلمان مرنے کا جذبہ اور داعیہ مضمحل ہے‘ وہ ارادہ ہی موجود نہیں ہے۔ اشخاص کے اندر بھی شاذ ہی ایسے افراد ہمارے معاشرے میں ملیں گے‘ جن میں یہ ارادہ قوی ہے اور مضبوط ہے۔ لیکن جب ہم معاشرے کو ایک اکائی کی حیثیت سے اپنے سامنے رکھتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ اس اعتبار سے وہ ارادہ‘ جسے میں collective will کا نام دیتا ہوں‘ اگر بنظر غائر دیکھا جائے‘ تو معلوم ہوگا کہ زبانی کلامی اسلام کی مدح سرائی کے سوا عملی اعتبار سے اسلام کے حق میں وہ

اجتماعی ارادہ‘ وہ collective will کہ ہمیں مسلمان جینا ہے‘ مسلمان مرنا ہے‘ موجود نہیں ہے۔ لہٰذا اس صورتِ حال کے پیش نظر جو فی الواقع درپیش ہے‘ موجود ہے‘ اصل کرنے کا کام یہ ہے کہ اس اجتماعی ارادے کو پیدا کیا جائے۔ "The will to be a Muslim" —— ﴿اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ وَ مَحْیَایَ وَ مَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ۝﴾۔ ایک انسان پہلے یہ فیصلہ تو کرے اور اسی طریقے سے ایک معاشرہ‘ جب یہ فیصلہ ہو جائے گا تو اب شریعت کے تمام احکام کو ذہناً بالکلیہ قبول کرنا اور ان پر عمل کرنے کی پیہم اور مخلصانہ سعی و کوشش کرنا بڑا آسان کام ہو جائے گا۔ اس کی ایک بڑی نمایاں مثال ہمارے سامنے موجود ہے۔ اور قرآن مجید کے نزول کے اعتبار سے جو حکمتِ دین ہے‘ اس کا بھی یہ ایک اہم پہلو ہے کہ ابتدا میں احکام نہیں دیے گئے۔ شریعت کے احکام اور حلال و حرام کے احکام‘ کچھ نہیں دیے گئے۔ بارہ تیرہ برس جو مکہ مکرمہ کے ہیں‘ ان میں اس ارادے کو تقویت دی گئی۔ اللہ کی توحید پر‘ رسول کی رسالت پر اور وقوعِ قیامت و آخرت پر ایمان پیدا کیا گیا۔ یقین پیدا کیا گیا‘ اس ایمان و ایقان کے نتیجے میں ارادہ ابھر کر سامنے آیا اور عمل کا ایک شدید داعیہ اہل ایمان کے قلوب میں موجزن ہو گیا۔ گویا ایک "strongest collective will" وجود میں آ گئی۔

چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ ہجرت کے بعد جب اہل ایمان کا اپنا ایک معاشرہ وجود میں آ گیا تو انفرادی اور اجتماعی زندگی کو ایمان کے مقتضیات کے مطابق بسر کرنے کی اس معاشرے میں شدید طلب اور پیاس پیدا ہو گئی۔ ایک urge پوری قوت سے ابھر آیا۔ لہٰذا ہم دیکھتے ہیں کہ مدنی سورتوں میں سب سے پہلی اور سب سے طویل سورت سورۃ البقرۃ ہے۔ اس میں کئی جگہ بہت سے احکام کا ذکر اس طرح ملتا ہے ’’یَسْئَلُوْنَکَ‘‘ ’’اے نبی یہ آپ سے پوچھ رہے ہیں۔ جیسے ﴿یَسْئَلُوْنَکَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَیْسِرِ﴾ ’’(اے نبیﷺ!) یہ آپ سے پوچھتے ہیں شراب اور جوئے کے بارے میں‘‘۔ ﴿یَسْئَلُوْنَکَ مَاذَا یُنْفِقُوْنَ﴾ ’’(اے نبیﷺ!) یہ آپ سے پوچھتے ہیں کہ اللہ کی راہ میں کتنا خرچ کریں‘‘۔ ﴿یَسْئَلُوْنَکَ مَاذَا اُحِلَّ لَھُمْ﴾ ’’(اے نبیﷺ!) یہ آپ سے پوچھتے ہیں کہ کیا کیا چیزیں ان کے لیے حلال ہیں‘‘۔ پس معلوم ہوا کہ جب وہ collective will پیدا ہو گئی تو خود بخود سوال پیدا ہوئے کہ ہمیں بتایا جائے کہ زندگی کے مختلف معاملات اور مقتضیات میں ہم کیا کریں! کون سا رویہ اختیار کریں! یہ داعیہ اتنی شدت سے ابھرا کہ شریعت کے احکام معلوم کرنے کے بارے میں جستجو‘ اصرار اور

urge پیدا ہوگیا۔ تو جب یہ collective will پیدا ہوگئی۔ یہ urge اچھی طرح ابھر آیا تو اس کے بعد احکام دیے گئے اور جیسے جیسے احکام نازل ہوتے گئے تو معاشرہ گویا پہلے سے تیار تھا اور وہ قبول کرتا چلا گیا اور احکام کی تنفیذ ہوتی چلی گئی۔ ہم کو اُس معاشرے میں یہ بات قطعی نظر نہیں آتی کہ کسی مسئلہ میں کوئی controversy پیدا ہوگئی ہو۔ بلکہ سوائے سود کی حرمت کے حکم کے، اور کسی حکم کے متعلق ہمیں اُس دَور میں یہ بات بھی نظر نہیں آتی کہ کوئی عقلی دلیل بھی طلب کی گئی ہو۔ سود کی حرمت کے حکم پر یہ عقلی اعتراض وارد کیا گیا کہ وہ یہ کہتے ہیں: ﴿اِنَّمَا الْبَیْعُ مِثْلُ الرِّبٰوا﴾ کہ بیع میں بھی تو کچھ منفعت ہوجاتی ہے کچھ نفع ہوجاتا ہے۔ سو روپے کی چیز خرید کر ایک سو دس روپے میں بیچ دی تو دس بچ گئے، تو اگر سو روپے کسی کو قرض دے کر اس سے ایک سو دس لے لیے تو آخر اس میں فرق کیا ہے [1]۔ اس کے سوا ہمیں نظر نہیں آتا کہ کچھ controversies اُٹھی ہوں اور عقلی استدلالات یا عقلی اشکالات پیش اور وارد کیے گئے ہوں اور بحث و تمحیص کے دروازے کھل گئے ہوں۔ اس دَور میں جس طریقے سے ''دانشوروں'' اور علماء کے مابین دینی مسائل کے بارے میں بڑی ہی رنگ آمیزیوں اور حاشیہ آرائیوں کے ساتھ رنگا رنگ اختلافی مضامین چھپتے اور اخبارات کی زینت بنتے ہیں، اس قبیل کی کسی شے کا اُس دَور میں کوئی سراغ نہیں ملتا۔ اس لیے کہ پہلے وہ will پیدا کر دی گئی، وہ ارادہ پیدا کر دیا گیا تھا جس کے بعد اب جو بھی احکام دیے گئے تو ''سرِ تسلیم خم ہے'' والا رویہ اختیار کیا گیا اور ان کو اس طور سے قبول کیا گیا کہ جیسے وہ پہلے ہی سے منتظر تھے کہ وہ حکم آئے اور وہ قبول کریں اور فوراً اس پر عمل شروع کر دیں۔

بدقسمتی سے ہمارے معاشرے میں کم سے کم اجتماعی سطح پر وہ collective will موجود نہیں ہے۔ ہے بھی تو وہ بہت مضمحل ہے۔ اس کی وجہ کیا ہے! اس کو بھی سمجھ لیجیے۔ اصل میں مغرب و مشرق کا جو تصادم ہے اس کی تاریخ ویسے تو قریباً دو سو برس کی تاریخ ہے۔ جیسے ہی یورپ کے ممالک سے انگریز آئے، فرانسیسی آئے، اور ولندیزی آئے، لیکن ہوتے ہوتے

(۱) اس کے جواب میں کوئی عقلی دلیل دینے کے بجائے فرمایا گیا: ﴿وَ اَحَلَّ اللّٰهُ الْبَیْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا ط﴾ ''اللہ نے بیع کو حلال اور ربا کو حرام قرار دیا ہے''۔ یعنی ایک بندۂ مومن کے لیے تعمیلِ حکم کے واسطے یہ دلیل کافی ہے کہ حلال و حرام قرار دینے کا اختیار صرف اللہ کو ہے جس پر تم ایمان لانے کے مدعی ہو۔ (مرتب)

انگریز کے سوا دوسری اقوام کا عمل دخل ختم ہوگیا یا نہ ہونے کے برابر رہ گیا، صرف انگریز قوم کا برصغیر پاک و ہند پر پورا تسلط قائم ہوگیا اور پورا ملک براہِ راست اس کی سیاسی غلامی میں چلا گیا۔ جیسے ہی یہ معاملہ ہوا، ویسے ہی تصادم شروع ہوگیا۔ بالکل نئی تہذیب آئی تھی۔ خدا ناآشنا مادہ پرستانہ تہذیب۔ اس تہذیب میں چمک دمک تھی۔ وہ جو علامہ اقبال نے کہا ہے ؎

نظر کو خیرہ کرتی ہے چمک تہذیبِ حاضر کی
یہ صناعی مگر جھوٹے نگوں کی ریزہ کاری ہے

لیکن یہ تو ایک بالغ نظر شخص ہی دیکھ سکتا تھا کہ یہ جھوٹے نگ ہیں۔ ہمارے یہاں ایک خاص طبقے نے اس تہذیب پر لبیک کہا اور اُسے اختیار کیا۔ یہ بھی بلا سبب نہیں ہوا۔ اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ وہ ایک حکمران قوم کی تہذیب تھی۔ یہ ایک محکوم قوم کے افراد تھے۔ محکوم قوموں میں حاکم قوم سے مرعوبیت ہوتی ہے۔ لہٰذا ہمارے ایک طبقے نے اس تہذیب کو، اس کے اصول کو، اس کے مبادی کو، اس کے مظاہر کو، اور اس کے فکر و فلسفہ کو ایک مرعوب ذہنیت کے ساتھ قبول کرنا شروع کیا۔ پھر یہ کہ یہ مظہر (phenomenon) مشترکہ طور پر آپ کو ہر محکوم قوم میں نظر آئے گا کہ محکوم قوم میں سے جو طبقہ حکمران قوم کی تہذیب کو آگے بڑھ کر قبول کرتا ہے، اپنے آپ کو اسی رنگ میں رنگنے اور اُسی سانچے میں ڈھالنے کی شعوری کوشش کرتا ہے، تو وہ طبقہ حاکم قوم کے قریب ہو جاتا ہے اور اس سے مفادات حاصل کرتا ہے، اس کی حکومت کی مشین میں پرزہ بنتا ہے، اس سے وفاداری کا معاملہ کرتا ہے اور اس سے خطابات حاصل کرتا ہے۔ اس لیے کہ اس وقت دنیوی ترقی کے لیے یہی راستہ سب سے زیادہ منفعت بخش ہوتا ہے۔ چونکہ اس طبقے کے لیے معیشت کے دروازے کشادہ ہوتے چلے جاتے ہیں۔ جو لوگ دُور رہیں گے، پیچھے رہیں گے، قریب نہیں آئیں گے وہ معاشی دوڑ میں بھی پیچھے رہ جائیں گے اور ان کا social status بھی کم رہ جائے گا۔

نتیجتاً ہمارے یہاں بھی ایک طبقہ ایسا پیدا ہوا جس نے اپنے آپ کو بالکلیہ انگریزی تہذیب میں رنگ لیا۔ اور ہمارے ایک بہت بڑے لیڈر کے قول کے مطابق اس طبقہ کا طرزِ عمل یہ ہو گیا کہ چمڑی کی رنگت کے سوا ہمیں ہر اعتبار سے ''انگریز'' بن جانا ہے۔ یہ گویا کہ objective تھا جو اس دَور میں دیا گیا تھا۔ یہ سر سید احمد خاں کا قول ہے جو میں آپ کو سنا رہا ہوں کہ ''سوائے چمڑی کی رنگت کے''۔ اس لیے کہ وہ تو اختیار سے باہر کی شے ہے اُسے بدلا

نہیں جا سکتا۔ ''مسلمانوں کو چاہیے کہ انگریز بن جائیں اور انگریزی تہذیب اختیار کر لیں''۔ تو یہ ایک طبقہ تھا جو اگرچہ ایک محدود طبقہ تھا' بالکل اقلیت میں تھا' تعداد کے اعتبار سے بہت قلیل تھا۔ لیکن چونکہ حکمران طاقت کے قریب تر یہی طبقہ ہوتا چلا گیا۔ لہٰذا اس کا نفوذ اور اثر ہمارے معاشرے میں مسلسل بڑھتا چلا گیا۔ تو یہ تصادم ہمارے یہاں اس وقت سے شروع ہو چکا تھا۔

لیکن آج میں چاہتا ہوں کہ ایک خاص بات آپ نوٹ کر لیں۔ وہ یہ کہ ہمارے معاشرے پر مغربی تہذیب کا بحیثیت مجموعی عمل دخل انگریز کی براہِ راست سیاسی غلامی کے دَور میں اتنا نہیں ہوا' جتنا کہ آزادی کے بعد ہوا ہے۔ یہ جو سینتیس (۳۷) برس ہم نے آزادی کے بتائے ہیں' ان میں یہ عمل دخل بہت زیادہ بڑھ گیا ہے۔ بہت وسیع پیمانے پر ہوا ہے۔ اس لیے کہ جیسا کہ میں نے ابھی عرض کیا کہ اس وقت صورتِ حال یہ تھی کہ وہ جو ایک محدود طبقہ تھا اور اس کا انگریزی حکومت سے بڑا قریبی تعلق تھا' لہٰذا ہمارے عوام ان کو پسند نہیں کرتے تھے۔ عوام الناس کو اس طبقے سے عموماً نفرت تھی۔ دوسرے یہ کہ محکوم قوم کے جذبات حکمران قوم کے لیے خیر سگالی اور پسندیدگی کے نہیں ہوا کرتے۔ مزید برآں عالم اسلام کو انگریزی حکومت کی وجہ سے جو نقصان پہنچا' اس کی وجہ سے بھی بحیثیت مجموعی ہماری قوم کے اندر انگریز اور انگریزی تہذیب سے واضح نفرت برقرار رہی۔ تیسرا سبب یہ تھا کہ اُس وقت اس جدید تہذیب کے ساتھ کوئی بہت ہی قربت والا رابطہ (close contact) نہیں تھا۔ اس دَور میں آمد و رفت اور رسل و رسائل کے ذرائع اتنے آسان نہیں تھے۔ انتہائی قلیل' معدودے چند لوگ ہوتے تھے جو ولایت جا کر تعلیم حاصل کرتے تھے۔ آٹے میں نمک کی نسبت سے بھی شاید کم۔ وہ آتے تھے مغربی تہذیب میں پورے رنگے رنگائے۔ ولایت پلٹ لوگ تو یقیناً اسی تہذیب کو بالکلیہ اختیار کر کے آتے تھے۔ اِلا ماشاء اللہ۔ لیکن تعداد کے اعتبار سے وہ اتنے کم ہوتے تھے کہ اگر مجموعی لحاظ سے ہم جائزہ لیں تو ہمیں نظر آئے گا کہ اس دَور میں ان کا معاشرے پر بہت کم اثر تھا۔ بلکہ عوام الناس ان کو طنزیہ انداز میں پھبتی کے طور پر ''لندن پلٹ'' کہا کرتے تھے۔

یہ معاملہ برصغیر پاک و ہند کی آزادی کے بعد ہوا ہے کہ ایک طرف تو اب جو ہمارے حکمران ہیں' وہ ہم میں سے ہیں۔ لیکن وہ کلیۃً اُسی تہذیب کے پروردہ ہیں' اُسی تہذیب میں رنگے ہوئے ہیں' اُسی تہذیب کے دلدادہ ہیں' اور اُسی کو انہوں نے عملاً اختیار کیے رکھا ہے۔ اور ہمارے سرکاری محکمہ جات کے عمال یعنی (bureaucracy) ہے یا ہماری ملٹری کی جو

top class ہے' یہ سب ایک ہی ہیں۔ یہ سب ایک ہی طبقے سے تعلق رکھنے والے افراد ہیں۔ یہی اونچا طبقہ بہت سے اعتبارات سے ہمارے یہاں انگریز کا وارث بنا ہے۔ ان میں SIR رہے ہیں۔ اب ان کی اولاد ہے۔ خان صاحبوں اور خان بہادروں کی نسل بھی چل رہی ہے ان سب کی اکثریت اُسی انگریزی تہذیب کے رنگ میں مزید رنگ گئی ہے۔ جو ان کے آباء و اَجداد نے اختیار کی تھی۔ انگریزی حکومت کے دَور میں جو طبقہ انگریز سے قریب تر تھا' وہی طبقہ یا اُسی کی اولاد ہے جو اکثر و بیشتر ہماری حکومتی اور قومی سطح پر جو اجتماعی زندگی ہے' اس میں سب سے زیادہ اونچے مناصب پر فائز اور سب سے زیادہ فعال یہی عنصر ہے۔ اب چونکہ یہ لوگ ہم ہی میں سے ہیں تو اُس وقت انگریزی تہذیب کے فروغ اور اثر و نفوذ میں کم از کم وہ نفرت روک اور آڑ بنی ہوئی تھی جو حاکم اور محکوم قوم کے مابین طبعاً موجود ہوتی ہے۔ اب وہ رکاوٹ دُور ہو گئی۔ نفرت کا وہ barrier بھی راستہ میں سے ہٹ گیا۔ اب تو وہ ہم میں سے ہیں۔ ہمارے معاشرے کے افراد ہیں "They are our own kith and kin" ان میں سے کسی کے نام کے ساتھ سید لکھا ہوا ہے' وہ سید زادہ ہے' چاہے وہ فکری اور عملی اعتبار سے سرتا پا مغربی تہذیب میں غرق ہو چکا ہو' لیکن بہرحال نسلی اعتبار سے وہ سید ہے۔ کوئی ہے جو خلفائے راشدینؓ یا دیگر اصحابِ رسول علی صاحبہم الصلوٰۃ والسلام و رضوان اللہ علیہم اجمعین اور اہل بیت رحمہم اللہ کے اسمائے گرامی اور خاندانوں سے خود کو منسوب کرتا ہے اس کے ناموں کے ساتھ صدیقی' فاروقی' عثمانی' علوی' حسنی' حسینی' زیدی' جعفری وغیرہم کے لاحقے ہوتے ہیں۔ لیکن فکر و عمل کے اعتبار سے ان کے نام کے سوا اسلام سے کوئی تعلق نہیں ہوتا الاّ ماشاء اللہ۔ یہ لوگ مغربی فکر اور مغربی تہذیب کے عملاً بھی خاموش داعی اور نقیب ہوتے ہیں اور قولاً بھی۔ پھر اسی طبقے سے عموماً اور اکثر وہ لوگ ابھرتے ہیں جو ہمارے یہاں ''دانشور'' کہلاتے ہیں۔ تو اس طرح حاکم قوم کی تہذیب سے' اس کی فکر سے محکوم قوم کو جو طبعاً نفرت ہوتی ہے' وہ barrier اب ہمارے معاشرے میں سرے سے موجود ہی نہیں ہے۔ لہٰذا انگریزی حکومت کے محکمہ جات کے جو وارث بنے ہیں ان کا معاملہ وہ ہے جو ہمارے یہاں بطور محاورہ کہا جاتا ہے کہ ''شاہ سے بڑھ کر شاہ کا خیر خواہ''۔ تو یہ طبقہ درحقیقت وہ ہے جو انگریزی دَور میں انگریز سے بڑھ کر مغربی تہذیب کا دلدادہ تھا۔ آزادی کے بعد اس میں کوئی کمی یا اصلاح کے عمل کے بجائے وہ اور ان کی اولاد اسی میں پختہ تر ہوتی چلی گئی۔ الا ماشاء اللہ۔

دوسرا عملی معاملہ یہ ہوا کہ ذرائع رسل ورسائل آسان ہو گئے' آمد و رفت میں سہولت پیدا ہو گئی ہے آزادی کے بعد سے ہمارے لوگ کثیر تعداد میں یورپ اور امریکہ گئے ہیں اور وہاں سے اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے آئے ہیں تو تعلیم کے ساتھ وہ وہاں کے افکار اور تہذیبی اقدار کے جراثیم بھی ساتھ لے کر آئے [1]۔ ظاہر بات ہے کہ ان جراثیم کو ہمارے معاشرے میں پھیلنا ہی پھیلنا تھا اور ان حضرات کے بود و باش' وضع قطع اور خیالات ورجحانات' میلانات وتاثرات کا اثر ہمارے معاشرے پر پڑنا ہی پڑنا تھا۔ لہٰذا اصل تصادم اس وقت ہو رہا ہے۔ اگرچہ ہم مغرب کی براہِ راست غلامی سے آزاد ہو چکے ہیں' لیکن مغربی افکار اور اس کی تہذیبی اقدار کا غلبہ اس وقت زیادہ گہرا ہوتا چلا جا رہا ہے۔ ان کے اثرات اب زیادہ نمایاں اور ظاہر ہو رہے ہیں۔ اسی وجہ سے اب وہ تصادم اور گہرا اور شدید ہو گیا ہے۔ یہ ہیں وہ اسباب جن کے پیشِ نظر آپ جب اجتماعی سطح پر اپنے معاشرے کا جائزہ لیں گے تو آپ اس نتیجہ تک پہنچ جائیں گے کہ وہ "collective will to be a Muslim" پہلے کے مقابلے میں مضمحل تر ہو چکی ہے۔ پہلے سے زیادہ کمزور ہو چکی ہے۔ اس لیے کہ وہ طبقہ بہر حال ہمارے معاشرے میں زیادہ مؤثر طبقہ ہے۔ اسے اپنے مرتبے' اپنے مقام اور اپنی حیثیت کی وجہ سے معاشرے پر اثر انداز ہونے کے مواقع زیادہ حاصل ہیں۔

تیسرا عملی معاملہ یہ ہوا کہ ذرائع ابلاغ نے نہایت وسعت حاصل کر لی۔ پچھلے دَور میں اگر کوئی روزنامہ یا ماہنامہ یا ہفت روزہ دس پندرہ ہزار کی تعداد میں شائع ہوتا تھا تو وہ کثیر الاشاعت کہلاتا تھا۔ اب اخبارات ورسائل لاکھوں کی تعداد میں شائع ہوتے ہیں' بعض ایک ہی وقت میں چند دوسرے بڑے شہروں سے بھی شائع ہوتے ہیں۔ پھر ان کی تعداد بھی پہلے سے کہیں زیادہ ہو رہی ہے۔ اب اکثر روزناموں' ماہناموں' خاص طور پر ڈائجسٹوں کی تعدادِ اشاعت لاکھوں سے متجاوز ہے۔ ڈائجسٹوں کی اتنی کثرت ہے کہ ان کے ناموں کا شمار اچھا خاصا مشکل کام ہے۔ ابلاغ کے اس ذریعہ (media) پر بھی اِسی مغربی تہذیب و افکار سے مرعوب ذہنیت رکھنے والوں کی اکثریت قابض ہے۔ پھر اخبارات ورسائل کی اشاعت اب باقاعدہ

(۱) جناب اکبر الٰہ آبادی مرحوم کا بڑا پیارا شعر ہے جو اس صورتِ حال پر صادق آتا ہے ؎

ہم تو سمجھے تھے کہ لائے گی فراغت تعلیم
کیا خبر تھی کہ چلا آئے گا الحاد بھی ساتھ!

ایک انڈسٹری بن گئی ہے۔ ان کے مابین مسابقت کی دوڑ لگی ہوئی ہے' لہٰذا ہر ایک اس کوشش میں مصروف نظر آتا ہے کہ عوام الناس کو لذت کوشی اور اباحیت پسندی میں مزید مبتلا کر کے زیادہ سے زیادہ مالی منفعت حاصل کرے۔ ان کی بلا سے کہ ہماری قوم کے افراد میں مسلمان جینے اور مسلمان مرنے کے اجتماعی ارادے کو ضعف پہنچتا ہے تو پہنچا کرے۔ وہ مزید مضمحل ہوتا ہے تو ہوا کرے۔ بلکہ یہ بات منفعت کے لحاظ سے ان کے لیے مفید ہے۔ لہٰذا ان کو اس کی قطعی پرواہ نہیں ہے کہ قوم کس پستی میں گر رہی ہے۔ یہی حال اُن ذرائع ابلاغ کا ہے جو مکمل طور پر حکومت کے زیر انصرام وانتظام ہیں۔ یعنی ریڈیو اور ٹیلی ویژن۔ ان میں ڈراموں' راگ اور موسیقی' رنگ ترنگ اور اسی قبیل کے تفریحی پروگراموں کی پذیرائی ہوتی ہے جو بڑی فنکاری سے اور غیر محسوس طریق پر معاشرے میں مسلمان جینے اور مسلمان مرنے کے اجتماعی ارادے میں ضعف کا زہر پہنچا رہے ہیں۔ میں تو ٹی وی دیکھتا نہیں' الحمد للہ میرے یہاں ٹی وی کا گزر ہی نہیں ہوا ہے' لیکن دیکھنے والے بتاتے ہیں کہ رہی سہی کسر وہ اشتہارات پوری کر دیتے ہیں جو کثرت کے ساتھ دکھائے جاتے ہیں۔ پھر جو مذہبی پروگرام ہوتے ہیں وہ برائے وزنِ بیت ہوتے ہیں اور یہ دکھانے کے لیے ہوتے ہیں کہ ٹی وی پروگراموں میں اتنے گھنٹے مذہبی پروگراموں کے لیے مختص ہیں۔ اس میں ایسے دینی پروگراموں کی رسائی مشکل ہے جن سے قوم کو ایسا مثبت پیغام مل سکے جس سے اس میں مسلمان جینے اور مسلمان مرنے کا اجتماعی داعیہ پیدا ہو۔ پھر ان ذرائع ابلاغ پر مؤثر ترین گرفت اور hold اِسی طبقے کی اکثریت کا ہے جن کے اذہان وقلوب پر خدا ناآشنا مغربی افکار اور مغربی تہذیب کی بالادستی نقش وثبت ہے۔ اس کی اکثریت کا اسلام سے محض مسلمانوں کے سے نام کے سوا شاید ہی کوئی عملی تعلق ہو تو ہو۔ یہ ہیں وہ اسباب اور یہ ہے اطراف وجوانب سے ہمارے معاشرے میں یلغار جس کی وجہ سے اگر اجتماعی سطح پر جائزہ لیں گے تو آپ کو صاف نظر آئے گا کہ "collective will to be a Muslim" وہ پہلے کے مقابلے میں مضمحل تر ہو چکی ہے' کمزور ہو چکی ہے اور یہ عمل مسلسل جاری ہے۔ لہٰذا نتیجہ یہ نکلا کہ فی الوقت ہمارا معاشرہ مغربی تہذیب' مغربی اقدار' مغربی تمدن' مغربی بود و باش اور مغربی طرزِ فکر کی زیادہ گرفت میں ہے اس کی بنسبت جبکہ آج سے چالیس برس قبل ایک مغربی قوم ہم پر براہِ راست حکمرانی کر رہی تھی۔

جب تک وہ اجتماعی ارادہ' وہ "collective will" پیدا نہیں ہو جائے گی اور یہ

بحثیں چھڑ جائیں گی تو وہی کچھ ہوگا جو ہو رہا ہے۔ اس لیے کہ یہ تو ایک علمی بحث ہے اور چونکہ اذہان تیار نہیں‘ دلوں میں حقیقی ایمان کی جوت موجود ہی نہیں۔ الا ماشاءاللہ۔ اور وہ آمادگی دل میں پیدا ہی نہیں ہوئی ہے کہ یہ معلوم کیا جائے کہ فلاں مسئلے میں اسلام کا حکم کیا ہے تاکہ اس پر عمل کریں۔ لہٰذا لا حاصل بحث ومباحثہ اور controversy کے علاوہ کوئی اور نتیجہ برآمد نہیں ہو رہا۔

اب یہاں چند سوالات پیدا ہوتے ہیں۔ پہلا یہ کہ اس collective will کو اسلام کی طرف لانے کا طریقہ کیا ہے! دوسرے یہ کہ اس کا ظہور کس طور سے ہوتا ہے! یہ کیسے معلوم ہوتا ہے کہ کسی معاشرے میں collective will اسلام کے حق میں پیدا ہو چکی ہے‘ اسلام کے رُخ کی طرف آ چکی ہے! ان دونوں سوالات پر تفصیلی گفتگو تو ان شاءاللہ میں آئندہ کسی جمعہ میں کروں گا۔ اس وقت اجمالاً عرض کر رہا ہوں کہ نظری طور پر اس کے دو طریقے ہیں۔ ایک تو یہ کہ انتخابات کا عمل کسی ملک میں جاری ہو اور صحیح نہج پر جاری ہو۔ یہ نہ ہو کہ جس طرح گاڑی knocking کرتی ہو‘ قدم قدم پر رکتی ہو‘ ایک انتخاب ہو یا ہونے والا ہو تو ایک ہنگامہ بپا ہو جائے جس کے نتیجے میں فوج take over کر لے۔ پھر کسی نئے اسلوب اور نئے اصولوں پر انتخابات کا ڈھونگ رچایا جائے اور پھر اس کی وجہ سے کوئی ہنگامہ اُٹھ کھڑا ہو۔ پہلے کی جگہ دوسرا مارشل لاء آ جائے اور فوج کو تسلسل یا وقفے وقفے سے اقتدار اپنے ہاتھ میں رکھنے کا موقعہ اور جواز ملتا رہے۔ ایسا نہیں‘ بلکہ اگر کسی ملک میں واقعتاً انتخابی عمل جاری ہے تو اس مسلسل انتخابی عمل کے ذریعے بھی collective will کا اظہار ہو سکتا ہے‘ اس کا ظہور ہو سکتا ہے۔ اس طرح معلوم ہوتا چلا جائے گا کہ لوگوں کا رخ کس طرف ہے! وہ کیا چاہتے ہیں! ان کا رجحان کس طرف ہے! میرے نزدیک نظری طور پر یہ بھی ایک طریقہ ہے لیکن میرا تاثر یہ ہے کہ ہمارے ملک کے موجودہ خاص حالات میں یہ طریقہ قریباً ناممکن العمل معاملہ بن گیا ہے۔ اس کی تفصیل‘ جیسا کہ میں نے عرض کیا‘ آئندہ کبھی عرض کروں گا۔

اب اس کے بعد دوسرا طریقہ رہ جاتا ہے‘ جسے آج کل ”انقلاب“ کا نام دیا جا رہا ہے۔ مجھے معلوم ہوا کہ میری عدم موجودگی میں جب کہ میں بیرون ملک گیا ہوا تھا‘ اسی شہر لاہور کے ایک اعلیٰ ترین ہوٹل میں ایک بڑی آن بان اور بڑی شان وشوکت کے ساتھ ایک کانفرنس ہوئی ہے‘ اگرچہ تا حال پتا نہیں چل سکا کہ وہ کس نے منعقد کی تھی‘ اس کے داعی کون لوگ تھے! لیکن

معلوم ہوا ہے کہ اس کانفرنس میں بڑی دھواں دھار تقاریر ہوئی ہیں کہ یہاں ایران کی طرح کا انقلاب آنا چاہیے اور ہمیں اس میدان میں ایران کی قیادت کو قبول کر لینا چاہیے۔ اس موضوع پر کہ ”کیا پاکستان میں ایرانی طرز کا انقلاب ممکن ہے“ میں ان شاءاللہ آئندہ جمعہ کو کچھ عرض کروں گا۔ اس وقت میں اس موضوع کو چھیڑنا نہیں چاہتا‘ لیکن یہ عرض ضرور کروں گا کہ معاشرے کی collective will کے ظہور کا دوسرا طریقہ یقیناً انقلابی طریقہ ہے۔

اب سوال پیدا ہوگا کہ انقلابی طریقہ سے مراد کیا ہے! وہ یہ کہ اگرچہ ایک نقطہ نظر اور ایک ideology کے حامل اور قائل لوگ عددی اعتبار سے اقلیت میں ہوں‘ لیکن وہ دعوت وتبلیغ سے‘ اپنی محنت سے‘ اپنے ایثار سے‘ اپنی قربانیوں سے‘ اپنی تنظیم سے‘ مشقت جھیل کر‘ مصائب برداشت کر کے وہ موثر اور effective ہونے کے اعتبار سے ایک اکثریت کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ یہ لوگ effective majority ہو جایا کرتے ہیں۔ اگرچہ numerically وہ ایک اقلیت ہوتے ہیں‘ لیکن وہ اپنی جدوجہد‘ اپنے ایثار وقربانی‘ اپنی استقامت ومصابرت اور اپنے موقف پر ایمان وایقان کی طاقت سے کامیاب ہوتے ہیں اور اپنی پسند کا نظام قائم کر دیتے ہیں۔ یہ انقلابی طریقہ ہے۔ لہٰذا کسی بھی collective will کے ظہور کے نظری طور پر یہ دو طریقے ہیں۔ ایک یہ کہ اگر انتخابی عمل صحیح انداز اور صحت مند اصولوں پر جاری ہے تو وہ بھی ایک index ہے‘ ایک اشاریہ ہے کہ لوگ کیا چاہتے ہیں! لوگوں کا رُخ کس طرف ہے! لوگوں کے رجحانات ومیلانات کیا ہیں! اور اگر یہ صورتِ حال نہیں ہے تو ایک ہی راستہ رہ جاتا ہے اور وہ انقلابی راستہ ہے۔ بہرحال اس کے بارے میں اگر اللہ کو منظور ہوا تو گفتگو کسی آئندہ صحبت میں ہوگی۔

اس وقت ہمارے یہاں ان دو میں سے کسی بھی ذریعے سے اسلام کے حق میں collective will کا ظہور نہیں ہوا۔ بلکہ بالفعل صورتِ حال یہ ہے کہ ایک مارشل لاء گورنمنٹ ہے۔ اس کی legitimacy‘ اس کا قانونی استحقاق ہی متنازعہ فیہ ہے‘ questionable ہے کہ یہ حکومت ہے تو کیوں ہے! آئی تھی تو کس دلیل سے آئی تھی! کس وعدہ کے تحت آئی تھی! اور اس حکومت کو اس وقت کی سپریم کورٹ نے تسلیم کیا تھا تو کن کڑی شرائط کے ساتھ کیا تھا! کیا کیا حد بندیاں اس پر عائد کی تھیں! لیکن یہ حکومت ہے کہ جس نے اپنے تسلسل کے لیے وجہ جواز یہ قرار دی ہے کہ ہم نے اس ملک میں اسلام قائم ونافذ کرنا ہے‘ لہٰذا اس نے اس وجہ جواز کو ثابت کرنے کے لیے کچھ نیم دلانہ قسم کے اسلام کے لیے اقدامات کیے ہیں‘ جن کی وجہ سے قیل و

قال، بحث ومباحثہ اور controversies اُبھر آئی ہیں۔اس کے سوا اسلام کی طرف کوئی مثبت (positive) پیش رفت نہیں ہو رہی، بلکہ ہر معاملے میں نظر یہ آ رہا ہے کہ دونوں نظریات کے حاملین کو شاید یہ اطمینان دلایا جا رہا ہے کہ ایک طرف یہ کہا جاتا ہے کہ ہم تمہارے ساتھ ہیں اور دوسری طرف والوں کو اطمینان دلایا جاتا ہے کہ آپ مطمئن رہیں، میں کٹر آدمی نہیں ہوں۔ایک طرف علماء کو اطمینان دلایا جاتا ہے کہ میں یہاں اسلام لانا چاہتا ہوں۔ دیکھو میری نماز، میرا روزہ، ٹوپی مصلے کا میرے ساتھ رہنا، یہ دین نہیں تو اور کیا ہے۔ میرا پختہ عزم ہے کہ یہاں مضبوط بنیادوں پر اسلام کو نافذ کروں۔ دوسری طرف یہ ہے کہ ایکٹروں اور ایکٹرسوں، جو اسلامی نقطہ نظر سے کسی بھی اکرام کے بہر حال مستحق نہیں ہیں، کو یہ اطمینان دلایا جاتا ہے کہ میں اتنا کٹر نہیں ہوں آپ کو مجھ سے گھبرانا نہیں چاہیے۔ پھر ان کی جس طرح حکومت کے ایک ایوان میں پذیرائی ہوئی ہے اور صدر مملکت صاحب نے جن کی منصبی مصروفیات کا سب کو علم ہے، ان ایکٹروں اور ایکٹرسوں کے ساتھ تبادلہ خیال میں اخباری رپورٹ کے مطابق قریباً سات گھنٹے گزارے ہیں۔ پھر جس گرم جوشی کے ساتھ ملک کے منصب کے لحاظ سے سب سے اعلیٰ مقتدر اور بلند و بالا شخصیت نے اس طائفے کا استقبال کیا ہے، وہ ان لوگوں کے لیے ایک لمحہ فکریہ ہے جو اس خوش فہمی میں مبتلا ہیں کہ اس حکومت کے ہاتھوں پاکستان میں اسلام آ رہا ہے۔ [(۱)]

یہ جو تضادات ہیں، یہ جو دوعملی ہے، یہ جو دورُخاپن ہے اور یہ جو دوطرفہ عمل ہے اس نے ایک طرف تمام مخلص محبّ دین اور محبّ پاکستان عناصر میں شدید مایوسی پیدا کر دی ہے، دوسری طرف اسلام کے ان مسلّمات کے بارے میں جو چودہ صدیوں سے مجمع علیہ اور متفق علیہ چلے آ رہے ہیں، ناقابل برداشت نوعیت کی controversies کا سلسلہ شروع کر دیا ہے جس کے باعث ہمارے تعلیم یافتہ خاص طور پر نئی نسل کے تعلیم یافتہ طبقے میں سخت ذہنی انتشار بڑھتا چلا جا رہا ہے۔ وہ یہ سمجھنے سے قاصر ہیں کہ اسلام کس کو سمجھا جائے، اُسے جو خیر القرون سے نسلاً

(۱) یاد ہوگا کہ جب مارچ ۱۹۸۳ء میں ڈاکٹر صاحب کی اس رائے پر کہ عورتوں کا دائرہ کار اسلام نے بالکل علیحدہ معین کیا ہے اور مخلوط اداروں میں خواتین کا مردوں کے شانہ بشانہ کام کرنا صریحاً اسلام کے خلاف ہے۔ اُس پر مغرب زدہ خواتین نے جو ہنگامہ آرائی کی تھی تو ان کو اطمینان دلانے کے لیے اخباری رپورٹوں کے مطابق جناب صدر مملکت نے فرمایا تھا کہ ''اتھارٹی میرے پاس ہے ڈاکٹر اسرار کے پاس نہیں ہے۔'' (مرتب)

بعد نسلٍ علمائے حقانی کے توسط سے نقل ہوتا ہوا ہم تک پہنچا ہے یا اُسے جو آج کل کے نام نہاد جدید مفسرین بالخصوص جدید ''مفسرات'' کی جانب سے پیش کیا جا رہا ہے۔ جن میں شاید ہی چند افراد ایسے ہوں جو قرآن حکیم کی ایک چھوٹی سی سورت کی بھی صحیح طور پر تلاوت کر سکیں۔ یا ان کو دین کے روزمرہ کے معمولات کی ذرا بھی شدبد ہو۔

آپ بنظر انصاف Islamisation کے اس process کا جائزہ لیں، جن کا پانچ چھ سال سے بڑا چرچا ہے تو آپ کو صاف نظر آئے گا کہ ہر قدم نیم دلی سے اور انتہائی ناقص انداز میں اٹھایا گیا ہے، حدود آرڈیننس کا جو حشر ہوا وہ کس سے پوشیدہ ہے! کیا سرقہ پر آج تک کسی کو قطع ید کی سزا ملی ہے! کیا ڈاکہ زنی کے مجرموں میں سے کسی پر اسلامی حد جاری ہوئی ہے! زکوٰۃ آرڈیننس کا جو معاملہ ہے اس پر میں گزشتہ تقریر میں اظہار رائے کر چکا ہوں۔ اسلام کے کسی معاملہ میں بھی فیصلہ کن انداز کہیں بھی موجود نہیں ہے، ورنہ آپ غور کیجیے کہ اخباری اطلاع کے مطابق اسلام کے قصاص و دیت کے قانون کو مدون کر کے اپنی مکمل رپورٹ اور سفارشات اسلامک آئیڈیالوجی کونسل نے چار سال قبل صدر مملکت کی خدمت میں پیش کر دی تھی۔

یہ اسلامی نظریاتی کونسل کن لوگوں پر مشتمل ہے! انہی لوگوں پر جنہیں اس حکومت نے اور اس کے جو بھی کارپرداز اور اربابِ حل و عقد ہیں، انہوں نے اس کونسل کے ارکان کو یہ سمجھ کر نامزد کیا تھا کہ یہ دین کے جاننے والے ہیں، سمجھنے والے ہیں۔ ہمارے یہاں جو مختلف فقہی مسالک یا فرقے ہیں یہ حضرات ان کے معتمد علیہ نمائندے ہیں۔ انہیں دین کا صحیح فہم اور شعور رکھنے والے جو بھی نظر آئے ان کو اسلامک آئیڈیالوجی کونسل میں رکھا۔ پھر علماء کے ساتھ اپنی صوابدید کے مطابق اس ملک ہی کے نہیں بلکہ دوسرے چند اہم ممالک کے دساتیر اور قوانین سے بخوبی واقف ماہرینِ قانون و دستور کو بھی شامل کیا۔ اس کونسل نے متفقہ طور پر مسودہ تیار کر دیا۔ معلوم ہوا کہ تمام فقہی مکاتب فکر اور فرقوں کے علماء کی تائید بھی اُسے حاصل تھی۔ جدید آئین و دستور کے ماہرین کی توثیق بھی اُسے حاصل تھی۔ گویا ایک متفقہ سند حکومت کو حاصل ہوگئی تھی کہ قصاص اور دیت کے مسئلہ میں اسلام کے مجمع علیہ قوانین یہ ہیں۔ اس کے بعد ایک ''شوریٰ'' وجود میں آ گئی تو یہ مسودہ اس کے سامنے رکھ دیا گیا۔ شوریٰ میں اس پر بحث ہوئی تو معلوم ہوا کہ یہاں تو دونوں ذہن یعنی دینی اور سیکولر ذہن رکھنے والے لوگ جمع ہیں۔ یہاں تو وہ وکلاء بھی ہیں جو اسلام پر پھبتیاں چست کرنے سے بھی باز نہیں رہتے۔ پھر وہ علماء دین بھی

ہیں کہ بہرحال جن کے فہم دین پر لوگوں کی اکثریت کو اعتماد ہے۔ لہٰذا محسوس ہوا کہ یہاں تو
معاملہ آسانی سے نہیں چکے گا' تو ایک کمیٹی بنا دی گئی۔ کمیٹی کی رپورٹ آئی تو پھر ایک طوفان اٹھ
کھڑا ہوا۔ معلوم ہوا کہ اس کمیٹی کے چیئرمین صاحب پر علماء کی طرف سے شدید الزامات عائد
کیے گئے۔ علماء میں سے جو حضرات اس کمیٹی میں شامل تھے انہوں نے رپورٹ کو بالکلیہ
disown کر دیا کہ یہ رپورٹ ہماری نہیں ہے' اس میں ہمارے نقطۂ نظر کو بالکل نظر انداز کر دیا
گیا ہے۔ پھر ایک کمیٹی تشکیل دی گئی۔ اس نے جو رپورٹ دی' وہ کابینہ میں زیر بحث آئی لیکن
وہاں بھی اتفاق رائے نہیں ہو سکا۔ نتیجہ یہ ہے کہ معاملہ تاحال معلق ہے۔ البتہ اخباری اطلاعات
سے معلوم ہوا ہے کہ اب اس مسئلہ کے بارے میں عالم اسلام کے علماء سے رائے لینے کے
مرحلے تک بات آ گئی ہے۔

یہ سارا عمل غمازی کر رہا ہے کہ اصل میں پختہ ارادہ موجود نہیں ہے[۱]۔ اگر پختہ ارادہ ہوتا
تو بہت سے ضروری اسلامی قوانین کو اب تک حقیقی طور پر نافذ ہو جانا چاہیے تھا۔ درحقیقت اصل
مسئلہ وہی ہے جو میں نے عرض کیا تھا کہ ان کو بھی راضی رکھنا ہے' اُن کو بھی ساتھ لے کر چلنا ہے'
اُن کو بھی ساتھ لے کر چلنا ہے' یہ بھی ناراض نہ ہوں اور وہ بھی ناراض نہ ہوں[۲]۔ ظاہر بات
ہے کہ اس طرز پر جو بھی کام ہوگا' اس میں کوئی پیش رفت نہیں ہو سکتی اور عملی اعتبار سے انسان
آگے نہیں بڑھ سکتا۔ پس میں نے اس controversy میں اسی لیے اپنے آپ کو ملوث نہیں
کیا کہ میرے نزدیک اس کا حاصل کچھ نہیں۔ یہ بالکل ایک بے محل بحث ہو رہی ہے' یا تو وہ
اجتماعی ارادہ موجود ہوتا یا اس کو پیدا کرنے کے لیے مثبت اقدامات کیے جاتے۔

جولائی ۱۹۷۷ء میں جب جناب جنرل محمد ضیاء الحق صاحب کی حکومت قائم ہوئی ہے اور
انہوں نے نوے دن میں انتخابات کرانے کے بجائے اس عزم کا اعلان کیا کہ most
earnestly ان کی حکومت یہاں اسلامی نظام نافذ کرنے کے لیے اپنی تمام قوت صرف کرے
گی تو نومبر ۱۹۷۷ء میں اسی شہر لاہور میں ہماری سالانہ قرآن کانفرنس منعقد ہوئی تھی۔ اس
کانفرنس میں' میں نے یہ بات عرض کی تھی' چونکہ مجھے جنرل صاحب کے متعلق معلوم تھا کہ وہ

(۱) انگریزی کا ایک مشہور مقولہ ہے: "Where there is a will there is a way"
—— "اگر عزم صمیم ہو کہ یہ کام بہرحال کرنا ہے تو راہ نکل آتی ہے۔" (مرتب)

(۲) ع "باغباں بھی خوش رہے راضی رہے صیاد بھی!"

ایک دین دار مسلمان ہیں۔ مجھے یہ بھی علم تھا کہ وہ ماہنامہ میثاق کے اس زمانہ سے خریدار ہیں'
جب وہ ملتان میں جی او سی تھے اسی زمانہ میں انہوں نے تفسیر تدبر قرآن منگائی تھی۔ اس سے
اندازہ ہوتا ہے کہ ایک شخص کا دینی ذوق ہے' دینی مزاج ہے' اس میں دین سے شغف ہے۔
انہوں نے ہماری قرآن کانفرنس کے لیے پیغام بھی ارسال کیا تھا' لہٰذا اُس وقت میں نے عرض
کیا تھا کہ "اب جب کہ اللہ نے آپ کو اس آزمائش میں ڈال دیا ہے کہ آپ کے ہاتھ اس ملک
کا اختیارِ کلی آ گیا ہے"—— چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر سے زیادہ مختارِ مطلق اس دنیا میں کوئی اور
نہیں ہوتا۔ امریکہ کا صدر بھی اتنا بااختیار نہیں ہے' وہ تو ملک بڑا وسیع ہے' وسائل بہت ہیں۔
اس لحاظ سے وہ ایک بڑی شخصیت ہوتی ہے لیکن اختیارات کے اعتبار سے اس پر قیود ہیں' حدود
ہیں' پابندیاں ہیں۔ بہت سے امور میں اسے کانگریس سے منظوری حاصل کرنی ہوتی ہے۔
اُسے اپنی پالیسیوں میں بہت محتاط رہنا پڑتا ہے' اس نے یا اس کی پارٹی کے دوسرے نامزد کو
صدارتی انتخاب لڑنا ہوتا ہے' پارٹی کو پھر ووٹوں کی بھیک مانگنی ہوتی ہے۔ ظاہر بات ہے کہ ان
تمام حدود و قیود اور احتیاطوں سے چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر مبرا' محفوظ' مامون اور مطمئن ہوتا
ہے۔ اُسے ان چیزوں کی کوئی فکر نہیں ہوتی۔ انہی اعتبارات کے پیش نظر میں نے ان سے عرض
کیا تھا کہ "آپ کے لیے یہ بہت بڑی آزمائش ہے' اب یہ ہے کہ اگر آپ واقعتاً اس آیت پر
عمل کریں کہ: ﴿اَلَّذِیۡنَ اِنۡ مَّکَّنّٰہُمۡ فِی الۡاَرۡضِ اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَ اٰتَوُا الزَّکٰوۃَ وَ اَمَرُوۡا
بِالۡمَعۡرُوۡفِ وَ نَہَوۡا عَنِ الۡمُنۡکَرِ﴾۔ تو آپ پورے کے پورے اسلام کو نافذ کیجیے۔ اس میں
تدریج کا معاملہ نہ کیجیے گا کہ ایک حصہ نافذ کر دیا دوسرا نہیں۔ اس میں اپنی priorities بنا لینا'
دین کی ترجیحات کو نظر انداز کر دینا' معاشرے کا رنگ دیکھ کر لوگوں کو مطمئن کرنے کے لیے' ان
کو جانچنے پرکھنے کے لیے نفاذِ اسلام میں تدریج اختیار کرنا' پھر یہ کہ اس کا تجزیہ کرنا' یعنی اس
کے اجزاء کرنا کہ دین کا ایک حصہ اس وقت نافذ کیا جائے اور دوسرے حصوں کو تعویق میں ڈالنا
کہ پھر دیکھا جائے گا' یہ طرزِ عمل اسلام کے مطابق نہیں ہے۔ اس ضمن میں سورۃ البقرۃ کی آیت
۸۵ ذہن میں رکھیے گا: ﴿اَفَتُؤۡمِنُوۡنَ بِبَعۡضِ الۡکِتٰبِ وَ تَکۡفُرُوۡنَ بِبَعۡضٍ﴾۔

اب تدریج کے لیے مکی دور سے دلیل نہیں لائی جا سکتی' چونکہ اس وقت مکمل شریعت موجود
نہیں تھی۔ اس وقت تک احکام نازل نہیں ہوئے تھے۔ اب وہ دَور دوبارہ نہیں آئے گا' مکمل
شریعت حقہ موجود ہے۔ قرآن پورا کا پورا ہمارے سامنے ہے' سنت رسول ﷺ ایک روشن

آفتاب کی صورت میں موجود ہے۔ ہماری تاریخ تاریک رات کے مانند نہیں ہے بلکہ لَیْلُھَا کَنَھَارِھَا اس کی تو راتیں بھی اتنی روشن ہیں جتنے کہ دن روشن ہوتے ہیں۔ حضورﷺ کے دورِ سعید سے متصلاً بعد خلافت راشدہ کا زرین دَور ہے۔ پھر اس کے بعد ائمہ فقہاء اور ائمہ حدیث کا دَور ہے۔ ہماری روشن تاریخ ہے جس کو سامنے رکھ کر ہمیں کامل دین کو لینا ہوگا۔ اس کے اجزاء کرنے کا اختیار کسی کو نہیں ہے۔ یہود کی اسی روش کے بارے ہی میں فرمایا گیا تھا کہ ﴿اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْکِتٰبِ وَ تَکْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ﴾ ''کیا تم ہماری کتاب یعنی ہماری شریعت اور ہمارے دین کے ایک حصہ کو مانتے ہو اور ایک کو نہیں مانتے''۔ ﴿فَمَا جَزَآءُ مَنْ یَّفْعَلُ ذٰلِکَ مِنْکُمْ اِلَّا خِزْیٌ فِی الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا﴾ ''پس تم میں سے جو کوئی بھی یہ روش اور یہ رویہ اختیار کرے گا اس کی سزا اس کے سوا اور کچھ نہیں ہے کہ دنیا کی زندگی میں اُسے ذلیل و خوار کر دیا جائے''۔ ﴿وَیَوْمَ الْقِیٰمَۃِ یُرَدُّوْنَ اِلٰٓی اَشَدِّ الْعَذَابِ﴾ ''اور قیامت کے دن اسے شدید ترین عذاب میں جھونک دیا جائے''۔ اس آیت میں ایک اٹل اصول' ضابطہ اور قاعدہ بیان کر دیا گیا ہے۔ شریعت محمدی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام مکمل شکل میں موجود ہے۔ لہٰذا اب تو take it all or leave it والا معاملہ ہے۔ شریعت لینی ہوگی تو پوری لینی ہوگی ورنہ چھوڑ دیجیے۔ اللہ کو کوئی احتیاج نہیں ہے' کوئی غرض نہیں ہے' اس کی کوئی ضرورت اس سے لاحق نہیں ہے۔ اس کا کوئی کام اٹکا ہوا نہیں ہے کہ اس کی شریعت میں سے تھوڑی سی چیز مان لی جائے تو اس کا کام چل نکلے گا ورنہ کام اٹکا رہے گا۔ معاذ اللہ ثم معاذ اللہ!

اسی لیے میں نے زور دے کر کہا تھا کہ ''آپ پورا اسلام نافذ کیجیے' اس میں تدریج کا معاملہ نہ کیجیے گا'' ساتھ ہی میں نے صاف صاف یہ بھی عرض کر دیا تھا کہ ''مجھے اندیشہ ہے کہ اگر آپ یہ کریں گے تو اس وقت معاشرے کی جو مجموعی کیفیت ہے تو یہ معاشرہ اُسے قبول نہیں کرے گا۔ ہوسکتا ہے کہ آپ کو اٹھا کر پھینک دے۔ آپ کی حکومت کا تختہ بھی اُلٹ جائے' لیکن اس کے باوجود آپ یہ کریں گے تو میں سمجھتا ہوں کہ یہ بہت بڑی قربانی ہوگی۔ اللہ کے یہاں بھی آپ ماجور ہوں گے اور تاریخ میں بھی یہ بات ایک کارنامے کے طور پر درج ہوگی''۔ میں نے یہ بھی عرض کیا تھا کہ ''اگر ایک انگریز بادشاہ ایک عورت کے لیے برطانیہ کی حکومت کے تاج وتخت کو ٹھوکر مار سکتا ہے''۔ وہ بھی اس دَور میں جب کہ برطانیہ کی حکومت اتنی وسیع تھی کہ کہا جاتا تھا کہ اس حکومت میں کبھی سورج غروب نہیں ہوتا۔ ''تو آج کا کوئی حکمران اگر اس لیے اقتدار

سے محروم کر دیا جائے کہ وہ خود مسلمان جینا اور رہنا چاہتا ہے اور ملک میں بھی اسلام لانا چاہتا ہے۔ اگر اس وجہ سے حکومت سے محروم ہونا پڑے تو یہ ایک بڑی شاندار اور تابناک مثال قائم ہو جائے گی''۔ اس سے ایک جوش پیدا ہوگا۔ ولولہ ابھرے گا' امنگیں جوان ہوں گی اور کروٹیں لیں گی' اسلام کے حق میں ایک نیا جذبہ پیدا ہوگا۔

ان تمام مفاہیم پر مشتمل باتیں تھیں جو میں نے نومبر ۱۹۷۷ء کی قرآن کانفرنس میں جناب جنرل محمد ضیاء الحق صاحب کو مخاطب کر کے کہی تھیں' لیکن سات سال پورے ہو چکے ہیں اور اب آٹھواں سال شروع ہو گیا ہے' ان سات سالوں کا جو ماحصل ہے' اس کی ہم جو balance sheet اپنے سامنے رکھ کر اُسے دیکھتے ہیں تو شدید مایوس کن صورتِ حال نظر آتی ہے۔ اس کے سوا کوئی اور نتیجہ نظر نہیں آتا کہ کچھ controversies ہیں' کچھ بحثیں ہیں جو بڑے زور وشور سے اخبارات ورسائل اور پبلک پلیٹ فارموں پر جاری ہیں۔ جن کا حاصل ذہنی الجھاؤ' پراگندگی اور انتشار کے سوا کچھ نہیں' جو بالکل ایک منفی کام ہے۔ عملی اعتبار سے ایک قدم آگے بڑھتا نظر نہیں آتا۔ زکوٰۃ کے بارے میں' میں گزشتہ جمعہ کو عرض کر چکا ہوں کہ اس نے کیا شکل اختیار کی ہے! اب اقامت صلوٰۃ کا جو اقدام کیا گیا ہے' اس کے متعلق اخبارات میں جس قسم کے بیانات اور خبریں آ رہی ہیں اور مجھے بتایا گیا ہے کہ ٹی وی پر بھی صلوٰۃ کمیٹیوں کی تشکیل کی بڑے زور وشور سے تشہیر کی جارہی ہے۔ اس سے جو لوگ یہ اندازہ لگا رہے ہیں کہ یہ اصل میں الیکشن کے لیے خالص تمہیدی قدم ہے جو اٹھایا گیا ہے' تو جس انداز سے یہ کام ہو رہا ہے' اس کے پیش نظر ان کے اس خیال کو غلط قرار دینا مشکل ہے۔ یہ رمز بھی اس کی نشان دہی کرتا ہے کہ یہ کام فوج ہی کے ذریعے قائم کیا جا رہا ہے۔ اسے سول بیوروکریسی کے بجائے فوجی نظام کے ساتھ نتھی کیا گیا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ موجودہ regime کا جو معہود ذہنی ہے' ان کے پیش نظر آئندہ کے لیے جو نقشہ ہے' اس میں اس کا کوئی خاص مقام ہے۔ اس کی کوئی افادیت ہے' اس کا کوئی مصرف ہے۔ گویا نظامِ زکوٰۃ اور نظام اقامت صلوٰۃ کی پشت پر ایک سیاسی face اور image بنانا ہے' اس کے سوا اور کچھ نہیں۔

یہی وجوہ ہیں کہ میں سوچتا ہوں کہ ان معاملات میں اگر بولوں تو اس کا فائدہ کیا ہے! حاصل کیا ہے! میں نے آپ کو بارہا بتایا کہ پردے کے سلسلہ میں گفتگو میرے اپنے کسی منصوبے اور ارادے کے تحت نہیں تھی۔ لیکن جب پوچھا جائے گا تو جو بات کتاب وسنت کے مطابق ہوگی

وہ کہنی پڑے گی۔ پھر میں نے اس موضوع پر اپنی دو تقریروں میں اپنی استعداد کی حد تک کتاب و
سنت کی تعلیمات پیش کیں۔ یہ تقریریں ''میثاق'' کی ایک خصوصی اشاعت میں شائع ہوئیں۔
ملک کے ایک مشہور اور نہایت کثیر الاشاعت روزنامے میں وہ قسط وار شائع ہوئیں۔ کتابی
صورت میں بھی وہ اشاعت پذیر ہو چکی ہیں۔ پھر میں کیا اور میری بساط کیا! ملک میں ہمارے
نامور اور جید علمائے کرام کی نہایت مبسوط کتب اس موضوع پر پہلے سے موجود ہیں۔

لیکن کیا موجودہ حکومت نے ان کتب سے کوئی استفادہ کیا! کیا اسلامک آئیڈیالوجی سے
استصواب کیا کہ ستر و حجاب کے متعلق شریعت کے احکام کیا ہیں! بلکہ مجھے یہ بات کہنے پر معاف
کیا جائے کہ جو کام ترکی میں اتاترک نے اور ایران میں دونوں رضا شاہ پہلوی کے نام رکھنے
والے بادشاہوں نے قانون' طاقت اور ڈنڈے کے زور سے کیا تھا' وہ موجودہ regime
بڑی حکمت عملی سے انجام دے رہی ہے اور ان سات سالوں میں مغربی ذہن رکھنے والی خواتین
کو نہ صرف یہ کہ کھلی چھٹی دی گئی ہے کہ اسلامی نظام معاشرت کے خلاف وہ جتنا چاہیں زہر
اُگلیں۔ بلکہ انہیں نمایاں طور پر آگے بڑھایا گیا ہے' اور بڑھایا جا رہا ہے' مختلف طور پر ان کی
حوصلہ افزائی ہو رہی ہے۔ اس دَور میں یہ کام جس پیمانے پر ہوا ہے اس کے عشر عشیر بھی پہلے کے
تیس برسوں میں نہیں ہوا تھا۔

اب ان حالات کے پیش نظر قانونِ شہادت میں عورتوں سے متعلق شق پر اور قصاص و
دیت کے مسودہ کے متعلق میں کچھ کہوں تو کیا کہوں! لیکن چونکہ مجھ سے سوال کیا گیا ہے اور
بعض احباب کا اصرار ہے کہ قصاص و دیت کے مسئلہ پر جو متنازعہ بحث چلی ہے' اس کے متعلق
میں کچھ عرض کروں۔ پھر میرے سامنے حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ کی حدیث کا وہ حصہ بھی
ہے جس پر بھی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے بیعت کرتے تھے کہ عَلٰی اَنْ نَقُوْلَ بِالْحَقِّ
اَیْنَمَا کُنَّا وَلَا نَخَافُ فِی اللّٰہِ لَوْمَۃَ لَائِمٍ —— لہٰذا اس مسئلہ پر قرآن و حدیث سے اپنی
استعداد اور اپنے فہم کے مطابق جو کچھ میں نے سمجھا ہے وہ میں ان شاء اللہ بعد میں عرض کروں گا۔
اس وقت بطور یاددہانی اس کام کا اعادہ کر رہا ہوں' جس کے لیے میں نے اپنے آپ کو کھپا رکھا
ہے' شاید کہ اس موقع پر میری بات چند لوگوں کے دل میں اتر جائے اور وہ جمود کو ختم کر کے آگے
بڑھیں اور اس کام میں میرے اعوان و انصار بنیں یا اپنے طور پر منظّم ہو کر اسی کام کی انجام دہی
کی دھن ان کے سروں پر سوار ہو جائے۔

میں نے قرآن حکیم اور سیرت مطہرہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کا جو بھی معروضی مطالعہ کیا
ہے' اس کے نتیجے میں میرے سامنے اصل کرنے کا کام اور نہج یہ آیا ہے کہ دین کے تقاضوں اور
مطالبوں کو اس وقت تک بطور نظام حیات نہ نافذ کیا جا سکتا ہے' نہ وہ مستحکم رہ سکتا ہے' جب تک
معاشرے کے معتدبہ افراد میں مسلمان جینے' مسلمان مرنے کی collective will پیدا نہ ہو
جائے۔ میں تو اس اجتماعی ارادے کو پیدا کرنے اور اسے قوی کرنے میں لگا ہوا ہوں۔ اس
will' اس ارادہ اور اس داعیہ کا براہِ راست تعلق ہے ایمان سے اور ایمان کا منبع و سرچشمہ ہے
قرآن حکیم۔ اسی منبع اور چشمہ رُشد و ہدایت کو عام کرنے کے لیے میں نے ۱۹۶۵ء سے لے کر
اب تک تقریباً بیس سال اپنی جوانی کے کھپائے اور لگائے ہیں۔ جو بھی اس کے اثرات ہیں اور
کوئی نتیجہ نکلا یا نہیں نکلا! یہ علیحدہ معاملہ ہے' یہ دوسری بات ہے۔ میرے پیش نظر حالات کو
بدلنے کی کوشش ہے اس کی کامیابی کا انحصار اللہ کی مشیت پر ہے۔ میری اُخروی نجات کے لیے
شاید میری یہ حقیر کوشش کام آ جائے۔ بہرحال میں اسی کام میں ہمہ تن لگا ہوا ہوں اس لیے کہ
میرا ایمان و یقین ہے کہ قرآن حکیم کی دعوت' اس کے پیغام اور اس کے ساتھ صحیح تعلق ہی تجدید
ایمان کا ذریعہ بنے گا۔ اسی سے ایمان کو تقویت حاصل ہوگی اور یہی کام درحقیقت ہمارے
معاشرے میں collective will کو پیدا کرنے کا مؤثر ترین ذریعہ بن سکتا ہے۔ اس سے
اگلا قدم یہ اٹھایا کہ جن لوگوں کے اندر انفرادی سطح پر یہ ارادہ اور داعیہ پیدا ہو چکا ہے' انہیں جمع
کیا جائے' انہیں منظّم کیا جائے اور اسلامی انقلاب کے لیے قرآن کے علوم و معارف اور اس کی
حکمت کو ذہنوں میں اتارنے کے لیے علمی و فکری سطح پر کام ہو۔ پھر اسی منزل کی طرف پیش قدمی
کے لیے سمع و طاعت کے اسلامی اصول پر ایک جماعت وجود میں آئے۔ میری پہلی کوشش کے
لیے عنوان ہے: ''مرکزی انجمن خدام القرآن'' اور دوسری کوشش کا نام ہے ''تنظیم اسلامی''۔ تو
میں اپنی ساری مساعی' ساری صلاحیتیں' ساری توانائیاں اصل میں ان دونوں کاموں میں
صرف کر رہا ہوں۔ اس وقت جو controversies پیدا ہو رہی ہیں اور پھیل رہی ہیں' اس
میں دراصل lacking عنصر collective will کے فقدان کا —— یہ سبب تھا اس معاملہ
میں میرا اب تک بالکل خاموش رہنے کا۔

آج میں قصاص اور دیت کے بارے میں اپنی رائے پیش کر دیتا ہوں' اس فیصلے کی وجوہ
میں بیان کر چکا ہوں کہ مجھ سے سوال بھی کیا گیا ہے اور از خود بھی لوگوں کے ذہنوں میں یہ سوال
ہوا ہوگا۔ اس معاملہ میں جہاں تک دیت کا مسئلہ زیر بحث ہے' اس میں ایک اہم بات شاید

لوگوں کو معلوم نہیں ہے وہ یہ کہ یہ قصاص والی دیت نہیں ہے۔ دیتیں دو ہیں۔ ایک دیت تو وہ ہے جو قصاص کے ساتھ bracket ہو کر آتی ہے' وحدانی شکل میں آتی ہے۔ ایک دیت بالکل علیحدہ ہے۔ ان دونوں کو جب تک آپ علیحدہ علیحدہ نہیں سمجھیں گے تو جو باتیں کہی جا رہی ہیں اور عقلی میدان میں جو گھوڑے دوڑائے جا رہے ہیں اس کا توڑ آپ کے لیے مشکل ہوگا۔ ایک ہے قتل عمد کا معاملہ—— ایک شخص نے جان بوجھ کر کسی دوسرے شخص کو قتل کیا ہے۔

اس کا معاملہ بالکل علیحدہ ہے۔ اس کا شریعت میں' قانون اسلامی میں عنوان ہے قصاص' جان کے بدلے جان' اور اس میں جان بالکل برابر اور مساوی ہے عورت کی بھی اور مرد کی بھی۔ اس میں کوئی فرق و امتیاز نہیں ہے۔ مقتول چاہے مرد ہو چاہے عورت' اسی طرح قاتل چاہے مرد ہو چاہے عورت۔ ان چاروں حالتوں میں مرد و عورت میں کوئی فرق و امتیاز نہیں ہوگا۔ اس لیے کہ جانیں سب کی برابر اور مساوی ہیں۔ یہاں جو قصاص ہے وہ جان کے بدلے جان ہے کہ قاتل کی جان اب مقتول کے ورثاء کے رحم و کرم اور ان کی صوابدید پر منحصر کر دی گئی کہ اگر وہ چاہیں تو قاتل کی جان لینے ہی کا فیصلہ کریں اور چاہیں تو قاتل یا اس کے لواحقین سے کوئی معاوضہ قبول کر کے اس کی جان بخشی کر دیں۔ ان دو میں سے کوئی ایک فیصلہ کرنے کا بالکلیہ اختیار مقتول یا مقتولہ کے ورثاء کو حاصل ہے۔ اس میں حکومت کا عمل دخل یہ ہے کہ اس نے قاتل کو پکڑا۔ مقتول یا مقتولہ کے ورثاء کے لیے یہ ممکن نہیں' اس کے لیے حکومت کی مشینری کی ضرورت ہے' جس میں پولیس ہے' عدالت ہے۔ پولیس نے قاتل کو پکڑا' تفتیش کی' قانون اور عدل کے جو تقاضے ہیں ان کو پورا کیا۔ مقدمہ قائم ہو کر عدالت میں پیش ہوا۔ ملزم کے خلاف شہادتیں پیش ہوئیں۔ اس کی طرف سے صفائی پیش ہوئی۔ ہر نوع کی شہادتوں پر جرح ہوئی۔ یہ سارا کام حکومت کے ذمہ ہے۔ ان تمام مراحل سے گزر کر جب عدالت نے فیصلہ دے دیا' وہ چاہے جج یا قاضی نے خود دیا ہو یا جیوری کی رائے کے مطابق دیا ہو کہ ملزم کا جرم ثابت ہو گیا' یہ شخص فلاں مرد یا فلاں عورت کے قتل عمد کا مجرم ہے تو اس کے بعد حکومت کا اختیار اور عمل دخل ختم۔ اب اس میں صدر مملکت کو بھی کوئی اختیار حاصل نہیں ہے' اگر اب تک ہے تو یہ بالکل غلط ہے' خلاف اسلام ہے[۱]۔ اب کسی کا کوئی اختیار نہیں ہے۔ نہ حکومت کا' نہ کسی گورنر کا' نہ صدر مملکت کا۔

(۱) اس کی خلافت راشدہ میں بڑی نمایاں مثال ملتی ہے۔ ابولؤلؤ فیروز نے حضرت عمر فاروق ؓ کو شہید کیا۔ اس نے تو اس کے بعد فوراً خودکشی کر لی' وہ گرفتار نہیں ہو سکا۔ لیکن قرائن اور ◀

اب یہ اختیار اسلامی قانون کے مطابق بالکلیہ مقتول یا مقتولہ کے ورثاء کو حاصل ہے۔ وہ چاہیں تو اس قاتل یا قاتلہ کی جان لینے کا فیصلہ کریں۔ حکومت اس کو execute کرے گی اور اگر چاہیں تو اس قاتل یا قاتلہ کی بلا دیت و قصاص جان بخشی کر دیں اور اگر وہ چاہیں تو قاتل یا قاتلہ سے یا ان کے ورثاء سے کوئی رقم بطور دیت قبول کر لیں۔

ایک اور اہم بات نوٹ کیجیے کہ یہ دیت جو قصاص کا قائم مقام بنتی ہے اس کا تعین نہیں ہے یہ معاملہ جانبین کی باہمی رضامندی سے طے ہوگا۔ اس سارے معاملے میں اصل میں جان کا بدلہ تو جان ہی ہے۔ یہ بات اچھی طرح جان لیجیے۔ دیت کی وہ رقم مقتول یا مقتولہ کی جان کی قیمت ہرگز نہیں ہے۔ اس کی قیمت تو قاتل یا قاتلہ کی جان ہی ہے البتہ آپ یہ کہہ سکتے ہیں اگر کہنا چاہیں کہ قاتل یا قاتلہ نے اپنی جان بچائی ہے اپنی جان کی قیمت ادا کر کے۔ اگر اس نے دس لاکھ روپے دے کر یا اس کے اعزہ و اقارب نے' اس کے کنبے نے' اس کی برادری نے' اس کے قبیلے نے ادائیگی کر کے قاتل یا قاتلہ کی جان بچائی ہے تو یہ دیت درحقیقت قاتل کی

◀ واقعاتی شہادتیں یہ تھیں کہ اس سازش میں ہرمزان بھی شریک تھا۔ وہ خلافت فاروقی میں مسلمان ہو چکا تھا اور مدینہ منورہ میں مستقل طور پر سکونت پذیر تھا۔ حضرت عبید بن عمر ؓ نے رنج اور غصہ سے مغلوب ہو کر ہرمزان کو قتل کر دیا' جبکہ اس کو سازش میں ملوث ثابت کرنے کے لیے عدل و قانون کے متعلق کوئی عدالتی کارروائی نہیں ہوئی تھی۔ حضرت عبیدؓ کو گرفتار کیا گیا' ان پر قتل عمد کا مقدمہ چلا اور وہ مجرم قرار دیے گئے۔ ہرمزان کا کوئی وہاں وارث نہیں تھا۔ جس کا کوئی وارث نہ ہو تو اسلامی قانون کے مطابق خلیفۂ وقت بحیثیت خلیفہ اس کا وارث قرار پاتا ہے۔ لہٰذا حضرت عثمان ؓ نے بحیثیت وارث دیت قبول کرنے کا فیصلہ کیا۔ حضرت عبیدؓ کے مالی وسائل دیت ادا کرنے کے متحمل نہیں تھے۔ چنانچہ حضرت عثمانؓ ہی نے اپنی جیب خاص سے مقرر کردہ دیت ادا کی اور وہ بیت المال میں داخل کی گئی۔ حضرت عبیدؓ کے لیے جو حضرت عمر فاروقؓ کے فرزند ہیں ''رحم'' کی کوئی اپیل خلیفۂ وقت کو پیش نہیں کی گئی۔ لہٰذا قاتل کو صوبائی گورنر یا صدر مملکت سے رحم کی اپیل کا حق دینا خلاف اسلام ہے۔ (مرتب)

جان کا معاوضہ ہے نہ کہ مقتول کی جان کی قیمت۔ یہ بدلہ قاتل کی جان کا ہے، مقتول کی جان کا نہیں ہے۔ چونکہ جان کا اصل بدلہ تو جان ہی ہے۔ اب اس فیصلے کا بالکلیہ اختیار مقتول کے ورثاء کی آزاد مرضی پر ہے۔ چاہیں دیت قبول کریں، چاہیں تو قبول نہ کریں اور قاتل کو موت کی سزا دلوا دیں۔ یہ ہے قتل عمد کا معاملہ۔ اس میں مرد کی پوری اور عورت کی آدھی دیت کا سرے سے مسئلہ زیر بحث آتا ہی نہیں۔ جان کی قیمت کا مسئلہ اگر زیر بحث آتا ہے تو یہاں آتا ہے اور اس میں قاتل چاہے عورت ہو یا مرد، اسی طرح مقتول عورت ہو یا مرد۔ دیت کی رقم کا تعین مقتول کے ورثاء کریں گے اور وہ درحقیقت قاتل اپنی جان بچانے کے لیے دیت دے گا جو دراصل اس کی اپنی جان کی قیمت ہوگی۔

دوسرا مسئلہ ہے قتل خطا کا جس میں قاتل یا قاتلہ کا اپنا کوئی ارادہ شامل تھا ہی نہیں۔ آپ گاڑی میں جا رہے ہیں کہ اچانک اور ناگہانی کوئی بچہ، کوئی عورت، کوئی مرد آپ کی گاڑی کے نیچے آ گیا اور ہلاک ہو گیا۔ آپ کا کوئی ارادہ نہیں تھا، آپ کی دشمنی نہیں تھی۔ یا یہ کہ آپ کی دیوار کے نیچے کوئی شخص بیٹھا ہوا تھا۔ وہ دیوار گر گئی اور اس کے ساتھ یا اس کے نیچے جو شخص بیٹھا ہوا تھا، وہ ہلاک ہو گیا۔ آپ کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ یا آپ نے گولی چلائی تھی کسی شکار پر وہ جا لگی کسی انسان کو۔ آپ کا قطعاً کوئی ارادہ اس شخص کو مارنے کا نہیں تھا۔ قتل خطا کی اور بھی بہت سی شکلیں اور نوعیتیں ہو سکتی ہیں۔ تو قتل خطا وہ ہے جس میں قتل کا ہرگز کوئی ارادہ شامل نہیں ہوتا۔

اب اسلامی قانون کا یہ ضابطہ نوٹ کیجیے کہ:-

"قتل خطا کے معاملے میں اب جان کے بدلے جان نہیں ہے۔ اس لیے کہ جان لینا اس قاتل کے پیش نظر تھا ہی نہیں۔"

اس قتل خطا میں مقتول یا مقتولہ کے لیے جو دیت مقرر کی جائے گی وہ اس بنیاد پر ہے کہ اس خاندان کا نقصان کتنا ہوا ہے۔ قاتل کا جرم اس اعتبار سے تو نہیں ہے کہ اس کا قتل کرنے کا ارادہ تھا، وہ قتل عمد کا کسی اعتبار سے بھی مرتکب نہیں ہے۔ لہٰذا اس قتل کی سزا کا ضابطہ جان کے بدلے جان نہیں ہے چونکہ قتل خطا سے ہوا ہے۔ اب چاہے قتل خطا سے ہوا ہو لیکن اس خاندان کا تو نقصان ہو گیا ہے جس کا فرد مقتول ہوا ہے۔ اس کے نقصان کی تلافی تو ہونی چاہیے اس کا compensation تو ہونا چاہیے۔ اس کی تلافی حکومت اپنے بیت المال سے بھی کر سکتی ہے۔ اس بات کو بھی پیش نظر رکھیے یہ تلافی اس صورت میں حکومت کرے گی، جب کہ قتل خطا کا

مجرم خود یا اس کے قریب ترین اعزہ اس تلافی کی استطاعت نہ رکھتے ہوں۔ اصلاً یہ تلافی اسلام نے اُس پر ڈالی ہے جو اس قتل خطا کا مرتکب ہوا ہے۔ کیوں ڈالی؟ اس کے اندر بھی حکمت ہے وہ یہ کہ اس سے احتیاط کا عنصر پیدا ہوگا۔ اگر اسے ہر صورت میں حکومت کے ذمے ڈال دیا جائے تو لوگوں میں احتیاط پیدا نہیں ہوگی۔ لوگ گاڑی rash چلائیں گے۔ ان کے پیش نظر یہ بات ہوگی کہ اگر کوئی گاڑی کے نیچے آ کر ہلاک یا معذور ہو گیا تو اس کی دیت حکومت دیتی پھرے گی۔ لیکن اگر ڈرائیور کو یہ معلوم ہو کہ یہ میرے سر پر آنے والی بات ہوگی تو اب وہ محتاط رہے گا یہ احتیاط معاشرے میں اسی شکل میں پیدا ہو سکتی ہے کہ اس قتل خطا کا تاوان اسی پر ڈالا جائے، جس کے ہاتھوں یا جس کے سبب سے یہ قتل خطا ہوا ہے۔ البتہ مستثنیات میں یہ تلافی بیت المال سے حکومت کر سکتی ہے۔

لیکن یہ جان کی قیمت نہیں ہے بلکہ درحقیقت یہ اس نقصان کی تلافی ہے، اس کا compensation ہے جو اس فرد کے ہلاک ہو جانے کے سبب سے اس خاندان کو پہنچا ہے جس کا وہ فرد تھا۔

اس دیت میں اسلام کے نزدیک مرد اور عورت میں فرق ہے۔ اس کی حکمت یہ ہے کہ اسلام کا جو نظام ہے اس میں معاش کا بوجھ عورت کے ذمے نہیں ڈالا گیا ہے۔ جب کہ مرد کسی خاندان کا ایک earninig member ہے۔ وہ خاندان کی کفالت کے نظام کا ایک رکن ہے۔ وہ حصولِ معاش کا ایک عضو ہے۔ لہٰذا کسی خاندان کے کسی مرد کا قتلِ خطا کے نتیجے میں ہلاک ہو جانا بڑا نقصان ہے بہ نسبت اس کے کہ اس طور پر اس خاندان کی کوئی خاتون ہلاک ہو جائے۔ چنانچہ شریعت نے اس میں یہ فرق رکھا ہے کہ:

قتل خطا میں مرد کی دیت کے مقابلے میں عورت کی دیت آدھی ہو جائے گی۔

اس میں جو حکمت ہے وہ روزِ روشن کی طرح عیاں ہے۔ عقلی دلیل کے اعتبار سے بھی یہ بات عین عدل و قسط کے مطابق ہے اور واضح ہے کہ ہر سلیم العقل انسان اس کی معقولیت کو بآسانی سمجھ سکتا ہے۔ اس کے خلاف ایک عقلی دلیل یہ لائی جاتی ہے کہ اس زمانے میں تو عورتیں بھی کمانے والی ہیں، اس سے قطع نظر کہ شریعت کی کسی نص کے خلاف کوئی عقلی دلیل دینا ایمان کے بالکل منافی ہے۔ اس طرزِ فکر سے ایمان کی سلامتی خطرے میں پڑ جاتی ہے۔ میں یہ کہتا ہوں کہ یہ **بِنَاءُ الفاسد علی الفاسد** ہے، اسلام کے منشا کے خلاف آپ نے ایک کارروائی

شروع کی ہے۔ اسلام تو یہ نہیں چاہتا کہ عورت پر معاش کی ذمہ داری ڈالی جائے۔ اسلام نے عورت پر کچھ اور ذمہ داریاں ڈالی ہیں۔ وہ گھر میں بیٹھے' اس کے لیے حکم ہے ﴿وَقَرْنَ فِيْ بُيُوْتِكُنَّ﴾۔ وہ کیوں معاشی تگ و دو میں نکلی ہوئی ہے! وہ قناعت کرے' صبر کرے' اس کا شوہر جو کچھ کما کر لا رہا ہے' اسی کے اندر گھر گرہستی کی ضروریات پوری کرے۔ اسلام تو یہ نہیں چاہتا۔ اسلام نے معاش کی ذمہ داری عورت پر نہیں ڈالی۔ آپ نے خود یہ ذمہ داری عورت پر بھی ڈال دی اور اپنی اس غلط روش کو اسلام کے ایک دوسرے قانون کے خلاف دلیل بنا رہے ہیں۔ اسلام کا نظام اور قانون تو پورا کا پورا منطقی طور پر اور مربوط طور پر ایک وحدت ہے' ایک اکائی ہے۔ اس نے چونکہ معاش کی ذمہ داری مرد پر ڈالی ہے' عورت پر نہیں ڈالی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وراثت میں بیٹے کو بیٹی کے مقابلے میں دگنا حصہ دیا ہے۔ یہ ساری چیزیں مربوط ہیں۔ اس لیے کہ بیٹا ایک خاندان کا سربراہ بننے والا ہے یا بن چکا ہے۔ اُسے اپنے خاندان کی کفالت کرنی ہے جب کہ بیٹی بیاہ کر کسی اور خاندان میں چلی جائے گی یا جا چکی ہوگی اور اس کی کفالت اس کے شوہر کے ذمہ ہوگی —— لیکن عورت کو ایک قانونی status دینے کے لیے کہ اس کا بھی ایک تشخص ہے' اس کی بھی ایک حیثیت ہے' لہٰذا وہ بھی اپنے والدین کے ترکے کی حق دار ہے۔ اُسے شریک تو رکھا گیا لیکن بھائی کے مقابلے میں اس کا حصہ نصف کر دیا گیا۔ لہٰذا اسلامی قانون کو جس زاویہ نگاہ سے بھی دیکھیں گے تو معلوم ہوگا کہ وہ ایک مربوط حکیمانہ نظام ہے۔ اس کا اپنا فلسفہ ہے۔ اور یہ فلسفہ تمام جزئیات کو govern کرتا ہے۔ تمام جزئیات اس فلسفے کے ساتھ مربوط ہو کر ایک وحدت بن جاتے ہیں جسے آپ ایک organic whole کہتے ہیں۔ اب اگر اس پورے اور وحدانی قانون سے ہٹ کر کوئی روش اختیار کریں گے' پھر اس سے اسلام کے کسی دوسرے قانون کے خلاف دلیل لائیں گے تو یہ میرے نزدیک بناء الفاسد علی الفاسد ہے۔ ایک غلط چیز پر بنیاد رکھ کر دوسری صحیح چیز کو غلط قرار دینا ہے۔ یہ درحقیقت اسی قبیل کی شے ہے جو آج کل قصاص و دیت کے مسئلہ میں سامنے لائی جا رہی ہے۔ ورنہ اسلام کا نظام اور قانون عقلی اعتبار سے بھی بالکلیہ عادلانہ اور منصفانہ ہے اور اس کا ہر جزو باہم دگر مربوط ہے۔ البتہ انتہا درجے کی مجبوری اور ضرورت ہو تو استثنائی شق قانون میں رکھی جا سکتی ہے لیکن یہ ایسے ہی ہونا چاہیے جیسے اضطرار کی حالت میں حرام کھانے کی شریعت نے رخصت رکھی ہے۔

اب آیئے ایک اہم اصول کی طرف —— جہاں تک نقل کا معاملہ ہے تو ہمارے دین میں نقل کو عقل کے مقابلے میں اقدمیت و اولیت حاصل ہے جس کے قدرے تفصیلی دلائل میں

دورانِ گفتگو پیش کروں گا۔ اس ضمن میں آپ کو یاد ہوگا کہ میں نے رمضان المبارک کے آخری جمعہ میں رجم کے متعلق بھی کچھ گفتگو کی تھی۔ اس ضمن میں ایک بڑی علمی شخصیت کی جو بفضلہٖ تعالیٰ بقید حیات ہیں۔ جو عالمِ دین ہونے کے ساتھ صاحب تفسیر بھی ہیں۔ رجم کے بارے میں جو رائے ہے اس پر تنقید کی تھی۔ پھر ان کے ایک شاگرد جوان سے بھی دو ہاتھ آگے نکل گئے ہیں۔ انہوں نے غامدیہ خاتون کے متعلق جو نازیبا بات کہی تھی بلکہ بہتان گھڑا تھا کہ ''وہ چکلا چلاتی تھی اس لیے اُسے رجم کیا گیا تھا''۔ پھر یہی نوجوان ہیں جنہوں نے چند سال پہلے اپنے رسالے میں لکھا تھا کہ آج تک اسلام کا صحیح قانونِ وراثت اور کلالہ کے صحیح معنی و مفہوم اور قانون کو آج تک کسی نے سمجھا ہی نہیں۔ اس کو بس انہوں نے ہی سمجھا ہے جسے وہ اب بیان کر رہے ہیں۔ تو بڑے میاں تو بڑے میاں چھوٹے میاں سبحان اللہ والا معاملہ سامنے آ رہا ہے۔

تو ان امور کے متعلق میں نے عرض کیا تھا۔ تو شریعت کے معاملے میں یہ بات جان لیجیے اور آج میں نے جو بات عرض کی ہے' اس کے ساتھ جوڑ کر سمجھ لیجیے کہ جہاں کہیں بھی یہ آمادگی پیدا ہو جائے گی کہ مجھے مسلمان جینا ہے' مجھے مسلمان مرنا ہے اس کے لیے سب سے پہلی دلیل یقیناً قرآن مجید ہے۔ لیکن دین میں وہ تنہا دلیل نہیں ہے۔ اسی لیے میں نے اُسے پہلی دلیل کہا ہے۔ جو قرآنِ حکیم کو تنہا اور واحد دلیل سمجھتا ہے اس کا راستہ ہم سے جدا ہے۔ ہم ہیں اہل السنة کہ جنہوں نے سنت کو دوسری دلیل مانا ہے۔ ہمارے نزدیک دلیل اول ہے قرآن مجید اور دلیل ثانی ہے سنت رسول علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام۔ اور یہ بھی جان لیجیے کہ سنت قرآن کے تابع نہیں ہے بلکہ اپنی جگہ مستقل ماخذ ہے' اگر اس کے تابع ہو تو اس کے تابع تو اولوا الامر بھی ہیں۔ اس کے تابع تو والدین کی اطاعت بھی ہے۔ اس کے تابع تو ساری اطاعتوں کا نظام بن جائے گا۔ درحقیقت سنت رسول علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام قرآن کے تابع ہو کر دلیل نہیں ہے بلکہ قرآن کے ساتھ ایک برابر کی دلیل ہے۔ یہ دو ستون ہیں' یہ دو pillars ہیں جن پر شریعت کی عمارت کی تعمیر ہوتی ہے۔ ایک ستون ہے اللہ کی کتاب قرآن مجید' ایک ستون ہے سنت رسول علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام (۱)۔ پھر فرض کیجیے کہ سنت رسولؐ میں کسی معاملہ میں ابہام ہے۔

(۱) رسول کی اطاعت کے لیے قرآن مجید میں یہ کلیہ بیان فرمایا گیا ہے کہ: ﴿مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ﴾ اور ﴿وَمَا اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ﴾۔ پہلی آیت میں ''الرَّسُوْلَ'' خاص ہے اور یہاں مراد جناب محمد رسول اللہ ﷺ ہیں۔ قرآن مجید میں پانچ مقامات پر امر کے صیغے میں اَطِيْعُوْا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ آیا ہے۔ اس اسلوب کے معانی و مفاہیم میں جو ◄

کہیں دو چیزیں بظاہر ایک دوسرے سے ٹکرا رہی ہیں۔ میں بظاہر کہہ رہا ہوں اس لفظ کو پیشِ نظر رکھیے۔ اس لیے کہ یہ چیز وہ ہے کہ محدثین عظام نے اپنی پوری پوری زندگیاں کھپا کر چھان پھٹک کی ہے اور پھر فقہاء کرام نے اس کے اندر عقلی اعتبار سے' استدلال کے ذریعے سے مطابقت پیدا کی ہے کہ ایک حدیث ہے جو عام بات بیان کر رہی ہے' دوسری حدیث ہے کہ اس کے اندر خاص بات بیان ہوئی ہے تو ایک حدیث گویا دوسری حدیث کے اتنے حصے کی ناسخ ہو جائے گی جو اس میں خصوص کا پہلو ہے۔ عام والا حصہ باقی رہ جائے گا' خاص والا معاملہ اب اس دوسری حدیث کی رو سے طے ہو گا۔ یہ معاملہ دنیا میں ہر جگہ ہے۔ قرآن مجید میں بھی ہے عام و خاص۔ یہی حدیث کے اندر معاملہ ہے۔

اس کے بعد تیسری دلیل ہمارے یہاں سنت رسولؐ کے بعد ہے' سنت خلفاء راشدین مہدیین۔ جس کے متعلق رسول اللہ ﷺ کی ایک طویل حدیث کے دوران یہ ارشاد آیا ہے: ((فَعَلَيْكُمْ بِسُنَّتِيْ وَ سُنَّةِ الْخُلَفَاءِ الرَّاشِدِيْنَ الْمَهْدِيِّيْنَ عَضُّوْا عَلَيْهَا بِالنَّوَاجِذِ)) ''تم پر لازم ہے میری سنت اور میرے خلفاء راشدین کی سنت کو جو میرے ہدایت یافتہ ہیں۔ پکڑو ان کو مضبوطی سے اپنے دانتوں کے ساتھ' ڈاڑھیوں اور کچلیوں کے ساتھ''۔ یہ فرمانِ محمدی ﷺ ہے۔ یہاں کلمہ ''فا'' بہت معنی خیز ہے' یہ تمام اختلافات کے لیے پناہ گاہ کی طرف دلالت کر رہا ہے۔ خلفاء راشدین کی سنت دراصل رسول اللہ ﷺ کی سنت ہی کا تتمہ ہے۔

اس کے بعد ہمارے پاس چوتھی دلیل ہے ہمارے ائمہ دین' ائمہ فقہاء کی استنباطات' ان کی تعبیرات اور ان کے قیاسات و اجتہادات۔ جیسا کہ میں نے عرض کیا کہ شاید کچھ لوگ سمجھتے ہوں کہ ان پر قرآن آج نازل ہو گیا ہے کہ وہ جس طرح چاہیں اُسے interpret کر دیں۔ ہماری ایک تاریخ ہے اور تاریخ تاریک نہیں ہے' بہت روشن ہے۔ یہ پچھلی دو تین صدیاں اگر ہمیں تاریک نظر آ رہی ہیں تو خدانخواستہ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ہماری پوری تاریخ تاریک

◀ زور ہے' اس کی جو غایت و مطلوب ہے' اس میں جو حکمت اور رمز ہے وہ روزِ روشن کی طرح واضح ہے اور پھر چھ مقام پر اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ آیا ہے۔ گیارہ مقامات پر اللہ تعالیٰ نے اپنے رسولوں کی زبان سے کہلوایا ہے کہ ''اَطِيْعُوْنِ''۔ پھر متعدد مقامات پر مختلف اسالیب سے رسول کی اطاعت اور اس کی معصیت سے بچنے کا حکم دیا ہے۔ اس سے نہ صرف رسول اللہ ﷺ کا ذاتی مقام واضح ہوتا ہے بلکہ سنت کا بھی' ویسے اتباعِ سنت کے لیے یہ آیت کریمہ نص کا درجہ رکھتی ہے کہ ﴿قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ ۭ وَ اللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝﴾

ہے۔ ہماری بڑی تابناک تاریخ ہے' ہماری اس تاریخ میں وہ ائمہ دین گزرے ہیں کہ جنہوں نے بڑی باجبروت حکومتوں کے مقابلے میں کھڑے ہو کر اس رائے کا اظہار کیا ہے جسے وہ حق سمجھتے تھے۔ امام مالکؒ کا تصور کیجیے کہ حکومت وقت کے خلاف رائے دے رہے ہیں۔ ان کی مشکیں کسی جا رہی ہیں۔ ان کے چہرے پر سیاہی مل کر پھر ان کو گدھے پر بٹھا کر پورے مدینہ میں پھرایا جا رہا ہے۔ لیکن اس حال میں بھی وہ کہہ رہے ہیں ''جو مجھے جانتا ہے' وہ جانتا ہے اور جو نہیں جانتا وہ جان لے کہ میں مالک بن انس ہوں اور میں ڈنکے کی چوٹ کہتا ہوں کہ طلاقِ مکرہ کی کوئی حقیقت نہیں ہے''۔ مسئلہ یہ تھا کہ مجبور کر کے اگر طلاق دلا دی جائے تو وہ طلاق ہو گی یا نہیں ہو گی۔ (۱)

اب یہ ایک مسئلہ ہے۔ یہ علیحدہ بحث ہے کہ کسی کو امام مالکؒ کی رائے سے اختلاف ہو۔ لیکن ہمارے ائمہ دین وہ ہیں جو کسی جبر اور کسی تشدد کے سامنے نہیں جھکے۔ امام ابوحنیفہؒ نے جیلیں کاٹی ہیں۔ ایک روایت کے مطابق انہیں زہر دیا گیا ہے۔ امام شافعیؒ نے سختیاں برداشت کی ہیں' کئی بار شہر بدر کیے گئے ہیں۔ امام ابن حنبلؒ نے وہ ماریں کھائی ہیں کہ کہا جاتا ہے کہ اگر ہاتھی کی پیٹھ پر وہ مار پڑتی تو وہ بھی بلبلا اٹھتا۔ امام ابن تیمیہؒ دو مرتبہ محبوس کیے گئے۔ قید کی حالت ہی میں ان کا انتقال ہوا۔ تو کیا ان ائمہ کے بارے میں ہم یہ سمجھیں گے کہ دین اور شریعت کے بارے میں غور و فکر اور صحیح تر رائے تک پہنچنے میں انہوں نے کوئی کسر چھوڑ دی ہو گی! انہوں نے کیا یہ سمجھنے کی کوشش نہیں کی ہو گی کہ فلاں فلاں مسائل میں قرآن کا صریح تقاضا کیا ہے اور سنت کی نصوص کون کون سی ہیں اور وہ مسائل کون کون سے ہیں جن پر خیر القرون سے اجماع اور تواترِ عمل چلا آ رہا ہے! رہے ایسے مسائل جن کی تعبیر و قیاس کے بارے میں اختلاف ہے ان کی نوعیت بالکل دوسری ہے۔ ان میں البتہ ایک گنجائش ہو گی۔ میرے لیے بھی گنجائش ہو گی۔ آپ کے لیے بھی گنجائش ہو گی۔ خلف کے علماء کے لیے بھی گنجائش ہو گی کہ وہ بھی امام دین اور امام فقہ ہیں' یہ بھی امام دین اور امام فقہ ہیں' امام حدیث ہیں۔ اُن کی رائے یہ ہے' اِن کی رائے یہ ہے۔ تو فقہی مسائل میں میدان وسیع ہو گیا۔

(۱) حکومت وقت کو اس مسئلہ پر تشدد کی ضرورت اس لیے درپیش ہوئی کہ خلیفۂ وقت کے لیے بالعموم بالجبر بیعت لی جاتی تھی۔ اگر طلاق مکرہ کو غیر مؤثر تسلیم کر لیا جائے تو حکومت کو خطرہ لاحق تھا کہ جبری بیعت کو بھی اس پر قیاس کر کے بیعت مکرہ سمجھا جائے گا۔ اور اس طرح یہ بیعت غیر موثر ہو جائے گی۔ (مرتب)

لیکن یہ بات جان لیجیے کہ جن مسائل میں خلفاء اربعہ کا تعامل ہو' ائمہ اربعہ کا اتفاق ہو۔ سلفی مسلک رکھنے والوں کا اتفاق ہو ان سے باہر نکلنا میرے نزدیک فتنہ ہے۔

میں یہ بات پہلے بھی کہہ چکا ہوں اور آج پھر ڈنکے کی چوٹ کہتا ہوں کہ یہ محض جذباتی بات نہیں ہے بلکہ نہایت غور و فکر کے نتیجے میں میری پختہ اور اٹل رائے ہے کہ جن مسائل میں خلفاء اربعہ کا تعامل موجود ہو' ائمہ اربعہ کا اتفاق موجود ہو' محدثین متفق ہوں' تمام واجب الاحترام اور معتمد ترین رجالِ دین کی رائے جن مسائل میں یک جا ہو جائے' وہ مجمع علیہ مسائل کی فہرست میں ہیں اسی کا نام اجماع ہے۔ یہ اجماع بھی دین میں حجت ہے۔ یہ چوتھی دلیل کا حاصل ہے [(۱)]۔ اور اُس کے خلاف رائے دینا اور اپنی رائے پر اصرار کیے جانا میرے نزدیک یقیناً اور لاریب فتنہ ہے۔

میرے بعض احباب کو جن کے خلوص پر مجھے کوئی شبہ نہیں' مجھ سے شکایت پیدا ہوئی ہے کہ میں شاید ایک خاص معاملے میں سختی کر رہا ہوں۔ بعض نے مجھ سے کچھ ناراضگی کا بھی اظہار کیا ہے۔ میں ان تمام حضرات سے گزارش کروں گا کہ شخصیتوں کو سامنے رکھ کر خدارا نہ سوچئے بلکہ یہ سوچئے کہ مجمع علیہ مسائل یا اجماع سے ہٹ کر کسی نص' کسی دینی مسئلہ اور متفق علیہ حدود شرعیہ

(۱) آج سے کئی سال قبل امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے حالاتِ زندگی کے مطالعہ کا موقع ملا تھا۔ اس میں یہ بات بھی درج تھی کہ امام موصوف قرآن مجید سے بھی ''اجماع'' کے حجت ہونے کی دلیل کے متلاشی تھے۔ لیکن امام صاحب کا کہنا یہ تھا کہ تین مرتبہ تلاوت قرآن اور غور و فکر کے بعد بھی یہ دلیل نہ مل سکی (واضح رہے کہ کہا جاتا ہے کہ امام موصوفؒ عموماً تین دن میں قرآن کی تلاوت مکمل کر لیا کرتے تھے)۔ ایک روز امام رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے ''اجماع'' کے حجت ہونے کی دلیل بھی قرآن مجید سے ان پر واضح کر دی۔ انہوں نے بتایا کہ تین سو ایک مرتبہ تلاوت کے دوران اچانک ان کی نگاہ اس آیت پر جم گئی اور منکشف ہوا کہ اجماع کے حجت ہونے کی دلیل اس آیت میں موجود ہے۔ آیت یہ ہے: ﴿وَمَنْ يُّشَاقِقِ الرَّسُوْلَ مِنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدٰى وَ يَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيْلِ الْمُؤْمِنِيْنَ نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰى وَ نُصْلِهٖ جَهَنَّمَ ؕ وَ سَآءَتْ مَصِيْرًا۝۱۱۵﴾ (النساء) امام موصوف کی رائے یہ ہے کہ ''یہاں سبیل المؤمنین سے قطعی طور پر اجماع مراد ہے''۔ یہاں مؤمنین سے وہ مؤمنین صادقین' جیسے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین' جیسے تابعین' تبع تابعین' فقہاء امت' محدثین کرام' علماء حقانی مراد ہیں جن کے قلوب حقیقی ایمان و ایقان کے نور سے منور تھے نہ کہ ہم جیسے کچے پکے اور روائتی مسلمان۔ (مرتب)

کے خلاف راستہ نکالنا اور رائے دینا اور اجتہاد کرنا' اسلاف کے ساتھ قطع تعلق ہے یا نہیں! ان تمام کی متفق علیہ رائے پر اظہار عدم اعتماد ہے کہ نہیں! میں صاف صاف عرض کر دینا چاہتا ہوں کہ اس معاملے میں' میں کسی مداہنت کا روادار نہیں۔ میں اِسے حمیت و غیرتِ دین کے منافی سمجھتا ہوں۔ اس لیے مجھے اس کی کوئی پرواہ نہیں کہ کون خوش ہوتا ہے' کون ناخوش۔ کون راضی رہتا ہے اور کون ناراض ہو جاتا ہے۔ شخصیتوں کو چھوڑ کر مسئلہ کی face value پر تبادلہ خیال' افہام و تفہیم اور دینی استدلال کے لیے میں ہر وقت تیار ہوں' نہ کسی کی دلداری کبھی پیش نظر رہی ہے اور نہ کسی کی ناراضگی سے خوف کھایا ہے۔ کسے باشد۔ اپنے دینی فہم و شعور کے مطابق جس بات کو حق سمجھا ہے اُسے برملا بیان کیا ہے اور پھر اس کا اعادہ کرتا ہوں کہ میرے نزدیک خلفاء راشدین' ائمہ مجتہدین' محدثین کرام کی مجمع علیہ متفق علیہ رائے اور مسائل کے خلاف اب کوئی نئی رائے دینا اور کوئی نئی راہ نکالنا یقیناً فتنہ ہے۔

یہ ہیں وہ اصل الاصول جن کو ہمیشہ پیش نظر رکھیے۔ یہی معاملہ رجم کا ہے۔ زنا کی حد کی آیت قرآنی کے بموجب سو کوڑے غیر شادی شدہ مرد اور عورت کے لیے حد عام ہے' لیکن اُسے سنت رسول علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام نے' اور سنت خلفاء راشدین رضوان اللہ علیہم اجمعین نے شادی شدہ مرد اور عورت کی طرف سے زنا کے ارتکابِ جرم پر رجم کو مستقل حد قرار دے کر خاص کر دیا۔ اس پر اجماع چلا آ رہا ہے۔ خلفاء راشدین مہدیینؓ کے تعامل و تواتر کی پوری طرح تحقیق کے بعد فقہ کے مشہور ائمہ اربعہ نے شادی شدہ مرد و عورت کے لیے رجم کو ''حد'' قرار دیا۔ لہٰذا اس پر تواتر کے ساتھ اجماع چلا آ رہا ہے۔ اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل ہے۔ یہ ثابت شدہ سنت ہے۔ احادیث نبویہ ہیں۔ سنت اور حدیث دونوں جمع ہو گئیں۔ پھر یہ کہ خلفاء اربعہؓ کا اس پر عمل ہے۔ ائمہ اربعہ کا اس پر اجماع ہے۔ نہ صرف ائمہ اربعہؒ کا بلکہ اس میں امام بخاریؒ ہوں' امام مسلمؒ ہوں' امام ابن حزم ظاہریؒ ہوں۔ الغرض اہل سنت کے تمام معتمد علیہ محدثین کا اس مسئلہ میں کامل اتفاق ہے۔ اسی طرح اہل تشیع جو بالکل علیحدہ فرقہ ہے اس کے جو مستند ائمہ فقہ ہیں جن میں امام جعفر صادقؒ ہوں' امام زیدؒ ہوں' سب کے سب اس مسئلہ میں متفق ہیں کہ شادی شدہ مرد اور شادی شدہ عورت کی اسلامی مستقل حد ''رجم'' ہے۔ خوارج اور گنتی کے چند معتزلہ ہیں جو اسے حد تسلیم نہیں کرتے۔ یہ فرقے اہل سنت والجماعت سے علیحدہ تسلیم کیے گئے ہیں اور تسلیم کیے جاتے ہیں۔ اس پر علماء امت کا اجماع ہے۔ اب آپ خود ہی نتیجہ نکال لیجیے کہ اس متفق علیہ اور مجمع علیہ مسئلے کے خلاف ایک نیا راستہ نکالنا اگر فتنہ نہیں تو کیا ہے۔

قصاص و دیت کے مسئلہ کو بھی انہی دلائل سے سمجھ لیجیے۔ جو رجم کے اسلامی حد ہونے کے بارے میں' میں نے پیش کیے ہیں۔ چونکہ اصول تو ایک ہی نہیں۔ دیکھئے قرآن مجید میں قصاص والا مسئلہ سورۃ البقرۃ میں زیر بحث آیا ہے اور قتل خطا کی دیت کا ذکر سورۃ النساء میں ہے۔ لیکن مقادیر وغیرہ کا کوئی ذکر قرآن مجید میں موجود نہیں ہے۔ اس ضمن میں عورت اور مرد میں فرق ہے یا برابری ہے' اس کا کوئی ذکر قرآن مجید میں نہیں ہے۔ البتہ قرآن مجید کے دو اصول اور ہیں جن کو دینی اصطلاح میں ''نص'' کہا جاتا ہے۔ یعنی اس کی لفظ بلفظ (literally) تعمیل ہو گی۔ ایک عورت کی شہادت کا معاملہ ہے تو وہ مرد کی شہادت سے نصف ہو گی۔ دوسرے قانونِ وراثت کے پورے قانون کو دیکھیں گے تو عورت ترکہ میں مرد کے مقابلے میں نصف کی حق دار بنتی ہے۔ دلالۃ النص سے اگر آپ کوئی چیز ثابت کرنا چاہیں تو یہ دو اصول قرآن میں موجود ہیں' لیکن اور کوئی صریح نص موجود نہیں ہے۔ اب آپ حدیث کی طرف آیئے۔ نبی اکرم ﷺ کی ایک حدیث quote ہو رہی ہے اور عجیب بات یہ ہے کہ اس کے ساتھ ہی دوسری حدیث ہے اُسے دیکھنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ حضرت عمرو بن حزم ؓ کو حضور ﷺ نے ایک تحریر لکھوا کر دی' وہی quote ہو رہی ہے اس میں ایک کلی قانون بیان ہوا ہے اور اس کے الفاظ یہ ہیں کہ: فِی النَّفْسِ الْمُؤْمِنَةِ مِائَةٌ مِنَ الْاِبِلِ ''ایک مؤمن جان'' یہاں چونکہ عام ہے لہٰذا اس کا اطلاق دونوں پر ہو سکتا ہے مؤمن مرد پر بھی اور مؤمن عورت پر بھی(۱)۔ ''ایک مؤمن جان کی دیت قتل خطا کی صورت میں سو اونٹ ہوں گے۔ ایک دوسری حدیث میں یہ بات بھی موجود ہے: دِیَةُ الْمَرْأَۃِ عَلَی النِّصْفِ مِنْ دِیَةِ الرَّجُلِ ''عورت کی دیت مرد کی دیت کے مقابلے میں نصف ہے''(۲)۔ معلوم یہ ہوا کہ ایک حدیث نے دوسری حدیث کو خاص کر دیا۔ ایک میں عام ہے کہ قتل خطا کے مقابلے میں ایک مؤمن جان کی دیت سو اونٹ ہے۔ دوسرا قولِ نبویؐ موجود ہے کہ عورت کی دیت مرد کے مقابلے میں نصف ہے۔ ہم عام و خاص کی نسبت سے دونوں حدیثوں کو مانتے ہیں۔ دونوں کے مابین ایک ربط قائم ہے کہ ایک عام بات حضورؐ نے

(۱) لفظ ''المؤمنة'' سے مغالطہ نہ ہو۔ عربی کا قاعدہ ہے کہ اگر موصوف مؤنث ہو تو صفت بھی مؤنث کے صیغے میں استعمال ہو گی۔ نفس عربی زبان میں مؤنث ہے لہٰذا صفت بھی مؤنث آئی ہے' مراد جنس مؤمن ہے۔

(۲) ''ہدایہ'' جلد دوم میں وضاحت ہے کہ یہ حدیث حضرت علی ؓ سے موقوفاً مروی ہے اور یہ حدیث مرفوعاً بھی ثابت ہے۔ (مرتب)

فرمائی' اس کے ایک جزو کی حد تک خصوص دوسرے قول سے ہو گیا۔ لہٰذا ان دونوں کو سامنے رکھیے تو مسئلہ بالکل واضح ہو جائے گا۔ جو شخص اتباعِ رسول کا جذبہ رکھتا ہو گا' اُسے اب اس میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں ملے گی۔ وہ کوئی اپنا قول نہیں لگائے گا' اپنی کوئی دلیل نہیں دے گا۔

آگے چلیے۔ ہمارے خلفاء راشدین مہدیین میں چار میں سے تین کے اقوال موجود ہیں۔ حضرت عمر کا قول موجود' حضرت عثمان کا قول موجود' حضرت علی کا قول موجود (رضی اللہ تعالیٰ عنہم وارضاہم اجمعین) کہ عورت کی قتل خطا میں دیت مرد کے مقابلے میں نصف ہے۔ اسی پر ان کا قول' اسی پر ان کا عمل۔ صحابہ کرامؓ میں سے تین عبادلہ' بہت مشہور ہیں۔ حضرت عبداللہ بن مسعود ؓ وہ صحابی ہیں جن سے ساری فقہ حنفی چلی ہے۔ اسی لیے اس کو فقہ عبداللہ بن مسعود بھی کہا جاتا ہے۔ چونکہ کئی واسطوں سے ان ہی کے پیرو ہیں امام ابوحنیفہؒ۔ دوسرے عبداللہ بن عباس ؓ ہیں' جن کے لیے حضورؐ نے دعا کی تھی کہ ''اے اللہ اس نوجوان کو قرآن کا علم عطا فرما دے''۔ وہ حبر الامة کہلاتے ہیں۔ اُمت کے سب سے بڑے عالم۔ لہٰذا جو اکثر تفسیری روایات ہیں عموماً ان کے متعلق ہر معتمد تفسیر میں آخری بات حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی ملے گی۔ تیسرے حضرت عبداللہ بن عمر ؓ ہیں' تو حدیث کے سلسلے میں جو سلسلۃ الذہب مشہور ہے' جو سنہری زنجیر ہے' اس کی پہلی کڑی حضرت عبداللہ بن عمر ؓ ہیں (رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین)۔ یہ تین عبادلہ اس اعتبار سے بہت مشہور ہیں۔ ان تینوں کے اقوال بھی اس کے حق میں موجود ہیں۔ پھر حضرت زید بن ثابت ؓ ہیں جن کے بارے میں نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: اَفْرَضُ اُمَّتِیْ زَیْدُ بْنُ ثَابِت ''میری اُمت میں قانونِ وراثت کے سب سے بڑے عالم زید بن ثابت ہیں''۔ ان کا قول اس کے حق میں موجود ہے۔ کسی مسلمان کے لیے جس میں یہ جذبہ پیدا ہو چکا ہو کہ مجھے اسلام پر چلنا ہے' کیا اس کے لیے اس مسئلہ میں اتنے شواہد کے بعد بھی کسی شک و شبہ کی گنجائش باقی رہ جاتی ہے؟

آگے چلیے۔ ائمہ اربعہ' امام مالک' امام ابوحنیفہ' امام شافعی' امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہم کا اس پر اتفاق ہے۔ مزید یہ کہ اہل تشیع کے دو ائمہ امام جعفر صادق اور امام زید رحمہما اللہ کا بھی اس پر اتفاق ہے جیسے سب کا اتفاق رجم کے مسئلہ پر ہے۔ اب بتایئے کہ جس شخص کے دل میں کوئی رمق بھی ایسی موجود ہو کہ وہ اسلام کے مجمع علیہ' متفق علیہ تمام مسائل کو تسلیم کرنا چاہتا ہے' وہ اس مسئلہ میں کوئی اپنی علیحدہ رائے رکھنے پر اصرار کر سکتا ہے! یوں تو کوئی شاذ رائے اکثر معاملات میں مل جائے گی۔ مجمع علیہ اور متفق علیہ آراء کے مقابلے میں شاذ رائے کی کھوج کرید

کرنا اور اس سے دلیل پکڑنا چاہے وہ رائے الاصم کی ہو' چاہے ابن علیّہ کی ہو' آخر اس کی ضرورت کیا ہے۔ پھر یہ دیکھنا ہوگا کہ ان حضرات کا علمی اعتبار سے مقام و مرتبہ کیا ہے! ان کی حیثیت کیا ہے! کیا اہل سنت کے جو چار مسلک ہیں اور جو سلفی اور ظاہری مسلک ہیں' کیا ان مسالک میں سے کسی میں ان کی رائے اور قول کی کوئی اہمیت اور حیثیت ہے! صحابہؓ بالخصوص تین خلفاء راشدین کے قول و عمل' تابعینؒ' تبع تابعین' ائمہ اربعہ اور تمام معتمد فقہائے اسلام کے مجمع علیہ اور متفق علیہ رائے کے مقابلے میں اِدھر اُدھر سے کھود کرید کر کے کسی شاذ اور غیر معروف قول پر استدلال کی عمارت کھڑی کرنا اس ذہنیت کی غمازی کرتا ہے کہ اصل میں جذبہ تو ہے نہیں' پیروی تو کرنی نہیں' وہ ارادہ موجود ہی نہیں کہ ہم کو اسلام پر چلنا ہے اور اسلام پر عمل کرنا ہے۔ لہٰذا یہی ہوگا جو ہو رہا ہے۔ آدمی کے پاس زبان ہے اور گز گز بھر کی زبان بھی موجود ہے اور لوگوں کے ہاتھ میں قلم ہے جن کو ہمارے اخبارات نے گزوں لمبا کر دیا ہے۔ قلم کا پہلے اتنا فتنہ نہیں تھا جو اس دَور میں اخبارات کے ذریعے سے یہ فتنہ شدید تر ہو گیا ہے وہ تو چاہتے ہیں کہ controversies زیادہ سے زیادہ پیدا ہوں۔ سیاست کا میدان تو بند پڑا ہے اس کے حوالے سے جو گرما گرمی ہوتی تھی اور نمک مرچ ملتا تھا' اور اخبارات کی زینت بنتا تھا' وہ موجود نہیں تو جہاں سے بھی بحث و تمحیص کا دروازہ کھل جائے اسے وہ نمایاں کریں گے۔ چونکہ اس میں ان کے قارئین کی دلچسپی کا سامان ہے اس کے سوا ان کے پیش نظر کوئی مثبت یا منفی تعلق یا مقصد نہیں ہے۔ اگر کوئی منفی تعلق ہو تو ہو۔ باقی مثبت تعلق کا تو ڈھونڈے سے بھی پتا نہیں ملے گا۔ یہ ہے اصل معاملہ کہ اگر کسی کو بات سمجھنی ہو اور فی الواقع سمجھنا ہو تو اس میں قطعاً کسی شک اور شبہہ کی گنجائش نہیں ہے کہ قتل خطا میں مرد کے مقابلے میں عورت کی دیت نصف ہے۔

میں پھر عرض کروں گا کہ اصل بات یہ ذہن میں رکھیے کہ دو چیزیں ہیں۔ پہلی یہ کہ انفرادی اور اجتماعی سطح پر وہ will ہے یا نہیں۔ فیصلہ کن بات تو یہ ہے۔ دوسری یہ کہ جب انفرادی اور اجتماعی سطح پر will پیدا ہو جائے تو پھر عمل کے لیے ترتیب یہ ہے کہ پہلے اللہ کی کتاب ہے پھر سنت رسول ہے۔ اس سنت کے اندر صحابہ کرامؓ کے اقوال بھی آ جائیں گے۔ اس لیے کہ انہیں بھی احادیث کہا جاتا ہے۔ یہ بات بھی احادیث ہیں جو مرفوع نہیں موقوف ہیں' لیکن حدیث کے درجے میں شمار ہوتی ہیں۔ وہ سنت کا ایک جزو ہیں۔ اس پر نبی اکرمﷺ کے دو ارشادات دلالت کرتے ہیں۔ پہلا ارشاد ایک حدیث کا آخری حصہ ہے: مَا اَنَا عَلَيْهِ وَ

اَصْحَابِی ''ہدایت یافتہ اور راہ یاب لوگ وہ ہوں گے جو میرے (یعنی نبی اکرمﷺ) طریقے اور میرے اصحاب کے طریقے پر چلیں گے''۔ دوسرا ارشاد ہے: اَصْحَابِیْ كَالنُّجُوْمِ فَبِاَيِّهِمُ اقْتَدَيْتُمُ اهْتَدَيْتُمْ ''میرے صحابہ ستاروں کے مانند ہیں' ان میں سے تم جس کی بھی اقتدا' پیروی اختیار کرو گے' راہ یاب ہو گے''۔ پھر خاص طور پر خلفاء اربعہؓ کی سنت ہے۔ جس کے سنت ہونے پر ہمارے تمام ائمہ فقہاء اور تمام علماء حقانی بلکہ پوری امت کا اجماع ہے۔ جس کے لیے دلیل رسول اللہﷺ کی وہ حدیث ہے جو میں نے آغاز میں آپ کو سنائی تھی۔ اس کی تشریح کرنی باقی ہے۔ اس موقع پر وہ تشریح پیش کیے دیتا ہوں۔ اس حدیث سے ہمیں وہ رہنمائی بھی مکمل طور پر مل جائے گی' جس کی اس پُر فتن دَور میں ہم کو سخت احتیاج ہے۔ یہ حدیث حضرت عرباض بن ساریہ ؓ سے مروی ہے اور امام ابوداؤدؒ اور امام ترمذیؒ نے اسے ''حدیث حسن صحیح'' قرار دیا ہے۔ حضرت عرباض بن ساریہؓ روایت کرتے ہیں: وَعَظَنَا رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ مَوْعِظَةً وَّجِلَتْ مِنْهَا الْقُلُوْبُ وَ ذَرَفَتْ مِنْهَا الْعُيُوْنُ ــــ ''رسول اللہﷺ نے ایک مرتبہ ہمیں وعظ و نصیحت فرمائی اور نصیحت ایسی تھی کہ اس سے قلوب پر ایسی رقت طاری ہوئی کہ وہ لرز گئے اور آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے''۔ فَقُلْنَا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ كَاَنَّهَا مَوْعِظَةُ مُوَدِّعٍ فَاَوْصِنَا ــــ ''ہم نے عرض کیا کہ اے اللہ کے رسولﷺ! یہ نصیحت تو ایسے محسوس ہو رہی ہے جیسے آپﷺ ہم سے رخصت ہو رہے ہیں! (اگر یہ اسی نوعیت کی ہے) تو ہمیں مزید وصیت و نصیحت فرمایئے''۔ قَالَ ((اُوْصِيْكُمْ بِتَقْوَى اللّٰهِ وَالسَّمْعِ وَالطَّاعَةِ وَاِنْ تَاَمَّرَ عَلَيْكُمْ عَبْدٌ)) ــــ ''حضورﷺ نے فرمایا کہ میں تمہیں اللہ کا تقویٰ اختیار کرنے کی اور سمع و طاعت کی روش پر کاربند رہنے کی وصیت کرتا ہوں خواہ تمہارا امیر ایک غلام ہی کیوں نہ ہو!'' اس وصیت کے آخری حصے میں یہ حکمت ہے کہ غلام یا غلام زادے کا امیر بننا عرب جیسی آزاد اور خودسر قوم کے نفس پر بڑا شاق گزرنے کا احتمال تھا۔ نبی اکرمﷺ نے اس کی اس موقع پر پیش بندی فرما دی۔ اس کے بعد رسول اللہﷺ نے فرمایا: ((فَاِنَّهُ مَنْ يَّعِشْ مِنْكُمْ بَعْدِیْ فَسَيَرٰى اخْتِلَافًا كَثِيْرًا)) ــــ ''تم میں سے جو کوئی بھی میرے بعد زندہ رہا وہ جلد ہی کثیر اختلافات دیکھے گا''۔ آگے حضور ہدایت اور راہنمائی فرما رہے ہیں کہ اختلافات کے زمانے میں امت کے لیے مشعل راہ کون سی ہے! روشنی کا مینار کون سا ہے! ارشاد ہوا: ((فَعَلَيْكُمْ بِسُنَّتِیْ وَ سُنَّةِ الْخُلَفَاءِ الرَّاشِدِيْنَ الْمَهْدِيِّيْنَ)) ''پس تم پر واجب ہے' لازم ہے کہ میری سنت اور میرے تربیت و ہدایت یافتہ' صراط مستقیم پر

گامزن خلفاءؓ کی سنت کو کچلیوں کے ساتھ مضبوطی سے تھامنا''۔ آگے فرمایا: ((وَاِیَّاکُمْ وَ مُحْدَثَاتِ الْاُمُوْرِ فَاِنَّ کُلَّ بِدْعَةٍ ضَلَالَةٌ)) — ''اور دیکھنا دین میں جو نئی چیز ایجاد کی جائے گی وہ بدعت ہوگی اور بدعت گمراہی ہوتی ہے۔''

اس کے بعد تابعین، تبع تابعین، ائمہ فقہاء کا جس مسئلہ پر اجماع ہو جائے تو میں سمجھتا ہوں کہ اس سے علیحدہ اور اُس سے باہر کوئی نیا راستہ کوئی ایسا شخص نہیں نکالے گا جس کے دل میں حقیقی دین پر عمل پیرا ہونے کے جذبے کی کوئی رمق بھی موجود ہو۔ اگر نکالے گا تو وہ اسی دائرے اور اسی زمرے میں آ جائے گا کہ ﴿وَ مَنْ یَّبْتَغِ غَیْرَ الْاِسْلَامِ دِیْنًا فَلَنْ یُّقْبَلَ مِنْهُ ۚ وَهُوَ فِی الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِیْنَ○﴾ (آل عمران) جو شخص بھی فرماں برداری (اسلام) کے سوا کوئی اور طریقہ اور راستہ اختیار کرنا چاہے گا، اس کا وہ طریقہ ہرگز قبول نہیں کیا جائے گا اور وہ آخرت میں نامراد و خاسر رہے گا۔ لہٰذا جو بھی اسلام کے احکام و قوانین کے علاوہ اور ضابطے اور طریقے کا متلاشی ہے، وہ تو باہر اِدھر اُدھر جھانکے گا اور اپنی رائے کے لیے عقلی اور نقلی دلیلیں گھڑے گا۔ وہ ﴿وَمَنْ یَّبْتَغِ غَیْرَ الْاِسْلَامِ دِیْنًا﴾ کے زمرے میں آ جائے گا۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اور تمام مسلمانوں کو اس سے محفوظ رکھے۔ آمین!

جہاں تک عقل کا تعلق ہے تو میں پورے انشراحِ صدر سے کہتا ہوں کہ عقل بھی اس کے حق میں ہے۔ عقل تسلیم کرتی ہے کہ قوتِ کار کے اعتبار سے اور معاشی کفالت کے لحاظ سے مرد کی منفعت عورت کے مقابلے میں کہیں زیادہ ہے[1]۔ اس دلیل سے میراث میں، قانونِ شہادت میں اور زیرِ گفتگو قتل خطا کی صورت میں عورت کی دیت میں نصف کی نسبت عقل کے تقاضے کے عین مطابق ہے۔ اسی طریقے سے رجم کے ''حد'' ہونے کے منکرین بھی عقل کے اعتبار سے اندھے اور کورچشم ہیں کہ وہ گویا عقلی اعتبار سے یہ فیصلہ کر رہے ہیں کہ شادی شدہ اور غیر شادی شدہ زانی برابر کے مجرم ہیں، ذرا ان کی عقل پر ماتم کیجیے۔ ایک پیٹ بھرا انسان چوری کرے اور ایک غیر پیٹ بھرا انسان چوری کرے، کیا یہ برابر ہو جائیں گے! ایک چوری ہے جو ہیرے جواہرات کی کی جا رہی ہے، ایک چوری وہ ہے جو روٹی کی کی گئی ہے یا راہ چلتے کسی باغ

(۱) ''ہدایہ'' میں علامہ مرغینانیؒ کا یہ قول موجود ہے: وَلِاَنَّ حَالَهَا اَنْقَصُ مِنْ حَالِ الرَّجُلِ وَمَنْفَعَتُهَا اَقَلُّ ''بلاشبہ عورتوں کی قوت کار اور ان کی منفعت مرد سے بہت کم ہے''۔ یہاں انقص، اور اقل کے الفاظ نہایت قابل غور ہیں۔ (مرتب)

کے پھل توڑ کر اپنا پیٹ بھرا گیا ہے۔ کیا یہ چوریاں برابر سمجھی جائیں گی! شریعت نے انہیں برابر نہیں رکھا۔ حضرت عمرؓ نے اپنے دورِ خلافت میں قحط کی حالت میں قطع ید کی سزا بالکل ساقط کر دی تھی اس لیے کہ شبہ موجود تھا کہ انسان چاہے چوری کسی شکل میں کر رہا ہو لیکن ہوسکتا ہے اور ظن غالب ہے کہ بھوک اس کا اصل سبب بن گیا ہو۔ تو کہاں ایک پیٹ بھرے انسان کا چوری کرنا اور کہاں ایک بھوکے انسان کا چوری کرنا! اسی پر قیاس کیجیے کہ کہاں ایک شادی شدہ انسان کا زنا کرنا! اور کہاں ایک غیر شادی شدہ انسان کا زنا کرنا! کیا عقل اس کو برابر تسلیم کر سکتی ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اُن لوگوں کی عقل پر آنسو بہایئے اور ان کے حق میں دعا کیجیے جو ان دونوں کو برابر قرار دیتے ہیں۔ حالانکہ وہ بڑے rationalist ہونے کے مدعی ہیں۔ بڑے عقل پسند اور عقل پرست ہونے کے دعویدار ہیں۔

یہی معاملہ قصاص اور دیت کا ہے کہ اس مسئلہ میں خلط مبحث کر دیا گیا ہے۔ قتل خطا کی جو دیت ہے وہ جان کی قیمت ہے ہی نہیں۔ جان کی قیمت کا مسئلہ قتل عمد میں آتا ہے اور وہاں بھی اصل الاصول یہ ہے کہ جان کی قیمت جان ہے پیسہ نہیں ہے قاتل کی جان تو مقتول کے ورثاء کے حوالے کر دی گئی ہے۔ اب قاتل کی جان ان کے رحم و کرم پر ہے۔ اب وہ چاہیں تو اس کی جان لینے کا فیصلہ کریں، چاہیں تو قاتل کی جان کا معاوضہ قبول کر لیں۔

گویا قتل عمد کی دیت دے کر قاتل اپنی جان بچاتا ہے وہ مقتول کی جان کا معاوضہ نہیں ہے اس لیے کہ مقتول کی جان کے بدلے تو قاتل کی جان حاضر ہے۔

البتہ قتل خطا میں جان کی قیمت کا معاملہ نہیں ہے۔ وہ کسی حد تک اس نقصان کی تلافی ہے جو مقتول کے خاندان کو پہنچا ہے۔ اس میں یقیناً عورت کی دیت مرد کے مقابلے نصف ہے اور وہ اس ذمہ داری اور اسلام کے فلسفہ عمرانیات کے اعتبار سے ہے کہ مرد کمانے والا ہے، عورت نہیں ہے۔ کسی خاندان کے مرد کا خطا سے کسی کے ہاتھ یا کسی کی بے احتیاطی سے ہلاک ہو جانا زیادہ بڑا نقصان ہے بمقابلہ عورت کے۔ یہ عقلی بنیاد بھی موجود ہے جس کے باعث شریعت میں یہ فرق رکھا گیا ہے۔

یہاں ایک اہم بات اور بھی عرض کر دوں، اگر عقل حاکم ہو جائے گی نقل پر، تو یہ اسلام کے خلاف راستہ ہے۔ اسلام اصلاً عقل پر نہیں بلکہ نقل پر قائم ہے۔ یہ نقل ہے وحی، اللہ کی جانب سے بذریعہ جبرئیل امین علیہ السلام منقول کی گئی ہے جناب محمد رسول اللہ ﷺ تک۔ قرآن بھی منقول

ہے‘ یہ بھی ایک روایت ہے۔ اس کے راویٔ اول کون ہیں! جبرئیل امینؑ اور راویٔ دوم کون ہیں! جناب محمد رسول اللہ ﷺ۔ پھر یہ روایت چلی آ رہی ہے‘ نبی اکرم ﷺ نے یہ قرآن صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو دیا۔ صحابہ سے تابعین کو ملا۔ ان سے تبع تابعین نے لیا اور اس طرح نسلاً بعد نسلٍ قرآن مجید روایت اور نقل ہوتے ہوئے ہم تک پہنچا اور اسی طرح یہ نقل ہوتا چلا جا رہا ہے۔ یہ قرآن نقل ہے۔ اس کی اساس عقل پر نہیں ہے‘ ہاں جب آپ عقل کو اس کے تابع رکھ کر اس سے کام لیں گے تو یہ بہت مفید شے ہے‘ بڑی طاقت ور شے ہے۔ یہ عقل آپ کو اس نقل پر مطمئن کرے گی۔ اس بات کو علامہ اقبال نے بڑے پیارے انداز میں بیان کیا ہے۔ ان کا ایک شعر ہے ؎

گزر جا عقل سے آگے کہ یہ نور　　　چراغِ راہ ہے‘ منزل نہیں ہے!

قرآن مجید میں بھی بار بار دعوت ہے کہ قرآن کو پڑھو‘ اس پر غور و تدبر کرو‘ اس کے فہم کے لیے عقل سے کام لو۔ متعدد آیات میں سے دو کے حوالوں پر اکتفا کرتا ہوں۔ سورۃ الروم میں فرمایا: ﴿وَ مِنۡ اٰیٰتِہٖ یُرِیۡکُمُ الۡبَرۡقَ خَوۡفًا وَّ طَمَعًا وَّ یُنَزِّلُ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَیُحۡیٖ بِہِ الۡاَرۡضَ بَعۡدَ مَوۡتِہَا ؕ اِنَّ فِیۡ ذٰلِکَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوۡمٍ یَّعۡقِلُوۡنَ ﴿۲۴﴾﴾۔ سورۂ یٰسٓ میں ارشاد ہوا: ﴿وَمَنۡ نُّعَمِّرۡہُ نُنَکِّسۡہُ فِی الۡخَلۡقِ ؕ اَفَلَا یَعۡقِلُوۡنَ ﴿۶۸﴾﴾. قرآن جو اصلاً نقل ہے اس کے لیے عقل کلید اور دلیل کا کام دے سکتی ہے لیکن مجرد عقل معرفت الٰہی اور شریعت کے حِکَمْ اور رموز صحیح فہم و ادراک کے لیے ہرگز کفالت نہیں کرے گی۔ اس کو بھی علامہ اقبال نے خوب ادا کیا ہے ؎

عقل گو آستاں سے دور نہیں　　　اس کی تقدیر میں حضور نہیں!

لیکن! یہاں یہ ’’لیکن‘‘ نہایت قابل غور ہے‘ it is a very big but لیکن اگر آپ نے اس نقل یعنی قرآن پر عقل کو حاکم بنا دیا تو جان لیجیے کہ چاہے آپ کہتے رہیں کہ آپ قرآن کو مانتے ہیں‘ درحقیقت آپ قرآن کو نہیں اپنی عقل کو مانتے ہیں اور اس کی رو سے قرآن کو interpret کر رہے ہیں۔ ہمارے یہاں عملی اعتبار سے قرآن کی interpretation بالکل وہی ہے جو رسول اللہ ﷺ سے ثابت ہو۔ پھر اگر ہماری تاریخ کے ادوار میں حضورؐ سے لے کر تا امروز جن مسائل میں تسلسل‘ تواتر اور اجماع موجود ہو تو دوسری کوئی بات کہنے کا کسی کو حق ہی نہیں ہے۔ الا یہ کہ قرآن پر کسی وجہ سے اعتماد نہ رہا کہ یہ مُنَزَّل مِنَ اللّٰہ ہے اور دل میں شک اور ریب کے کانٹے چبھ گئے ہوں۔ اللہ تعالیٰ اس گمراہی‘ اس ضلالت سے مجھے‘ آپ کو اور جمیع المسلمین کو اپنی حفظ و امان میں رکھے۔

وَ اٰخِرُ دَعۡوَانَا اَنِ الۡحَمۡدُ لِلّٰہِ رَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ

قتلِ خطا میں عورت کی نصف دیت کا مسئلہ

محترم مجیب الرحمٰن شامیؔ ایک معروف اہل قلم ہیں۔ ذہنی وفکری طور پر اُن کا تعلق ملک کی ایک معروف نیم دینی و نیم سیاسی جماعت سے ہے۔ کئی جرائد کے مدیر اعلیٰ رہ چکے ہیں۔ فی الوقت ماہنامہ ’’قومی ڈائجسٹ‘‘ لاہور سے نکال رہے ہیں نیز معاصر عزیز ’’نوائے وقت‘‘ میں ’’جلسہ عام‘‘ کے عنوان سے ایک مستقل کالم بھی لکھ رہے ہیں جس میں طنز و مزاح کا عنصر غالب رہتا ہے۔ اکتوبر کے اواخر میں موصوف نے اسی کالم میں قتل خطا کی صورت میں محترم ڈاکٹر صاحب کی رائے پر (جو سنت سے ماخوذ ہے) اسی انداز سے اختلافی تبصرہ کیا تھا۔ محترم ڈاکٹر صاحب نے موصوف کو اس کا جواب براہِ راست بھیج دیا تھا۔ یہ جواب دو پیراگراف حذف کر کے ’’نوائے وقت‘‘ میں شائع بھی ہو گیا تھا۔ اب اسے من وعن قارئین ’’میثاق‘‘ کے استفادہ کے لیے شائع کیا جا رہا ہے۔ حذف شدہ پیراگراف پر بریکٹ لگا دیے گئے ہیں۔ (ادارہ)

برادرم مجیب الرحمٰن شامی صاحب‘ السلام علیکم ورحمۃ اللہ

آپ نے چند روز قبل بھی میرا ذکر اپنے کالم میں کیا تھا اور آج پھر کرم فرمائی کی ہے۔ اس ضمن میں جہاں تک میری ذات کا تعلق ہے مجھے ہرگز اعتراض نہیں ہے کہ آپ اسے اپنے ذوقِ طبع کی تسکین کی خاطر یا مروّجہ صحافت کی ضرورت کے طور پر ہدفِ طنز و طعن بنائیں بلکہ اس ضمن میں اگر کوئی زیادتی آپ نے اب تک کی ہے تو مَیں اسے بھی معاف کرتا ہوں اور آئندہ کے لیے بھی پیشگی اجازت دیتا ہوں کہ آپ جیسے چاہیں مشقِ ستم فرمائیں۔ لیکن خدارا دین و شریعت کے ایک اہم مسئلے کو اس تمسخر و استہزاء کی لپیٹ میں نہ لیں۔ اس لیے کہ یہ ع ’’بازی بازی باریش بابا ہم بازی‘‘ والا طرزِ عمل آخرت کے خسران اور عاقبت کی بربادی کا موجب بن سکتا ہے۔ اللہ مجھے اور آپ کو اس سے بچائے۔ آمین!

[واقعہ یہ ہے کہ میں جس طرح عملی یا انتخابی سیاست سے کنارہ کش ہوں‘ اسی طرح

خدمت دین کے وسیع و عریض میدان میں بھی فروعی مسائل اور فقہی اختلافات کے دائرے میں بالکل دخل نہیں دیتا۔ اس کی وجہ یہ بھی ہے کہ مَیں اپنے آپ کو اس کا اہل نہیں سمجھتا' اور یہ بھی ہے کہ میرے نزدیک فی الوقت ان مسائل میں الجھنا دین کے لیے بجائے مفید ہونے کے اُلٹا مضر ہوسکتا ہے' اس لیے کہ اس وقت ہمارے معاشرے میں بحیثیت مجموعی دین پر عمل پیرا ہونے کا ارادہ ہی مضمحل ہے۔ لہٰذا اصل ضرورت اس ارادے کی تقویت کی ہے۔ چنانچہ الحمد للہ کہ میری تمام جدوجہد اسی نکتے پر مرکوز ہے —— یعنی قرآنِ حکیم کی ان اساسی تعلیمات کی نشر و اشاعت جن سے ایمان و یقین میں اضافہ ہو اور دین کو پہلے خود اپنی زندگیوں' پھر اپنے وطن عزیز اور بالآخر پورے کرۂ ارضی پر غالب کرنے کی جدوجہد کا عزم اور ارادہ پیدا ہو۔

چنانچہ دو ڈھائی سال قبل پردے وغیرہ سے متعلق جو ہنگامہ میرے حوالے سے ہوا تھا اُس کا آغاز بھی مَیں نے اپنی کسی سکیم یا منصوبے کے تحت نہیں کیا تھا بلکہ وہ بھی ایک سابق رفیق اور ہمسفر کی ''کرم فرمائی'' تھی۔ البتہ جب بحث چل نکلی تو میں نے اپنے فہم کے مطابق دینی موقف کو ڈٹ کر پیش کیا تھا۔ پھر عورت کی شہادت سے متعلق بحث زور شور سے چلی' لیکن میں نے اس میں قطعاً کوئی حصہ نہیں لیا۔ اسی طرح جب سے قتل خطا میں عورت کی دیت سے متعلق بحث چھڑی ہے' میں نے اس میں بھی قطعاً کوئی حصہ نہیں لیا' نہ تحریراً نہ تقریراً' اس لیے بھی کہ جیسے کہ میں عرض کر چکا ہوں یہ میرا میدان نہیں ہے اور اس لیے بھی کہ یہ مسئلہ مجھ سے کہیں بڑھ کر اہل تر ہاتھوں میں تھا۔ چنانچہ جماعت اسلامی کے اہل علم و عقل وضاحت کر چکے تھے اور اہل حدیث' دیوبندی اور بریلوی ہر مکتب فکر کے علماء کرام نے بھی اس کا حق ادا کر دیا تھا۔ البتہ چونکہ مجھے ہر ہفتے اجتماعِ جمعہ کی صورت میں ایک جلسہ عام میں پیش ہونا پڑتا ہے۔ لہٰذا جو مسائل فضا میں گردش کر رہے ہوں' ان سے بالکل صَرفِ نظر ممکن نہیں ہوتا۔ چنانچہ ایک خطاب جمعہ میں مَیں نے اس موضوع پر اظہارِ خیال کیا' اور میرے ایک بزرگ رفیق نے اس کا کچھ حصہ ٹیپ سے اُتار کر اور آغاز و اختتام کے لیے اِدھر اُدھر چند جملوں کا اضافہ کر کے بغرض اشاعت اخبارات کو ارسال کر دیا۔ گویا یہ ہے میرے اس موضوع پر ''بولنے'' یا ''نہ بولنے'' کا معاملہ!!]

اب آیئے اصل مسئلے کی جانب:

اس ضمن میں جہاں تک ''عقل'' کا تعلق ہے' یہ تو آپ بھی جانتے ہوں گے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ جنس گرانمایہ برٹرینڈ رسل اور اس کے قبیل کے بے شمار لوگوں کو میرے اور آپ کے

مقابلے میں بہت زیادہ دی تھی لیکن جس طرح حضور ﷺ نے مال و اسباب دنیوی کے بارے میں فرمایا ہے: ((مَا قَلَّ وَكَفٰى خَيْرٌ مِمَّا كَثُرَ وَاَلْهٰى)) یعنی ''جو کم ہو لیکن ضرورت پوری کر دے وہ اس سے بہتر ہے جو زیادہ تو ہو' لیکن غافل کر دے!'' اُسی طرح اُس ٹنوں عقل کے مقابلے میں جو اللہ کو پہچاننے سے قاصر رہ جائے' ہماری وہ تولہ یا ماشہ بھر عقل بہتر ہے جو اللہ کو پہچانتی اور مانتی ہے۔ اقبالؔ نے اس حقیقت کو یوں بیان کیا کہ ؎

بر عقل فلک پیما تُرکانہ شبیخوں بہ
یک ذرۂ دردِ دل از علم فلاطوں بہ!!

ثانیاً —— شریعت کا دار و مدار اصلاً ''عقل'' پر نہیں ''نقل'' پر ہے اس لیے کہ اس میں حجت اول کی حیثیت حاصل ہے کلام ربانی کو جو اللہ سے بذریعہ جبرئیلؑ رسول اللہ ﷺ کو ''منتقل'' ہوا۔ پھر حجت ثانی کی حیثیت حاصل ہے سنت رسولؐ کو جو اولاً صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے ذریعے اور بعد ازاں نسلاً بعد نسلٍ امت کے تواتر عمل اور تدوین و اشاعت حدیث رسولؐ کے ذریعے ''منتقل'' ہوتی آ رہی ہے۔ لہٰذا اللہ اور اس کے رسولؐ پر ایمان رکھنے والی عقل کا اصل کام اس میدان میں یہ ہے کہ احکامِ شریعت کے اسرار و حِکم کو سمجھنے کی کوشش کرے۔ جہاں وہ سمجھ میں آ جائیں' اللہ کا شکر ادا کرے اور جہاں کوئی بات سمجھ میں نہ آئے' وہاں بھی ''سمعنا و اطعنا'' کا طرزِ عمل اختیار کرے۔ اس کے برعکس اگر ''عقل'' شریعت پر ''حاکم'' بننے کی کوشش کرے گی تو سخت ٹھوکر کھائے گی اور اوندھے منہ گر کر رہے گی۔ اس قسم کے عقلیت پرست یا عقل گزیدہ لوگوں کی ہمارے یہاں متعدد قسمیں پائی جاتی ہیں۔ چنانچہ ہمارے درمیان کچھ ایسے لوگ بھی موجود ہیں جو ''اجتہاد'' کا کوئی راستہ قرآن سے بھی بالا بالا اپنانا چاہتے ہیں۔ جس زمانے میں عورت کی شہادت کے مسئلے پر زور شور سے بحث ہو رہی تھی ایک انگریزی اخبار میں کسی مراسلہ نگار کا مراسلہ شائع ہوا تھا کہ ہمیں ماننا پڑتا ہے کہ قرآن واقعتاً عورت کو مرد کے مقابلے میں ثانوی درجہ دیتا ہے' لہٰذا ہمیں اجتہاد کے لیے ایسے اصول تلاش کرنے ہوں گے جو قرآن سے بھی بالاتر ہوں۔ پھر ایسے لوگ تو کثیر تعداد میں موجود ہیں جو سنت رسولؐ کو دائمی حجت نہیں مانتے بلکہ اس سے بے نیاز اور آزاد ہو کر براہِ راست قرآن سے استنباط کرنا چاہتے ہیں۔ ایسے لوگوں کی عقلی جولانیوں کی ظاہر ہے کوئی حد نہیں ہے بلکہ ''بے حیا باش ہر چہ خواہی کن'' کے مصداق اُنہیں کلی اختیار حاصل ہے جو چاہے کہہ دیں۔ تماشا یہ ہے کہ ایسے لوگوں میں وہ بھی شامل ہیں جو اُس شخصیت سے نسبت پر فخر کرتے ہیں جس کا قول یہ ہے کہ ؎

بمصطفیٰؐ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اُوست
اگر باو نہ رسیدی تمام بولہبی است!!

ثالثاً — اہل سنت کے نزدیک سنت رسولؐ کے ساتھ ساتھ اور اس سے بالکل ملحق دو چیزیں اور بھی ہیں: ایک حدیث نبویؐ "مَا اَنَا عَلَیْہِ وَ اَصْحَابِیْ" کی رو سے تعامل صحابہؓ اور دوسرے حدیث نبویؐ "عَلَیْکُمْ بِسُنَّتِیْ وَسُنَّۃِ الْخُلَفَاءِ الرَّاشِدِیْنَ" کے مطابق خلفاءِ راشدین کا طرزِ عمل، اور اس کے بعد حجت شرعی کی حیثیت حاصل ہے "اجماعِ امت" کو جسے قرآن مجید نے "سَبِیْلُ الْمُؤْمِنِیْنَ" سے تعبیر فرمایا ہے۔ اس ضمن میں اجماع سے متعلق فنی بحثوں سے قطع نظر اہل سنت کے نزدیک تو کسی مسئلے میں ائمہ اربعہ کا اجماع و اتفاق بجائے خود دلیل و حجت قطعی کا درجہ رکھتا ہے، اس سے بھی آگے بڑھ کر جن مسائل میں اہل سنت کے چاروں مسلکوں کے ساتھ ساتھ اہل تشیع کی زیدی اور جعفری دونوں فقہیں، اور اہل ظاہر کے اہم مسالک بھی متفق ہو جائیں اُن کے شریعت اسلامی کے جزو لاینفک ہونے پر تو کوئی ایسا شخص ہی کلام کر سکتا ہے جس میں دین کے اتباع کا نہیں بلکہ اُس سے بغاوت کا جذبہ کارفرما ہو۔ اس لیے کہ اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ اُس کے نزدیک امام ابوحنیفہؒ اور اُن کے نامور تلامذہؒ امام مالکؒ امام شافعیؒ امام احمد بن حنبلؒ اور امام جعفر صادقؒ سب یا تو نصوص دینی کا صحیح علم نہیں رکھتے تھے یا پھر دین کے مقاصد و مصالح کے صحیح فہم سے قاصر تھے۔ اور یہ بات یا کوئی فاتر العقل کہہ سکتا ہے یا دین کا باغی۔ البتہ اُن حضرات کے مابین کسی مسئلہ میں دو آراء پائی جائیں تو کسی دوسرے کے لیے کچھ کہنے کی گنجائش پیدا ہو جاتی ہے۔

[فقہی معاملات میں عقل و نقل کے عمل دخل کے دائروں کے ضمن میں ایک دلچسپ مکالمہ امام ابوحنیفہ اور امام جعفر صادق رحمۃ اللہ علیہما کا منقول ہے۔ ایک ملاقات میں امام جعفر صادقؒ نے امام ابوحنیفہؒ سے خفگی کے ساتھ فرمایا: "ہم نے سنا ہے کہ آپ ہمارے نانا کی احادیث پر اپنے عقلی قیاس کو مقدم رکھتے ہیں؟" اس پر امام ابوحنیفہؒ نے ع "یہ ہوائی کسی دشمن نے اُڑائی ہو گی" کے انداز میں فرمایا: "اگر میں عقل سے فیصلہ کرتا تو وراثت میں بیٹی کو بیٹے سے دوگنا حصہ دلاتا کہ وہ صنف ضعیف ہے اور عورت کے ایام کی نمازوں کی قضا کو واجب قرار دیتا نہ کہ روزے کی قضا کو، اس لیے کہ نماز روزہ سے اہم تر ہے۔"]

قتل خطا کی صورت میں عورت کی دیت کے مرد کے مساوی یا نصف ہونے کے مسئلے میں

متذکرہ بالا دینی حجتوں کا جائزہ لیا جائے تو جو صورتِ حال سامنے آتی ہے وہ یہ ہے:

(۱) قرآنِ مجید میں اس مسئلے پر کوئی صراحت تو موجود نہیں، لیکن اگر کوئی شخص قرآن کے قانونِ شہادت اور قانونِ وراثت کو اس معاملے میں دلالۃ النص یا اشارۃ النص کے درجے میں پیش کرے تو اس سے اختلاف تو کیا جا سکتا ہے لیکن اس کا قطعی انکار نہیں کیا جا سکتا۔

(۲) حدیث نبویؐ کے ضمن میں بھی کوئی درجۂ اول کی مستند حدیث تو اس معاملے میں موجود نہیں تاہم ایک حدیث موجود ہے جسے عورت کے دیت کے نصف ہونے کے حامی حضرات نے بار بار پیش فرمایا ہے جسے فریق ثانی ضعیف قرار دے رہا ہے۔ لیکن اس کے مقابلے میں اُس فریق ثانی کے پاس اپنے موقف کے حق میں کوئی ضعیف تو کیا موضوع حدیث بھی موجود نہیں۔

(۳) اِس کے بعد اجماع کو لیجیے۔ تو یہاں معاملہ حد درجہ فیصلہ کن ہے۔ حنفی، مالکی، شافعی، حنبلی، جعفری، الغرض تمام مسلکوں کا متفق علیہ اور مجمع علیہ فیصلہ عورت کی دیت مرد کے مقابلے میں نصف ہونے کے حق میں ہے۔ صرف ایک دو شاذ آراء برابری کے حق میں ہیں، جن کی اُن جملہ مسالک کے اتفاق و اجماع کے مقابلے میں کوئی حیثیت نہیں۔

اب ذرا عقلی اعتبار سے بھی جائزہ لے لیں۔

(۱) خالص عقلی لحاظ سے دیکھا جائے تو قتل خطا کا کوئی تاوان قاتل کے ذمے آنا ہی نہیں چاہیے۔ اس لیے کہ اس فعل میں اُس کے کسی ارادے کا دخل نہیں ہے۔

(۲) شریعت نے اس کے باوجود قاتل یا اُس کی برادری پر تاوان ڈالا — تو اس میں دو حکمتیں سمجھ میں آتی ہیں: (الف) یہ کہ اس سے دوسروں میں احتیاط کا مادہ پیدا ہو گا۔ اس کے برعکس اگر قتل خطا میں قاتل یا اُس کی برادری پر کوئی تاوان نہ ہو تو لوگوں میں بے پروائی اور بے احتیاطی پیدا ہو جانے کا اندیشہ ہے۔ اور (ب) اس سے مقتول یا مقتولہ کے ورثاء کے نقصان کی کسی درجے میں تلافی ہو جائے گی۔

اس نقصان کے ضمن میں بھی یہ بات تو بالکل ظاہر و باہر ہے کہ مقتول یا مقتولہ کے ورثاء اور اعزہ و اقارب کو جو ذہنی اور جذباتی صدمہ پہنچتا ہے اُس کی تلافی کی تو کوئی صورت کسی درجے میں بھی ممکن نہیں ہے۔ زیادہ سے زیادہ کوشش مالی نقصان ہی کی تلافی کی ہو سکتی ہے، اور

اس کے سلسلے میں جب کوئی قانون بنایا جائے گا تو ایک عام اور اوسط درجے کے معاملے کو سامنے رکھ کر بنایا جائے گا نہ کہ شاذ اور استثنائی صورتوں کو سامنے رکھ کر۔ مثلاً یہ ہوسکتا ہے کہ مقتول کوئی بوڑھا اور مریض انسان ہو جو اپنے ورثاء کے لیے مالی اعتبار سے ''اثاثہ'' ہونے کے بجائے اُلٹا ایک ''بوجھ'' ہو' اور اس کی موت سے اس کے ورثاء کو نہ صرف یہ کہ کوئی مالی نقصان نہ پہنچے بلکہ خالص مالی اعتبار سے ایک بوجھ سے نجات ملے۔ اس کے برعکس وہ مثال جو آپ نے دی ہے کہ مقتولہ ایک بیوہ اور بے سہارا عورت ہو جو اپنے یتیم بچوں کی واحد کفیل ہو' لیکن ظاہر ہے کہ قانون ہر انفرادی معاملے کے لیے علیحدہ نہیں ہوسکتا بلکہ قانون اوسط پر بنایا جائے گا۔

اب اس عمومی قانون کی رو سے اسلام نے خاندان کی کفالت کا بوجھ عورت پر نہیں بلکہ مرد پر ڈالا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ شریعت اسلامی ماں باپ کی وراثت میں بیٹے کے مقابلے میں بیٹی کو نصف حصہ دلاتی ہے۔ تو یہاں عقل کا فیصلہ اس کے سوا اور کیا ہوسکتا ہے کہ قتل خطا میں بھی عورت کی دیت مرد سے نصف ہو۔ شرط صرف یہ ہے کہ وہ عقل شریعت کے مقابلے میں بغاوت اور نشوز کے جراثیم سے مأمون و مصئون ہو!!

رہی آپ کی وہ جذباتی مثال کہ ایک بیوہ ہے جو اپنے یتیم بچوں کی واحد کفیل ہے' تو اس پر قیاس کر کے فرمائیے کہ کیا آپ اسی دلیل سے اسلام کے قانونِ وراثت کو بھی بدلوانا چاہیں گے؟ اس لیے کہ عین ممکن ہے کہ ایک شخص کی زندگی ہی میں اُس کی بیٹی بیوہ ہو جائے اور اس کے کئی یتیم بچے بھی ہوں۔ جبکہ اُس کے بھائی اچھے بھلے برسر روزگار ہوں' تو کیا اُس شخص کے انتقال پر قانونِ وراثت برعکس کر دیا جائے گا؟ قانون تو ظاہر ہے کہ اس طرح کی موم کی ناک نہیں بن سکتا۔ البتہ عقل بتاتی ہے کہ اس صورتِ حال میں اس بیوہ کی امداد و اعانت کے دوسرے ذرائع اختیار کیے جانے چاہئیں۔ اولاً والد اپنی زندگی میں اپنی بیوہ بیٹی کو کچھ ہبہ کر سکتا ہے۔ دوسرے یہ کہ معاشرے میں عام اخلاقی حِس پیدا کی جانی چاہیے۔ چنانچہ انسانی ہمدردی اور خدمت خلق کا مادہ افراد میں بھی ہو اور ''لاکھوں روپے سے قائم ہونے والے اداروں'' میں بھی۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اصلاً ایک اسلامی ریاست میں بے سہاروں کو سہارا دینا حکومت کی ذمہ داری ہے۔

اسی پر ''عامل خواتین'' کے معاملے کو بھی قیاس کیا جا سکتا ہے کہ اگر کسی معاملے میں اضافی تلافی کی واقعی ضرورت ہو تو اس کے لیے مختلف ذرائع اختیار کیے جا سکتے ہیں جیسے کہ مختلف مکاتب فکر کے علماء کرام نے بھی اپنی مشترکہ پریس کانفرنس میں تجویز کیا ہے کہ ''بطورِ تعزیر''

کچھ اضافی بوجھ اس شخص پر بھی ڈالا جا سکتا ہے جس کی بے احتیاطی سے کسی خاتون کی جان تلف ہوئی ہو۔ لیکن یہ واضح رہنا چاہیے کہ اسلامی قانون ایک حیاتیاتی وحدت ہے اور اس کے مختلف اجزاء کے مابین کامل منطقی ہم آہنگی موجود ہے۔ وہ جب عام اور نارمل حالات میں کنبے کی معاشی کفالت کا بوجھ عورت پر ڈالتا ہی نہیں بلکہ کلیۃً مرد پر ڈالتا ہے تو اُس سے مطالبہ کرنا کہ وہ قتل خطا میں عورت کی دیت مرد کے مساوی قرار دے' خالص غیر منطقی بات ہے۔ اب اگر کوئی خاتون محض شوقیہ یا اپنے معیارِ زندگی کو بلند سے بلند تر کرنے کی خواہش سے کوئی کام کر رہی ہوں تو یہ اُن کا ذاتی معاملہ ہے۔ ہاں اگر کسی واقعی ضرورت کا معاملہ ہو تو یہ اُن استثنائی صورتوں میں سے ہوگا جن کے بارے میں اوپر گفتگو ہو چکی ہے۔

آخر میں اس قدر اور عرض کرنے کی اجازت چاہتا ہوں کہ اگر ہماری خواتین کا ایک محدود طبقہ اُس مغربی تہذیب کی پیروی یا نقالی کرنے پر مُصر ہے جس کی ظاہری چمک دمک کو علامہ اقبال مرحوم نے اپنے انگریزی خطبات میں "glittering exterior of the Western Civilization" سے تعبیر کیا ہے۔ اور جس کی خدمت میں بہترین ''خراجِ تحسین'' اپنے اس شعر کے ذریعے پیش فرمایا ہے ؎

نظر کو خیرہ کرتی ہے چمک تہذیب حاضر کی
یہ صناعی مگر جھوٹے نگوں کی ریزہ کاری ہے!

تو وہ خوشی سے ایسا کریں —— لیکن براہِ کرم اسلام اور اس کے نظامِ قانون کو اپنے پیچھے گھسیٹنے کی کوشش نہ کریں ورنہ عاقبت تو تباہ و برباد ہوگی ہی اس دنیا میں بھی اُن کا مقابلہ پاکستان کے اُن عوام سے ہوگا جو خواہ بے عمل ہوں لیکن دین میں تحریف کی کسی کوشش کو گوارا کرنے کے لیے تیار نہیں! اور دین کے معاملے میں وہ اعتماد بہرحال علماء کرام ہی پر کرتے ہیں' نہ کہ خطیبوں' دانشوروں' ادیبوں یا پروفیسروں پر۔ اور اس ضمن میں جملہ فقہی مسالک کے علماء کے اتحادِ رائے میں اُن کے لیے ایک بڑا ''انتباہ'' مضمر ہے۔ فقط والسلام

خاکسار اسرار احمد عفی عنہٗ

باب دہم

متفرّقات

(ا) آیۂ اظہارِ دین کے ضمن میں

امام الہند شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی تصریحات

(ب) قولِ فیصل: لا یصلح آخِرُ ھٰذِہ الاُمّۃِ...... کی تحقیق

(۱) جناب شمس مجددی

(۲) حضرت قاضی محمد حمید فضلی

خانقاہ فضلیہ، شیر گڑھ، تحصیل و ضلع مانسہرہ

(ج) ''علما کب اٹھیں گے؟''

مولانا محمد زکریا، سربراہ پاکستان سنی اتحاد، کراچی

(د) سوانحی خاکہ حاجی عبدالواحد مرحوم

(''میثاق'' فروری ۱۹۸۶ء)

(ہ) حرفِ آخر

مولانا سید عنایت اللہ شاہ بخاری مدظلہ (گجرات) کی تقریر سے اقتباس!

(''میثاق'' نومبر ۱۹۸۴ء)

(و) اور ''چھپتے چھپتے''

مولانا آزاد کے بارے میں افراط و تفریط

(ا)

آیۂ اظہارِ دین

کے ضمن میں امام الہند حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کی تصریحات

(ماخوذ از ''ازالۃ الخفاء عن خلافۃ الخلفاء'')

ترجمہ : مولانا محمد عبدالشکور لکھنویؒ

لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ

چونکہ دینِ حق کا غلبہ تمام دینوں پر آنحضرت ﷺ کے زمانہ میں حاصل نہیں ہوا' کیونکہ نصاریٰ و مجوس اس وقت تک اپنے طمطراق پر قائم تھے۔ لہٰذا اکثر مفسرین اس آیت کی تفسیر میں عاجز ہو گئے ہیں۔ ضحاک رحمۃ اللہ علیہ نے کہا کہ یہ بات حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نزول کے وقت ہو گی۔ حسن بن فضل رحمۃ اللہ علیہ نے کہا ہے کہ غلبہ سے مراد حجت و برہان کا غلبہ ہے۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے ان سب سے زیادہ مضبوط بات بیان کی ہے۔ انہوں نے کہا ہے کہ اپنے رسول (ﷺ) کو تمام دینوں پر غالب کر دیا (اس طرح) کہ جن لوگوں نے آپؐ کا کلام سنا ان پر واضح کر دیا کہ یہی حق ہے اور جس قدر دین اس کے خلاف ہیں باطل ہیں اور نیز آپؐ کو اس طرح غالب کر دیا کہ گروہ اہل شرک میں دو دین تھے۔ ایک دین اہل کتاب کا دوسرا دین اُمیوں[1] کا' تو اُمیوں کو تو رسولِ خدا ﷺ نے مغلوب کر لیا' یہاں تک کہ وہ لوگ اسلام میں داخل ہو گئے اور اہل کتاب (کی یہ حالت ہوئی کہ ان) میں سے بعض نے ذلت کے ساتھ جزیہ دینا منظور کیا اور آپؐ کا حکم ان پر جاری ہو گیا۔ یہی مطلب آپؐ کے دین کا تمام دینوں پر غالب آ جانے کا ہے۔

یہ فقیر کہتا ہے کہ جب کسی آیت کے معنی میں کچھ مشکل پیش آ جائے تو وہاں دو باتوں کی ضرورت ہے اوّل یہ کہ ہم الفاظِ قرآنی کو لوگوں کے بیان کیے ہوئے معنے کے ساتھ عقل خالص کی ترازو میں (جو اوہام کی آفت سے محفوظ ہو) تولیں اگر دونوں میں موافقت ظاہر ہو تو فبہا ورنہ

(۱) عرب کے لوگ زمانہ آنحضرت ﷺ میں تین مذہب رکھتے تھے۔ بعض مشرک تھے' بعض نصرانی' بعض یہودی۔ نصرانی اور یہودی اہل کتاب کہے جاتے ہیں اور مشرکین اُمی' بوجہ اس کے کہ ان میں لکھنے پڑھنے کا رواج نہ تھا۔

اس معنے کو ہم چھوڑ دیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ کی حدیث کو ہم اپنا پیشوا بنا لیں' کیونکہ آپؐ قرآن کے (حقیقی اور اصلی) مفسر ہیں۔ (اس قاعدہ کے موافق) جب ہم (لوگوں کے بیان کیے ہوئے معنے یعنی) آنحضرت ﷺ کے غلبہ کو جو (مقامِ) نجران کے نصرانیوں اور ہجر کے مجوسیوں اور خیبر کے یہودیوں پر آپؐ کو حاصل ہوا اور آپؐ نے ان سے جزیہ اور خراج لیا (عقل خالص کی ترازو کے) ایک پلّہ میں رکھتے ہیں اور (الفاظِ قرآنی یعنی) **لیظھرہ علی الدّین کلّہٖ** کو دوسرے پلہ میں رکھتے ہیں تو دونوں میں باہم کچھ مناسبت نہیں پاتے' ایک تھوڑے سے ٹکڑے پر غالب آ جانا تمام دینوں پر غلبہ نہیں ہوسکتا۔ تمام دینوں پر غلبہ کے معنی تو یہ ہیں کہ تمام دینوں کی جڑ کھد جائے اور ان کے حمایتی درہم برہم ہو جائیں اور کوئی شخص ان دینوں کی طرف بلانے والا نہ رہے اور ان دینوں کی عزت و بزرگی بالکل زائل ہو جائے (لہٰذا ہم نے ان تمام معانی کو چھوڑ دیا) باقی رہی حدیث نبی ﷺ کی (تو وہ حسب ذیل ہے)[1]

''مسلم نے حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اللہ نے میرے لیے زمین کو لپیٹ دیا اور میں نے اس کی مشرق و مغرب سب دیکھ لیں اور بیشک میری امت کی سلطنت اس حصۂ زمین تک پہنچے گی جو میرے لیے لپیٹا گیا' اور (فرمایا کہ) مجھے سرخ و سفید[2] دونوں قسم کے خزانے دیے گئے۔''

امام احمد رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت مقداد رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا کہ آپؐ فرماتے تھے: روئے زمین پر کوئی گھر اور کوئی خیمہ باقی نہ رہے گا جس میں اللہ کلمۂ اسلام کو داخل نہ کرے' کسی سعادت مند کو عزت دے کر یا کسی بدنصیب کو ذلت دے کر۔ عزت دینے کی صورت یہ ہے کہ اللہ ان کو اہل اسلام میں سے کر دے اور ذلت دینے کی صورت یہ ہے کہ وہ اسلام کے محکوم بن جائیں۔ حضرت مقدادؓ کہتے ہیں کہ میرے دل میں آیا کہ اس وقت ہر جگہ دین اللہ کا ہو گا۔ ان احادیث صحیحہ کا مقتضا یہ ہے کہ پورا غلبہ دین کا آنحضرت ﷺ کے بعد ہو گا' لہٰذا انہی احادیث کو ہم نے پیشوا بنایا اور آیت کریمہ کو آپ کے زمانۂ حیات سے متعلق نہ رکھا۔ الفاظِ قرآنی بھی اس کو نہیں چاہتے کہ حضرت ﷺ کی حیات ہی میں دین حق کو غلبۂ کامل ہو جائے' چنانچہ اگر **یظھرہ** کی ضمیر (منصوب متصل) **ھدی** اور **دین**

(۱) حضرت مصنف رحمۃ اللہ علیہ نے اس مقام پر چھ احادیث نبویہؐ درج فرمائی ہیں' لیکن طوالت کے خوف سے ہم یہاں ان میں سے صرف دو احادیث نقل کر رہے ہیں۔ (ادارہ)

(۲) دونوں قسم سے مراد زرد و سفید یعنی سونا اور چاندی۔

حق کی طرف پھیریں تو مطلب یہ ہوگا کہ رسول کا ہدایت اور دین حق کے ساتھ بھیجنا سبب ہو جائے گا اس ہدایت اور دین حق کے تمام دینوں پر غالب ہونے کا۔ اس صورت میں کچھ ضروری نہیں کہ وہ غلبہ آنحضرت ﷺ کے سامنے ہو جائے آپ کا مبعوث ہو جانا غلبہ کا سبب ہو گیا' گو تتمہ اس غلبہ کا آنجناب ﷺ کے نائبوں کے ہاتھ پر ہوا اور اگر یہ ضمیر رسول کی طرف پھیری جائے تب بھی کچھ بعید نہیں ہے' کیونکہ دین حق کا غلبہ جو آنحضرت ﷺ کے نائبوں کے ہاتھ سے ہوا' بلاشبہ وہ آنحضرت ﷺ ہی کا غالب ہونا ہے۔

اگر تم سن سکتے ہو تو ایک باریک نکتہ سنو!

خدا تعالیٰ جب کسی پیغمبر کو اصلاحِ عالم کے لیے اور بنی آدم کو نیکیوں سے نزدیک کرنے اور بدیوں سے دور کرنے کے لیے مبعوث فرماتا ہے اور غیب الغیب میں کوئی خاص صورت اس اصلاح کی مقرر کر دیتا ہے تاکہ وہ اصلاح اسی صورت میں ظاہر ہو تو لامحالہ وہ صورت خاص اس پیغمبر کی بعثت میں پوشیدہ ہوتی ہے۔ پھر جب حکمت الٰہی اس پیغمبر کو عالم ادنیٰ سے رفیق اعلیٰ کی طرف قبل اس صورت کی تکمیل کے لے جانا چاہتی ہے تو لامحالہ وہ پیغمبر ان مقاصد کے پورا کرنے کے لیے جو اس کی بعثت میں مندرج ہیں' اپنی امت میں سے کسی شخص کو اپنا آلہ بناتا ہے اور اس کی تربیت کرتا ہے تاکہ اس کا دل الہام خداوندی کے نزول کے قابل ہو جائے اور پھر اس شخص کو ان مقاصد کی وصیت کر دیتا ہے اور ان کی ترغیب دیتا ہے اور ان مقاصد کے پورے ہونے کی دعا مانگتا ہے۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے کوئی شخص بدنی قوت نہ رکھتا ہو کہ حج کا ارادہ کر سکے مگر مالی طاقت رکھتا ہو تو اس پر ضروری ہے کہ فریضۂ حج کے پورا کرنے کے لیے دوسرے سے حج کرائے اور اس کے نامۂ اعمال میں دوسرے کا حج لکھا جائے اور یہ شخص بوجہ سبب ہونے کے حکم الٰہی کا مطیع ہو اور ثوابِ حج کا پورا حصہ حاصل کرے۔ اس قسم کا خلیفہ بنانا ہر دین میں ہوا ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے حضرت یوشع علیہ السلام کو اپنا خلیفہ بنایا تھا اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے حواریوں کو اپنا خلیفہ بنایا تھا (حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے خلیفہ بنانے کا ایک عجیب طریقہ تھا)۔ انجیل میں مذکور ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے ایک روٹی اپنے ہاتھ میں لی اور فرمایا کہ یہ عیسیٰ کا گوشت پوست ہے پھر وہ روٹی آپ نے حواریوں میں تقسیم کر دی۔ جب انہوں نے اس روٹی کو کھا لیا تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام مناجات کرنے لگے اور فرمایا کہ (یا اللہ) جس طرح انہوں نے یہ روٹی کھا لی اور وہ ان کے بدن میں حلول کر گئی اسی طرح عیسیٰ ان کے بدن میں حلول کر جائے۔ اے خداوند! جو نظر رحمت تو میری طرف رکھتا ہے وہی ان پر مبذول فرما تاکہ یہ لوگ تیرے بندوں کو تیری

طرف بلائیں۔ اسی قاعدہ کے موافق جب عالم میں آنجناب کی الوہیت کے متعلق برے اعتقاد پھیل گئے اور عقیدۂ ارجا کا رواج ہو گیا' یعنی اعمال کو ساقط از درجۂ اعتبار[1] سمجھنا اور (برے) کاموں کے (بد) انجام سے خوف نہ کرنا جو تمام انبیاء علیہم السلام کی شریعتوں کے خلاف ہے' تو غضب الٰہی جوش میں آیا۔ اور ارادۂ انتقام (عالم) ملکوت میں پیدا ہوا۔ پھر ان لوگوں کے ہلاک و برباد کرنے کا ایک وقت مقرر ہوا جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ (ترجمہ[2]) ہر گروہ کے لیے ایک وقت ہے جب وہ وقت آ جاتا ہے تو ایک ساعت کے لیے بھی وہ گروہ نہ پیچھے ہٹ سکتا ہے نہ آگے! چنانچہ وہ وقت آ گیا تو حق تعالیٰ نے افضل افرادِ بشر یعنی ذاتِ مقدس ختم الرسل ﷺ کو مبعوث فرمایا اور اپنی وحی آپؐ پر نازل فرمائی اور آنجنابؐ نے اپنی انتہائی کوشش کے ساتھ اس ہدایت اور دین حق کی طرف لوگوں کو بلایا۔ قابلیت رکھنے والے سعادت اندوز ہوئے اور بدبخت لوگ ملعون ابدی بن گئے۔ اسی بعثت کے ضمن میں وہ ارادۂ انتقام ان لوگوں سے جو آنجناب کی اُلوہیت کے متعلق برے اعتقادات رکھتے تھے' قائم کیا گیا اور آنحضرت ﷺ اور آپؐ کے اصحاب رضی اللہ عنہم (باوجود سراپا رحمت ہونے کے) اس انتقام میں بمنزلہ جارحہ (الٰہی) کے ہو گئے جس طرح حضرت جبرئیل علیہ السلام (باوجود سراپا رحمت ہونے کے) صیحۂ[3] ثمود کے وقت (جارحہ الٰہی بنے تھے) اسی وجہ سے جو لڑائیاں آنحضرت ﷺ کے حکم سے واقع ہوئیں وہ ان لڑائیوں میں شریک ہونے والوں کے لیے موجب نزولِ برکاتِ عظیمہ بنے اور ان لڑائیوں میں ایک ساعت کی شرکت صد سالہ عبادت کے برابر تہذیب باطن میں کارگر ہوئی' اسی وجہ سے ہماری شریعت میں جہاد کا ثواب تمام عبادات کے ثواب سے بالاتر ہے اور اہل بدر و اہل اُحد و اہل حدیبیہ کی فضیلت مانی گئی ہے۔

خلاصہ یہ کہ (اس آخری زمانہ میں) اصلاحِ عالم کی اور دشمنانِ خدا سے انتقام لینے

---

(۱) مشرکین کا حال تو ظاہر ہے کہ وہ جزا و سزا ہی کے قائل نہ تھے' اعمال کا کیا اعتبار کرتے۔ رہ گئے یہود و نصاریٰ' ان کا یہ خیال تھا کہ ہم برے اعمال کریں گے تب بھی جنت ہماری ہے' کیونکہ ہم خدا کے دوست ہیں۔

(۲) سورۃ الاعراف' آیت ۳۴۔

(۳) صیحہ' بلند آواز کو کہتے ہیں۔ قوم ثمود اسی آواز سے ہلاک کی گئی تھی۔ ثمود وہی قوم ہے جس کی طرف حضرت صالح علیہ السلام پیغمبر بنا کر بھیجے گئے تھے۔ جب قوم نے اونٹنی کے پیر کاٹے جو معجزہ سے پیدا ہوئی تھی تو یہ عذاب نازل ہوا۔

کی ایک خاص صورت مقرر ہوگئی تھی اور وہ صورت یہ نہ تھی کہ وہ (مثل قوم قارون کے) زمین میں دھنسا دیے جائیں یا (مثل قوم ہود وغیرہ کے) ان پر آسمان سے پتھر برسائے جائیں یا (مثل قومِ ثمود کے) صیحہ سے ہلاک کیے جائیں۔ اس خاص صورت کی تعیین کسی ایسی حکمت کے سبب سے ہوئی جس کو سوائے اللہ کے کوئی نہیں جانتا اور وہ خاص صورت یہ تھی کہ ادیانِ (باطلہ) کے حامیوں اور دعوت دینے والوں کو بذریعہ قتل و گرفتاری و تاراج و بندش و خراج و جزیہ سرنگوں کر کے اور ان کی دولت و شوکت کو پائمال اور بے حقیقت کر کے آنحضرت ﷺ اور آپ کے اصحاب علیہم الرضوان کے دین کو غلبہ دیا جائے اور یہ صورت خاص آنحضرت ﷺ کی بعثت کے ساتھ لپٹی ہوئی تھی اور آنجنابؐ کی بعثت اس خاص صورت پر متضمن تھی۔ یہی مطلب اس آیت کا ہے کہ اللہ نے اپنے رسول کو ہدایت اور دین حق کے ساتھ اس لیے بھیجا تاکہ اس دین کو تمام دینوں پر غالب کر دے۔

اور چونکہ خدا تعالیٰ نے آنحضرت ﷺ کے لیے ان روحانی نعمتوں کو جو بغیر رفیق اعلیٰ سے ملے ہوئے حاصل نہیں ہوسکتیں' پسند فرمایا اس لیے ضروری ہوا کہ دین حق کے غلبہ کو کامل کرنے اور دشمنانِ خدا کی سرنگوئی کو پورا کرنے کے واسطے آپؐ کسی کو خلیفہ بنائیں تاکہ یہ سب باتیں آپؐ کے صحیفۂ اعمال میں درج ہو جائیں اور وہ ارادۂ انتقام جو آنحضرت ﷺ کی بعثت کے ضمن میں لپٹا ہوا تھا اپنا کام پورا کرے۔ اس کی مثال یہ ہے کہ کوئی خاص اور مقرب ملازم کسی بادشاہ کا (ترقی پا کر) محبت کی مجالس اور مقدس محافل میں بادشاہ کا ہم نشین ہو جائے اور بعض قلعوں کا فتح کرنا جن کے لیے بادشاہ نے بہت کچھ تاکید کی ہے' اپنے کسی اچھے کارگزار کے متعلق کر دے اور جب وہ قلعے (اس کارگزار کے ہاتھ پر) فتح ہو جائیں تو اس ملازم کی عزت بڑھ جائے اور خلعتیں اور بخششیں اس کو ملیں۔ جب یہ سب باتیں بیان ہو چکیں تو اب سمجھ لینا چاہیے کہ صحیح مطلب اس آیت کا یہ ہے کہ جس قدر غلبہ دین حق کو حاصل ہوا وہ سب **لیظھرہ** میں داخل ہے اور اس غلبہ کی تمام اقسام میں اعلیٰ درجہ کی قسم یعنی دولت کسریٰ و قیصر کا درہم و برہم کرنا بدرجۂ اولیٰ داخل ہوگا۔ اور اس قسم اعلیٰ کے حاصل کرنے والے خلفاء رضی اللہ عنہم تھے۔ انہی بزرگواروں کی کوششیں آنحضرت ﷺ کے بھیجنے سے (حق تعالیٰ کو) مقصود تھیں' اور ان کی کوششیں آپؐ کی بعثت کے ساتھ لپٹی ہوئی تھیں اور یہ بزرگوار تدبیر غیبی کے لیے اس کے ظہور کے آلات تھے۔ خلافت خاصہ کے یہی معنی ہیں!![۱]

(۱) ''**ازالة الخفاء عن خلافة الخلفاء**'' تالیف فخر الہند حضرت امام شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ مع ترجمہ **کشف الغطاء عن السنة البیضاء** از حجۃ الاسلام حضرت مولانا محمد عبدالشکور لکھنوی فاروقی مجددی قدس سرہ' مطبوعہ کارخانہ تجارت کتب آرام باغ کراچی از صفحہ ۱۶۴ تا ۱۷۵ (تلخیص)

(ب)

قولِ فیصل

''لَا یَصْلُحُ اٰخِرُ ھٰذِہِ الْاُمَّۃِ اِلَّا بِمَا صَلَحَ بِہٖ اَوَّلُھَا''

کی تحقیق کے ضمن میں

دو اہم خطوط

''لَا یَصْلُحُ آخِرُ ھٰذِہِ الْاُمَّۃِ اِلَّا بِمَا صَلَحَ بِہٖ اَوَّلُھَا'' — کا حوالہ اس صدی میں سب سے پہلے مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم نے ۱۹۱۲ء میں 'الہلال' میں امام مالکؒ کے قول کی حیثیت سے دیا تھا۔ مولانا مرحوم کو اس مقولے سے کس درجہ محبت و اُنسیت تھی' اس کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ انہوں نے تقریباً ۱۰ سال بعد نومبر ۱۹۲۱ء میں لاہور میں منعقدہ جمعیت العلماء ہند کے تیسرے سالانہ اجلاس میں اپنے تحریری خطبۂ صدارت میں پھر اس کا حوالہ دیا (جمعیت العلماء ہند' مرتبہ پروین روزینہ صاحبہ' جلد اول' صفحہ ۱۰۲) اور اس بار پھر اُسے امام مالکؒ ہی کے قول کی حیثیت سے نقل کیا۔ راقم نے بحمد اللہ اپنی تحریروں اور تقریروں کے ذریعے گزشتہ بیس سال کے دوران اسے بہت عام کیا ہے۔ اسی دوران میں ایک بار پروفیسر یوسف سلیم چشتی مرحوم و مغفور نے فرمایا تھا کہ یہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا قول ہے۔ چنانچہ میں نے بعض مواقع پر اس کی یہ نسبت بھی بیان کی' لیکن چونکہ نہ چشتی صاحب ہی اس کا حوالہ دے سکے نہ میں خود تلاش کر پایا' لہٰذا میں نے دوبارہ اسے امام مالکؒ ہی کی جانب منسوب کرنا شروع کر دیا۔ راقم بے حد ممنون و مشکور ہے ادارۂ فیوضاتِ مجددیہ' شیر گڑھ' تحصیل و ضلع مانسہرہ کے جناب شمس مجددی کا کہ انہوں نے نہ صرف یہ کہ اس کی تحقیق کا حق ادا کر دیا' بلکہ اس کے جزوِ ثانی کی صورت میں علم و حکمت کا ایک اور گراں بہا موتی ہمیں عنایت فرما دیا۔ **فَجَزَاہُ اللّٰہُ عَنَّا خَیْرَ الْجَزَاءِ**۔ ہم اُن کے شکریے کے ساتھ اُن کا خط ہدیۂ قارئین کر رہے ہیں۔

اس ضمن میں محترم مکتوب نگار نے جس اہم امر کی جانب راقم کی توجہ منعطف کرائی ہے' اس پر ان کے خصوصی شکریے کے ساتھ عرض ہے کہ بحمد اللہ نہ یہ امر راقم پر مخفی ہے نہ یہ حقیقت کہ خود راقم میں یہ صلاحیتیں مطلوبہ معیار کے کسی ہزارویں درجے میں بھی موجود نہیں ہیں' البتہ اِس

سلسلے میں ایک تیسری حقیقت بھی ہے جو نگاہوں سے اوجھل نہیں ہونی چاہیے اور وہ کہ لا ریب یہ کام بالفعل تو اُسی شخص کے ذریعے ہوگا جس کی نشاندہی جناب صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے کی ہے' لیکن اس کے لیے امکانی کوشش ہر صاحب ایمان کا فرض ہے۔ بالکل ایسے جیسے کسی فردِ واحد کی زندگی میں دعوت و تنظیم' تربیت و تزکیہ اور جہاد و قتال کے جملہ مراحل کا اِس حد تک طے پا جانا کہ اللہ کی زمین کے کسی قطعہ پر اُس (تعالیٰ) کا دین بالفعل غالب و قائم ہو جائے' تاریخ میں صرف ایک ہی بار ہوا ہے' یعنی سید الاولین والآخرین اور امام الانبیاء والمرسلین ﷺ **وفداہ آباءُ نا و اُمھاتنا** کے دست مبارک سے' تاہم اس کے لیے کوشش اور جدوجہد جملہ انبیاء و رسل علیہم السلام نے کی۔ لہٰذا اگر آج کی کسی بڑی سے بڑی شخصیت کو بھی یہ ''زعم'' ہو جائے کہ یہ مہم اس کے ذریعے لازماً سر ہو جائے گی تو یہ بہت بڑا دعویٰ اور سراسر ''مغالطہ'' ہوگا۔ رہا خود ان سطور کا عاجز و ناچیز راقم یا اُس جیسے اور لوگ' تو اگر ہم اس ''خبط'' میں مبتلا ہو جائیں تو اسے خلل دماغی کے سوا اور کسی چیز سے موسوم نہیں کیا جا سکتا۔ ہماری تو بڑی سے بڑی آرزو یہ ہو سکتی ہے کہ ع ''کہ خونِ صد ہزار انجم سے ہوتی ہے سحر پیدا'' کے مصداق ہمارا شمار ان لاکھوں کروڑوں ستاروں میں ہو جائے جو خورشید کے طلوع ہونے سے قبل اپنی ہستی کو فنا کر لیتے ہیں۔ گویا ہم حضرتِ یحییٰ علیہ السلام کے الفاظ کے مطابق آنے والے **افضلکم مقدرةً و املکھم لِنفسہٖ**' کے لیے ''راستہ صاف کرنے والے'' بن جائیں تو یہی عین سعادت ہوگی! **رزقنا اللّٰہ ذٰلک!!**

(۱)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ادارہ فیوضات مجدّدیہ
خانقاہ فضلیہ شیر گڑھ' تحصیل و ضلع مانسہرہ

محترم جناب ڈاکٹر صاحب! السلام علیکم ورحمۃ اللہ

مدت سے خیال تھا کہ جناب کی توجہ عربی عبارت کے ایک مقولہ ''**لا یصلح آخر ھذہ الامة الا بما صلح بہ اولھا**'' کی طرف مبذول کراؤں' جسے آپ امام مالکؒ کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ آپ سے یہ توقع نہیں کی جا سکتی کہ آپ بغیر کسی دلیل کے ایسی بات کہہ

دیں۔ مگر میرا خلجان اس وجہ سے بھی تھا کہ مرشدی حضرت قاضی محمد حمید فضلی دام برکاتہم نے اس جملہ کو بعینہٖ حضور ﷺ کی حدیث کے طور پر اپنے کسی مضمون میں تحریر کیا تھا۔ چنانچہ اپنے کتب خانہ میں دستیاب کتابوں میں یہ جملہ حدیث تو نہ ثابت ہو سکا اور نہ ہی ان میں حضرت امام مالکؒ کا مقولہ۔ البتہ حضرت امام شعرانی رحمہ اللہ کی تصنیف ''**طبقات کبریٰ**'' صفحہ ۱۵۱' جلد ا' پر حضرت ابوبکر صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے ترجمہ (سوانحی تذکرہ) میں ان کی طرف یہ الفاظ منسوب ہیں:

ان ھذا الامر لا یصلح بہ آخرہ الا بما صلح بہ اوّلہٗ و لا یحتملہ الا افضلکم مقدرة و املکھم لنفسہ.

بالفرض اگر امام مالکؒ کی طرف کسی کتاب میں منسوب آپ کی نظر سے گزرا ہو تو شاید یہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے قول کے اتباع و روشنی میں ان کا قول ہوگا' جس کی ابتدائی اور بنیادی نسبت حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی طرف ہونی چاہیے۔ اس مقولہ کے آخری دو جملے بھی آپ کے غور و فکر کے لیے پیش ہیں' تاکہ اصلاحِ امت میں حضرتؓ کی فرمودہ اہلیت —— احتمالِ اصلاح یعنی اصلاحِ اُمت کا بیڑہ بھی وہی اٹھا سکتا ہے —— جو طاقت و مقدرت کے لحاظ سے افضل ہو —— دنیاوی اعتبار سے' اور روحی و قلبی اعتبار سے **املکھم لنفسہ** —— یعنی ضبطِ نفس کا حامل ہو اور ساتھ ساتھ اس کی خباثتوں پر بھی کنٹرول کر سکنے کی ہمت رکھتا ہو۔ اُمید کہ جناب ایک دور افتادہ' پسماندہ علاقہ کے ایک بھائی کی سچی بات کو قبول کرنے میں بخل نہ برتیں گے۔

والسلام
شمس مجددی

(۲)

محترم جناب ڈاکٹر صاحب: زید معالیکم
السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

میثاق فروری ۱۹۸۶ء کے شمارہ میں افکار و آراء کے ذیل میں عزیزی شمس مجددی صاحب کے مکتوب سے خوشی ہوئی کہ انہوں نے آپ کے خطاب میں بالواسطہ اس عاجز کو بھی اپنے ایک مقالہ میں ''**لن یصلح آخر ھذہ الامة الا بما صلح بھا اوّلھا**'' کو حضور علیہ السلام کی طرف منسوب کرنے پر متنبہ کیا۔ اللہ تعالیٰ اپنے حبیب کے صدقے میں اس سہو کو معاف فرمائے۔ یہ

عاجز جب ماہنامہ ''فیض'' کے ''عشاقِ رسول ﷺ نمبر'' کے سلسلہ میں سرخیل محبین حضرت صدیق رضی اللہ عنہ کے حالات کے تفحص کے لیے متعلقہ کتب کی طرف متوجہ ہوا تو یہ کلمات آپ کے ایامِ مرضِ موت کے آخری خطبہ میں ملے جو آپ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو خلیفہ مقرر کرنے (پر) بعض صحابہ کی طرف سے ان کی شدتِ طبع پر تشویش کے اظہار کے جواب میں دیا تھا' جسے ''کنز العمال'' صفحہ ۱۴۷' جلد ۳' اور اسی طرح ''کنز العمال'' کے حوالہ سے ''حیات الصحابہ'' عربی' ص ۳۴۔۳۵' جلد ۲ (ہمارے پاس ''حیات الصحابہ'' کا جو ایڈیشن موجود ہے' وہ دہلی کا مطبوعہ ہے۔ اس میں یہ خطبہ ص ۲۷۔۲۸' جلد ۲ پر ہے) میں حضرت مولانا محمد یوسف کاندھلوی (امیر تبلیغی جماعت رحمۃ اللہ علیہ) نے بھی ''من یحتمل الخلافة'' کے عنوان سے ذکر فرمایا' جو یہ ہے:

یـٰآیُّھَا النَّاسُ! اُحْذُرُوا الدُّنْیَا وَ لَا تَثِقُوْا بِھَا' (فَاِنَّھَا) غَرَارَۃٌ وَ آثِرُوا الْاٰخِرَۃَ عَلَی الدُّنْیَا فَاَحِبُّوْھَا فَبِحُبِّ کُلِّ وَاحِدَۃٍ مِّنْھُمَا تُبْغَضُ الْاُخْرٰی' وَ اِنَّ ھٰذَا الْاَمْرَ الَّذِیْ ھُوَ اَمْلِکُ بِنَا لَا یَصْلَحُ آخِرَہٗ اِلَّا بِمَا صَلُحَ بِہٖ أوَّلَہٗ فَلَا یَحْمِلُہٗ اِلَّا اَفْضَلُکُمْ مَقْدِرَۃً وَاَمْلَکُکُمْ لِنَفْسِہٖ اَشَدُّکُمْ فِیْ حَالِ الشِّدَّۃِ وَ اَسْلَسُکُمْ فِیْ حَالِ الشِدَّۃِ وَ اَعْلَمُکُمْ بِرَأْیِ ذَوِی الرَّأْیِ' لَا یَتَشَاغَلُ بِھَا بِمَالَا یَعْنِیْہِ وَلَا یَحْزَنُ بِمَا لَا یَنْزِلُ بِہٖ وَ لَا یَسْتَحْیِ مِنَ التَّعَلُّمِ وَ لَا یَتَحَیَّرُ عِنْدَ الْبَدِیْھَۃِ' قَوِیٌّ عَلَی الْاَحْوَالِ' وَ لَا یَخُوْنُ بِشَیْءٍ مِّنْھَا حِدَۃً لِعُدْوَانِ وَ لَا یَقْصِرُ وَ یَرْصَدُ بِمَا ھُوَ آتٍ' عِتَادُہٗ مِنَ الْحَذْرِ وَ الطَّاعَۃِ وَھُوَ عُمَرَ بْنَ الْخَطَابِ رضی اللہ عنہ۔

''اے لوگو! دنیا سے ڈرو اور اس پر بھروسہ مت کرو' یہ دھوکہ باز ہے' آخرت کو دنیا پر ترجیح دو اور اُسے پسند کرو' کیونکہ ان میں سے کسی ایک کی محبت دوسری سے نفرت کا باعث ہوتی ہے۔ یہ معاملہ جو اس وقت ہمارے لیے انتہائی اہم ہے' اس کا آخر اسی چیز سے اصلاح پذیر ہو سکتا ہے جس سے اس کے اول نے اصلاح پائی اور اس کی برداشت اور اس ذمہ داری کو وہی شخص نباہ سکتا ہے جو تم میں طاقت و مقدرت کے لحاظ سے بہتر ہو' جو ضبطِ نفس کے لحاظ سے پختہ تر ہو اور کسی بھی سختی کے وقت تاثر نہ لینے میں وہ سخت ہو' یعنی اعصابی لحاظ سے مضبوط ہو اور نرمی کے زمانہ میں وہ خوش مزاج ہو' مردم شناس ہو' اپنے اردگرد خوشامدی ٹولے سے زیادہ عقل مندوں کو ترجیح دیتا ہو۔ جس کے اوقات

تعمیری ہوں اور جو اندیشہ ہائے فردا سے غم حال کی تعمیر میں منہمک ہو' اور جو کسی سے حصولِ علم میں حیا نہ محسوس کرتا ہو' جو اچانک حادثات میں ڈانواڈول نہ ہوتا ہو' جو معاشی استحکام کا ذہن رکھتا ہو۔ اپنے غصہ کی سرکشی و ظلم میں قومی دولت کی خیانت و تقصیر کا مرتکب نہ ہوتا ہو۔ اس کے ذہن میں سفرِ آخرت کی تیاری کے سامان کا خیال رہتا ہو' جو اللہ کا ڈر اور اس کی اطاعت ہے۔ ان صفات کا حامل عمر بن الخطاب (رضی اللہ عنہ) ہے۔''

یہ عاجز مناسب موقع پر تلاش میں تھا کہ اپنی اس غلط نسبت کے تدارک میں کچھ لکھے اور احباب سے اپنی غلطی کا برملا اعتراف کرے۔

یہ میری خوش قسمتی ہوئی کہ مجھے بھی موقعہ مل گیا کہ میں اپنی غلطی کی تلافی کر سکوں۔ الحمد لِلّٰہ علٰی ذٰلِک کہ عزیز کے مکتوب کے سلسلہ میں جناب نے جو ذاتی وضاحت فرمائی' آج کے اس ماحول میں بقول حضرت مجدد علیہ الرحمۃ' جو اپنے مکتوب میں فرماتے ہیں:

گوئے توفیق و سعادت درمیاں افگندہ اند
کس بمیداں درنمی آید' سواراں را چہ شد!

ہر چند سلامتی در زاویہ است اما دولت عز و شہادت در معرکہ است' کنج و زاویہ باہل سرو ضعف مناسب است۔ در حدیث آمدہ: **اَلْمُؤْمِنُ الْقَوِیُّ خَیْرٌ مِّنَ الْمُؤْمِنِ الضَّعِیْفِ**۔ کار مردان اقویا' مبارزت و معرکہ کبریٰ است۔

﴿قُلْ کُلٌّ یَّعْمَلُ عَلٰی شَاکِلَتِہٖ فَرَبُّکُمْ اَعْلَمُ بِمَنْ ھُوَ اَھْدٰی سَبِیْلًا﴾

(مکتوب ۵۶' دفتر سوم' ص: ۱۲۸)

ہم زاویہ نشینان' ضعیفان بجز دعا اور کیا کر سکتے ہیں۔ اللہ جو دلوں کا حال جانتا ہے اپنے دین کو سربلند فرمائے۔ (آمین!)

والسلام

عاجز حمید فضلی

☆☆☆

(ج)

علماء کب اُٹھیں گے؟

جب اسلامی معاشرہ کافرانہ لبادے میں دفن ہو جائے گا

محترم ایس ایم جمیل صاحب ریٹائرڈ آڈیٹر جنرل حکومت پاکستان' صدر مؤسس انجمن اشاعت قرآن عظیم پاکستان (کراچی) ۴/اپریل کو محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب سے ملاقات کے لیے اکیڈمی تشریف لائے تھے۔ موصوف تو دعوتی دورے پر اسلام آباد اور پشاور تشریف لے گئے ہوئے تھے۔ لہٰذا سید صاحب ازراہِ کرم وتلطف اس عاجز کے کمرے میں قدم رنجہ ہوئے۔ نصف گھنٹے تک مختلف موضوعات پر موصوف نے راقم کی راہنمائی فرمائی۔ نیز ایک چہار ورقہ عنایت فرما گئے جس کے مطالعہ کے بعد اندازہ ہوا کہ اس شمارے میں جو مضامین شائع ہو رہے ہیں اس کے مضمون کی ان سے بڑی مناسبت ہے' لہٰذا قارئین میثاق کی خدمت میں پیش ہے۔ (جمیل الرحمٰن)

(۱) حضور ﷺ کے ارشاد کے مطابق امت کے علماء بنی اسرائیل کے انبیاء کی طرح ہیں۔ دوسری جگہ ارشاد ہوا ہے کہ علماء انبیاء کے وارث ہیں۔ دونوں ارشادات کے بموجب علماء اسلامی معاشرے کے خصوصی رہبر اور سردار ہیں۔

(۲) نبی کریم ﷺ کی امت کو اللہ تعالیٰ نے ''خیر امت'' سے تعبیر فرمایا ہے اور پوری امت کو خطاب فرماتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے امت پر ذمہ داری ڈالی ہے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی۔

دوسرے مقامات پر اللہ تعالیٰ کے ارشاد کے بموجب دعوت الی اللہ اور دیگر ادیان پر اسلام کو برتر ظاہر کرنے کی بھی حضورؐ پر حضورؐ کی امت پر ذمہ داری ڈالی گئی ہے۔ اُمت کے ہر فرد پر لازم ہے کہ علم دین سیکھے اور دین کی حفاظت اور برتری میں اپنی جان اور مال کو وقف کر دے اور اپنے آپ کو اللہ کے ہاتھ پر بکا ہوا سمجھے' یہ ذمہ داری امت کے ہر فرد پر ہے۔ البتہ جو لوگ علم والے ہیں ان پر یہ ذمہ داری بدرجۂ اولیٰ عائد ہوتی ہے اور جاننے والے اور نہ جاننے والے برابر نہیں ہو سکتے۔

(۳) علمائے حق نے ہر پریشان کن اور نازک وقت پر ذاتی آرام و راحت کو چھوڑ کر دین اور معاشرۂ اسلامی کی حفاظت کے لیے سربکف ہو کر پیش قدمی کی ہے' انہوں نے سلطنت مغلیہ کے اضمحلال اور انہدام اور سلطنت برطانیہ کے موقع پر بے یار و مددگار ہوتے ہوئے اور بغیر اسباب ظاہرہ کے اسلام کی مدافعت میں ایسی مضطربانہ اور والہانہ کوششیں کیں کہ برصغیر کے مسلمان' عیسائی مشنریوں کے اثر سے محفوظ رہے اور ہزار میں سے ایک مسلمان بھی انگریزوں کے صد سالہ دور حکومت میں عیسائی نہیں ہوا۔ صرف یہی نہیں بلکہ مکمل شکست و ریخت کے بعد تھوڑے ہی عرصہ میں مسلمانوں میں دین اور اسلامی معاشرے کے سلسلہ میں خود اعتمادی پیدا ہوئی اور پورے برصغیر میں عزم و حوصلہ اور خود اعتمادی کی لہر دوڑ گئی تا آنکہ پاکستان اسلام کے نام پر وجود میں آیا۔

افسوس کہ گزشتہ تیس چالیس سالہ دور میں بہت غلطیاں اور لاپرواہیاں ہوئیں اور اسلام کے نام پر بنائے ہوئے اس ملک میں غیر اسلامی خیالات اور رجحانات کے مراکز اور انجمنیں بن گئیں اور اس ملک میں نفاذ اسلام ایک حقیقت کے بجائے چیلنج اور سوال بن گیا۔ ہر مسلمان اور عام مسلمان سے زیادہ ہر عالم دین پر لازم ہے کہ سب اختلافات و کشاکشوں اور ذاتی مفادات و مصلحتوں کو چھوڑ کر اس بنیادی' تباہ کن خطرے کو دور کرنے کی مہم پر آمادہ ہو جائیں۔

اٹھو وگرنہ حشر نہیں ہو گا پھر کبھی
دوڑو! زمانہ چال قیامت کی چل گیا

(٤) اسلام نہایت کم مادی وسائل کے عالم میں ابھرا اور زاہدانہ زندگی' تقویٰ' جہاد اور بلند اخلاق کی بنیادوں پر بجلی کی طرح پھیلا اور ہر جگہ ایسا محبوب بنا کہ وہاں کے غیر مسلم لوگ مسلمان ہو کر اسلام کے جانباز سپاہی بنے۔

اب ہم کو دوبارہ احکام قرآنیہ اور سنت نبویہ پر کاربند ہوتے ہوئے ''حب الدنیا و کراھیة الموت'' کی بجائے تقویٰ' توکل اور تبتّل کی طرف آنا چاہیے اور زاہدانہ جفاکشی اور ذکر کو اپنا شعار بنانا چاہیے۔

(٥) آج کل علماء کی توجہات مدرسہ کی حدود میں اور مساجد کے امام بنانے میں صَرف ہو رہی ہیں' عوام اور ان کے منتخب خواص سے رابطہ نہ ہونے کے برابر رہ گیا ہے۔

(٦) اب اللہ تعالیٰ نے اپنی مہربانی سے ایک سنہری موقع دیا ہے کہ عوام بالعموم اور علماء

بالخصوص اپنی سابقہ غلطیوں کا احساس کرتے ہوئے بیدار ہو جائیں۔استغفار اور ذکر کے ساتھ اپنی اور معاشرے کی اصلاح میں سرگرم عمل ہو جائیں۔اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے کہ دین کے لیے کام کرنے والوں کے لیے اللہ تعالیٰ کی مدد اور کامیابی یقینی ہے۔

(۷) اسلام پھیلا ہے اور اسلام محکم ہوا ہے۔مسلمانوں کے خصوصاً علماء کے تقویٰ، توکل اور مجاہدانہ زندگی سے راتوں کے ذکر اور دعاؤں سے، بقولہٖ تعالیٰ:

﴿اَمَّنْ هُوَ قَانِتٌ اٰنَآءَ الَّيْلِ سَاجِدًا وَّقَآئِمًا يَّحْذَرُ الْاٰخِرَةَ وَيَرْجُوْا رَحْمَةَ رَبِّهٖ ؕ قُلْ هَلْ يَسْتَوِى الَّذِيْنَ يَعْلَمُوْنَ وَالَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ ؕ اِنَّمَا يَتَذَكَّرُ اُولُوا الْاَلْبَابِ ﴿۹﴾﴾ (الزمر)

یہ بات قابل غور ہے کہ ابتدائی طور پر جب مسلمان بالعموم مجاہدانہ زندگی گزارتے تھے، علماء اور غیر علماء میں طبقاتی حیثیت سے تفریق نہیں تھی۔البتہ بعض لوگ علم اور تقویٰ میں دوسروں سے زیادہ ممتاز ہوا کرتے تھے اور عوام ان کی صحبتوں اور مذاکرات سے مستفید ہوتے تھے۔آخرت کی زندگی اور اللہ تعالیٰ کی رضا کے حصول کا جذبہ علماء کی سرکردگی میں عوام، خواص، علماء اور حکام سب کو حاصل ہوئی یہی استحکام اور ترقیات کی بنیادیں تھیں۔اس زمانہ میں مروجہ مدارس نہ تھے مگر کتاب وسنت کا علم وعمل پہنچانے والے ہر جگہ موجود اور سرگرم عمل تھے۔امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا کام پورے معاشرے میں جاری تھا اور اس کا غلغلہ اور مسلمانوں کے بے لاگ انصاف اور حق کے لیے جانبازی کا غلغلہ اطراف عالم پر تھا اور یہ خصوصیات زندگی ہر معرکہ میں اللہ تعالیٰ کے ہاں سے نصرت اور کامیابی لانے والی تھیں۔ہر شخص تکمیل احکام اور تقویٰ میں پیش قدمی اور سبقت لے جانے کا خواہاں تھا۔بقولہٖ تعالیٰ: ﴿وَاجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِيْنَ اِمَامًا ﴿۷۴﴾﴾ (الفرقان)

تقویٰ کی دوڑ اور مسلسل کوشش اسلامی معاشرے کی فضا میں لازم وملزوم تھی اور تقویٰ کا نصاب قرآن شریف اور احادیث میں واضح طور پر مکرراً اور تاکیداً ارشاد فرمادیا گیا تھا تاکہ اس سے کوئی شخص لاپرواہ نہ رہے اور جاننے والے اور نہ جاننے والوں کا ایسا ارتباط تھا کہ تقویٰ اور اتباعِ سنت نبویؐ کے سلسلہ میں پورے معاشرے میں ہم آہنگی، یک رنگی کی کیفیت پائی جاتی تھی۔ضرورت ہے کہ یہ باہمی رابطہ دوبارہ پورے طور پر قائم اور مستحکم ہو اور جاننے والے اور نہ جاننے والوں میں علم وعمل کی پیاس پیدا کریں۔جیسا کہ سابقہ ادوار میں ہوتا آیا ہے۔

(۸) آج کل بعض جگہ ذکر آ رہا ہے کہ مدارس دینیہ کے نصاب میں انگریزی زبان، جغرافیہ، ریاضی اور سائنسی علوم کو شامل کیا جانا ضروری ہے۔مناسب طور پر نصاب میں ان چیزوں کا اضافہ کر دینے میں حرج نہیں ہے مگر بنیادی ضرورت اس کی ہے کہ ان مدارس میں کتاب اللہ، سنت نبویؐ اور صحابہؓ کی عملی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو سامنے لایا جائے۔تقویٰ، توکل اور تبتّل اور مسلسل مجاہدانہ زندگی، دنیا اور آخرت دونوں کے لیے کامیابی اور عزت کی بنیادیں ہیں۔فلسفہ اور منطق اور انگریزی زبان وغیرہ بالکل بعد کی چیزیں ہیں۔اور انگریزی زبان کے ساتھ انگریزی طرز معاشرت اور نظریاتی زندگی کی اہمیت طالب علموں کے ذہنوں میں آ گئی تو یقینی طور پر اسلامی علم وعمل کے لیے سم قاتل ہے۔

(۹) سیاسی غلامی سے زیادہ ذہنی اور قلبی غلامی تباہ کن ہے جس میں پاکستانی قوم خصوصاً نوجوان نسل گرفتار ہے اور دن بدن غیروں کی ذہنی غلامی، دنیا کی محبت، اتباع ھویٰ (خواہشاتِ نفس کی غلامی)، آرام وراحت اور عیش پرستی کی جانب نہایت تیزی سے پیش قدمی کر رہی ہے اور اس دلدل میں دن بدن پہلے سے زیادہ پھنستی چلی جا رہی ہے۔مسلمان قوم اور مسلم معاشرے کی اصلاح کی اور اس کا رُخ بدلنے کی ہنگامی کوششوں کی ضرورت ہے اور اس کی زیادہ تر ذمہ داری علماء پر عائد ہوتی ہے۔اس ذمہ داری سے کماحقہٗ سبکدوشی کے لیے متذکرہ بالا اسلامی بنیادوں کو از سرنو زندہ کرنا پڑے گا، ان پر کاربند ہونا پڑے گا۔اس کے بغیر اصلاح معاشرہ کا اور مسلمانوں کو تباہی سے بچانے کا مقصد حاصل کرنا، ناممکن ہے۔اگر اس وقت اس جانب ہنگامی بنیادوں پر توجہ نہ دی گئی تو اسلامی معاشرے کو کفر اور لادینیت کی دلدل میں دفن ہونے سے بچانے کا موقع ہاتھ سے نکل جائے گا اور پاکستانی قوم اور پاکستانی معاشرہ بھی بہت سے دوسرے اسلامی علاقوں کے معاشروں کی طرح ہمیشہ کے لیے دفن ہو جائے گا۔

ائمہ مساجد کی ذمہ داریاں

(۱) نبی کریم ﷺ کی امت کو اللہ تعالیٰ نے ''خیر اُمت'' کے نام سے یاد فرمایا ہے (آل عمران)۔دنیا کی بہترین امت اس واسطے کہ کارِ نبوت اس اُمت سے لیا جائے گا۔

(۲) اس اُمت کا ہر فرد اس امر پر مامور ہے کہ ''امر بالمعروف''، ''نہی عن المنکر'' اور ''دعوت الی اللہ'' کا کام کرے اور اس کام کے لیے امکان بھر تیاری کرے اور اپنے آپ کو اللہ کے ہاں بکا ہوا سمجھے۔

(۳) یہ فریضہ خاص طور پر ان افراد پر عائد ہوتا ہے جو علم دین کی دولت سے بہرہ ور ہیں اور اگر مساجد کے امام بھی ہوں تو اس علاقے کے لیے راہ دکھلانے کی ذمہ داری ان پر مزید طور پر آتی ہے۔

(۴) اسی نظام کے تحت جب اسلام پھیلا تو ہر جگہ کے لیے امام بھیجے گئے۔ انہوں نے ہر جگہ اپنی ذمہ داری ایسی ادا کی کہ ہر جگہ دین کے علم و عمل کا نور چمکا۔ دُور دُور علاقوں میں بھی ہر جگہ مساجد، دینی علوم اور تقویٰ کا مرکز بن گئیں اور عوام میں علم و عمل کی تلاش اور پیاس پیدا ہوئی۔

(۵) پاکستان بھی اسلام کے نام پر بنا تھا۔ مساجد اور علمی کتابیں پہلے سے موجود تھیں اور ان میں حیرت انگیز طور پر سوگنا ترقی ہوئی۔ مگر مادیت کی طرف توجہات کی وجہ سے مقاصد کی طرف سے لاپرواہیاں برتی گئیں اور معاشرے میں خرابیاں اور دینی نقصانات رونما ہوئے۔

(۶) اب وقت آ گیا ہے کہ مساجد کے امام اپنی پوری ذمہ داریاں ادا کریں اور سابقہ غلطیوں اور کوتاہیوں کا کفارہ ادا کریں، ورنہ لادینیت کی مسلسل لہریں اور بیرونی دشمنانِ دین کی کوششیں تباہی کے خطرات کو دوچند کیے ہوئے ہیں۔ صرف پوری کوشش سے سابقہ لاپرواہیوں کا ازالہ ہو سکتا ہے۔ تمام اختلافات کو مٹا کر والہانہ طور پر قرآن وسنت کی روشنی کو قائم کرنا اور بڑھانا ہے۔

(۷) اللہ تعالیٰ کا مستقل حکم ہے کہ ہر مردِ مؤمن اللہ کے ہاتھ جان و مال کے ساتھ بکا ہوا ہے اگر اس کا عملی ثبوت ہم سب نے اور خصوصاً اہل علم نے نہ دیا تو نہایت پریشان کن تباہی کو دُور نہیں سمجھنا چاہیے۔ پورے ماحول کا تقاضا ہے کہ ہر اہل علم و بصیرت کو اس تعمیری کام میں بلاتاخیر سرگرم عمل ہو جانا چاہیے تاکہ اسلامی معاشرہ بھی بنے اور استحکامِ پاکستان کا مقصد بھی حاصل ہو۔

مولانا محمد زکریا

سربراہ پاکستان سنی اتحاد

(د)

اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ

حدیث نبویؐ ’’بَدَأَ الْاِسْلَامُ غَرِیْبًا وَسَیَعُوْدُ کَمَا بَدَأَ فَطُوْبٰی لِلْغُرَبَاءِ‘‘ کے مصداق کامل

حاجی عبدالواحدؒ کا انتقال

یہ دنیا دارِ فانی ہے اور یہاں جو بھی آیا ہے اُسے جلد یا بدیر یہاں سے جانا بھی ہے، فرق صرف پہلے اور بعد اور آگے اور پیچھے کا ہے۔ چنانچہ زیارتِ قبور کے سلسلے میں ماثورہ الفاظ یہ ہیں: ’’اَلسَّلَامُ عَلَیْکُمْ یَا اَھْلَ الْقُبُوْرِ! یَغْفِرُ اللّٰہُ لَنَا وَلَکُمْ اَنْتُمْ سَلَفُنَا وَنَحْنُ بِالْاَثَرِ‘‘ —— یعنی ’’اے قبروں والو تم پر سلامتی ہو، اللہ ہماری بھی مغفرت فرمائے اور تمہاری بھی، تم ہم سے پہلے گزر گئے ہو لیکن ہم بھی تمہارے پیچھے پیچھے آ ہی رہے ہیں!‘‘ لیکن ظاہر ہے کہ جبکہ یہاں آنے والے، سوائے رنگ و شکل کے ظاہری و معمولی فرق کے، سب ایک سے ہوتے ہیں، جانے والے ایک سے نہیں ہوتے! چنانچہ ایسے بھی ہوتے ہیں جو جاتے ہی ’’نَسْیًا مَنْسِیًّا‘‘ ہو جاتے ہیں اور ایسے بھی ہوتے ہیں جو اپنے پیچھے طویل اور تادیر باقی رہنے والی یادیں چھوڑ جاتے ہیں۔

ایسی ہی ایک شخصیت ہفتہ ۱۱؍جنوری ۱۹۸۶ء کو دن کے لگ بھگ گیارہ بجے نہایت خاموشی سے دنیا سے رخصت ہوگئی۔ ہماری مراد حاجی عبدالواحد صاحب سے ہے جو شمسی حساب سے پچاسی برس اور ۲۸ دن اِس دارِفانی میں گزار کر متذکرہ بالا تاریخ کو راہیِ ملکِ بقا ہو گئے: اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن! اَللّٰھُمَّ اغْفِرْ لَہٗ وَ ارْحَمْہُ وَ اَدْخِلْہُ فِیْ رَحْمَتِکَ وَ حَاسِبْہُ حِسَابًا یَّسِیْرًا، آمین یا ربّ العالمین.

حاجی صاحب چونکہ گزشتہ بیس برس سے بھی زائد عرصہ سے علیل تھے اور ان کی پبلک لائف اب سے تقریباً ربع صدی قبل ختم ہو چکی تھی، لہٰذا پاکستان کی نئی نسل تو اِن سے واقف ہی نہیں ہے۔ تاہم چونکہ ۷۰-۱۹۷۱ء سے ۸۱-۱۹۸۰ء تک اُن کا راقم الحروف کے ساتھ بڑا گہرا ربط رہا۔ لہٰذا ’’تنظیم اسلامی‘‘ کے سینئر لوگ اُن سے خوب واقف ہیں، البتہ گزشتہ پانچ سال سے چونکہ وہ

بالکل صاحبِ فراش ہو چکے تھے' لہٰذا تنظیم کے بھی اکثر نئے رفقا کو اُن سے واقفیت نہیں ہے۔

راقم الحروف کو ان کی نماز جنازہ پڑھانے کی سعادت حاصل ہوئی تو اس موقع پر جو چند جملے اُس نے کہے' اُن میں یہ بھی تھا کہ ''انسان کا باطن تو اللہ ہی کے حوالے ہے' جہاں تک ''ظاہر'' کا تعلق ہے کم از کم مَیں نے اپنی زندگی میں حاجی صاحب جیسا ''پابند شریعت'' انسان کوئی اور نہیں دیکھا''۔ چنانچہ واقعہ یہ ہے کہ مکمل ''شرعی پردہ'' بھی راقم نے زندگی میں پہلی بار حاجی صاحب مرحوم کے یہاں دیکھا! اور وعدہ کی پابندی بھی جتنی راقم نے اُن میں دیکھی اور کہیں نہیں دیکھی۔

حاجی صاحب کی زندگی کا اہم ترین پہلو یہ ہے کہ اِس صدی کی کوئی قابل ذکر دینی و مذہبی تحریک ایسی نہیں ہے جس میں حاجی صاحب نے حصہ نہ لیا ہو۔ اگرچہ اکثر و بیشتر تحریکوں اور جماعتوں کے ساتھ معاملہ یہ ہوا کہ یا وہ حاجی صاحب کی صاف گوئی کو برداشت نہ کرسکیں یا حاجی صاحب کی سیماب وش طبیعت اُن سے تادیر مطمئن نہ رہ سکی اور ع ''کچھ اور چاہیے وسعت مرے بیاں کے لیے!'' اور ع ''ہے جستجو کہ خوب سے ہے خوب تر کہاں!'' کے مصداق خود انہوں نے نئی منزلوں کی جانب رُخ کرلیا۔

حاجی صاحب کے مختصر سوانح حیات حسب ذیل ہیں: (واضح رہے کہ یہ جملہ واقعات ویسے تو خود مَیں نے بھی حاجی صاحب سے سنے ہیں لیکن تاریخوں اور سنوں کے لیے مَیں نے اُن کے صاحبزادے حافظ قاسم رضوان کو تکلیف دی تھی۔ چنانچہ ان کی ذمہ داری اُن ہی پر ہے)

❁ ولادت: ۱۴/ دسمبر ۱۹۰۰ء بمقام اجنالہ (ضلع امرتسر)

❁ ۱۹۱۷ء: گورنمنٹ ہائی سکول کوئٹہ سے (جہاں اُن کے والد مولوی محمد حسن صاحب ہیڈ ماسٹر تھے) میٹرک کا امتحان پاس کیا اور اسلامیہ کالج لاہور میں داخل ہوئے۔ جہاں قریب ہی حضرت شیخ الہندؒ کے شاگرد خواجہ عبدالحیٔ فاروقیؒ درسِ قرآن دیا کرتے تھے' یہیں سے دین کی آگ دل میں بھڑکی۔

❁ ۱۹۲۰-۲۱ء: اسلامیہ کالج لاہور کو چھوڑ کر ''جامعہ ملّیہ'' علی گڑھ میں جا داخلہ لیا جس کا سنگ بنیاد حضرت شیخ الہندؒ نے رکھا تھا۔ اسی دوران میں تحریک ہجرت سے متاثر ہو کر ہجرت کے ارادے سے راولپنڈی پہنچ گئے لیکن ساتھیوں کے بروقت نہ پہنچ سکنے کے باعث آگے نہ جا سکے' واپس علی گڑھ پہنچے ہی تھے کہ والد صاحب کے انتقال کی اطلاع آ گئی' لہٰذا تعلیم درمیان

میں چھوڑ کر کوئٹہ واپس آئے اور گورنمنٹ ہائی سکول ہی میں ملازمت اختیار کر لی۔

❁ ۱۹۳۰ء: پنجاب یونیورسٹی سے پرائیویٹ بی اے پاس کیا۔ انگریزی میں یونیورسٹی میں اول آئے اور گولڈ میڈل حاصل کیا۔

❁ ۱۹۳۱-۳۲ء: ملازمت سے رخصت حاصل کر کے' گورنمنٹ کالج لاہور میں داخل ہو کر انگریزی میں ایم اے کیا۔

❁ ۱۹۳۳-۳۴ء: مزید رخصت حاصل کر کے دارالعلوم ندوۃ العلماء میں مقیم رہے۔ وہاں سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہٗ سے عربی کی تحصیل کی۔ مولانا علی میاں حاجی صاحب سے انگریزی پڑھتے رہے۔ اُسی زمانہ میں مولانا محمد منظور نعمانی صاحب سے بھی تعلق قائم ہوا جو تازیست قائم رہا۔

❁ ۱۹۳۵ء: حضرت مولانا احمد علی لاہوریؒ سے بیعت سلوک! (حاجی صاحب کو حضرت لاہوریؒ سے خلافت بھی حاصل تھی)۔

❁ ۱۹۳۶ء: پہلا حج بیت اللہ اور اس کے دوران مولانا عبید اللہ سندھی مرحوم سے تعارف اور مراسم!

❁ ۱۹۳۷ء: شادیٔ خانہ آبادی۔

❁ ۱۹۳۸ء: مولانا لاہوریؒ کی خدمت میں دورۂ تفسیر کی تکمیل۔

❁ ۱۹۴۰-۴۱ء: حضرت لاہوریؒ کے ارشاد پر خانقاہ رائے پور میں شاہ عبدالقادرؒ کی خدمت میں حاضری اور استفادہ' اسی دوران میں حضرت مولانا محمد الیاسؒ سے تعارف ہوا اور اِن کے پاس بھی طویل قیام رہا۔ اس کے بعد تبلیغی جماعت کے ساتھ کافی طویل سفر کیے اور تمام اکابر سے رابطہ رہا۔

❁ ۱۹۴۲ء: اپنی بقیہ زندگی کو دین کی خدمت کے لیے وقف کرنے کی نیت سے ملازمت سے قبل از وقت ریٹائرمنٹ لے لی۔

❁ ۱۹۴۲-۴۳ء: جماعت اسلامی کے مرکز واقع دارالاسلام' پٹھان کوٹ میں مولانا ابوالاعلیٰ مودودی مرحوم کے پاس قیام' لیکن جلد ہی بد دل ہو کر مولانا محمد منظور نعمانی کے ساتھ ہی کنارہ کشی!

❁ ۱۹۴۳-۴۷ء: اپنے آبائی قصبہ اجنالہ ہی میں قیام اور درسِ قرآن کی تحریک کا آغاز۔ ابتدا میں حوصلہ افزائی' بعد میں مقامی علماء کی شدید مخالفت!

❁ ۱۹۴۷ء: کے اوائل ہی میں لاہور منتقل ہو گئے اور بعض دوسرے دینی بھائیوں کے ساتھ مل کر گڑھی شاہو میں ہندوؤں سے کچھ جائیداد خرید کی!

❁ ۱۹۴۸ء: حضرت مولانا عبدالقادر رائے پوریؒ کی خدمت میں چھ ماہ مسلسل قیام اور سلوک کی تکمیل!

❁ ۱۹۵۱-۵۲ء: تبلیغی جماعت کے ساتھ دوسرا حج۔ ایک سال ارضِ مقدس ہی میں قیام۔ اس دوران میں مولانا سعید احمد خاں اور مولانا عبیداللہ بلیاوی سے خصوصی تعلقات و روابط!

❁ ۱۹۵۲-۵۳ء: ایک مثالی اسلامی بستی کے قیام کے لیے انجمن رضوان کے نام سے ایک کوآپریٹو سوسائٹی کا قیام۔ اور اس کے لیے دیوانہ وار کام!

❁ ۱۹۵۵ء: ادارہ اصلاح و تبلیغ (آسٹریلیا بلڈنگ' میکلوڈ روڈ' لاہور) کے زیر اہتمام قرآن مجید کی ایک آسان اور عام فہم تفسیر بعنوان ''درسِ قرآن'' لکھنے کے لیے علماء کا ایک بورڈ قائم ہوا۔ جس کے حاجی صاحب بھی رکن بنائے گئے۔ اور تفسیر کے کام کے اختتام تک بورڈ کے رکن رہے!

❁ ۱۹۶۰ء سے ۱۹۷۰ء کا زمانہ حاجی صاحب کی زندگی میں بہت سی ناکامیوں اور مایوسیوں کا دَور تھا۔ اس عرصہ کے دوران ایک طرف تبلیغی جماعت کے بعض اہم اور ذمہ دار حضرات سے شدید اختلاف کی بنا پر حاجی صاحب کا رابطہ اُس ''حلقے'' سے بالکل ٹوٹ گیا۔ دوسری طرف انجمن رضوان' جسے حاجی صاحب نے اپنے خونِ جگر سے پروان چڑھایا تھا' اور جس کے صدر اور مؤسس سب کچھ حاجی صاحب تھے' اُس سے اُنہیں اِس طرح نکال باہر کیا گیا جیسے دودھ میں سے مکھی نکال کر پھینک دی جاتی ہے۔ ان دو شدید ترین صدموں کے باعث حاجی صاحب کی صحت ایک دم جواب دے گئی۔

❁ راقم الحروف سے حاجی صاحب کا ربط ۱۹۷۱ء میں قائم ہوا۔ راقم کے چند دروس و خطابات ہی سے انہیں راقم سے بہت اُنس ہو گیا۔ اور ایک طویل عرصے تک حاجی صاحب اپنی علالت اور ضعیفی کے باوصف لاہور میں میری ہر تقریر اور درس میں شرکت فرماتے رہے۔

❁ ۱۹۷۲ء میں مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کی تاسیس کا مرحلہ آیا تو میرے اِس خیال کی حاجی صاحب نے اپنے تلخ تجربے کی بنا پر شدت کے ساتھ تائید کی کہ اِس کا ڈھانچہ مروّجہ جمہوری روایات کے مطابق نہیں ہونا چاہیے' بلکہ اِس میں صدر مؤسس کی تاحیات صدارت بھی

طے ہونی چاہیے۔ اور اس پورے عرصے کے دوران اُسے مجلس منتظمہ میں ویٹو کا حق بھی حاصل ہونا چاہیے۔ اِس ضمن میں انہوں نے میرے منع کرنے کے باوجود مولانا امین احسن اصلاحی اور شیخ سلطان احمد صاحب سے بھی گفتگو کی' اگرچہ اُن حضرات نے اُن کی بات پر توجہ نہ فرمائی۔

❁ ۱۹۷۳-۷۴ء کے دوران کسی موقع پر حاجی صاحب نے زبردستی راقم کا ہاتھ کھینچ کر اپنے آپ کو راقم کے ساتھ ''بیعت جہاد'' کے رشتے میں منسلک کر لیا۔ اس وقت تک خود راقم نے اِس کے بارے میں سوچا تک نہ تھا (اگرچہ اصولی طور پر راقم کا یہ ذہن ۱۹۵۸ء میں بن چکا تھا کہ ''اقامت دین'' کے لیے قائم ہونے والی جماعت کی اساس ''بیعت جہاد'' ہی پر ہونی چاہیے)۔

❁ ۱۹۷۵ء میں تنظیم اسلامی قائم ہوئی تو حاجی صاحب اُس کے تاسیسی ارکان میں شامل ہو گئے۔

❁ ۱۹۷۶ء میں حاجی صاحب نے علالت اور پیرانہ سالی کے باوجود راقم اور تنظیم اسلامی لاہور کے دیگر ساٹھ ستر رفقاء کی معیت میں کوئٹہ کا سفر کیا۔ اور قرآنی تربیت گاہ میں شرکت فرمائی۔

❁ ۱۹۸۰ء تک راقم اور تنظیم اسلامی کے ساتھ حاجی صاحب کا تعلق نہایت پُر جوش اور فعال طرز کا رہا۔ چنانچہ اسی دوران میں حاجی صاحب نے راقم کو اپنی جائیداد میں سے دو کنال کے رقبے پر مشتمل ایک کوٹھی ہبہ کی جس کے ایک چوتھائی کے بارے میں اُن کے اور تبلیغی جماعت کے ایک معروف بزرگ حاجی عبدالحمید صاحب کے مابین تنازعہ بھی چل رہا تھا (جو تاحال جاری ہے) الحمد للہ اُسی کوٹھی کے تین چوتھائی پر وہ عمارت تعمیر ہو رہی ہے جس میں تنظیم اسلامی کا مرکزی دفتر منتقل ہو رہا ہے۔

۱۹۸۰ء کے بعد سے حاجی صاحب تقریباً صاحب فراش ہو گئے اور کہیں آنا جانا بالکل موقوف ہو گیا۔ اور اس عرصے کے دوران' اُن کے مزاج میں کچھ تلخی اور چڑ چڑا پن بھی پیدا ہو گیا تھا۔ چنانچہ ان ہی آیام میں ایک مرتبہ جب مولانا علی میاں مدظلہٗ کا لاہور آنا ہوا اور وہ حاجی صاحب سے ملاقات کے لیے تشریف لے گئے تو حاجی صاحب اُن سے بھی نہایت تلخی کے ساتھ پیش آئے! اگرچہ مولانا نے اس کا قطعاً برا نہ منایا' اور راقم کی اُن سے جب بھی ملاقات ہوئی مولانا نے حاجی صاحب کی صحت و عافیت کے بارے میں ضرور دریافت فرمایا' اور سلام کہلوایا! چنانچہ مَیں نے بھی مولانا کو حاجی صاحب کے انتقال کی اطلاع بذریعہ تار دی اور ان کا بھی دعائے مغفرت اور تعزیت کا پیغام بذریعہ تار ہی ملا! اِدھر میری مصروفیات بھی ایک دم بہت بڑھ

گئیں اور حاجی صاحب کی خدمت میں حاضری کے مواقع کم ہو گئے' چنانچہ ع ''عشق است و ہزار بدگمانی!'' کے مصداق حاجی صاحب کو راقم سے بھی کچھ گلے شکوے پیدا ہوئے' لیکن یہ ان کی شرافت اور مروّت تھی کہ انہوں نے انہیں اپنے تک ہی رکھا اور کبھی کسی کے سامنے زبان نہ کھولی!

❁ ان کی نقاہت کے بارے میں تو راقم کو علم تھا کہ تدریجاً بڑھ رہی ہے لیکن انتقال سے قبل کوئی ایسی خاص علالت ہوئی ہی نہیں جسے ''مرضِ وفات'' کا نام دیا جا سکے' لہٰذا ان کے انتقال کی اطلاع بالکل اچانک ملی۔ صبح تک کوئی آثار موت کے نہ تھے' چنانچہ ان کے داماد برادرم محمد حنیف ورک جو اُن کے ساتھ ہی رہتے ہیں' معمول کے مطابق ڈیوٹی پر کالج گئے ہوئے تھے اور صاحبزادے حافظ قاسم رضوان بھی اتفاقاً ہی گھر پر تھے۔ بڑے صاحبزادے محمد حسن بھی اپنے کاروبار پر باہر تھے کہ اچانک ۱۱رجنوری ۱۹۸۶ء کو ۱۱ بجے دن کے لگ بھگ حاجی صاحب انتہائی خاموشی کے ساتھ دنیا سے رخصت ہو گئے! گویا اُن کی بے چین روح کو جگر کے اِس مصرعے کے مطابق ع ''عمر بھر کی بے قراری کو قرار آ ہی گیا'' ہمیشہ ہمیشہ کے لیے سکون حاصل ہو گیا۔ ع ''حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا!''

❁ راقم جب اُسی روز بعد نماز مغرب ان کی نماز جنازہ ادا کر رہا تھا تو دل میں عجیب سی حسرت کا احساس پیدا ہوا کہ کاش گزشتہ چند دنوں کے دوران حاجی صاحب سے ایک ملاقات ہو جاتی تو راقم اپنے ایک اقدام کی وضاحت کر سکتا جس سے انہیں شکایت پیدا ہوئی تھی۔ اس لیے کہ گزشتہ پندرہ سال کے دوران راقم کو متعدد بار تجربہ ہو چکا تھا کہ حاجی صاحب کو کوئی شکایت پیدا ہوئی اور جیسے ہی مَیں حاضر ہوا ساری شکایت کافور ہو گئی۔

بلکہ بعض اوقات تو محسوس ہوا کہ حاجی صاحب خفگی کا اظہار کرتے ہی اس لیے ہیں کہ مَیں اپنی مصروفیات میں سے کچھ وقت نکال کر اُن کی خدمت میں حاضری دے سکوں۔ وہ ہر اعتبار سے میرے ''بزرگ'' تھے (عمر میں تو میرے والد صاحب مرحوم سے بھی چار سال بڑے تھے) لیکن وہ جس ادب و احترام ہی نہیں ''تعظیم'' کے ساتھ مجھ سے پیش آتے تھے اُس سے بہت شرمندگی ہوتی تھی اور بعض اوقات اسی کا احساس ان کی خدمت میں حاضری سے مانع ہو جاتا تھا۔ بہرحال ہم سب اللہ ہی کے ہیں اور اُسی کی طرف ہم سب کو لوٹ جانا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اپنی رحمت اور فضل و کرم کے سائے میں جگہ دے اور ﴿وَ نَزَعْنَا مَا فِیْ صُدُوْرِھِمْ مِّنْ غِلٍّ اِخْوَانًا عَلٰی سُرُرٍ مُّتَقٰبِلِیْنَ۝﴾ کے مصداق بنا دے۔ اَللّٰھُمَّ آمِیْن!!

☆☆☆

(۶)

حرفِ آخر

خطاب مولانا سید عنایت اللہ شاہ بخاری مدظلہٗ

۱۵رستمبر ۱۹۸۵ء کو بعد نماز عشاء امیر محترم کو عالی مسجد نواں کوٹ ملتان روڈ لاہور پر تنظیم اہل سنت و الجماعت کے چالیسویں اجلاس میں تقریر کرنا تھی' جہاں حضرت مولانا عنایت اللہ شاہ بخاری مدظلہٗ العالی بھی مدعو تھے۔ جو دعوتِ توحید اور مشرکانہ و مبتدعانہ اوہام و افعال کی تردید کے ضمن میں پاکستان گیر شہرت کے حامل ہیں۔ شاہ صاحب محترم نے اپنی زندگی اسی کام کے لیے وقف کر رکھی ہے۔ خطاب سے قبل محفل طعام میں جس کا اہتمام عبدالرشید رحمانی نے کیا تھا' شاہ صاحب قبلہ کی امیر محترم سے ملاقات ہوئی۔ شاہ صاحب نے میثاق میں شائع ہونے والے ''الھدیٰ'' کے سلسلے اور اگست و ستمبر میں شائع ہونے والے امیر محترم کے خطابات پر موصوف کی تحسین بھی فرمائی اور اُن کے حق میں دعا بھی کی۔ بعد نماز عشاء عالی مسجد میں محترم شاہ صاحب مدظلہٗ اور دیگر علماء کی موجودگی میں امیر محترم نے ''توحید عملی کا اقامت دین سے ربط و تعلق'' کے موضوع پر تقریباً پونے دو گھنٹے مفصل و جامع خطاب کیا۔

چنانچہ اس تقریر سے متاثر ہو کر شاہ صاحب مدظلہٗ نے جن تاثرات و مشاہدات کا اظہار فرمایا انہیں ٹیپ سے منتقل کر کے پیش کیا جا رہا ہے۔ (ج۔ر)

ارشاداتِ شاہ صاحب!

حضرت شاہ صاحب مدظلہٗ نے خطبہ مسنونہ کے بعد سورۃ الرعد کی حسب ذیل آیات کی تلاوت فرمائی:

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْم : بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

﴿ لَہٗ دَعْوَۃُ الْحَقِّ ط وَالَّذِیْنَ یَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِہٖ لاَ یَسْتَجِیْبُوْنَ لَھُمْ بِشَیْءٍ اِلَّا کَبَاسِطِ کَفَّیْہِ اِلَی الْمَآءِ لِیَبْلُغَ فَاہُ وَمَا ھُوَ بِبَالِغِہٖ ط وَمَا دُعَآءُ الْکٰفِرِیْنَ

اِلَّا فِیۡ ضَلٰلٍ﴿۲۵﴾

اس کے بعد حضرت شاہ صاحب قبلہ نے اپنے موضوع ''توحید فی الحقیقت کیا ہے؟'' پر گفتگو سے قبل بطور تمہید فرمایا:

بزرگو! بھائیو! عزیزو! ہمارے محترم ومکرم جناب ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے ماشاء اللہ و لاحول ولاقوۃ الا باللہ اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے جس خوبی' اخلاص اور سوز اور دردِ دل سے توحید فی العمل یا توحید فی الطلب کو مفصل اور پورے اجزاء کے ساتھ بیان فرمایا ہے اور پھر الحمد للہ کتاب وسنت کے پورے حوالے سے اور صحیح تشریح سے آپ حضرات تک فصل الخطاب کے ساتھ پیغام حق پہنچایا ہے' اللہ تعالیٰ ہم سب کو اسے قبول کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ میرا یہ پہلا موقع ہے کہ میں نے جناب محترم کی تقریر سنی ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کی عمر میں برکت دے۔ اللہ تعالیٰ دین حق پر' دین قیم پر' دین خالص پر جناب مکرم کو استقامت اور اخلاص کی نعمت نصیب فرمائے اور جس ولولے' جس جذبے' جس محنت کے ساتھ یہ رضائے الٰہی کو مقصود بنائے ہوئے دعوتِ حق کا کام کر رہے ہیں' تبلیغ کا حق ادا کر رہے ہیں' جس کی وجہ سے اپنوں کی بھی باتیں سن رہے ہیں' غیروں کے طعن وتشنیع بھی برداشت کر رہے ہیں۔ اس کام میں وقتاً فوقتاً جو تکالیف اٹھاتے اور جھیلتے ہیں وہ ان کے لیے توشۂ آخرت بنائے اور اللہ تعالیٰ اس دعوت کو کامیاب فرمائے اور ہم سب مسلمانوں کو توفیق دے اور اپنے فضل ورحمت سے ہماری قسمت میں یہ سعادت عطا فرمائے کہ اللہ اللہ جس طرح ڈاکٹر صاحب دل وجان سے کوشش کر رہے ہیں کہ دین توحید اجتماعی رنگ میں غالب اور نافذ ہو جائے۔ دین پورا کا پورا قائم ہو۔ اس طرح ہم بھی اس کام میں لگ جائیں۔ ان کی تو کوشش ہے' محنت ہے۔ ان کے ساتھیوں کی محنت ہے اور کوشش ہے۔ اللہ تعالیٰ اس کو کامیاب فرمائے یہ اس کے ہاتھ میں ہے۔ البتہ ہمیں وہ سب کچھ کرنا چاہیے جو ہم سے بن سکے۔ اس کے مصداق تو ہم بنیں اور اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے اور اس کی قدرتِ کاملہ سے کچھ بعید نہیں کہ وہ کامیابی عطا فرما دے۔ اس کے ہاتھ میں ہے کہ: ﴿کَمۡ مِّنۡ فِئَۃٍ قَلِیۡلَۃٍ غَلَبَتۡ فِئَۃً کَثِیۡرَۃًۢ بِاِذۡنِ اللّٰہِ ؕ وَ اللّٰہُ مَعَ الصّٰبِرِیۡنَ﴾ صبر واستقامت اسی طرح جاری رہا تو اللہ تعالیٰ کی رحمت سے کوئی بعید نہیں کہ وہ کامیابی عطا فرما دے۔ ورنہ ایک مسلمان کہلانے والے کا جو فریضہ ہے اس کے لیے تو ماشاء اللہ ڈاکٹر صاحب نے تن من کی بازی لگائی ہوئی ہے۔ یہ محض رسمی الفاظ نہیں بلکہ میرا حقیقی تاثر ہے کہ مجھے ان کی تقریر سن کر **الحمد للہ ثم الحمد للہ** سب سے بڑی خوشی' سب سے بڑی راحت اور سب

سے بڑا اطمینان دل کو ہوا کہ یا اللہ اس دَور میں تو نے اپنے فضل وکرم سے کسی کو تو یہ توفیق بخش دی ہے کہ وہ تیرے دین خالص کے لیے' دین حق کے لیے اجتماعی طور پر اسے کامیاب بنانے کے لیے کوشش کر رہا ہے۔ اے اللہ! تو اس کو بارآور فرما ---- مایوسی کے حالات تو ہوں گے لیکن ﴿وَ مَنۡ یَّقۡنَطُ مِنۡ رَّحۡمَۃِ رَبِّہٖۤ اِلَّا الضَّآلُّوۡنَ﴾ اللہ کی رحمت سے مایوسی گمراہی اور کفر ہے: ﴿وَ لَا تَایۡـَٔسُوۡا مِنۡ رَّوۡحِ اللّٰہِ ؕ اِنَّہٗ لَا یَایۡـَٔسُ مِنۡ رَّوۡحِ اللّٰہِ اِلَّا الۡقَوۡمُ الۡکٰفِرُوۡنَ﴾ اللہ کی رحمت سے صرف کافر لوگ ہی مایوس ہوتے ہیں۔ باقی کچھ لوگ بعض اوقات کہہ دیتے ہیں کہ موجودہ معاشرے میں اس کام کی کامیابی مشکوک ہے۔ یہ خیال ہی سرے سے غلط ہے۔

دنیا میں کامیابی ہو یا نہ ہو لیکن اللہ کے نزدیک کرنے کا کام یہی ہے۔ میں کون اور ڈاکٹر صاحب کون! نبی اکرم ﷺ نے فرمایا کہ قیامت کے دن انبیاء میں سے بعض نبی جن کی صداقت پر' جن کی دیانت پر' جن کی امانت پر' جن کی محنت پر' جن کی دعوت پر' جن کے اخلاص پر' جن کی استقامت پر' جن کی قربانیوں اور ایثار پر کسی کو اعتراض کا موقع نہیں مل سکا تو اللہ تعالیٰ اور اس کے پاک نبی پاکؐ نے فرمایا کہ ان میں سے کسی کے ساتھ دو اور کسی کے ساتھ ایک امتی ہو گا جنہوں نے دعوت کو پوری طرح قبول کیا ہو گا اور کسی کے ساتھ ایک بھی نہیں''۔ یہ تو حدیث ہے اور صحیح ہے۔ اللہ اللہ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے حضرت نوح علیہ السلام کا شکوہ نقل فرمایا ہے: ﴿رَبِّ اِنِّیۡ دَعَوۡتُ قَوۡمِیۡ لَیۡلًا وَّ نَہَارًا﴾ اے میرے مالک' اے میرے آقا اور مختار میں نے خالص توحید اور صرف تیری عبادت کی دعوت دی اور اس کام کے لیے میں نے نہ رات چھوڑی نہ دن چھوڑا۔ لیکن نتیجہ: ﴿فَلَمۡ یَزِدۡہُمۡ دُعَآءِیۡۤ اِلَّا فِرَارًا﴾۔ یہ میری دعوت سن کر راتوں کو بھی بھاگ کھڑے ہوتے اور دن کو بھی۔ آگے آیا کہ ﴿ثُمَّ اِنِّیۡۤ اَعۡلَنۡتُ لَہُمۡ وَ اَسۡرَرۡتُ لَہُمۡ اِسۡرَارًا﴾ میں نے مجلسوں میں اعلانیہ بھی دعوت دی۔ جیسے ڈاکٹر صاحب نے آپ حضرات کے سامنے دعوت پیش کی۔ اور میں نے پوشیدہ ایک ایک کے پاس جا کر بھی دعوت دی تاکہ مجلس میں بات سمجھ میں نہ آئی ہو تو اس طرح آ جائے۔ الغرض دعوت پہنچانے میں مَیں نے کوئی کسر نہیں چھوڑی' نہ رات چھوڑی' نہ دن چھوڑا' نہ اعلان چھوڑا' نہ اسرار چھوڑا' اپنا تمام آرام تج دیا ---- ڈاکٹر صاحب محترم کا نام بھی آ گیا۔ لیکن ان کی ساڑھے نو سو سال کی دعوت پر کتنے لوگ ایمان لائے! کتنے لوگوں نے اسے قبول کیا۔ اللہ تعالیٰ کی شہادت ہے کہ نوح علیہ السلام کے اخلاص میں' ان کی استقامت میں' ان کے ایثار میں' ان کی صداقت میں' ان کی

شجاعت میں نہ کمی تھی نہ کسی کو شک تھا۔ لیکن اللہ کی شہادت سن لو کہ اس سب کا نتیجہ کیا نکلا؟ ﴿وَمَآ اٰمَنَ مَعَهٗٓ اِلَّا قَلِيْلٌ﴾ ''بہت ہی تھوڑے آدمی ان پر ایمان لائے'' انہوں نے اللہ کے حکم سے جو کشتی بنائی وہ کتنی بڑی ہو گی! آپ خود تصور کر لیں۔ بعض روایات میں آتا ہے کہ کل اَسی (۸۰) افراد تھے۔ ذرا سوچو کہ ساڑھے نو سو برس کی دعوت کا نتیجہ یہ تھا۔ اگر فی برس ایک آدمی بھی دعوت قبول کرتا تو ساڑھے نو سو تو آتے۔ چلو دس برس میں ایک آدمی آتا تو بھی پچانوے تو ہوتے۔ لیکن بعض روایات میں اَسی (۸۰) سے بھی کم تعداد آئی ہے۔ کلہم چالیس (۴۰) افراد۔ ایک اور روایت بھی ہے جس میں نو افراد کی تعداد بیان ہوئی ہے۔ اللہ اللہ! کام کرنے والا یہ نہ سوچے کہ میرے ساتھ لوگ آتے ہیں یا نہیں آتے۔ دیکھنے والے بھی یہ نہ سوچیں کہ اس کے ساتھ فلاں بزرگ ملے یا نہیں ملے۔ یہ دیکھو کہ کام صحیح ہے۔ کتاب و سنت کے مطابق ہے۔ اللہ تعالیٰ کے قرآن کے مطابق ہے۔ نبی اکرم ﷺ کے ارشاداتِ گرامی کے مطابق ہے تو چشم ماروشن دل ماشاد۔ پھر قبول کرنا چاہیے۔ زیادہ لوگ ہوں یا نہ ہوں اس میں اعلیٰ قسم کے لوگ ہوں یا نہ ہوں۔ وہ معاملہ نہ ہو جو حضرت نوح علیہ السلام کی قوم نے آنجناب کے ساتھ کیا تھا۔ ﴿وَمَا نَرٰىكَ اتَّبَعَكَ اِلَّا الَّذِيْنَ هُمْ اَرَاذِلُنَا بَادِيَ الرَّاْيِ﴾۔ اے نوح ہم دیکھتے ہیں کہ بڑے بڑے سردار لوگ، بڑے بڑے ذہین لوگ، بڑے بڑے باوجاہت لوگ وہ تو تیرے ساتھ آئے نہیں۔ ہماری قوم کے کچھ ادنیٰ لوگ کم عقل اور بے وقوف لوگ ہیں جو تیرے پیچھے لگ گئے ہیں۔ اللہ اللہ! میں آپ لوگوں کو مخلصانہ مشورہ دوں گا کہ ڈاکٹر صاحب کی دعوت کا ساتھ دیں۔ اس میں ہماری دنیا اور عاقبت کی بھلائی ہے۔

☆☆☆

(و) چھپتے چھپتے

ع ''اپنے بھی خفا مجھ سے ہیں، بیگانے بھی ناخوش''

مولانا آزاد کے بارے میں افراط و تفریط

کتاب کی کاپیاں پریس میں جا رہی تھیں کہ اس کا جو مقدمہ ''میثاق'' میں شائع ہو گیا تھا، اس کے بارے میں محترم و مکرم ڈاکٹر شیر بہادر خاں پنّی کا مکتوب موصول ہوا۔

ڈاکٹر صاحب موصوف مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم کے عاشق صادق اور انتہائی عقیدت مند ہیں۔ انہوں نے جہاں مولانا آزاد کی زندگی کے ۱۹۱۲ء سے ۱۹۲۰ء تک کے دَور کے ضمن میں راقم کے موقف کی صد فی صد تائید کی ہے، وہاں اُن کی بعد کی زندگی کے بارے میں ان ہی خیالات کا اظہار فرمایا ہے جو مولانا آزاد کے دوسرے مفرط عقیدت مند مثلاً ڈاکٹر ابو سلمان شاہجہاں پوری کرتے ہیں۔

اتفاق سے چند ہی ماہ پیشتر روز نامہ نوائے وقت لاہور نے اپنے ادارتی کالموں میں راقم پر مولانا آزاد سے ''اظہارِ محبت'' اور ''اظہارِ عقیدت'' پر شدید تنقید کی تھی۔

قارئین کی دلچسپی کے لیے اس کتاب کے ''حرفِ آخر'' کے طور پر یہ دونوں تحریریں شائع کی جا رہی ہیں تا کہ مولانا آزاد مرحوم کے بارے میں دو انتہائی متضاد نقطہ ہائے نظر کا فوری تقابل سامنے آ جائے۔ اس لیے کہ یہ ایک نہایت عمدہ مثال ہے اس حقیقت کی کہ محبت اور عقیدت کی نگاہ کو خوبی ہی خوبی نظر آتی ہے جبکہ نفرت و عداوت کی آنکھ کے لیے کسی خوبی کا مشاہدہ ممکن نہیں ہوتا۔

دعا ہے کہ اب جبکہ مولانا مرحوم کے انتقال کو بھی تیس برس ہونے کو آئے، مسلمانانِ پاکستان اُن کے بارے میں نصف صدی قبل کے سیاسی اختلافات کو نظر انداز کرتے ہوئے متوازن اور عادلانہ رائے قائم کر سکیں۔

اس ضمن میں مولانا مرحوم کے عقیدت مندوں سے صرف اتنی گزارش ہے کہ راقم نے یہ

کبھی نہیں کہا کہ ۱۹۲۰ء کے بعد مولانا کا قرآن حکیم سے شغف ختم ہوگیا تھا یا یہ کہ اُن کا سیاسی موقف کسی بد دیانتی پر مبنی تھا ــــ راقم کا موقف صرف یہ ہے کہ مولانا نے ۱۳-۱۹۱۲ء میں ''حزب اللہ'' کے عنوان سے جس ہمہ گیر اسلامی تحریک کا آغاز کیا تھا ۱۹۲۰ء کے بعد وہ اس سے دستکش ہوگئے۔ رہے باقی امور تو وہ راقم کا موضوع ہیں ہی نہیں!

ڈاکٹر پنی صاحب کے خط کا ایک نہایت مفید پہلو یہ ہے کہ اس کے ذریعے ارضِ لاہور میں دعوتِ قرآنی کے ایک اہم لیکن بھولے بسرے سلسلے کا ذکر ضبط تحریر' اور اس کتاب کے ذریعے زیر اشاعت آ گیا۔ ارضِ لاہور میں راقم کی دعوتِ قرآنی کا مرکز اگر پہلے دس سالوں کے دوران مسجد خضراء سمن آباد میں رہا جس کا سنگ بنیاد مولانا احمد علی لاہوریؒ نے رکھا تھا' تو اس کے بعد سے اب پورے دس سال ہوگئے ہیں کہ اس کا خطاب جمعہ **مسجد دارُ السّلام باغِ جناح** لاہور میں ہو رہا ہے' جہاں مولانا عبد القادر قصوریؒ کے جلیل القدر صاحبزادگان درسِ قرآن دیتے رہے۔

اسرار احمد عفی عنہ

(۱)

روزنامہ نوائے وقت لاہور (۴) ۸/اپریل ۱۹۸۷ء

ڈاکٹر اسرار احمد اور تحریک پاکستان!

تنظیم اسلامی کے بارہویں سالانہ اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے تنظیم اسلامی پاکستان کے امیر ڈاکٹر اسرار احمد نے کہا ہے کہ مجھے جماعت اسلامی کی دعوت اور تحریک سے کوئی اختلاف نہیں' البتہ میں جماعت کی انتخابی سیاست کے طریق کار سے اتفاق نہیں رکھتا۔ انہوں نے کہا کہ اس صدی میں حکومت الٰہیہ کا تصور سب سے پہلے مولانا ابوالکلام آزاد نے پیش کیا تھا لیکن بعد ازاں وہ تحریک آزادی کی طرف متوجہ ہوگئے۔ ڈاکٹر اسرار احمد نے انتخابی سیاست سے اپنی بیزاری کا اظہار پہلی مرتبہ نہیں کیا وہ اکثر و بیشتر انتخابات سے اپنی الرجی کا اظہار کرتے رہتے ہیں' حالانکہ ملکی دستور کے تحت پاکستان میں تبدیلی کا صرف ایک ہی راستہ کھلا ہے اور وہ انتخابات کا راستہ ہے۔ اس کے علاوہ کسی انقلابی طریقے سے تبدیلی لانے کا پروگرام آئین کی خلاف ورزی ہے۔

ہم یہ نہیں کہتے کہ ڈاکٹر اسرار صاحب جماعت سازی نہ کریں یا سیاست میں حصہ نہ لیں لیکن انہیں خود اس بات کا خیال رکھنا چاہیے کہ وہ جو کچھ بھی کریں آئین کی حدود میں رہتے ہوئے کریں۔ جب آئین انتخابی سیاست کو تبدیلی کا واحد راستہ قرار دیتا ہے تو ڈاکٹر صاحب کو انتخابی سیاست کے خلاف بیان بازی کرنے سے احتراز کرنا چاہیے۔ اور محض اتنی سی بات پر انتخابی سیاست کو ردّ نہیں کر دینا چاہیے کہ یہ جماعت اسلامی کی بھی پالیسی ہے۔

جہاں تک مولانا ابوالکلام آزاد سے اظہارِ محبت کا تعلق ہے ڈاکٹر صاحب اپنی تقریر و تحریر میں اکثر اس بات کا اظہار کرتے رہتے ہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ وہ مولانا آزاد کے بہت بڑے مداح ہیں اور اب صرف اتنی سی کسر باقی ہے کہ کسی روز ڈاکٹر صاحب مولانا آزاد کے روحانی اور سیاسی جانشین ہونے کا دعویٰ کر دیں۔ لیکن انہیں حقائق سے چشم پوشی کا رویہ اختیار نہیں کرنا چاہیے۔ انہیں یہ بات کبھی نہ بھولنی چاہیے کہ مولانا ابوالکلام آزاد نے آزاد اسلامی مملکت کے قیام کی سرتوڑ مخالفت کی تھی۔ ڈاکٹر اسرار احمد کے بقول مولانا آزاد اگرچہ اس صدی میں حکومت الٰہیہ کے نقیب تھے لیکن بعد میں اسلام کے مستقبل سے مایوس ہو کر وہ متحدہ قومیت کے فلسفے کے پرچارک بن گئے اور اسلام کے نام پر کسی علیحدہ مملکت کے قیام کے حامی نہ رہے۔ ہندو کانگرس نے اسلامی مملکت کے قیام کی مخالفت میں ان کی خدمات سے خوب فائدہ اٹھایا اور مسلمانوں کا ایک محدود طبقہ مولانا آزاد سے عقیدت مندی کی بنا پر تحریک پاکستان کا آخر دم تک مخالف رہا۔ ان تلخ حقائق کو پس پشت ڈالتے ہوئے مولانا آزاد سے ڈاکٹر صاحب کا اظہارِ عقیدت بہت سی غلط فہمیوں کا دروازہ کھولنے کا موجب بن سکتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب اگر سیاست کا شوق رکھتے ہیں تو پاکستان اور بانیانِ پاکستان کے حوالے سے یہ شوق پورا کریں اور ملک کی نظریاتی حدود و قیود کو اسی طرح قبول کریں جس طرح ملک کے باقی سیاست دان' صحافی' دانشور اور ادیب کرتے ہیں۔

(۲)

مکتوب گرامی ڈاکٹر شیر بہادر خان پنّی (پشاور)

محترمی زاد عنایتہ ــــ السلام علیکم

ماہ جولائی کا ''میثاق'' ملا جس کے مطالعہ سے دل بے حد خوشنود ہوا۔ کتاب ''جماعت شیخ الہند سے تنظیم اسلامی تک'' کا مقدمہ پڑھا جو آپ کی تحریرات کا شاہکار ہے اور حرم کی خوشبو سے معطر۔

آپ نے میرے محبوب' عبقری صفات کی عظمت کی تصدیق فرما دی۔ وہ حقیقتاً برصغیر پاک و ہند میں بیسویں صدی کے داعیٔ اول قرآن و جہاد تھے۔ ان کے اس مقام کو آپ نے مان کر' حق بہ حق دار رسید کا کام سرانجام دے دیا۔ جزاک اللہ۔

۱۹۲۱ء سے بعد ان کی آزادی وطن کی تحریک میں شمولیت' پس پائی یا بددلی کا نتیجہ نہ تھی' بلکہ ان کی مؤمنانہ فراست کی وجہ سے محاذ جنگ کی تبدیلی کے مترادف تھی اور عین جنگ میں بھی محاذ کی تبدیلی کی اجازت تو قرآن نے بھی دی۔ اور اس تبدیلی کے لیے انہوں نے معاصر علماء سے گفتگو بھی کی' لیکن کسی نے ان کی بات پر کان نہ دھرا سوائے حضرت شیخ الہندؒ کے۔ اس کا ذکر مولانا نے ترجمان القرآن جلد دوم' صفحہ ۹۵ کے حاشیہ میں ان الفاظ میں کیا:

''......۱۹۱۴ء کی بات ہے کہ مجھے خیال ہوا کہ ہندوستان کے علماء و مشائخ کو عزائم و مقاصد پر توجہ دلاؤں۔ ممکن ہے چند اصحابِ رشد و عمل نکل آئیں۔ چنانچہ میں نے اس کی کوشش کی۔ لیکن ایک تنہا شخصیت کو مستثنیٰ کر دینے کے بعد' سب کا متفقہ جواب تھا کہ یہ دعوت ایک فتنہ ہے۔ ''اِئذَنْ لِیْ وَ لَا تَفْتِنِّی'' یہ مستثنیٰ شخصیت مولانا محمود حسنؒ دیوبندی کی تھی' جواب رحمت الٰہی کے جوار میں پہنچ چکی ہے۔''

گو وہ تحریک آزادی وطن کی جماعت ......کانگرس...... میں شامل ہو گئے۔ لیکن اپنے عزم و بنیادی مقصد ''دعوتِ قرآن و جہاد'' سے غافل نہیں ہوئے۔ اور یہ بھی یاد رہے کہ ان کا مطمح نظر محض آزادیٔ ہندوستان ہی نہ تھا' بلکہ ان کے پیش نظر اسلامی ممالک کی آزادی تھی۔ اور یہ معلوم رہے کہ ہندوستان کی آزادی کے فوراً بعد سب اسلامی ممالک آزاد ہو گئے۔

بات ہو رہی تھی ان کی دعوتِ قرآن کی۔ وہ کانگرس کی سیاسی تحریک کی گہما گہمی میں رہے مگر بنیادی مقصد سے ذرہ بھر بھی غافل نہیں رہے۔ جیل کے اندر یا باہر' ترجمہ و تفسیر قرآن میں مشغول رہے۔ حالانکہ سیاسی شورشوں میں علمی کام کرنے کے لیے مناسب جمعیت خاطر میسر نہیں آ سکتی۔ لیکن وہ اس کام میں برابر (۱۹۲۰ء کے بعد وہ مرحوم نہیں ہوئے) لگے رہے۔ جب انہوں نے ترجمان القرآن کی دوسری جلد ختم کر لی تو اسی وقت کانگرس کا اجلاس ہو رہا تھا۔ اس گہما گہمی میں انہوں نے اس جلد کی تقدیم لکھی' جو ان الفاظ پر ختم ہوئی:

ابوالکلام

''موتی نگر۔ کانگرس کیمپ''

لکھنؤ ۱۴/اپریل ۱۹۳۶ء

اور یہ بات بھی ثابت ہو چکی ہے کہ انہوں نے اس کے بعد ترجمان القرآن جلد سوم اور تفسیر ''البیان'' اور مقدمہ تفسیر لکھا' جس پر ان کی زندگی کا اختتام ہوا۔ گویا انجامِ زندگی تک وہ اپنے مقصد زندگی......دعوتِ قرآن و جہاد میں لگے رہے۔

آپ نے تحریر فرمایا کہ آپ کو دعوتِ قرآن کے لیے لاہور کی فضا مولانا عبید اللہ سندھیؒ کے دو شاگردوں مولانا عبدالحئی فاروقی اور مولانا احمد علی لاہوری مرحوم کی تیار کردہ ملی۔ واقعی یہ دونوں اصحاب اس سلسلے میں عزت و احترام کے مستحق ہیں۔ لیکن اس ضمن میں مولانا آزادؒ کے دو عزیز شاگردوں' پسرانِ مولانا عبدالقادر قصوریؒ کا ذکر آپ نہیں کر سکے۔ مولانا عبدالقادر قصوریؒ کی علمی وجاہت اور سیاسی مرتبت تاریخ کے صفحات پر منضبط ہے اور جو تعلق مولانا آزاد کو اس خاندان سے تھا' اس کا ذکر انہوں نے اپنی مشہور تصنیف ''تذکرہ'' میں بھی کیا ہے۔

وہ لکھتے ہیں: ''ڈاک ملی اور اخبارات سے معلوم ہوا کہ عزیزی مولوی محی الدین احمد' بی۔اے۔ کو قصور میں تلاشی کے بعد گرفتار کیا گیا۔ شاید نظر بندی کا معاملہ پیش آئے۔ ان تمام ایام جلاوطنی میں (رانچی ۱۹۱۶ء) یہ پہلا دن ہے کہ اس واقعہ کے سننے سے دل کو مضطر اور دماغ کو پراگندہ پاتا ہوں۔ عزیزی موصوف بلکہ ان کا پورا خاندان اپنے خصائص ایمانی و جوش اسلامی و ایثار للہ و فی اللہ کے اعتبار سے عہد سلف کے واقعات کو زندہ کرنے والا ہے اور علی الخصوص اس عزیز کے طلب صادق اور استعداد کامل سے تو اپنی چند در چند امیدیں وابستہ تھیں۔ افسوس فتنہ حوادث نے اس کو بھی نہ چھوڑا۔ مجھے اس سے کب انکار تھا کہ میرے پاؤں میں ایک کے بدلے دس زنجیریں ڈال دی جائیں' لیکن دوسروں کو اس میں کیوں شریک کیا جاتا ہے۔ بظاہر عزیز موصوف کا اس کے سوا کوئی جرم نہیں کہ مجھ خانماں خراب سے رسم و راہ رکھتے ہیں۔ سبحان اللہ! اپنی آشنا پروری اور دوست نوازی بھی قابل تماشا ہے۔ جب تک کوئی اپنا دشمن نہ بن جائے ہمارا دوست ہی نہیں ہو سکتا۔''

اسی خاندان (مولانا عبدالقادر قصوریؒ کے دو فرزندان) کے دو افراد' مولوی محمد علی مرحوم (ایم۔اے کنٹب) اور مولوی محی الدین احمد (بی۔اے) نے فضائے لاہور کو درسِ قرآن کی آواز سے معمور رکھا۔

مولوی محمد علی نے ۱۹۵۰ء میں باغ جناح میں ہر اتوار بعد نماز عصر درس قرآن شروع کیا۔

ان دنوں حسین وجمیل مسجد (مسجد دارالسلام) کی جگہ ایک چھوٹا سا چبوترہ تھا۔ نیچے فرش نہ اوپر سایہ۔ نہ سردی، گرمی، دھوپ و بارش میں سر چھپانے کی کوئی جگہ تھی۔ لیکن مولوی محمد علی صاحب کے عالمانہ انداز کی کشش تھی کہ شہر کے ہر کونے سے فہمیدہ و سنجیدہ اصحاب، درس میں کھچے چلے آتے۔ جنوری ۱۹۵۸ء میں مولانا قصوری اللہ کو پیارے ہو گئے۔ آپ کے بعد آپ کے برادر اکبر مولوی محی الدین احمد قصوری نے درس کی خدمات اپنے ذمے لے لیں اور چھوٹے بھائی کی طرح پوری پابندی اور باقاعدگی سے اس خدمت کو پورا کیا۔ لیکن صحت کی خرابی پھر اختلاج قلب کی شدید تکلیف نے کام معطل کر دیا۔ آپ کی وفات آخر ۱۹۷۰ء میں ہوئی (ماخوذ از سیارہ ڈائجسٹ قرآن نمبر)۔ لہٰذا لاہور کی فضا میں ان دو بھائیوں کے انفاس درس قرآنی بھی شامل ہیں جہاں سے اب آپ خطباتِ جمعہ دے رہے ہیں۔

آپ نے اس ضمن میں مولانا آزادؒ کی ایک تحریر کا ادھورا سا حوالہ دیا، جس سے قارئین پورا لطف نہیں اُٹھا سکتے۔ چونکہ یہ گفتارِ محبوب ہے اس کی بلاغت و معنویت کے اظہار کے لیے اسے مکمل تحریر کیے دیتا ہوں۔ بحوالہ موج کوثر ''ہر شخص کی زندگی کے مختلف پہلو ہوتے ہیں۔ اور ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک دسرے سے کسی قدر متضاد اور مختلف ہوں۔ خود میں گلیم زہد اور قبائے رندی کو ایک ہی وقت اوڑھنے، پہننے کا مجرم ہوں۔ پس اس سے بڑھ کر اور کیا حماقت ہو سکتی ہے کہ ہم اپنے ایک دوست سے جو سلوک مے خانہ کی چھت پر کریں، اس کا مستحق اسے سجادہ و خانقاہ پر بھی سمجھیں۔''

اس درازسخنی کی معافی چاہتا ہوں۔ ع ''لذید بود حکایت، دراز تر گفتم''۔

میری دعا ہے کہ خدا آپ کو اس مشن (جو میرے محبوب کا مشن تھا) دعوتِ قرآن اور تحریک جہاد میں کامیاب کرے۔ آمین!

و آخر دعوانا ان الحمد للّٰہِ ربّ العالمین

امید ہے مزاج گرامی بخیر ہوگا...... دعا کا طالب

والسلام

شیر بہادر خاں پنی